سوانح
ڈاکٹر نبی بخش بلوچ
محمد راشد شیخ
Dr. Nabi Bakhsh Khan Baloch Research Foundation
اینڈ ومینٹ فنڈ ٹرسٹ
ڈاکٹر بی بخش خان بلوچ
ریسرچ فاؤنڈیشن حیدر آباد

تصنیف

محمد راشد شیخ

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ

ریسرچ فاؤنڈیشن حیدر آباد۔ سندھ

فاؤنڈیشن کی کتاب نمبر (10)

نام کتاب۔۔۔۔۔۔ سوانح ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

مصنف۔۔۔۔۔۔۔ محمد راشد شیخ

تعداد۔۔۔ ۔۔۔۔۔ پانچ سو

سال۔۔۔۔۔۔۔۔ دسمبر 2017ء

طابع۔۔۔۔۔۔۔۔ پیکاک پرنٹرز کراچی

ناشر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ریسرچ فاؤنڈیشن حیدر آباد

تعاون۔۔۔۔۔۔۔۔ اینڈومینٹ فنڈ ٹرسٹ، کراچی

کتاب ملنے کا پتہ

1. سندھی ادبی بورڈ کا کتاب گھر، تلک چاڑھی، حیدر آباد
2. قلبچ کتاب گھر، سندھی لینگوئج اتھارٹی، حیدر آباد
3. فضلی بک سپر مارکیٹ، اردو بازار، کراچی
4. ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی
5. کتاب سرائے، اردو بازار، لاہور

برائے رابطہ

موبائل: 0333-2683907

انتساب

علامہ اقبال ہائی اسکول لطیف آباد حیدر آباد میں دورانِ تعلیم (۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۱ء)

سندھی زبان کے استادِ محترم

عاشق علی بلوچ صاحب

کے نام

جن کی شفقت، محبت اور عمدہ طرزِ تدریس کی بنا پر
میرے لیے سندھی زبان میں لکھنا، پڑھنا اور بولنا آسان ہوا

محمد راشد شیخ

فہرست

باب نمبر 2 ابتدائی حالاتِ زندگی اور تعلیم

باب نمبر 3 جُوناگڑھ اور علی گڑھ میں اعلیٰ تعلیمی مراحل

باب نمبر 4 علّامہ عبدالعزیز میمن اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔ عظیم استاد اور عظیم شاگرد

باب نمبر 5 ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا قیامِ امریکہ۔ وہاں حصولِ علم و دیگر مصروفیات

باب نمبر 6 ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا قیامِ کراچی (۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۱ء)

باب نمبر 10 ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی شخصیت کے اوصاف ومحاسن

باب نمبر 11 ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی علمی وتحقیقی خدمات کا مختصر تعارف

باب نمبر 12 ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی سندھی زبان وادب اور موسیقی سے متعلق تحقیقات

باب نمبر 13 ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی لُغت نویسی میں خدمات

باب نمبر 14 سندھی لوک ادب کے تحفّظ کا عظیم الشان منصوبہ

باب نمبر 15 ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی 'شاہ جو رسالو' پر منفرد تحقیق اور تکمیل

باب نمبر 16 ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی تاریخ نویسی میں خدمات

باب نمبر 17 سندھی اساسی (کلاسیکی) شعرا کے کلام کا تحفّظ

باب نمبر 18 ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی فارسی اور عربی زبانوں میں خدمات

باب نمبر 19 ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی اردو میں علمی و تحقیقی خدمات

باب نمبر 20 ڈاکٹر نبی بخش بلوچ بحیثیت ماہرِ تعلیم اور ان کی تعلیمی خدمات

باب نمبر 21 ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی مکتوب نگاری

باب نمبر 22 ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی خاکہ نگاری

باب نمبر 23 ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے اسفار اور سفرنامے

باب نمبر 24 ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے علمی روابط

باب نمبر 25 افکار ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

پبلشرز نوٹ

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ریسرچ فاؤنڈیشن کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مرحوم کی حیات اور ان کی وسیع علمی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق ہو اور ان تحقیقی منصوبوں کی اشاعت ہو۔اس کے علاوہ فاؤنڈیشن کے مقاصد میں ڈاکٹر بلوچ مرحوم کی کتابوں اور ان کے مقالات کے تراجم کرانا، ان علمی منصوبوں کی خاطر مناسب اسکالرشپ کا انتظام کرنا اور ڈاکٹر بلوچ صاحب کی حیات و خدمات پر سیمینار کا انعقاد کرانا بھی شامل ہے۔

پیش نظر کتاب ''سوانح ڈاکٹر نبی بخش بلوچ'' کے مرتب جناب محمد راشد شیخ کے ڈاکٹر بلوچ صاحب سے تقریباً پچیس برس تک علمی و نیازمندانہ تعلقات رہے۔ان تعلقات کا آغاز اس وقت ہوا جب ڈاکٹر بلوچ مرحوم کے استادِ محترم اور عربی زبان و ادب کے نامور عالم علامہ عبدالعزیز میمن کی سوانح اور علمی خدمات پر راشد صاحب نے جب تحقیقی کتاب کا آغاز کیا۔اس دوران متعدد مرتبہ ڈاکٹر بلوچ صاحب سے استفادہ، ان کی علمی مجالس میں شرکت اور ان کی علمی خدمات کے بارے میں راشد صاحب کو آگاہی حاصل ہوئی۔اس تمام عرصے میں وہ اپنی کتاب ''علامہ عبدالعزیز میمن سوانح اور علمی خدمات'' کی تکمیل میں منہمک رہے۔اس مقصد کے لیے انھوں نے ڈاکٹر بلوچ صاحب سے نہ صرف بار بار ملاقاتیں کیں بلکہ ان سے فون پر بھی ہدایات لیتے رہے۔ڈاکٹر بلوچ صاحب بھی دل سے خواہش مند تھے کہ ان کے استادِ محترم کی یہ اولین سوانح معیاری انداز سے شایع ہو۔انھوں نے راشد صاحب کو نہ صرف علامہ میمن کے اپنے نام لکھے خطوط دیے بلکہ کتاب کی تکمیل کے لیے کئی مفید چیزیں بھی دیں۔جب کتاب کا پہلا ایڈیشن شایع ہوا تو راشد صاحب نے اس کا پہلا نسخہ بلوچ صاحب کی خدمت میں روانہ کیا جسے پاکر وہ بہت خوش ہوئے اور انھیں ایک خط لکھا جو شایع ہو چکا ہے۔۲۰۰۵ء میں اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کی جانب سے ڈاکٹر بلوچ صاحب کو خط لکھا گیا کہ اکادمی کے سلسلے 'پاکستانی ادب کے معمار' میں

ڈاکٹر بلوچ صاحب پر کتاب لکھوائی جائے گی اور اس حوالے سے وہ نام پیش کریں کہ یہ کام کون کرسکتا ہے؟ ڈاکٹر بلوچ صاحب کے کہنے پر اس کام کو راشد شیخ نے بخوشی انجام دیا اور دو سال کی محنت کے بعد ۲۰۰۷ء میں کتاب 'ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔شخصیت اور فن' اسلام آباد سے شایع ہوئی۔ یہ مختصر کتاب بلوچ صاحب کی حیات اور علمی خدمات پر پہلی اردو کتاب تھی۔اس کتاب کے بعد راشد صاحب نے ڈاکٹر بلوچ صاحب کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ان کے اردو مقالات اور اردو خطوط پر بھی کام کیا جاسکتا ہے اور وہ اس کام کے لیے بخوشی رضامند ہیں۔اس تجویز پر ڈاکٹر بلوچ صاحب نے مسرت کا اظہار کیا اور مفید مشورے بھی دیے۔محمد راشد شیخ کا مرتبہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کے اردو مقالات اور خطبات کا پہلا مجموعہ ''گلشن اردو'' کے عنوان سے پاکستان اسٹڈی سینٹر سندھ یونیورسٹی جام شورو سے ۲۰۰۹ء میں شایع ہوا۔اس کے بعد راشد شیخ نے بلوچ صاحب کے اردو خطوط کو مرتب کیا اور کتاب ''خطوط ڈاکٹر نبی بخش بلوچ'' ۲۰۱۱ء میں محکمہء ثقافت حکومت سندھ کراچی کی جانب سے شایع ہوئی۔اس کے بعد راشد شیخ نے فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کی حیات اور وسیع علمی و عملی خدمات پر ایک کتاب لکھی جو'' ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔سوانح حیات اور علمی و عملی خدمات'' کے عنوان سے ۲۰۱۴ء میں محکمہء ثقافت حکومت سندھ کراچی سے شایع ہوئی۔

اس نئی کتاب کی اشاعت کی خاطر ہم Endowment Fund Trust(EFT) کراچی کے مشکور ہیں جن کی مالی معاونت سے اس کی اشاعت ممکن ہوسکی۔اس کے ساتھ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ریسرچ فاؤنڈیشن کے اراکین کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اس علمی منصوبے میں معاونت فرمائی۔

محمد راشد شیخ اس کتاب کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر بلوچ صاحب کی سندھی اور انگریزی کتب و مقالات کے اردو تراجم کرنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں نیک مقاصد میں کامیاب فرمائے۔

ڈاکٹر محمد شریف بلوچ

چیرمین

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ریسرچ فاؤنڈیشن، حیدرآباد

مورخہ: ۲۵/نومبر ۲۰۱۷ء

مقدّمہ

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ پاکستان کے بین الاقوامی شہرت یافتہ محقق، عالم، تاریخ دان، ماہر لغت نویسی، ماہر تعلیم، دانشور اور دیگر کئی حیثیتوں کے مالک تھے۔ آپ تقریباً ستر برس تک خدمتِ علمی میں مصروف رہے۔ آپ کی علمی خدمات کا دائرۂ کار سندھی زبان کے علاوہ اردو، انگریزی، عربی، فارسی، بلوچی اور سرائیکی زبانوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ان تمام زبانوں میں آپ نے سب سے زیادہ سندھی زبان میں ناقابل فراموش علمی و تحقیقی کارنامے انجام دیے اور سندھی زبان کی وہ بنیادی ضرورتیں پوری کیں جو کسی بھی زندہ زبان کے لیے ضروری ہیں۔ پاکستان میں اہلِ علم اور محققین اور بھی ہیں لیکن ڈاکٹر بلوچ صاحب کی یہ انفرادیت ہے کہ ان کی ہر تحریر مسلسل محنت، تحقیق اور غور وفکر کے بعد سامنے آئی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی ہر تحریر مستقل اہمیت کی حامل نظر آتی ہے۔ علمی اور تحقیقی میدان میں مسلسل محنت اور بلند پایہ تحقیقات کے نتیجے میں آج ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا نام استناد کی علامت بن چکا ہے۔ اگر آج سے کئی دہائیاں قبل کا لکھا کوئی مقالہ پڑھیں تو وہ آج بھی تحقیقی اور علمی اعتبار سے تازہ نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ تشنگانِ علم کے لیے ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحریروں نے ہر عہد میں مشعلِ راہ کا کام دیا ہے اور آئندہ بھی دیتی رہیں گی۔

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ یا مختصراً ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحقیقات وسیع الاطراف اور وسیع الموضوعات ہیں۔ آپ کی تحقیقی خدمات کا ایک پہلو تاریخ سے متعلق ہے۔ اس حوالے سے آپ نے سندھ کی تاریخ کے دو بنیادی

ماخذ یعنی ''چچ نامہ'' اور ''تحفتہ الکرام'' کے بیانات کی تصحیح کی اور مفید معلومات کا اضافہ کیا۔ اس طرح صدیوں کے بعد تاریخِ سندھ سے متعلق درست معلومات قارئین کے سامنے آسکیں۔ اس سلسلے میں مذکورہ کتب کے مقدمات میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کے تحقیقی نکات محققین اور عام افراد کے لیے رہنمائی کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کتب کے علاوہ ڈاکٹر بلوچ کی تاریخی خدمات متعدد کتب کی تدوین و اشاعت کی شکل میں محفوظ ہے جس کی تفصیلات پیش نظر کتاب کے باب نمبر 16 میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی دلچسپی کا ایک اور موضوع سندھی زبان، اس کا آغاز و ارتقاء سے متعلق تھا۔ اس حوالے سے سندھی زبان کا آغاز، اس کے ارتقاء، مختلف مراحل، سندھی زبان پر دیگر زبانوں کے اثرات اور اس کی موجودہ عہد تک ترقی پر آپ نے سندھی زبان میں ایک جامع کتاب 'سندھی زبان و ادب کی تاریخ' لکھی اور اس میں مزید اضافے بھی کیے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس موضوع پر دیگر حضرات نے بھی کتب لکھی ہیں لیکن ڈاکٹر بلوچ صاحب کا نقطۂ نظر، تحقیقی شان کا حامل اور مدلل ہے۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی دلچسپی کا ایک اور میدان ''لوک ادب'' (Folklore) تھا۔ بقول آپ کے یہ لوک ادب ہی ہے جس سے مختلف اقوام کی تاریخ اور اس کے ادب کا بنیادی تعلق ہے۔ لوک ادب ہی عوامی جذبوں کا سچا ترجمان ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپ کی شب و روز محنت کے نتیجے میں سندھی لوک ادب کا بڑا حصہ جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلا آرہا تھا اور اس کے ضائع ہونے کا خطرہ تھا اسے حصہ ضائع ہونے سے بچایا اور اسے مطبوعہ شکل میں 43 جلدوں میں محفوظ کیا۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صاحب لوک ادب کی تقریباً پندرہ مزید کتب شائع کرانا چاہتے تھے جو بوجوہ شائع نہ ہوسکیں۔ اگر یہ سلسلہ ڈاکٹر صاحب کے پروگرام کے مطابق جاری رہتا تو یہ کل 60 جلدوں میں مکمل ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب نے بقیہ جلدوں کا مواد اکھٹا کرلیا تھا اور اس کی منصوبہ بندی Planning بھی کرلی تھی لیکن یہ عظیم علمی منصوبہ مکمل نہ ہوسکا۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحقیق کا ایک اور میدان سندھ کے عظیم شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی سوانح اور کلام سے متعلق ہے۔ اس حوالے سے آپ نے 'شاہ جو رسالو' پر جو تحقیقی کام ہے وہ اس قدر عمیق تحقیقی کام سندھی کے کسی شاعر پر آج تک کسی اور شخص نے نہیں کیا۔ صرف شاہ عبداللطیف بھٹائی کی سوانح اور کلام پر ڈاکٹر بلوچ

صاحب کی تحقیق بتیس سال کے عرصے پر محیط تھی۔ آپ نے دس ضخیم جلدوں میں 'شاہ جو رسالو' کو مرتب کیا اور تحقیق محنت کا اندازہ اس حقیقت سے لگائیں کہ اس کام کی خاطر پچاس قلمی نسخوں اور تمام مطبوعہ نسخوں کا حرف بہ حرف مقابلہ کیا اور اس عظیم شاعر کے کلام کو پہلی مرتبہ مکمل تحقیق کے بعد شائع کرایا۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی ایک اور پہچان بطور ماہرِ تعلیم کی تھی۔ آپ نے طویل عرصے تک نہ صرف بطور استاد فروغِ علم میں حصہ لیا بلکہ تعلیم اور اس کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی خدمات بھی انجام دیں۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے بنیادی طور پر ایک استاد کے طور پر زندگی گزاری ہے اور اپنے آپ کو پڑھنے پڑھانے کے مفید شغل میں مصروف رکھا۔ علم کے فروغ کا انہیں اس حد تک شوق تھا کہ سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بننے کے بعد بھی اپنا لیکچر باقاعدگی سے دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے طویل عملی تجربے کے نچوڑ کے طور پر ہمارے تعلیمی مسائل کے حل بھی مختلف کتب میں پیش کیے ہیں نیز فروغِ تعلیم کے لیے کئی ٹھوس اور عملی تجاویز بھی پیش کی ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنے اور ان کو روبہ عمل لانے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب ایک ماہر لغت نویس بھی تھے۔ دیگر اعزازات کے ساتھ یہ اعزاز بھی آپ ہی کو حاصل ہوا کہ سندھی زبان کی سب سے بڑی لغت پانچ جلدوں میں آپ ہی نے لکھی۔ اس کے بعد اس لغت پر نظر ثانی بھی کی اور اضافے بھی کیے۔ یہ نظر ثانی و اضافہ شدہ لغت تین ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ سندھی ۔اردو لغت اور اردو۔ سندھی لغت بھی آپ ہی کی کوششوں سے شایع ہوئیں۔ بعد ازاں آپ نے یک جلدی سندھی لغت اور شاہ جو رسالو کی لغت بہ عنوان ''روشنی'' لکھی جو شایع بھی آپ کی زندگی ہی میں ہوئیں۔

ڈاکٹر بلوچ کی اردو خدمات بھی کم اہمیت کی حامل نہیں۔ آپ نے 'سندھ میں اردو شاعری'، 'مولانا آزاد سبحانی ۔تحریک آزادی کے ایک مقتدر رہنما'، 'دیوانِ شوق افزا عرف دیوانِ صابر'، 'دیوانِ ماتم' جیسی کتب کی تحقیق و تدوین کے بعد شائع کرائیں۔ اس کے علاوہ آپ کی اردو تحریروں کا معلومات افزا مجموعہ 'گلشنِ اردو' بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں جسے ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ان کی خواہش کے مطابق راقم الحروف نے مرتب کیا اور ان کی زندگی ہی میں یہ شائع بھی ہوا۔ ان کتب کے علاوہ آپ کے مقالات و مقدمات بھی تحقیقی شان کے حامل ہیں۔ اس موضوع پر ہم نے کتاب کے باب نمبر 19 میں تفصیلات پیش کی ہیں۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ سے راقم الحروف کا اولین تعارف اس وقت ہوا جب وہ اسلام آباد میں مقیم تھے اور راقم حیدرآباد میں زیرِ تعلیم تھا۔ ڈاکٹر صاحب جب اسلام آباد سے حیدرآباد منتقل ہو گئے تو ان سے ملاقاتوں اور استفادہ کے سلسلے کا آغاز ہوا جو ان کے آخر دم تک جاری رہا۔ تعلقات کے آغاز کی وجہ یہ بنی کہ راقم نے ڈاکٹر بلوچ صاحب کے استادِ محترم اور عربی زبان و ادب کے نامور عالم علامہ عبدالعزیز میمن کی سوانح اور علمی خدمات پر کتاب کا آغاز 1991 میں کیا تھا اور پورے پاکستان میں علامہ میمن کے قدیم ترین شاگرد ڈاکٹر صاحب ہی تھے اور اس کام کی خاطر ان سے استفادہ کرنا لازمی تھا۔ اس دوران متعدد مرتبہ ڈاکٹر بلوچ صاحب سے استفادہ، ان کی علمی مجالس میں شرکت اور ان کی علمی خدمات کے بارے میں آگاہی حاصل ہوئی۔ راقم کا جب بھی کراچی سے حیدرآباد جانا ہوتا، کوشش کر کے ڈاکٹر بلوچ صاحب سے ملاقات کرتا اور ان کی علمی مجالس اور علمی گفتگو سے فیض یاب ہوتا۔ کئی مرتبہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کو صبح و شام کی سیر کرتے بھی دیکھا۔ معلوم ہوا وہ بھی اپنے استادِ محترم علامہ میمن کی طرح صبح و شام کی سیر کے عادی ہیں۔ اسی طرح سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس حیدرآباد کے مشرقی گوشے کے ایک سادہ سے کمرے میں نہایت سادہ ساز و سامان اور دو معاونین کے ساتھ ''شاہ جو رسالو'' یعنی رسالہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی تحقیقات کے کام میں منہمک دیکھا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب روزانہ شام کے دو گھنٹے شاہ جو رسالو کی تحقیق و تدوین میں صرف کرتے تھے۔ فی الحقیقت راقم نے ڈاکٹر بلوچ صاحب کی شخصیت میں سچے اہلِ علم کی سادگی دیکھی۔ وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر خدمتِ علمی میں مصروف پائے گئے۔ عام رہن سہن، اکل و شرب اور نشست و برخاست میں بھی وہی سادگی نظر آئی۔ ان کی زندگی بیجا تکلفات اور تصنّع سے پاک تھی۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی شخصیت اور علمی خدمات کا جوں جوں علم ہوتا رہا راقم الحروف ان کے بارے میں تحریری مواد جمع کرتا رہا۔ ان کے بارے میں سندھی، انگریزی اور اردو میں جو کچھ چھپا ہمیشہ کوشش کی کہ اسے اولین فرصت میں حاصل کیا جائے۔ اس دوران ڈاکٹر بلوچ صاحب کی عنایات بھی راقم پر کچھ کم نہ تھیں۔ شدید مصروفیات، ضعیف العمری اور علالت کے باوجود جب جب راقم نے گزارش کی، ڈاکٹر بلوچ صاحب نے نہ صرف مطبوعہ مواد فراہم کیا بلکہ بہت سی یادداشتیں ریکارڈ بھی کرائیں۔

۲۰۰۵ء میں اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کی جانب سے ڈاکٹر بلوچ صاحب کو خط لکھا گیا کہ اکادمی

کے سلسلے' پاکستانی ادب کے معمار' میں ڈاکٹر بلوچ صاحب پر کتاب لکھوائی جائے گی اور اس کام کی خاطر وہ نام پیش کریں کہ یہ کام کون کرسکتا ہے؟ یہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کی شفقت تھی کہ اس کام کی خاطر انھوں نے پہلے بذریعہ فون راقم کا عندیہ لیا اور اس کے بعد راقم کا نام پیش کیا چنانچہ تقریباً دو سال کی محنت کے بعد ۲۰۰۷ء میں کتاب' ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔ شخصیت اور فن' اسلام آباد سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کا اضافہ شدہ ایڈیشن ان شاء اللہ دسمبر ۲۰۱۷ء میں شائع ہوگا۔ اکادمی ادبیات کے ذمہ داروں کی خواہش پر یہ مختصر کتاب ترتیب دی گئی تھی ورنہ راقم کا ارادہ مفصل کتاب کی تالیف تھا۔ اس کتاب کے بعد راقم نے ایک ملاقات کے دوران ڈاکٹر بلوچ صاحب کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ان کے اردو مقالات اور اردو خطوط پر بھی کام کیا جاسکتا ہے اور راقم اس کام کے لیے بخوشی رضامند ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کی انگریزی میں خط وکتابت اور ان کے انگریزی مقالات کے دو مجموعے شایع ہو چکے تھے اسی طرح ان کے سندھی خطوط اور ان کے نام مشاہیر کے سندھی زبان میں خطوط کی بھی دو جلدیں شایع ہوچکی تھیں۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے بخوشی رضامندی ظاہر کی۔ الحمدللہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کے اردو مقالات اور خطبات کا معلومات افزا مجموعہ ''گلشن اردو'' کے عنوان سے پاکستان اسٹڈی سینٹر سندھ یونیورسٹی جام شورو سے ۲۰۰۹ء میں شایع ہوا۔ اس کے بعد راقم نے ڈاکٹر بلوچ صاحب کے اردو خطوط کو مرتب کیا اور یہ ''خطوط ڈاکٹر نبی بخش بلوچ'' کے عنوان سے محکمہ ثقافت حکومت سندھ نے ۲۰۱۲ء میں شایع کیے۔ اس کے بعد بھی راقم نے ڈاکٹر بلوچ مرحوم کی حیات اور خدمات پر تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا چنانچہ اس موضوع پر کتاب' ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔ سوانح حیات اور علمی وعملی خدمات' ۲۰۱۴ء میں محکمہء ثقافت حکومت سندھ سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر بلوچ کے حوالے سے راقم کی اب تک کی آخری کتاب' خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' ہے جسے ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ریسرچ فاؤنڈیشن حیدرآباد نے ۲۰۱۵ء میں شائع کیا۔ ان پانچ کتب کے بعد بھی راقم کی ڈاکٹر بلوچ مرحوم کے حوالے سے حیات وخدمات کے نئے نئے گوشوں سے آگاہی حاصل کرنے کا سفر ختم نہیں ہوا اور اس سفر کا حاصل پیشِ نظر کتاب ہے جس میں کل ۲۵ ابواب ہیں ان کی حیات اور علمی وتحقیقی خدمات پر نئی اور اب تک کی تحقیقات کے مطابق تازہ ترین معلومات پیش کی گئی ہیں۔ ان شاء اللہ علم وتحقیق کی راہوں کا یہ سفر آئندہ بھی جاری رہے گا۔

جہاں تک ڈاکٹر بلوچ مرحوم کی شخصیت کا تعلق ہے، راقم الحروف نے ڈاکٹر بلوچ صاحب کی شخصیت میں ایک سچے، محنتی اور مخلص عالم کی صفات پائیں۔ ان کی طویل علمی و تحقیقی خدمات سے آج بھی نئی نسل مشعلِ راہ کا کام لے سکتی ہے۔ اُن کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اگر حصولِ علم کی سچی لگن ہو تو راہ کی مشکلات کبھی سدِ راہ نہیں بنتیں۔ انہوں نے گاؤں کے سادہ ماحول میں پرورش پائی جہاں ابتدائی تعلیم تک کا انتظام نہیں تھا۔ علم کی سچی لگن کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ پہلے نوشہرو فیروز اسکول اور مدرسہ تک پہنچے اور پورے سندھ کے مسلمان طلبہ میں میٹرک کے امتحان میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد آپ اپنی محنت اور مستقل مزاجی سے بہاء الدین کالج جوناگڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور کولمبیا یونیورسٹی امریکہ تک پہنچے اور وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آج کی نوجوان نسل کو ڈاکٹر بلوچ صاحب کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ کس طرح وہ طرح طرح کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے اور اعلیٰ سے اعلیٰ ترین تعلیمی اسناد حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ آج تو صورت حال یہ نظر آتی ہے کہ بہت سے نوجوان تمام سہولیات کے باوجود حصولِ علم پر توجہ نہیں دیتے۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی زندگی سے ہمیں یہ بھی سبق ملتا ہے کہ علم و تحقیق کا سچا ذوق رکھنے والے کبھی قلتِ وقت کی شکایت نہیں کرتے اور بغیر کسی مادی منفعت کے خدمتِ علمی میں مصروف رہتے ہیں۔ پیشِ نظر کتاب کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے ہر عہد میں سرکاری مصروفیات کے باوجود اپنے قیمتی وقت کو علمی و تحقیقی مشاغل میں صرف کیا۔ انہوں نے زندگی بھر علمی و تحقیقی منصوبوں کا آغاز اور ان کی بڑی کامیابی سے تکمیل، ذاتی شوق کی بنا پر کی مثلاً شاہ جو رسالو، جامع سندھی لغات، لوک ادب یا دیگر منصوبے۔ ان تمام کاموں کی تکمیل کے بعد آپ نے ہمیشہ اس اصول پر عمل کیا کہ اپنی ہر کتاب کا پہلا ایڈیشن ناشر کو بلا معاوضہ چھاپنے کی اجازت دی خواہ ناشر نے کتنی ہی تعداد میں چھاپا۔ اب تک فی زمانہ کوئی ایسی مثال سامنے نہ آئی کہ برس ہا برس کی شب و روز محنت کے بعد اپنی تحقیقات کا ثمر ناشر کو مفت پیش کیا جائے۔ ایک مرتبہ ایک ناشر نے رائلٹی کی مد میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کو ایک لاکھ کا چیک روانہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس چیک کو واپس کر دیا اور اسے خط لکھا کہ یہ ان کے زندگی بھر کے اصول کے خلاف ہے کہ کتاب کے پہلے ایڈیشن کی رائلٹی لیں۔ پہلے ایڈیشن سے متعلق یہ

شرط ڈاکٹر صاحب محض اس وجہ سے رکھتے تھے کہ ناشر اگر دوسرا ایڈیشن شائع کرے تو ڈاکٹر صاحب کو مطلع کرے تا کہ دوسرا ایڈیشن مفید ترمیمات واضافات کے بعد شائع ہو ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی متعدد کتب کے پہلے ایڈیشن کے بعد بھی کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے لیکن انھوں نے علمی فیض رسانی کے جذبے کے تحت کسی ایڈیشن کی رائلٹی کسی ناشر سے کبھی نہیں لی۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب ان عظیم شخصیات میں شامل تھے جن پر قومیں اور ممالک فخر کرتے ہیں۔انہوں نے ساری زندگی علم اور تحقیق کی خاطر صرف کی ان کی شخصیت ایک چلتے پھرتے انسائیکلو پیڈیا کی مانند تھی۔ان کی شخصیت کثیر الجہات تھی ۔ڈاکٹر صاحب کی حیات اور ان کی تحریروں سے ہم آج بھی روشنی حاصل کر سکتے ہیں اور اقوامِ عالم کی صف میں بلند مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ڈاکٹر بلوچ ایک نامور ماہرِ تعلیم بھی تھے اور انہوں نے تعلیم کے موضوع پر جو تحقیقی کتب تصنیف فرمائیں ان سے آج بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے مثلاً ان کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کے لئے اساتذہ کی تربیت اور تعلیم سے متعلق تھا۔وہ سندھ یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کے بانی اور پہلے ڈائریکٹر بھی تھے۔ڈاکٹر صاحب ان تمام موضوعات کے علاوہ ایک ماہر مرتّب اور مدون بھی تھے۔اور انہوں نے نہ صرف سندھ کے اساسی شعراء کے کلام کو مرتب کیا بلکہ سندھ سے تعلق رکھنے والے اردو شعرا کے کلام کو بھی ۔اس کے علاوہ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے قریہ قریہ گاؤں گاؤں جا کر زبانی روایتوں کی مدد سے سندھی لوک ادب کو کتابی شکل محفوظ کردیا۔اس سلسلے کی 43 جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب ایک نامور تاریخ دان بھی تھے اور اس موضوع پر ان کی مہارت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایئے کہ ان کے مقالات Encyclopaedia Britanica اور Encyclopaedia of Islam میں بھی شامل ہیں۔

راقم الحروف کا مشاہدہ ہے کہ عام اردوداں تو رہے ایک طرف وہ حضرات جن کا علم وتحقیق سے تعلق ہے وہ بھی ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مرحوم کی کثیر اللسان اور کثیر الجہات علمی اور تحقیقی خدمات سے کماحقہٗ واقفیت نہیں رکھتے۔ڈاکٹر بلوچ صاحب کو بطور ایک دانشور، محقق اور عالم کے طور پر تو سب جانتے ہیں لیکن مختلف مواقع پر جب راقم کی بہت سے اہل قلم اور محقّقین حضرات سے ڈاکٹر بلوچ صاحب کی عظیم الشان علمی خدمات پر گفتگو ہوئی تو علم ہوا کہ یہ حضرات اس

بارے میں بہت کم واقفیت رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر راقم الحروف نے پیش نظر کتاب میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کی علمی اور تحقیقی خدمات کی تفصیلات اردو میں تحریر کی ہیں تاکہ اردو داں قارئین کو علم ہو کہ ایک فرد واحد نے اپنی مسلسل محنت، عزم، حوصلے اور مستقل مزاجی سے کام لے کر تمام مشکلات اور مسائل کے باوجود کتنی عمدگی سے بڑے بڑے علمی منصوبوں کا آغاز بھی کیا اور ان کی تکمیل بھی کی۔ دنیا میں علمی منصوبوں کا آغاز تو بہت سے محقّقین کرتے ہیں لیکن محض چند ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی زندگی میں ان منصوبوں کو مکمل شکل میں دیکھ سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کی علمی اور تحقیقی خدمات نہ صرف پاک و ہند میں بلکہ عالمی علمی تاریخ میں بالکل منفرد نوعیت کی ہیں اور ان کا ایک ایک علمی منصوبہ پورے اداروں کے کاموں پر بھاری ہے۔

پیش نظر کتاب کا باب نمبر 24 ڈاکٹر بلوچ مرحوم کے علمی روابط کے بارے میں ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب کے روابط نہ صرف پاک و ہند کے اہل قلم و محققین سے تھے بلکہ بین الاقوامی سطح کے محققین سے بھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی علم ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کس کس طرح ان محققین کی علمی معاونت کرتے تھے اور اگر ضرورت پڑے تو ان سے معاونت طلب بھی کرتے تھے۔ اس معاملے میں ڈاکٹر صاحب کسی طرح بھی محدود دائرے میں مقیّد نہیں رہے اور زندگی بھر وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے علمی فیض رسانی کرتے رہے۔ کتاب کا آخری باب ڈاکٹر صاحب کے افکار سے متعلق ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں ڈاکٹر صاحب دیگر حیثیتوں کے ساتھ ساتھ ایک مفکر بھی تھے اور مختلف موضوعات پر ہمیں ان کے منفرد افکار اور اقدارِ حیات ملتی ہیں جن پر وہ بڑی ثابت قدمی سے عمر بھر عمل پیرا رہے۔ دراصل ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں اخلاقیات اور اخلاقی اصولوں کی بہت زیادہ اہمیت تھی جن پر وہ عمر بھر گامزن رہے۔ ان کے یہی وہ اخلاقی اصول ہیں جن پر عمل کر کے ہم اقوامِ عالم کی صف میں بلند مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی حیات اور خدمات کی تحقیق کے دوران یہ حیران کن انکشاف بھی ہوا کہ اس قدر وسیع الموضوعات اور وسیع الاطراف علمی اور تحقیقی کاموں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے زندگی میں بہت سے عملی کام بھی کیے۔ انھوں نے بڑی کوشش سے اپنے گاؤں گوٹھ جعفر خان لغاری میں پہلا اسکول قائم کرایا، اس اسکول کو ترقی بھی دلائی اور بچیوں کا اسکول بھی تعمیر کرایا اور اس کو عمدہ طریقے سے چلانے کی ذمہ داری اپنی بیٹی محترمہ

حمیدہ بلوچ کو سونپی جنھوں نے برس ہا برس گاؤں کی بچیوں کو زیورِ علم سے آراستہ کیا اور یوں اپنے عظیم والد کے مشن کو آگے بڑھایا۔ اس کے علاوہ سندھ کے کئی دیہات میں ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے اسکول قائم ہوئے جن میں کوٹ میر محمد (تحصیل کنگری ضلع خیر پور میرس) میں اسکول بھی شامل ہے جو انھوں نے ذاتی رقم سے تعمیر کرایا۔ اس کے علاوہ سندھ میوزیم، انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی، مہران آرٹس کونسل، سندھی لینگویج اتھارٹی و دیگر کئی علمی و ثقافتی ادارے بھی ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے ہی قائم ہو سکے۔ انہی کی کوششوں سے عمر کوٹ، حیدر آباد اور بھنبھور میں عجائب گھر قائم ہوئے جہاں آثارِ قدیمہ کے نوادرات کی حفاظت کا مناسب انتظام کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کتاب میں ان کی علمی خدمات کے ساتھ ساتھ عملی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے۔

اس کتاب کی تالیف ایک مشکل اور صبر آزما کام تھا لیکن گزشتہ تجربات کی بنا پر راقم اس کام کی اہمیت سے کسی حد تک واقف تھا۔ راقم کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ اگر ڈاکٹر صاحب کی سوانح پر اب بھی کوئی جامع کام نہ سکا تو جیسے جیسے وقت گزرے گا یہ کام مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا۔ راقم الحروف اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ کئی مشاہیر سندھ مثلاً علامہ آئی آئی قاضی، ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ و دیگر حضرات کی مفصل تو کیا مختصر سوانح بھی اب تک شائع نہ ہو سکیں۔ اسی وجہ سے راقم نے اس مشکل کام کا بیڑا اٹھایا اور ڈاکٹر صاحب کی یہ جامع اور مفصل سوانح ان شاءاللہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی صد سالہ تقریبات یعنی دسمبر ۲۰۱۷ء سے قبل قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی۔ اس دوران کتاب کی تکمیل کی خاطر بہت سے دوستوں، بزرگوں اور احباب نے راقم کا مختلف مراحل کے دوران ساتھ دیا اور مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد فراہم بھی کیا۔ ان احباب میں پروفیسر محمد اقبال مجدّدی، سیّد جمیل احمد رضوی، ڈاکٹر عارف نوشاہی، سیّد معراج جامی، حافظ افتخار احمد صاحب شامل ہیں۔ سید معراج جامی صاحب نے کمپوزنگ کے مشکل کام میں معاونت فرمائی اور حافظ افتخار احمد نے بعض تکنیکی مشورے دے کر شکریے کا موقع دیا۔ ان کے علاوہ جناب محبوب عالم بھی خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے راقم کی گزارش پر کتاب کی ابتدائی پروف ریڈنگ کی اور مفید رہنمائی فرمائی۔ راقم ان سب احباب کا مشکور ہے اور ان کے لیے دعا گو۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کا ساتھ شامل حال نہ ہوتا تو کتاب کی تکمیل میرے لیے مزید مشکل ہو جاتی۔

میں محترم ڈاکٹر محمد شریف بلوچ صاحب چیرمین ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ریسرچ فاؤنڈیشن اور دیگر اراکین

کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے فاؤنڈیشن حیدرآباد کی جانب سے اس کتاب کی اشاعت کی منظوری دی۔
ڈاکٹر بلوچ صاحب کے لائق پوتے جناب محمد ارشد بلوچ کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تالیف کے دوران اپنے عظیم دادا سے متعلق ہر وہ چیز فراہم کی جسے راقم نے طلب کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے بعض ضروری عبارات کی کمپوزنگ بھی فراہم کی۔ دورانِ تحقیق ڈاکٹر بلوچ صاحب سے متعلق جب بھی کوئی بات دریافت کی انھوں نے یا تو خود یا متعلقہ افراد سے دریافت کر کے مطلع کیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کے نواسے جناب محمد عارف بلوچ بھی میرے شکریہ کے حقدار ہیں جنھوں نے بعض مشکل عبارات کے سندھی سے اردو تراجم میں مدد کی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کی صاحب زادی محترمہ حمیدہ بلوچ کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میری گزارش پر کمپوز شدہ صفحات کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کیا، بعض اغلاط کی نشان دہی کی اور بعض مقامات پر مفید اضافات بھی تجویز کیے۔

آخر میں قارئین کی خدمت میں عرض ہے کہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی اس جامع سوانح کی تالیف میں راقم نے اپنی حد تک شب و روز محنت کی اور اسے تکمیل تک پہنچایا لیکن انسان خطا کا پتلا ہے۔ اگر دورانِ مطالعہ کتاب میں کوئی کمی محسوس کریں یا کوئی بیان اصلاح طلب ہو تو بلا تکلف مطلع کریں تا کہ آئندہ ایڈیشن میں درستگی کی جا سکے۔ ان شاء اللہ یہ سلسلہ مزید آگے بڑھے گا اور آئندہ ایڈیشن میں ڈاکٹر بلوچ سے متعلق مزید اہم معلومات پیش کی جائیں گی۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی پوری زندگی حصولِ علم اور فروغِ علم میں بسر ہوئی۔ اگر اس کتاب کے مطالعے کے بعد کسی دل میں حصولِ علم اور فروغ علم کی سچی لگن پیدا ہو جائے تو میں سمجھوں گا میری محنت ٹھکانے لگی اور اس کی اشاعت کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

مورخہ: ۲۲/نومبر ۲۰۱۷ء

محمّد راشد شیخ
الفلاح، ملیر ہالٹ
کراچی
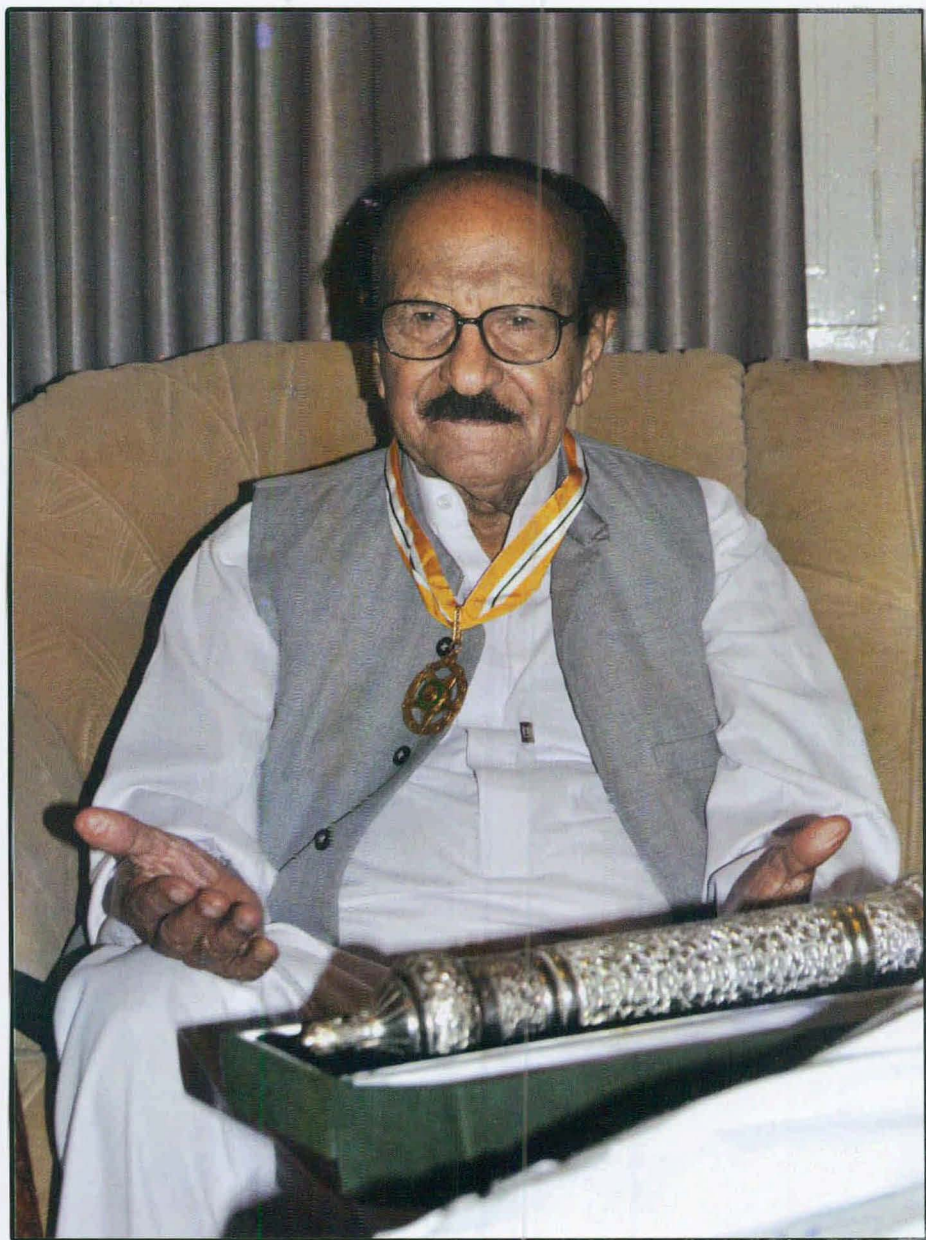
ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی آخری تصویر- مورخہ 3 اپریل 2011 کو حیدرآباد میں صدر پاکستان کی جانب سے ستارۂ امتیاز ملنے کی خوشی میں منعقدہ تقریب میں — یہ تقریب ڈاکٹر صاحب کے انتقال سے دو روز قبل منعقد ہوئی تھی

باب نمبر 1

مختصر تاریخ قریہ جعفر خان لغاری

قریہ جعفر خان لغاری ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کا آبائی گاؤں اور جائے پیدائش ہے۔اس باب میں ہم اس قریے سے متعلق اہم تفصیلات اور بلوچ صاحب کی ابتدائی زندگی پر روشنی ڈالیں گے۔

قریہ جعفر خان لغاری کا جغرافیہ

جغرافیائی لحاظ سے قریہ جعفر خان لغاری سندھ کے دو معروف شہروں شہداد پور اور سانگھڑ کے درمیانی قریوں میں سے ایک ہے۔ بلوچ صاحب کی تحقیق کے مطابق پہلی صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری تک دریائے سندھ اسی علاقے سے بہتا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سن ۱۱۲ ہجری تا ۱۱۶ ہجری عربوں کے عہد میں مشہور شہر ''منصورہ'' آباد ہوا۔ منصورہ کے قدیم آثار آج بھی قریہ جعفر خان لغاری کے جنوب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایک اور قدیم اور چھوٹے شہر ''متھلو'' کے آثار قریہ جعفر خان لغاری سے تقریباً دو میل جنوبی جانب آج تک پائے جاتے ہیں۔ متھلو کسی عربی نام کی تبدیل شدہ شکل ہے۔ ایک اور گاؤں ''جراری'' قریہ جعفر خان لغاری سے ساڑھے تین میل جنوب مغربی جانب آباد ہے۔ ''جراری'' دراصل ''جلوالی'' یعنی پانی والا، دریائے سندھ کی ایک قدیم شاخ کا نام ہے جس کا ذکر عربوں کی فتحِ سندھ کے اہم ترین ماخذ ''فتح نامۂ سندھ عرف چچ نامہ'' میں موجود ہے۔ سن ۱۱۶

ہجری میں ''برہمن آباد'' کے بالمقابل دریا کے دوسری جانب ''منصورہ'' آباد کیا گیا تھا۔ برہمن آباد کے آثارِ قدیمہ کی باقیات آج بھی موجود ہیں۔ ان قدیم آثار میں بدھ مذہب کی عبادت گاہ کے آثار قریہ جعفر خان لغاری سے آٹھ میل جنوب مغربی سمت میں آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔(۱)

دریائے سندھ کے رُخ کی تبدیلی

دریائے سندھ جب تک اس علاقے سے بہتا رہا تب تک مذکورہ بالا علاقہ آباد رہا۔ تیرھویں صدی عیسوی سے دریائے سندھ نے اپنے بہاؤ کا رُخ تبدیل کیا اور مغربی جانب شہداد پور کے نزد بہنے لگا۔ دریا کے بہاؤ کی تبدیلی کا یہ نتیجہ نکلا کہ قریہ جعفر خان لغاری کے نزدیہ آباد علاقہ غیر آباد ہونے لگا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شہداد پور اور سانگھڑ کا درمیانی علاقہ بالکل غیر آباد ہو گیا اور اٹھارھویں صدی کے آخر تک یہ علاقہ ''دشتِ باراں'' کہلانے لگا۔ اس غیر آباد علاقے کا ذکر تاریخِ سندھ کے نامور مصنّف میر علی شیر قانع ٹھٹوی نے اپنی معروف تصنیف ''تحفتہ الکرام'' میں کیا ہے۔(۲)

علاقے کی دوبارہ آبادکاری

شہداد پور اور سانگھڑ کے درمیانے علاقے میں دوبارہ آبادی اُس وقت ہوئی جب میر شہداد خان تالپور نے مغربی جانب سے دریا سے نکلنے والی نہر ''مارکھ واہ'' کو مزید آگے بڑھایا اور ''شہداد پور'' نامی شہر آباد کیا۔ یہ واقعہ اندازاً ۱۸۰۸ء تا ۱۸۱۰ء کا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ پر مغلوں کی حکومت تھی۔ نہروں میں اضافہ اور مزید نہروں میں کھدائی کا سبب یہ تھا کہ شہزادہ معزالدین نے میر شہداد خان کو ''پٹ باراں'' کا علاقہ بطور جاگیر عطا کیا تھا جسے آباد کرنے کے لیے نہروں کی کھدائی کا کام اسی زمانے میں کرایا گیا۔ ''مارکھ واہ'' نامی نہر جو دریائے سندھ کے مغربی جانب سے نکلتی تھی، شہداد پور کے نزدیکی علاقے تک پانی پہنچاتی تھی۔ اُسی نہر سے ایک چھوٹی نہر ''راج واہ'' جنوبی جانب سے نکالی گئی جس کے نزد شہداد پور نامی شہر آباد کیا گیا۔ بعد میں ''مارکھ واہ'' نامی نہر کو مزید ۱۴ میل آگے تک کھودا گیا اور شہر ''جھول'' اسے توسیع دی گئی۔ اس نئی نہر کو میر شاہو خان کے نام پر ''شاہو واہ'' کا نام دیا

گیا۔ شاہو واہ سے مزید نہریں نکالی گئیں جن سے یہ پورا علاقہ دوبارہ قابلِ زراعت ہوا اور آباد ہو گیا۔ انھی نئی نہروں میں ''حضور وواہ'' بھی ہے، جس سے شہر سنجھورو تک کی زمینیں آباد ہوگئیں۔

شاہو واہ اور اس کی ذیلی نہروں سے زراعت کا نظام 1932ء تک چلتا رہا۔ اسی سال سکھر بیراج تعمیر ہوا جس سے دنیا کا عظیم الشان نہری نظام قائم کیا گیا۔ سکھر بیراج کی تعمیر کے بعد جمڑاؤ کینال میں مزید پانی بڑھایا گیا اور جمڑاؤ کینال سے ایک نئی نہر نکالی گئی جس کا نام قدیمی شاہو واہ کی مناسبت سے ''شاہو برانچ'' رکھا گیا۔ ''شاہو برانچ'' سے مزید چھوٹی نہریں نکالی گئیں۔ انھی نہروں سے اور شاہو واہ سے آباد ہونے والی زمینیں آباد کی گئیں۔ جو زمینیں ان نہروں سے سیراب ہوتی ہیں ان میں قریہ جعفر خان لغاری اور دیگر نزدیکی دیہات کی زمینیں شامل ہیں۔ (۳)

قریہ جعفر خان لغاری اور اس کے مضافاتی دیہات کی آبادکاری

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحقیق کے مطابق قریہ جعفر خان لغاری اور اس کے مضافات میں موجود تمام گاؤں سنہ ۱۷۰۰ء کے بعد اٹھارھویں صدی عیسوی میں آباد ہوئے۔ ان میں سے زیادہ تر گاؤں ''لغاری'' قبیلے کے افراد کے ہیں۔ لغاری قبیلے کے افراد ڈیرہ غازی خان سے منتقل ہو کر اس علاقے میں آباد ہوئے تھے۔ انگریزوں کے سندھ پر قبضے (۱۸۴۳ء) سے قبل ڈیرہ غازی خان تک سندھ کی سرحدیں تھیں اور یہ علاقہ سندھ میں شامل تھا۔ لغاری قبیلے کے افراد اس علاقے میں عہدِ مغلیہ کے اواخر میں آباد ہوئے۔ اس علاقے میں لغاری قبیلے کے جو بزرگ سب سے پہلے آباد ہوئے ان کا نام ''بعالی خان'' تھا۔ بعالی خان نے ''شہدادو واہ'' نامی نہر کی تعمیر میں بھی حصہ لیا تھا۔ بعالی خان کی اولاد سے چھوٹے بعالی خان تھے۔ چھوٹے بعالی خان کے بیٹے حمزہ خان کے تین بیٹے تھے جن میں بڑے کا نام گھنو خان، درمیانے کا نام مانو خان اور چھوٹے کا دھگانو خان تھا۔ والد کی وفات کے کچھ ہی بعد گھنو خان نے اپنے والد کے مقام پر ہی قیام کیا جبکہ مانو خان نے تقریباً ایک فرلانگ جنوبی سمت میں اور دھگانو خان نے نصف فرلانگ کے فاصلے پر جدا جدا گھر تعمیر کیے۔ گھنو خان کے فرزند کا نام جعفر خان تھا جو تالپوری عہد کے اواخر کی معروف شخصیت تھے اور انھیں کے نام پر قریہ جعفر خان لغاری آباد ہوا۔ قریہ جعفر خان لغاری کے

مضافات میں جو گاؤں آباد ہیں ان میں قریہ محمدانی، قریہ پیروزانی، قریہ فتح محمد جونیجو، قریہ قاسم آرادین، قریہ پلیو خان لغاری، قریہ میر محمد، قریہ صاحبانی، قریہ الھداد لغاری، قریہ سائیں داد لغاری، قریہ ٹھارو لغاری، قریہ گل حسن لغاری، قریہ پیر بخش چاکرانی وغیرہ موجود ہیں۔ یہ تمام گاؤں ۱۷۰۰ء کے بعد آباد ہوئے۔

قریہ جعفر خان لغاری و مضافات کی اقتصادی صورتِ حال

قریہ جعفر خان لغاری اور اس کے مضافات کا علاقہ صدیوں سے بارانی تھا۔ جب اس علاقے میں شہزادو واہ اور اس کے بعد سکھر بیراج سے نکلنے والی نہروں کا پانی پہنچا تو یہ علاقہ نہری نظام سے منسلک ہو گیا۔

۱۸۴۳ء میں سندھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد مقامی لوگوں کو مطیع کرنے کے لیے انگریزوں نے سخت گیری کا آغاز کر دیا۔ انگریزی فوج کے کمانڈر چارلس نیپیر نے سندھ کے تمام با اثر لوگوں کو (جنھیں میروں کی جانب سے اسناد ملی تھیں) اپنے دربار میں طلب کیا۔ اس وقت جعفر خان لغاری ضعیف ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے عزیزوں اور بیٹوں کو مشورے کے لیے طلب کیا کہ اس صورتِ حال میں کیا کیا جائے۔ ان کے صاحبزادے نبی بخش خان نے مشورہ دیا کہ عیسائی حکمرانوں کے آگے نہ جایا جائے اور قومی غیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کیا جائے۔ اس فیصلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جعفر خان کو میروں کی جانب سے عطا کی گئی سند اور زمینوں سے متعلق تمام حقوق واپس لے لیے گئے اور دیگر سہولیات بھی واپس لے لی گئیں۔

انگریزوں کے سندھ پر قبضے سے قبل یہاں کی زیادہ تر زمینوں کے مالک مسلمان تھے۔ سامراجی حکمرانوں نے سندھ پر قبضے کے بعد اپنی حکومت مضبوط کرنے اور عوام میں نفاق پیدا کرنے کی خاطر ہندو اقلیت کو آگے بڑھایا۔ صورتِ حال اس حد تک ابتر ہو گئی کہ ۱۸۶۰ء تک سُود خور ہندو بنیے گاؤں گاؤں پھیل گئے اور ضرورت مند مسلمانوں کو بڑی بڑی رقمیں سود پر دینے لگے۔ مزید یہ کہ رقموں کا حساب اپنے مخصوص رسم الخط میں لکھنے لگے جس سے عام مسلمان ناواقف تھے۔ انگریزوں نے مسلمانوں پر مزید ظلم یہ کیا کہ نئے قوانین کے مطابق اس طرزِ تحریر کو عدالتوں میں تسلیم کیا جانے لگا۔ سندھ کے شرفا عدالتوں میں جا کر ذلّت اٹھانے سے بہتر یہ سمجھتے کہ ہر قیمت پر سُود خور ہندوؤں سے معاہدہ کر لیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صورتِ حال مسلمانوں کے لیے دن بہ دن خراب

سے خراب تر ہوتی گئی۔ ہندو سود خور مسلمانوں سے چال بازیاں کر کے زمینیں اپنے قبضے میں لینے لگے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۹۳۰ء تک سندھ کی چالیس فیصد بہترین زمینیں سود خور ہندوؤں کے قبضے میں جا چکی تھیں۔(۴)

۱۹۳۲ء میں سکھر بیراج کی تعمیر کے بعد نیا نہری نظام قائم کیا گیا۔ اسی نظام کے تحت شاہو واہ سے اس علاقے کی زمینیں آباد ہونے لگیں اور سال میں دو دو فصلیں ربیع اور خریف کی ہونے لگیں۔

۱۹۴۷ء میں تقسیمِ برّصغیر کے بعد ہندوؤں کی اکثریت سندھ چھوڑ کر ہندوستان منتقل ہوگئی۔ ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی زمینیں ہندوستان سے آنے والوں کو دی گئیں۔ اس دوران مقامی باشندوں کو ہندوؤں کی چھوڑی زمینیں نہ ملیں۔ مہاجرین کو زراعت کا تجربہ نہ تھا، انہوں نے زمینیں دوبارہ مقامی سندھیوں کو فروخت کر دیں۔

نہری نظام کے آنے اور تقسیم برصغیر کے بعد مسلمانوں کے مقامی حالات بہتر ہوئے۔ ان حالات کے نتیجے میں تعلیم کی طرف عوام کی توجہ ہوئی اور کاروبار میں بھی اضافہ ہوا۔ اس علاقے میں ابتدائی تعلیم کا سلسلہ قیامِ پاکستان سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا جس میں بعد میں بے حد اضافہ ہوا۔ نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگے۔ سرکاری نوکریوں کی جانب رجحان بڑھا اور ۱۹۸۰ء کے بعد قریہ جعفر خان لغاری و مضافاتی دیہات میں سرکاری نوکری کرنا ایک عام ذریعۂ معاش بن چکا تھا۔(۵)

قریہ جعفر خان لغاری و مضافات میں تعلیمی ترقی

قریہ جعفر خان لغاری اور دیگر قریوں میں تعلیمی ترقی میں خاصا وقت لگا۔ تالپوروں کے عہد میں ہر دیہات میں ابتدائی مکتبی تعلیم کی سہولت موجود تھی۔ اس مکتبی تعلیم کے علاوہ گھریلو خواتین بھی بچیوں کو گھروں ہی میں قرآن مجید کی تعلیم دیتی تھیں۔ جب انگریزوں نے ۱۸۴۳ء میں سندھ پر قبضہ کیا تو شہروں میں اسکولی تعلیم کا آغاز ہوا اور دیہات میں مکتبی تعلیم کا خاتمہ ہونے لگا۔ انگریزوں کے قبضے کے بعد تقریباً سو برس تک دیہات میں پرائمری تعلیم کا مناسب انتظام نہ ہو سکا۔ اس کے بعد جب اسکولی تعلیم کا آغاز ہوا تو ابتدا میں انگریزوں کی سرپرستی کی وجہ سے ہندوؤں کے دیہات میں اسکول کھولے گئے۔ سرکاری حلقوں میں یہ ماحول پیدا کیا گیا کہ مسلمان

بچوں کو تعلیم کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس وقت کے ہندو معاشرے میں ایک عام قول رائج تھا کہ ''جٹوں کے بچے پڑھ کر کیا کریں گے''۔ عام ہندو، مسلمانوں کو جَٹ یعنی گنوار کہا کرتے تھے۔

۱۹۰۰ء تک دیہات میں تعلیم کا یہ عالم تھا کہ قریہ جعفر خان لغاری میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے دادا عرض محمد گو کہ کسان تھے لیکن قرآن مجید پڑھ چکے تھے اور ابتدائی دینی ارکان سے واقف تھے۔ ۱۸۹۶ء کی حُروں کی تحریک (۶) کے بعد انگریز حاکموں کی سختی مزید بڑھ گئی اور انھوں نے شہداد پور، سنجھورو اور سانگھڑ کے دیہات میں پرائمری اسکولوں کا قیام مزید مشکل بنا دیا۔ اسی وجہ سے پیر صاحب پگارا جناب شاہ مردان شاہ (۷) نے خانگی مکاتب کا آغاز کیا۔ قریہ جعفر خان لغاری کا نزدیک ترین مکتب شہداد پور تعلقہ میں ملّا رحمت کے گاؤں میں تھا جہاں قریہ جعفر خان لغاری کے دو تین بچوں نے دو سال تک مکتبی تعلیم حاصل کی۔ تقریباً ۱۹۰۰ء میں پہلے ڈٹھڑو اور اس کے بعد قریہ پلیو لغاری میں جہاں ہندو مقیم تھے، سرکاری اسکول منظور کیے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں ڈٹھڑو میں سندھی سکول کھلا جہاں ان دیہات کے بچوں نے دو تین جماعتوں تک تعلیم حاصل کی۔

۲۲۔۱۹۲۱ء میں قریہ پلیو لغاری میں پہلے سے بند پرائمری اسکول میں دوبارہ تعلیم کا آغاز ہوا جس میں اِرد گرد کے دیہات کے تقریباً دس پندرہ مسلمان اور باقی سب ہندوؤں کے بچے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ان مسلمان بچوں میں صرف ایک بچہ ایسا تھا جس نے سچی علمی لگن کا مظاہرہ کیا اور تمام مشکلات کے باوجود چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس بچے کا نام نبی بخش بلوچ تھا۔

قریہ جعفر خان لغاری میں پہلے پرائمری اسکول کا آغاز

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے تعلیم کے بارے میں صرف کتابی تحقیق ہی نہیں کی بلکہ فروغِ علم کے لیے عملی جدوجہد بھی کی۔ بلوچ صاحب جب ۱۹۴۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے تو انھیں شدّت سے احساس ہوا کہ ان کے اپنے گاؤں میں پرائمری اسکول تک نہیں جہاں بچے تعلیم حاصل کر سکیں۔ اسی احساس کے تحت جب آپ گرمیوں کی چھٹیوں میں مسلم یونیورسٹی سے قریہ جعفر خان لغاری پہنچے تو ڈسٹرکٹ لوکل بورڈ ضلع نواب شاہ میں پرائمری اسکول کھولنے کے لیے درخواست دی۔ اس کی اصل وجہ یہ

تھی کہ اس دور میں پرائمری تعلیم اور پرائمری اسکولوں کا نظام ڈسٹرکٹ اسکول بورڈ کے تحت تھا۔ قریہ جعفر خان لغاری تعلقہ سنجھورو میں واقع تھا اور سنجھورو اُس وقت ضلع نواب شاہ میں شامل تھا۔ سنجھورو کے گاؤں جراڑی کا ہندو زمیندار سیٹھ دیارام اس زمانے میں نواب شاہ ڈسٹرکٹ اسکول بورڈ کا رکن تھا۔ اس نے مسلمانوں سے تعصّب کا مظاہرہ کرتے ہوئے بورڈ کی پہلی ہی میٹنگ میں اسکول کھولنے کی شدید مخالفت کی۔ اس نے یہ بہانہ بنایا کہ اسکول کھولنے سے حکومت کا پیسہ ضائع ہوگا کیونکہ دیہاتی مسلمان بچوں کو پڑھنے کا بالکل شوق نہیں جس کی بنا پر قریہ پلیو خان لغاری میں اسکول بند کرنا پڑا۔ سیٹھ دیارام کی اسی مخالفت کی وجہ سے اسکول کھولنے کی منظوری نہ مل سکی۔ (۸)

ہندو سیٹھ دیارام کے تعصّب اور اس حوصلہ شکن صورتِ حال کے باوجود بلوچ صاحب نے ہار نہ مانی اور دوبارہ درخواست پیش کی اور اسکول بورڈ کے مسلمان رکن گاھی بھنبھرو سے ملے اور اس سے اسکول کھولنے کے لیے پُرزور اصرار کیا۔ اس نے یہ عذر پیش کیا کہ ہم کیا کریں، سیٹھ دیارام مخالفت کر رہا ہے؟ بلوچ صاحب نے اس سے کہا کہ آپ تمام مسلمان ارکان کیا اس قدر مجبور ہیں اور اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اسکول کھولنے کے حق میں بول سکیں؟ آپ خود آ کر دیکھیں کہ اسکول کی واقعی ضرورت ہے یا نہیں؟ بالآخر بلوچ صاحب کی مسلسل کوشش کے نتیجے میں قریہ جعفر خان لغاری میں پہلا پرائمری اسکول کھولنے کی اجازت ۱۹۴۴ء میں مل گئی (۹)۔ اس بارے میں جھول شہر کے سیاست دان میر اللہ بخش خان تالپور مرحوم نے بلوچ صاحب کی مدد بھی کی اور رہنمائی بھی۔ اسکول تو منظور ہو گیا لیکن اس کے لیے جگہ نہیں تھی، دوسرے یہ مسئلہ بھی درپیش تھا کہ بلوچ صاحب کی گرمیوں کی چھٹیاں بھی قریب الختم تھیں اور انھیں واپس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جانا تھا۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جانے سے قبل اسکول کا انتظام اور تعلیم کا آغاز ہو جائے تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ اسکول تو منظور کرا لیا مگر کوئی پڑھنے والا ہی نہیں۔ اس مشکل کا حل بلوچ صاحب نے یوں نکالا کہ گاؤں میں مورو فقیر لغاری کا بغیر چھت والا مکان خالی پڑا تھا جس کے بیٹے حاجی مصری نے بلوچ صاحب کے کہنے پر بخوشی اسکول کے لیے یہ جگہ پیش کی۔ بلوچ صاحب نے گاؤں کے بعض احباب کے ساتھ مل کر اپنے ہاتھوں سے لکڑیوں کی چھت بنائی اور ایک نزدیکی گاؤں کے اسکول سے سادہ فرنیچر لا کر رکھا۔ یہ فرنیچر اس لیے بھی آسانی سے مل گیا کہ اس گاؤں کا اسکول بند پڑا تھا۔ یہ زمانہ اس لحاظ سے بڑا اہم تھا کہ پیر صاحب پگارا کے مرید حُر مجاہدین انگریزوں کے خلاف جہاد میں مصروف تھے اور یہ علاقہ ان کا خاص

مرکز تھا۔ ان حالات میں اسکول کا آغاز کرنا اہم کارنامہ تھا۔ یہی پرائمری اسکول قریہ جعفر خان لغاری اور قریبی دیہات میں فروغِ تعلیم کا نقطۂ آغاز بنا۔ اس کے بعد دیگر قریبی دیہات میں بھی اسکول کھلے۔ تا دمِ تحریر (۲۰۱۷ء میں) اس علاقے میں تعلیم کا اس حد تک فروغ ہوا ہے کہ نزدیکی دیہات میں کُل ۲۳ پرائمری اسکولوں میں تعلیم دی جارہی ہے۔(۱۰)

بلوچ صاحب کو اپنے علاقے کی تعلیمی ترقی کا اس قدر خیال تھا کہ انھوں نے پرائمری اسکول کے بعد مزید تعلیم کے لیے پہلے مڈل اور پھر ہائی اسکول کی منظوری کے لیے کوششیں کیں چنانچہ ۱۹۴۹ء میں لڑکوں کا مڈل اسکول، ۱۹۷۳ء میں لڑکیوں کا مڈل اسکول، ۱۹۸۱ء میں لڑکوں کا ہائی اسکول اور ۱۹۹۷ء میں لڑکیوں کے ہائی اسکول کا آغاز ہوا۔

قریہ جعفر خان لغاری میں بچّیوں کی تعلیم اور اس کے فروغ کے لیے بھی بلوچ صاحب اور ان کے خاندان کے افراد نے اہم کردار ادا کیا۔ اس مقصد کے لیے بلوچ صاحب کی صاحبزادی محترمہ حمیدہ بلوچ نے تمام ذمّے داریاں سنبھالیں۔ وہ بچیوں کے پرائمری اسکول اور اس کے بعد مڈل اسکول کی پہلی استانی اور ہیڈ مسٹریس بنیں۔ قریہ جعفر خان لغاری میں لڑکیوں کا مڈل اسکول اور اس کے بعد ہائی اسکول بلوچ صاحب کی والدہ محترمہ مائی صاحبزادی کے نام پر کھولا گیا۔ مائی صاحبزادی وہ نیک دل خاتون تھیں جنھوں نے ۱۹۴۰ء سے قبل گاؤں کی بچیوں کو اپنے گھر میں قرآن پڑھانے کا انتظام کیا تھا۔

بچیوں کی تعلیم کے لیے بلوچ صاحب کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ تا دمِ تحریر (۲۰۱۷ء میں) قریہ جعفر خان لغاری اور قریبی دیہات میں ۲۱ گرلز اسکول کُھل چکے ہیں اور وہاں باقاعدہ تعلیم دی جارہی ہے۔

اپنے گاؤں میں تعلیم کے فروغ کے حوالے سے ڈاکٹر بلوچ مرحوم کی یہ بھی دلی خواہش تھی کہ ان کے گاؤں یعنی قریہ جعفر خان لغاری میں اعلیٰ تعلیم کا بھی انتظام ہو جائے اور اس کی خاطر یہاں ایک کالج قائم کیا جائے ۔اس نیک مقصد کی خاطر ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی ہی میں یہ انتظام کیا کہ اپنی ذاتی صرفے سے تقریباً چھے ایکڑ زمین اس مقصد کی خاطر وقف کر دی تھی ۔زمین کا یہ پلاٹ اب تک گاؤں میں خالی ہے جہاں ان شاء اللہ مستقبل میں ایک کالج قائم ہوگا۔

بلوچ صاحب کی اپنے گاؤں اور قریبی دیہات میں تعلیمی ترقی کے ثمرات آج دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان تعلیمی اداروں سے زیورِ علم سے آراستہ افراد آج بڑی تعداد میں ڈاکٹر، انجینیر ' وکیل، پروفیسر، بینکار اور سرکاری افسران مختلف میدانوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس تمام روداد سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بلوچ صاحب محض ایک نصابی ماہرِ تعلیم ہی نہیں تھے بلکہ ایک ایسے دانش ور اور عالم تھے کہ انھوں نے کتابی کام کے علاوہ عملی میدانوں میں بھی خدمات انجام دیں اور تعلیمی ترقی کے لیے کوششیں کیں۔ راقم الحروف سے ایک ملاقات کے دوران بلوچ صاحب نے فرمایا تھا کہ کسی بھی قوم کا اصل اسلحہ اس کی تعلیم ہوتی ہے اور ہم اگر دنیا میں باعزت زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ہمیں تعلیم اور خصوصاً ابتدائی تعلیم پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

حواشی باب نمبر 1

۱۔دیکھیے کتاب ''اسان جو ڳوٺ جعفر خان لغاري ''(ہمارا گاؤں جعفر خان لغاری) از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ،ص ۵ تا ۷

۲۔ایضاً ص ۷

۳۔ایضاً ص ۱۱

۴۔ایضاً ص ۲۴،۲۵۔مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمایئے پیر علی محمد راشدی کی کتاب ''اُهي ڏينهن اُهي شينهن'' (وہ دن وہ سُورما) جلد نمبر ۲،ص:۲۶۲۔

۵۔ایضاً ص ۲۷

۶۔حُروں کی تحریک اور گوریلا جنگوں کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں ''تذکرہ پیرانِ پاگارہ'' از تبسّم چوہدری' صفحہ نمبر ۱۵۱ تا ۱۵۸

۷۔پیر صاحب پاگارہ شاہ مردان شاہ اوّل حُروں کے پانچویں پیر تھے۔آپ ۱۸۶۰ء میں اپنے بھائی سید علی گوہر شاہ کے انتقال کے بعد پیر پاگارہ ہوئے۔اُس وقت انگریزوں کی غلط اور ظالمانہ پالیسیوں کی وجہ سے حُر مجاہدین بڑے مشتعل تھے اور اسی وجہ سے حُروں نے بڑے پیمانے پر گوریلا جنگیں کیں۔پیر مردان شاہ اوّل کا انتقال ۹ نومبر ۱۹۲۱ء کو ہوا۔تدفین پیر جو گوٹھ (ضلع خیر پور) میں ہوئی۔

۸۔ایضاً ص ۳۳

۹۔دیکھیے کتاب ''اسان جو ڳوٺ جعفر خان لغاري ''(ہمارا گاؤں جعفر خان لغاری) از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ،ص ۳۲

۱۰۔اسکولوں کے یہ اعداد و شمار مولف کو جناب محمد ارشد بلوچ (ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مرحوم کے پوتے) کی عنایت سے معلوم ہوئے۔

باب نمبر2

ابتدائی حالاتِ زندگی اور تعلیم

آباواجداد

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کے آباواجداد کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے تھا۔آپ کے بزرگوں کا تعلق لغاری قبیلے سے تھا جو تقریباً تین سو برس قبل نقلِ مکانی کر کے سنجھورو (ضلع سانگھڑ) میں آباد ہوئے۔جیسا کہ گزشتہ باب میں ذکر آیا، ڈاکٹر صاحب کے جدّ امجد کا نام جعفر خان لغاری تھا جنھوں نے اندازاً 1800ء کے لگ بھگ تعلقہ سنجھورو میں ایک گاؤں آباد کیا جو آج بھی گوٹھ جعفر خان لغاری (یعنی قریہ جعفر خان لغاری) کے نام سے معروف ہے(۱)۔یہی گاؤں بلوچ صاحب کی جائے پیدائش ہے اور اب دنیا بھر میں انھی کی نسبت سے پہچانا جاتا ہے۔

جعفر خان لغاری

جیسا کہ ذکر آیا جعفر خان لغاری تالپوری عہد کی اہم شخصیت تھے۔وہ بڑے بہادر اور جری انسان تھے۔جب انگریزوں نے 1843ء میں سندھ پر قبضہ کیا تو جنرل چارلس نیپیر (جس نے سندھ پر قبضہ کرنے والی فوج کی کمان کی تھی) کی جانب سے پورے سندھ کی اہم شخصیات کے نام سرکلر پہنچے کہ اُس کے دربار میں حاضر ہوں۔اس نازک موقعے پر جعفر خان لغاری نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا اور قومی غیرت کے سبب وہ چارلس نیپیر

کے دربار میں نہیں پہنچے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ انگریز حکّام کے زیرِ عتاب آ گئے اور مالی مشکلات کا شکار ہوئے۔

(۲)

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تاریخ و جائے پیدائش اور بچپن کی یادیں

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے ابتدائی اسکول کے رجسٹر کے مطابق آپ کی تاریخِ پیدائش 16/دسمبر 1917ء لکھی گئی ہے اور یہی تاریخ بعد میں مختلف اسناد میں درج کی گئی۔ البتہ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس عہد میں عموماً اسکول میں داخلے کے وقت بچوں کی عمر زیادہ لکھائی جاتی تھی تاکہ زیادہ عمر کی وجہ سے نوکری جلد مل جائے۔ خود بلوچ صاحب کے مطابق ان کی پیدائش مارچ 1919ء میں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کی پیدائش قریہ جعفر خان لغاری میں ان کے نانا لعل بخش خان کے گھر ہوئی۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا ایک مفصل انٹرویو سندھی نیوز چینل کے ٹی این میں ان کی زندگی کے آخری دور میں آیا تھا۔ ہمیں اس انٹرویو کی کاپی ڈاکٹر بلوچ کے پوتے جناب ارشد بلوچ کی عنایت سے ملی۔ اس انٹرویو میں ایک مقام پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی پیدائش کے بارے میں بتایا تھا:

"میرے چچا ولی محمد نے مجھے بتایا تھا کہ تم بہار (فروری مارچ) کے میں پیدا ہوئے تھے۔"

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے اپنی یادوں پر مشتمل کتاب سنڌ جو ذهين ٻار ڊاڪٽر نبي بخش خان بلوچ (سندھ کا ذہین بچہ۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) میں اپنے بچپن کی یادوں کی تفصیلات بیان کی تھیں۔ انھی یادوں میں سے ایک کے بارے میں انھوں نے فرمایا تھا:

"مجھے اب تک یاد ہے کہ میں ابھی شیر خوار تھا تو میں لالٹین کو دیکھا کرتا تھا۔ بڑا ہو کر میں نے ایک دفعہ اپنی والدہ سے کہا کہ جب میں بہت چھوٹا تھا محض چند ماہ کا اس وقت آپ یہاں سے لالٹین اٹھا کر دوسری جالی میں رکھتی تھیں۔ یہ سن کر میری والدہ بہت حیران ہوئی تھیں کہ تم اس وقت محض چند ماہ کے تھے اور جو بات تم نے بتائی حقیقتاً ایسا ہی ہوتا تھا۔"

شجرہ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ
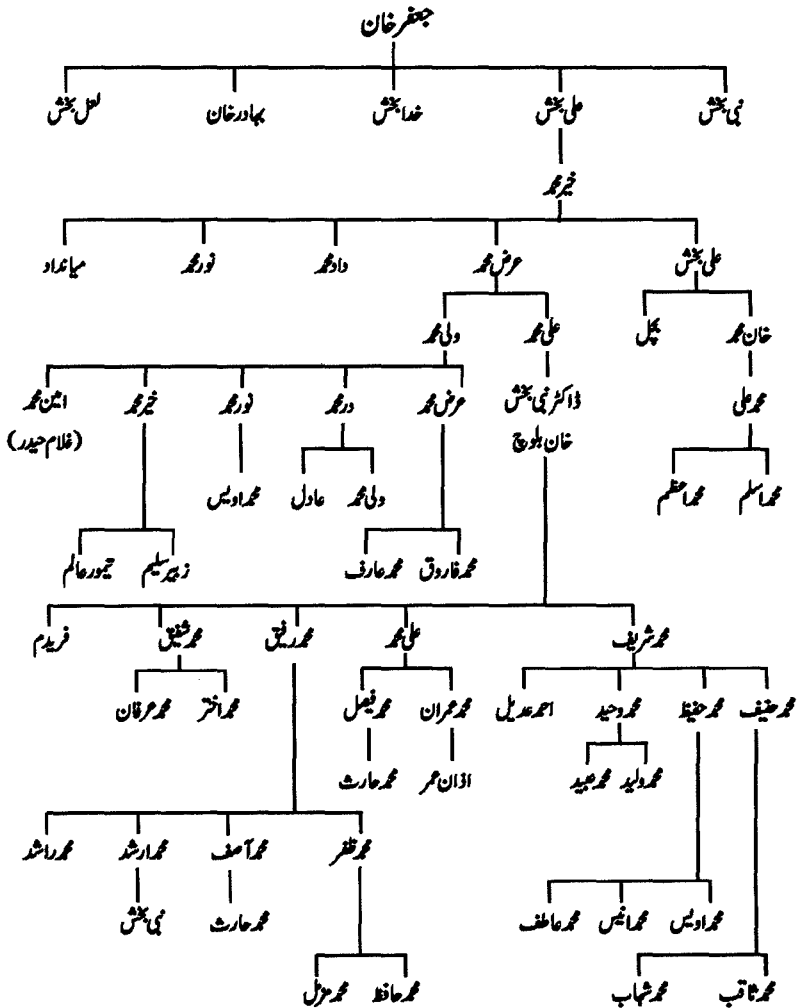
والد کا انتقال اور ابتدائی قرآنی تعلیم

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ابھی محض چھ ماہ ہی کے تھے کہ آپ کے والدِ محترم علی محمد خان کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد آپ کی پرورش کی ذمّے داری آپ کے دادا عرض محمد خان نے سنبھالی۔ عرض محمد خان ایک نیک، شفیق اور دین دار بزرگ تھے۔ وہ اس وقت نابینا ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود کم سن پوتے سے انتہائی شفقت کا برتاؤ کرتے اور اپنے ساتھ ہی سلاتے۔ بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ وہ انتہائی نیک، نمازی اور تہجّد گزار بزرگ تھے۔ انھوں نے ہی ڈاکٹر بلوچ کو ابتدائی قرآنی تعلیم دی۔ ابتدا میں انھوں نے الحمد شریف اور آخری پارے کی سورتیں یاد کرائیں۔ جب بلوچ صاحب کی عمر تقریباً چار برس کی تھی تو شفیق دادا کا بھی انتقال ہوگیا۔ اُس کے بعد آپ کی والدہ محترمہ نے آپ کو قرآن پڑھایا۔ (۳)

والدِ محترم کی وصیّت

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے والدِ محترم کا نام علی محمد خان تھا۔ جب کم سن نبی بخش محض چھ ماہ کے تھے تو ان کے والد علی محمد خان کا محض 25/ برس کی مختصر عمر میں انتقال ہوگیا۔ انتقال سے قبل اپنے والدِ محترم کی وصیّت کے بارے میں بلوچ صاحب نے مورخہ 30 جون 2006ء کو راقم الحروف سے فرمایا:

> ''ہمارے ہاں روایت ہے کہ جب کسی انسان کا وقتِ آخر قریب ہو تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ کی وصیّت کیا ہے؟ جب میرے والد سے یہ پوچھا گیا تو انھوں نے صرف یہ جملہ کہا: ''میرے بچے کو پڑھانا'' اور آنکھیں بند کرلیں۔ اُس وقت وہاں میرے چچا ولی محمد خان موجود تھے۔ انھوں نے اس وصیت پر نہ صرف عمل کیا بلکہ مجھ سے بھی کرایا۔ انھوں نے میری ابتدائی تعلیم کا بہتر سے بہتر انتظام کیا۔ وہ بچپن میں مجھ سے اکثر کہتے کہ میں نے اپنے بھائی کو یہ کہتے سُنا تھا اس لیے میں آپ کو ضرور پڑھاؤں گا اور پڑھائے بغیر نہ چھوڑوں گا۔'' (۴)

چچا کا یہی عہد آگے جا کر دُور رس نتائج کا حامل ہوا۔ایک انٹرویو میں بلوچ صاحب نے بیان کیا تھا کہ ان کے والد تعلیم نہیں حاصل کر سکے تھے اور انھیں اس بات کا بڑا احساس تھا۔اسی وجہ سے انھوں نے اپنے بیٹے کو تعلیم دلانے کی وصیت کی تھی۔بلوچ صاحب کے والدِ محترم کا کاشت کاری سے تعلق تھا۔

اسی انٹرویو میں بلوچ صاحب نے فرمایا تھا کہ ان کی والدہ محترمہ مائی صاحب زادی کا انتقال 1941ء میں ہوا تھا۔

دادا کی محبت آمیز یادیں

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے اپنی یادوں پر مشتمل کتاب سنڌ جو ذهين ٻار ڊاڪٽر نبي بخش خان بلوچ (سندھ کا ذہین بچہ۔ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) میں اپنے بچپن کی ان یادوں کی تفصیلات بیان کی تھیں جن کا تعلق ان کے دادا سے تھا۔یہاں ہم ان عبارات کا سلیس اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں:

> بچپن میں جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو اس عمر میں میں اپنے دادا عرض محمد خان کے پاس رہنے لگا۔وہ پڑھے لکھے آدمی تھے اور بہت ہی نیک بزرگ تھے۔وہ قرآن پڑھے ہوئے تھے،نماز پڑھاتے تھے،نکاح پڑھاتے تھے اور قرآن بھی پڑھاتے تھے۔میں جب ان کے پاس پہنچا وہ آنکھوں سے نابینا ہو چکے تھے۔ان کی داڑھی سفید ہو چکی تھی اور وہ میانہ قد کے آدمی تھے۔وہ سر پر ہمیشہ سفید رنگ کی ٹوپی پہنتے تھے۔ان دنوں وہ ہمارے گاؤں سے نزدیکی ایک گاؤں میں ایک بزرگ خاتون کو جن کا نام 'مائی بھاگ بھری' تھا وہ قرآن شریف پڑھانے جاتے تھے۔چونکہ وہ نابینا ہو چکے تھے اس لیے وہ خاتون قرآن پڑھتیں اور اگر کہیں غلط پڑھتیں تو میرے دادا ان کی اصلاح کرتے۔جمعہ کے دن میرے دادا مجھے گاؤں کی مسجد میں لے جاتے۔یہ مسجد میری دادا نے ہی بنوائی تھی۔مجھے بخوبی یاد ہے کہ اس مسجد میں نیلے رنگ کی ایک خوبصورت دستی تصویر بھی تھی جس میں کعبۃ اللہ اور اس کے گرد کا ماحول دکھایا گیا تھا۔مجھے اسے دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا اور میں

یہی کہتا تھا کہ جمعہ کا دن کب آئے گا کہ میں مسجد میں جاؤں گا اور اسے دیکھوں گا۔ مسجد پہنچ کر دادا مجھے کہتے کہ میں نماز پڑھوں گا، تم بیٹھو۔ میں کہتا کہ میں بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔ جب وہ نماز میں سجدے میں جاتے تو میں ان کے کاندھے پر چڑھ کر بیٹھ جاتا اس کے بعد وہ اپنے سجدے کو طویل کر دیتے، اگر سجدے سے اٹھتے تو میں ان سے چپک جاتا جس پر وہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھتے تاکہ میں ان کے کاندھے سے اتر جاؤں۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ مجھے دادا سے بے حد محبت تھی۔ وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتے اور مجھے قرآن شریف پڑھاتے تھے۔ انھوں نے مجھے قرآن شریف کی کئی سورتیں بھی یاد کرائیں جن میں 'قل اعوذ برب الناس' سے 'اذا جاء نصر اللہ' تک کی سورتیں شامل ہیں۔ اگر وہ مزید وقت زندہ رہتے تو مزید سورتیں یاد کراتے لیکن وہ بیمار پڑ گئے اور اسی بیماری میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس روز ایک آدمی نے مجھ سے کہا: "تمھارے دادا گزر گئے" اور کفن دفن کے لیے بہت سے آدمی آئے تھے۔ لیکن میں اتنا چھوٹا تھا کہ کچھ سمجھ نہ سکا کہ اس کے اس جملے کے کیا معنیٰ ہیں اسی وجہ سے میں دادا کے انتقال پر بالکل نہیں رویا تھا۔

دادا کے انتقال کے بعد مجھ میرے چاچا ولی محمد اپنے گھر لے گئے۔ میرے والد کے انتقال کے بعد ان کی شادی ہوئی تھی اور گھر میں کوئی بچہ نہیں تھا۔ ان دو میاں بیوی کے علاوہ میں ہی گھر میں بچہ تھا۔ اس دور کی مجھے یہ بات یاد ہے کہ ان کے گھر میں چند بکریاں تھیں جن سے میں کھیلا کرتا تھا۔ ان بکریوں کے مختلف نام بھی تھے اور مختلف رنگ بھی۔

تعلیمی مراحل کے لیے چچا کا کردار

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کے والدِ محترم کے انتقال کے وقت آپ کی عمر محض چھ ماہ تھی۔ ہوش سنبھالنے کے بعد آپ کے چچا ولی محمد خان نے ہر ہر موقعے پر آپ کی تعلیم پر توجہ دی۔ اس زمانے میں قریہ جعفر خان لغاری میں کوئی باقاعدہ اسکول نہیں تھا اس لیے چچا نے انھیں گاؤں کے ہندو استاد وسومل کے پاس

ابتدائی تعلیم کے لیے بھیجا جہاں آپ نے ابتدائی حروفِ تہجّی اور اعداد سیکھے۔ اس کے بعد آپ کے چچا نے قریہ پلیو خان لغاری کے پرائمری اسکول میں آپ کو داخل کرادیا۔ یہ واقعہ 1924ء کا ہے۔ تعلیمی مراحل کی نگرانی کے حوالے سے بلوچ صاحب نے راقم الحروف سے فرمایا:

''پرائمری اسکول کی تعلیم کے دوران بھی میرے چچا نے بھرپور نگرانی کی۔ ہمارے اسکول کے ایک استاد بچوں کو بہت مارتے تھے۔ ایک روز اُن کے ڈر سے میں اسکول سے بھاگ نکلا لیکن میرے چچا نے مجھے تلاش کیا اور اسی وقت اسکول لے گئے اور استاد کے سامنے حاضر کیا۔ اس زمانے میں وہ اکثر مجھ سے یہی کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنے بھائی کو آپ کی تعلیم کے لیے وصیّت کرتے سُنا تھا اس لیے میں آپ کو ضرور پڑھاؤں گا اور پڑھائے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔''(۵)

اسی ملاقات کے دوران بلوچ صاحب نے اپنے چچا سے متعلق مزید فرمایا:

''میرے چچا انسانی لحاظ سے عظیم انسان تھے۔ انھوں نے اپنے بھائی کی خواہش پوری کی۔ میں ہمیشہ ان کا ممنون رہا اور اب بھی ہوں۔ ان کا انتقال 1980ء میں ہوا۔''(٦)

ابتدائی تعلیم کے صبر آزما مراحل اور کامیابی

بلوچ صاحب کا بچپن غربت کے ماحول میں گزرا تھا لیکن ان کی شخصیت کا یہ نہایت روشن پہلو ہے کہ زندگی میں کبھی بھی مشکل حالات سے انھوں نے ہار نہ مانی اور حصولِ علم کی سچی لگن کی بنا پر تمام مشکلات کا نہایت کامیابی سے مقابلہ کرتے رہے۔ ایک انٹرویو میں بلوچ صاحب نے ان حالات سے متعلق کچھ یوں فرمایا تھا:

''مجھے ابتدائی پرائمری تعلیم کے لیے قریہ پلیو خان لغاری کے سندھی اسکول میں داخل کرایا گیا تھا۔ وہ ہمارے گھر سے کوئی دو میل دور تھا۔ وہاں ہم چل کر جاتے تھے۔ اس زمانے میں غربت تھی اور مجھے یاد ہے کہ میرے پاؤں میں جوتے نہیں ہوتے تھے اور

پاؤں میں بہت کانٹے چبھتے تھے۔ برسات ہوتی تو پانی جمع ہو جاتا، اُس سے گزر کر ہم
جاتے۔ ابھی تک مجھے یاد ہے کہ سردیوں میں پانی کتنا ٹھنڈا ہوتا تھا اور گرمیوں میں وہ پانی
اتنا گرم ہو جاتا کہ پاؤں جل جاتے۔ وہاں ہم نے کوئی پانچ سال تعلیم حاصل کی۔ چوتھی
جماعت میں تھے کہ ایک انسپکٹر صاحب امتحان لینے آئے۔ انھوں نے میرے بارے میں
کہا کہ یہ بچہ ذہین ہے، اسے اسکالرشپ دلوایا جائے اور مزید تعلیم کے لیے ہائی اسکول میں
بھیجا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان انسپکٹر صاحب کا یہ نوٹ میرے لیے کافی تعریف دہ
ثابت ہوا اس سے مزید تعلیم حاصل کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔'' (۷)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے اپنی یادوں پر مشتمل کتاب سنڌ جو ذهين ٻار ڊاڪٽر نبي بخش خان
بلوچ (سندھ کا ذہین بچہ۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) میں اپنی ابتدائی تعلیم کی تفصیلات بیان کی تھیں۔ اس حوالے
سے انھوں نے فرمایا تھا:

''میں تقریباً پانچ سال کا تھا کہ میرے چاچا نے کہا کہ وفات سے قبل میرے
والد علی محمد خان نے وصیت کی تھی کہ میرے بچے کو پڑھانا، اس کے بعد انھوں نے آنکھیں
بند کر دی تھی۔ چچا نے کہا کہ یہ میرے بھائی کی وصیت ہے چنانچہ میں تمھیں ضرور پڑھاؤں
گا اور پڑھائے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ اس وقت گاؤں میں کوئی اسکول نہیں تھا اس لیے گاؤں
کے بنیے وسومل کے پاس مجھے چھوڑا جس سے میں نے ابتدائی گنتی سیکھی۔ اس کے بعد انھوں
نے گاؤں کی مسجد کے امام جن کا نام عزیز اللہ ڈتو فقیر تھا چھوڑا اور ان سے کہا کہ مجھے قرآن
شریف پڑھائیں۔ میرے دادا نے مجھے 'اذا جاء نصر اللہ' تک کی سورتیں یاد کرائیں تھیں اس
کے بعد کی دو ایک سورتیں امام مسجد نے یاد کرائیں۔ درمیان میں میری والدہ مرحومہ نے بھی
مجھے قرآن پڑھایا۔

انھی دنوں یہ اطلاع ملی کے ہمارے گاؤں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر گوٹھ

پلیو خان لغاری میں سندھی اسکول کھلا ہے۔سندھی اسکول اس زمانے میں وہاں کھولے جاتے جہاں ہندو ہوتے، مسلمانوں کے گاؤں میں اسکول نہیں کھولے جاتے تھے۔وہاں استاد محمد یوسف سومرو بحیثیت استاد آئے جن کا گھر شہر کھڈڑو میں تھا۔میرے چاچا نے مجھے اس اسکول میں داخل کرادیا جہاں میں نے چار درجے سندھی تک تعلیم حاصل کی (۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ءتک)۔اس زمانے میں غربت کی وجہ سے ایسا نہیں ہوتا تھا کہ ہر بچہ روزانہ پیسے لے کر اسکول پہنچے۔جس روز چار پانچ پیسے جمع ہو جاتے تو استاد اپنی جانب سے مزید پیسے شامل کر کے دال خریدتے اور دال پکتی۔پھر ہم دال روٹی کھاتے تھے۔انھی دنوں کی بات ہے کہ استاد قلندر بخش ہمارے اسکول میں آئے اور حساب کے زبانی سوالات کیے ۔ایک سوال پر چھٹے درجے کے لڑکے خاموش رہے لیکن میں نے ہاتھ اٹھا دیا۔یہ دیکھ کر انھوں نے کہا کہ اتنے چھوٹے لڑکے نے ہاتھ اٹھایا ہے، آخر کیا بات ہے؟اس پر استاد یوسف نے کہا کہ یہ لڑکا دوسرے درجے میں پڑھتا ہے لیکن معلوم نہیں کیوں اس نے ہاتھ اٹھایا ہے۔اس پر انھوں نے وہی سوال مجھ سے کیا۔میں نے فوراً اس کا درست جواب دیا۔اس جواب پر وہ اس قدر خوش ہوئے کہ بطور انعام مجھے چار آنے دیے۔

میں ابھی چوتھے درجے میں ہی تھا کہ استاد جیٹھانند پڑھانے آئے ۔وہ پڑھاتے بہت اچھا تھے لیکن ڈنڈے سے بہت مارتے تھے۔ایک مرتبہ انھوں نے مجھے سزا دی جس سے مجھے بہت تکلیف ہوگئی اور میں اسکول سے دو دفعہ بھاگ گیا لیکن دونوں دفعہ میرے چاچا نے مجھے تلاش کیا اور اسکول چھوڑ آئے۔ان مواقع پر انھوں نے مجھ سے کہا :''تمہارے والد نے کہا تھا کہ میرے بیٹے کو پڑھانا اس لیے میں تمھیں پڑھائے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔چلو میں تمھیں اسکول چھوڑ آؤں۔

۱۹۲۸ء میں ہمارے اسکول میں چوتھے درجے کا امتحان ہوا۔معلوم ہوا کہ امتحان لینے 'صاحب' آئے ہیں۔یہ نوشہرو فیروز کے محمد بخش میمن صاحب تھے۔انھوں نے

جب امتحان لیا تو میرے جوابات انھیں اس قدر پسند آئے کہ میرے نام کے ساتھ وزیٹرز بک Visitors' Book میں یہ الفاظ لکھے: ''یہ لڑکا بہت ہوشیار ہے، اسے انگریزی پڑھانا چاہیے''۔ صاحب تو یہ لکھ گئے لیکن یہ علم نہیں تھا کہ آخر انگریزی کہاں سے پڑھی جائے؟ یہ استاد کے علم میں بھی نہیں تھا۔ اس زمانے میں استاد سندھی کے سات درجے تک تعلیم حاصل کر کے 'کمیٹی' کے امتحان دیتے اور سندھی کے استاد بن کر اسکول میں ملازمت اختیار کر لیتے تھے۔ استاد کو فقط یہ علم تھا کہ نوشہرو فیروز میں مدرسہ اور ہائی اسکول ہے جو ہمارے علاقے سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر ہے چنانچہ استاد نے مجھ سے کہا: ''نوشہرو میں مدرسہ ہے تم وہاں چلے جاؤ۔''

نوشہرو فیروز مدرسہ و ہائی اسکول میں داخلے کی کوشش

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے ایک ملاقات کے دوران راقم الحروف سے فرمایا کہ اس زمانے میں مسلمانوں کے تعلیمی ادارے بہت کم تھے۔ پورے سندھ میں ہندوؤں کے تین کالج کراچی، حیدرآباد اور شکارپور میں قائم ہو چکے تھے جبکہ مسلمانوں کا کوئی کالج نہ تھا۔ اس کے علاوہ دریائے سندھ کے بائیں کنارے کے وسیع علاقے میں مسلمانوں کا صرف ایک ہی اسکول تھا جبکہ ہندوؤں کے کئی اسکول موجود تھے۔ مسلمانوں کا یہ واحد اسکول نوشہرو فیروز مدرسہ اینڈ ہائی اسکول تھا۔ اس ادارے میں میٹرک تک تعلیم کا انتظام تھا۔ مئی 1928ء میں ڈاکٹر بلوچ کے چچا ولی محمد خان مزید تعلیم کے لیے آپ کو نوشہرو فیروز مدرسہ و ہائی اسکول لے گئے۔ اس زمانے میں یہ مدرسہ پورے سندھ میں ایک معیاری تعلیمی ادارہ تھا۔ یہاں بچوں کی نہ صرف تعلیم پر توجہ دی جاتی بلکہ تربیت پر بھی۔ بلوچ صاحب قریہ پلیو خان لغاری کے پرائمری اسکول سے تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ اب ان کے چچا انھیں ہائی اسکول کی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ اس وقت نوشہرو فیروز مدرسہ و ہائی اسکول کے پرنسپل عثمان علی انصاری تھے جنھوں نے بلوچ صاحب کے چچا ولی محمد خان سے کہا کہ مارچ 1928ء میں داخلے مکمل ہو چکے اس لیے اب داخلہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس موقعے پر ولی محمد خان نے پرنسپل سے بے حد اصرار کیا اور کہا کہ ان کے گاؤں میں کسی کو علم نہیں تھا کہ

داخلے کب ہوتے ہیں اس لیے نبی بخش کا امتحان لیا جائے اگر وہ کامیاب ہوتو داخلہ دیا جائے ورنہ نہیں۔ اس جذبے کو دیکھ کر پرنسپل عثمان علی انصاری نے داخلہ دینے سے تو معذرت کر لی اور یہ وعدہ کیا کہ اس سال وہ مجبور ہیں لیکن آئندہ سال مارچ میں داخلہ ضرور دیا جائے گا نیز اسکول کی فیس بھی معاف کر دی جائے گی اور بورڈنگ ہاؤس میں مفت رہائش اور خوراک بھی فراہم کی جائے گی۔ اس کے بعد چچا بھتیجا یعنی ولی محمد خان اور نبی بخش بلوچ دونوں گاؤں واپس پہنچے۔(۸)

دیھ 22 میں انگریزی تعلیم

گاؤں واپسی کے بعد ولی محمد خان نے اپنے کم سن بھتیجے نبی بخش سے کہا کہ تمھیں مئی 1928ء سے مارچ 1929ء تک کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ کہیں نہ کہیں تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے کسی سے سُن رکھا تھا کہ پنجابیوں کے گاؤں دیھ 22 میں انگریزی کے تین درجوں تک تعلیم کا انتظام ہے۔ چنانچہ چچا ولی محمد خان نے بلوچ صاحب سے کہا کہ وہاں خود ہی جا کر تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ بلوچ صاحب کے دل میں حصولِ علم کی سچی لگن تھی چنانچہ دوسرے دن علی الصباح بلوچ صاحب تن تنہا گھر سے نکلے اور پانچ میل پیدل چل کر سنجھورو پہنچے۔ سنجھورو سے ریل گاڑی میں کھڈرو پہنچے جہاں استاد محمد یوسف سومرو کے گھر پہنچے جو گھر پر موجود نہ تھے اور دیھ 22 گئے ہوئے تھے۔ بلوچ صاحب یہاں سے بڑی مشکل سے اونٹ پر سفر کر کے دیھ 22 پہنچے جہاں استاد محمد یوسف سے ملاقات کی۔ استاد محمد یوسف نے بتایا کہ داخلہ تو مل جائے گا لیکن رہنے کا انتظام اس وقت ہوگا جب فیس دی جائے گی۔

اس وقت معاشی مسائل بھی تھے جن کی وجہ سے اسکول کا وقت گزرنے کے بعد بلوچ صاحب استاد یوسف کے ساتھ کھڈرو اور وہاں سے بمشکل رات گئے اپنے گاؤں پہنچے اور گھر والوں کو تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ دو روز بعد ولی محمد خان اپنے کم سن بھتیجے کو لے کر دیھ 22 پہنچے جہاں علی محمد آرائیں کے گھر ساڑھے سات روپے مہینہ دے کر رہائش کا انتظام کیا۔ بلوچ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یہ ان کی زندگی کی پہلی آزمائش تھی جس میں اس کم عمری میں حصولِ علم کے لیے گھر سے باہر رہنا پڑا۔ دیھ 22 میں آپ نے ریٹائرڈ صوبیدار فیض علی پنجابی

سے انگریزی پڑھی۔ دیھہ 22 کے اس اسکول میں ابھی تین ماہ ہی گزرے تھے کہ علی محمد پنجابی نے اپنے گھر رہائش فراہم کرنے سے انکار کردیا۔اس نازک موقعے پر اسکول کے ایک نیک دل استاد لعل دین پنجابی نے بلوچ صاحب کو اپنے گھر رکھنے پر آمادگی ظاہر کی چنانچہ آپ کو لعل دین کے گھر منتقل ہونا پڑا۔لعل دین اسکول میں سندھی پڑھاتے تھے۔وہ نبی بخش کو بڑی محبت سے اپنے گھر دیھ 24 لے گئے جہاں ان کی اہلیہ زینت بی بی نے انھیں اپنے بچوں کی طرح رکھا۔دیھ 22 کے اسکول میں بلوچ صاحب نے مئی 1928ء تا مارچ 1929ء انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کی۔(۹)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی یادوں پر مشتمل کتاب سنڌ جو ذهين ٻار ڊاڪٽرنبي بخش خان بلوچ (سندھ کا ذہین بچہ۔ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) میں دیھہ ۲۲ میں تعلیم اور وہاں سے گاؤں آمد و رفت کی تفصیلات ملتی ہیں۔اس بارے میں انھوں نے فرمایا تھا:

> دیھہ ۲۲ میں علی محمد پنجابی سفید پوش لیکن لائق آدمی تھا۔اس نے کہا کہ میں اس لڑکے کو اپنے گھر رکھنے کو تیار ہوں لیکن کھانے کا خرچ ادا کرنا ہوگا۔اس پر چاچا نے کہا کہ میں چار آنا روزانہ کھانے کا خرچ دوں گا، گویا اس طرح ساڑھے سات روپے ماہانہ کھانے کا خرچ ادا کروں گا۔جب یہاں سنیچر کے دن چھٹی ہوتی تو میں دن کے دو بجے دیھ ۲۲ سے پیدل اپنے گاؤں جعفر خان لغاری کی جانب روانہ ہوتا اور غروب آفتاب یا اس کے کچھ بعد پہنچتا تھا۔دیھہ ۲۲ سے گوٹھ جعفر خان لغاری کا فاصلہ ۱۲ میل تھا یعنی آمد و رفت کے کل ۲۴ میل میں ہر ہفتے پیدل سفر کرتا تھا۔اتوار کو چھٹی ہوتی تھی اس لیے دوراتیں اپنے گاؤں میں گزار کر پیر کے دن منہ اندھیرے میں دیھہ ۲۲ پیدل روانہ ہوتا اور اسکول کا وقت شروع ہونے سے قبل وہاں پہنچ جاتا تھا۔اس راہ کے تمام نشانات اور کھیت مجھے بخوبی یاد ہو گئے تھے۔

نوشہرو فیروز مدرسہ و ہائی اسکول کی مختصر تاریخ

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے مورخہ ۳۱/اکتوبر ۱۹۹۵ کو نوشہرو فیروز مدرسہ و ہائی اسکول میں ایک مقالہ بہ عنوان:

Role of the Government Madressah & High School

Naushahro Feroze(۱۰)

پڑھا تھا۔اس مقالے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب نے سندھ میں تعلیم کی مختصر تاریخ اور خصوصاً نوشہرو فیروز مدرسہ و ہائی اسکول کی تاریخ پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی تھی۔بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ سندھ میں مسلمانوں کا تعلیم و تحقیق سے تعلق تاریخ کی مستند کتابوں سے ثابت ہے۔سندھ میں اسلام کی روشنی آٹھویں صدی عیسوی میں پہنچی۔اس کے بعد سے سندھ کے شہروں خصوصاً دیبل ،منصورہ،بکھر اور ملتان (جو اس وقت سندھ میں تھا) کے علما اور مصنفین نے عالمِ اسلام میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔یہاں تک ہوا کہ قرآن مجید کا پہلا ترجمہ پہلی مرتبہ سندھ کے شہر منصورہ میں ہوا۔اوائل اسلام سے تالپوروں کے عہد تک سندھ میں ابتدائی تعلیم بذریعہ مکاتب و مدارس دی جاتی تھی جس میں مسلمان اور غیر مسلم تمام طلبہ زیورِ علم سے خود کو آراستہ کرتے تھے۔یہ دور انیسویں صدی عیسوی تک چلا۔بقول بلوچ صاحب، انگریزوں کی آمد سے قبل سندھ میں تعلیم کا معیار بہت اعلیٰ پائے کا تھا۔

انگریزوں کی فتح سندھ 1843ء کے بعد سندھ کے تعلیمی نظام میں تبدیلیاں کی گئیں۔انگریزوں نے نہ صرف مکاتب نظامِ تعلیم کی حوصلہ شکنی کی بلکہ سندھ میں نئے پرائمری اسکولوں کے نظام کی باگ ڈور مقامی مسلمانوں کے بجائے بمبئی سے آئے غیر مسلم افسروں یعنی ہندوؤں کو سپرد کر دی۔یہ سندھ کے باشندوں کے ساتھ بڑی زیادتی تھی اور جان بوجھ کر ان کو نظر انداز کرنا تھا۔یہ نظام تقریباً نصف صدی تک چلتا رہا۔اس کے بعد ہی سندھ کے مسلمانوں کو ایسے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی اجازت دی گئی جن میں اسکول اور مدرسہ دونوں کی تعلیم دی جاسکے۔اس اجازت کے بعد کراچی میں سندھ مدرسۃ الاسلام 1885ء میں اور لاڑکانہ میں مدرسہ اور ہائی اسکول 1901ء میں قائم کیے گئے۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحقیق کے مطابق نوشہرو فیروز مدرسہ اینڈ ہائی اسکول دریائے سندھ کے بائیں

کنارے رہنے والے مسلمانوں کا پہلا تعلیمی ادارہ ہے جس میں تعلیم کا آغاز 1883ء میں ہوا۔ اسے مڈل اسکول کا درجہ ۱۸۹۵ء میں دیا گیا۔ بلوچ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ اس ادارے کے قیام کے وقت مقامی ہندوؤں نے اس کے قیام کی سخت مخالفت کی تھی اور اسی بنا پر اسکول کے لیے کوئی پلاٹ حاصل نہ کیا جاسکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نوشہرو فیروز شہر میں اسکول قائم نہ ہوسکا اور شہر سے جنوبی سمت کوئی چار فرلانگ فاصلے پر ایک کچی عمارت میں اسکول کا آغاز کرنا پڑا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے رہنما سیّد الہ ڈنو شاہ کی کوششوں سے شہر میں اسکول کے لیے جگہ مل سکی اور ۱۹۰۸ء میں ہائی اسکول کی عمارت تعمیر ہوسکی۔ اسی سال بورڈنگ کی عمارت بھی تعمیر کی گئی جہاں غریب طلبہ کو ڈسٹرکٹ لوکل بورڈ نواب شاہ کی جانب سے مفت رہائش کی سہولت حاصل تھی۔ مسلمانانِ سندھ کے اس تاریخی تعلیمی ادارے کے تحفظ اور ترقی کی خاطر کئی نسلوں نے خدمات انجام دیں۔ سیّد الہ ڈنو شاہ کے بعد ان کے صاحب زادے سیّد محمد علی شاہ نے ادارے کی باگ ڈور سنبھالی اور ان کے بعد ان کے صاحب زادے سیّد ظفر علی شاہ نے۔

نوشہرو فیروز مدرسہ وہائی اسکول کی تعلیمی تاریخ میں جن ہیڈ ماسٹر صاحبان نے اس ادارے کی بیش بہا خدمات انجام دیں، ان میں قاضی عبدالکبیر، جی این قاضی، عثمان علی انصاری اور بی کے شیخ شامل ہیں۔ بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ قاضی عبدالکبیر نے اس ادارے کے تحفظ اور ترقی کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی اور وہ ادارے کے خلاف ہر سازش اور مخالفت کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کا کردار ادا کرتے تھے۔

نوشہرو فیروز مدرسہ وہائی اسکول میں داخلہ

جیسا کہ اوپر ذکر آیا، نوشہرو فیروز مدرسہ وہائی اسکول کے پرنسپل عثمان علی انصاری نے بلوچ صاحب کے چچا ولی محمد خان سے کہا تھا کہ مارچ 1929ء میں دوبارہ آئیں۔ چنانچہ اسی مہینے میں بلوچ صاحب اپنے چچا ولی محمد خان کے ہمراہ نوشہرو فیروز مدرسہ وہائی اسکول پہنچے جہاں ولی محمد خان نے پرنسپل عثمان علی انصاری صاحب کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔ عثمان علی انصاری نے اپنا وعدہ پورا کیا اور نہ صرف فیس معاف کردی بلکہ بورڈنگ ہاؤس میں مفت رہائش کی اجازت بھی دی۔ اس تعلیمی ادارے میں بلوچ صاحب کو تعلیم و تربیت کا بہترین ماحول میسّر آیا جس نے

انھیں زندگی کی آنے والی جدوجہد کے لیے تیار کیا۔ یہاں بلوچ صاحب کو بہترین اساتذہ ملے جن میں مخدوم امیر احمد مرحوم (۱۱) بھی شامل تھے۔ مخدوم صاحب عربی و فارسی کے عالم تھے جن کی صحبت میں بلوچ صاحب کے علمی ذوق وشوق کو مزید جلا ملی۔ مخدوم امیر احمد ادارے کے طالب علموں کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کی بھرپور کوششیں کرتے تھے۔ وہ ادارے میں مشاعرے بھی منعقد کراتے۔ انھیں کی ترغیب پر بلوچ صاحب نے ''بزمِ مشاعرہ'' کے سیکریٹری کا عہدہ قبول کیا۔ نوشہرو فیروز مدرسہ وہائی اسکول کے دیگر قابلِ ذکر اساتذہ میں اخوند کریم بخش (جو مدرسے کی مسجد کے پیش امام بھی تھے) اور گل محمد پٹھان شامل ہیں۔ بلوچ صاحب کے اس دور کے دوستوں میں شیر محمد بلوچ، قاضی محمد ابراہیم، محمد ادریس میمن، انور علی پنجابی اور بشارت علی انصاری شامل تھے۔ یہاں قیام کے دوران بلوچ صاحب کا نہ صرف تعلیمی ریکارڈ شاندار رہا بلکہ آپ نے علمی وادبی مشاغل میں بھی بھرپور شرکت کی۔ بالآخر 1936ء میں بلوچ صاحب نے نوشہرو فیروز مدرسہ وہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان دیا اور پورے سندھ کے مسلمان طلبہ میں دوسرے نمبر پر آئے۔ اُس زمانے میں میٹرک کا امتحان بمبئی یونیورسٹی کے تحت ہوتا تھا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اسی تعلیمی ادارے میں 1928ء میں بلوچ صاحب کو داخلہ نہیں دیا گیا تھا اور یہیں قیام کے دوران اپنی محنت اور صلاحیت سے آپ نے یہ مقام حاصل کیا کہ پورے سندھ کے مسلمان طلبہ میں دوسری پوزیشن حاصل کی اور اس تعلیمی ادارے کا نام روشن کیا۔

نوشہرو فیروز مدرسہ اینڈ ہائی اسکول میں تعلیمی زمانہ

ڈاکٹر بلوچ کے نوشہرو فیروز مدرسہ اینڈ ہائی اسکول میں تعلیمی دور کے بارے میں ہمیں مفید معلومات پروفیسر محمد عمر چنڈ کی مرتبہ کتاب سنڌ جو ذهين ٻار ڊاڪٽر نبي بخش خان بلوچ (سندھ کا ذہین بچہ۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) میں ملتی ہیں۔ یہ کتاب دراصل ایک طویل انٹرویو ہے جو بلوچ صاحب نے پروفیسر محمد عمر چنڈ کو مختلف نشستوں میں دیا اور انھیں اپنی یادداشتیں ریکارڈ کرائی تھیں۔ اس کتاب میں نوشہرو فیروز مدرسہ اینڈ ہائی اسکول میں تعلیمی دور کی یادوں کے حوالے سے فرمایا تھا:

نوشہرو مدرسہ میں میرا دوسرا سال تھا اور میں دوسرے درجے انگریزی کا طالب

علم تھا۔ بورڈنگ ہاؤس میں ہمیں روزانہ دال کھانے کو ملتی تھی، کبھی کبھی گوشت ملتا تھا۔ اس پر میں نے دال پر ایک کافی (سندھی شاعری کی ایک صنفِ سخن) کہی جس میں کچھ اس قسم کے اشعار تھے:

خدایا تُو اس دال سے مجھ کو بچانا
کوئی اچھا کھانا سری جیسا آج کھلانا

عثمان علی انصاری صاحب ہمارے پرنسپل تھے۔ ان سے بڑے طلبہ نے کہا کہ اس چھوٹے لڑکے نے دال پر اشعار کہے ہیں۔ انصاری صاحب نے مجھے طلب کیا اور اشعار سنانے کو کہا۔ میں نے اشعار سنا دیے۔ اس کے بعد انھوں نے حکم دیا کہ ہر جمعہ کی رات یا جمعہ کے دن کھانے میں گوشت کا سالن فراہم کیا جائے۔

اس زمانے میں مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا اور ساتھ ہی کھیلوں میں شرکت کا بھی بہت شوق تھا۔ جن کھیلوں میں میں شرکت کرتا تھا ان میں ہاکی، کرکٹ، والی بال شامل تھے۔ کبھی جب پرنسپل عثمان علی انصاری صاحب شکار پر جاتے تو میں بھی بڑے طالب علموں کے ساتھ ان کے ساتھ جاتا تھا۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تعلیمی زندگی کا نوشہرو فیروز مدرسہ اینڈ ہائی اسکول میں گزرا تعلیمی زمانہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ بلوچ صاحب نے اس ادارے میں گزرے زمانے کے بارے میں ایک انٹرویو میں مفید معلومات سے آگاہ کیا تھا۔ اس زمانے میں ان کا قیام بورڈنگ ہاؤس میں تھا جہاں 65 تا 70 طلبا رہائش پذیر تھے۔

نوشہرو فیروز مدرسہ اینڈ ہائی اسکول میں طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی جسمانی صحت کا بھی بھرپور خیال رکھا جاتا تھا صبح پہلا پیریڈ ورزش کے لئے مختص تھا جس کے لیے ایک ریٹائرڈ فوجی بطور ڈرل ٹیچر یہ ذمّے داری ادا کرتا تھا اس کے علاوہ شام کے اوقات میں مختلف کھیلوں کا مناسب انتظام تھا جن میں کرکٹ، فٹ بال، ہاکی اور والی بال شامل ہیں۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب بھی ان کھیلوں میں روزانہ شرکت کرتے خاص طور پر کرکٹ اور فٹ بال ابتدا سے ہی کھیلنے لگے جب کہ والی بال پانچویں سے ساتویں جماعت میں کھیلی۔ بلوچ صاحب نے

ایک انٹرویو میں بتایا کہ وہ کرکٹ میں اتنا اچھا کھیلنے لگے تھے کہ اسکول کی کرکٹ ٹیم میں شامل ہو گئے اور پرنسپل انھیں دیگر شہروں میں کرکٹ کی ٹیم کے ساتھ لے بھی گئے۔(۱۲)

اس زمانے میں ادارے میں طلبہ کی غیر نصابی سرگرمیوں پر بھی توجہ دی جاتی تھی۔اسکول میں ایک بزمِ مشاعرہ بھی تھی جس کے نگراں عربی کے استاد مخدوم امیر احمد تھے۔جب بلوچ صاحب پانچویں جماعت میں تھے تو مخدوم امیر احمد کی ترغیب پر بزمِ مشاعرہ کے سیکریٹری بن گئے اور ابتدائی طور پر سادہ زبان میں شاعری بھی کی۔بزم مشاعرہ کی طرف سے ڈاکٹر صاحب نے اسکول کے باہر بھی اسکول کی نمائندگی کی اور حیدر آباد کے ٹیچرس کالج کے مشاعرے میں شرکت بھی کی۔(۱۳)

بلوچ صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اپنا ایک حیرت انگیز واقعہ بھی لکھا ہے جس کا تعلق اسی زمانے سے ہے وہ لکھتے ہیں کہ میتھ میٹکس کے استاد مسٹر ھنگوانی تھے بلوچ صاحب کو میتھ میٹکس میں مشکل پیش آتی تھیں۔ایک دفعہ انہوں نے ایک مشکل مشق دی اور کہا: کل یہ مشق کر کے آئیں۔جب رات کو بلوچ صاحب سوئے تو انھیں نیند میں یہ خواب میں دکھائی دیا کہ مشق کیسے حل کی جائے۔وہ فوراً اٹھ بیٹھے اور اس حل کو کاغذ پر لکھ لیا۔ دوسرے دن جب کلاس میں پہنچے تو بلوچ صاحب کے علاوہ اور کوئی طالب علم یہ مشق نہیں کر سکا تھا۔(۱۴)

اس زمانے میں سفر کی بھی بڑی مشکلات تھیں اور ذرائع آمد ورفت بہت کم اور ناقص تھے لیکن بلوچ صاحب نے حصولِ علم کی خاطر یہ مشکلات بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔وہ اس زمانے میں ریل کے ذریعے پڈعیدن تک سفر کرتے اور وہاں سے نوشہرو فیروز تک چودہ میل کا فاصلہ پیدل طے کرتے۔بعض اوقات یہ مشکل سفر بیل گاڑی سے بھی کرنا ہوتا۔چھٹّیوں کے آغاز میں یہ چودہ میل کا فاصلہ دوستوں کے ساتھ مل کر رات کو طے کرتے۔اس زمانے میں نوشہرو اور پڈعیدن کے درمیان ایک سرکاری کنواں تھا۔پانی صرف وہیں ملتا تھا باقی سارے راستے میں کہیں نہیں ملتا تھا۔بلوچ صاحب کے بقول ایک سال ایسا بھی آیا کہ جب سیلاب کی وجہ سے پڈعیدن اور نوشہرو فیروز کا راستہ بند ہو گیا اور پڈعیدن سے نوشہرو فیروز تک انھیں ایک کشتی میں سفر کرنا پڑا۔

نوشہرو فیروز مدرسہ اینڈ ہائی اسکول میں بلوچ صاحب نے بڑی محنت سے علم حاصل کیا۔وہ اسکول کے ذہین طالب علم تھے اور میٹرک اس اعزاز کے ساتھ 1936ء میں پاس کیا کہ پورے سندھ کے مسلمان طلبہ میں

ان کی دوسری پوزیشن آئی اور 20 روپیہ اسکالرشپ بھی ملی۔ یہیں سے ان کے دل میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ بیدار ہوا اور بعد کے تعلیمی مراحل کے لیے مضبوط بنیاد قائم ہوئی۔(۱۵)

نوشہرو فیروز مدرسہ اینڈ ہائی اسکول کا دور ڈاکٹر صاحب کی تعلیمی زندگی کا اس لحاظ سے بھی اہم دور تھا کہ یہاں تک کی تعلیم میں ان کے چچا ولی محمد خان کا اصرار اور معاونت شامل تھی۔ اس کے بعد کے تمام تعلیمی مراحل بلوچ صاحب نے اپنی ذاتی محنت، جرأت اور ہمت مردانہ سے کام لے کر طے کیے۔ اس تعلیمی ادارے کے خاص دوستوں میں جو حضرات شامل تھے ان میں شیر محمد بلوچ، قاضی محمد ابراہیم، محمد ادریس، انور علی پنجابی اور بشارت حسین انصاری شامل تھے۔(۱۶)

ڈی جے کالج کراچی میں داخلہ اور یک سالہ قیام

ڈاکٹر بلوچ کے ڈی جے کالج کراچی میں تعلیمی دور کے بارے میں ہمیں مفید معلومات پروفیسر محمد عمر چنڈ کی مرتبہ کتاب سنڌ جو ذهين ٻار ڊاڪٽر نبي بخش خان بلوچ (سندھ کا ذہین بچہ۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) میں ملتی ہیں۔ یہ کتاب دراصل ایک طویل انٹرویو ہے جو بلوچ صاحب نے پروفیسر محمد عمر چنڈ کو مختلف نشستوں میں دیا اور انھیں اپنی یادداشتیں ریکارڈ کرائی تھیں۔ اس کتاب میں ڈی جے کالج کراچی میں داخلہ اور تعلیمی دور کے حوالے سے فرمایا تھا:

> نوشہرو فیروز مدرسہ کی جانب سے میں نے ۱۹۳۶ء میں میٹرک کا امتحان دیا۔ یہ امتحان دینے ہم حیدرآباد آئے تھے اور یہ امتحان ہوم اسٹیڈ ہال (جو اب بھی موجود ہے) میں ہوا تھا۔ میٹرک کے امتحان میں پورے سندھ کے مسلمان طالب علموں میں میرا دوسرا نمبر آیا تھا اور مجھے 'وکٹری اسکالرشپ' یعنی آگے کالج میں تعلیم کی خاطر بیس روپے ماہانہ ملی تھی۔ اس زمانے میں سندھ میں ہندوؤں کے تین کالج تھے یعنی ڈی جے کالج کراچی، پھلیلی حیدرآباد میں کالج اور شکارپور میں کالج جبکہ مسلمانوں کا پورے سندھ میں ایک بھی کالج نہ تھا۔ مجھے بیس روپے ماہانہ وظیفہ ملا تھا جس کی بنا پر میں ڈی جے کالج میں

داخل ہو کر مزید تعلیم کی خاطر کراچی پہنچ گیا۔ یہاں میں ہوسٹل میں رہتا تھا جہاں ایک مشکل
یہ پیش آئی کہ کلب Mess میں کھانے پینے کا ماہانہ خرچہ تیس روپے تھا جبکہ ہر ماہ میرے
پاس ہوتے ہی صرف بیس روپے تھے۔اس مشکل کا حل میں نے یہ نکالا کہ چند دوستوں کی
مدد سے اپنا جدا کلب کھولا جس کا نام دوسرے کلب والوں نے 'یتیم کلب' رکھا۔اس کلب کی
خاطر کھانا پکانے والا میں گاؤں سے لے گیا اور سانگھڑ سے میں اصلی گھی لاتا جو کھانے میں
استعمال ہوتا تھا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا اُس زمانے میں پورے سندھ میں ہندوؤں کے تین کالج تھے۔ یہ کالج سندھ کے تین بڑے شہروں یعنی کراچی، حیدرآباد اور شکارپور میں تھے۔اس کے برعکس مسلمانوں کا کوئی کالج نہیں تھا چنانچہ مسلمان طالبِ علم یا تو ہندوؤں کے کالج میں تعلیم حاصل کرتے یا بہاء الدین کالج جونا گڑھ جاتے جہاں طالب علموں کو بہت سی سہولیات حاصل تھیں۔ بلوچ صاحب نوشہرو فیروز مدرسہ اینڈ ہائی اسکول سے پورے سندھ میں میٹرک میں دوسری پوزیشن حاصل کر چکے تھے۔اس کے بعد آپ نے ڈی جے کالج (دیارام جیٹھل کالج) کراچی میں داخلہ لیا لیکن مالی مشکلات کی بنا پر یہاں تعلیم جاری نہ رکھ سکے چنانچہ آپ جُونا گڑھ پہنچے جہاں بہاء الدین کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں آپ کو کسی طرح کی مالی مشکلات کا سامنا نہ ہوا۔(۱۷)

ڈی جے کالج کراچی میں قیام کے دوران بلوچ صاحب نے ایک نظم سندھی زبان میں لکھی تھی جو بعد میں کالج کی جانب سے شایع شدہ کتاب میں بھی شامل کی گئی۔(۱۸)

ایک ریڈیو انٹرویو میں بلوچ صاحب نے ڈی جے کالج کراچی میں داخلہ، وہاں مالی مشکلات اور اعلیٰ تعلیم کے لیے بہاء الدین کالج جُونا گڑھ جانے کی وجوہات پر یوں روشنی ڈالی تھی:

''سندھ میں جو مسلمان طلبہ تھے ان میں میٹرک میں میری دوسری پوزیشن تھی۔ایک
صاحب کراچی کے تھے، ان کی پہلی پوزیشن تھی۔اسی وجہ سے ہمیں اسکالرشپ ملی اور وہاں
سے آکر ہم کراچی پہنچے کہ ہم کالج پڑھنے آئے ہیں لیکن میرے پاس پیسے نہیں تھے اور
اسکالرشپ کا سلسلہ بہت مشکل معاملہ تھا۔ایک سال میں یہاں کراچی میں رہا لیکن بعد میں

دیکھا کہ گاڑی چلتی نہیں۔ میرے پاس پیسے نہیں، کتابیں میں کیسے لوں گا اور کہاں سے کھاؤں پیوں گا۔ بڑی مشکل ہوگئی تو مجھے کسی نے بتایا کہ جُوناگڑھ میں ایک کالج ہے۔ وہ نواب صاحب کی ریاست ہے اور وہاں جو مسلمان طلبہ آتے ہیں ان سے فیس نہیں لی جاتی اور وہاں اگر آپ جائیں تو بہت ہی اچھا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ جوناگڑھ تک کا کرایہ کوئی دس روپے ہوتا ہے۔ بڑی مشکل تھی کہ میں وہاں کیسے پہنچوں۔ بہرحال کسی طرح ہم وہاں پہنچ گئے تو وہاں فیس معاف تھی اور ہم صرف کھانے پینے کا انتظام کرتے تھے اور اسکالرشپ ملتی تھی جس سے ہم گزارہ کرتے تھے۔ اس طرح چار سال ہمارے جوناگڑھ میں گزرے اور بی اے کا امتحان ہم نے بمبئی جا کر دیا کیونکہ کوئی اور سینٹر نہیں تھا، یا کراچی جائیں یا بمبئی جائیں۔ وہاں جو چار سال گزرے وہ ہمارے تعلیمی سلسلے کا بہت ہی اچھا عرصہ تھا۔ ہم پڑھے اور ہمارے اساتذہ بھی بہت اچھے تھے جن سے ہم نے بہت شوق سے پڑھا پھر 1941ء میں ہم نے بی اے کا امتحان بمبئی یونیورسٹی سے پاس کیا۔'' (۱۹)

حواشی باب نمبر 2

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں ''اسان جو ڳوٺ جعفر خان لغاري '' ص:۱، ۲

۲۔ ایضاً ص: ۲۳

۳۔ ایضاً ص: ۴۶

۴۔ انٹرویو ڈاکٹر نبی بخش بلوچ از محمد راشد شیخ مورخہ ۲۲/جون ۲۰۰۶ء بہ مقام قیام گاہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، سندھ یونیورسٹی، (اولڈ کیمپس) حیدرآباد۔

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً

۷۔ یہ ریڈیو انٹرویو ریڈیو پاکستان کراچی مرکز میں ڈاکٹر الیاس عشقی نے ۱۹۷۴ء لیا تھا۔ اب یہ انٹرویو مطبوعہ شکل میں کتاب ڈاڪٽر بلوچ جا انٽرويو جلد پهريون (ڈاکٹر بلوچ کے انٹرویو جلد اوّل) مرتبہ محمد ارشد بلوچ میں موجود ہے۔

۸۔ ملاحظہ فرمائیے ''اسان جو ڳوٺ جعفر خان لغاري '' ص: ۵۳۔

۹۔ ایضاً ص: ۵۷۔

۱۰۔ ملاحظہ فرمائیں کتاب **Sindh Studies- Educational and Archeological** میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کا مضمون Role of Government Madressah & High School Naushahro Feroz

۱۱۔ مخدوم امیر احمد سندھ کے نامور عالم اور عربی دان تھے۔ آپ ۱۹۰۱ء میں کھڑا (ضلع خیر پور میرس) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کھڑا اور سندھ کے دیگر علمائے کرام سے حاصل کی۔ آپ کی ذہانت اور حافظہ بے مثل تھا اسی وجہ سے صرف آٹھ ماہ کی قلیل مدت میں مکمل قرآن پاک حفظ کیا۔ آپ نوشہرو فیروز مدرسہ و ہائی اسکول کے

ناموراستاد تھے۔ ۱۹۵۲ء میں آپ کو سندھ اورینٹل کالج حیدرآباد کا پرنسپل بنایا گیا۔ آپ کو عربی، فارسی اور اردو پر بڑی دسترس حاصل تھی۔ مخدوم امیر احمد کا انتقال مورخہ: ۲۶ رفروری ۱۹۷۱ء کو ہوا۔

مخدوم امیر احمد کو عربی اور فارسی سے ترجمہ کرنے پر بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ آپ نے تاریخ سندھ کے اہم ترین ماخذ یعنی: فتحنامہ سندھ عرف چچ نامہ، تحفۃ الکرام اور تاریخ معصومی کے فارسی سے سندھی تراجم کیے۔ آپ کی ایڈٹ کردہ کتب میں حیات القاری فی اطراف صحیح البخاری اور بذل القوۃ فی سنی النبّوۃ شامل ہیں۔

۱۲۔ ملاحظہ فرمایئے کتاب ڈاکٽرنبي بخش خان بلوچ_زندگي ۽ خذمتون (ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ زندگی اور خدمات) از محمد انس راجپر ،ص:41۔

۱۳۔ ایضاً ص:42۔

۱۴ ایضاً ص:46۔

۱۵۔ ایضاً ص:46۔

۱۶۔ ایضاً ص:44۔

۱۷۔ انٹرویو ڈاکٹر نبی بخش بلوچ از محمد راشد شیخ، مورخہ ۲۲ جون ۲۰۰۶ء

۱۸۔ یہ بات ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اپنی زندگی کی آخری تقریب میں دوران خطاب بیان کی تھی۔ یہ تقریب بلوچ صاحب کو ہلال امتیاز ملنے کی خوشی میں جناب آفتاب شاہ جاموٹ کی رہائش گاہ پر مورخہ ۳/اپریل ۲۰۱۱ء کو منعقد ہوئی تھی۔ یہ نظم کتاب ڈاکٽر بلوچ جا مقالا۔علم ادب ۽ شخصيتون کے صفحہ نمبر 406 پر بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

۱۹۔ ڈاکٽربلوچ جا انٽرويو جلد پھريون (ڈاکٹر بلوچ کے انٹرویو جلد اوّل) مرتبہ محمد ارشد بلوچ، ص166

باب نمبر 3

جُوناگڑھ اور علی گڑھ میں اعلیٰ تعلیمی مراحل

ریاست جُوناگڑھ کا عام ماحول

تقسیمِ برصغیر سے قبل جُوناگڑھ کی ریاست وہاں کے نیک دل حکمرانوں کی وجہ سے ایک فلاحی ریاست کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ وہاں رعایا بڑے آرام اور خوشحالی کی زندگی بسر کرتی تھی۔ وہاں عدلیہ مکمل طور پر بااختیار تھی، عام باشندے خواہ دیہات میں رہنے والے ہوں یا شہروں میں، نہایت خوشحال تھے۔ افلاس ان کے قریب سے بھی نہیں گزرا تھا۔ جوناگڑھ شہر میں نواب صاحب جُوناگڑھ کی جانب سے ایک سرکاری لنگر خانہ قائم تھا جہاں سے صبح و شام ناداروں کو مفت کھانا مہیّا کیا جاتا۔ اسی طرح بیواؤں اور یتیموں کو ریاست کی جانب سے ماہانہ الاؤنس دیا جاتا تھا۔ یہ ریاست ہر لحاظ سے ایک فلاحی ریاست تھی اور بیروزگاری اور ناداری کے نام سے بھی کوئی واقف نہ تھا۔ ریاست میں مہمانوں کی خاطر بڑے بڑے مہمان خانے بنے ہوئے تھے جن کا انتظام ایک الگ افسر کے سپرد تھا جو ''مہمانداری افسر'' کہلاتا تھا۔ سب سے اعلیٰ مہمان خانہ ''مہابت منزل'' تھا جو راجاؤں اور نوابوں اور والیانِ ریاست کے لیے مخصوص تھا۔(۱)

بہاءالدین کالج جُوناگڑھ

جُوناگڑھ کا بہاءالدین کالج بعض مخصوص سہولیات کی بنا پر پورے برصغیر میں مشہور تھا۔ اس کالج میں پورے برّصغیر کے مسلمان لڑکوں کے لیے مفت تعلیم اور رہائش کا انتظام تھا۔ یہ کالج بمبئی یونیورسٹی سے منسلک تھا اور برّصغیر کے بہترین تعلیمی اداروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس کالج میں غیر مسلم طلبہ کی تعداد بھی خاصی تھی اور ان کی 25 فیصد فیس معاف کر دی جاتی تھی۔ اس عہد میں سندھ میں مسلمانوں کا کوئی کالج نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ سے قربت اور سہولیات کی بنا پر سندھ کے ذہین اور محنتی طالب علم بہاءالدّین کالج پہنچنے لگے۔ یہ سلسلہ تقریباً 1925ء سے شروع ہوا۔ سندھ کی جن معروف شخصیات نے بہاءالدین کالج میں تعلیم حاصل کی ان میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے علاوہ اے کے بروہی (۲)، ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوتہ (۳) اور ڈاکٹر این جی بی قاضی شامل ہیں۔

ڈاکٹر بلوچ کے بہاءالدین کالج جوناگڑھ میں تعلیمی دور کے بارے میں ہمیں مفید معلومات پروفیسر محمد عمر چنڈ کی مرتبہ کتاب سنڌ جو ذهين ٻار ڊاڪٽرنبي بخش خان بلوچ (سندھ کا ذہین بچہ۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) میں ملتی ہیں۔ یہ کتاب دراصل ایک طویل انٹرویو ہے جو بلوچ صاحب نے پروفیسر محمد عمر چنڈ کو مختلف نشستوں میں دیا اور انھیں اپنی یادداشتیں ریکارڈ کرائی تھیں۔ اس کتاب میں بہاءالدین کالج جوناگڑھ میں گزارے ایام کی یادوں کے حوالے سے فرمایا تھا:

> اسی دوران کسی ذریعے سے اطلاع ملی کہ جوناگڑھ میں بہاءالدین کالج ہے جہاں مسلمان طلبہ کے لیے مفت تعلیم کا انتظام ہے۔ میں وہاں پہنچ گیا اور کالج میں داخلہ لے لیا لیکن اخراجات کی وجہ سے وہاں بھی حالات ایسے ہو گئے کہ میں پڑھ نہ سکا اور واپس کراچی پہنچ کر پیرالٰہی بخش مرحوم کے پاس پہنچا اور جن کی عنایت سے مجھے پی ڈبلیوڈی میں کلرکی کی ملازمت مل گئی۔ اس طرح چالیس روپے ماہانہ تنخواہ پر میں نے کوئی چار یا پانچ ماہ تک کلرکی کی۔ اس عرصے کے بعد دوسرا تعلیمی سال شروع ہو گیا۔ اس وقت میں نے پختہ ارادہ کیا کہ مجھے یہ نوکری نہیں کرنی اور میں مزید تعلیم حاصل کروں گا چنانچہ اس عہدے سے استعفیٰ دے کر میں دوبارہ حصول علم کی خاطر جوناگڑھ پہنچ گیا۔ جوناگڑھ پہنچ کر میں نے عربی

میں ایک خط ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ (جو اس وقت ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن سندھ تھے) کو لکھا جس میں بیان کیا کہ میں نوشہرو مدرسہ سے میٹرک کے امتحان میں بیٹھا تھا اور پورے سندھ کے مسلمانوں میں دوسرا نمبر حاصل کیا جس کی بنا پر مجھے وکٹری اسکالرشپ ملی تھی۔ پھر میری آنکھیں متاثر ہوگئیں جس کی بنا پر علاج کی خاطر تعلیم چھوڑ دی جس پر اسکالرشپ بند ہوگئی۔ میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اس مجبوری کی بنا پر عارضی طور پر اور علاج کی خاطر تعلیم ترک کی تھی۔ اب میں نے اپنے تعلیمی سلسلے کو ازسر نو شروع کیا ہے لیکن میرے پاس پیسے نہیں ہیں اس لیے میری اسکالرشپ تین سال کے لیے دوبارہ جاری کر دی جائے۔ اس خط کے نتیجے میں ڈاکٹر داؤد پوتہ صاحب کی مہربانی سے میری اسکالرشپ تین سال کے لیے جاری ہوگئی۔

اسی کتاب ذکر ہے کہ ڈاکٹر بلوچ نے بہاء الدین کالج جونا گڑھ میں دوران تعلیم عربی مضمون اختیار کرنے کے حوالے سے فرمایا تھا:

بہاء الدین کالج جونا گڑھ میں جب انٹر کے امتحان کا نتیجہ نکلا تو میں میتھ میں بھی فرسٹ آیا اور عربی میں بھی۔ پروفیسر راؤ ہمیں میتھ پڑھاتے تھے جن کا مشورہ تھا کہ مزید تعلیم میتھ میں حاصل کروں جبکہ پروفیسر وائی ایس طاہر علی ہمیں عربی پڑھاتے تھے جن کا مشورہ تھا کہ میں عربی میں مزید تعلیم حاصل کروں چنانچہ میں نے عربی کو اختیار کیا کیونکہ اسکول میں بھی میں نے عربی پڑھی تھی اور بی اے آنرز کے لیے عربی میں داخلہ لیا۔ جونا گڑھ کا تعلیمی دور نوشہرو فیروز مدرسہ کے دور کی طرح ہر لحاظ سے بہترین دور تھا۔ یہاں مسلمان طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھے اس کے علاوہ ہر تین ماہ بعد امتحان ہوتا تھا جس میں کامیاب طلبہ کو اسکالرشپ دی جاتی تھی۔

اسی کتاب ذکر ہے کہ ڈاکٹر بلوچ نے بہاء الدین کالج جونا گڑھ میں دوران تعلیم مختلف سرگرمیوں کے حوالے سے فرمایا تھا:

جس طرح میں نے مسلم ہاسٹل کراچی میں کھانے کا جدا 'کلب' بنایا اسی طرح بہاء الدین کالج جونا گڑھ میں بھی بنایا۔ پرانے کلب میں ہر طالب علم کا کھانے کی مد میں اٹھارہ روپے خرچہ آتا تھا جبکہ میرے قائم کردہ کلب میں یہ خرچہ گھٹ کر گیارہ روپے ہوگیا۔ یہاں میں نے کھیلوں میں بھی خوب حصہ لیا مثلاً کالج کے کشتی رانوں College Rovers کا سربراہ بن گیا۔ اس کے علاوہ یو ٹی سی ٹریننگ کور میں شامل ہوکر سارجنٹ میجر تک پہنچ گیا۔ علاوہ ازیں فٹبال، ہاکی اور والی بال کی ٹیموں کا رکن بھی بن گیا۔ ان سب کاموں کے علاوہ میں نے وہاں خاکسار تحریک شروع کی اور جونا گڑھ شہر میں خاکساروں کے مارچ کا اہتمام بھی کیا۔

۱۹۴۳ء میں بہاء الدین کالج کی جانب سے میں نے بی اے آنرز کا بمبئی یونیورسٹی سے امتحان دیا جس میں پورے کالج میں میر پہلی پوزیشن اور بمبئی یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن آئی۔ بہاء الدین کالج کا یہ دستور تھا کہ جو طالب علم کالج میں پہلی پوزیشن حاصل کرتا اسے ایم اے کی تعلیم کی خاطر سو روپے ماہانہ ''مہابت اسکالرشپ'' ملتی تھی۔ مجھے جب یہ اسکالرشپ ملی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

بہاءالدّین کالج جُونا گڑھ کی کچھ اور یادیں

جیسا کہ ذکر آیا بہاءالدّین کالج جُونا گڑھ میں بلوچ صاحب کا قیام 1937ء تا 1941ء رہا۔ یہاں آپ کا تعلیمی ریکارڈ نہایت شاندار رہا۔ یہاں وہ نہ صرف کالج کے بہترین طالب علم رہے بلکہ انھوں نے غیر نصابی سر گرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ ان سرگرمیوں میں خاکسار تحریک میں شمولیت اور پیراکی کے مقابلوں میں شرکت اور نمایاں کامیابی شامل ہے۔ راقم الحروف سے ایک انٹرویو کے دوران بہاء الدین کالج کے ماحول اور وہاں کے اساتذہ کے بارے میں بلوچ صاحب نے راقم الحروف سے فرمایا:

''بہاءالدّین کالج ریاست جونا گڑھ کے نیک دل وزیر اعظم، بہاء الدین صاحب نے قائم

کیا تھا۔ تقریباً 1925ء سے سندھ کے طالب علموں کا اس کالج میں جانے کا آغاز ہوا۔ یہاں مسلمانوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کالج کی شاندار عمارت تھی اور بہت عمدہ ہاسٹل تھا۔ یہاں ایک سہولت یہ بھی تھی کہ اگر طالبِ علم ششماہی امتحان میں کامیاب ہوتو اسے چھ یا نو روپے ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر کالج کا کوئی طالبِ علم ایم۔ اے میں فرسٹ کلاس آئے تو اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک سو روپے ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا۔ اس وظیفے کو نواب مہابت خان کے نام پر ''مہابت فیلو'' کہا جاتا تھا۔ اس وظیفے کی بنا پر ذہین طلبہ بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرتے تھے۔'' (۴)

بہاءالدین کالج میں قیام کے دوران بلوچ صاحب نے جن جن اساتذہ سے فیض اُٹھایا ان میں پروفیسر محمد علی ترمذی بھی شامل تھے۔ راقم الحروف سے انٹرویو کے دوران بلوچ صاحب نے پروفیسر محمد علی ترمذی صاحب کے طریقہء تدریس کے بارے میں فرمایا:

''بہاءالدین کالج کے معروف اساتذہ میں پروفیسر سیّد محمد علی ترمذی شامل تھے جو ہمیں فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے صاحب زادے باقر علی ترمذی (۵) اس وقت بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر رہے تھے۔ پروفیسر ترمذی مرحوم سے پڑھ کر ہمیں ایسا لگا کہ وہ ایسے استاد ہیں جو طالب علموں کو غور وفکر کی تربیت دے رہے ہیں۔ وہ خود سوالات کرتے اور ان کے جوابات ہم سے پوچھتے اور خود بھی غور وفکر کے نئے نئے پہلو بیان کرتے۔ ایک مرتبہ ایک فارسی غزل پڑھاتے ہوئے جب اس میں ستاروں کا ذکر آیا تو انھوں نے علمِ فلکیات (Astronomy) کے بارے میں نہایت مفید معلومات فراہم کیں۔'' (٦)

بہاءالدّین کالج اور شہر جُونا گڑھ کی عمومی فضا

بہاءالدین کالج اور شہر جونا گڑھ کی عمومی فضا کے بارے میں بلوچ صاحب اپنے مضمون ''قاضی احمد میاں اختر اور جونا گڑھ کی یاد میں'' میں لکھتے ہیں:

''۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۱ء جونا گڑھ میں قیام رہا۔ وہاں بہاء الدین کالج میں بی۔اے کی ڈگری کے لیے داخلہ لے رکھا تھا۔ سندھ کے خشک میدانی ماحول کے برعکس جونا گڑھ کا خطّہ سرسبز و آباد تھا۔ شہر تو پہاڑوں کی آغوش میں بسا ہوا تھا جس کو دیکھتے ہی تعجب اور تحیّر کی سی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ اس وقت ریاست کے نواب جناب مہابت خان جی تھے۔ برسوں پہلے ریاست کے روشن دماغ وزیرِ باتدبیر جناب بہاء الدین کی مساعیِ جمیلہ سے ڈگری کالج قائم ہوا تھا جس میں طلبہ کے لیے ٹیوشن فیس معاف تھی۔ شہر و ریاست کے ہندو اور مسلمان طلبہ اور طالبات کے علاوہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے غریب مسلمان طلبہ وہاں پہنچتے تھے۔ ان کے لیے ہوسٹلوں میں رہنے کا انتظام تھا۔ کالج کی فضا پُرامن و پُرلطف تھی اور تعلیم پر پوری توجہ دی جاتی تھی۔ پہلے سال کے نصف میں مقابلے کا ایک امتحان ہوا کرتا تھا جس میں اوّلیت حاصل کرنے والے کو آٹھ روپے فی ماہ وظیفہ ملتا تھا۔ راقم نے جب یہ وظیفہ حاصل کرلیا تو سارے مسائل حل ہو گئے۔ کھانے کے انتظام کے لیے ہوسٹلوں میں کلب تھے جو طلبہ خود چلاتے تھے۔ میں نے جب دیکھا کہ دھاندلی ہو رہی ہے اور فی ماہ بل اٹھارہ روپے تک جا پہنچا ہے تو مروجہ سررشتے سے قطعِ تعلق کر کے ایک جداگانہ کلب قائم کرلیا تاکہ حتی المقدور کم خرچ پر اچھا کھانا مہیا ہو سکے۔ اس مقصد میں کامیابی ہوئی اور فی ماہ بل گیارہ روپے تک جا پہنچا۔ کلب کے ممبروں کے لیے لازمی تھا کہ ہر نئے مہینے کی یکم کو وہ ماہانہ بل کی رقم پیشگی ادا کریں۔ ہم نقد رقم دے کر کھانے پینے کی اشیا کافی رعایت سے خرید لیتے تھے۔ شہر کے مرکزی ''دیوان چوک'' کی بڑی دکانوں سے سودا لیتے تھے۔ بہترین چاول اٹھارہ روپے فی من، خالص گھی ایک روپے کا ایک سیر تا سوا سیر، دارجیلنگ چائے (سچا نگ پیکو لیبل والی) نو روپے میں، ایک پاؤنڈ وزن کا ڈبہ۔ ہر جمعے کو بریانی اور میٹھے کا حلوا پکتا تھا۔ بس عیش ہی عیش تھے۔''(۷)

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے ایک انٹرویو میں فرمایا تھا کہ ان کی ہمت اور کوشش سے کالج میں جو نیا کھانے کا

کلب قائم ہوا تھا،اس کا نام انھوں نے 'یتیم کلب' رکھا تھا۔اس کلب کی خاطر بلوچ صاحب نے ایک کھانا پکانے والے کا انتظام اپنے گاؤں سے کیا تھا اور اسے اپنے ساتھ جونا گڑھ لے گئے تھے۔اس کلب میں ابتدا میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ باجرے کے آٹے کی روٹی مہیا کی جائے گی کیونکہ باجرے کا آٹا گندم کے آٹے کی بہ نسبت سستا تھا ،لیکن بعد میں گندم کے آٹے کی روٹی سب ممبران کو مہیا کی گئی۔

شہر جونا گڑھ،اس کے قدرتی مناظر اور آثار

اسی مضمون میں بلوچ صاحب شہر جُونا گڑھ، وہاں کے قدرتی مناظر اور قدیم آثار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پہلے ایک ڈیڑھ سال تو زیادہ تر نئے ماحول اور نئی فضا سے مانوس ہونے میں لگا ۔شہر کے گرد شہر پناہ کے طور پر پتھر کی مضبوط دیوار اور شہر کے اندر وسط میں قدیم قلعہ اپر کوٹ یہی جھونا قدیم گڑھ تھا جس پر شہر کا نام جھونا گڑھ پڑا۔

شہر پناہ کے جنوب کو واقع اپنے ہوسٹل سے جب ہم شہر کو جاتے تھے تو ''کالوا'' گیٹ سے داخل ہوتے تھے۔دروازے کا یہ نام کالو اندی (برساتی نالے) کے نام پر تھا۔نماز جمعہ کے لیے شہر کے اندر جامع مسجد میں جاتے تھے۔شہر کے مشرق کی طرف اونچے پہاڑ تھے جن کی وجہ سے ہماری ہوسٹلیں اور شہر کا مشرقی حصہ صبح کے سات آٹھ بجے تک سائے میں ڈھکے رہتے تھے۔جون تا ستمبر موسلا دھار بارشیں ہوتی تھیں اور ہم دور سے آبشاروں کو دیکھ کر پہاڑوں پر جا پہنچتے تھے۔ربڑ کے برساتی جوتے بارہ آنے (آج کے پچھتر پیسے)میں ملتے تھے جن سے چار مہینے تک گزارہ ہوجاتا تھا۔ہوسٹلوں سے سیدھا مشرق کی طرف داتار پہاڑ تھا جس کے اوپر جمیل شاہ داتار ٹھٹوی کی چلہ گاہ تھی۔مجاور سندھی بول لیتے تھے۔یہ بزرگ جمیل شاہ شہر ٹھٹھہ سے بارہ میل جنوب کو ''پیر آر (پیر پٹھا) پر مدفون ہیں جہاں پر جمیل شاہ گرناری کے نام سے مشہور ہیں۔یہاں سے وہ

گرنار پہاڑ پر گئے اور پھر داتار پہاڑ پر چلّہ کشی کی۔ گرنار پہاڑ داتار کے شمال کو واقع ہے جس کے اوپر جین دھرم کے مندر پائے جاتے ہیں۔ گرنار ایک اونچا پہاڑ ہے اور جو لوگ وہاں جاتے تھے تو رات کو وہیں پر ٹھہر جاتے تھے۔ پیسے والے خود کو ڈولیوں میں اٹھوا کر اوپر پہنچتے تھے مگر کالج کے طلبہ کا پہاڑی ٹولہ پہاڑوں پر چڑھنے اترنے میں مشّاق ہو گیا تھا۔ ہم ایک ہی دن میں گرنار پہاڑ پر چڑھتے اور واپس نیچے اترتے تھے۔ شہر جونا گڑھ کے اطراف اور بعض دور دراز علاقوں کو جا کر دیکھتے تھے۔ دھوراجی، راج کوٹ، منگرول، کتیانہ اور مانا وادر شہروں کے علاوہ ساحلِ سمندر پر ویراوال بندر پر پہنچے اور ویراوال سے سومناتھ گئے۔ وہاں پر ایک قدیم قبرستان دیکھا جس میں ایک لمبی قطار ایسی قبروں کی نظر آئی جن پر پتھر میں تراشے ہوئے گھوڑوں کے بت استوار تھے۔ ان کی نسبت یہ روایت سنی کہ یہ سلطان محمود غزنوی کے لشکر کے گھوڑے تھے جو یہاں پر مرے اور دفن ہوئے۔ اس طرح کی تگ و دو سے پہلے ایک ڈیڑھ سال میں ہی ہم نے جونا گڑھ شہر اور اطراف کے ماحول کو اپنا لیا تھا۔''(۸)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے راقم الحروف سے مورخہ ۲۲/جون ۲۰۰۶ء کو دوران انٹرویو فرمایا تھا کہ انھیں زندگی کے ابتدائی ایام سے ہی تیراکی کا بہت شوق تھا اور اس فن میں انھوں نے مہارت حاصل کر لی تھی۔ جونا گڑھ میں ان کے قیام کے دوران ایک مرتبہ تیراکی کا مقابلہ ہوا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب نے نواب صاحب جونا گڑھ کے تیراکوں کو ہرایا تھا اور میڈل حاصل کیا تھا۔

قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی سے تعارف اور روابط

بہاء الدین کالج جونا گڑھ کے اسی قیام کے دوران بلوچ صاحب کی ملاقات اردو زبان کے معروف محقق اور ادیب قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی (۹) سے ہوئی۔ ان سے اولین ملاقات اور جونا گڑھ میں روابط کے بارے میں بلوچ صاحب لکھتے ہیں:

''کالج کی عمارت میں داخل ہونے کا دروازہ مشرق سے تھا اور داخل ہوتے ہی سامنے کالج لائبریری کا بڑا وسیع ہال تھا البتہ اندر کی جانب دروازے سے متّصل بائیں کو ایک کمرہ تھا جس پر ریاست کے آثارِ قدیمہ آفس کا سائن بورڈ (Department of Archaeology) کچھ مزید الفاظ کے ساتھ آویزاں تھا۔ میں اکثر اس بورڈ کو دیکھا کرتا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کا آفس ہے۔ ایک دن دیکھا کہ چپراسی اس کمرے کا دروازہ کھول رہا ہے۔ اندر دیکھا تو بڑے بڑے سائز کی ضخیم اور مجلّد کتابیں خوبصورت الماریوں میں رکھی نظر آئیں۔ اسی اثنا میں باہر وکٹوریہ گاڑی آکر رکی اور قاضی احمد میاں صاحب اترے اور کمرے کے دروازے کی طرف آئے۔ جب دیکھا کہ میں ان کی طرف تعجّب سے دیکھ رہا ہوں تو پوچھا! آپ پڑھتے ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے بتایا کہ میں سندھ سے آیا ہوں، پھر مزید شفقت سے پوچھا کہ آپ یہاں کھڑے ہو کر کیا دیکھ رہے تھے؟ میں نے کمرے کے بورڈ اور کمرے میں اندر کتابوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ کمرہ اور یہ کتابیں کس لیے ہیں؟ فرمایا! یہ ریاست جونا گڑھ کے آثارِ قدیمہ کا محکمہ ہے اور میں اس کا نگران ہوں۔ اس مختصر ملاقات کے بعد دوسری بار جب تشریف لائے تو میں ہمت باندھ کر اندر کمرے میں گیا میرے ہاتھ میں ابن صاعد اندلسی کی کتاب ''طبقاتُ الامم'' کا اردو ترجمہ تھا جو کئی سال پہلے خود قاضی صاحب نے کیا تھا۔ میں نے سلام عرض کیا اور کہا کہ آپ کا نام نامی دیکھ کر میں نے یہ کتاب لائبریری سے نکلوائی ہے اور اس کو پڑھ رہا ہوں۔ سن کر خوش ہوئے اور مجھے مزید مطالعے کی ترغیب دی۔

شہر سے مشرق رویہ گرنار پہاڑ کی طرف جاتے ہوئے ہم ایک تراشے ہوئے گول پتھر پر کندہ شدہ کتبے دیکھتے تھے۔ ایک دن میں نے کچھ پوچھنے کا بہانہ بنایا تاکہ میں ان سے مل سکوں۔ یہ جان کر خوش ہوئے کہ مجھے کتبوں سے بھی دلچسپی ہے۔ پھر تفصیل سے سمجھایا کہ یہ راجہ اشوک کے زمانے کے کتبے ہیں اور بہت ہی اہم ہیں۔ بہرحال شروع میں اس

طرح مجھے قاضی صاحب سے ملنے اور متعارف ہونے کے مواقع حاصل ہوئے۔"(۱۰)

بہاء الدّین کالج جُونا گڑھ کے اساتذہ اور جُونا گڑھ کی معروف شخصیات

بہاء الدین کالج جونا گڑھ کے اساتذہ اور شہر جونا گڑھ کی معروف شخصیات کے بارے میں بلوچ صاحب نے لکھا:

"سنہ ۱۹۳۸ء کے آخر میں جب ذہن علم وفضل کی راہیں تلاش کرنے لگا تو بعض قد آور شخصیتیں نظر آنے لگیں جن میں بالخصوص قاضی احمد میاں اختر صاحب زیادہ نمایاں تھے۔ بعض دوسرے بزرگ جو میری یادوں میں زندہ رہے ہیں وہ یہ تھے: کالج کے پرنسپل جناب ظہور الدین صاحب جو وضع قطع میں سوفی صد مسلمان اور طالب علموں پر مہربان تھے فلسفہ اور نفسیات کے عالم تھے اور ان علوم کے حوالے سے کتابیں لکھی تھیں جن میں سے ایک دو اس وقت تک چھپ چکی تھیں۔ کالج کے اساتذہ میں سے جناب طاہر صاحب (۱۱) ہمیں عربی پڑھاتے تھے اور لائق فائق تھے۔ ہندو اساتذہ میں سے جناب راؤ صاحب ریاضیات کے اچھے استاد تھے۔ میں نے انٹر میں منطق کے بجائے ریاضیات کو بطور اختیاری مضمون لے رکھا تھا۔ راؤ صاحب کی ذہانت سے متاثر ہو کر میں نے اس مضمون میں خوب محنت کی اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے چنانچہ راؤ صاحب نے ترغیب دی کہ میں ریاضیات میں بی۔اے کروں لیکن ساتھ ہی عربی میں اچھے نمبر آئے اور جناب طاہر علی صاحب کی تلقین نے ان کی طرف کھینچ لیا۔ پروفیسر اوزا صاحب ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے، معمّر مگر شگفتہ طبع تھے اور کلاس میں ان کی اور طلبہ کی آپس میں خوب نوک جھونک رہتی تھی۔ جناب ترمذی صاحب ہمیں فارسی پڑھاتے تھے (جو میرا اختیاری مضمون تھا) ان کا طریقۂ تدریس محققانہ اور استفسار پر مبنی تھا۔ چنانچہ مجھے پہلی بار علمی تحقیق وتجسس کی کرنیں نظر آنے لگیں۔ کالج سے باہر شہر میں جناب برہانی صاحب شہر

کے رؤسا میں سے تھے اور ریاست کے کسی محکمے کے سربراہ، شہر میں نیلی مسجد کے پیش امام عربی کے فاضل تھے اور میں فراغت میں ان کے ہاں جا کر ابنِ درید کا مقصورہ پڑھتا تھا۔ ریاست کے لانسرس (گھڑسوار فوج کا رسالہ) کی مسجد کے حافظ عالم فاضل تھے، فرّخ آباد کے رہنے والے تھے۔ رمضان میں تراویح پڑھاتے تھے اور میں اکثر وہیں نماز کے لیے جایا کرتا تھا۔ شہر کے تجارتی حلقوں میں ہاشم سیٹھ (میمن) ایک معزز شخص تھے اور نواب صاحب کے ہاں مقبول تھے۔ دیوان چوک میں ان کی دکان تھی اور میں ان کے ہاں جا کر بیٹھتا تھا۔ فاروقی صاحب کا چھوٹا سا پریس تھا۔ قلندر صفت انسان تھے ، اسلام کی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے۔ قرآن شریف کے گجراتی ترجمے کو شائع کرنے کا اہتمام کر رہے تھے۔ اصل میں جبل پور کی طرف کے رہنے والے تھے۔ میں اُن دنوں خاکسار تحریک میں تھا اور فاروقی صاحب نے میری ہمت افزائی کی۔ میں چاہتا تھا کہ علّامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کے تصنیف کردہ کتابچے ''اسلام کا عسکری نظام'' کا گجراتی میں ترجمہ کر کے چھپوایا جائے۔ جناب فاروقی صاحب نے میرا یہ مسئلہ حل کر دیا اور ایک ہزار کاپیاں چھاپ کر تقسیم کی گئیں (اس پاداش میں مجھے بی۔اے کے بعد ایم اے کے لیے بہاءالدین کالج میں داخلہ نہ مل سکا اور پرنسپل ظہورالدین صاحب کے مشورے سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جا پہنچا)۔ فتح محمد سندھی صاحب پولیس کے کمانی تھے اور بڑی رعب دار شخصیت کے مالک۔ جناب کامل جوناگڑھی ملک الشعرا تھے انھوں نے جوناگڑھ ریاست کی تاریخ لکھی تھی۔ موسیقی کا صحیح علم رکھتے تھے۔'' (۱۲)

بہاءالدّین کالج جُوناگڑھ میں آل انڈیا مشاعرے

بہاءالدین کالج میں طلباء کے علمی وادبی ذوق کو پروان چڑھانے کے لیے ادبی تقریبات خصوصاً آل انڈیا مشاعرے بھی منعقد کیے جاتے تھے۔ ان مشاعروں میں برصغیر کے نامور شعرا شریک ہوتے

تھے۔ان مشاعروں اور اردو کے معروف شاعر جناب جگر مراد آبادی کے بارے میں (جو شریک مشاعرہ ہوتے) بلوچ صاحب لکھتے ہیں:

''بہاء الدین کالج جوناگڑھ میں آل انڈیا مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۰ء تک دو ایسے مشاعرے منعقد ہوئے۔دونوں مشاعروں میں جناب جگر مراد آبادی تشریف لائے، متوسط قدو قامت، چھوٹی سی کالی داڑھی (سفید ریش نہیں ہوئے تھے) شیروانی اور پاجامے میں ملبوس، سر پر کالی ٹوپی، وضع قطع میں لااُبالی، پان کا اتنا شوق کہ منہ کے دونوں اطراف گویا ریشہ آمیز، جوناگڑھ کے رؤسا میں سے ایک خوبصورت نوجوان جو اپنا تخلص قمر کرتے تھے ان ہی کے ہاں جگر صاحب مہمان ہوتے تھے۔مقامی شعرا میں سے ریاست کے ملک الشعرا تو حضرتِ کامل تھے جو البتہ معمر تھے۔ایک عجوبہ روزگار جو نیجہ صاحب تھے ان کے آباو اجداد کئی پشتوں سے سندھ سے ہجرت کر کے جوناگڑھ میں بس گئے تھے۔جو نیجہ صاحب مقامی جوناگڑھی (گجراتی اردو آمیز) زبان میں خوب شعر کہتے تھے اور اس میں انھوں نے اپنا ایک جداگانہ دیوان بنا رکھا تھا۔سب کو اپنے یہ اشعار شوق سے سناتے تھے۔ایک غزل میں آخری قافیہ و ردیف والے الفاظ یہ تھے:

''ہونے تو دو''۔وہ شستہ اردو میں بھی معیاری شعر کہتے تھے۔

پہلا مشاعرہ جو ہم نے دیکھا وہ کالج کے اندر ہی منعقد ہوا۔اس میں قاضی احمد میاں اختر صاحب منتظم اعلیٰ نظر آئے۔بطور والنٹیر کے میں نے بھی انتظام میں حصہ لیا۔ معلوم ہوا کہ ان مشاعروں کے حقیقی محرّک قاضی صاحب ہی تھے۔دوسرے مشاعرے کے انتظام میں میں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قاضی صاحب مجھے کام میں مشغول دیکھ کر خوش ہوئے۔جناب جگر صاحب مہمان خاص تھے۔مصرعِ طرح تھا:

قدرت خدا کی ہے کہ خزاں ہے بہار میں

تقریباً چار گھنٹوں تک محفل جمی رہی۔حضرت کامل جوناگڑھی کو اور حضرت جگر کو بڑے احترام سے سنا گیا۔مجھے اعلیٰ اردو شاعری کی نزاکتوں سے اس وقت تک اتنی آگہی نہ تھی کہ اچھے اشعار ازبر ہو جائیں البتہ جونیجہ صاحب کی مزاحیہ نظم پر ہم نے خوب قہقہے لگائے۔ مصرعِ طرح کی تضمین کرتے ہوئے انھوں نے یہ شعر پیش کیا اور خوب داد حاصل کی۔

بیٹھا ہوا رقیب ہے پہلوئے یار میں
''قدرت خدا کی ہے کہ خزاں ہے بہار میں''(۱۳)

جُوناگڑھ سے علی گڑھ برائے اعلیٰ تعلیم

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی تعلیمی زندگی کے تمام ادوار بڑے شاندار رہے۔انھوں نے ہر عہد میں مسائل اور مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اعلیٰ اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔1941ء میں بلوچ صاحب بہاء الدین کالج جوناگڑھ سے بی اے آنرز کر چکے تھے اور یہ منفرد اعزاز بھی حاصل کر چکے تھے کہ پورے کالج میں ان کی پہلی پوزیشن آئی تھی۔بلوچ صاحب کو جوناگڑھ کا ماحول اور وہاں کی فضا بہت پسند تھی لیکن حالات نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا کہ انھیں جوناگڑھ چھوڑنا پڑا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جانا پڑا۔اس بارے میں بلوچ صاحب لکھتے ہیں:

''1937ء۔1941ء کے دوران بہاء الدین کالج جوناگڑھ سے بی اے آنرز کیا اور کالج میں پہلی پوزیشن آئی جس پر ایک سو روپے ماہوار ''مہابت فیلوشپ'' وظیفہ (بنام نواب مہابت خان والیِ ریاست) کا مستحق ہوا۔جون 1941ء میں خوشی کے مارے جب کالج پہنچا تو ایم اے میں داخلے کا دروازہ بند پایا۔وجہ یہ تھی کہ میں نے کالج اور شہر میں خاکسار تحریک کا اجرا کیا تھا لہٰذا جوناگڑھ کالج میں میرا داخلہ ممنوع ہو گیا تھا۔البتہ یہ امتناعی حکم صیغۂ راز میں رہا اور پرنسپل جناب ظہور احمد صاحب مجبور تھے۔وہ مجھے چاہتے تھے۔انھوں نے مجھے بلا کر فرمایا کہ بمبئی یونیورسٹی سے تاریخ یا عربی میں ایم اے کرنے سے آپ کو اتنا فائدہ نہیں ہوگا، بہتر ہوگا کہ آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے جائیں۔مزید تسلّی کے لیے ایک

طویل سفارشی خط جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (۱۴) کے نام تھا اور جس میں خاص طور پر ذکر تھا کہ میں نے کالج میں فرسٹ اور بمبئی یونیورسٹی میں تھرڈ پوزیشن حاصل کی ہے۔ اس پر خود کو مجبور پا کر میں نے بے سروسامانی کی حالت میں بادلِ ناخواستہ علی گڑھ کا رُخ کیا لیکن وَ عسیٰ اَن تَکرھُوا شیئاً وَ ھُوَ خَیر'' لَکُم (۱۵)۔ یہ تبدیلی آئندہ کے لیے نیک فال بنی۔

جنت نشان جونا گڑھ کو چھوڑا تو ہمت نشان علی گڑھ کو اپنے سامنے پایا۔'' (۱۶)

قیامِ علی گڑھ

علی گڑھ تحریک اور سرسیّد کا نظریۂ تعلیم

1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانانِ برصغیر جن مشکل حالات و حادثات سے دوچار ہوئے اور ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلمانوں نے جن جن تحریکوں کا آغاز کیا، ان میں بحیثیتِ مجموعی سب سے مؤثر اور سب سے زیادہ متاثر کن ''علی گڑھ تحریک'' ہی تھی۔ اس تحریک کے علاوہ جو جو تحاریک اور ادارے بنے انھوں نے اپنے اپنے زمانے میں مفید خدمات انجام دیں اور بعض اب تک دے رہی ہیں۔ ہر انسانی تحریک کی طرح اس تحریک میں کمزوریاں بھی ضرور تھیں لیکن اس تحریک کے بانی یعنی سرسیّد احمد خان کی دردمندی، مسلمانوں کی ترقی کی خواہش، ان کے مسائل حل کرنے کا جذبہ اور 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانانِ برصغیر کو مشکل حالات کے بھنور سے نکالنے کی شدید خواہش سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سرسیّد اور ان کی تحریک کے ناقدین اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ صرف اور صرف مذہبی تعلیم سے مسلمانوں کے مسائل کا حل نکالنا ممکن نہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان جدید تعلیم یافتہ بھی ہوں اور دین کے تقاضوں سے واقف اور دین پر صدقِ دل سے عمل کرنے والے بھی ہوں۔ آج کے دور میں ہمارے مذہبی طبقات بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ تمام مسلمان اگر صرف اور صرف مذہبی تعلیم حاصل کریں تو یہ مسائل کا حل نہیں۔ دیگر یہ کہ جدید دنیاوی تعلیم

حاصل کرنا بھی مذہب کا حصہ ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان جدید تعلیم بھی حاصل کریں اور اپنے اپنے شعبوں میں مہارت حاصل کریں اور دنیا کے حالات کا مقابلہ کریں۔سرسیّد کی تمام تحریروں اور ان کی تحریک کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کی شدید خواہش یہ تھی کہ برصغیر کے مسلمانوں کا وہ انجام نہ ہو جو اسپین کے مسلمانوں کا ہوا۔وہ ہندوستان کو دوسرا اسپین بنانا نہیں چاہتے تھے۔1857ء کے مشکل حالات کے بعد مسلمانوں کی مجموعی حالت سے سرسیّد بڑے فکر مند تھے۔وہ خود اس بارے میں لکھتے ہیں:

''ایک مدّت اسی غم میں پڑا سوچتا رہا کہ کیا کیجیے؟ جو خیالی تدبیریں کرتا تھا کوئی بن پڑتی معلوم نہ ہوتی تھی۔آخر یہ سوچا کہ سوچنے سے کرنا بہتر ہے' کرو جو کچھ کر سکو' ہو یا نہ ہو۔اسی بات پر دل ٹھہرا، ہمّت نے ساتھ دیا اور صبر نے سہارا اور اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا۔'' (۱۷)

سرسیّد نے قومی حالت پر مکمل غور کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل تعلیم میں مضمر ہے۔1857ء کے بعد کے مشکل حالات کی بنا پر وہ فوراً تعلیمی تحریک کا آغاز نہ کر سکے۔اس کے بجائے انھوں نے پوری کوشش کی کہ حکمرانوں کے دل سے مسلمانوں کے خلاف نفرت کا جذبہ ختم کیا جائے اور ان کے سامنے صحیح صورتِ حال پیش کی جائے۔

سرسیّد کی تعلیمی مہم کا باقاعدہ آغاز غازی پور سے ہوا۔1864ء میں انھوں نے غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی جس کا بنیادی مقصد یورپی علوم وفنون کی کتب کا اردو ترجمہ کرنا تھا۔دو سال بعد جب ورنا کولر سوسائٹی کی تجویز حکومت کے سامنے پیش کی گئی تو یہ خیال مزید پختہ ہو چکا تھا کہ اگر ترقی کرنا ہے تو مغرب کے علمی خزانوں سے استفادہ انتہائی ضروری ہے۔سائنٹیفک سوسائٹی کے بعد سرسیّد کا سب سے بڑا کارنامہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام ہے۔یہی وہ کالج ہے جسے 1920ء میں یونیورسٹی کا درجہ عطا کیا اور جو ''مسلم یونیورسٹی علی گڑھ'' کے نام سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔سرسیّد کا بھی اصل مقصد یہی تھا کہ ان کا قائم کیا ہوا کالج ایک اقامتی یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر لے لیکن ان کی زندگی میں یہ مقصد پورا نہ ہو سکا۔سرسیّد نے اپنے تعلیمی مقاصد کے حصول کے لیے ایک اور ادارے کی بنا بھی ڈالی۔یہ سرسیّد کو اس وجہ سے کرنا پڑا کہ صرف ایک تعلیمی ادارہ تمام ہندوستان کے کروڑوں

مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کے لیے ناکافی تھا۔ یہ ادارہ ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' کے نام سے معروف ہے۔ اس اہم ادارے کے اغراض ومقاصد یہ تھے:

۱) مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ کی کوشش کرنا۔

2) مسلمانوں کے لیے جو سرکاری اسکول قائم کیے جائیں ان میں مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا۔

3) مذہبی نیز مشرقی علوم کے لیے علماء نے جو مدارس قائم کیے ہیں انھیں مستحکم کرنا۔

4) قرآن خوانی اور حفظِ قرآن کے مدارس کی اصلاح واستحکام۔

5) دیسی اسکولوں کی تعلیم میں اصلاح کرنا۔

اس کانفرنس کی بدولت برصغیر کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا چرچا عام ہوا۔ پورے برصغیر کے مختلف شہروں میں کانفرنس کے اجلاس منعقد کیے جاتے۔ جہاں جہاں کانفرنس کا اجلاس ہوتا وہاں تعلیمی بیداری پیدا ہو جاتی۔ سرسیّد کی تحریک کے بنیادی طور پر تین پہلو ہیں: ان کی پہلی کوشش یہ تھی کہ علم وحکمت کے خزانے جہاں بھی ہیں انہیں حاصل کر کے اپنے ملک اور اپنی قوم کو ان سے مالا مال کیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ سرسیّد کی دوسری کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک مرکزی تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی شکل میں قائم کیا جائے۔ یہ کالج دراصل پیش خیمہ بنا مغرب کی بہترین درس گاہوں کی طرز پر ایک اقامتی یونیورسٹی کا جو سرسیّد کے انتقال کے 22 برس بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی شکل میں قائم ہوا۔

سرسیّد کا تیسرا اہم کارنامہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام تھا جس کا مقصد عام تعلیم کی خاطر ملک کے گوشے گوشے میں تعلیمی اداروں کا قیام تھا۔ سرسیّد نے یہ تین کارنامے اس مشکل اور ناسازگار حالات میں انجام دیے جب بظاہر کسی بھی طرح اس طرح کے کاموں کے لیے حالات ناسازگار تھے۔ کسی بڑی شخصیت میں خامیاں نکالنا بہت آسان ہے لیکن اس کے عہد اور اس کے کارنامے کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیے بغیر اس کا اصل کارنامہ نگاہوں سے پوشیدہ ہی رہے گا۔ سرسیّد کے اصل کارناموں سے واقفیت کے لیے اس عہد کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔(۱۸)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا یوں تو 1920ء میں آغاز ہوا لیکن اُس کے حقیقی بانی سر سیّد احمد خان ہی تھے۔
سر سیّد مسلمانانِ برصغیر پاک و ہند کے وہ رہنما تھے جنھوں نے مغل سلطنت کے خاتمے کے بعد مسلمانانِ ہند کو ترقی و خوشحالی کی خاطر انگریزی تعلیم پر آمادہ کیا تھا۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا 1875ء میں سر سیّد نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے نام سے کالج قائم کیا جو ترقی کرتے کرتے 1920ء میں یونیورسٹی بن گیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں برصغیر پاک و ہند کے دور دراز سے مسلمان طلبہ داخل ہوتے اور فارغ التحصیل ہو کر اپنے اپنے شعبوں میں خدمات انجام دیتے۔ اس یونیورسٹی کے ماحول کی چھاپ طلبہ پر اس قدر گہری ہوتی کہ تاعمر وہ اس بات پر فخر کرتے کہ وہ علی گڑھ کے طالب علم رہے۔ اقصائے برصغیر سے طلبہ یہاں آتے اور وہاں کے ماحول میں گھل مل کر ایک ہو جاتے تھے۔ سندھی ہوں یا پٹھان ، بنگالی ہوں یا پنجابی، حیدرآبادی ہوں یا مدراسی، بمبئی کے سیٹھ ہوں یا بلوچی سب ایک ہی لباس، ایک ہی ثقافت اور معاشرت کے علمبردار بن جاتے۔ اس یونیورسٹی کے طلبہ کو یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی تاعمر یونیورسٹی دیکھنے کو دل ترستا، وہاں کے در و دیوار سے محبت ہو جاتی اور وہاں کی محبت دل و دماغ پر انمٹ نقش چھوڑ جاتی۔ برصغیر پاک و ہند کے مشاہیر علم و ادب، تاریخ و سیاست اور دیگر رہنما جتنی بڑی تعداد میں اس یونیورسٹی نے پیدا کیے کسی اور یونیورسٹی نے نہ کیے۔ اس درس گاہ سے تعلیم حاصل کرنے والوں میں عظیم سیاست دان مثلاً مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، سردار عبدالرب نشتر، شیخ عبداللہ و دیگر مشاہیر شامل تھے۔ اس تعلیمی ادارے سے پڑھنے والوں میں مولانا ظفر علی خان، مولانا حسرت موہانی، قاضی عبدالغفار، مولوی عنایت اللہ دہلوی، فانی بدایونی، شان الحق حقی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، مختار مسعود اور ان جیسے شعراء و ادباء اور محققین شامل تھے۔ اس تعلیمی ادارے سے ڈاکٹر ذاکر حسین خان، غلام السیّدین اور شیخ عبداللہ جیسے ماہرین تعلیم پیدا ہوئے۔ (۱۹)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی روایات

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی روایات نہ تو سو فیصد خالص اسلامی تھیں اور نہ خالص مغربی بلکہ دونوں کے بین بین راستہ اپنایا گیا تھا۔ یہاں حفظِ مراتب، خوش ذوقی، خوش گفتاری، بذلہ سنجی اور اپنے منصب اور ذمّے داری کا احساس بہت اہمیت رکھتا تھا۔ مسلمانانِ برصغیر کی ترقی اور بہبود میں جو کردار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا رہا ہے اس کی تہہ میں درس وتدریس کے ساتھ ان کی اخلاقی تربیت اور مختلف تہذیبی سرگرمیوں میں ان کے ملوّث ہونے کا بڑا حصہ ہے کیونکہ اس کے بغیر شخصیت کی بالیدگی ممکن نہیں۔

سندھ کے جن جن مشاہیر نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی اس کی کچھ تفصیلات ہمیں جناب زیڈ اے نظامی کے مضمون 'مشاہیرِ علی گڑھ پاکستان میں' (مشمولہ ماہنامہ تہذیب کراچی، اکتوبر ۱۹۹۲ء) میں ملتی ہیں۔ سندھ سے تعلق رکھنے والے علیگ حضرات میں علامہ آئی آئی قاضی، غلام محمد بھرگڑی، پیر الٰہی بخش، سید علی مردان شاہ پیر صاحب پگاڑا، جسٹس زیڈ اے چنّا، میر غلام علی خان تالپور، قاضی فضل اللہ، پروفیسر غلام مصطفی شاہ، آغا غلام نبی پٹھان اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ شامل ہیں۔

ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ 1941ء سے 1945 تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طالب علم رہے۔ یہ دور اُن کی زندگی کا اس لحاظ سے اہم ترین دور ہے کہ اس دوران انھیں اعلیٰ تعلیم کا وسیع اُفق میسّر آیا۔ اس کے علاوہ علی گڑھ کے نامور اساتذہ خصوصاً علّامہ عبدالعزیز میمن مرحوم سے وہ قلبی تعلق قائم ہوا جو علّامہ میمن سے زندگی بھر جاری رہا۔ آگے میں، ہم بلوچ صاحب کے قیامِ علی گڑھ کی تفصیلات پیش کرتے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلوں کا نظام اور بلوچ صاحب کے ابتدائی ایّام

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ۱۹۴۱ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پہنچے۔ وہاں داخلوں کے نظام اور ایک نو وارد کی مشکلات کے بارے میں یہ دلچسپ معلومات اپنے مضمون 'ایّامِ علی گڑھ' میں یوں بیان کیں:

''ان دنوں داخلے کا نظام خوب تھا۔ انتظامیہ کے دفاتر ایس ایس ہال کی دکھنی ونگ کے اوپر تھے۔ داخلے سے وابستہ افسران ایک ہی صف میں بیٹھے ہوتے تھے۔ یکے

بعد دیگرے سب کے یہاں سے گزرتے ہوئے ایک گھنٹے کے اندر اندر داخلے کے لوازمات پورے ہوگئے ۔ایم اے کے لیے شعبہ عربی میں اور ایل ایل بی کے لئے شعبہ قانون میں داخلے ملے ۔رہائش کے لیے مجھے آفتاب ہوسٹل میں سنگل رُوم الاٹ ہوا۔معلوم ہوا کہ بی اے میں نمایاں کامیابی کی وجہ سے مجھے اسکالر میں شمار کیا گیا اور دستور کے مطابق سکالرز ہوسٹل یعنی آفتاب ہوسٹل میں کمرہ دیا گیا۔

اس کے بعد پہلی کوہ پیما مشق شروع ہوئی۔چار پائی شہر سے خرید کر کے لانی تھی اور ساتھ ہی مچھر دانی کیوں کہ ہیلی کاپٹر نما مچھر برسرِ پیکار تھے ۔شہر جانے کے لیے خاص الخاص سواری یکّہ سے آشنائی ہوئی ۔ایک مختصر ساتختہ جس پر ایک سواری کے بیٹھنے کی جگہ نظر آرہی تھی۔ اس پر ہم تین ساتھی شہر سے تین چار پائیاں لاد کر لائے ۔بس یکہ نوجوانانِ قوم کی جوانی کا پاسبان تھا کہ شہر کے اونچے ریلوے پل کو پار کرتے ہوئے بال بال بچ جاتے تھے۔ بہر حال اپنی خریدی ہوئی چار پائی پر سونے سے یقین محکم ہوا کہ ہم صحیح معنوں میں مسلم یونیورسٹی کے شہری ہیں ۔بعد میں شب تعارف (Introduction Night) کے ہوش رُبا ہنگامے نے ہمیں صحیح معنوں میں علیگیرین بنا دیا۔"(۲۱)

جُونا گڑھ اور علی گڑھ کے درمیان فرق اور علی گڑھ میں دلچسپیاں

ڈاکٹر بلوچ صاحب اپنے مضمون "ایامِ علی گڑھ" میں بہاء الدین کالج جونا گڑھ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تدریسی اور غیر تدریسی ماحول کا فرق یوں بیان کرتے ہیں:

"مجھے اپنے گزشتہ کالجوں اور مسلم یونیورسٹی کے انتظامی امور میں فرق نظر آیا۔وہاں ہر محل وموقع پر انتظامیہ کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہاں پر انتظامیہ پس پردہ تھی اور اجتماعی زندگی کی وجہ سے توازن برقرار تھا۔ وہاں پر نصابی تعلیم پر ہی توجہ مرکوز تھی یہاں پر پڑھنے والوں کے لیے غیر نصابی تربیت کے کئی مواقع موجود تھے۔ ہر ہوسٹل کے اپنے مختصر جلسوں کے علاوہ

یونیورسٹی کی سطح پر بڑے بڑے اجلاس منعقد ہوتے تھے۔ مباحثوں، مشاعروں اور کھیلوں کا ایک سلسلہ چلتا تھا۔ کرکٹ، ہاکی اور فٹبال کی ٹیموں کو اور خاص طور سے ان کے کپتانوں کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ رائڈنگ اسکول کے کپتان کے لیے جب گھوڑا لایا جاتا تھا تو لاٹ صاحب کا سماں نظر آتا تھا۔ یونیورسٹی یونین کا الیکشن ایک آزاد ملک کی اسمبلی کے الیکشن کا نظارہ پیش کرتا تھا اور یونین کے صدر نشین کا ایک منفرد مقام تھا۔ البتہ الیکشن میں کامیاب امیدوار اور اُن کے ساتھیوں کو مبارک بادی کے تحائف اور ہارنے والے کے لواحقین کے لیے مرثیہ خوانی کے کوائف مہیا ہوتے تھے۔ یہ روایت مسلم یونیورسٹی کی خاص الخاص روایات میں سے تھی۔ یونیورسٹی کی حدود سے باہر ایک پُرکشش سالانہ نمائش لگتی تھی جو طلبہ کے لیے خاص طور پر ایک بڑی تفریح گاہ بن جاتی تھی۔ وہاں پر خان کے کباب اور پراٹھوں کی لذت اور خورجہ کے شلغم اچار کی خوشبو سے سال بھر کے کیلوریز کا اہتمام ہو جاتا تھا۔" (۲۱)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طریقۂ تعلیم اور اس عہد کے نامور اساتذہ

ڈاکٹر بلوچ صاحب اپنے مضمون 'ایامِ علی گڑھ' میں علی گڑھ میں طریقۂ تدریس، کلاس روم کے تقدّس اور وہاں اس زمانے کے نامور اساتذہ کے بارے میں یہ مفید تفصیلات لکھتے ہیں:

"مسلم یونیورسٹی میں آ کر مجھے کلاس روم کے تقدّس کا احساس ہوا۔ ایک قابلِ ستائش روایت (جس کا پہلے والی درس گاہوں میں فقدان تھا) یہ تھی کہ کلاس روم میں طلبہ پڑھانے والے اساتذہ کا کلّی طور پر احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ ہمہ تن گوش ہو کر لیکچر سنا جاتا تھا اور اگر طوالت اور تکرار کی وجہ سے لیکچر بے مزہ ہوتا تو بھی ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کی جاتی تھی۔ مسلم یونیورسٹی میں آ کر پہلی بار معلوم ہوا کہ پروفیسر کی اہلیت اور قابلیت کا معیار کیا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اچھا پڑھانے والے بعض اساتذہ دیکھے تھے لیکن ایسے بلند پائے کے پروفیسر نہیں دیکھے تھے جو اس وقت مسلم

یونیورسٹی کے تدریسی اسٹاف کے روشن ستارے تھے۔شعبہء عربی کے پروفیسر استاد عبدالعزیز میمن صاحب (۲۲) بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔شعبہء فارسی کے پروفیسر ہادی حسن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ایران کے مختلف فارسی لہجوں میں گفتگو کر سکتے ہیں وہ انگریزی میں بھی ایک اچھے خطیب کی حیثیت رکھتے تھے اور انگریزی میں شکنتلا کو ڈرامائی انداز میں پیش کر کے مسحور کر دیتے تھے۔جناب سیّد ظفر الحسن صاحب اپنے ڈھیلے ڈھالے جبّے اور دراز ریش کے ساتھ شعبہء فلسفہ (ایس ایس ایسٹ) کے سامنے آہستہ آہستہ خراماں ہوتے تھے تو فلسفے کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتے تھے۔شعبہء تاریخ کے پروفیسر محمد حبیب صاحب کا نامِ نامی ہندوستان بھر میں مشہور تھا۔کچھ پہلے انھوں نے سلطان محمود پر تنقیدی نگاہ سے ایک کتاب لکھی تھی جس کا شہرہ ابھی باقی تھا۔ان ہی کی ایما پر ان دنوں آل انڈیا ہسٹری کانفرنس مسلم یونیورسٹی میں منعقد ہوئی جس کا اسٹریچی ہال میں شاندار افتتاح ہوا۔ڈاکٹر تاراچند الہ آباد سے تشریف لائے اور غالباً انہی نے صدارت فرمائی۔شعبہء اردو مباحثوں اور مشاعروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔مولانا حسرت موہانی اور دوسرے فضلا اور شعرا تشریف لاتے تھے۔ان دنوں شعبہء اردو کے شگفتہ طبع استاد رشید احمد صدیقی صاحب کی مزاح آمیز تحریروں کا چرچا تھا۔شعبہء طبعیات کے پروفیسر چودھری صاحب صحیح معنوں میں سائنس دان مانے جاتے تھے۔شعبہء کیمیا کے حیدر خان صاحب، حیوانیات کے بابر مرزا صاحب، نباتیات کے ڈاکٹر رفیق احمد خان صاحب اقتصادیات کے کریم لودھی صاحب اور جغرافیہ کے ڈاکٹر عبادالرحمن خاں (جو یونیورسٹی کے چیف پراکٹر بھی تھے) سب کے سب لائق فائق مانے جاتے تھے۔ان دنوں یونیورسٹی کا انجینیرنگ کالج زیر تعمیر تھا اور جواں سال پروفیسر عبیداللہ خان درّانی اپنی خاص مہارت سے مشینوں کو نصب کرنے میں مشغول تھے۔" (۳۲)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہاسٹل کی زندگی (Hostel Life)

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اپنے مضمون میں مسلم یونیورسٹی میں قیام کے دوران ہاسٹل کی زندگی کی دلچسپ تفصیلات اس طرح بیان کیں:

''آفتاب ہوسٹل میں قیام (۱۹۴۱ تا ۱۹۴۲ء) کے دوران طلبہ کی ہوسٹل لائف سے متعلق مجھے دو باتوں سے آشنائی ہوئی ایک طلبہ کی یاری دوستی اور تفننِ طبع کے لیے آپس میں چھیڑ چھاڑ جس کو ایکٹیوٹی (Activity) کہا جاتا تھا، اور دوم ان کی علمی ادبی مساعی۔ یہ دونوں مشغلے دو سطحوں پر جاری وساری تھے۔ ایک لوکل یعنی ہوسٹل کی سطح پر اور دوسرے نیشنل یعنی یونیورسٹی کی سطح پر۔ شبِ تعارف یونیورسٹی سطح کی ایکٹیوٹی تھی مگر ہر ہوسٹل میں اس کا اہتمام ہوتا تھا۔ اس طرح بعض صاحبان کو خاص الخاص اسما اور القاب سے نوازا جاتا تھا جیسے یونین کے صدر، سعید انڈا، جو اس وقت کا ایک مشہور نام تھا لیکن اس عرف پر سعید صاحب نے کبھی بُرا نہیں مانا بلکہ اور زیادہ مشہور ومعروف ہو گئے۔ ایکٹیوٹی کا جوہر اسی میں تھا کہ قطعاً برا نہ مانا جائے۔ آفتاب ہوسٹل میں ایک نو وارد حسین جمیل طالب علم بڑے ناز و انداز کے عادی تھے اور بہت کچھ بنتے تھے۔ یار لوگوں نے ان کا نام ہیٹر (Heater) رکھ چھوڑا تھا لیکن یہ کوڈ ورڈ (Code Word) ہوسٹل تک محدود تھا۔ علمی و ادبی مساعی کا مرکز آفتاب ہوسٹل کی شمالی ونگ کے اوپر وارڈن کا کوارٹر تھا۔ ان دنوں اس کے روحِ رواں خورشید الاسلام صاحب تھے جن کا تعلق شعبہ اردو سے تھا اور غالباً ایم اے کر چکے تھے۔ ان کے ہاں شعر وادب کی محفلیں ہوتی تھیں۔ شعبہء اردو سے ایک شاندار میگزین شایع ہوا تھا جو خورشید الاسلام صاحب اپنے ساتھ لائے اور جس پر ایک نشست میں گفتگو ہوتی رہی۔

آفتاب ہوسٹل میں بمشکل ایک سال میں مشرّف بشرف اسکالر رہا۔ مجھے سنگل روم میں تنہائی محسوس ہوتی تھی۔ دوسری تکلیف کھانے کی تھی۔ میں دیر تک شعبہء عربی میں بیٹھ کر پڑھتا تھا اور پیچھے بیرا کھانا میرے کمرے میں چھوڑ کر چلا جاتا تھا جو سردیوں کے موسم

میں یخ ہوجاتا تھا اور کھایا نہیں جاسکتا تھا۔ یہ یونیورسٹی کا جمہوری کھانا تھا جو محمود و ایاز کے لیے یکساں تھا۔ بعض طلبہ مل کر انگیٹھیاں رکھتے تھے اور عطا شدہ رزق کو گرم کر کے کھانے کے قابل بناتے تھے یا پھر اپنی ایڈیشنل ڈشز پکاتے تھے۔ اس مشق سے بعض تو ڈگری حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اچھے بھلے باورچی بن جاتے تھے۔ بہر حال میری درخواست پر دوسرے سال مجھے پکی بارک (ایس ایس ایسٹ کمرہ نمبر ۱۶) میں جگہ مل گئی جہاں سندھ کے غلام مصطفی شاہ پہلے ہی مقیم تھے۔ ہم نے مل کر انگیٹھی خرید لی۔ کھانا گرم کرنا میرے ذمّے تھا اور بیرے کو بلا کر کھانا منگوانا ان کے ذمّے۔ مگر وہاں کے بیرے طلبہ سے کچھ زیادہ ہی خوددار تھے اور اپنی مرضی سے ہی کام کرتے تھے۔ ہمارا بیرا مجید تھا۔ کسی نزدیکی گاؤں کا رہنے والا۔ دھوتی لنگوٹی باندھتا تھا اور سر پر گاندھی جی والی سفید ٹوپی اوڑھتا تھا۔ غلام مصطفی شاہ نے ان کو خان بہادر کے لقب سے نوازا اور بجائے مجید کے ان کو خان بہادر، کہہ کر بلایا جاتا تھا۔ تاہم وہ اپنے کردار کے ساتھ اپنی رفتار کا بھی خود ہی مالک تھا۔ غلام مصطفی جب ان کو چیخ کر بلاتے تھے اور پوری فضا خان بہادر کی آواز سے گونج اٹھتی تھی تب جا کر کہیں مجید میاں نمودار ہوتے تھے۔'' (۲۴)

اسی مضمون میں ڈاکٹر بلوچ صاحب بیان کرتے ہیں کہ اُس عہد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جو اساتذہ تھے ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے فن میں کامل تھا۔ راقم الحروف سے انٹرویو کے دوران بلوچ صاحب نے فرمایا کہ اس عہد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جیسے اساتذہ موجود تھے ایسے اساتذہ انھوں نے کہیں نہیں دیکھے۔ ان اساتذہ میں شعبۂ فارسی کے ڈاکٹر ہادی حسن، شعبۂ فلسفہ کے ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن، شعبۂ تاریخ کے پروفیسر محمد حبیب، شعبۂ اردو کے پروفیسر رشید احمد صدیقی، شعبۂ طبیعیات کے پروفیسر چودھری، شعبۂ کیمیا کے حیدر خاں صاحب شعبۂ حیوانات کے بابر مرزا صاحب شعبۂ اقتصادیات کے کریم لودھی صاحب، شعبۂ جغرافیہ کے عباد الرحمن خان، شعبۂ نباتات کے رفیق احمد خان تھے۔ یہ تمام اساتذہ اپنے اپنے فن میں یکتا تھے۔ البتہ ان تمام اساتذہ میں جس استاد سے ڈاکٹر بلوچ صاحب کا قریب ترین تعلق قائم ہوا اور تا عمر جاری رہا وہ علّامہ عبدالعزیز میمن تھے۔ اس زمانے

میں بلوچ صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم اے (عربی) کے طالبِ علم تھے۔ علاّمہ میمن صدرِ شعبہ عربی تھے۔ علاّمہ میمن عربی زبان وادب کے بین الاقوامی شہرت یافتہ عالم اور محقق تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ ذہین اور محنتی طالب علموں کی بھرپور سرپرستی کرتے اور علمی وتحقیقی معاملات میں ان کی ہر ممکن مدد کرتے۔ بلوچ صاحب کا ابتداہی سے علاّمہ میمن سے قریبی تعلق قائم ہوا۔ علاّمہ میمن کی عادت تھی کہ صبح وشام چہل قدمی ضرور کرتے تھے۔ شام کی سیر کے دوران بلوچ صاحب ان کی مشایعت کرتے۔ اس دوران علاّمہ میمن ہزارہا علمی نکات بیان کرتے اور اپنی معلومات کا کھل کے اظہار کرتے۔ سوالات پر کوئی پابندی نہ تھی۔ جو سوال پوچھا جاتا اس کا مفصّل جواب دیتے۔ بلوچ صاحب نے دسمبر 1942ء سے علاّمہ میمن کے بیان کردہ ان علمی نکات کو اپنی نوٹ بک میں لکھنا شروع کیا جس کے نتیجے میں ''محاضراتِ میمنی'' جیسا مفید اور معلومات افزا مضمون تیار ہوا۔

خط بنام ظہیر الدین احمد صاحب پرنسپل، بہاء الدین کالج، جونا گڑھ

دورانِ تحقیق ہمیں ڈاکٹر بلوچ صاحب کا ایک یادگار خط بنام ظہیر الدین احمد صاحب پرنسپل، بہاء الدین کالج، جونا گڑھ ملا ہے جو اس زمانے کی یادگار ہے جب ڈاکٹر بلوچ علامہ میمن کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھ رہے تھے۔ یہ یادگار خط مکمل حالت میں درج ذیل ہے:

۲۵ رشوال ۱۳۶۲ھ مطابق ۲۵ راکتوبر ۱۹۴۳ء

معظم ومحترم جناب قبلہ ظہیر الدین احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مدتِ مدید کے بعد خدمت اقدس میں یہ نیاز نامہ ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ اللہ پاک نے آپ کو صحت کامل بخش دی ہوگی۔

میں یہاں مسلم یونیورسٹی میں ریسرچ کلاس عربک ڈپارٹمنٹ ہیں داخلہ لے چکا ہوں، سندھی ہونے کی وجہ سے میرا موضوع بحث میرا ملک ہی رہا: یعنی کہ ''السند

تحت سیطرۃ العرب'' مضمون نہایت بکھرا ہوا ہے، سندھ کے متعلق مکمل حالات تو بالکل ناپید ہیں البتہ خال خال کہیں کچھ چیزیں مل جاتی ہیں مگر غیر تسلی بخش۔ بہرحال میں اس ریزہ چینی پر امید لگائے بیٹھا ہوں۔ اس مضمون کے متعلق علماء ہند میں سے صرف محترم جناب حضرت سیّد سلیمان صاحب ندوی ہی میری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ''عرب و ہند کے تعلقات'' اس سلسلہ میں ان کی وسعتِ نظر کا زندہ ثبوت ہے۔

میں نے سنا ہے کہ رفقاء ندوہ میں سے جناب ابوظفر صاحب ندوی نے نیز سندھ پر کام کیا ہے۔ اپنے پیشرو کی علمی کوشش سے استفادہ کرنا بالکل ضروری ہے۔ اور یہ کام صرف جناب حضرت سیّد صاحب کی وساطت سے ہی ہوسکتا ہے لہٰذا میں ان کی علم دوستی میں امید رکھتے ہوئے ان کو ایک مؤدبانہ خط اس سلسلہ میں تحریر کر رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ کی سفارش بھی ضروری سمجھتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ برائے کرم آپ جناب حضرت سیّد صاحب کو سفارش کریں کہ وہ آپ کے ایک شاگرد اور عقیدت مند کی اس سلسلے میں ہر ممکن امداد فرمائیں۔

دیگر عرض کہ خان بہادر عبدالقادر صاحب یہاں تشریف لائے۔ کاٹھیاواڑی و سندھی طلبہ کی طرف سے ان کو ایک ''ایٹ ہوم'' دیا گیا اور ہار پہنائے گئے اور ساتھ ہی ایک ایڈریس پیش کیا گیا۔ اس انتظام کے لیے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے بمشورہ استاد میمن صاحب مجھے ہی چنا۔ الحمد للہ انتظام نہایت خوبی سے کیا گیا اور جو ایڈریس میں نے اپنے بھائیوں کی طرف سے پیش کیا وہ فی الحقیقت ایک بہاؤ الدینی کی حیثیت میں پیش کیا اور نیت یہی تھی کہ ہمارے بہاؤ الدین کالج کا اچھا خاصا تعارف کرا دیا جائے۔ اس ایڈریس کی نقل آپ کے مطالعہ کے لیے پیش کر رہا ہوں، اور مناسب ہو تو بعد میں ہمارے کالج میگزین میں شایع کیا جائے۔

پہلی مرتبہ ہے کہ اردو میں لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ یہ تحریر اغلاط

سے پاک نہ ہوگی لہٰذا خط کو عفو و اغماض سے درگزر کریں۔ والسلام

مخلص

نبی بخش

خاکسار تحریک سے تعلق

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے ایّامِ طالب علمی کے دوران خاکسار تحریک میں بھرپور شرکت کی تھی۔ ان کا اس تحریک سے 1936ء سے تعلق قائم ہوا جو 1946ء تک جاری رہا۔ یہ تعلق بہاء الدین کالج جونا گڑھ میں قائم ہوا۔ آپ نے جونا گڑھ شہر میں خاکساروں کا مارچ بھی کرایا تھا۔ اس طرح مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پہنچنے کے بعد بھی آپ کا خاکسار تحریک سے بھرپور تعلق رہا اور وہ یونیورسٹی میں خاکساروں کے سالارِ اعلیٰ بھی ہوگئے۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے راقم الحروف سے فرمایا تھا کہ ان کا خاکسار تحریک سے تعلق علی گڑھ کے دور تک رہا۔

جب علّامہ مشرقی علی گڑھ تشریف لائے تو علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی خواہش پر بلوچ صاحب نے ان سے ملاقات کی اور انھیں بتایا کہ مسلم یونیورسٹی میں مختلف مکاتبِ فکر کے احترام کی روایت چلی آرہی ہے اور وہ خود مسلم لیگی اور خاکسار طلبہ میں یکجہتی اور اشتراکِ عمل کے حامی ہیں۔ علّامہ مشرقی بلوچ صاحب کے دلائل سن کر مطمئن ہوگئے اور یوں بلوچ صاحب کی کوشش سے یونیورسٹی میں امن و امان کی صورتِ حال کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا۔ (۲۵)

اس عہد میں خاکسار تحریک سے وابستہ معروف شخصیات کے حوالے سے بلوچ صاحب اپنے مضمون 'ایّام علی گڑھ' میں لکھتے ہیں:

> ''ان دنوں یو پی کے خاکساروں میں بعض دانش ورتحریک میں فکری انقلاب لانا ضروری سمجھتے تھے۔ ان میں جناب پروفیسر کرار حسین صاحب (۲۶) اور جناب اختر حمید خان صاحب (۲۷) پیش پیش تھے۔ کرار صاحب میرٹھ کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔ اختر حمید خان (آئی سی ایس) بنگال سروس میں ڈپٹی کمشنر تھے جہاں سے استعفا

دے کر علی گڑھ آ گئے تھے اور انھوں نے خدمتِ خلق کے ذریعے محنت کش طبقے میں رہ کر ان کو سر بلند کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ ذاتی طور پر میرے دل میں ان دونوں صاحبوں کے لیے بے حد عزت و محبت تھی۔ اختر حمید خان صاحب زمین پر بیٹھ کر تالے بناتے تھے۔ کرّار صاحب کبھی کبھار علی گڑھ آ جاتے تھے۔ ان کی سربراہی میں ماہانہ انگریزی اخبار Radiance کا اجرا ہوا اور کرار صاحب اپنے قلم سے اس میں خوب سے خوب تر اسلامی فکری اداریے لکھتے تھے۔"

اس عہد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اساتذہ میں سے بعض خاکسار تحریک سے وابستہ تھے۔ ان میں جناب عبیداللہ درانی اور جناب رفیق احمد خان (۲۸) شامل تھے۔ عبیداللہ درانی صاحب کے بارے میں بلوچ صاحب نے راقم الحروف کو مورخہ ۲۲ جون ۲۰۰۶ء کو درج ذیل مفید معلومات سے آگاہ کیا تھا:

"عبید اللہ خان درّانی کا تعلق مدراس سے تھا۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خاکساروں کے لیڈر تھے۔ جب میں علی گڑھ پہنچا۔ ان دنوں درانی صاحب علی گڑھ انجینیر نگ کالج کے قیام کے لیے شب و روز کوشاں تھے۔ وہ خود الیکٹریکل انجینیر تھے اور کالج میں جو بھاری مشینیں آ رہی تھیں، انھیں وہ خود نصب کراتے تھے۔ ان دنوں ہم نے علی گڑھ کے قلعے میں خاکساروں کا کیمپ لگایا جس میں درانی صاحب نے بھی نہایت عالمانہ خطاب فرمایا۔ ان کا خطاب سن کر میں حیران رہ گیا کہ انجینیر ہونے کے باوصف اُنھیں تاریخِ اسلام کے بارے میں کس قدر معلومات ہیں۔ تقسیم کے بعد درانی صاحب علی گڑھ چھوڑ کر پشاور آ بسے جہاں انھوں نے انجینیئر نگ کالج قائم کیا۔ میری دو مرتبہ پشاور میں ان سے ملاقات بھی ہوئی۔ بعد میں انھوں نے مکمل درویشی اختیار کر لی اور سوات میں بونیر کے نزدیک ایک قدرتی چشمہ دریافت کیا اور وہاں خانقاہ قائم کی۔ ان کا انتقال اور تدفین اسی مقام پر ہوئی۔"

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے مفارقت

ایم اے عربی میں گولڈ میڈل حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر بلوچ نے علّامہ میمن کی نگرانی میں ''سندھ تحت عرب'' کے اہم موضوع پر ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تکمیل میں شب و روز مصروف تھے۔ علّامہ میمن بھی شدید خواہش مند تھے کہ وہ یہ مقالہ مکمل کریں لیکن یہ کام مکمل نہ ہوسکا۔ اس کی وجہ ڈاکٹر بلوچ صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

> ''سندھ کے وزیر اعلیٰ اور اولڈ علیگیرین جناب پیر الٰہی بخش (۲۹) کی کوشش سے کراچی میں مسلمانانِ سندھ کا پہلا اعلیٰ تعلیمی ادارہ ''سندھ مسلم کالج'' قائم ہوا اور مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی (۳۰) کو اس کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ انھوں نے مجھے ترغیب دی کہ میں کالج میں آجاؤں۔ استاد المیمنی نے فرمایا کہ آپ وہاں گئے تو آپ کا مقالہ رہ جائے گا۔ میں رک گیا۔ مگر شاید ڈاکٹر امیر حسن صاحب نے پیر الٰہی بخش صاحب کو مشورہ دیا اور انھوں نے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے نام خط بھیجا کہ اس نئے کالج کے لیے اسٹاف کی ضرورت ہے اور مجھے کالج میں آنے کی ترغیب دی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ خط استاد محترم کو بھیج دیا جس پر انھوں نے فرمایا کہ اگر اُن کو آپ کی ضرورت ہے تو پھر آپ جائیں۔ مجھے لیکچرر بننے پر جتنی خوشی ہوئی اس سے کچھ زیادہ ہی استادِ محترم سے مفارقت اور مسلم یونیورسٹی سے رخصت پر رنج ہوا۔'' (۳۱)

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے پیر الٰہی بخش صاحب کا خط علّامہ میمن کو بھیجا تو جواباً علّامہ میمن نے ایک موثر خط پیر الٰہی بخش صاحب کو لکھا جس میں موضوع کی اہمیت اور بلوچ صاحب کی محنت کا ذکر کر کے اس بات پر زور دیا کہ مقالہ مکمل کرنے دیں۔ علّامہ میمن نے اس خط میں پیر الٰہی بخش صاحب کو لکھا:

> ''سندھ زیر عرب'' کے عنوان پر انتہائی عرق ریزی سے یہ ریسرچ سوا دو سال سے جاری ہے۔ کوئی آٹھ ماہ اور رہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں ہندوستان میں آج تک گو

سندھ وعرب پر متعدد کتابیں مسلمانوں اور غیر مسلموں نے لکھی ہیں مگر کسی نے اتنی جانفشانی سے عربی ادبیات کے پوشیدہ گوشوں سے یہ مواد نہیں نکالا جس کا کھوج لگانا بلوچ صاحب کے نصیب میں تھا۔ میں کاٹھیاواڑی میمن ہوں مگر اس کام کی تکمیل کے لیے بے تاب ہوں مگر آپ کا، بلوچ صاحب کا تو سب کچھ سندھ ہے فِيها تَحيُون وفِيها تَموتُون ومِنها تُخرجُون (۲)۔ اگر اس طرح آپ کی توجہ شاملِ حال رہی تو ملازمت تو پھر بھی مل کر رہے گی مگر یہ کام روزمرہ نہیں ہوا کرتے۔ محض سندھ اور سندھ کے لیے میری آپ سے التماس ہے کہ آٹھ ماہ کے لیے کوئی عارضی انتظام کر لیجیے پھر بلوچ کو میں آپ کے حوالے کر دوں گا۔'' (۳۳)

بالآخر پیر الٰہی بخش اور ڈاکٹر امیر حسن صدیقی کا اصرار غالب آیا اور بلوچ صاحب علی گڑھ چھوڑ کر سندھ مسلم کالج کراچی میں لیکچرار ہو گئے۔ عربوں کے زیر اثر سندھ کی تاریخ کے جس اہم موضوع پر بلوچ صاحب تحقیق کر رہے تھے وہ نامکمل رہی البتہ برسوں بعد اس موضوع پر ڈاکٹر ممتاز پٹھان نے History of Sind- The Arab Period کے نام سے کتاب لکھی۔ تاریخِ اسلام سے متعلق عربی زبان میں ماخذات پر نظر رکھنے والوں کی رائے ہے کہ عربی زبان میں عدم مہارت کی وجہ سے یہ کام معیاری نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب عربی زبان میں مہارت کی وجہ سے جس معیار کا کام کر رہے تھے، وہ اگر علّامہ میمن کی نگرانی میں مکمل ہو جاتا تو تاریخِ سندھ کے ایک اہم دور سے متعلق کئی اہم گوشے بے نقاب ہو جاتے۔ اب ہمارے ہاں عربی و فارسی کی تعلیم کا جو عالم ہے اس صورتِ حال میں اس معیار کا کام شاید کبھی نہ ہو سکے۔

ایک ملاقات کے دوران بلوچ صاحب نے راقم الحروف سے فرمایا تھا کہ پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے تحقیق کے دوران انھوں نے تاریخ سندھ کے عرب دور سے متعلق جو مواد جمع کیا تھا اسے 'فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ' کے سندھی ترجمے کے حواشی میں استعمال کیا تھا۔

حواشی باب نمبر 3

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے ''پاپ بیتی۔ایک اور طرح کی آپ بیتی'' از اشفاق نقوی، ص: ۲۷ تا ۹۷۔

۲۔ اے کے بروہی معروف دانشور، ماہر قانون، سفیر اور سابق وفاقی وزیر قانون تھے۔آپ علامہ آئی آئی قاضی کے خاص شاگرد تھے۔آپ کی پیدائش ۲۴ر دسمبر ۱۹۱۵ءکو گڑھی یاسین (ضلع لاڑکانہ) میں ہوئی۔آپ پاکستان کے بین الاقوامی شہرت یافتہ وکیل تھے۔انتقال ۱۳ر ستمبر ۱۹۸۷ءکو لندن میں ہوا، تدفین کراچی میں ہوئی۔

۳۔ ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوتہ ممتاز دانشور، ماہر تعلیم، سابق ڈائریکٹر ادارۂ تحقیقات اسلامی کراچی اور سابق چیرمین اسلامی نظریاتی کونسل تھے۔آپ یکم جنوی ۱۹۱۷ءکو گل محمد ہالیپوتہ ضلع حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔وفات ۵ فروری ۲۰۰۱ءکو ہوئی۔

۴۔ انٹرویو ڈاکٹر نبی بخش بلوچ از محمد راشد شیخ مورخہ ۲۲ جون ۲۰۰۶ء بہ مقام سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد۔

۵۔ باقر علی ترمذی، بہاء الدین کالج جوناگڑھ میں فارسی و عربی کے استاد سید محمد علی ترمذی کے صاحب زادے تھے۔آپ نے کم عمری میں نہایت شاندار علمی خدمات انجام دیں۔بمبئی یونیورسٹی سے ۱۹۴۰ء میں ایم اے عربی کیا اور چانسلر کا تمغہ حاصل کیا۔نومبر ۱۹۴۳ء سے اسماعیل یوسف کالج بمبئی میں بطور استاد عربی ملازمت کا آغاز کیا۔آپ نے ''گجرات میں عربی زبان کی خدمت'' کے موضوع پر بڑی محنت سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا، جس پر ۱۹۴۷ء میں Ph.D کی ڈگری بمبئی یونیورسٹی سے حاصل کی۔مقالے کی خاطر علّامہ عبدالعزیز میمن سے بھی استفادہ کیا۔۱۱ر جون ۱۹۵۱ءکو صرف ۳۵ برس کی عمر میں بمبئی میں وفات پائی۔

۶۔ انٹرویو ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مورخہ ۲۲ جون ۲۰۰۶ء۔

۷۔ ملاحظہ فرمائیں ''قاضی احمد میاں اختر اور جوناگڑھ کی یاد میں'' از ڈاکٹر این اے بلوچ در کتاب ''گلشنِ اردو'' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر ۲۲۴۔ یہی مضمون قبل ازیں مجلہ تحقیق، شمارہ نمبر ۹۔۸ شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی میں بھی شایع ہو چکا ہے۔

۸۔ ایضاً

۹۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، اردو، عربی اور فارسی کے محقق اور جوناگڑھ کے صاحبِ ثروت افراد میں تھے۔ تقسیم برصغیر کے بعد آپ کراچی آ گئے اور انجمن ترقی اردو میں بحیثیت معتمد خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی کوشش سے سندھ یونیورسٹی حیدرآباد میں شعبۂ تاریخ اسلام کے صدر بنے۔ آپ کا انتقال ۶ / اگست ۱۹۵۵ء کو حیدرآباد میں ہوا۔ تدفین کراچی میں ہوئی۔

۱۰۔ ملاحظہ فرمائیں ''قاضی احمد میاں اختر اور جوناگڑھ کی یاد میں'' مجلہ تحقیق شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی جام شورو، شمارہ نمبر ۱۰۔۱۱، ص: ۱۸۔ یہی مضمون بعد ازاں 'گلشن اردو' مرتبہ محمد راشد شیخ میں بھی شایع ہوا۔

۱۱۔ پروفیسر وائی ایس طاہر علی، بہاء الدین کالج جوناگڑھ میں استاد عربی تھے۔ آپ تقسیم برصغیر کے بعد حیدرآباد (سندھ) منتقل ہو گئے اور کئی تعلیمی اداروں میں خدمات انجام دیں۔ آپ پبلک سروس کمیشن کے رکن بھی رہے۔ انتقال ۵ / مارچ ۱۹۹۰ء کو حیدرآباد (سندھ) میں ہوا۔

۱۲۔ ملاحظہ فرمائیں ''قاضی احمد میاں اختر اور جوناگڑھ کی یاد میں'' از ڈاکٹر این اے بلوچ مجلہ تحقیق، شمارہ نمبر ۹۔۸ شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی' ص: ۱۷۔ یہی مضمون بعد ازاں 'گلشن اردو' مرتبہ محمد راشد شیخ میں بھی شایع ہوا۔

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد بین الاقوامی شہرت یافتہ ریاضی دان اور مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے وائس چانسلر تھے۔ آپ ۱۳ / فروری ۱۸۷۳ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ تمام زندگی علی گڑھ یونیورسٹی کی ترقی اور طلباء کی تعلیم کی خاطر صرف کر دی۔ انتقال ۲۳ دسمبر ۱۹۴۷ء کو لندن میں اور تدفین سرسیّد کے پہلو میں علیگڑھ میں ہوئی۔

۱۵۔ قرآنی آیت

۱۶۔ ملاحظہ فرمائیں ''ایام علی گڑھ'' از پروفیسر نبی بخش بلوچ، علی گڑھ میگزین (خصوصی شمارہ ۹۷۔۱۹۹۵ء)،

ص:۲۱۸۔یہی مضمون بعدازاں 'گلشن اردو' مرتبہ محمد راشد شیخ میں بھی شایع ہوا۔

۱۷۔ ملاحظہ فرمایئے ''سرسیّد کا تعلیمی منصوبہ اور عہدِ حاضر میں اس کی معنویت'' از ڈاکٹر نورالحسن نقوی' سہ ماہی ''فکرو آگہی دہلی'' علی گڑھ نمبر جلد نمبر ۱۱ تا ۱۴، ۲۰۰۰ء، ص ۲۱۷۔

۱۸۔ ایضاً ص: ۲۴۔

۱۹۔ ان مشاہیر کے علاوہ برصغیر پاک و ہند کے ہر شعبے کے نامور افراد نے اس یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی جن میں سے بعض کی علیگڑھ میں قیام کی دلچسپ یادیں رسالہ علی گڑھ میگزین کے خاص نمبر ''علی گڑھ آئینۂ ایام میں'' میں شائع ہوئیں۔ یہ خاص نمبر علی گڑھ میگزین ۹۷۔۱۹۹۵ء کے طور پر شائع ہوا۔

۲۰۔ بحوالہ ''ایام علی گڑھ'' از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ در کتاب 'گلشن اردو' مرتبہ محمد راشد شیخ۔یہی مضمون قبل ازیں علی گڑھ میگزین ۹۷۔۱۹۹۵ء' ص:۲۱۹۔ میں بھی شایع ہوا۔

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔علّامہ عبدالعزیز میمن عربی زبان و ادب کی عبقری شخصیت تھے۔ آپ ۲۳ ر اکتوبر ۱۸۸۸ء کو پڑدھڑی (راج کوٹ) میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم راج کوٹ اور جونا گڑھ میں حاصل کی۔بعدازاں دہلی پہنچے جہاں دیگر علماء کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد سے تلمذ اختیار کیا۔ دہلی سے امروہہ اور وہاں سے رام پور بغرض حصولِ علم پہنچے۔ ۱۹۱۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان دیا اور پوری یونیورسٹی میں اول آئے۔ اسی سال ایڈورڈ کالج پشاور میں عربی و فارسی کے استاد کے طور پر ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۵ء اورینٹل کالج لاہور میں استاد عربی کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۴ء تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ریڈر، پروفیسر اور صدر شعبہ عربی کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۴ء تک کراچی میں رہے اور ادارۂ تحقیقات اسلامی اور شعبۂ عربی جامعہ کراچی میں قائم کیا۔ ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۶ء پنجاب یونیورسٹی میں صدر شعبہ عربی رہے۔آپ کا انتقال ۲۷ ر اکتوبر ۱۹۷۸ء کو کراچی میں ہوا۔علّامہ میمن کے معروف شاگردوں میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر سید محمد یوسف، ڈاکٹر خورشید احمد فارق، ڈاکٹر مختارالدین احمد، مولانا امتیاز علی خان عرشی، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر اور ڈاکٹر احمد خان شامل ہیں۔مفصل حالات اور علمی خدمات کے لیے ملاحظہ

فرمائیں ''علّامہ عبدالعزیز میمن۔سوانح اور علمی خدمات'' از محمد راشد شیخ

۲۳۔عبیداللہ درّانی کا تعلق مدراس سے تھا۔آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں الیکٹریکل انجینیر نگ کے استاداور انجینئر نگ کالج کے بانیوں میں تھے۔تقسیم برصغیر کے بعد آپ علی گڑھ سے پشاور منتقل ہوگئے۔ جہاں انجینیر نگ کالج قائم کیا۔آپ کا تصوّف کی جانب خاص رجحان تھا۔عمر کے آخری دور میں سوات کے نزدیک ایک قدرتی چشمہ دریافت کیااور وہاں خانقاہ قائم کی۔آپ کا انتقال ۹رجون ۱۹۹۰ءکواسی مقام پر ہوا۔تدفین بھی وہیں ہوئی۔

۲۴ ۔بحوالہ ''ایام علی گڑھ'' از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ در کتاب 'گلشن اردو' مرتبہ محمد راشد شیخ۔یہی مضمون قبل ازیں علی گڑھ میگزین ۹۷۔۱۹۹۵ء ص:۲۱۹۔میں بھی شایع ہوا۔

۲۵۔ایضاً

۲۶۔ پروفیسر کرار حسین ممتاز ماہرِ تعلیم، دانشوراور سابق وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ تھے۔ ولادت ۸رستمبر ۱۹۱۱ءکوکوٹ (راجپوتانہ) میں اور وفات ۷ نومبر ۱۹۹۹ءکوکراچی میں ہوئی۔

۲۷ ۔اختر حمید خان ممتاز سماجی سائنسدان، علّامہ مشرقی کے داماداور سابق پرنسپل وکٹوریہ کالج کومیلا تھے۔ اس کے علاوہ اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے آپ ہی خالق تھے ولادت:۱۵ر جولائی ۱۹۱۴ءبہ مقام آگرہ وفات: ۱۹رکتوبر ۱۹۹۹ءانڈیانا امریکہ۔

۲۸۔ رفیق احمد خان، شعبہ نباتات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق صدر اور اسلامیہ کالج لاہور کے سابق پروفیسر تھے۔انتقال ۲۰فروری ۱۹۸۲ءکولاہور میں ہوا۔

۲۹۔ پیر الٰہی بخش مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق طالب علم، تحریک خلافت وتحریک پاکستان کے ممتاز رہنما تھے۔آپ سندھ کے وزیر تعلیم اور وزیر اعلیٰ بھی رہے۔آپ کا انتقال ۱۸راکتوبر ۱۹۷۵ءکوہوا۔تدفین آپ کی بسائی ہوئی پیر الٰہی بخش کالونی کراچی کی جامع مسجد کے نزدہوئی۔

۳۰۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی تاریخِ اسلام کے مشہور استاد تھے۔آپ ایس ایم کالج کے پہلے پرنسپل تھے۔ اس کے علاوہ کراچی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ تاریخ بھی بنے۔آپ کی پیدائش ۱۸راگست ۱۹۰۱ءاور وفات ۱۷ر

دسمبر ۱۹۷۱ء کو کراچی میں ہوئی۔

۳۱۔ بحوالہ ''ایام علی گڑھ'' از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ص: ۲۳۴۔

۳۲۔ ملاحظہ فرمایئے ''علّامہ میمن کا ایک نہایت ممتاز شاگرد'' از ڈاکٹر مختار الدین احمد، مجلہ تحقیق جامعہ سندھ، شمارہ نمبر ۱۰۔۱۱، ص: ۱۶۸۔

۳۳۔ قرآنی آیت جس کا ترجمہ ہے: ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناگوار ہو اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو۔
(سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۱۶)

۳۴۔ بحوالہ ''محاضرات میمنی'' از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ در کتاب 'گلشن اردو' مرتبہ محمد راشد شیخ۔ یہی مضمون قبل ازیں مجلہ تحقیق شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی جام شورو، شمارہ نمبر ۱۰۔۱۱ میں بھی اشاعت پذیر ہوا۔
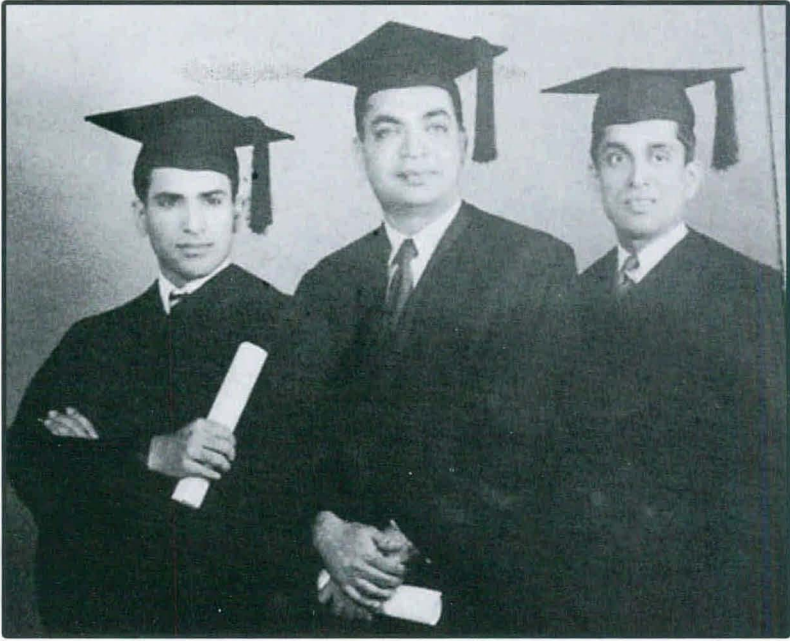
بائیں سے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ایچ اے فاروقی اور آر اے قریشی۔ کولمبیا یونیورسٹی نیویارک سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد
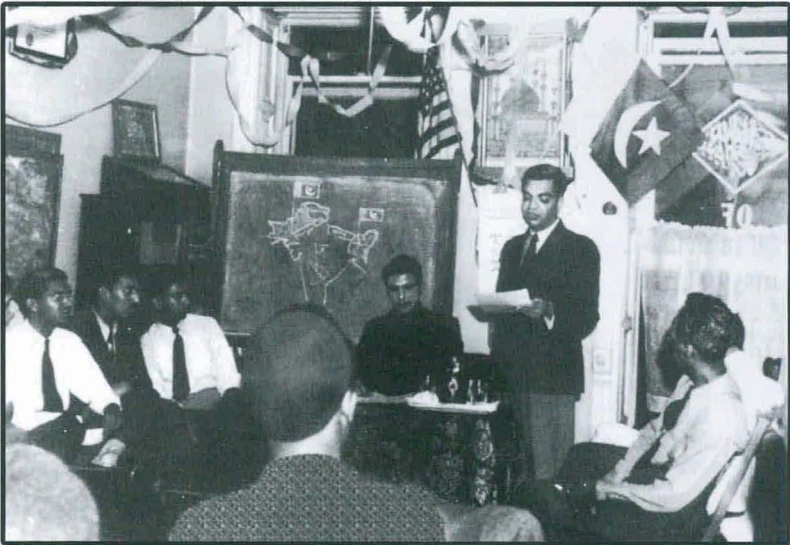
قیام پاکستان کے محض چند گھنٹے بعد نیویارک میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی کوشش سے پہلا یوم پاکستان منایا گیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب اسٹیج پر بیٹھے ہوئے ہیں
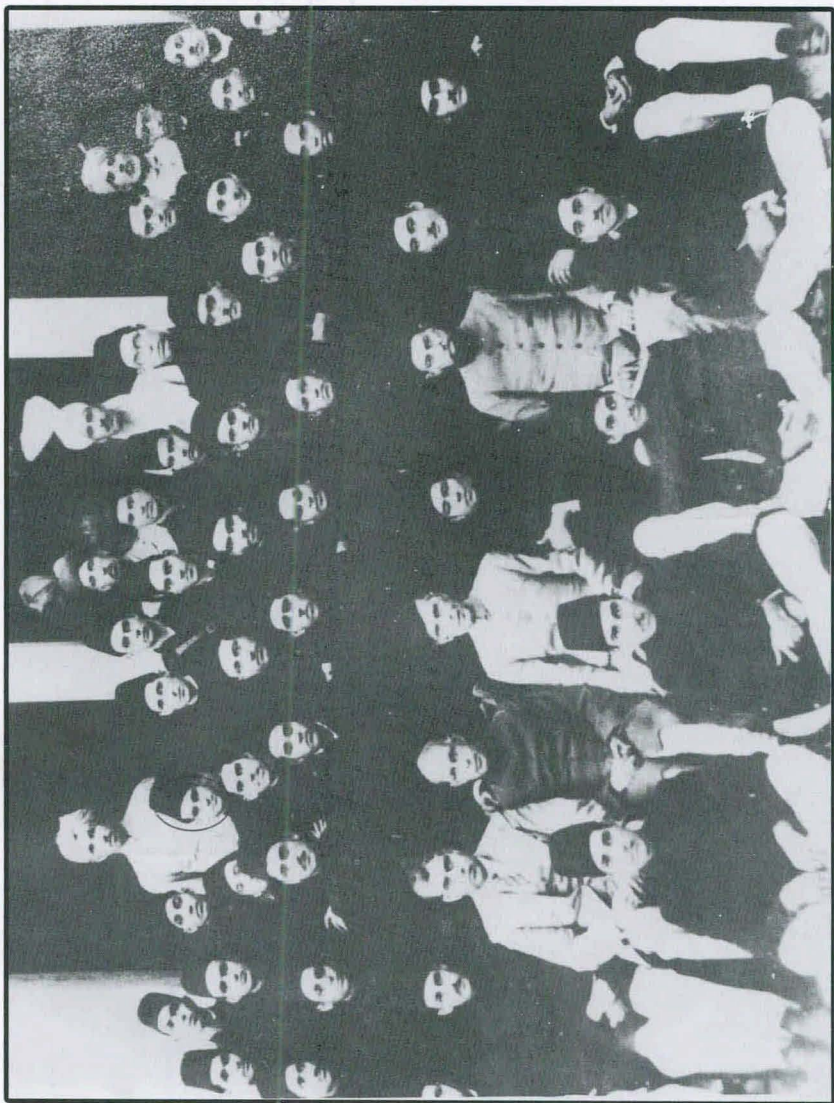
ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے قیام علی گڑھ کی یادگار تصویر۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اساتذہ اور طلبہ قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھ۔

علامہ آئی آئی قاضی، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اور اساتذہ وطلبہ سندھ یونیورسٹی۔ ۱۹۵۳ء کی ایک یادگار تصویر

باب نمبر 4

علّامہ عبدالعزیز میمن اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ
عظیم استاد اور عظیم شاگرد

علامہ عبدالعزیز میمن ڈاکٹر بلوچ کی نظر میں

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے اپنے طالب علمی کے دور میں مختلف اصحابِ علم و فضل سے استفادہ کیا۔ راقم الحروف سے ایک ملاقات کے دوران انھوں نے فرمایا تھا کہ ان کے علی گڑھ کے چھ سالہ قیام کے دوران انھوں نے دیکھا کہ ہر شعبے میں بہترین ماہرینِ علم و فضل جمع ہو چکے تھے۔ ان کے علاوہ زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف اساتذہ سے انھوں نے استفادہ کیا اور ان سب کے وہ مشکور تھے لیکن ان تمام اساتذہ میں سے اگر صرف ایک کا ذکر کرنا ضروری ہو تو وہ صرف اور صرف علّامہ عبدالعزیز میمن ہی ہوں گے۔

علّامہ عبدالعزیز میمن کے احترام کا یہ عالم تھا کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب ہمیشہ ان کے نام سے قبل ''الاستاذ'' لکھتے اور بولتے تھے۔ علّامہ میمن ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے تمام عمر عربی زبان وادب کی خدمت کی۔ علمائے عرب آج بھی ان کا نام احترام سے لیتے ہیں۔ وہ عربی لغت اور عربی شعر وادب میں یکتائے روزگار تھے۔ بقول بلوچ صاحب اس برصغیر میں استاد عبدالعزیز میمن جیسے جَبَلُ العِلم کا پیدا ہونا اور پنپنا ایک معجزے سے کم نہ تھا(۱)۔

جیسا کہ گزشتہ باب میں ذکر آچکا، بلوچ صاحب 1941ء میں ایم اے کے طالب علم کی حیثیت سے

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پہنچے تھے۔اس وقت علاّمہ میمن شعبۂ عربی کے صدر تھے۔یہی وہ وقت تھا کہ بلوچ صاحب کا علاّمہ میمن سے تعلق قائم ہوا جو نہ صرف قیامِ علی گڑھ کے دوران برقرار رہا بلکہ کراچی میں علاّمہ میمن کے انتقال (27/اکتوبر 1978ء) تک استاد اور شاگرد کا یہ رشتہ بہت مضبوط ہو چکا تھا۔علاّمہ میمن بھی اپنے اس ہونہار شاگرد کی نہ صرف ہر طرح سرپرستی کرتے بلکہ انھیں مفید مشورے بھی دیتے۔علاّمہ میمن کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ طالب علموں میں جوہر قابل کی تلاش جاری رکھتے اور جہاں کہیں جوہرِ قابل نظر آتا اس کو اپنی سرپرستی میں لے کر علم و تحقیق کے راستوں پر گامزن کر دیتے تھے۔ بلوچ صاحب کی ذات میں علاّمہ میمن جوہرِ قابل دیکھ چکے تھے چنانچہ انھوں نے علی گڑھ میں بلوچ صاحب کی ہر ممکن طریقے سے سرپرستی کی۔ یہاں تک کہ بلوچ صاحب کے لیے اپنا قیمتی کتب خانہ بھی کھول دیا کہ جس کتاب سے چاہیں استفادہ کریں حالانکہ وہ علی گڑھ میں اس حوالے سے خاصے سخت گیر مشہور تھے۔بلوچ صاحب نے راقم سے ایک ملاقات کے دوران فرمایا تھا کہ استاد میمن کی ان پر اس قدر نوازشات تھیں کہ انھیں ہر طرح کے سوالات کی اجازت تھی جن کے مفصل جوابات ارشاد فرماتے۔کبھی ایسا نہ ہوا کہ علاّمہ میمن نے کسی سوال کا برا مانا ہو یا غیر تسلی بخش جواب دیا ہو۔(۲)

الحمد للہ راقم الحروف کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ استاد شاگرد دونوں کی مفصل سوانح حیات راقم ہی نے لکھیں۔علامہ عبدالعزیز میمن کی سوانح ''علامہ عبدالعزیز میمن سوانح اور علمی خدمات'' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے جبکہ بلوچ صاحب کی مفصل سوانح آپ کے زیرِ مطالعہ ہے۔دورانِ تحقیق راقم کو استاد شاگرد میں بعض دلچسپ مماثلتوں کا علم ہوا جن کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے:

ا۔علامہ میمن اور ڈاکٹر بلوچ دونوں کی ابتدائی زندگی نہایت عسرت میں گزری لیکن حصول علم کی شدید خواہش کی وجہ سے دونوں نے ان مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور ہار نہیں مانی۔

۲۔علامہ میمن اور ڈاکٹر بلوچ دونوں زندگی میں سادگی پسند تھے اور ٹیپ ٹاپ اور غیر ضروری تکلفات کو ناپسند کرتے تھے۔

۳۔علامہ میمن اور ڈاکٹر بلوچ دونوں کے مزاجوں میں خودداری اور استغنا تھا۔دونوں کبھی دنیاوی عہدوں کی خاطر اپنے مقام سے نیچے نہیں اترے بلکہ جس عہدے پر بھی فائز رہے اسے وقار بخشا اور اس عہدے کے تقاضوں

سے بڑی ایمان داری اور محنت سے عہدہ برآ ہوئے۔

۴۔علامہ میمن اور ڈاکٹر بلوچ دونوں عمدہ صحت برقرار رکھنے کی خاطر صبح بعد فجر اور شام کو چہل قدمی Walk کے عادی تھے۔

۵۔علامہ میمن اور ڈاکٹر بلوچ دونوں علمی کاموں کی خاطر شدید محنت کے قائل تھے اور انھوں نے جو جو علمی کام کیے ان کی مستقل اہمیت ہے۔

۶۔علامہ میمن اور ڈاکٹر بلوچ دونوں سہل انگار طالب علموں کو ناپسند کرتے اور جوہر قابل کی بھرپور سرپرستی کرتے تھے۔

۷۔علامہ میمن اور ڈاکٹر بلوچ دونوں تحقیق کی خاطر شاگردوں سے بھی محنت کراتے اور گویا اسے کندن بنا دیتے تھے۔

۸۔علامہ میمن اور ڈاکٹر بلوچ دونوں نے زندگی میں دو دو نکاح کیے اور صاحب اولاد تھے۔

۹۔علامہ میمن اور ڈاکٹر بلوچ دونوں کی زندگی کے آخری ادوار بیٹیوں کے پاس گزرے اور ان ادوار میں ان کی بیٹیوں نے ان کی بہت خدمت کی اور دعائیں لیں۔

۱۰۔علامہ میمن اور ڈاکٹر بلوچ دونوں نے نوے سے سو سال کے درمیان عمر پائی۔

علّامہ میمن کا طرز تدریس، رہنمائی اور بلوچ صاحب کی سرپرستی

علامہ میمن کے طرز تدریس و دیگر موضوعات پر ہمیں مفید معلومات پروفیسر محمد عمر چنڈ کی مرتبہ کتاب سنڌ جو ذهين ٻار ڊاڪٽر نبي بخش خان بلوچ (سندھ کا ذہین بچہ۔ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) میں ملتی ہیں۔یہ کتاب دراصل ایک طویل انٹرویو ہے جو بلوچ صاحب نے پروفیسر محمد عمر چنڈ کو مختلف نشستوں میں دیا اور انھیں اپنی یادداشتیں ریکارڈ کرائی تھیں۔اس کتاب میں ہمیں جو معلومات دستیاب ہوئیں ان کا سلیس اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

ایم اے میں گولڈ میڈل لینے کی وجہ سے مجھے پی ایچ ڈی کرنے کے لیے اسکالر

شپ ملی چنانچہ علامہ میمن کے مشورے سے میں نے 'سندھ زیر عرب' کے موضوع پر پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن کرالی اور شب و روز علمی تحقیق میں مگن ہوگیا۔ میرے تحقیق اور تجسس کے شوق کا آغاز بھی علی گڑھ ہی میں علامہ میمن کی صحبت میں ہوا۔ جب میں نے دیکھا کہ ہمارے استاد علامہ عبدالعزیز میمن علم کے کس بلند مقام پر فائز ہیں تو میرے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی اس منزل تک پہنچوں۔ یہ جذبہ کہ اعلیٰ علمی قابلیت پیدا کی جائے وہیں پیدا ہوا علمی قابلیت ایسی ہو کہ وسیع علمی معلومات ہوں، فکر میں گہرائی ہو، اس وقت تو ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ علامہ عبدالعزیز میمن کے پڑھانے کا طریقہء کار اس قدر اعلیٰ تھا کہ ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے انھوں نے ہمارے سامنے علم کا دریا بہا دیا ہو۔ وہ جب کوئی کتاب پڑھاتے (مثلاً المبرد کی کتاب 'الکامل') یا جب گرامر سے متعلق کوئی سوال کرتا تو گرامی کی امہات الکتب کے حوالات دے کر بات سمجھاتے یا اگر کوئی بیان دوران تدریس آتا تو ماضی کے عالموں کے اقتباسات زبانی بیان کر کے سمجھاتے تھے مثلاً اس بارے میں اصمعی نے یہ لکھا، جاحظ نے یہ لکھا۔ دوران تدریس جب کوئی شعر آتا تو قوی حافظے کی مدد سے پورا قصیدہ سنا دیتے جس سے یہ شعر ماخوذ ہوتا خواہ وہ قصیدہ کتنا ہی طویل ہوتا۔

اس کے علاوہ اس موضوع پر ہمیں بلوچ صاحب کی تحریروں میں مفید معلومات ملتی ہیں۔ وہ ایک مضمون میں علّامہ میمن کا کلاس میں لیکچر دینے کا طریقہ، ایم اے عربی میں مولانا سیّد سلیمان ندوی کو زبانی امتحان Viva دینے کا واقعہ، ایم اے میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کرنا اور اس کے بعد علّامہ میمن کے مشورے اور حوصلہ افزائی سے پی ایچ ڈی کے لیے تحقیق کے آغاز سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''شعبہء عربی کے صدر عالی قدر پروفیسر استاد عبدالعزیز المیمنی (میمن صاحب) تھے جو علم و فضل کے روشن مینار تھے۔ وہ درسی کتاب کی عبارت تو سمجھاتے تھے لیکن اس سے آگے بڑھ کر اُس عبارت کے مآخذ اور سیاق و سباق بیان فرماتے۔ اگر درس میں کہیں کوئی شعر آجاتا تو شاعر کے دیوان کا حوالہ دے کر اپنے حافظے سے، اس سلسلے کے سب

اشعار پڑھ کر سناتے۔ ایک بار انھوں نے روبۃ بن العجاج کا پورا ارجوزہ پڑھ کر سنایا۔ ان کے لیکچر کا انداز محققانہ ہوتا تھا، ٹیکسٹ تک محدود رہنے کے بجائے وہ وسیع معلومات مہیا کرتے تھے۔ شعبہ عربی میں ہمارے دوسرے استاد مولانا بدرالدین علوی صاحب تھے جو قدیم روایتی انداز میں پڑھاتے تھے۔ ڈاکٹر عابد علی اوکسفورڈ کے ڈی فل تھے اور انگریزی میں لیکچر دیا کرتے تھے۔ اس وقت سیّد محمد یوسف کو ڈاکٹری کی ڈگری مل چکی تھی۔ انھوں نے استاد المیمنی کی رہنمائی میں اموی دور کے مشہور جرنیل مہلب بن ابی صفرہ پر مقالہ لکھا تھا۔ خورشید احمد فارق ڈاکٹریٹ کے لیے زیاد بن ابیہ پر مقالہ مرتب کر رہے تھے۔ شعبہ عربی میں کلی طور پر علمی ماحول تھا اور ہم نے بہت کچھ حاصل کیا۔ اس وقت میرا مدعا وکیل بننے کا تھا تاکہ آزادانہ طور پر قومی آزادی کے لیے کام کرسکوں لہٰذا شعبہ قانون کے نصاب پر کچھ زیادہ توجہ رہی۔ ایم اے کے مضامین کو بھی کافی کچھ سمجھنے کی کوشش کی مگر ایم اے فائنل وائے واVival میں مجھے اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوا۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی صاحب ممتحن تھے۔ مجھے ایک عبارت پڑھنے کو کہا جس میں لفظ سکان آیا تھا۔ سیّد صاحب نے سکان کے معنی پوچھے میں نے اس لفظ کے معنی پر کبھی سوچا بھی نہ تھا کیوں کہ سندھی میں بھی سکان ہی کہا جاتا ہے۔ میں نے بتایا کہ یہ لکڑی کا ایک آلہ ہے جس سے کشتی کا رخ موڑ لیا جاتا ہے۔ لیکن سیّد صاحب نے فرمایا کہ اس کو کیا کہا جاتا ہے۔ میں اتنا کنفیوز ہو گیا کہ انگریزی میں بھی نام بتا نہ سکا۔ اردو لفظ سے تو میں نابلد تھا۔ سیّد صاحب نے شفقت سے کہا کوئی بات نہیں اس کو پتوار کہا جاتا ہے۔

اس تجربے کے بعد مجھے بین خوف و رجا امتحان کے نتیجے کا انتظار رہا۔ ایل ایل بی کا نتیجہ فرسٹ ڈویژن میں آیا اور وکیل بننے کے امکانات روشن ہوئے مگر بعد میں ایم اے کا نتیجہ فرسٹ ڈویژن میں فرسٹ آیا جس نے آئندہ کا رخ بدل دیا۔ اس وقت ایسی کامیابی پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے تین سال تک پچاس روپیہ ماہوار

وظیفہ ملتا تھا۔ استاد میمن صاحب نے خوش ہو کر فرمایا کہ خورشید احمد صاحب اپنا کام مکمل کرنے والے ہیں اور اب آپ کی باری ہے۔ آپ رک جائیں اور پی ایچ ڈی کے لیے السند تحت سیطرۃ العرب پر کام کریں۔ میں نے آمنّا وصدّقنا کہہ دیا۔ اس طرح مسلم یونیورسٹی میں تقریباً تین سال مزید (۱۹۴۳۔۱۹۴۵ء) رہنے کا موقعہ ملا۔" (۳)

علّامہ میمن کی رہنمائی برائے تحقیقی مقالہ پی ایچ ڈی

جیسا کہ ذکر ہوا، علّامہ میمن کی شفقت اور سرپرستی اس حد تک بڑھی کہ بلوچ صاحب کے لیے انھوں نے اپنا قیمتی کتب خانہ کھول دیا۔ ایک ملاقات کے دوران بلوچ صاحب نے راقم سے فرمایا کہ قیامِ علی گڑھ کا پورا زمانہ انھوں نے وسیع وعمیق مطالعہ کر کے گزارا۔ اس زمانے میں ان کی عادت تھی کہ کتاب کا مطالعہ مکمل کر کے آخری صفحے پر باریک الفاظ میں اپنا قلمی نام "عثمان السندی" لکھ دیا کرتے تھے۔ نہ صرف علّامہ میمن کی کتب بلکہ لٹن لائبریری (موجودہ مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری) کی کئی کتب کے آخر میں یہ قلمی نام آج بھی موجود ہے۔

1943ء میں بلوچ صاحب نے ایم اے (عربی) میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی (۴)۔ اس سے قبل بلوچ صاحب مسلم یونیورسٹی سے ایل ایل بی فرسٹ ڈویژن میں پاس کر چکے تھے۔ جب ایم اے عربی میں فرسٹ کلاس فرسٹ میں کامیابی حاصل کی تو علّامہ میمن کے مشورے پر "سندھ تحت عرب" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کے لیے رجسٹریشن کرایا۔ یہ موضوع علّامہ میمن کا منتخب کردہ تھا اور وہ ہر طرح سے خواہش مند تھے کہ بلوچ صاحب اس اہم موضوع پر ڈاکٹریٹ کرلیں مگر یہ مقدر میں نہ تھا۔ 1943ء تا 1945ء بلوچ صاحب نے علّامہ میمن کی نگرانی میں اس موضوع پر جم کر کام کیا۔

ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تکمیل کے لیے علّامہ میمن دو طرح سے رہنمائی کرتے: اوّل ہر مسئلے میں وہ خود رہنمائی کرتے اور تحقیق کے کام کو آگے بڑھاتے دوم وہ اس مقالے میں معاونت کی خاطر علما وفضلا کو سفارشی خطوط لکھتے جن سے بلوچ صاحب کو رہنمائی حاصل ہوتی۔ اس بارے میں علّامہ میمن نے جن مشاہیر کو خطوط لکھے ان میں

قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ(۵)، پروفیسر مولوی محمد شفیع،(۶) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (۷) شامل ہیں۔ان کے علاوہ مولانا امتیاز علی عرشی(۸) کو بھی خط لکھا جس کی بنا پر بلوچ صاحب کو رامپور کے شاہی کتب خانے سے استفادے اور شاہی مہمان خانے میں قیام کا موقع ملا۔

پہلے تحقیقی مقالے کی اشاعت

علّامہ میمن کی رہنمائی اور مسلسل محنت کے نتیجے میں بلوچ صاحب نے خود میں اتنی استعداد محسوس کر لی تھی کہ تحقیقی مقالہ لکھ سکیں۔ چنانچہ آپ نے اموی دور کے آخر کے ایک باغی قائد منصور بن جمہور کے سندھ پر تسلط پر مقالہ لکھا جس کے لیے شعبۂ تاریخ کے استاد پروفیسر شیخ عبدالرشید سے معاونت حاصل کی۔ البتہ بلوچ صاحب کا پہلا مطبوعہ تحقیقی مقالہ حیدر آباد دکن کے معروف علمی و تحقیقی رسالے Islamic Culture میں شائع ہوا۔ اس مقالے کی وجہ تحریر کے بارے میں بلوچ صاحب لکھتے ہیں:

> ''اُن دنوں اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) میں کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر جناب محمد اسحاق صاحب کا مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے 'فتوح البلدان' کے مصنف بلاذری کے اس بیان کو غلط قرار دیا تھا کہ دیبل (سندھ) بھروچ (گجرات) اور تھانہ (نزد بمبئی) پر مسلمانوں کا پہلا بحری حملہ حضرت عمرؓ کی خلافت میں 15ھ میں ہوا۔ انھوں نے دلائل پیش کیے کہ یہ حملہ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں 24ھ میں ہوا۔ اس کے برعکس میں اپنے مطالعے کے دوران اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ مؤرخ بلاذری کمال حد تک ثقہ ہیں اور ان کے حوالوں کو رد کرنا یا ہلانا آسان نہیں۔ لہذا میں نے فاضل پروفیسر کے دلائل کا جائزہ لینا شروع کیا اور ان کو رد کرتے ہوئے بلاذری کے حوالے کی تصدیق اور تائید میں ایک مقالہ تیار کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ پہلے مقالے کی نسبت اس مقالے میں میری انگریزی کچھ بہتر تھی تاہم اپنے استاد بھائی سیّد محمد یوسف (۹) سے گزارش کی جنھوں نے پورے مقالے کو پڑھ کر میری کمزور عبارتوں کی تصحیح فرمائی۔ اس کے بعد جب یہ مقالہ ''اسلامک کلچر'' کے ایڈیٹر کو

بھیجا گیا تو انھوں نے اشاعت کے لیے قبول کرلیا جس پر مجھے بہت بہت خوشی ہوئی اور اطمینان ہوا کہ میں اپناڈاکٹریٹ کی ڈگری والا مقالہ خیر وخوبی سے لکھ سکوں گا۔''(۱۰)

ایک اور مضمون میں بلوچ صاحب نے علاّمہ میمن کی رہنمائی کی مزید تفصیلات تحریر کی تھیں۔انھوں نے اس حوالے سے لکھا تھا:

''مطالعے اور تحقیق کے سلسلے میں مجھے استاد المیمنی سے دوطرح کی رہنمائی حاصل ہوتی تھی۔ایک تو وہ خود ہر مسئلے میں رہنمائی فرماتے تھے، دوم یہ کہ میری گزارش پر دوسرے فضلا کو سفارشی خط لکھ دیا کرتے تھے کہ میری مدد فرمائیں۔خود اپنی طرف سے ان کی یہ کرم فرمائی تھی کہ انھوں نے مجھے اجازت دے رکھی تھی اور چابی میرے حوالے کردی تھی کہ میں ان کے ذاتی کتب خانے کو دیکھوں اور جی بھر کر استفادہ کروں۔بات یہ تھی کہ السند والہند کے متعلق مجھے تاریخی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں سے بھی حوالے ملنے لگے۔اس پر تہیّہ کرلیا کہ لٹن لائبریری میں جو بھی عربی و فارسی کتابیں محفوظ ہیں ان سب کو دیکھوں گا۔ بہر حال جو کتاب دیکھ لیتا تھا اس کے خاتمے پر باریک حرف میں 'عثمان السندی' لکھ دیا کرتا تھا تا کہ دوبارہ دیکھنے کی زحمت نہ ہو۔استاد نے دو تین کتابوں پر ایسے اندراجات دیکھ لیے تھے اور مطمئن تھے کہ میں کام کر رہا ہوں۔

باہر کے فضلا سے استفادہ کرنے میں استاد محترم نے میری بہت کچھ مدد فرمائی۔ قاضی احمد میاں اختر (جونا گڑھ)،ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ (سندھ)، پروفیسر محمد شفیع (لاہور)اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد) کو میرے سلسلے میں خطوط لکھے۔استاد نے رامپور کے شاہی کتب خانے کو دیکھنے کی ترغیب دی اور وہاں کے مہتمم جناب امتیاز علی صاحب عرشی کو ایک خاص خط لکھا جس پر نہ صرف مجھے کتب خانے سے استفادہ کرنے کی اجازت ملی بلکہ معزز مہمان کے طور پر نواب صاحب کے شاہی مہمان خانے میں رہائش کا انتظام بھی ہوا۔ عرشی صاحب کی رہنمائی میں کتب خانے سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ان دنوں ایک مقتدر

شیعہ عالم سیّد رضی لکھنوی بھی شاہی مہمان خانے میں مقیم تھے اور تفسیر قرآن لکھ رہے تھے ۔ فلسفے اور منطق میں یگانہ تھے۔ انھوں نے مجھے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشّہود کے مفاہیم سمجھائے اور خوب سمجھائے۔

جب بھی کوئی فاضل محقق مسلم یونیورسٹی میں آتا تھا اور استاد المیمنی سے ملتا تھا تو مجھے بلا لیتے تھے اور میرا تعارف کروا کر مجھے ان کی خدمت میں لگا دیتے تھے تاکہ مجھے ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملے۔ اس طرح ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور ڈاکٹر زاہد علی سے (جو حیدرآباد دکن سے تشریف لائے تھے) قریبی صحبتوں میں استفادہ کر سکا۔ ڈاکٹر زاہد علی نے ان دنوں اسماعیلی مذہب کی حقیقت کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب مرتّب کر لی تھی جس کا مسودہ وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ میں چوتھی صدی ہجری کے السند میں فاطمی دعوت کو سمجھنا چاہتا تھا۔ میری استدعا پر ڈاکٹر زاہد علی نے وہ مسودہ میرے حوالے کر دیا جو تین روز تک میرے پاس رہا۔ اس میں فاطمی فقہ کی بعض قلمی اور نایاب کتابوں میں سے نقل کیا گیا مواد تھا جس میں تاویل پر بعض انوکھی عبارتیں موجود تھیں۔ میں نے کافی کچھ مواد نقل کیا جو ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔" (۱۱)

ڈاکٹر ضیاء الدّین احمد سے تعارف اور ملاقات

جس زمانے میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ زیرِ تعلیم تھے اسی دور میں وہاں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد بطور وائس چانسلر خدمات انجام دے رہے تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے اپنی زندگی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے وقف کر دی تھی اور آج تک مسلم یونیورسٹی کی خدمت اور ترقی کے حوالے سے ان کا دور یاد کیا جاتا ہے۔ ان سے ایک ملاقات کا احوال بلوچ صاحب نے یوں تحریر کیا ہے:

"اس سرگزشت کے شروع میں مسلم یونیورسٹی کی انتظامیہ کے بارے میں میرے ایک ذاتی تاثر کا ذکر آ چکا ہے کہ انتظامیہ پس پردہ تھی اور یونیورسٹی میں اجتماعی زندگی

کی دیرینہ روایت سے طلبہ میں نظم ونسق قائم تھا۔ باوجود اس کے کہ انتظامیہ گویا غیر مرئی (Invisible) تھی تاہم بے خبر نہ تھی۔ کم از کم وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کلّی طور پر باخبر و بیدار تھے۔ وہ سینیر طلبہ میں سے اکثر کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ داخلے کے بعد میری ان سے دو سال تک کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی البتہ ایک دن غیر رسمی طور پر ڈاکٹر صاحب ایس ایس ایسٹ (پکی بارک ہوسٹل کے مشرقی ونگ) کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ہم چند طلبہ وہاں پر کھڑے تھے تو آ کر ہمارے سامنے رکے۔ ہم سب نے سلام کیا اور انھوں نے خیریت پوچھی وہ سخت سردی کا دن تھا۔ ڈاکٹر صاحب ایک موٹی شیروانی پہنے ہوئے تھے جس میں اندر سے رُوئی بھری ہوئی تھی۔ انھوں نے خاص طور پر مخاطب ہوکر فرمایا کہ آپ بھی میری شیروانی جیسی شیروانیاں بنوالیں۔ اس کے اندر روئی بھری ہوئی ہے اور اس سے سردی نہیں لگتی پھر یہ سستی بھی ہے اور بنوانے میں زیادہ کچھ خرچ نہیں ہوتا۔'' (۱۲)

جیسا کہ ذکر آچکا ایک اور مضمون میں بلوچ صاحب علّامہ عنایت اللہ مشرقی (۱۳) کی علی گڑھ میں آمد اور اس سلسلے میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد سے ملاقات کے حوالے سے لکھا تھا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے بلوچ صاحب کو بلا کر کہا تھا کہ علامہ مشرقی سے مل کر انھیں اس بات پر قائل کریں کہ موجودہ حالات میں ان کا مسلم یونیورسٹی میں آنا اور خطاب کرنا یونیورسٹی کے لیے مناسب نہ ہوگا۔ بلوچ صاحب علامہ سے ملے تھے اور علامہ مشرقی نے یونیورسٹی نہ آنے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے کہنے پر بلوچ صاحب نے جوناگڑھ کے وزیر اعظم کے اعزاز میں مسلم یونیورسٹی کے سندھی طلبہ کی جانب سے چائے پارٹی کا انتظام بھی کیا تھا۔

تحقیقی کام میں شدید مشغولیت اور علی گڑھ میں مشاہیر کی زیارت

پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالے کی تحریر کے لیے بلوچ صاحب نے علّامہ میمن کی نگرانی اور سرپرستی میں شدید محنت کی۔ اس دوران علی گڑھ آنے والے کئی مشاہیر کی زیارت بھی کی۔ اس حوالے سے اپنے مضمون میں یہ مفید معلومات تحریر کیں:

''اس پورے عرصے میں یونیورسٹی کے اندر میرے شب و روز زندگی کا بڑا حصہ مطالعے میں گزرا۔ اس قدر کہ گویا دنیا و مافیہا سے کنارہ کشی کر لی تھی۔ میرے اس مطالعے میں قبلہ استاد المیمنی سے استفسار اور استفادہ کو اولیت حاصل تھی لہٰذا صبح و شام ان سے ملنے کے لیے وقت نکالتا رہتا تھا البتہ جب بعض زعما باہر سے آتے اور یونیورسٹی میں خطاب فرماتے تو ان کو سننے کے لیے ضرور جایا کرتا تھا چنانچہ مولانا حسرت موہانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، سیّد سلیمان ندوی اور نواب بہادر یار جنگ کو سننے کا شرف حاصل ہوا۔ نواب صاحب موصوف اردو میں خطابت کے بادشاہ تھے۔ انھوں نے اپنے خطاب میں خاص طور پر کشمیر کا ذکر کیا اور اس حوالے سے جب کشمیریوں کے حسن کو اپنے چند جملوں کا موضوع بنایا تو بیان و معانی کی لطافت سے مسحور کر دیا، رحمہ اللہ۔ مطالعے اور تحقیق کے سلسلے میں مجھے استاد المیمنی سے قریب تر ہونے کا شرف حاصل ہوا اور انھوں نے اپنی نگاہِ شفقت سے نوازا۔ ڈپارٹمنٹ میں خواہ گھر پر جب ضرورت ہوتی تھی ان سے جا کر مستفید ہوتا تھا۔ میرے لیے وقت نکالتے تھے حالانکہ ان دنوں وہ خود تحقیق و تصنیف میں مشغول تھے۔ ایک دن بغیر پیشگی اطلاع کے میمن منزل پہنچا اور نوکر کو اطلاع دی تو اندر اپنے کتب خانے میں بلا لیا۔ تہمد باندھے ہوئے چٹائی پر بیٹھے تھے، اردگرد کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور حوالے تلاش کر رہے تھے۔ ان دنوں وہ بغدادی کی کتاب 'خزانۃ الادب' پر حواشی لکھ رہے تھے۔ دو تین جلدیں پہلے چھپ چکی تھیں۔ فرمایا کہ آپ ہر وقت آ سکتے ہیں لیکن بہتر ہوگا کہ روزانہ شام کو آئیں اور ٹہلنے میں میرے ساتھ ہو جائیں پھر اس وقت جو کچھ پوچھنا چاہیں پوچھ لیں۔ استادِ محترم ہر شام پابندی وقت سے نابیناؤں کے اسکول کے نابینا ماسٹر سعید احمد صاحب کی

بیٹھک پر آ جاتے تھے جہاں پر دو ایک اور اصحاب بھی پہنچ جاتے تھے اور حقے کا دور چلتا تھا۔ استاد حقّے کے دلدادہ تھے۔ گھر پر حقہ تیار رہتا تھا اور وہ خود بڑی احتیاط سی حقہ تیار کرتے تھے۔ نابینا ماسٹر کے ہاں شام کو حقہ پیتے تھے لیکن وہ ان کے اپنے معیار کا نہیں تھا۔''(۱۴)

علّامہ میمن کے ساتھ روزانہ شام کی سیر اور علمی نکات تحریری شکل میں محفوظ کرنا

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا زندگی بھر یہ معمول رہا کہ وہ روزانہ ڈائری لکھتے تھے جن میں مفید علمی اور تحقیقی نکات لکھ کر محفوظ کر لیتے تھے۔ اوپر ذکر آیا کہ علّامہ میمن کی اجازت سے روزانہ وہ شام کی سیر میں علّامہ کی معیّت کرنے لگے۔ اس دوران علّامہ سے کئی علمی استفسارات بھی کرتے اور پر لطف گفتگو بھی ہوتی۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے راقم سے ایک ملاقات کے دوران فرمایا تھا کہ وہ علامہ سے بہت سے سوالات کرتے تھے لیکن علّامہ نے کبھی یہ نہ فرمایا کہ اس قدر سوالات کیوں کرتے ہیں بلکہ ہمیشہ بڑی شفقت اور محبت سے بلوچ صاحب کو مفصل اور معلومات افزا جوابات دیتے۔ بلوچ صاحب روزانہ ہاسٹل پہنچ کر تاریخ وار ان قیمتی معلومات کو قلمبند کر لیتے۔ یہ گویا کہ علّامہ میمن کے قیمتی ملفوظات ہوتے۔ انھیں قلمبند شدہ ملفوظات کا ایک حصہ بلوچ صاحب نے سہ ماہی صحیفہ لاہور میں شایع کرایا تھا۔ بعد ازاں ڈاکٹر نجم الاسلام مرحوم (سابق صدر شعبہء اردو سندھ یونیورسٹی جام شورو) کی گزارش پر ان علمی نکات کا مکمل مسودہ ان کے حوالے کیا تھا۔ ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے اس مسودے کو بڑی محنت سے قابلِ طبع بنایا اور اسے مجلہ تحقیق کے خاص شمارے میں 'افادات میمنی' کے عنوان سے مکمل صورت میں پہلی مرتبہ شایع کیا تھا۔ علّامہ میمن کی علمی صحبتوں اور ان کے قیمتی ارشادات کو بلوچ صاحب نے اپنی ڈائری میں 1942ء سے 1945ء تک قلم بند کیا۔ بلوچ صاحب کے بقول وہ دن میں علّامہ میمن سے جو علمی ارشادات سنتے، رات کو ہوسٹل پہنچ کر اسے قلم بند کر لیتے۔ اس لیے اس ڈائری کے الفاظ صد فی صد علّامہ میمن کے نہیں البتہ مفہوم وہی ہے۔ یہاں ہم بلوچ صاحب کی لکھی اس ڈائری سے علّامہ میمن کے چند ارشادات نقل کرتے ہیں۔ علامہ میمن کی ان قیمتی نصیحتوں پر بلوچ صاحب نے اپنی آئندہ زندگی میں عمل کیا اور کارہائے نمایاں انجام دیے:

''ایم اے کے پہلے سال میں تو ہم میمن صاحب کے لکچروں کو کچھ ضرورت سے زیادہ محسوس کرنے لگے البتہ ایک سال کی صحبت کے بعد جب ہم ۱۹۴۲ء میں ایم اے فائنل میں منتقل ہوئے تو جا کر ہوش سنبھالا کہ استاد میمن ہی اعلیٰ تعلیم کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے صحیح معنوں میں ہمیں علمی مباحث و مصادر سے روشناس کراتے ہیں بلکہ علم کا دریا بہادیتے ہیں تا کہ کوئی بھی طالب علم تشنہ لب نہ رہ جائے۔

استاد کا علم وفضل تو ہمارے احاطہ ذہن سے باہر تھا لیکن راقم کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ عربی ادب کے متعلق استاد کے ارشاداتِ گرامی اتنے قیمتی ہیں کہ ان کو اپنی رہنمائی کے لیے قلمبند کرتا جاؤں۔ یہ خیال ایک مدت تک دامن گیر رہا لیکن دسمبر ۱۹۴۲ء میں میں نے اس کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ چنانچہ شام کو ٹہلتے وقت استاد کی صحبت میں جب کبھی علمی باتیں ہوتیں تو رات کو کمرے میں آ کر جو کچھ یاد رہ جاتا تھا لکھ لیتا تھا۔

طالب علمی کے زمانے کا ۱۹۴۲ء کا لکھا ہوا یہ کاپی نوٹ بک میرے ہاں محفوظ رہ گیا ہے۔ ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک استاد کی صحبتیں نصیب ہوئیں لیکن افسوس کہ بعد کی بالکل ہی چند صحبتوں کی یادیں اس ڈائری میں محفوظ رہ گئی ہیں۔

یہ ایک طالب علم کی ڈائری ہے جس میں وہ سب نقص موجود ہیں جو ایک ایم اے کے طالب علم کی لکھی ہوئی یادداشت کی خامیوں میں ہو سکتے ہوں۔ خاص طور پر ایسا طالب علم کہ جس نے ۱۹۴۱ء۔ ۱۹۴۲ء میں جو کچھ لکھا وہ استاد نے املا نہیں کرایا بلکہ جس طرح ان سے سنا اور سمجھا گیا اس کو گھنٹوں بعد حافظے سے لکھا۔ لہذا اس یادداشت کو ایک طالب علم کی خامیوں پر محمول کیا جائے اور استاد المیمنی کی طرف ان کو قطعی منسوب نہ کیا جائے۔

''ان قریبی صحبتوں میں استاد کی گفتگو سن کر محسوس ہوا کہ وہ شگفتہ طبع کے مالک تھے اور انکی غیر رسمی گفتگو میں اعلیٰ ظریفانہ انداز ہوتا تھا۔ ایک دن بدستور ہم قلعے کی طرف والے راستے پر جا رہے تھے، شدید گرمی کا دن تھا۔ شیروانی کے نیچے پاجامہ پسینے پسینے ہو

رہا تھا۔اس وقت ہمارے سامنے ایک لالہ جی جارہے تھے اور دھوتی لنگوٹی باندھے ہوئے تھے۔ دھوتی کا کنارہ ایک ہاتھ میں دبا رکھا تھا اور ہاتھ کو ہلاتے جاتے تھے جس سے دھوتی کے اندر کافی کشادگی آجاتی تھی۔اس پر میں نے استاد سے عرض کیا کہ قبلہ پاجامے کی نسبت دھوتی کافی کھلی ہوئی اور ہوادار ہے۔ جواب میں تصدیق فرماتے ہوئے میسون بنت بحدل (اعرابن بیوی جس کو امیر معاویہ نے محل میں آرام سے رکھا تھا لیکن وہ اپنے بادیہ نشینوں کے ہوادار گھروں کو یاد کرتی تھی) کا مندرجہ ذیل شعر پڑھ کر کہا کہ یہ (دھوتی) میسون بنت بحدل کے اس گھر کی مانند ہے جس میں ہوائیں چلتی رہتی ہیں:

لبیت تخفق ارواحٌ فیها

احبّ الیّ من قصرٍ منیف

اسی مضمون میں ڈاکٹر بلوچ نے علامہ میمن کی چند قیمتی نصیحتوں کو نقل کیا ہے۔ڈاکٹر بلوچ کی زندگی کے بعد کے حالات کی تحقیق سے علم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد کی ان نصیحتوں پر ہمیشہ عمل کیا:

☆استاد نے فرمایا میں آپ کو علم کا ایک خلاصہ اور راز بتادیتا ہوں، وہ یہ کہ:

1)علم کو کتابوں کے مطالعے سے وسیع اور پختہ کرو، جو کچھ ہے وہ مقابلہ ہے بشرطیکہ مقابلہ غائر اور پختہ نظر سے کیا جائے۔اس سے اصل حقیقت، مصنفوں کا علم میں درجہ ان کی غلطیاں وغیرہ سب معلوم ہوجائیں گی۔

2)کسی کتاب کو حقیر مت سمجھو اور ضرور اس کو دیکھو کیونکہ نسبتاً دوسری تصنیف سے گھٹیا ہو لیکن جس وقت و ماحول میں وہ لکھی گئی ہے اس میں دوسری نہیں لکھی گئی۔اس وجہ سے بہت سے فائدے اس کے مطالعے سے حاصل ہوں گے۔

☆دو پرانے علماء جن کا ہند سے تعلق رہا ہے، بڑے علامتہ الدہر تھے۔ایک ابوبکر دمامینی اور دوم امام صاغانی لاہوری۔ابوبکر دمامینی مصر کے جیّد عالم تھے۔حوادثِ زمانہ سے مجبور ہو کر ہندوستان پہنچے اور سورت کی بندرگاہ پر اترے۔اس وقت گجرات کا حاکم احمد شاہ تھا۔دمامینی نے

گجرات ہی میں بیٹھ کر المنہل الصافی فی شرح الوافی لکھی جو مصر میں چھپ چکی ہے۔

استاد ' معجم الادبا' کے حواشی لکھ رہے ہیں (اب وہ مجمع العلمی دمشق میں ۱۹۶۵ء۔۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۷ء میں چھپ چکے ہیں) استاد نے فرمایا کہ معجم الادبا میں نے سات آٹھ مرتبہ پڑھی اور ابن خلکان پر اس کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس سلسلے میں بتایا کہ کیسے مارغیولوث نے رشید بن زبیر اور اس کے بھائی مہذب کے دو قصائد میں جو انھوں نے ایک دوسرے کے جواب میں لکھے فاحش غلطی کی ہے اور مہذّب کے دوم قصیدے کے مطلع کو رشید کے مطلع کے اول میں ضم کر دیا ہے۔ استاد نے اس کی تصحیح اپنے مبیضہ مسودے کے صفحہ ۳۰ پر کی ہے جو انھوں نے دکھائی اور رشید کا مقامہ 'امنیۃ الالمعی و منیۃ المدعی' جو رٹر (Ritter) نے استاد کو قسطنطنیہ میں دیا تھا وہ دکھایا۔ اس مقامہ کے نام پر بھی مارغیولوث پوری تحقیق نہیں کر سکا اور ''منیۃ المدعیٰ'' کے بدلے بلغۃ المدعی لکھ دیا ہے

استاد نے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رشید بڑا علّامہ تھا۔ وقت کی سیاست میں ماہر تھا۔ اس مقامہ سے ظاہر ہے کہ وہ انشاء کا استاد تھا اور اس قصیدے سے ثابت ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجے کا شاعر تھا۔ استاد نے فرمایا کہ یہ قصیدہ (ادبا میں) اتنا خوب صورت ہے کہ میں اس کی داد نہیں دے سکتا۔

میں جب ''انسابِ سمعانی'' میں اہل سندھ کے تذکرے دیکھ رہا تھا تو استاد نے فرمایا کہ سمعانی نے محدثین کے چند نام دیے ہوں گے اور فرمایا کہ وہ عربی علما جن کا ہندوسند سے تعلق رہا ان کے متعلق اتنی منتشر معلومات ہیں کہ ان کو کہاں تک خیال میں رکھا جائے۔ فرمایا کہ فلاں نحوی کے متعلق میں نے کل ایک کتاب میں دیکھا کہ وہ ہندوستان میں آیا تھا حالانکہ یہ اطلاع اس کے متعلق صرف اسی ایک کتاب میں ہے دوسری جگہ اس کے ترجمے میں موجود نہیں۔ ابن نجار مورخ جس نے ''ذیل تاریخ بغداد'' لکھی۔ وہ لاہور آتا تھا۔

استاد نے فرمایا کہ کسی کتاب کو حقیر مت سمجھو اور ضرور اس کو دیکھو کیونکہ نسبتاً دوسری تصنیف سے گھٹیا ہو لیکن جس وقت و ماحول میں لکھی گئی اس میں دوسری نہیں لکھی گئی۔ اس وجہ سے بہت سے فائدے اس کے مطالعے سے حاصل ہوں گے۔ فرمایا کہ مجھ جیسے انسان کو یہ ضرورت نہیں کہ ''شذرات الذهب'' جیسی کتاب کے حوالے دے لیکن میں نے سوچا کہ شاید کوئی فائدے کی بات حاصل ہو جائے۔ اس لیے میں نے اس کو اٹھایا اور دیکھا کہ مصنف کے سامنے ایک ابن اهدل نام کے شخص کی تاریخ بھی موجود تھی۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ جو تحریر ابن اهدل سے نقل کی گئی ہے۔ اس میں سے بہت اچھی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

استاد نے فرمایا کہ بعد کی جو یہ شروح شواہد لکھی گئی ہیں ان میں '' خزانة الادب'' ممتاز ہے اس سے پہلے علماء نے جو شروح شواہد لکھی ہیں وہ ضرور قابل قدر ہیں۔ فرمایا کہ شواہد کے اکثر ابیات رضی کی کافیہ میں آ جاتے ہیں۔ باقی کچھ تھوڑے دیگر کتب مثلاً ''مغنی اللبیب'' میں ملتے ہیں۔ سیبویہ کے شواہد نیز رضی (مغنی اللبیب) میں آ جاتے ہیں۔

تاہم سیبویہ کی کتاب کے شواہد پر پہلے غالباً ابو محمد ابن السیر افی نے لکھا ہے جس کا نسخہ قسطنطنیہ میں کتب خانہ سلطان احمد ثالث میں موجود ہے۔ اسی کا رد ابو محمد اسود اعرابی نے لکھا ہے۔ استاد نے فرمایا کہ یہ میرے پاس موجود ہے۔

امام صاغانی لاہوری اعلیٰ ترین پایے کا لغوی تھا۔ مولف ''لسان العرب'' اس کا ہم عصر تھا۔ لسان العرب کا مولف کوئی اعلیٰ لغوی نہیں تھا اس نے صرف چار کتابیں جمع کر دی ہیں۔ کتاب غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔ استاد نے فرمایا کہ لسان العرب کی تنقید پر کام کی ضرورت ہے لیکن فارغ البالی ہو۔ دو اچھے خاصے عربی داں مدد کے لیے ہوں تا کہ غیر ضروری کام حسب اشارت کرتے رہیں اور امام صاغانی کی جملہ تصنیفات نیز سامنے ہوں

،استاد نے فرمایا کہ میں نے جو کچھ لسان کی حواشی سے متعلق کام کیا ہے وہ اطمینان سے نہیں کیا اور صرف احباب کے اصرار پر بغیر دلچسپی اور تعجیلاً کیا ہے۔ استاد نے فرمایا کہ اگر لسان میں وارد اشعار کے معنی اور ان کے از روئے شواہد حیثیت وغیرہ چیزوں کو لیا جائے تو مصنف کی ہر ایک جلد سے ہزاروں غلطیاں نکالی جائیں۔ فرمایا کہ میں نے لسان کے مطالعے سے اندازہ لگایا ہے کہ اگر اشعار کی غلطیاں لی جائیں تو کم از کم ایک ہزار غلطیاں فی جلد کے حساب سے بیس ہزار غلطیاں ضرور نکالی جائیں۔

امام صاغانی نے پہلے ۸ جلدوں میں صحاح کا تکملہ لکھا 'مجمع البحرین' لغت میں لکھی اور دونوں کو ملا کر 'العباب الذاخروا للباب لفاخر' اعلیٰ ترین لغت کی تصنیف پیدا کر دی۔ العباب میں انھوں نے الفاظ (آخری حروف کے اعتبار سے) الف سے شروع کر کے میم کے لفظ بکم تک پہنچائے تو انھوں نے وفات کی استاد نے اشعار پڑھے جن میں شاعر نے اس لفظ بکم کو لے کر کہا ہے کہ اتنا بڑا امام بھی بکم پر آ کے خاموش رہ گیا۔

فرمایا کہ آٹھویں صدی میں مجدالدین فیروز آبادی نے القاموس میں صاغانی کی کتابوں پر ڈاکہ ڈالا۔ فرمایا صاغانی نے مسلم و بخاری کی متفقہ حدیثیں مشارق الانوار میں جمع کر دیں۔ مولوی خرمی (خرم علی بلہوری) نے مشارق الانوار کا اردو ترجمہ کیا۔

فرمایا کہ بغداد جانے کے بعد صاغانی مصر گیا اور بعد میں مکہ شریف میں سکونت اختیار کی اور خود کو الملتجی الیٰ حرم اللہ لکھتے ہیں لیکن کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خانہء کعبہ میں رہنے کے باوجود یقیناً پھر ایک دو مرتبہ ہندوستان آئے۔

مولوی عبدالعلیم صدیقی صاحب میرٹھی نے سلسلہء اسناد سے متعلق ایک تحریر عربی میں حال میں شایع کی تھی جس کی کاپی میں نے استاد کو مطالعے کے لیے دی۔ آج اس کے متعلق بات نکلی۔ استاد نے فرمایا کہ مولوی صاحب موصوف کی یہ تحریر اپنی جگہ پر

کارآمد ہے لیکن ایک عجیب وغریب چیز میں نے ان کے سلسلہء اسناد مذکور میں پائی یعنی کہ عبدالعزیز الحبشی کی عمر از روئے سلسلہ اسناد مذکور گویا ۶۵۰ برس کے قریب پہنچتی ہے جو ناممکن ہے اور اس سلسلے کی خامی پر شاہد۔

فرمایا کہ ہمارے نزدیک اسناد کی صحت یا وقعت تیسری صدی ہجری تک ہی بالکل قابل وثوق واعتبار رہی ہے اور زیادہ سے زیادہ رعایت کے ساتھ تو دوسرے درجے میں چوتھی صدی تک۔ اس کے بعد سلسلہء اسناد میں بڑی خامیاں پیدا ہوگئیں اور اس کی صحت کے متعلق کچھ اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ فرمایا کہ یہ کافی ہے کہ بخاری یا مسلم نے جس سلسلے سے حدیثیں نقل کی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں مگر بعد کے علماء حدیث نے اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ ہر حدیث کو خود سے لے کر مسلم تک اور مسلم سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اسناد بیان کرنے کی زحمت اٹھائی ہے، اس لیے بہت سی غلطیاں ہوگئی ہیں۔

فرمایا کہ بہر حال یہ اسناد کا سلسلہ فائدے سے خالی نہیں تھا اور اس لیے راویانِ حدیث بہت کچھ نقل حرکت کرتے تھے اور کم از کم نسبتوں سے روایت جمع کرتے تھے۔

استاد کے اعزاز میں طلبائے پنجم وششم کلاس کی طرف سے چائے پارٹی دی گئی جس میں ان کی تقرری بر منصب پروفیسر مسلم یونیورسٹی پر جذبہء خوشی ومحبت کا اظہار کیا گیا۔ استاد نے اپنی جوابی تقریر میں حسب ذیل اشارات ہمارے استفادے کے لیے بیان فرمائے:

۱۔ فرمایا کہ میں نے اپنی پچھلی ۲۹ سال کی زندگی میں کبھی کام کرنے سے گریز نہیں کیا۔ جس حالت میں رہا خواہ تنخواہ تھوڑی تھی یا زیادہ تصنیف کا کام لگاتار اسی محنت سے کرتا رہا۔

۲۔ فرمایا کہ علمی سلسلے کے آدمی میں ظاہری تکلّفات کی کمی لازمی ہے۔ اگر وہ اپنی ظاہری حالت، لباس فیشن اور ہر جگہ آنے جانے اور ٹانگ اڑانے کی کوشش کرے گا تو

چاہے اور کتنی ہی شہرت اس کو حاصل ہو جائے لیکن اس کو ''علم'' نہیں مل سکتا۔

۳۔ فرمایا کہ میں نے کبھی خود کو عالم نہیں سمجھا۔ اگر میں خود کو عالم سمجھتا تو یقیناً مجھ میں کام کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی اور یہ ظاہر ہے کہ چاہے کوئی شخص کتنا ہی باخبر ہو لیکن لازمی ہے کہ اس کی معروفات کے مقابلے میں اس کی مجہولات زیادہ ہوں گی تو بس اگر یہ حال ہے تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ خود کو عالم تصور کر کے اپنی جستجو کو ختم کر لیں۔

۴۔ فرمایا کہ یہ البتہ ہے کہ میں نے یہ کبھی نہیں مانا کہ کوئی خاص انسان مثلاً ایک گورے چمڑے والا علم میں زیادہ فضیلت حاصل کر سکتا ہے کیونکہ فطرت نے ہر ایک کو کافی دماغ و وسائل دیے ہیں کہ کام کرے۔ فرمایا کہ آپ یہ کبھی مت سوچیں کہ علم عربی میں آپ کسی طرح یورپی مستشرقین سے کم رہ سکتے ہیں۔ سب محنت کا پھل ہے۔

یورپی مستشرقین علم عربی کو دو تین مقاصد کے لیے پڑھتے ہیں:

۱۔ اپنے قومی استعمار کے لیے۔ ۲۔ علمی فائدے کے لیے۔ ۳۔ اس علم میں اپنی یادگار چھوڑنے کے لیے مثلاً ماغیولوث عربی کا عالم تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ کرسچین مشن کا بڑا لیڈر تھا۔ اسی مشنری کام کی خدمت کے لیے اس نے بڑے ناپاک الزام اسلام پر لگائے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چاہے یہ الزام جھوٹے ہوں تو کیا، صحیح ہوں تو کیا لیکن پڑھنے والے میری علمی طاقت کی وجہ سے ضرور اس کو وقعت دیں گے۔ فرمایا کہ اس نے نبی ﷺ کے متعلق لکھا ہے کہ نبوت سے پہلے وہ لات کی پرستش کیا کرتے تھے اور ثبوت کے لیے امام احمد ابن حنبل کی مسند سے حدیث پیش کی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک عام شخص کے لیے ایسی دلیل کتنی ہیبت ناک ہو گی۔ لیکن اہلِ علم جانتے ہیں کہ جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرتؐ کے سامنے بت پیش کر کے کہا کہ ہم حسب روایت پہلے اس کی پوجا کرتے ہیں تو نبی ﷺ نے اس وہم کو رد کر دیا اور انکار کر دیا اور کہا کہ میں ان کو نہیں پوجوں گا۔ اب ماغیولوث اس انکار کو اقرار بتانا چاہتا ہے۔

۵۔فرمایا کہ انسان کو چاہیے کہ کام کرتا رہے۔آپ کو چاہیے کہ علم کے لیے خود کو وقف کر دیں اور اس خیال کو کبھی اپنے اندر نہ آنے دیں کہ آپ کو بڑی تنخواہ ملے یا آپ اونچے ہو جائیں یا لذیذ طعام کھائیں۔رزق اللہ پر ہے۔ہر حالت میں کام کرتے جائیں۔فرمایا کہ میں نے لاہور میں پہلی مرتبہ اپنے بیوی بچوں کو ساتھ رکھا لیکن میری بیوی اور بچے میرے کام میں مانع تھے، زیادہ دیر تک نہ رہ سکے۔اس وقت چھ مہینے کے عرصے میں ابوالعلاء پر پوری کتاب لکھ ڈالی اور اس کے علاوہ ابوالعلاء کی تصانیف پر کام کیا اور ساتھ اپنے کالج کی ڈیوٹی اور گھر کا کام سنبھالتا رہا۔

نوٹ: استاد کی پوری تقریر مجموعہء فوائد تھی۔میں نے اوپر چند اشارات قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔

علماء ہند میں سے مفتی سعد اللہ (مراد آبادی ۱۸۷۷ء) اس فن کے ماہر ترین انسان تھے بلکہ آج سے ۷۵ سال پہلے ہندوستان میں مفتی سعد اللہ کے پائے کا کوئی عربی کا عالم نہ تھا۔پہلے وہ امجد علی شاہ والد واجد علی شاہ کی خدمت میں تھے، وہاں انھوں نے تاج اللغات کی تصنیف میں حصہ لیا۔اسکے چیف ایڈیٹر مولانا لندنی تھے۔مفتی سعد اللہ کی عربی میں ''عروض با قافیہ'' عربی عروض پر ان کی اعلیٰ تصنیف ہے لیکن معرکۃ الآرا تصنیف اس فن میں فارسی عروض پر ''میزان الاشعار و معیار الافکار'' ہے جو طوسی کی فارسی شاعری پر تصنیف کی طرح ہے۔لیکن اس سے بڑھ کر ان کا کارنامہ لغت میں قاموس پر ردّ الموسوم بہ ''القول المانوس فی صفات القاموس'' ہے۔اس رد کا ایک نسخہ نواب صدیق حسن خاں نے تیرھویں صدی کے زبردست ادیب احمد آفندی ادیب فارس کو بھیجا تھا اور احمد آفندی نے ایک ہولناک ردقاموس پر لکھا ہے جس کا نام الجاسوس علی القاموس ہے۔اس میں آفندی نے مفتی سعد اللہ کی کتاب کا ذکر کیا ہے۔مفتی صاحب کی اس تصنیف کے دو تین نسخے علی گڑھ (یونیورسٹی لائبریری) میں موجود ہیں۔اکثر کتب خانے اسی سے نقل حاصل کرتے ہیں۔

۲۔ہندوستان کا دوسرا عربی کا بڑا عالم اوحد الدین بلگرامی تھا۔ انھوں نے النساء العالمات یعنی عالم عورتوں کا تذکرہ لکھا ہے جو نواب صدر یار جنگ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ نیز فاضل مصنف نے نفائس اللغات اور منتخب النفائس دو کتابیں لغت پر لکھیں۔ اوحد الدین اردو فارسی اور عربی زبانوں کے ماہر تھے۔ وہ ہندی اردو کے لفظ کو لے کر اس کا فارسی اور عربی مترادف بناتے ہیں۔

۳۔عربی کا بڑا عالم محمد بن احمد یمنی الشیر وانی تھا جو باہر سے بلایا گیا تھا اور فورٹ ولیم کلکتہ میں پروفیسر تھا۔ دیوان متنبّی کو اس نے پہلی مرتبہ ہندوستان میں شایع کیا۔

۴۔مفتی صدر الدین دھلی کے بھی عربی کے بڑے ادیب فاضل تھے۔

۵۔فرمایا کہ ڈپٹی نذیر احمد میرے استاد تھے جن کے استاد شیخ ابراہیم ذوق تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے مجھے فضل حق خیر آبادی کے قصیدے کے دو اشعار سنائے۔ ایک یہ:

لاتصغين الى البيض الامالیدی

فاحمر الموت فی اجفانہ السود

استاد نے عربی سوسائٹی کے جلسے میں جہاں طلبہ نے اپنے مضامین پڑھے صدارت فرمائی اور آخر میں مختلف مضامین کی اصلاح دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"گو بدیع الزمان ہمدانی فن مقامات کی تکمیل کی رو سے اس کے موجد تھے لیکن مقامہ لکھنے میں وہ سب سے اول نہیں تھے کیونکہ ان کے استادوں میں سے ابو بکر ابن درید نے مجالس لکھیں جو اسی فن کا پیش خیمہ ہیں۔ فرمایا کہ میں اس کتاب کو ممالک اسلام سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ فرمایا کہ اس کے بعد استاد بدیع الزماں چوتھی صدی کے عالم تھے۔ نیز ابن فارس اللغوی نے اس رنگ کی کتاب لکھی وہ نام فتیا فقیہ العرب جس کو ہمارے دوست ڈاکٹر علی محفوظ (بغداد) نے مجلّہ المجمع العلمی (دمشق) میں اب چھاپ دیا ہے۔

فرمایا کہ یورپ والوں کی تنقید میں بہت سی خامیاں ہیں جس سے ہمیں بچ کر رہنا چاہیے۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ مقامات حریری کا درجہ بعد از قرآن ہے یہ حماقت ہے اور خود قرآن پاک کی توہین ہے۔ فرمایا کہ حریری سے ہمذانی کی قابلیت ہزار بار برتر ہے کیوں کہ اس نے تو چلتے چلتے مقامات املا کرا دیے لیکن حریری نے تو اپنی حیات کے پچاس سال اپنے مقامات پر صرف کیے۔ اگر اور علما نیز دردسری کرتے تو یقیناً ایسے یا اس کے لگ بھگ مقامات تیار کر سکتے تھے۔

فرمایا کہ ہم حدیث نبوی کی بے مثال فصاحت و بلاغت سے کبھی حریری کے مقامات کو پہلے نہیں رکھ سکتے۔ مضامین نگاروں کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا کہ:

(۱) جو کچھ لکھو وہ اپنی محنت سے لکھو، نقالی سے قابلیت ہرگز نہیں بڑھے گی۔

(۲) کبھی حکم تام نہ لگاؤ حکم تام لگانے کی شرط یہ ہے کہ جس پر ایسا حکم لگانا مقصود ہو اس کا مطالعہ مکمل کیا جائے اور اس کی تفتیش استقصائی ہو ورنہ آئندہ چل کر دنیا ایسے حکم کو رد کردے گی اور اس نظریہ یا تصنیف کی قیمت بالکل گر جائے گی۔

ایک دن فرمایا کہ علم کو علم کی خاطر پڑھیں۔ جس علمی کوشش میں دنیاوی مقاصد مضمر ہوتے ہیں وہ علم گندا ہو جاتا ہے۔ فرمایا کہ میں نے علم کسی ذاتی غرض یا مقصد کے لیے کبھی نہیں سیکھا البتہ علم کے طفیل جو کچھ اللہ پاک نے دیا اس کو بخوشی قبول کرلیا۔ فرمایا کہ جو لوگ علم کو ذاتی اغراض کے لیے پڑھتے یا استعمال کرتے ہیں ان کی سب علمی کوششیں خاک میں مل جاتی ہیں اور ان سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ ایک دن فرمایا کہ سیوطی کی تصانیف کی علما کے نزدیک کچھ زیادہ وقعت نہیں، انھوں نے اپنی طرف سے کوئی معلومات پیش نہیں کیے۔ جو کچھ دوسروں کی تصانیف میں ملا ان کو جمع کر دیا۔ ان کی تصانیف کی قیمت اب اگر ہے تو صرف اس لیے کہ ان کے ماخذ فنا ہو چکے ہیں۔

فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی بھی فن میں گہرا اترے تو اس کو ماہرینِ فن کی غلطیاں

بھی نظر آ جائیں گی۔اپنی مثال دی کہ چوں کہ ادبِ عربی کے گوشے گوشے کو میں ٹٹول چکا ہوں لہذا ایسے بڑے ادیب جیسے کہ مفضل الضبی ،ابوعلی قالی،ابوعبید بکری وغیرہ کی فروگزاشتیں نظر آ گئیں۔فرمایا کہ ان غلطیوں سے متنبہ کرنے میں میں نے کوئی بڑا کارنامہ نہیں کیا۔ان جیسی غلطیاں میری تصانیف میں ہوگئی ہوں گی لیکن ان غلطیوں سے آ گاہ صرف وہی کرسکتا ہے جس کی نظر نہایت وسیع ہو اور ادبِ عربی کی گہرائیوں تک اتر چکا ہو۔

استاد ہمیشہ اپنے گھر کی ضروریات خود ہی بازار جا کر لیتے ہیں اور سبزی گوشت وغیرہ خود ہی خرید کر لاتے ہیں ۔بندہ بھی کئی مرتبہ ان کے ہمراہ شہر جا چکا ہے۔شہر کے لین دین میں بھی استاد کا تجربہ اور فہم دیکھ کر حیران رہ گیا۔اسی سلسلے میں کئی مرتبہ فرمایا:

یہاں کئی لوگ اپنی جنٹلمینی کا شکار ہوگئے ہیں ۔میں اگر ان کی طرح رہوں اور نوکروں کے ہاتھ بازار کی سڑیل چیزیں منگوا منگوا کر کھاتا رہوں تو میری صحت چند دنوں میں تباہ ہوجائے گی اور میں کسی کام کا نہ رہوں گا۔باقی رہی لوگوں کی میری طرف انگشت نمائی اس کی مجھے کوئی پروا نہیں ۔کفار مکہ نبی ﷺ پر یہی اعتراض کیا کرتے تھے کہ یہ نبی کیسے ہیں جو بازار میں خرید وفروخت کرر ہے ہیں ۔(مالھذاالرّسول یاکل الطّعام و یمشی فی الاسواق)لہذا میں تو نبی کی سنت ادا کرر ہا ہوں اور دیگر کہ میں علی گڑھ والوں کی تعریف خواہ مذمت سے آگے نکل چکا ہوں ۔(استاد یہاں کے اکثر لوگوں کے برتاؤ سے نہایت شاکی ہیں)فرمایا کہ یہاں خلوص اور سچائی کے بدلے مکاری وغداری بھری ہوئی ہے ۔کہا کہ یہ خطہ کسی تمدن کا مرکز تھوڑے عرصے کے لیے رہا ہے لیکن اب یہاں بگڑے ہوئے تمدن کی غلامانہ ذہنیت نے خوب کام کیا ہے اور لوگوں کے اخلاق کو کلیتہً تباہ و برباد کر دیا ہے۔فرمایا کہ علی گڑھ سے میں اتنا تنگ آیا ہوں کہ اگر کسی دوسری جگہ معقول روزگار مل جائے تو یہاں کی پروفیسر شپ اور تنخواہ کو نظر انداز کر کے چلا جاؤں۔

فرمایا کہ مسلم یونیورسٹی میں سے علم کی قدر جاتی رہی ۔آئندہ یہاں وہی لوگ

اسٹاف میں آتے رہیں گے جو یہاں کسی سیاست کے سلسلے میں کارآمد ہوں گے۔نتیجہ یہ نکلے گا کہ باہر سے قابل اور فاضل لوگوں کا آنا بند ہوجائے گا اور یہ یونیورسٹی کسی کام کی نہ رہے گی۔فرمایا کہ عربک ڈپارٹمنٹ میں جان اس وقت تک ہے جب تک میں یہاں ہوں ،اس کے بعد امید نہیں کہ یہاں کوئی اطمینان بخش کام ہوسکے۔

(۱) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی کو ہم نے اپنی عربک سوسائٹی میں گزشتہ سال بلایا۔انھوں نے سامی زبانوں کی چند خصوصیات پر لیکچر دیا۔استاد صاحب صدر تھے ۔ڈاکٹر ہادی حسن نیز موجود تھے۔لیکچر کے بعد استاد نے اپنی تصریحات میں عجیب وغریب معلومات پیش کیں ۔خصوصاً فاضل مقرر کے ایک نکتے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ فارسی میں ''ذ'' نہیں ہوتا لہٰذا د سے اس کی تعبیر ہوتی ہے،استاد نے اشعار در اشعار فارسی زبان میں پیش کیے جن میں ''ذال'' موجود تھا۔خاص طور پر (غالباً انوری کے) یہ اشعار پڑھے

آناں کہ بفارسی سخن می دانند — درموقع دال ذال را بنشانند
ماقبل وی کہ ارساکنی جزوای بود — دال است وگرنہ ذال معجم خوانند
دستت بہ سخا چوں ید بیضا بنمود — از جودش تو در جہاں جہانی افزود

میں دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر حسن استاد کی طرف نہایت تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

استاد سے سنا کہ ''مجلس مصنفین'' کے ایک جلسے میں مولانا طفیل احمد نے بابل قدیم پر ایک مضمون پڑھا۔نواب صدر یار جنگ صدر تھے،جلسہ حلیم صاحب کی کوٹھی پر ہوا۔بابل کے صحیح تلفظ پر مضمون نگار نے کچھ لکھا تھا اور پڑھتے وقت حاضرین سے رائیں لی گئیں۔جناب صدر بھی اس کو بابُل بتانے لگے۔شاید حلیم صاحب نے میمن صاحب کی رائے لی۔استاد صاحب نے کہا میں حیران ہوں کہ بعد کی کتب میں سے حوالے دیے جارہے ہیں اور آپ مسلمان علماء ہیں ۔آپ کو تو علم ہونا چاہیے کہ یہ لفظ قرآن پاک میں آیا ہے 'بِبَابِلَ هَارُوتَ وَ مَارُوتَ' اور اس صریح ضبط کے بعد بحث کی کوئی گنجائش

نہیں ۔استاد کے اس محاضرے پر سب حیران ہوئے ۔بعد میں صدر صاحب مضمون ختم ہونے سے پیشتر چلے گئے اور استاد کو صدارت دی گئی ۔مضمون ختم ہونے پر استاد نے اپنی محفوظات سے بابل اور اس کی حکومت وحکام کے متعلق وہ وہ معلومات پیش کیے کہ حاضرین حیران رہ گئے ۔پروفیسر شریف صاحب نے استاد کو اتنا بھی کہہ دیا کہ میمن صاحب! آپ کے مقابلے میں ہم خود کو جاہل پاتے ہیں

ڈاکٹر رفیق احمد خان سے سنا اور بعد میں خود استاد صاحب سے دریافت کرنے پر بھی معلوم ہوا کہ ابھی ابھی مجلس مصنفین میں لکھنو کے ایک فاضل نے خطاطی پر مضمون پڑھا۔سامعین پر اتنا اثر ہوا کہ مضمون نگار کے ہاتھ چومنے لگے گویا انھوں نے کوئی معجزہ کر کے دکھایا۔استاد کو جلسے کے وقت صدر بنایا گیا اور بعد میں سکریٹری صاحب ان کو لکھتے رہے کہ آپ اس مضمون پر ضرور کچھ کہیے تاکہ علی گڑھ کی لاج رہے ۔استاد نے فرمایا کہ وہ اس موقع پر علی گڑھ کی لاج'' کی فکر میں پڑ گئے حالانکہ انھوں نے پیشتر صرف یہ اطلاع بھی نہ دی کہ مجھے صدارت کرنی ہے ۔بہر حال مضمون ختم ہونے پر استاد صاحب اٹھے اور پہلے ہی حاضرین کے سامنے عماد الدین کاتب کی کتاب پیش کی جہاں سے مضمون نگار نے معلومات حاصل کیے تھے ۔اس کے بعد استاد نے خطاطی پر وہ تصریحات بیان کیے کہ بقول ڈاکٹر رفیق احمد خان، ہم سب مرعوب ہو گئے ۔استاد نے بعض نکات پر تو مضمون نگار کی اصلاح بھی کردی کہ ابنِ مقلہ کو خطِ نسخ کا موجد نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کے پیدا ہونے سے بھی پہلے کی کتابیں خط نسخ میں موجود ہیں ۔البتہ وہ اس خط کے مزیّن محسن اور سب ہی کچھ تھے اور اس خط کو انھوں نے ہی کمالیت پر پہنچایا لیکن موجد نہیں ۔دوم کہ مضمون نگار شیعہ ہونے کی وجہ سے عمر خیام کو ''عمرو خیام'' پڑھ رہے تھے ۔استاد نے نہایت اچھے طریقے پر واضح کر دیا کہ ''تیس برس پہلے میں نے مولانا شبلی کی ایک کتاب غالباً شعر العجم میں ''عمرو'' دیکھا تھا لیکن اپنی کم علمی اور مولانا کی تصنیف کی وجہ سے میں نے اس لفظ کو یونہی

رہنے دیا لیکن اس کے بعد آج تیس برس کے مطالعے میں میں نے ''عمر و خیام'' کہیں دیکھا نہ سنا اور آج ہی پہلا موقع ہے کہ میں اس لفظ کو پھر عمر و خیام سُن رہا ہوں خود عمر خیام کا اپنا مصرع ہے:

ھم عمر خیّامی، ہم عمر خطّاب

اس کے بعد شک کی کیا گنجائش!

استاد کی ان تصریحات نے سب حاضرین میں ہیجان پیدا کر دیا اور اب تک علی گڑھ میں استاد کی اس فاضلانہ تقریر کا چرچا باقی ہے۔

بالآخر ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے متعلق باتیں ہوئیں۔ استاد صاحب نے فرمایا کہ وہ شکل کے سرخ سفید تھے مزاج میں تیزی زیادہ تھی اگر غصے میں ہوتے تھے تو شیر ژیاں کی مثل گرجتے تھے لیکن ساتھ ساتھ اگر کسی کے ساتھ ان کی محبت ہو جاتی تھی تو اس کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ استاد صاحب نے فرمایا کہ میرے ساتھ وہ خاص شفقت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے چند کتابیں بھی دی تھیں جن میں سے ایک ''حماسہ'' ہے جو ابھی تک میرے پاس موجود ہے (بمبئی کا ایڈیشن جواب سندھ یونیورسٹی میں آ گیا ہے) ایک مرتبہ کہا کہ ''شرح حماسہ تبریزی'' لے جاؤ لیکن میں نے قبول نہ کیا اور عرض کیا کہ یہ آپ خود پڑھاتے ہیں اس وجہ سے آپ کے یہاں رہے تو بہتر ہے۔ پھر فرمایا کہ میرے کتب خانے میں سے جو کتاب تم چاہو وہ لے جاؤ۔ استاد صاحب نے فرمایا کہ ان کی کتابوں کی دو الماریاں تھیں اور میں جو چاہتا تھا وہاں سے کتاب اٹھا لے جاتا تھا۔ تبریزی کے ذیل میں صراحت کی کہ کتب خانہ قونیہ میں ''مفضلیات'' کی شرح تبریزی کا نسخہ خود تبریزی کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔

فرمایا کہ ان (ڈپٹی نذیر احمد) کے مکان کے دو حصے تھے۔ زیریں منزل میں تو ادھر ادھر کتابوں کے ڈھیر پڑے رہتے تھے جو وہ خود چھپواتے رہتے تھے اور بالا خانے

میں وہ گاؤ تکیہ لگائے لیٹے رہتے تھے اور حقہ سامنے رہتا تھا اور وہاں جو طالب علم پہنچتے تھے ان کو بھی پڑھا دیتے تھے۔ فرمایا کہ ڈپٹی صاحب نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے ماہانہ کھانے پر کوئی پندرہ روپیہ لگتے تھے اور پانچ سات روپیہ حقہ بھرنے والے نوکر کو دے دیا کرتے تھے۔ ویسے زندگی میں بہت پیسہ کمایا تھا۔ فرمایا کہ مجھے ڈپٹی صاحب نے بتایا کہ میری تنخواہ ایک وقت اٹھارہ سو روپیہ تک پہنچ چکی تھی اور یہ بتایا کہ پہلے ہی میں گورکھ پور محکمہ بندوبست میں کام کیا کرتا تھا۔ جب لارڈ کچنر آیا تو میں نے عربی میں اس کی تعریف میں ایک چھوٹا قصیدہ لکھا جس کی وجہ سے فوراً میری تنخواہ تین سو سے چھ سو روپے کر دی گئی۔ استاد صاحب نے فرمایا کہ اس قصیدے کے چند شعر ڈپٹی صاحب نے ہمیں اس وقت سنائے تھے جب کہ ہم متنبی پڑھ رہے تھے اور وامتقطت تلونا کے الفاظ آئے اس وقت کہا کہ میں نے بھی یہ الفاظ استعمال کئے ہیں اور یہ شعر پڑھے جو اس قصیدے میں سے تھے۔

ولی عمل بالبندوبست ومحنۃ اکابدھا بالصبر منذ شان

فھذا بلائی و امتقعت تلونا وھذا مشیبی ثبت قبل اوان

استاد صاحب نے رامپور کے مشہور شاعر امیر اللہ تسلیم شاگرد غالب کے یہ دو شعر سنائے جو استاد صاحب نے کہا کہ خود انھوں نے ان کو سنائے تھے۔

آسماں گردش میں ہے میرے ستانے کے لیے

چکیاں نو چل رہی ہیں ایک دانے کے لیے

(دوسرا شعر درج نہ ہوسکا)

استاد نے ان کو ۱۹۱۱ء کے قریب دیکھا تھا، دبلے پتلے اور بہت بوڑھے تھے۔

استاد صاحب طالب علم کی اتنی دل کھول کر مدد کرتے ہیں کہ کئی غیر علمی مشکلات بھی آسان ہو جاتی ہیں اور ہمت وحوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ آج خدمت میں حاضر ہوا اور عرض

کیا کہ میرا رامپور کے کتب خانے سے استفادہ کرنے کا ارادہ ہے۔ استاد صاحب نے فوراً تائید کی اور ساتھ لے چلے اور اپنی کوٹھی پر دو خط لکھے ایک جناب سیّد بشیر حسین صاحب زیدی مدارالمھام ریاست رامپور کو اور دوسرا جناب امتیاز علی صاحب عرشی مہتمم کتب خانہ کو دونوں خطوط بذریعہ ڈاک روانہ کر دیے گئے اور اگر اللہ نے چاہا تو آئندہ جمعرات کو رامپور کو روانہ ہوں گا۔ وباللہ التوفیق۔

صبح کو ڈپارٹمنٹ میں استاد صاحب تشریف لائے۔'کشف الظّنون' کا ذکر آیا۔ فرمایا کہ یہ محض اسماء کتب اور مولفین کی فہرست ہے باقی حالات از روے صحت بالکل ناکارہ۔ فرمایا کہ ہر کتاب کے حالات میں اس کے مصنف، کتاب کے نام، فن وغیرہ ہر ایک بیان میں غلطی کا احتمال ہے۔ ممکن ہے کہ کتاب کا نام کچھ اور ہو اس کے مصنف کا نام کچھ اور ہو وغیرہ۔ صرف اتنا معلوم ہوگا کہ دراصل کچھ چیز ہے اور بس۔ اسمٰعیل بابانی کی 'ذیل کشف الظّنون' کا بھی یہی حال ہے لیکن ایک ضرورت کو دونوں پورا کرتی ہیں۔

ڈیڑھ بجے کے قریب ڈاکٹر یوسف صاحب کی معیت میں استاد صاحب کے ہاں گئے۔

جمھرۃ الاشعار کا ذکر آیا۔ فرمایا کہ علی گڑھ سبحان اللہ کلیکشن والا نسخہ دنیا میں شاید قدیم ترین نسخوں میں سے ہے۔ باقی نسخے سب دسویں صدی کے عہد کے ہیں۔ فرمایا کہ ایک اورینٹلسٹ نے تقریباً ۱۵ نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کتاب پر مضمون لکھا ہے، جو اس کتاب کے متعلق ہونے کی وجہ سے حاصل کرنے کے قابل ہے۔ فرمایا کہ میں نے کتاب پر نہایت سنجیدگی سے غور کیا ہے۔ مقدمے میں اسناد نہایت غلط ہیں۔ کتاب یقیناً پرانی ہے اور کوفیوں کی روایت ہے۔ تیسری صدی میں یہ کتاب جمع کی گئی، چوتھی صدی کے بعد ابن رشیق نے ''عمدہ'' میں اس مصنف کا حوالہ دیا ہے۔ مصنف کا نام بھی کچھ الٹا سلٹا لکھتے ہیں۔ فرمایا کہ مجھے گمان ہے کہ کتاب کا مصنف شاید محمد بن ابی الخطاب سیبویہ کے استاد سے نسبت رکھتا ہو، حالانکہ نام میں غلطی ہے، فرمایا محمد بن ابی الخطاب نے پہلی مرتبہ عربی اشعار

جمع کر کے ہر ایک بیت کے نیچے اس کی شرح لکھنی شروع کی۔ جمھرۃ میں بھی یہی ترتیب پائی جاتی ہے۔ جزاہم اللہ۔ اس سے پہلے علماء پورا قصیدہ نقل کر کے پھر شرح لکھتے تھے۔ ملاحظہ ہو اشعار ذیل پہلا ایڈیشن یورپ۔(۱۵)

آل انڈیا اورینٹل کانفرنس بنارس میں شرکت

۱۹۴۴ء میں ہندو یونیورسٹی بنارس میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے جو وفد شریک ہوا اس میں علّامہ میمن اپنے عزیز شاگرد بلوچ صاحب اور دیگر شاگردوں کو بھی لے گئے۔ قیام بنارس کی دلچسپ یادداشتیں ہمیں بلوچ صاحب کی درج ذیل تحریر میں ملتی ہیں:

''غالباً ۱۹۴۴ء میں ہندو یونیورسٹی بنارس میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے انعقاد کی خبر آئی اور مسلم یونیورسٹی سے شعبۂ عربی کو اس کانفرنس میں شرکت اور نمائندگی کا شرف حاصل ہوا۔ استاد المیمنی اور ان کے ساتھ ڈاکٹر سیّد محمد یوسف کے جانے کا فیصلہ ہوا تو میں نے گزارش کی کہ کچھ طلبہ بھی ساتھ ہو جائیں تاکہ ان کو بنارس یونیورسٹی جیسی بڑی درس گاہ کو دیکھنے کا موقع مل سکے۔ اس گزارش کو استادِ محترم نے بڑی شفقت سے مان لیا اور میرے علاوہ تین اور طلبہ کے لیے سفارش کر دی جو یونیورسٹی سے منظور ہو گئی۔ جب کالی شیروانیوں میں ملبوس یہ قافلہ بالآخر ہندو یونیورسٹی پہنچا تو سب کی نگاہیں ہم پر مرکوز ہو گئیں۔ ہم طلبہ کو ایک ہوسٹل کے وسطی ہال میں گراؤنڈ فلور پر ٹھہرایا گیا۔ ہم نے باجماعت نماز ادا کی تو دوسری منزل پر رہنے والے طلبہ اوپر بالکنی میں آ کر دیکھنے لگے۔ عشا کے وقت جب ہمارے ایک نڈر ساتھی غلام محمد بھٹی (۱۶) نے بلند آواز سے اذان دے ڈالی تو بالکنی میں مجمع اور بڑھ گیا لیکن ہوسٹل کے ہندو طلبہ نے بڑے تحمل کا مظاہرہ کیا کہ چار روز تک وہ بھٹی صاحب کی اذانیں سنتے رہے۔ استاد المیمنی نے غالباً المفضل الضبی کی مشہور تالیف 'المفضلیات' پر اپنا بصیرت افروز مقالہ پیش کیا جس سے یہ انکشاف ہوا کہ اس کتاب

میں شامل نظمیں غالباً امام ابراہیم باخمرا نے منتخب کی تھیں۔ میں نے ہندو یونیورسٹی کے استاد لالہ مہیش پرشاد صدر شعبہء عربی و فارسی و اردو سے بھی استفادہ کیا جو عربی میں مولوی فاضل تھے اور عرب سیاحوں کی تصانیف سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے مہربانی فرما کر سلیمان تاجر کے سفرنامے کا پیرس میں چھپا ہوا ایڈیشن عاریۃً میرے حوالے کر دیا جو میں اپنے ساتھ لایا اور نقل کر کے اصل کتاب انھیں واپس بھیج دی۔ کانفرنس کے دوران ایک دن ہم نے صبحِ بنارس دیکھنے کی ٹھان لی۔ ایک دن پہلے ہوسٹل سے رکشاؤں کی سواری اور پھر گنگا ندی پر دو چھوٹی کشتیوں کی سواری کا انتظام کر لیا۔ دوسرے دن علی الصباح بڑے جگن ناتھ مندر کے گھاٹ پر پہنچے جہاں پر بھٹی صاحب نے اپنے معمول کے مطابق اذان دے کر بڑے اطمینان اور دل جمعی سے نماز فجر ادا کی۔ پھر کشتیوں میں بیٹھ کر گنگا کے وسط تک گئے جہاں مغربی کنارے شہر بنارس کا ہوش ربا خط سمائی Sky line نظر آنے لگا اور سورج طلوع ہوا تو شہر کی گنجان آبادی اور عمارت کے نقوش نمودار ہوئے۔ ہم ایک شعر کو تھوڑی ترمیم سے دہراتے رہے کہ:

ذرا اس سمت میں دل سیر کر لے　　　دوبارہ پھر قدم آئے نہ آئے"(۱۷)

کتب خانہء حبیب گنج جانے کا پروگرام اور حبیب الرحمن شاستری سے ملاقات

بلوچ صاحب کے قیام علی گڑھ کے زمانے میں حبیب گنج (نزد علی گڑھ) میں واقع نواب حبیب الرحمن شروانی کا کتب خانہ اپنے نوادرات کی بنا پر پورے ہندوستان میں مشہور تھا۔ بعد ازاں یہ کتب خانہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں منتقل کر دیا گیا اور اب 'حبیب گنج کلکشن' کے نام سے معروف ہے۔ علّامہ میمن کے نواب صاحب سے قریبی تعلقات تھے اور انھی کے مشورے پر بلوچ صاحب وہاں تحقیقی مواد کے حصول کے لیے جانے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ بلوچ صاحب حبیب گنج تو بوجوہ نہ جا سکے لیکن ایک دوسرے حبیب الرحمن صاحب سے ملاقات کا دلچسپ احوال ان الفاظ میں تحریر کیا:

"بنارس جانے سے کافی عرصہ پہلے استاد سے گزارش کی کہ آپ اکثر نواب

صاحب سے ملاقات کا دلچسپ احوال ان الفاظ میں تحریر کیا:

''بنارس جانے سے کافی عرصہ پہلے استاد سے گزارش کی کہ آپ اکثر نواب حبیب الرحمن خاں شروانی کے کتب خانے کا ذکر فرماتے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو میں وہاں جا کر کتب خانے کو دیکھ لوں۔ ان دنوں نواب صاحب کا قیام علی گڑھ میں تھا لیکن وہ اپنے گاؤں حبیب گنج کو بھی جایا کرتے تھے۔ استاد نے فرمایا کہ ہاں یہ ممکن ہے۔ جب نواب صاحب حبیب گنج جائیں تو آپ ان کے ساتھ جائیں۔ ۱۸ر جنوری ۱۹۴۴ء کو نواب صاحب کے نام ایک خط قلمبند کر کے مجھے دیا لیکن نواب صاحب پہلے ہی حبیب گنج جا چکے تھے۔

لیکن نواب صاحب کے ہم نام ایک اور حبیب الرحمن تھے جن سے علی گڑھ میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ تھے پنڈت حبیب الرحمن صاحب شاستری جو یونیورسٹی ہائی اسکول میں اردو کے استاد تھے۔ انھوں نے سنسکرت میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور اس مناسبت سے پنڈت کے لقب سے ملقب تھے۔ ساٹھ سال کے قریب ان کی عمر ہو گی۔ وہ ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ پہلی ملاقات میں جب ان کو معلوم ہوا کہ میں سندھ سے ہوں تو بڑی شفقت سے پیش آئے۔ بتایا کہ ان کا خاندان حضرت عثمان سندھی کے سلسلے سے منسلک رہا ہے جن کا مزار لکھنو کے اطراف میں کہیں ہے۔ پنڈت حبیب الرحمن صاحب عالم فاضل تھے اور ان سے میری عقیدت میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ میں نے کہا کہ قبلہ مجھے افسوس ہے اور ہمیشہ کے لیے رہے گا کہ میں نے سنسکرت کیوں نہ پڑھی۔ اس پر میری تسلی کے لیے فرمایا کہ سنسکرت ادب میں فلسفہء رس یا انبساط جو کہ علم بدیع و معانی میں سے ہے مطالعہ کے قابل ہے اور اس پر میں نے سلیس اردو میں ایک کتاب لکھی ہے جو آپ کو دے رہا ہوں۔ آپ اس کو پڑھیں تا کہ اس پر مزید گفتگو ہو سکے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور جب کتاب پڑھی تو محسوس ہوا کہ اردو میں یہ مختصر کتاب فلسفہء انبساط (رس) پر ایک شہکار تصنیف ہے۔''(۱۸)

رسالہ Islamic Culture میں پہلے تحقیقی مقالے کی اشاعت

جیسا کہ ذکر ہوا، بلوچ صاحب کی زندگی کا پہلا تحقیقی مقالہ جو کسی اہم جریدے میں شایع ہوا وہ حیدر آباد دکن کا معروف انگریزی علمی اور تحقیقی رسالہ Islamic Culture ہے۔ اس معروف علمی رسالے کا آغاز مارما ڈیوک پکتھال نے کیا تھا اور یہ آج تک باقاعدگی سے شایع ہو رہا ہے۔ اس تحقیقی مقالے کے بارے میں بلوچ صاحب لکھتے ہیں:

> ''قبلہ استاد المیمنی کی قریبی صحبتوں میں مسلسل رہنمائی سے اور ساتھ ہی عربی و فارسی مصنفات وار مستشرقین کی لکھی ہوئی کتابوں کے مطالعے سے ۱۹۴۵ء کے آغاز تک مجھے اپنے آپ میں اتنی استعداد محسوس ہوئی کہ کچھ لکھوں تو لکھ سکوں گا۔ چنانچہ اموی دور کے آخر میں ایک باغی قائد منصور بن جمہور کے السند پر تسلط کے سلسلے میں کچھ لکھا مگر محسوس ہوا کہ میری انگریزی بہت کمزور ہے۔ اس وقت شعبہ تاریخ کے شیخ عبدالرشید صاحب نے میری مدد فرمائی اور مسودہ کی تصحیح کی۔ ساتھ ہی تحقیقی مواد سے متاثر ہو کر آئندہ کے لیے بھی اعانت کا وعدہ فرمایا۔
>
> ان دنوں اسلامک کلچر (حیدر آباد دکن) میں کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر جناب محمد اسحاق صاحب کا مقالہ شائع ہوا جس میں انھوں نے فتوح البلدان کے مصنف بلاذری کے اس بیان کو غلط قرار دیا تھا کہ دیبل (سندھ) بھروچ (گجرات) اور تھانہ (نزد بمبئی) پر مسلمانوں کا پہلا بحری حملہ حضرت عمرؓ کی خلافت میں سنہ ۱۵ ہجری میں ہوا۔ انھوں نے دلائل پیش کیے کہ یہ حملہ حضرت عثمان کی خلافت میں سنہ ۲۴ ہجری میں ہوا تھا۔ اس کے برعکس میں اپنے مطالعے کے دوران اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ مورخ بلاذری کمال حد تک ثقہ ہیں اور ان کے حوالوں کو رد کرنا یا ہلانا آسان نہیں۔ لہذا میں نے فاضل پروفیسر کے دلائل کا جائزہ لینا شروع کیا اور ان کو رد کرتے ہوئے بلاذری کے حوالے کی تصدیق اور تائید میں ایک مقالہ تیار کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ پہلے مقالے کی نسبت اس مقالے میں میری انگریزی

کو بھیجا گیا تو انھوں نے اشاعت کے لیے قبول کرلیا جس پر مجھے بہت بہت خوشی ہوئی اور اطمینان ہوا کہ میں اپنا ڈاکٹریٹ کی ڈگری والا مقالہ خیر وخوبی سے لکھ سکوں گا۔‘‘(۱۹)

علی گڑھ اور علّامہ میمن سے مفارقت

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ علّامہ میمن کی زیر نگرانی پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کی تیاری میں شب و روز مصروف تھے۔ خود علّامہ میمن بھی دل سے خواہش مند تھے کہ بلوچ صاحب جیسا ذہین اور محنتی طالب علم تاریخ سندھ کے عربوں سے متعلق اس اہم دور پر تحقیق مکمل کرے۔ اب صرف آٹھ ماہ کا کام باقی تھا لیکن تقدیر میں یہ نہ لکھا تھا کہ یہ کام مکمل ہو۔ ہوا یہ کہ پیر الٰہی بخش کی کوششوں سے مسلمانانِ سندھ کا پہلا کالج ایس ایم کالج کے نام سے ۱۹۴۵ء میں کراچی میں قائم ہوا۔ پیر الٰہی بخش ذاتی طور پر بلوچ صاحب سے متعارف تھے اور شدید خواہشمند کہ بلوچ صاحب بھی بطور استاد اس کالج میں آجائیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں پہلے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (وائس چانسلر) کو خط لکھا جو انھوں نے علّامہ میمن کو بھجوا دیا۔ علّامہ میمن نے اس کے جواب میں پیر الٰہی بخش کو خط لکھا جس میں بڑی دل سوزی سے لکھا کہ صرف آٹھ ماہ کا کام باقی ہے لیکن پیر الٰہی بخش کا اصرار جاری رہا جس کی بنا پر بلوچ صاحب کو علی گڑھ سے کراچی آنا پڑا اور بطور اسسٹنٹ پروفیسر عربی، ایس ایم کالج میں ملازمت کا آغاز کیا۔ یہاں ہم اس واقعے کی تفصیل بلوچ صاحب کے الفاظ میں اور اس کے بعد علّامہ میمن کا پیر الٰہی بخش کو لکھا خط درج کرتے ہیں:

> ’’سندھ کے وزیر اعلیٰ اور اولڈ علیگیرین جناب پیر الٰہی بخش صاحب کی کوشش سے کراچی میں مسلمانانِ سندھ کا پہلا اعلیٰ تعلیمی ادارہ سندھ مسلم کالج قائم ہوا اور مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی کو اس کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ انھوں نے مجھے ترغیب دی کہ میں کالج میں آجاؤں۔ استاد المیمنی نے فرمایا کہ آپ وہاں گئے تو آپ کا مقالہ رہ جائے گا۔ میں رک گیا مگر شاید ڈاکٹر امیر حسن صاحب نے پیر الٰہی بخش صاحب کو مشورہ دیا اور انھوں نے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے نام خط

بھیجا کہ اس نئے کالج کے لیے اسٹاف کی ضرورت ہے اور مجھے کالج میں آنے کی ترغیب دی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ خط استاد محترم کو بھیج دیا جس پر انھوں نے فرمایا کہ اگر ان کو آپ کی ضرورت ہے تو پھر آپ جائیں۔ مجھے لیکچرر بننے پر جتنی خوشی ہوئی اس سے کچھ زیادہ ہی استاد المیمنی سے مفارقت اور مسلم یونیورسٹی سے رخصت ہونے پر رنج ہوا۔(۲۰)

استاد صاحب کا خط پیر الٰہی بخش صاحب کے نام:

معظم و محترم جناب والا القاب پیر الٰہی بخش صاحب وزیر تعلیمات سندھ۔ زاد فضلہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ،

بغیر سابقہ تعارف کے میں آپ کو تصدیع دینے کی جسارت کر رہا ہوں۔ آج عزیزی مولوی نبی بخش بلوچ ایم اے ایل ایل بی ریسرچ اسکالر نے مجھے آپ کے کرم نامے اور مکرم ڈاکٹر امیر حسن صاحب پرنسپل کا خط بیک وقت دکھائے۔ اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ بلوچ صاحب کے مضمون پر قدرے روشنی ڈالی جائے۔

سندھ زیر عرب کے عنوان پر انتہائی عرق ریزی سے یہ ریسرچ سوا دو سال سے جاری ہے کوئی آٹھ ماہ اور رہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں آج تک گو سندھ و عرب پر متعدد کتابیں مسلمانوں اور غیر مسلموں نے لکھی ہیں مگر کسی نے اتنی جانفشانی سے عربی ادبیات کے پوشیدہ گوشوں سے یہ مواد نہیں نکالا جس کا کھوج لگانا بلوچ کے نصیب میں تھا۔ میں کاٹھیاواڑی میمن ہوں مگر اس کام کی تکمیل کے لیے بے تاب ہوں مگر آپ کا اور بلوچ کا تو سب کچھ سندھ ہے فیھا تحیون و فیھا تموتون و منھا تخرجون۔ اگر اسی طرح آپ کی توجہ شامل حال رہی تو ملازمت تو پھر بھی مل رہے گی مگر یہ کام روز مرہ نہیں ہوا کرتے۔

محض سندھ اور سندھ کے لیے میری آپ سے التماس ہے کہ آٹھ ماہ کے لیے کوئی عارضی انتظام کر لیجیے پھر بلوچ کو میں آپ کے حوالے کر دوں گا۔ اس سلسلے میں آپ

کو عارضی ضرورت پوری کرنے کے لیے بہت سے آدمی مل جائیں گے۔آپ کو سندھ کا واسطہ دلا کر پھر ملتمس ہوں کہ ڈاکٹر امیر حسن صاحب کو آپ خود سمجھائیے۔ اگر ممکن ہو تو ڈاکٹر داؤد پوتہ صاحب کو میرا نیاز نامہ دکھا کر استصواب کیجیے۔

آخر میں آپ سے اس جسارت پر طالب عفو ہوں۔ والسلام

ناچیز

میمن عبدالعزیز(۲۰)

کراچی سے علی گڑھ اور علّامہ میمن کے گھر میں قیام

ایس ایم کالج میں ملازمت کی وجہ سے بلوچ صاحب علی گڑھ سے کراچی پہنچ چکے تھے۔اس کے بعد مارچ ۱۹۴۶ء میں ان کا کراچی سے علی گڑھ جانا ہوا۔وہاں علّامہ میمن سے ملاقات ہوئی جن کی عنایت سے علّامہ میمن کی ذاتی رہائش گاہ 'میمن منزل' میں قیام رہا۔وہاں قیام کے دوران علّامہ میمن کی علمی گفتگو خصوصاً قرآن مجید کے مختلف اشاریے Indexes اور مرزا غالب کے کلام کی خصوصیات کو انھوں نے اس طرح قلمبند کیا:

''تاریخ ۱۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو کراچی سے علی گڑھ ریسرچ کے سلسلے میں آنا ہوا۔ استاد صاحب کی کوٹھی پر قیام ہوا ہے۔کرم فرما کر مشرقی کمرہ خالی کر دیا۔ پہلے دن کی ضیافت فرمائی۔تقریباً ۱۸ مارچ کو نقوی پارک ٹہلنے گئے۔قرآن شریف کے انڈیکس کے متعلق گفتگو ہوئی۔فرمایا اورنگ زیب کے زمانے میں فہرست بنائی گئی تھی۔فرمایا کہ بنارس کے ایک پادری نے سب حروف کو تہجی پر مرتب کر دیا ہے جو غیر عالم کے لیے کافی مفید ہے۔فرمایا کہ ترکی میں بھی ایک فہرست (مجھے اس کی تفصیل اور نام یاد نہیں رہا...... نبی بخش) بنائی گئی فرمایا کہ لیکن سب سے بہتر فہرست فتح الرحمان فی آیات القرآن ہے جو فلسطین کے ایک شخص نے بنائی ہے اور ہر ایک لفظ کے آگے پیچھے والے ایک دو الفاظ ضبط کر کے آیات کو مقید کر دیا ہے۔فرمایا کہ باریک پیپر پر نہایت خوبصورتی سے چھپی ہے۔فرمایا کہ فلوگل نے

بھی بڑا کام کیا ہے اور کافی جان لڑا کر فہرست قرآن بنائی ہے۔

اس پر میں نے عرض کیا کہ آج کل ایک گروہ ایسا ہے جو غالب کی شاعری کا منکر ہے۔ وہ تو میر ہی کو مانتے ہیں۔ فرمایا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر غالب سے پہلے تھا اور خود غالب کو میر کا اعتراف ہے اور یہ بیت پڑھا:

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

بعد میں کہا کہ جو غالب کو شاعر نہیں مانتے وہ خود لاشیء ہیں۔ غالب نے اردو زبان کو ایک خاص اسلوب وقالب دیا جو آج تک مروج ہے البتہ ان کے ہاں آج کل کی انگریزی اصطلاحات سے نقل شدہ فقرے مثلاً میں پانی پی سکتا ہوں Can I drink نہیں ملتے۔ فرمایا یہ اصطلاحات بالکل فضول ہیں۔ ان سے پوچھو کہ اگر آپ کے ہاتھ میں سکت ہے اور پانی آپ کے حلق سے نیچے اتر سکتا ہے تو آپ پی سکتے ہیں۔ اس میں پوچھنے کی کیا گنجائش ہے؟ فرمایا کہ کہنا یوں چاہیے کہ مجھے پانی پینے کی اجازت ہے وغیرہ فرمایا غالب نے اردو کو موجودہ رنگ دیا البتہ ان کے اشعار میں فارسی محاورات کے استعمال سے تکلف پیدا ہو گیا ہے۔ تاہم غالب کا شعر خیالات کی گہرائی، الفاظ کی بندش اور ترکیب میں بے مثال ہے۔ گو ان کے شعر میں وہ نازک بیانی جو کہیں کہیں ذوق کے اشعار میں پائی جاتی ہے وہ ان کے ہاں نہیں۔ لیکن یہ ایک فطری بات ہے کہ ایک خوبی جو ایک شاعر میں ہے وہ دوسرے میں نہیں اور اس بنا پر کسی شاعر کی قدر و قیمت گرانا مناسب نہیں۔ اس کے بعد غالب کی یہ غزل پڑھی:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

فرمایا دیکھیے یہ زبان ہے یا ساحری اور پھر یہ غزل پوری پڑھی:

وہ اپنی خو نہ بدلیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

فرمایا کہ میں نے دونوں رنگ دیکھے ہیں اور سمجھتا ہوں کہ اردو زبان میں غالب کی وقعت عربی زبان میں متنبی سے زیادہ ہے۔ فرمایا متنبی کو عربی ادب سے ہٹا لیجیے کوئی فرق نہیں آئے گا لیکن غالب کو اردو زبان سے ہٹانے پر زبان کی پوری عمارت زمیں پر آن پڑے گی۔ بعد میں زبان اور معنی کی رو سے شعر پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ عربی میں ابن ہانی کا دیوان بعض خوبیوں کی وجہ سے متنبی سے بہتر ہے مثلاً ابن ہانی کا دیوان آپ پورا پڑھتے جائیں بغیر معنی پر توجہ کرتے ہوئے تو بہترین دیوان معلوم ہوگا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ابن ھانی کے دو قصیدے لاجواب ہیں، اور قصیدے دونوں نونیہ اور فائیہ (جس میں ستاروں کا بیان ہے) پڑھیے، نونیہ کے کچھ اشعار پڑھے اور فرمایا دیکھیے کہ زبان پر کیا ملکہ ہے لیکن ازروئے معنی گوزشتر ہیں۔ نونیہ کے شروع والے اشعار پڑھے اور ان کی خوبصورتی بتائی اور فرمایا کہ اس طرح کہیں کہیں بہترین معنی بھی مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد فائیہ پڑھا اور ستاروں کے معانی کا ذکر کیا۔ فرمایا کہ ابن ہانی نے معز کی مدح میں استغراق کی وجہ سے اپنی شاعری کو ملوّث کر دیا اور علما نے اس کو پڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ اس لیے ان کا دیوان مروج نہیں ہوا۔

مغرب کے بعد جب استاد صاحب لیٹے ہوئے تھے تو میں بھی جا کر بیٹھ گیا۔ علمی سلسلے کی باتوں کے دوران میں فرمایا کہ اب اس وقت ضرورت ہے کہ کتابوں کا پیچھا چھوڑ کر زندگی کے عام مشغلوں میں دلچسپی لوں تا کہ صحت سالم رہے۔" (۲۱)

بعد از تقسیم علّامہ میمن سے تعلقات

تقسیم برصغیر کے بعد علّامہ میمن کے دونوں بڑے صاحب زادے محمد محمود میمن اور محمد سعید میمن حیدر آباد (سندھ) منتقل ہو چکے تھے۔ خود علّامہ میمن ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ سے کراچی منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد سے علّامہ

میمن کے انتقال (اکتوبر ۱۹۷۸ء) تک بلوچ صاحب کا علامہ میمن سے نہایت قریبی تعلق رہا۔ علامہ میمن جب کبھی کراچی سے حیدرآباد جاتے تو اپنے عزیز شاگرد سے ملنے سندھ یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) بھی جاتے جہاں بلوچ صاحب اپنے استاد محترم سے نہایت اکرام سے پیش آتے۔ اس کے علاوہ علامہ میمن تلک چاڑھی حیدرآباد میں محمد سعید میمن کی دکان 'میمن اسٹور' بھی جاتے جہاں اکثر بلوچ صاحب ان سے ملنے آتے۔ راقم سے حیدرآباد کے بعض بزرگوں نے بیان کیا کہ ان دنوں بلوچ صاحب کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی عربی کتاب ہوتی جس کے مشکل مقامات کے حل کے لیے علامہ میمن سے رجوع کرتے۔ اسی طرح بلوچ صاحب جب حیدرآباد سے کراچی آتے تو علامہ میمن کی رہائش گاہ واقع بہادرآباد جاتے۔ علامہ میمن بھی اپنے اس عزیز شاگرد کی علمی اور تحقیقی خدمات سے بہت خوش تھے۔ ۱۹۷۴ء میں جب علامہ میمن نے اپنا قیمتی کتب خانہ فروخت کرنے کا ارادہ کیا تو بلوچ صاحب نے ان سے رابطہ کیا۔ اس وقت بلوچ صاحب سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ یہ علامہ میمن کی بلوچ صاحب سے محبت تھی کہ ان کی گزارش پر اپنا قیمتی کتب خانہ سندھ یونیورسٹی کو فروخت کیا حالانکہ یونیورسٹی کی پیشکش سے دگنی رقم ایک بینک دینے کو تیار تھا۔ یہاں ہم ۱۹۷۰ء میں سندھ یونیورسٹی میں علامہ میمن کی آمد کے بعد بلوچ صاحب کے قلم سے لکھے ان کے ارشادات نقل کرتے ہیں:

> ''آج استاد صاحب یہاں حیدرآباد میں میرے سندھ یونیورسٹی آفس میں تشریف لائے۔ کافی دیر تک ان کے علمی ارشادات سے بندہ مستفید ہوا۔ فرمایا کہ تصوف میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد حسن البصری کا رسالہ پہلی تصنیف ہے اور میرے ہاں جو قلمی نسخہ ہے وہ نوادرات میں ہے حالانکہ قریبی زمانے میں لکھا گیا۔
>
> بیت کے معانی پوچھے تو فرمایا کہ شعر کے معنی ہیں بیت، قصیدہ یا دیوان کا ٹکڑا ہے۔ بیت الشعر کہا جاتا ہے۔ بیت یعنی دو مصرعوں کا مجموعہ، یہ قصیدہ کا ایک بیت ہے یا گھر، گویا قصیدہ ایک بڑی حویلی ہے۔

انَّ احسن بیت انت قائلہ

بیت یقال اذ انشدتہ صدقا

فرمایا یہ بیت حسان کی طرف منسوب ہے، فلیتامل

فرمایا بیت وتد طنب (ج اطناب) عربوں کے گھر کی مصطلحات ہیں۔ علم عروض کے مصطلحات عربوں کے گھر سے لیے گئے ہیں۔ ابو العلاء المعری نے ''سقط الزند'' کے پہلے قصیدہ میں کہا ہے۔

بیت یقال اذا نشدتہ صدق

بیت من الشعر اوبیت من الشعر

کلمہ اور قافیہ: فرمایا شعر یا قصیدہ کے معانی میں ہے۔ حدیث میں ہے کہ

اصدق کلمۃ قالھاشاعر کلمۃ لبید

الا کل شی ء ماخلااللہ باطل وکل نعیم لامحالۃ زائل

قال نابغتہ: اذود القوافی عنی ذیادا (میں اشعار کو اپنے آپ سے ہٹاتا ہوں جب کہ وہ آتے ہیں)۔ گفتگو کے دوران نعمت خان عالی کا یہ شعر پڑھا اور میری استدعا پر اپنے قلم سے لکھا:

برخرمی تو ان زخریت عتاب کرد'' (۲۲)

علّامہ میمن کی اوّلین سوانح کے لیے بلوچ صاحب کا تعاون اور حوصلہ افزائی

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان سطور کے عاجز راقم کو علّامہ میمن کی اولین سوانح بہ زبانِ اردو لکھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس کتاب کا آغاز آج سے تقریباً ۲۵ برس قبل ہوا۔ پاکستان میں علّامہ میمن کے سب سے پرانے شاگرد ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ہی تھے۔ راقم اس کام کے سلسلے میں ان سے برابر رابطے میں رہا۔ بلوچ صاحب بھی دل سے خواہش مند تھے کہ ان کے استادِ محترم کی یہ اولین سوانح ضرور شایع ہو۔ اس عرصے میں بلوچ صاحب کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی مسلسل حاصل رہی۔ انھوں نے علّامہ میمن کے ان کے نام تمام اردو خطوط و دیگر مواد فراہم کیا جو کتاب میں شامل کیا گیا۔ ان خطوط کے لفظ لفظ سے علّامہ میمن کی اپنے عزیز شاگرد کے لیے محبت، شفقت اور

ترقی کی خواہش ظاہر ہے۔ الحمدللہ کتاب 'علّامہ عبدالعزیز میمن۔ سوانح اور علمی خدمات' کے عنوان سے شایع ہوئی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۲۰۰۹ء میں شایع ہوا۔ راقم نے سب سے پہلا نسخہ بلوچ صاحب کی خدمت میں روانہ کیا جسے پا کر بے حد خوشی کا اظہار فرمایا اور راقم کو یہ حوصلہ افزا خط تحریر فرمایا:

''آپ کو یاد کرتے ہوئے یہ عید مبارک ارسال کر رہا تھا کہ ڈاک میں آپ کا گراں بہا تحفہ یعنی قبلہ میمن صاحب کی سوانح پر لکھی گئی یہ کتاب میرے سامنے آئی۔ گویا آپ کی طرف سے 'عید مبارک' احسن طریقے پر ادا ہوئی۔ میں ممنون ہوں کہ کتاب کی پہلی کاپی آپ نے مجھے بھجوادی اور میں بے حد خوش ہوں اور آپ کو داد دیتا ہوں کہ آپ نے قبلہ استاذ کی سوانح کے سلسلے میں جملہ مآخذ سے خوشہ چینی کر کے یہ تفصیلی تصنیف مرتب کی۔ میں نے کتاب کو سرسری طور پر دیکھا ہے اور اب تفصیل سے پڑھوں گا لیکن استاذ مرحوم سے متعلق آپ کی یہ کتاب ایک بڑی مدت تک معتمد علیہ یادگار رہے گی۔'' (مکتوب مورخہ ۱۸ر ستمبر ۲۰۰۹ء)

علامہ عبدالعزیز میمن کی تاریخی سند برائے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے راقم الحروف کو کتاب ''علامہ عبدالعزیز میمن۔ سوانح اور علمی خدمات'' کی سوانح کی تالیف کے دوران جو جو نادر چیزیں پیش کیں ان میں علامہ میمن کے قلم سے ڈاکٹر صاحب کے لیے ایک تاریخی سند بزبان عربی بھی شامل تھی۔ یہ سند علامہ میمن نے ڈاکٹر صاحب کی خواہش پر مورخہ ۸ر مارچ ۱۹۴۵ء کو علی گڑھ میں لکھ کر دی تھی۔ یہاں ہم سند کا عکس اور اس کا اردو ترجمہ شایع کر رہے ہیں۔ اس سند میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں علامہ میمن نے جو جو پیش گوئیاں کیں اور جو جو امیدیں وابستہ کیں ڈاکٹر صاحب نے آئندہ زندگی میں انھیں درست ثابت کیا۔

اس تاریخی سند کے اردو ترجمے کے لیے ہم ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کے ممنون ہیں۔ قوسین میں مزید وضاحت من جانب مولف ہے:

عبد العزيز الميمني
(Member Arabic Academy, Damascus.)
PROF. & CHAIRMAN.

DEPARTMENT OF ARABIC,
MUSLIM UNIVERSITY,
ALIGARH (INDIA).

Dated 8-3-1945

هذه شهادة للمتأدب الشادي الفاضل نبي بخش بلوص أدعيان
السندي أنه أقام عندنا أربعة أعوام مجرّمة يشتغل فيها في فرع العربية بدروسه وبحوثه
فاجتاز في الأوليين منهما على شهادة الماجستير (ايم. اي) أول أوّل أي أنه وقع أول
في الدرجة الأولى، مع اشتغاله بدروس الشرائع، وقد وقع أنجح فيها أيضاً من الأولى،
فجمع بين الحسنيين، وهذا نجاح لم أره لغيره منذ عشرين عاماً قضيتها بهذه الجامعة.
ثم إنه لشدة ولعه بالعربية اشترك في الدكتوراه بكتابة مقالة حافلة
طافحة بالبحوث التي لا عهد لمن كتبوا في السند بمثلها بهمة لا تعرف الكلل ونهمة
بعيدة عن الملل وأستشهد أنه يفوز فيها بالخصل، ويبرّز على عامة من تقدمه
بالكتابة في الموضوع بالميزة والفضل. إن شاء الله
وكان له في هذه المدة بي خصيصى لم أرها في كثير ممن ينتابون هذه الجامعة
وأذكر أنه لم يتّئد عليكره إلا من أجلي فقد لزمني لزوم الظل بحيث شبعت المزادة وارتوى السجل.
هذا وهو شابّ ذكيّ خبير بما هو بصدده، متأدب مع الأساتيذ والتلاميذ
وعامة الناس، له همة شامخة في العلياء، وله مستقبل زاهر في خدمة بلاده
علماً وعملاً، ونظرة واسعة في آداب العربية وأخبارها وتواريخها، إلى ما يخدم به بلده
والإنسانية خدمة تذكر وتشكر. أنسأ الله في أجله، وبلّغه منتهى أمله،
في خدمة بلاده وأوطانه خاصة، وعالم الإنسانية عامة، فإنه حري بها مستخدم،
على كل حال من سحيل ومبرم. وفقه الله لذلك، ووطّأ له تلك المسالك. إنه
هو أهل التقوى وأهل المغفرة.
وله حلم يزن الجبال رزانة، ورأي حصيف يفوق المعاقل حصانة، إلى أخلاق
سهلة سمحة، ومجاراة للآخرين ومداراة، وقلة الخلاف معهم والمباراة، كأنه
لم يرث التعصب من الأم والأب، فتراه دائماً حلواً سائغاً كما جاء في الحديث
المؤمن هيّن ليّن، فلا رين على قلبه ولا شين، إلى مزايا لم تجتمع لغيره لا أرى حاجة
إلى التكثير بها فإنه بنفسه شاهد لها عدل يغنيك مرآه عن مخبره

الداعي
عبد العزيز الميمني

علامہ عبدالعزیز میمن کے قلم سے عربی زبان میں سند برائے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

علامہ میمن کی بلوچ صاحب کے لیے سند کا اردو ترجمہ

یہ سند خوش اطوار طالب علم نبی بخش بلوچ (عثمان السندی) کے لیے جاری کی جاتی ہے کہ وہ پورے چار سال تک ہمارے ہاں مقیم اور شعبہء عربی میں درس و تحقیق کے میدان میں مصروف کار رہے۔ انھوں نے صف اوّل کے طلبہ میں ایم اے کی سند اوّل اوّل یعنی فرسٹ کلاس فرسٹ کے امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ قانون کی تعلیم بھی پاتے رہے اور اس میدان میں بھی فرسٹ کلاس حاصل کی اور اس طرح دو خوبیوں کے جامع ٹھہرے۔ یہ ایسی کامیابی ہے کہ اس یونیورسٹی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) میں گزارے ہوئے بیس برس کے عرصے میں میں نے کسی اور طالب علم کو اس سے ہمکنار ہوتے نہیں دیکھا۔

مزید یہ کہ عربی زبان سے گہری دلچسپی کے باعث انھوں نے ڈاکٹریٹ کے لیے جو مقالہ لکھا ہے وہ ایسے تحقیقی نکات سے بھرپور اور لبریز ہے کہ سندھ کے موضوع پر لکھنے والوں کی نظر سے پہلے کبھی نہ گزرے ہوں گے۔ یہ کام انھوں نے ایسے عزم سے انجام دیا ہے جس میں سہل انگاری کو کوئی دخل نہیں رہا اور ایسے شوقِ فراواں سے یہ کام انجام دیا جس میں اکتاہٹ نے کبھی راہ نہیں پائی۔ میں اس بات کا شاہد ہوں کہ ان شاء اللہ اس مقالے میں انھیں تفوق حاصل ہوگا اور وہ اس موضوع پر تمام سابق لکھنے والوں میں امتیاز اور فضیلت سے سرفراز ہوں گے۔

اس تمام عرصے میں انھیں میرے ساتھ وہ خاص تعلق خاطر رہا ہے کہ اس یونیورسٹی میں بیشتر داخلہ لینے والوں کے ہاں مجھے نظر نہیں آیا۔ ذکر کرتا چلوں کہ وہ علی گڑھ آئے ہی میری خاطر اور میرے ساتھ سائے کی طرح لگے رہے تا آنکہ ان کا توشہ دان توشے سے اور ڈول پانی سے بھر گیا (اشارہ ہے علامہ میمن سے علمی فیض حاصل کرنے کی طرف)۔

علاوہ ازیں یہ کہ وہ ایک دین دار نوجوان ہیں اور اپنے میدان کا خوب علم رکھتے ہیں۔ اساتذہ، تلامذہ اور عامّۃ النّاس کے ساتھ ان کی روش بڑی شائستہ ہے۔ ان کا ارادہ فلک بوس ہے اور علم و عمل سے اپنے وطن کی خدمت بجالانے میں ان کا مستقبل شاندار ہے۔ عربی زبان کے ادب نیز تاریخ و روایات پر وسیع نظر رکھتے

ہیں اور ان صفات سے متصف ہیں جن کے ذریعے وہ دین اور انسانیت کی ایسی یادگار خدمات انجام دے سکیں گے کہ زمانہ ان کا معترف رہے گا۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے اور انھیں ان کے مقاصد میں کامیاب فرمائے۔ اپنے وطن اور سرزمین کی خدمت میں بطور خاص اور عالم انسانیت کی خدمت میں بطور عام، کہ وہ جملہ گرم وسرد میں بہر رنگ ان دونوں خدمتوں کے اہل بھی ہیں اور دل دادہ بھی۔ اللہ انھیں توفیق ارزانی فرمائے اور ان راہوں کو ان کے لیے ہموار کر دے۔ وہی اللہ ڈرنے کے لائق ہے وہی بخشش کا اہل ہے۔

ان (بلوچ صاحب) کی طبع حلیمانہ پہاڑوں کا سا وقار رکھتی ہے اور پختگی رائے قلعوں سے بڑھ کر حفاظت کی ضامن ہے۔ اخلاق میں نرمی اور رواداری ہے۔ دوسروں کے ساتھ ہم آہنگی ہے اور پاسِ لحاظ بھی۔ مخالفت اور منافست سے یوں پاک ہیں گویا ماں باپ کی طرف سے غصہ تو ورثے میں پایا ہی نہیں۔ جب دیکھو شیریں مزاج اور خوشگوار۔ عین مضمونِ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق کہ مومن منکسر المزاج اور نرم خو ہوتا ہے۔ دل پر نہ زنگ ہے نہ کج خلقی کا رنگ۔ اور ایسی ہی دیگر صفاتِ عالیہ جن کی تفصیل میں پڑنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ان کی ذات ان صفات کی شاہدِ عادل ہے۔ جو انھیں دیکھ لے گا آزمانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرے گا۔

دعا گو

عبدالعزیز المیمنی

حواشی باب نمبر 4

۱۔ ملاحظہ فرمائیں ''گلشنِ اردو'' مرتبہ محمد راشد شیخ، ص ۱۴۴

۲۔ انٹرویو ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مورخہ ۲۲ جون ۲۰۰۶ء بہ مقام سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد۔

۳۔ 'ایام علی گڑھ' از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ص:۲۲۶۔ یہی مضمون بعدازاں 'گلشن اردو' مرتبہ محمد راشد شیخ میں بھی شایع ہوا۔

۴۔ ایم اے عربی کے زبانی امتحان (VIVA) کی خاطر نامور علّامہ سیّد سلیمان ندوی آئے تھے جنہوں نے بلوچ صاحب کا امتحان لیا۔ انہیں اعظم گڑھ سے علی گڑھ آنے کی دعوت علّامہ میمن نے دی تھی۔ اس زمانے میں علامہ سیّد سلیمان ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ناظم اور ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے ایڈیٹر تھے۔

۵۔ شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ ۲۵ مارچ ۱۸۹۶ء کو سہون میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی سے میٹرک میں اس اعزاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی کہ پورے سندھ میں آپ کی پہلی پوزیشن آئی۔ ۱۹۲۱ء میں ڈی جے کالج کراچی سے بی اے اور ۱۹۲۳ء میں بمبئی یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد آپ کیمبرج یونیورسٹی چلے گئے جہاں سے ''فارسی شاعری پر عربی شاعری کا اثر'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مختلف اوقات میں آپ جن جن مناصب پر فائز رہے ان میں پرنسپل سندھ مدرسۃ الاسلام، پروفیسر اسماعیل کالج بمبئی اور ڈائریکٹر محکمہ تعلیم صوبہ سندھ شامل ہیں۔ آپ کا انتقال مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۵۸ء کو کراچی میں ہوا۔ آپ نے عربی فارسی اور انگریزی میں کل ۲۸ کتب یادگار چھوڑیں جن میں سندھ کی تاریخ پر دو معروف کتب یعنی 'چچ نامہ' اور 'تاریخ معصومی' کی ترتیب و تہذیب شامل ہیں۔

۶۔ پروفیسر مولوی محمد شفیع، عربی زبان و ادب کے ماہر، سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور اور رئیس ادارہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور تھے۔ آپ کی پیدائش ۱۶ اگست ۱۸۸۳ء کو قصور میں اور وفات ۱۴ مارچ ۱۹۶۳ء کو لاہور میں ہوئی۔

۷۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ۲۶ دسمبر ۱۸۸۵ء کو سندیلہ (ہردوئی) میں پیدا ہوئے۔ ناگپور، الہ آباد اور علی گڑھ

میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۷ء میں جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ علی گڑھ حیدرآباد دکن اور ڈھاکہ میں عربی کے پروفیسر رہے۔ آپ کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ انتقال ۲۸ جولائی ۱۹۷۲ء کو الہ آباد میں ہوا۔

۸۔ مولانا امتیاز علی عرشی ۸ دسمبر ۱۹۰۴ء کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ آپ اردو، عربی، فارسی اور پشتو کے محقق اور ماہر غالبیات کے طور پر مشہور ہیں۔ آپ اورینٹل کالج لاہور میں علّامہ عبدالعزیز میمن کے شاگرد رہے۔ بعد ازاں مدرسۂ عالیہ رام پور سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۲ء میں آپ رضا لائبریری رام پور کے ناظم مقرر ہوئے اور تمام عمر اسی کتب خانے کی خدمت میں صرف کی انتقال ۲۵ ؍فروری ۱۹۸۲ء کو رامپور میں ہوا۔

۹۔ ڈاکٹر سیّد محمد یوسف ۲۱ مئی ۱۹۱۶ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھوپال اور آگرہ میں حاصل کی۔ ۱۹۳۹ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم اے عربی اور اس کے بعد یہیں سے علّامہ عبدالعزیز میمن کی نگرانی میں Ph.D کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے مصر، سری لنکا، ملائشیا اور پاکستان میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ آپ کراچی یونیورسٹی میں صدر شعبہ عربی بھی رہے۔ آپ کا انتقال ۲۲ جولائی ۱۹۷۸ء کو لندن میں ہوا۔

ڈاکٹر سیّد محمد یوسف اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ دونوں استاد بھائی تھے اور دونوں کے آپس میں بڑے برادرانہ تعلقات تھے۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کے پہلے علمی مقالے کی اشاعت سے قبل ان کی ڈاکٹر یوسف صاحب نے انگریزی تحریر میں بہتری کے حوالے سے معاونت کی تھی۔

۱۰۔ یہ مقالہ بوجوہ مکمل نہ ہو سکا جس کی تفصیل آگے پیش کی جائے گی۔

۱۱۔ 'ایام علی گڑھ' از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔ یہی مضمون بعد ازاں 'گلشن اردو' مرتبہ محمد راشد شیخ میں بھی شایع ہوا۔ ملاحظہ فرمائیں اس کتاب کا صفحہ نمبر ۱۳۴۔

۱۲۔ ایضاً صفحہ نمبر ۱۴۰۔

۱۳۔ علّامہ عنایت اللہ مشرقی خاکسار تحریک کے بانی تھے۔ آپ ۲۵ ؍اگست ۱۸۸۸ء کو پیدا ہوئے اور ۲۷ ؍اگست ۱۹۶۳ء کو لاہور میں وفات پائی۔

۱۴۔ بحوالہ ''ایام علی گڑھ'' از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' ص: ۲۲۴۔

۱۵۔ دیکھیں 'گلشن اردو' ص ۱۳۷

۱۶۔ ایک ملاقات کے دوران ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے راقم الحروف کو مطلع کیا تھا کہ غلام محمد بھٹی خاکسار تحریک سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا تعلق ٹنڈو محمد خان کے ایک نزدیکی دیہات سے تھا۔

۱۷۔ دیکھیں 'گلشن اردو' ص ۱۳۸

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ دیکھیں 'گلشن اردو' ص ۱۳۸

۲۰۔ ایضاً،ص ۱۸۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۰۳

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۱۷

باب نمبر 5

قیامِ امریکہ۔ وہاں حصولِ علم و دیگر مصروفیات

کراچی سے دہلی برائے انٹرویو پھر کراچی سے امریکہ روانگی

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی کراچی سے امریکہ روانگی کے بارے میں ہمیں مفید معلومات پروفیسر محمد عمر چنڈ کی مرتبہ کتاب سنڌ جو ذهين ٻار ڊاڪٽر نبي بخش خان بلوچ (سندھ کا ذہین بچہ۔ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) میں ملتی ہیں۔ یہ کتاب دراصل ایک طویل انٹرویو ہے جو بلوچ صاحب نے پروفیسر محمد عمر چنڈ کو مختلف نشستوں میں دیا اور انھیں اپنی یادداشتیں ریکارڈ کرائی تھیں۔ اس انٹرویو میں بلوچ صاحب نے امریکہ روانگی کے حوالے سے فرمایا تھا:

''۱۹۴۶ء میں جب کراچی میں مسلمانان سندھ کا پہلا کالج پیر الٰہی بخش کی کوشش سے قائم ہوا تو اس میں مجھے لکچرر کی پیشکش ہوئی۔ میں نے اپنے استاد علامہ میمن سے مشورہ کیا جنھوں نے فرمایا کہ پہلے پی ایچ ڈی کی تحقیق مکمل کرلو ورنہ یہ کام ادھورا رہ جائے گا۔لیکن ہوا یہ کہ پیر الٰہی بخش کے اصرار اور وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی ہدایت پر مجھے مسلم یونیورسٹی چھوڑ کر کراچی آنا پڑا۔ مجھے کالج میں لکچرر بننے کی جس قدر خوشی ہوئی اس سے زیادہ مجھے استاد محترم اور مسلم یونیورسٹی چھوڑنے کا رنج ہوا۔ اس کے بعد میں مسلم کالج

کراچی میں عربی کا اسسٹنٹ پروفیسر ہو گیا اور تقریباً ایک سال تک وہاں عربی پڑھائی۔ اس وقت ہم چار دوست یعنی غلام مصطفی شاہ، علی اکبر جلبانی، گل محمد شیخ اور میں مسلم ہاسٹل کراچی میں ساتھ رہتے تھے۔ ایک روز گل محمد شیخ نے کہا کہ اخبار میں اشتہار آیا ہے کہ ولایت میں تعلیم حاصل کرنے کے خواہش منداسکالرشپ کے لیے درخواستیں دے سکتے ہیں۔ دوسرے دن گل محمد شیخ کہیں سے اسکالرشپ کے فارم بھی لے آئے۔ میں نے آل انڈیا اسکالرشپ کے لیے فارم بھرا اور سیکریٹری ایجوکیشن کے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے بھیج دیا۔ کچھ عرصے بعد مجھے دہلی سے خط آیا کہ آپ کی درخواست پہنچی، آپ فلانے مہینے کی فلانی تاریخ کو دہلی میں انٹرویو کے لیے آئیں چنانچہ میں کراچی سے پہلے علی گڑھ استاد محترم علامہ عبدالعزیز میمن سے ملنے گیا اور وہاں سے دہلی پہنچ گیا۔ یہ انٹرویو منسٹری آف ایجوکیشن کی عمارت میں تھا اور انٹرویو کمیٹی کے صدر سر مارس گائر Sir Maurice Gayer تھے۔ کمیٹی کے اراکین میں سر شفاعت احمد خان اور کئی دیگر افراد شامل تھے۔ یہ اسکالرشپ شعبۂ تعلیم میں مزید تحقیق کی غرض سے تھیں اور کل تیرہ یا سترہ افراد کے لیے تھیں جبکہ درخوستیں کوئی چھ سو تیرہ آئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ باری باری درخواست گزار انٹرویو دے کر آرہے تھے لیکن واپسی پر ان کے چہرے ملول نظر آتے۔ یہ دیکھ کر میں نے فیصلہ کرلیا کہ خواہ مجھے اسکالرشپ ملے یا نہ ملے میں اندر جاکر مردوں کی طرح ہمت سے جوابات دوں گا اور یوں ملول چہرے کے ساتھ واپس نہ آؤں گا۔ انٹرویو کمیٹی نے سوالات کا آغاز کیا اور میرے ریکارڈ کو بھی دیکھا۔ میرے ریکارڈ میں پروفیسر محمد حبیب (سابق صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا میرے لیے سرٹیفکیٹ بھی تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا: ''یہ امیدوار نہایت ہوشیار اور قابل ہے۔ اس نے علی گڑھ میں ڈگریاں حاصل کرنے کے علاوہ بمبئی یونیورسٹی سے بی آئے آنرز فرسٹ کلاس میں کیا اور بمبئی یونیورسٹی میں اس کی تیسری پوزیشن آئی تھی۔'' یہ پڑھ کر انٹرویو کمیٹی کے ارکان مطمئن نظر آئے اور آخر میں

مجھ سے انگریزی میں یہ سوال کیا:

If you get this scholarship, then you will come back as a missionary to advance the cause of Education

میں نے فوراً جواب دیا: No Sir

اس پر ایک رکن نے کہا: Then

میں نے جواب دیا:

Sir, I will come back and work not as a missionary but with missionary zeal

اس پر سب مسکرائے اور یوں یہ انٹرویو تمام ہوا۔اس کے بعد میں واپس کراچی پہنچ گیا۔تقریباً ایک ماہ بعد دہلی سے خط میرے نام پہنچا جس میں درج تھا کہ آپ کا انتخاب اسکالرشپ کے لیے ہو چکا ہے، آپ ۱۵/اگست تک بمبئی کے فلاں مقام پر پہنچ جائیں تا کہ جب جہاز روانہ ہوتو آپ کو اس میں سوار کرایا جائے۔اس خط میں یہ بھی درج تھا کہ آپ کو کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں اسکالرشپ ملی ہے۔جب میں ویزا لینے کراچی میں امریکن کاؤنسلر کے دفتر پہنچا تو اس نے مجھ سے کہا کہ تم خوش قسمت ہو کہ تمھیں کولمبیا یونیوسٹی میں اسکالرشپ ملی ہے۔میں نے اس سے کہا کہ مجھے اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ مجھے اسکالرشپ پر امریکہ بھیج رہے ہیں، مجھے آکسفورڈ یا کیمبرج بھیجتے تو اچھا ہوتا۔اس نے مجھ سے مسکرا کر کہا کہ تم کولمبیا یونیورسٹی جاؤ گے تو خوش ہو گے کیونکہ کولمبیا اس وقت آکسفورڈ اور کیمبرج سے بڑی یونیورسٹی ہے اور اس کا معیار بھی ان سے اعلیٰ ہے، دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے انگلینڈ کی یونیورسٹیوں کا وہ معیار نہیں رہا جو پہلے تھا۔

کراچی سے امریکہ براہ بمبئی

امریکہ روانگی کے لیے میں بمبئی پہنچا اور ۱۵/اگست ۱۹۴۶ء کو بمبئی سے بحری جہاز میں سوار ہوا۔ ۳۸ دن کے سفر کے بعد سان فرانسسکو پہنچا جہاں سے ریل گاڑی میں سوار ہو کر ۲۵/ستمبر ۱۹۴۶ء کو کولمبیا یونیورسٹی نیویارک پہنچ گیا۔ یہاں تقریباً ڈھائی سال سے کچھ زائد عرصے تعلیم حاصل کی اور مئی ۱۹۴۹ء تک یہاں مقیم رہا۔ اس وقت میری توجہ اس بات پر تھی کہ یہ مجھے زندگی میں سنہری موقع ملا ہے، اس کو ضائع نہ کروں اور خوب محنت سے تعلیم حاصل کروں۔ کولمبیا میں اس وقت کریڈٹ پوائنٹ سسٹم رائج تھا۔ ہر طالب علم کو اختیار کردہ کورس کے نمبر حاصل کر کے آگے بڑھنا ہوتا تھا۔ ایم اے کی ڈگری کی خاطر کم از کم ۳۲ پوائنٹ حاصل کرنا ضروری تھا۔ میں نے شب و روز محنت کی اور چھٹیوں میں بھی مزید کورس لے کر محض ایک سال کے عرصے میں ایم اے ایجوکیشن کے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس کے بعد ارادہ کیا کہ تعلیم سے متعلق ہی کسی موضوع پر پی ایچ ڈی کروں۔ وہاں کے طریقہء کار کے مطابق پی ایچ ڈی کا مقالہ Thesis لکھنے سے قبل کئی کورس کرنا پڑتے تھے۔ مقالے کے موضوع کے لیے پہلے میں نے جس موضوع کا انتخاب کیا وہ 'سندھ میں تعلیمی محکمے کی اصلاح' تھا۔ اس مقصد کی خاطر سندھ کے شعبہء تعلیم سے متعلق کئی حضرات کو خطوط لکھے جس میں چھے ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس کے جواب میں ضروری مواد بھجنا تو ایک طرف کسی نے ایک خط کا بھی جواب نہیں دیا۔ آخر کار میں نے پوری صورت حال ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ مرحوم کو لکھی۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ پاکستان نیا نیا قائم ہوا ہے اس لیے یہاں پوری صورت خال ڈانواڈول ہے اور اب تک کوئی نیا نظام قائم نہیں ہو سکا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم کسی اور موضوع کا انتخاب کرو اور اس پر مقالہ لکھو۔ اس مشورے کے بعد میں اپنے پروفیسر سے ملا جس کی نگرانی میں مقالہ لکھنا تھا اور اس سے کہا کہ اب میرا ارادہ ہے کہ پورے ملک پاکستان کے لیے استادوں کی تربیت کے موضوع پر مقالہ لکھوں۔ اس نے

یہ تجویز قبول کر لی چنانچہ اب میرے مقالے کا موضوع یہ تھا:

A Program of Teacher Education for the New State of Pakistan

اور اس موضوع پر پی ایچ ڈی کے لیے تن دہی سے میں مصروف ہو گیا۔

اقوام متحدہ کے صدر دفتر میں تربیتی پروگرام اور عارضی ملازمت

اسی کتاب میں مذکور ہے کہ ڈاکٹر بلوچ نے اس بارے میں فرمایا تھا کہ:

سال یعنی ۱۹۴۸ء میں حکومت پاکستان کے ایک اہم عہدے دار مسٹر مجید ملک نیویارک آئے اور پاکستانی طلبہ کو طلب کیا۔ انھوں نے مطلع کیا کہ گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران ہمیں پاکستانی طلبہ میں سے کسی ایک کو دس ہفتوں کے لیے اقوام متحدہ کے صدر دفتر میں تربیتی پروگرام کے لیے بھیجنا ہے۔ پھر انھوں نے تمام طلبہ کے انٹرویو لیے اور امتحان بھی لیا۔ اس کے بعد اس تربیتی پروگرام کے لیے انھوں نے میرا انتخاب کیا چنانچہ چھٹیوں کے یہ دس ہفتے میں نے اقوام متحدہ میں گزارے۔ یہ میرے لیے زندگی کا بالکل نیا تجربہ تھا جس کے دوران یہ علم ہوا کہ بین الاقوامی طور پر پوری دنیا میں کیا کچھ اور کیسے ہو رہا ہے۔ اس تربیتی پروگرام کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے پر بھی کام جاری رکھا اور ایک ٹائپ رائٹر خرید کر پہلے ٹائپ رائٹنگ سیکھی اور خود ہی اپنا مقالہ ٹائپ کیا۔ اس کے بعد ایک ماہر ٹائپ رائٹر سے پورا مقالہ دوبارہ ٹائپ کرا کر شب و روز محنت سے چھے مہینے میں مقالہ مکمل ٹائپ کرا لیا۔ مقالہ جمع کرانے کے بعد مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی۔

ابھی میں نے پی ایچ ڈی کا کام مکمل ہی کیا تھا کہ ایک دن اقوام متحدہ کے ادارے ECOSOC کی جانب سے مجھے خط ملا۔ اس میں تحریر تھا کہ چونکہ میں نے اس سے قبل اقوام متحدہ کے صدر دفتر میں کام کیا تھا اس وجہ سے مجھے انٹرویو کی خاطر طلب کیا گیا

ہے۔ وہاں جب میں پہنچا تو مجھے مسٹر لازلو ہیموری کے دفتر میں پہنچا دیا گیا جو اس ادارے کے ڈائرکٹر اور ہنگری کے باشندے تھے۔ انھوں نے مجھے مطلع کیا کہ میرے عمدہ کام کی وجہ سے انھوں نے مجھے اقوام متحدہ میں کام کرنے کے لیے منتخب کیا ہے اور کثیر تنخواہ کی پیش کش بھی کی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کا شکریہ کہ مجھے اس اہم عہدے کے لیے منتخب کیا ہے لیکن اب ہمارا ملک پاکستان قائم ہو چکا ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ میں پاکستان جاؤں اور اپنے ملک کی خدمت کروں۔ مسٹر ہیموری نے میری اس بات کو پسند کیا اور کہا کہ اگر تمہارا یہی جذبہ ہے تو تم ضرور اپنے ملک جاؤ اور اس کی خدمت کرو۔ اسی دوران محکمہء تعلیم حکومت پاکستان کی جانب سے مجھے خط ملا کہ یہاں تعلیمی ماہرین کی سخت ضرورت ہے آپ یہاں آکر اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر کے عہدے پر کام شروع کرو۔ اس زمانے میں واشنگٹن کے پاکستانی سفارت خانے میں ڈاکٹر امداد حسین ایجوکیشن آفیسر کے عہدے پر فائز تھے جو میری کامیابی سے بہت خوش تھے۔ انھوں نے میری واپسی کا یہ انتظام کیا کہ نیویارک سے لندن تک بذریعہ ہوائی جہاز سفر کا انتظام کرا دیا، اس کے علاوہ میرے لیے یہ بھی انتظام کرا دیا کہ ایک ماہ تک میں برطانیہ میں رہ کر وہاں کے تعلیمی نظام کا مطالعہ کروں۔ چنانچہ ایک ماہ تک میں نے انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کی یونیورسٹیوں اور ٹیچرز کالجز میں وقت گزارا، وہاں کے پروفسروں سے ملا اور وہاں کے تعلیمی نظام سے متعلق مفید معلومات حاصل کیں۔ ایک ماہ وہاں گزار کر میں وہاں سے کیلیڈونیا کمپنی کے بحری جہاز کے ذریعے مئی ۱۹۴۹ء میں بخیر وعافیت کراچی پہنچ گیا۔

جیسا کہ ذکر آچکا 1946ء میں بلوچ صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے سندھ مسلم کالج کراچی بحیثیت لیکچرار آچکے تھے۔ اسی برس برطانوی حکومت نے مرکزی سطح پر ڈاکٹریٹ کے لیے اسکالرشپ کا اعلان کیا۔ بلوچ صاحب نے آل انڈیا سطح پر اس میں کامیابی حاصل کی اور 16 راگست 1946ء کو بمبئی سے امریکہ روانہ ہوئے جہاں کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں درج ذیل موضوع پر ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیقی مقالے کا آغاز کیا:

A Programme of Teacher education for the New State of Pakistan

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے ہندوستان سے امریکہ تک بحری سفر کی رُوداد ہم پیشِ نظر کتاب کے باب نمبر ۲۳ میں بیان کریں گے۔

امریکہ میں قیام کے دوران بلوچ صاحب نے ڈاکٹریٹ کے مقالے کے لیے تحقیقی کاموں کے ساتھ ساتھ دیگر مفید خدمات بھی انجام دیں۔ مورخہ ۲۲/جون ۲۰۰۶ء کو بلوچ صاحب نے راقم الحروف کو انٹرویو کے دوران انھیں مصروفیات کے بارے میں یوں مطلع فرمایا:

''میں ستمبر 1946ء میں امریکہ پہنچا جہاں کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں مجھے داخلہ ملا۔ جنوری 1947ء میں ہماری طلبہ یونین نے خطاب کے لیے ایک صاحب کو مدعو کیا جن کا نام ''طارق ناتھ داس'' تھا۔ ان صاحب نے اس موقعے پر تقریر شروع کی تو اسے سن کر مجھے شدید صدمہ (Shock) محسوس ہوا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ مکمل تیاری کر کے آئے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف اور انگریزوں کی تعریف میں تقریر کریں گے۔ اس موقعے پر میں نے صحیح صورتِ حال واضح کرنے کے لیے ان سے سوال کیا جس کا جواب انھوں نے دیا۔ پھر میں نے دوسرا سوال کیا جس کا بیزاری سے جواب دیا۔ جب میں نے تیسرا سوال کیا تو وہ بگڑ گئے اور یہ احتجاج کرتے ہوئے چلے گئے کہ مجھے یہاں بلا کر میری بے عزتی کی گئی ہے۔ اس نازک موقعے پر امریکی طالب علموں نے مجھے کہا کہ اسٹیج پر آ کر اس موضوع پر اظہار خیال کروں۔ میں اسٹیج پر پہنچا اور طارق ناتھ داس کے تمام الزامات کا مدلل رد کیا۔ اس تقریب کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ طارق ناتھ داس کا تعاقب کیا جائے اور مسلمانوں کے خلاف جن خیالات کا وہ امریکہ میں اظہار کر رہے ہیں، اس کے جواب میں مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر پیش کیا جائے۔ کچھ ہی عرصے بعد American Academy of Political and Social Sciences کی فلاڈلفیا میں گولڈن یا سلور جوبلی ہوئی۔ اس ادارے کی جانب سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو بھی دعوت نامہ بھیجا گیا جہاں سے جواباً لکھا گیا کہ نبی بخش

بلوچ کولمبیا یونیورسٹی میں ہیں اور وہ مسلم یونیورسٹی کی نمائندگی کریں گے۔ چنانچہ اس تقریب میں، میں نے اور مدثر حسین شمسی نے مسلم یونیورسٹی کی نمائندگی کی۔ اس موقع پر بھی طارق ناتھ داس سے ہمارا مجادلہ ہوا، جس کے بعد انھوں نے اپنے فاسد خیالات کا اظہار بند کیا اور کہیں ہمارا سامنا نہیں کیا۔"(۱)

مسلم یونیورسٹی گزٹ میں خط

ہفت روزہ مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ میں مورخہ ۸ رنومبر ۱۹۴۶ء کے شمارے میں ڈاکٹر بلوچ کا ایک خط شایع ہوا تھا۔ اس خط کی ابتدا میں ایڈیٹر مسلم یونیورسٹی گزٹ کی جانب سے درج ذیل نوٹ شایع ہوا:

"نبی بخش بلوچ ایم اے عربی و ایل ایل بی (علیگ) جو ہمارے ایک ہونہار اور فاضل طالب علم تھے گزشتہ سال سندھ مسلم کالج کراچی میں عربی کے پروفیسر ہو گئے تھے اور ادھر تین سال کی محنتِ شاقہ سے انھوں نے "سندھ میں عربی دور" پر اپنا تھیس تیار کیا تھا جس کے کچھ اقتباسات 'اسلامک کلچر' حیدر آباد میں نکل چکے ہیں۔

گزشتہ اگست میں گورنمنٹ آف انڈیا کے خرچ پر بغرض تعلیم امریکہ بھیجے گئے ہیں جہاں سے انھوں نے جناب پروفیسر میمن عبدالعزیز صاحب صدر شعبہء عربی کی خدمت میں حسب ذیل خط بھیجا ہے جس میں موصوف نے اپنے سفر کے حالات اور بعض ولایتوں کی یونیورسٹیوں کے کوائف درج کیے ہیں:

"بمبئی سے روانگی کے وقت ایک خط راج کوٹ کے پتہ پر روانہ کیا تھا۔ امید ہے کہ مل چکا ہوگا۔ امریکہ کا سفر 'فن تعلیم' میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اختیار کرنا پڑا۔ فنی نقطہ نظر کے علاوہ "سیروا فی الارض" کے اصول کے ماتحت ایک سیر و سفر کا جذبہ یہاں تک کھینچ کر لایا۔ اور پھر "مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے"۔ اپنی جیب پر چنداں بوجھ نہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے کرایہ سفر اور ٹیوشن فیس کے علاوہ یہاں ۱۵۰

ڈالر ماہانہ وظیفہ ملتا ہے۔

ہمارا سفر بمبئی سے ۲۲ر اگست ۵ بجے شام کو جہاز مسمّٰی بہ ''جنرل گارڈن'' میں شروع ہوا، یہ جہاز ۲۴ر کی شام کو کولمبو (سنگل دیپ) بندر کے نزدیک سے گزرا اور ۲۸ر کو ۱۰ بجے سنگاپور بندر پر پہنچا۔ جہاز ڈاک تک نہیں گیا لہٰذا اس لڑائی کے تاریخی شہر کو دیکھنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ ۲ بجے دوپہر کے بعد یہاں سے جہاز روانہ ہوا اور دوسرے دن ۲۹ر کو بندہ کی کوشش سے جملہ مسلم مسافروں نے جہاز پر نماز عید ادا کی۔ ۳۱ر اگست کو جہاز جزائر تبان و کور جڈور کے درمیانی دروازے سے منیلا بندر کی حدود میں داخل ہوا۔ منیلا بندر میں کئی ڈوبے ہوئے جہاز منکوسۃً علی رو سھا نظر آئے۔ یہ سب اس لڑائی کے کارنامے تھے لیکن منیلا کی تباہی و بربادی کا منظر اور زیادہ تعجب خیز تھا۔ جاپانیوں نے اس شہر کو مورچہ بنایا اور امریکی جہازوں کو تقریباً ہر جگہ پر بم برسانے پڑے۔ بڑے بڑے مکانات، سرکاری عمارتیں، ہوٹلیں، ٹاؤن ہال، یونیورسٹی بلڈنگیں اور کلیسائیں شاہی کھنڈرات بنی ہوئی تھیں اور ان کو دیکھ کر وحشت پیدا ہوتی تھی۔ بازاروں کی جو کڑیاں سلامت رہ گئی تھیں وہاں دکانیں موجود تھیں۔ ہر چیز نہایت گراں تھی۔ فلپائن والوں کو ۴ر جولائی کو امریکہ نے آزادی دی تھی لہٰذا لوگوں میں زندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ فلپائن والوں کو امریکی تہذیب وتمدن نے جذب کر لیا ہے۔ وہ اپنا معاشرتی سرمایہ بالکل کھو چکے ہیں۔ مغربیت میں غرق ہیں لیکن نہایت بیدار اور زندہ دل ہیں۔ ۲ر ستمبر ۷ بجے صبح کو جہاز ساحل چین کی طرف روانہ ہوا۔ اور ۴ر ستمبر کو ۱۱ بجے ہانگ کانگ پہنچا۔ ایک دن کے لیے ہانگ کانگ دیکھنے کا موقعہ ملا۔ یہ شہر خلیج ہانگ کانگ کے دونوں طرف پہاڑیوں پر آباد ہے۔ یہاں ہندوستانی فوج کا پرانا مرکز ہے جہاں ایک عالی شان مسجد بنی ہوئی ہے۔ پیش امام صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ چینی مسلمان تھے اور انگریزی سے اچھی خاصی واقفیت رکھتے تھے۔ ہانگ کانگ شہر میں ایک عمدہ جامع مسجد ہے جو ۱۹۱۵ء میں بمبئی کے حاجی

اسحاق سیٹھ کے خرچ پر تیار ہوئی۔ ایک خاص چینی مسلمانوں کی مسجد شہر کے ''ونچائی'' محلہ میں واقع ہے جہاں ایک صاحب محمد تواضع چینی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کل مصر سے جہاز میں آئے ہیں اور وہ کل تیرہ رفقاء ہیں۔ ۹ چین کے باشندے اور ۴ چینی ترکستان کے۔ یہ تیرہ چینی نوجوان ۸ سال جامعہ ازہر میں تعلیم ختم کر کے اب واپس چین جا رہے تھے۔ محمد تواضع بدرالدین چینی محمد مکین چینی کو بخوبی جانتے تھے۔ ۶ رستمبر کو جہاز ہانگ کانگ سے روانہ ہوا اور مشرق شمال کی سمت میں جزائرِ لوچو سے گزر کر جاپان کے جنوب سے یوکوہاما کی سمت میں آ کر سیدھا سان فرانسسکو کو روانہ ہوا۔ اور ۱۸ رستمبر کو وہاں پہنچا۔ دو دن شہر دیکھنے کا موقع ملا۔ یہاں بھی ''راشن سسٹم'' موجود ہے اور لڑائی کی دیگر صعوبتیں بھی باقی ہیں حالانکہ ہندوستان جیسی سختی نہیں۔ سان فرانسسکو میں انڈیا گورنمنٹ کے افسر کی طرف سے ہمیں تین ماہ کا وظیفہ پیشگی ملا۔ جملہ ۱۲۵ طلبہ اس سفر میں ہمارے ساتھ تھے۔ فن تعلیم کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا نے ہندوستان سے جملہ ۱۳ طلبہ منتخب کئے تھے جن میں سے تین یہاں ہم سفر ہیں۔ ۲۱ رستمبر کو سان فرانسسکو سے نیویارک کو روانگی ہوئی اور اس ریل کے سفر میں امریکہ کو مشرق سے مغرب تک دیکھنے کا موقع ملا۔ راستہ میں شکاگو میں اترے اور تین گھنٹے بہ ذریعہ موٹر شہر کی سیر کی۔ وہاں سے روانہ ہو کر ۲۵ رستمبر کو نیویارک کولمبیا یونیورسٹی میں پہنچے اور بفضل خدا اسی دن داخلہ کا طول طویل مرحلہ ختم ہو گیا۔ اور ایک ہوسٹل میں رہنے کو جگہ مل گئی۔ (مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لینے والے اور داخلہ کرنے والے حضرات غور فرمائیں)۔

داخلہ کولمبیا یونیورسٹی کے ''ٹیچرس کالج'' میں ہوا جو درحقیقت بقول امریکیوں کے دنیا میں بڑی سے بڑی ''تعلیمی یونیورسٹی'' ہے۔ اس سال سات ہزار گریجویٹوں نے یہاں داخلہ لیا ہے اور کم و بیش دنیا کے ہر ملک کے طلبا یہاں موجود ہیں۔ چین، ایران، ترکی، عراق و مصر کے چند صاحبان سے ابتدائی ملاقات ہو چکی ہے۔ ہوسٹل کی فیس ستّر ڈالر فی ٹرم ہے۔

کھانے کا انتظام حسبِ رواج ہوسٹل میں ہوتا ہے۔ سب لوگ ہوسٹل ہی میں کھانا کھاتے ہیں۔ تقریباً دو سے ڈھائی ڈالر روزانہ خرچ ہے۔ کھانا صاف اور زود ہضم مل جاتا ہے۔ مصالحہ اور چٹنی البتہ موجود نہیں۔ چاول ہوٹلوں میں اکثر نہیں ملتے۔ یہاں ''راجہ ہوٹل''، ''سیلون انڈیا ان'' موجود ہیں جہاں ہندوستانی کھانا بھی مل جاتا ہے۔ میں نے کالج میں ''ڈاکٹر آف ایجوکیشن'' کا کورس لیا ہے۔

کولمبیا یونیورسٹی میں شاندار ''اورینٹل ڈیپارٹمنٹ'' موجود ہے جو اب تک میں نے عدم فرصت کی وجہ سے نہیں دیکھا۔ اس کے متعلق آئندہ عرض کروں گا۔ یہاں کے پروفیسر ایک پروفیسر حتی تھے جنھوں نے بلاذری (فتوح البلدان) کا ترجمہ کیا ہے اور ایک تاریخ ادب عرب بھی لکھی ہے۔ اب وہ پرنسٹن یونیورسٹی میں ہیں۔ البتہ سان فرانسسکو میں کیلیفورنیا یونیورسٹی میں جانے کا اتفاق ہوا اور سیدھا اورینٹل ڈیپارٹمنٹ میں پہنچا اور اس کے رئیس ڈاکٹر ولیم پامر سے ملا۔ اس نے بتایا کہ یہاں مشرقیات سے مراد جاپانی، چینی اور مشرق اقصیٰ کی زبانیں ہیں لیکن ایک شعبہ وسط مشرق کا بھی موجود ہے۔ پھر انھوں نے ''ڈاکٹر ولیم پائز'' سے تعارف کرایا۔ ان کے سامنے عربی کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور واقعی لکھنے پڑھنے والے معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے عربی تاریخ خصوصاً مصر کے مملوک خاندان کی تاریخ پر اچھے خاصے معلومات دیے۔ یہ وہی ولیم پائز ہیں جنھوں نے ''النجوم الزاهر'' کو ایڈٹ کیا ہے۔ حال ہی میں النجوم کی ایک جلد لیڈن سے چھپ کر ان کے یہاں پہنچی تھی جو انھوں نے دکھائی۔ ابھی کچھ اور جلدیں باقی ہیں جن کو انھوں نے ایڈٹ کر رکھا ہے مگر چھپنے کی دیر ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے عبدالعزیز المیمنی کا نام سنا ہے۔ خوش قسمتی سے میرے پاس آپ کا عربی میں دیا ہوا سرٹیفکیٹ موجود تھا جو میں نے ان کو دکھایا۔ کافی غور سے پڑھنے اور عربیت پر سَر دھننے لگے۔ انھوں نے پھر ''والٹر فیشر'' سے ملاقات کرائی جو اس سے پیشتر جیروشلم میں رہتے تھے۔ وہ ابن خلدون پر کام کر رہے

تھے اور کہا کہ آپ اپنے پروفیسر صاحب سے ابن خلدون کے متعلق خاص معلومات حاصل کر کے مجھے دیں۔فیشر اتنے فاضل نہیں معلوم ہوتے تھے جتنے ولیم پامر۔''

مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کا قیام اور اکیڈمی آف اسلام میں خدمات:

بلوچ صاحب کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ امریکہ میں پاکستانی طلبہ کی پہلی تنظیم قائم کی۔اس تنظیم کے قیام اور اس کے تحت منائے گئے پہلے یومِ پاکستان کے حوالے سے راقم کو مورخہ ۲۲ جون ۲۰۰۶ء کو فرمایا:

''اس زمانے میں مجھے یہ بھی اعزاز حاصل رہا کہ انھوں نے امریکہ میں مسلم طلبہ کی پہلی تنظیم مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن قائم کی اور میں اس کا سیکریٹری بنا۔قیام پاکستان کے بعد سے اس کا نام پاکستان اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن ہے۔جب پاکستان قائم ہونے کی اطلاع ہمیں ملی تو ہمیں بے حد خوشی ہوئی اور میں نے نیویارک شہر کا ایک بڑا ہال کرائے پر لیا اور 14/اگست 1947ء کو ایک شاندار پروگرام منعقد کیا۔یہ پروگرام پاکستان سے باہر پہلا یوم پاکستان تھا کیونکہ 14 اگست 1947ء کو پاکستان میں دن تھا اور اس کے محض چند گھنٹے بعد ہی ہم نے امریکہ میں یومِ پاکستان منایا۔''(۲)

امریکہ میں قیام کے دوران بلوچ صاحب نے ''اکیڈمی آف اسلام'' میں بھی خدمات انجام دیں۔بعد میں مولانا آزاد سبحانی پر ڈاکٹر صاحب نے ایک کتاب بھی لکھی جس میں ''اکیڈمی آف اسلام'' میں مصروفیات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہ اکیڈمی'' ''ہارلم'' میں تھی۔ہارلم حبشی نسل کے لوگوں کا مسکن ہے۔اس اکیڈمی کی بنیاد کچھ سال پہلے عطیہ بیگم مرحومہ (۳) نے ڈالی تھی۔یہ ان دنوں کی بات ہے جب عموماً کوئی باہر سے آنے والا مسلمان ''ہارلم'' کا نام تک نہیں لیتا تھا لیکن عطیہ بیگم مرحومہ نے وہیں پر ہی ایک اسلامی ادارہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ میں اور دو طلبہ رفیق اتوار کے روز اکیڈمی آف

اسلام میں جاتے تھے، نومسلموں سے ملتے تھے اوران کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔''(۴)
1949ء میں بلوچ صاحب نے نمایاں کامیابی سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ جمع کرا کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور واپس پاکستان پہنچے۔

مولانا آزاد سبحانی سے تعارف اور ملاقاتیں

امریکہ میں قیام کے دوران بلوچ صاحب کا قریبی تعلق برصغیر کے ممتاز عالم اور خطیب مولانا آزاد سبحانی سے بھی قائم ہوا۔ وہ مولانا کی سادگی، خودداری اور مسلمانوں کے لیے جذبہء خیر خواہی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ دیگر کاموں کے علاوہ بلوچ صاحب نے یہ خدمت بھی انجام دی کہ مختلف مواقع پر مولانا کے عربی خطبات کا فی البدیہ اردو ترجمہ کرتے۔ کئی برسوں بعد بلوچ صاحب نے مولانا پر اردو زبان کی اولین کتاب ''مولانا آزاد سبحانی۔تحریک آزادی کے ایک مقتدر رہنما'' لکھی جو لاہور سے شایع ہوئی۔ اس کتاب میں بلوچ صاحب نے مولانا سے ملاقاتوں کی تفصیلات بھی بیان کیں جو کہیں اور دستیاب نہیں۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''یہ سال ۱۹۴۶ء کے نصف آخر کا ذکر ہے جب میں کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں طالب علم تھا۔ عیدالاضحیٰ کا موقعہ تھا اور ہم نے سنا کہ ہندوستان سے ایک عالم دین آئے ہیں جو شہر نیویارک میں مسلمانوں کو نماز عید پڑھائیں گے۔ انڈین سیمین کلب کی مسلم جماعت کی طرف سے ان کو مدعو کیا گیا تھا۔ یہ جماعت بنگال کے مسلمان باشندوں کی تھی۔

عید کے دن جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں نماز کا انتظام تھا تو معلوم ہوا کہ وہ عالم دین مولانا آزاد سبحانی ہیں۔ غالباً کلکتہ میں عید کے موقعے پر مولانا آزاد سبحانی کی امامت کی شہرت سے متاثر ہو کر ان کو نیویارک میں امامت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ مولانا صاحب نماز عید کا خطبہ عربی میں دینے والے تھے اور ضرورت اس بات کی تھی کہ اس خطبے کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ ہی سنایا جائے۔ چونکہ میں عربی سے کچھ مانوس تھا لہذا یہ خدمت میرے سپرد کی گئی۔ مولانا نے بڑا موثر اور شاندار خطبہ دیا، البتہ کہہ نہیں سکتا کہ میں نے

ترجمے کا حق کہاں تک ادا کیا؟ بہرحال یہ ایک سبب بنا کہ مولانا سے میری قریبی ملاقات ہوگئی۔ میں ان کی درویشانہ، مدبرانہ اور جاذب نظر شخصیت کا گرویدہ ہوگیا۔ نماز عید کے بعد ہم اپنے ہوسٹل میں واپس آئے اور دوسرے دن تعلیمی پروگرام میں مشغول ہوگئے۔ شاید دوروز گزر گئے کہ میرے دل میں خیال آیا کہ مولانا صاحب کا پتہ کرنا چاہیے کہ اب وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اس ارادے سے کچھ وقت بچا کر میں ''انڈین سیمین کلب'' پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ وہاں اور تو کوئی بھی نہیں البتہ مولانا صاحب دروازے کے ساتھ ایک بینچ پر تن تنہا بیٹھے ہیں۔ میں نے مصافحہ کیا اور حال پوچھا! کہنے لگے سب خیر ہے ہاں اس وقت آپ اگر مجھے تمباکو دلوادیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔ مولانا صاحب ان دنوں پائپ پیتے تھے۔ پائپ ان کے ہاتھ میں تھا اور منہ کو لگا رہے تھے۔ لیکن سلگا ہوا نہیں تھا۔ میں تمباکو کی ڈبیا خرید کر کے لایا اور مولانا پائپ سلگا کر بہت خوش ہوئے۔

بعد میں باتوں میں پتہ چلا کہ کل صبح سے لے کر انھوں نے کچھ کھایا بھی نہیں اور نہ ہی وہاں کوئی انھیں کھلانے والا تھا۔ میں نے حسب حال کچھ کھانے کا بندوبست کیا اور پھر ان سے یوں گزارش کی مولانا صاحب! آپ یہاں اکیلے ہیں اگر اجازت دیں تو میں آپ کے لیے کہیں رہائش کا انتظام کردوں جو کہ یہاں کے غریب مسلمانوں کے یہاں ہوگا۔ یہ سن کر انھوں نے فوراً مان لیا۔ میں نے اسی شام کو اکیڈمی آف اسلام کے ایک رکن مختار احمد صاحب کے یہاں ان کی رہائش کا بندوبست کرا دیا۔ یہ اکیڈیمی ہارلم میں تھی۔ ہارلم حبشی نسل کے لوگوں کا مسکن ہے۔ اس اکیڈمی کی بنیاد کچھ سال پہلے عطیہ بیگم محترمہ نے ڈالی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب عموماً کوئی باہر سے آنے والا مسلمان ہارلم کا نام تک نہیں لیتا تھا۔ لیکن عطیہ بیگم نے وہیں پر ایک اسلامی ادارے کی بنیاد ڈالی تھی۔ میں اور ایک دو طلبہ رفیق اتوار کے روز اکیڈمی آف اسلام میں جاتے تھے نومسلموں سے ملتے تھے اور ان کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ وہاں کے ایک سرگرم رکن محترم مختار احمد تھے جن کا اپنا گھر تھا۔ میں نے

جب ان سے مولانا کی رہائش کے مسئلے کا ذکر کیا تو محترم مختار احمد نے بخوشی قبول کر لیا کہ مولانا موصوف ان کے ہاں بطور مہمان ٹھہریں۔ چنانچہ میں مولانا صاحب کو ان کے گھر لے آیا اور مختار صاحب اور ان کی اہلیہ نے مولانا کے لیے ایک خاص کمرہ مخصوص کر دیا اور ان کی خاطر خواہ خدمت کرتے رہے۔ اس کے بعد مولانا صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ان کے تبحّر علمی سے استفادہ کرتا رہا۔

مولانا موصوف کافی عرصے (غالباً تین چار مہینے) تک وہاں مقیم رہے۔ اس مدت میں وہ ہر اتوار اور کبھی دوسرے اتوار کو شہر نیویارک کی مسلم تنظیموں کو اپنے خطبات سے نوازتے تھے۔ مولانا کا خطاب عربی میں ہوتا تھا اور میں ان کے انگریزی مترجم کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ایک روز فرمایا کہ:

''آج میں انگریزی میں تقریر کروں گا اور جہاں میرے الفاظ میں کمی محسوس ہو وہاں آپ مناسب الفاظ ڈال دیجیے اور جس جگہ میرے الفاظ مبہم لگیں وہاں ان کا آسان نعم البدل بیان کر دیجیے گا''

انگریزی میں ان کا پہلا خطاب تھا تو انتہائی دلچسپ مگر حاضرین ان کے مافی الضمیر کو سمجھ گئے۔ یونہی چار پانچ تقریریں کرنے کے بعد ان کے انگریزی انداز بیان میں کافی صحت اور معنویت آ گئی اور لوگ محو حیرت ہو کر ان کی ذہانت کی داد دینے لگے۔''

انھی دنوں بلوچ صاحب نے مولانا آزاد سبحانی کا لکھا ایک ترجمہ بھی شایع کرایا تھا۔ اس بارے میں لکھتے ہیں:

''بعد ازاں ایک بار مجھے فرمایا کہ میں فلسفہء ربّانیت کی روشنی میں اسلام کے متعلق انگریزی میں ایک کتابچہ لکھنا چاہتا ہوں جسے اگر آپ شائع کروا دیں گے تو یہاں پر رہنے والوں کے لیے کافی مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دو روز میں مسودہ تیار کر لیا اور تصحیح کے لیے مجھے دے دیا۔ میں نے اس کی مناسب اصلاح کر دی اور ایک تعارفی نوٹ

کا اضافہ کر کے اسے شائع کروادیا۔ میں ان دنوں ''عبداللہ عثمان السندی'' کے قلمی نام سے لکھا کرتا تھا اور تعارف کے آخر میں بھی یہی نام لکھا۔ اس وقت یونیورسٹی میں ہمارے ایک پروفیسر صاحب نفسیات کے گیسٹالٹ (Gestalt) نظریے کی توضیح وتفسیر کر رہے تھے اور فہم وادراک (Learning) کے سلسلے میں فرمارہے تھے کہ ادراک بتدریج نہیں ہوتا بلکہ بہ یک وقت فوری طور پر ہوتا ہے۔ ہم نے مولانا صاحب کو ہوسٹل میں بلایا تھا جہاں پر طلبہ ان سے علمی سوالات پوچھ رہے تھے۔ چنانچہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ ادراک مجمل ہے یا مفصل؟ اس پر انہوں نے بڑی دقیق گفتگو فرمائی۔

مولانا صاحب سے صحبتوں کا سلسلہ جاری رہا اور میں متواتر طور پر ان کے ہاں آتا جاتا رہا۔ اچانک ایک روز فرمایا کہ اب میں یہاں سے رخصت ہونے والا ہوں۔ میں نے پوچھا کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ فرمایا: مصر۔ میں نے دریافت کیا کہ وہاں کون ہے کس کے پاس جا کر ٹھہریں گے؟ تو فرمایا ''کئی اللہ کے بندے ہوں گے کسی کے پاس چلا جاؤں گا اور کوئی نہ کوئی تو مجھے ٹھہرا ہی لے گا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ مصر سے ہوتے ہوئے ہندوستان چلا جاؤں گا اور وہاں جا کر جواہر لعل نہرو سے ملوں گا۔ یہاں جو کچھ دیکھا اور سمجھا ہے یہ ان کے گوش گزار کروں گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان سے ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں گفتگو کروں گا تاکہ حصول آزادی کے بعد مسلمان وہاں پر عزت کی زندگی بسر کر سکیں۔''

میں نے پوچھا کہ اس کے بعد آپ کے کیا پروگرام ہوں گے؟ فرمایا ''ہندوستان کے بعد روس جاؤں گا اور وہاں اپنے فلسفہ ربانیت کی روشنی میں ان کو سوشلزم کے صحیح مفہوم کی طرف راہنمائی کروں گا۔ میرے خیال میں مولانا سوشلزم کے بعض پہلوؤں کو اچھا تصور کرتے تھے، خاص طور پر یہ کہ سوشلزم میں کام کرنے والوں اور مزدوروں کو ایک مقام حاصل ہوا ہے۔ ان کے خیال میں یہ جذبہ اسلامی فکر کی روح میں سے ہے۔ فرماتے تھے کہ

ازروئے قرآن خود اللہ تعالیٰ کی ایک ذی شان صفت ''ورکر'' میں سے ہے کہ کُلَّ یومٍ هُوَ فی شَان'' (الرحمن:۲۹)

چنانچہ اپنی اُسی فکر کے پیش نظر انھوں نے اپنے انگریزی کتابچے میں بھی ایک باب اس عنوان سے باندھا ہے ''اللہ تعالیٰ بحیثیت ایک ورکر کے'' جب مولانا کے ''ہارلم'' سے رخصت ہونے کی خبر وہاں کے مسلمانوں کو ملی تو وہ ان سے ملنے آئے اور پوچھا کہ کیا آپ کے پاس ٹکٹ آ گیا ہے؟ فرمایا ''ٹکٹ نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کوئی صورت پیدا کر دے گا۔ اس پر اکاڈمی آف اسلام کے ممبروں نے مل کر رقم جمع کی اور مولانا کے لیے بحری جہاز کا ٹکٹ خرید لیا۔ ساتھ ہی ان کے لیے دو چار کپڑوں کے جوڑے جن میں ٹاپ کوٹ اور پینٹ شامل تھے، خرید لیے ایک ٹرنک اور ایک بیگ اور ان میں مولانا کے کپڑے اور مناسب سامان سفر بھر دیا گیا۔ مقررہ تاریخ پر ہم بندرگاہ پر مولانا کو الوداع کہنے گئے۔ ان کے لیے جمع کیا جانے والا زادِراہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ سامان دیکھ کر انھوں نے مجھے اپنے قریب بلایا اور فرمایا:

''میں نے نہ کبھی پہلے سامان اٹھایا ہے اور نہ اب اٹھاؤں گا۔ اس روز میں نے اپنے بھائیوں کی دل شکنی کرنی مناسب نہ سمجھی تھی۔ اب میرے لیے جمع کیا جانے والا سامان یہیں پر رہنے دو تا کہ کسی ضرورت مند کے کام آ سکے۔'' اور پھر ہم سے مصافحہ کر کے اوپر جہاز میں چلے گئے۔

ان دنوں مولانا موصوف کی بعض نشستوں میں ان کے اشعار سننے کا بھی موقع ملا اور نیویارک سے جاتے وقت وہ اپنی ایک شعری بیاض بھی مجھے عنایت کر گئے۔ اس کتاب کے آٹھویں باب میں اشعار کے عنوان سے صفحات ۲۳۰۔۲۵۶ میں دیا جانے والا کلام بالخصوص ان کی شعری بیاض پر مبنی ہے۔ مولانا صاحب کی سوانح پر تحقیق و جستجو کے سلسلے میں مولانا آزاد سبحانی کا سفرنامہ مرتب حسن سبحانی مطبوعہ لکھنو ۱۹۷۱ء جو اب نایاب ہے، ہاتھ

آیا جس کے بعض اقتباسات استفادۂ عام کے لیے اس کتاب کے ساتویں باب میں جمع کر دیے ہیں۔

بہرحال مقدور بھر مولانا آزاد سبحانی کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مجھے امید ہے کہ مولانا اور ان کے کام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔''(۵)

امریکہ میں قیام کا فائدہ

پروفیسر محمد عمر چنڑ کی مرتبہ کتاب سنڌ جو ذهين ٻار ڊاڪٽر نبي بخش خان بلوچ (سندھ کا ذہین بچہ۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) ڈاکٹر بلوچ نے اپنے قیام امریکہ اور وہاں جو کچھ علمی اور عملی میدانوں میں سیکھنے کو ملا اور جن باتوں سے انھوں نے اپنی علمی زندگی میں فائدہ اٹھایا اس بارے میں مفید معلومات ملتی ہیں۔ اس بارے میں انھوں نے فرمایا:

''امریکہ میں قیام کے دوران یہ خوبی کی باتیں سیکھنے کو ملیں کہ کیسے لکھا جائے، اور اپنی تحریر میں تسلسل، تدبر اور توازن کیسے پیدا کیا جائے (یعنی Discipline, Detachment, Patience and Balance)۔ مثلاً ہمارے یہاں استاد اکثر کہتے ہیں کہ: This is very very good جبکہ امریکہ میں کہا جاتا ہے کہ Very very good کچھ بھی نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ اچھا کا فقط Good ہے۔ وہاں قیام کے دوران یہ بھی سیکھنے کو ملا کہ بڑی بڑی باتیں نہ کی جائیں اور باتوں میں مبالغہ نہیں کیا جائے۔ وہاں یہ بھی سیکھا کہ اپنی تحریر میں صحیح اور خوبصورت جملے کس طرح لکھے جائیں، ایسے جملے جن میں ضبط ہو، بیان کا توازن ہو، خوبصورت اور موثر انداز سے لکھا جائے، تحریر میں غیر ضروری اطناب نہ ہو بلکہ ایجاز ہو۔ اس کے علاوہ تحریر میں ذاتی جذبات نہ ہوں بلکہ مدلل انداز ہو۔ ان باتوں کا مجھے امریکہ روانگی سے قبل علم نہیں تھا۔

اس کے بعد اپنی شخصی تنقید کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ ہم نے وہاں یہ بھی سیکھا کہ اپنے آپ پر پہلے خود تنقید کس طرح کی جائے۔ علمی کام کے دوران لکھنے والا پہلے اپنے آپ سے سوال کرے کہ جب قاری میری تحریر پڑھے گا تو کیا سوچے گا، کیا سمجھے گا؟ اس موضوع یا اس عبارت کو کیا میں مزید بہتر انداز سے لکھ سکتا ہوں، اگر ہاں تو کس طرح لکھ سکتا ہوں؟ میں نے اپنی تحریر میں جو دلائل دیے ہیں، ان کا رد کیا ہوگا اور اگر کسی نے رد کیا تو میں کس طرح پہلے ہی اس رد کے مقابلے میں مضبوط دلائل اپنی تحریر میں شامل کروں؟ مختصراً یہ کہ اپنے اندر ایک قاضی کو بٹھایا جائے جو پہلے ہی فیصلہ کر لے کہ کیا کچھ اور کس انداز سے لکھا جائے۔''

امریکہ سے واپسی کے بعد گاؤں میں پذیرائی

ڈاکٹر صاحب جب امریکہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر پہلی مرتبہ اپنے گاؤں قریہ جعفر خان لغاری پہنچے تو ان کے رشتے داروں اور گاؤں کے افراد نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی محنت اور قابلیت سے اس گاؤں کا نام بھی روشن کیا تھا اور وہ اعزاز حاصل کیا تھا جو اس گاؤں تو کیا قریب کے کسی گاؤں کے کسی فرد نے آج تک حاصل نہ کیا تھا۔ اس بارے میں مورخہ ۲۳رفروری ۲۰۱۴ کو ڈاکٹر بلوچ صاحب کے ماموں جناب علی بخش لغاری نے دوران انٹرویو درج ذیل معلومات سے آگاہ کیا:

''ڈاکٹر صاحب جب امریکہ سے ڈاکٹریٹ کر کے آئے تو گاؤں والے بہت خوش ہوئے اور اسے پورے گاؤں کے لیے ایک اعزاز سمجھا۔ اس کے بعد بہت سے لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کی دعوتیں کیں اور انھیں سات گاؤں کی پگڑی پہنائی گئی جو بڑا اعزاز تھا۔ یہ ساتوں گاؤں لغاریوں کے گاؤں تھے۔ پگڑی پہنانے سے اشارہ اس جانب تھا کہ اب ان تمام گاؤں کی قیادت کی ذمہ داری ڈاکٹر بلوچ صاحب کو سونپی گئی۔''

حواشی باب نمبر 5

۱۔ انٹرویوڈاکٹر نبی بخش بلوچ مورخہ ۲۲رجون۲۰۰۶ءبہ مقام سندھ یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) حیدرآباد۔

۲۔ ایضاً

۳۔ عطیہ بیگم فیضی کے علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد سے قریبی تعلقات رہے۔آپ نے Music of India کے نام سے ۱۹۲۵ء میں ایک کتاب بھی لکھی۔اس کے علاوہ علامہ اقبال کے آپ کے نام خطوط بھی شائع ہو چکے ہیں۔آپ کا انتقال ۴ جنوری ۱۹۶۷ء کو کراچی میں بہ عمر ۸۰ برس ہوا۔تدفین میوہ شاہ قبرستان میں ہوئی۔

۴۔ ملاحظہ فرمایئے''مولانا آزاد سبحانی۔تحریک آزادی کے ایک مقتدر رہنما''از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' ادارۂ تحقیقات پاکستان' دانش گاہِ پنجاب لاہور، ۱۹۸۹ء

۵۔ ایضاً

باب نمبر 6

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا قیامِ کراچی
(۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۱ء)

گزشتہ باب میں ذکر کیا گیا کہ بلوچ صاحب ڈاکٹریٹ کر کے ۱۹۴۹ء میں واپس پاکستان پہنچے۔ واپسی کے بعد پبلک سروس کمیشن میں ایجوکیشن آفیسر کے عہدے کے لیے درخواست دی لیکن اس دور میں وزیر تعلیم کا تعلق بنگال سے تھا جن کی خواہش تھی کہ اس عہدے پر کسی بنگالی کا تقرر ہو۔ اس کے نتیجے میں انھوں نے یہ Post ہی Abolish کرا دی۔(۱)

ڈاکٹر بلوچ صاحب کا طویل علمی و تحقیقی سفر سندھ

اس کے بعد بلوچ صاحب نے فیصلہ کیا کہ سندھ کے چپے چپے کا سفر کیا جائے اور گاؤں گاؤں قریہ قریہ گھوم کر عام لوگوں سے ملا جائے اور سندھ کے لوک ادب (Folklore) پر مواد جمع کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے انتہائی مختصر سامان لیا اور تیرہ ماہ تک مسلسل سفر کر کے سندھ کے چپے چپے پر گئے اور یہ مواد جمع کیا۔ اس سفر کی خاطر ہر طرح کی مشکلات برداشت کیں اور پیدل، گھوڑے پر، گدھے پر، گاڑی میں ہر طرح سے سفر جاری رکھا۔ یہ سفر اور یہ مشقت اس لحاظ سے بڑی مفید ثابت ہوئی کہ بعد میں آپ نے سندھی زبان میں جو عظیم الشان علمی و تحقیقی کام کیا اس کے لیے خاصا مواد اس سفر کے نتیجے میں جمع ہوا۔ اس تحقیقی کام کی تفصیل آگے آئے گی۔

1950ء میں سندھ کے اس طویل علمی سفر سے قبل بلوچ صاحب نے Ministry of information and Broadcasting میں ملازمت کی درخواست دے رکھی تھی۔ اس سفر کے دوران جب آپ جاتی (ضلع ٹھٹہ) میں تھے کہ تقرری کا ٹیلی گرام آیا۔ چنانچہ آپ فوراً کراچی پہنچے اور آپ نے اس وزارت میں بحیثیت افسر بکارخاص (Officer on Special Duty) خدمات انجام دینا شروع کیں۔(۲)

اس زمانے میں ایس ایم اکرام صاحب (۳) اس وزارت کے Joint Secretary اور جناب قدرت اللہ شہاب صاحب Deputy Secretary تھے۔ بلوچ صاحب نے بیرونی نشریات (External Publicity) کے شعبے میں قدرت اللہ شہاب صاحب کی ماتحتی میں خدمات انجام دیں۔ اس دور میں آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو کابل پاکستان کے خلاف بڑھ چڑھ کر پروپیگنڈا کر رہے تھے۔ بلوچ صاحب نے اس کا توڑ کیا اور پاکستان کا موقف اور درست صورتِ حال ریڈیو پاکستان کے ذریعے پیش کی۔"(۴)

ثقافتی پروگرام اور بیگم عطیہ فیضی کی معاونت

اس زمانے میں پاکستان کا دارالحکومت کراچی تھا چنانچہ تمام مرکزی دفاتر کراچی میں تھے۔ یہاں PEN نامی تنظیم کے سربراہ شاہد سہروردی صاحب (۵) تھے جو پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین بھی تھے۔ انھوں نے شہاب صاحب سے کہا کہ ایک ثقافتی پروگرام کرنا ہے لیکن اس کے انتظامات کون کرے گا؟ شہاب صاحب نے بلوچ صاحب کا نام پیش کیا چنانچہ صدر کراچی کے کٹرک ہال میں بلوچ صاحب نے ایک شاندار پروگرام منعقد کیا اور اس کے تمام انتظامات کی ذمہ داری احسن طریقے پر ادا کی۔

انھیں دنوں عطیہ بیگم فیضی بمبئی سے کراچی آچکی تھیں اور Three Arts Circles نامی تنظیم کے تحت موسیقی کی محافل منعقد کراتی تھیں (۶)۔ بلوچ صاحب کا ان سے تعارف ہوا تو وہ بلوچ صاحب کی معلومات اور خیالات سے بہت متاثر ہوئیں۔ انہوں نے بلوچ صاحب سے کہا کہ ان ثقافتی محافل کے لیے ان کی معاونت کریں چنانچہ بلوچ صاحب نے ان کے معاون کے طور پر کام کیا۔ بلوچ صاحب ان محافل کے لیے اندرونِ سندھ سے لوک فنکاروں کو کراچی لاتے جہاں وہ اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ اس تنظیم میں بلوچ صاحب نے عطیہ

بیگم فیضی کے سیکریٹری کے طور پر خدمات انجام دیں۔

کراچی میں قاضی احمد میاں اختر جُونا گڑھی سے ملاقاتیں

گزشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا کہ قیامِ جونا گڑھ کے دوران بلوچ صاحب کے تعلقات نامور ادیب اور محقق قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی سے قائم ہو چکے تھے۔ یہ تعلقات کراچی آمد کے بعد مزید استوار ہوئے۔ قیامِ کراچی کے دوران بلوچ صاحب کی قاضی صاحب سے ان کی رہائش گاہ واقع ٹھٹائی کمپاؤنڈ بالمقابل سول ہسپتال میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ان ملاقاتوں اور دیگر مصروفیات کے بارے میں بلوچ صاحب لکھتے ہیں:

''مئی ۱۹۵۰ء تا اگست ۱۹۵۱ء میں انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ ڈویژن میں بحیثیت او ایس ڈی کام کرتا رہا اور میرا قیام کراچی میں ہی رہا۔اس مدت میں جناب قاضی صاحب سے ان کے گھر پہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ان کا کتب خانہ بڑا تو نہیں تھا لیکن اس میں تحقیق و تجسس کے لیے کافی کام کی کتابیں موجود تھیں۔میں اس وقت دیبل کے محلِ وقوع پر کام کر رہا تھا اور مجھے ایلیٹ ڈاؤسن کی مرتب کردہ تاریخی جلدوں میں سے پہلی جلد کی ضرورت تھی۔قاضی صاحب سے ذکر کیا تو فرمایا میری کتابوں میں موجود ہے۔ پھر کتاب لے آئے اور میرے حوالے کر دی۔ان دنوں ملازمت کی ذمّے داریوں کے علاوہ میرے پسندیدہ مشغلے یہ تھے: کراچی میں ان نو وارد فضلا کو جو تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے، سندھ کی تاریخ اور تاریخی آثار سے روشناس کروانا (۲) حضرت شاہ عبداللطیف اور سندھی موسیقی کے تعارف کے سلسلے میں محفلیں منعقد کرنا (۳) مرحومہ عطیہ بیگم کی ادبی ثقافتی محفلوں کا کاروبار سنبھالنا اور (۴) ''پین'' (P.E.N) تنظیم (جس کے صدر جناب شاہد سہروردی تھے) کے زیرِ سایہ محفلوں کا انتظام سنبھالنا (جیسا کہ مرحوم شہاب صاحب چاہتے تھے)۔ ان سلسلوں کے خاص خاص موقعوں پر قاضی صاحب کو بلا ناغہ اطلاع دے کر ان کی رفاقت کی سعادت حاصل کرتا رہا۔قاضی صاحب کو موسیقی سے خاص شغف تھا اور موسیقی کی محفلوں

میں بہت محظوظ ہوتے تھے۔ عرب، اسلامی دور کی تاریخ کے سلسلے میں، میں نے دیبل کے محلِ وقوع پر مقالہ لکھا اور محکمہ آثار قدیمہ کے زیرِ انتظام ایک محفل میں اس کو پیش کیا۔ مرحوم ممتاز حسن (۷) اس وقت فیڈرل مالی سکریٹری نے اور جناب قاضی صاحب نے بہت پسند فرمایا۔ اس مقالے میں، میں نے دیبل کو بھنبھور کے کھنڈرات سے مشخص کیا تھا۔ قاضی صاحب نے تقاضا کیا کہ میں رہنمائی کروں تا کہ بھنبھور کے کھنڈرات دیکھے جائیں۔ اس مہم میں اور احباب بھی شریک ہوئے اور قاضی صاحب نے مولانا ہاشمی فرید آبادی کو جو اس وقت انجمن ترقی اردو میں کام کرتے تھے شمولیت کی دعوت دی۔ اس طرح بعد میں ہم ٹھٹہ دیکھنے گئے۔'' (۸)

دمشق کے پاکستانی سفارت خانے میں تقرر اور علّامہ آئی آئی قاضی کی پیشکش

قیامِ کراچی ہی کے دوران ۱۹۵۱ء میں بلوچ صاحب کو ان کی اعلیٰ تعلیم اور صلاحیت کی بنیاد پر پاکستان پبلک سروس کمیشن نے دمشق کے سفارت خانے میں ''پریس اتاشی'' کے طور پر منتخب کیا۔ وہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

''۱۹۵۱ء کے وسط میں پاکستان پبلک سروس کمیشن نے مجھے 'پریس اتاشی' کے عہدے کے لیے منتخب کیا اور اگست میں دمشق میں میری تقرری کا فیصلہ ہوا۔ اب میں نے جا کر قاضی صاحب کو بتایا خوش تو ہوئے لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ آپ کا باہر چلے جانا ہم پر گراں گزرے گا۔ ان کے یہ الفاظ میرے دل میں بس گئے۔ مجھے تیاری کا الاؤنس مل گیا اور دمش جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ قبلہ علّامہ آئی آئی قاضی، وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سے کراچی تشریف لائے اور پیغام بھیجا کہ میں ان سے ملوں۔ جا کر ملا تو پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہیں۔ میں نے بتایا کہ فیڈرل پبلک سروس کمیشن سے میرا انتخاب ہوا ہے اور دمشق جانے کی تیاری کر رہا ہوں کہ وہاں پر میری تقرری ہوئی ہے۔ سن کر انھوں

نے زوردار ترغیب دی کہ میں رک جاؤں اور سندھ یونیورسٹی میں ''پروفیسر آف ایجوکیشن'' کا عہدہ سنبھال لوں۔ قبلہ علّامہ قاضی صاحب سے کالج کے دنوں سے عقیدت تھی۔ میں نے عرض کیا کہ قبلہ میں خدمتِ تعلیم کو گورنمنٹ سروس پر ترجیح دیتا ہوں مگر سندھ یونیورسٹی تو ایک ممتحن یونیورسٹی ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہاں سے کبھی بھی مجھے رخصت کر دیا جائے۔ فرمایا کہ میں سندھ یونیورسٹی کو ایک مثالی تربیت گاہ بنانا چاہتا ہوں۔ اب یہ ''ریذیڈنشل ٹیچنگ یونیورسٹی'' ہوگی اور یہ بسم اللہ آپ ہی کی تقرری سے ہوگی۔ مزید یہ کہ آپ کی تقرری کے آرڈر میں لکھ دیا جائے گا کہ ریٹائرمنٹ تک آپ کو سکیورٹی آف ٹینیوئر دی گئی ہے۔''(۹)

بالآخر بلوچ صاحب نے اپنی زندگی کا یہ اہم فیصلہ یوں کیا کہ تعلیمی وتحقیقی زندگی کو سفارتی زندگی پر ترجیح دی اور فروغِ تعلیم کے جذبے کے تحت سفارت خانے کی ملازمت سے کہیں کم تنخواہ پر سندھ یونیورسٹی کی ملازمت اختیار کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس فیصلے کے بعد ان کے افسرانِ بالا نے یہ مشورہ دیا کہ وہ سفارت خانے میں بحیثیت ''پریس اتاشی'' کی ملازمت ہی اختیار کریں لیکن بلوچ صاحب جو فیصلہ کر چکے تھے مضبوطی سے اس پر جمے رہے۔ اس مضمون میں آگے وہ تعلیمی ادارے سے وابستگی اور اس کے بعد کے واقعات کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''یہ تو علّامہ قاضی کی شفقت تھی البتہ میرے لیے صبر آزما صورت حال سامنے تھی کہ دمشق جانے کو خیر باد کہوں۔ دو روز گزرے ہی تھے کہ قبلہ علّامہ صاحب نے یکم ستمبر ۱۹۵۱ء میں سندھ یونیورسٹی میں میری تقرری بطور پروفیسر آف ایجوکیشن کا آرڈر بھجوا دیا۔ جس میں ''ٹینیوئر'' کا بھی اندراج تھا۔ یہ ۳۰/ستمبر کا دن تھا۔ قبلہ علّامہ صاحب کی ترغیب کے مدِ نظر مجھے اتنی توفیق ہوئی کہ دوسرے دن یعنی ۳۱/اگست کو میں شہاب صاحب اور اکرام صاحب سے ملا اور ان کو اپنے استعفے کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ دونوں نے سمجھایا کہ میں اتنی اچھی ملازمت نہ چھوڑوں لیکن میں نے ان کو منوایا کہ میرا استعفیٰ قبول کرلیا جائے۔ دونوں کرم فرما پھر مجھے سیکرٹری مسٹر جی۔ احمد کے پاس لے گئے جنھوں نے مزید مراعات

کے حوالے سے مجھے ترغیب دی کہ میں ملازمت نہ چھوڑوں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور گزارش کی میں تعلیم کی خدمت کی خاطر یونیورسٹی کی ملازمت کو ترجیح دے رہا ہوں لہٰذا میرا استعفیٰ قبول کرلیا جائے۔اس پر جی۔احمد صاحب نے پوچھا کہ آپ کب جانا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا آج ہی۔اس پرانھوں نے فائل پر دستخط کردیے۔''

اسی دن میں قاضی صاحب (احمد میاں اختر جوناگڑھی) کے ہاں پہنچا اور کہا کہ ''قبلہ میں ایک خوشخبری لایا ہوں اور وہ یہ کہ میں دمشق نہیں جاؤں گا۔'' حیران رہ گئے کیونکہ دو چار روز پہلے ہی میں ان کو بتا چکا تھا کہ ملک سے باہر جانے والا ہوں۔جب انھوں نے یہ سنا کہ قبلہ علاّمہ صاحب کے ایما پر میں سندھ یونیورسٹی جارہا ہوں اور آج ہی استعفیٰ دے کر آیا ہوں تو خوش ہوکر فرمایا۔کہ ''ہاں بھائی جاؤ اور ہمیں بھی لے جاؤ۔'' میں نے دل میں سوچ لیا کہ ان شاءاللہ قاضی صاحب کو سندھ یونیورسٹی میں بلایا جائے گا۔''(۱۰)

اس کے بعد بلوچ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ سندھ یونیورسٹی پہنچ کر انھوں نے علاّمہ آئی آئی قاضی کے آگے قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کو بلانے کی تجویز پیش کی۔اس کے نتیجے میں علاّمہ قاضی نے قاضی احمد میاں اختر کو شعبۂ مسلم تاریخ کے صدر اور پروفیسر کے عہدے کی پیشکش کی جسے انھوں نے قبول کرلیا۔

حواشی باب نمبر 6

۱۔ انٹرویو ڈاکٹر نبی بخش بلوچ از محمد راشد شیخ مورخہ ۲۲ جون ۲۰۰۶ء بہ مقام سندھ یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) حیدرآباد۔

۲۔ ایضاً

۳۔ ایس ایم اکرام یا شیخ محمد اکرام سابق بیوروکریٹ، مؤرخ اور دانشور تھے۔ آپ کی معروف کتب آبِ کوثر، رودِ کوثر اور موجِ کوثر ہیں۔ آپ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۸ء کو رسول نگر ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ وفات ۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء کو لاہور میں ہوئی۔

۴۔ انٹرویو ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مورخہ ۲۲ جون ۲۰۰۶ء بہ مقام سندھ یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) حیدرآباد۔

۵۔ حسن شاہد سہروردی کا تعلق بنگال کے معروف سہروردی خاندان سے تھا۔ آپ ۲۴/اکتوبر ۱۸۹۱ء کو مدناپور (مغربی بنگال) میں پیدا ہوئے اور ۳/مارچ ۱۹۶۴ء کو کراچی میں انتقال کیا۔
آپ پبلک سروس کمیشن کے چیرمین اور ثقافتی تنظیم PEN کے سربراہ تھے۔ اس کے بعد آپ اسپین میں پاکستان کے سفیر بھی رہے۔ معروف سیاستدان حسین شہید سہروردی، حسن شاہد سہروردی کے چھوٹے بھائی تھے۔

۶۔ بلوچ صاحب نے ایک ملاقات کے دوران راقم سے فرمایا تھا کہ اس زمانے میں وہ سندھ کے لوک فنکاروں اور دیگر فن کاروں کی کراچی میں عطیہ فیضی کے ادارے کے تحت ہونے والے پروگراموں میں شرکت کا انتظام کرتے تھے۔ بلوچ صاحب نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ محترمہ عطیہ فیضی کے سیکریٹری کے طور پر اعزازی طور پر کام کرتے تھے۔ کراچی میں اس ادارے کے تحت کٹرک ہال صدر میں ثقافتی پروگرام منعقد ہوتے تھے۔

۷۔ ممتاز حسن پاکستان کے معروف ماہر اقتصادیات، سابق گورنر اسٹیٹ بینک آف پاکستان اور سابق وفاقی سیکریٹری خزانہ حکومت پاکستان تھے۔ ان عہدوں کے علاوہ وہ پاکستان کے کئی علمی و ادبی اداروں کے بانی اور سرپرست بھی تھے۔ ممتاز حسن مورخہ ۶/اگست ۱۹۰۷ء کو تلونڈی موسیٰ خان (گوجرانوالہ) میں پیدا ہوئے

اور آپ کی وفات مورخہ ۲۸/اکتوبر ۱۹۸۴ء کو کراچی میں ہوئی۔

۸۔ ملاحظہ فرمایئے بلوچ صاحب کا مضمون ''قاضی احمد میاں اختر مرحوم اور جونا گڑھ کی یاد میں'' در کتاب ''گلشنِ اردو'' مرتبہ محمد راشد شیخ، ص:۲۱۔

۹۔ ایضاً ص:۲۲۔

۱۰۔ ایضاً۔

باب نمبر 7

سندھ یونیورسٹی میں علمی و عملی خدمات

سندھ یونیورسٹی میں بلوچ صاحب کا عہد اس لحاظ سے بڑا اہم تھا کہ آپ نے حسب عادت یہاں بھی بہت سی مفید اصلاحات کیں اور تعلیمی معیار کو بہتر سے بہتر کرنے کی پوری کوشش کی۔ اوپر ذکر آیا کہ سندھ یونیورسٹی میں بلوچ صاحب علّامہ آئی آئی قاضی (۱) کی ترغیب اور مشورے کے بعد آئے تھے۔ بلوچ صاحب نے متعدد مواقع پر یہ تحریر کیا ہے اور تقاریر میں بھی بیان کیا ہے کہ علّامہ قاضی کے پیش نظر سندھ یونیورسٹی کا کیا خاکہ تھا۔ ایک انٹرویو کے دوران بلوچ صاحب نے بیان کیا کہ انگریزوں کے عہد میں طلبہ کالجوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور یونیورسٹیوں کا کام صرف امتحان لینا ہوتا تھا۔ جب علّامہ قاضی وائس چانسلر بنے تو انھوں نے کوشش کر کے سندھ یونیورسٹی کا معیار بمبئی یونیورسٹی سے بھی بلند کر دیا۔ یہ معیار قاضی صاحب کے بعد بھی کچھ عرصے تک باقی رہا۔ (۲)

انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی اور سندھ میوزیم کے قیام کی خاطر کوششیں

جس زمانے میں سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (۳) تھے اسی زمانے میں بلوچ صاحب نے انھیں سندھالاجی کی طرز کا ادارہ قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے بعد بلوچ صاحب نے مفصل اسکیم تیار کی اور رضی الدین صدیقی صاحب کے ساتھ راولپنڈی گئے اور وفاقی سیکریٹری تعلیم شریف صاحب

کے سامنے اسکیم رکھی اور ان کے سوالات کے جوابات بھی دیے۔شریف صاحب نے یہ اسکیم منظور کی اور پچاس ہزار روپے کی گرانٹ منظور کی۔اس طرح ''سندھی اکیڈمی'' کے نام سے ادارہ قائم ہوا۔

بلوچ صاحب بیان کرتے ہیں کہ ابتدا ہی سے ان کی رائے یہ تھی کہ ادارے کا نام ''انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی'' رکھا جائے۔اس کے بعد انتظامی ادارے کی جانب سے یہ تجویز منظور کی گئی۔سندھی کے لکچرر جناب الانہ کو اس ادارے کا آفس اسسٹنٹ مقرر کیا گیا جبکہ محمد حنیف صدیقی صاحب کو اعزازی ڈائریکٹر مقرر کیا گیا جن کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری بلوچ صاحب کو سونپی گئی۔جنوری ۱۹۷۶ء تک یہ ذمہ داری بلوچ صاحب نے سنبھالی۔ادارے کی موجودہ عالیشان عمارت بھی بلوچ صاحب کی ہی کوشش سے بنی اور ادارے کو اس میں منتقل کیا گیا۔

اسی زمانے میں بلوچ صاحب نے سندھ میوزیم کے قیام کے لیے بھی کوششیں کیں۔وہ بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۵۷ء سے وہ اس ادارے کے قیام کے لیے کوششیں کررہے تھے لیکن کام آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔اس کے بعد بلوچ صاحب نے بطور اعزازی ڈائریکٹر ون یونٹ صوبے کے چیف سیکریٹری بی اے قریشی سے ملاقات کی اور انھیں خالی شدہ عمارت کا ڈھانچا دکھایا جس کے بعد تین لاکھ روپے کی گرانٹ منظور ہوئی اور میوزیم قائم کیا گیا۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے سندھ یونیورسٹی میں ستمبر ۱۹۵۱ء تا ۲۵؍جنوری ۱۹۷۶ء کا عرصہ گزارا۔یہ زمانہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اسی دور میں بلوچ صاحب نہ صرف سندھ یونیورسٹی میں پورے پاکستان کی یونیورسٹیوں میں پہلے شعبہء تعلیم کا آغاز کیا،اسے مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا بلکہ سندھ یونیورسٹی کے شعبہء سندھی کا بھی آغاز کیا۔شعبہء سندھی کے آغاز سے متعلق ہمیں سندھی زبان میں لکھا ڈاکٹر بلوچ کا اہم خط جناب محمد ارشد بلوچ کی عنایت سے ملا ہے۔ یہ خط بنام چیر پرسن شعبہ سندھی سندھ یونیورسٹی ہے جو بلوچ صاحب نے مورخہ 11-3-2009 کو لکھا۔اس خط کے اہم نکات کا سلیس اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

''آپ کا خط مورخہ 9/4/2009 کے جواب میں لکھا جارہا ہے۔میرے ذاتی ریکارڈ کے مطابق حقیقت درج ذیل ہے۔مزید تصدیق آپ یونیورسٹی کے ریکارڈ سے

کرلیں:

ا۔میں نے اکیڈمک سال 53-1952 میں تجویز پیش کی تھی کہ اگر گورنمنٹ کی جانب سے گرانٹ نہ ملے تب ہم اسٹاف ممبران سے چند اعزازی طور پر پڑھائیں گے اور کورس پورا کرائیں گے لیکن شعبہ سندھی ضرور قائم کیا جائے۔عالی دماغ وائس چانسلر علامہ آئی آئی قاضی نے اس تجویز کو قبول کیا اور شعبہ سندھی قائم کیا گیا۔

۲۔ تدریس کی ذمہ داری میں نے سنبھالی پھر محترم علی نواز جتوئی اور محترم غلام علی الانا کو بطور لکچرار مقرر کیا گیا۔علامہ قاضی کی وائس چانسلری کے دور تک مسلسل سات سال میں نے اس شعبے کے صدر کے طور پر خدمات انجام دیں۔اس دوران ایم اے کے نصاب میں درج ذیل اہم اصلاحات کی گئیں (ا) ایم اے کے مضامین میں ایک مضمون برائے ریسرچ رکھا گیا تاکہ طلبہ کسی اہم موضوع پر مقالہ لکھ سکیں (۲) سندھی میں ڈاکٹریٹ (Ph.D) کا آغاز کیا گیا جس میں پہلے سال 15 اسکالرز نے داخلہ لیا۔

۳۔ 1959ء میں جب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب جب بطور وائس چانسلر آئے تو مرحوم محبوب علی چنّا کی سربراہی میں بعض لوگ ڈاکٹر صدیقی کو اس جانب راغب کرنے لگے کہ ڈاکٹر بلوچ شعبہ تعلیم کے صدر ہیں، ان سے شعبہ سندھی چھڑایا جائے۔یہ صاحبان اس کے مقصد کی خاطر 1959 /6/6ء کو خاص وفد کی شکل میں وائس چانسلر سے ملے۔میں نے بھی اسی روز وائس چانسلر کو استعفیٰ لکھ بھیجا کہ میں نے سات سال تک شعبے کی خدمت کی ہے۔اب بھلے اس عہدے پر کسی اور صاحب کو مقرر کیا جائے۔افسوس کہ مرحوم محبوب علی کو پھر بھی اس عہدے پر قبول نہ کیا گیا کیونکہ انہوں نے ایم اے فارسی میں کیا تھا نہ کہ سندھی میں۔"

یہی وہ عرصہ ہے جب بلوچ صاحب نے یونیورسٹی کے اندر اور باہر کئی ادارے قائم کیے۔ان اداروں کے آپ اعزازی اور مستعد ذمہ دار بھی رہے۔

بلوچ صاحب کو یہ بھی اعزاز حاصل رہا کہ وہ سندھ یونیورسٹی کے پہلے پروفیسر تھے۔ان کا تقرر علاّمہ قاضی نے کیا تھا۔اسی طرح بلوچ صاحب کو یہ بھی اعزاز حاصل رہا کہ یونیورسٹی کے پہلے ادارے کے بھی وہی بانی تھے، یہ ادارہ شعبہء تعلیم تھا۔یہی ادارہ ۱۹۵۱ء میں سب سے پہلے قائم کیا گیا اور یہ پورے پاکستان کی یونیورسٹیوں کا پہلا شعبہ تعلیم بھی تھا۔اس شعبے میں جو کورس پڑھائے جاتے تھے وہ تعلیم ڈپلوما اور بیچلر ان ٹیچنگ تھے جسے بعد میں بڑھا کر بیچلر ان ایجوکیشن کا درجہ دیا گیا۔اس کے بعد ماسٹر ان ایجوکیشن کے کورس بھی جاری کیے گئے اور ماسٹر کی ڈگری کے لیے نصاب سازی کی گئی۔اسی ادارے کو بعد میں ترقی دے کر انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کا درجہ دیا گیا۔ ۱۹۷۳ء میں بلوچ صاحب کو سندھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا اور اسی سال آپ کو نیشنل میرٹ پروفیسر کا اعزاز بھی عطا کیا گیا۔

تحقیقی مجلاّت اور اشاعتی سرگرمیوں کا آغاز

سندھ یونیورسٹی میں قیام کے اسی زمانے میں بلوچ صاحب نے دو تحقیقی مجلّوں کا اجرا کیا یعنی:

Journal of Education

یہ تحقیقی مجلہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۵ء تک جاری رہا جبکہ

Journal of Research:Arts and Social Sciences

کے بلوچ صاحب کی ادارت میں تیرہ شمارے شایع ہوئے اور یہ مجلہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۵ء تک جاری رہا۔اس کے علاوہ بلوچ صاحب نے اسی زمانے میں جو جو مفید کتب شایع کرائیں وہ درج ذیل ہیں:

-Instructional Series

-Historial Perspective on Education

-Educational foundation series : Persian works on Methods of Education of Teaching **Hasil al Nahj** of Jafar al Bubakani

-Report on Education by B.H.Ellis printed in 1856.

-Richard Burton's observations(1851) on the Moslem Education at Schools and Colleges under the Native Rules and our Government in Sind

اسی زمانے میں بلوچ صاحب نے سندھی زبان کے چار عظیم الشان منصوبوں کا خاکہ بنایا، ان کا آغاز کیا اور بعد میں کامیابی سے تکمیل بھی کی۔ یہ منصوبے ہیں:

۔لوک ادب

۔جامع سندھی لغات

۔سندھی اساسی (کلاسیکی) شعرا کے کلام کی جمع آوری اور کتابی شکل میں تحفظ

۔تاریخ سندھ کے ماخذ کی تدوین

ان علمی منصوبوں کی مزید تفصیلات ہم آگے بیان کریں گے۔

دسمبر 1973ء میں بلوچ صاحب کو سندھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس سال آپ کو National Merit Professor کا درجہ بھی عطا کیا گیا۔ آپ نے دسمبر 1973 تا جنوری 1976 سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ یہ بات اہم ہے کہ تعلیم و تدریس سے گہرے تعلق کی بنا پر وائس چانسلر بننے کے بعد بھی آپ حسبِ سابق لیکچر ضرور دیتے اور اس کے لیے مکمل تیاری کر کے آتے۔

نئے سندھ یونیورسٹی شہر کے لیے کوششیں

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے علمی کے ساتھ ساتھ بہت سی عملی خدمات بھی انجام دیں۔ وہ سندھ یونیورسٹی کے پہلے پروفیسر تھے۔ اس زمانے میں سندھ یونیورسٹی کی عمارت ایک اسکول میں تھی اور یہ جگہ یونیورسٹی کے شایانِ شان نہیں تھی۔ اسی وجہ سے ایک نئے تعلیمی شہر یا Sindh University Town کی تعمیر ضروری تھی۔ یہ شہر کس طرح بنا اور اس کے لیے کون کون سی جگہوں پر ابتدا میں غور کیا گیا اور ان تمام مراحل میں خود ڈاکٹر

بلوچ صاحب نے کیا کردار ادا کیا، اس کی تفصیل ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اپنے سندھی زبان میں لکھے دو مضامین (۴) میں بڑی عمدگی سے بیان کی تھی۔ یہاں ہم انھی مضامین کے خاص نکات کا سلیس اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں:

۱۹۳۷ء میں جب سندھ بمبئی سے جدا ہوکر ایک الگ صوبہ بنا تب ہی سے سندھ کے بعض دردمند رہنماؤں نے تعلیمی پس ماندگی کے مدنظر سندھ کی اپنی علیحدہ یونیورسٹی قائم کرنے کی کوششیں کیں۔ اس نئی یونیورسٹی کے قیام کی دس سال تک مخالفت کی گئی یہاں تک کہ ۱۹۴۷ میں پاکستان قائم ہوا۔ اسی سال کراچی میں سندھ یونیورسٹی قائم کی گئی اور پروفیسر اے بی اے حلیم کو وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد پروفیسر حلیم نے نئی قائم شدہ کراچی یونیورسٹی کا وائس چانسلر بننا قبول کیا اور اس صورت حال میں علّامہ آئی آئی قاضی سے درخواست کی گئی کہ وہ سندھ یونیورسٹی کی قیادت کی ذمہ داری سنبھالیں۔

علّامہ قاضی اس وقت اپنی اہلیہ محترمہ ایلسا قاضی کے ہمراہ لندن میں مقیم تھے۔ وہ لندن کی تمام آسائشوں کو خیر باد کہہ کر کراچی پہنچے اور مورخہ ۹/اپریل ۱۹۵۱ کو کراچی میں بطور وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی اپنے عہدے کا حلف اٹھایا تھا۔ اس کے بعد ان کی کوششوں سے سندھ یونیورسٹی کراچی سے حیدرآباد منتقل کی گئی اور اسے ودیالہ ہائی اسکول کی عمارت میں منتقل کیا گیا۔ علّامہ قاضی اسے ایک جدید اور ہر طرح کی تعلیمی سہولیات سے آراستہ یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے کیونکہ اس سے قبل یونیورسٹی کا کام صرف امتحانات لینا ہی تھا اور درس و تدریس کالجوں میں ہوتی تھی۔ علّامہ قاضی کی خواہش تھی کہ اس یونیورسٹی میں نہ صرف درس و تدریس ہو بلکہ رہائشی سہولیات بھی ہوں۔ انھوں نے تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر سب سے پہلے شعبۂ تعلیم قائم کیا اور ڈاکٹر بلوچ صاحب کو اس کا سربراہ بنایا اور یونیورسٹی کے پہلے پروفیسر کا عہدہ اسی سال ستمبر میں دیا گیا۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ علّامہ صاحب قابل آدمیوں کی بڑی قدر کرتے تھے اور خود انھیں علّامہ صاحب کا اعتماد حاصل تھا جس کی بنا پر انھوں نے یہاں شب و روز محنت کی۔ علّامہ صاحب کے ذہن میں ایک یونیورسٹی شہر کا منصوبہ تھا اور اس حوالے سے انھوں نے بلوچ صاحب سے بھی وقتاً فوقتاً مشورے کیے اور اس منصوبے کو کامیاب بنانے کی ترغیب دی۔ انھوں نے بلوچ صاحب کو مورخہ ۳۱/مئی ۱۹۵۳ کو کراچی بھیجا تا کہ آفتاب قاضی صاحب (وفاقی سیکریٹری خزانہ) سے ملیں اور انھیں اس منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کریں۔ بلوچ

صاحب کراچی میں آفتاب قاضی صاحب سے ملے اور اس کے بعد جناب ہاشم رضا (جو اس وقت سندھ کے الیکشن کمشنر تھے) (۵) سے بھی ملے اور انھیں منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ ہاشم رضا صاحب علّامہ قاضی صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان سے احترام آمیز تعلقات رکھتے تھے۔

مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۵۴ کو علّامہ قاضی اور بلوچ صاحب کراچی پہنچے تاکہ پاکستان پلاننگ بورڈ کی میٹنگ میں شرکت کر سکیں۔ اس بورڈ کی میٹنگوں میں یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرز بھی شرکت کرتے تھے اور اپنی اپنی یونیورسٹی کے منصوبوں کی تفصیلات بیان کرتے تھے تاکہ ان منصوبوں کی خاطر فنڈز کی منظوری حاصل کی جائے۔ اسی شام علّامہ قاضی صاحب اور بلوچ صاحب کی ملاقات ممتاز حسن صاحب سے ہوئی جو ان حضرات کو جناب زاہد حسین سے ملانے لے گئے۔ زاہد حسین اس وقت پاکستان پلاننگ بورڈ کے چیرمین تھے۔ زاہد حسین صاحب نے انھیں یقین دلایا کہ بورڈ کی آئندہ میٹنگ میں اس منصوبے کو بھی شامل کیا جائے گا اور اہم فیصلے کیے جائیں گے۔ جون والی میٹنگ میں علّامہ صاحب نے بھی شرکت کی اور اس منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ انھوں نے دوران خطاب یہ بھی فرمایا کہ یہ بہت ضروری ہے کہ یونیورسٹیوں کو سیاسی اثرات سے آزاد رہ کر کام کرنے دیا جائے کیونکہ یہ بات نہ صرف معیاری تعلیم کے لیے ضروری ہے بلکہ پاکستان کے لیے بھی مفید ہے۔

اس سے اگلا مرحلہ یہ تھا کہ یونیورسٹی شہر کے لیے کون سا مقام مناسب ہوگا۔ اس مقصد کے لیے متعدد تجاویز پر غور کیا گیا۔ ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۴ء اس شہر کے لیے دو مقامات تجویز کیے گئے: پہلا مقام گورنمنٹ کالج کالی موری کے آگے اور دوسرا ہالہ ناکہ سے آگے۔ اس زمانے میں کوٹری بیراج زیر تعمیر تھا اس لیے ان زمینوں تک پانی کی فراہمی کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ ان دو مقامات میں سے کسی ایک پر نیا یونیورسٹی شہر بسانے کی راہ میں سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ یہ زرعی زمینیں تھیں اور انھیں خریدنا ضروری تھا۔ جب تخمینہ لگایا گیا تو پتہ چلا کہ اس نئے شہر کو بسانے کے لیے کم از کم دو کروڑ روپے درکار ہوں گے۔ جب حکومت سندھ کو اس بارے میں لکھا گیا تو جواب آیا کہ یہ رقم فراہم کرنا ممکن نہیں بلکہ کسی بھی طرح کی رقم کی امید نہ رکھی جائے۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں وہ اکثر اتوار کے دن شکار کی غرض سے گنجو ٹکر اور کوٹری بیراج سے آگے کے علاقے میں جایا کرتے تھے۔ ایک روز ان کے ذہن میں خیال آیا کہ کوٹری بیراج سے

آگے کی زمین سرکاری اور غیر آباد ہے اور اگر نیا تعلیمی شہر یہاں بنایا جائے تو زمین خریدے بغیر یہ کام ممکن ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے اس تجویز سے علّامہ قاضی صاحب کو مطلع کیا جو اس منصوبے کی وجہ سے ان دنوں خاصے فکر مند تھے۔ علّامہ صاحب نے بلوچ صاحب سے اس بارے میں تفصیلات معلوم کیں اور خود جاکر یہ زمین دیکھی۔ اسی وقت انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ نیا تعلیمی شہر یہیں بنایا جائے گا۔ بعد ازاں اس تجویز کی منظوری حکومت سندھ کی جانب سے بھی آ گئی۔ اس کے بعد لیاقت میڈیکل کالج کی تعمیر کے لیے بھی یہی فیصلہ کیا گیا کہ وہ بھی اس کے شمالی جانب تعمیر کیا جائے۔

زمین کا فیصلہ ہو جانے کے بعد علّامہ صاحب لندن گئے۔ لندن جانے کا اصل مقصد سائنس کی لیبارٹریوں کے لیے سامان و دیگر اشیا کی خریداری تھا۔ لندن سے علّامہ صاحب جرمنی گئے اور اسٹڈ گارڈ یونیورسٹی میں تعمیری منصوبوں کے ماہر ڈاکٹر ڈاکر Dr. Richard Docker سے ملاقات کی اور ان سے فزکس اور کیمسٹری کے شعبوں کی عمارات کے حوالے سے گفتگو کی۔ علامہ نے ڈاکٹر ڈاکر سے معاہدہ بھی کیا کہ وہ خود آ کر زمین دیکھیں گے اور مفید مشورے دیں گے اور نئے شہر کی منصوبہ بندی کریں گے۔ مورخہ ۲۰ رجنوری ۱۹۵۶ کو علّامہ صاحب بحری جہاز سے کراچی پہنچے۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب اس سے قبل کراچی میں جناب ممتاز حسن اور جناب ایم ایم شریف سے ملے جو اس زمانے میں تعلیمی مشیر تھے اور ان سے مجوزہ منصوبے کی خاطر چھ کروڑ کی رقم پر گفتگو کی۔ اسی سال اپریل میں ڈاکٹر ڈاکر بھی جرمنی سے پاکستان پہنچے اور بلوچ صاحب انھیں مجوزہ زمین پر لے گئے اور تفصیلات سے آگاہ کیا۔ بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر ڈاکر کو یہ کھلا ماحول پسند آیا لیکن انھوں نے کہا کہ مجوزہ تعلیمی شہر میں کثرت سے شجر کاری کرنا ضروری ہوگا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ڈاکر جرمنی واپس چلے گئے اور وہاں سے اس تعلیمی شہر کا نقشہ تیار کر کے بھیجا۔ ۱۹۵۶۔۵۷ میں حکومت کی جانب سے اس تعلیمی شہر کی عمارتوں کی تعمیر کی خاطر تیس لاکھ کی رقم منظور کی گئی اور اس کے بعد منصوبے پر کام کا آغاز ہوا۔

اس منصوبے کے آغاز کے بعد یعنی ۷ راکتوبر ۱۹۵۸ کو اسکندر مرزا نے پاکستان میں مارشل لا لگا دیا۔ اس واقعے سے علّامہ قاضی صاحب کو ذاتی صدمہ پہنچا کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ اقدام پاکستان کے مستقبل کے لیے مضر ثابت ہوگا۔ علّامہ صاحب نے چانسلر گورنر سندھ کو ٹیلی گرام بھیجنے کا ارادہ کیا کہ اب انھیں یونیورسٹی کی

خدمات سے سبک دوش کر دیا جائے۔ جب بلوچ صاحب کو یہ اطلاع ملی تو وہ علّامہ صاحب سے ملے اور ان سے یہ گزارش کی کہ حکومتوں کی تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور اس وقت نئے یونیوسٹی شہر کی تعمیر بھی جاری ہے اس لیے علّامہ صاحب اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی فرمائیں اور استعفیٰ نہ دیں۔ بلوچ صاحب نے یہ بھی گزارش کی کہ علّامہ صاحب اس بارے میں ممتاز حسن صاحب اور عترت حسین زبیری صاحب (٦) سے بھی مشورہ کرلیں جو علّامہ صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے۔ علّامہ صاحب اس بات پر راضی ہو گئے اور بلوچ صاحب کو کراچی بھیجا جنھوں نے ان دونوں صاحبان سے ملاقات کی اور علّامہ صاحب کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ دونوں صاحبان نے مطلع کیا کہ علّامہ صاحب استعفیٰ ہرگز نہ دیں اور اپنے منصوبے کے مطابق نئے تعلیمی شہر کے کام کو آگے بڑھائیں۔ اس کے بعد علّامہ صاحب نے انجینیر عباسی صاحب کو یونیورسٹی کے زیر تعمیر کاموں کی نگرانی کی خاطر یونیورسٹی انجینیر مقرر کیا اور انھیں یہ بھی ہدایت دی کہ وقتاً فوقتاً انھیں تمام تعمیری تفصیلات سے مطلع کرتے رہیں۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ بعض لوگ علّامہ صاحب کی عظمت اور ان کے خدمت کے جذبے کو پہچان نہ سکے اور انھوں نے چانسلر (گورنر) کو علّامہ صاحب کے خلاف درخواستیں بھیجیں۔ علّامہ صاحب نے مورخہ ۱۱رفروری ۱۹۵۹ کو اپنے دفتر میں تمام پروفیسر حضرات کو بلایا اور ان درخواستوں کا ذکر کیا۔ اسی سال فروری اور مارچ کے مہینوں میں وہ وقفے وقفے سے علیل رہے اور یونیورسٹی کے ایکٹنگ وائس چانسلر کی ذمہ داری اے ایل شیخ صاحب نے انجام دی۔ اپریل میں انجینی عباسی صاحب کو نئے تعلیمی شہر کے بارے میں کچھ ہدایات دیں اور مورخہ ۱۲رمئی ۱۹۵۹ کو چانسلر کو اپنا استعفیٰ پیش کرکے یونیورسٹی کو خیرباد کہا۔

آخر میں بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ علّامہ قاضی صاحب کو جتنا علم میں کمال حاصل تھا اتنے ہی وہ پختہ ارادے کے مالک تھے اور ان کا عمل بے مثال تھا۔ انھوں نے خود کو شمع کی طرح جلا کر ہمارے ماحول کو روشن کیا۔ اب جبکہ قاضی صاحب سندھ یونیورسٹی کی زمین کے نیچے محوِ آرام ہیں، ہمیں سوچنا چاہیے کہ ان کے بعد اس درس گاہ کو ہم نے کس قدر سنوارا اور آراستہ کیا ہے؟
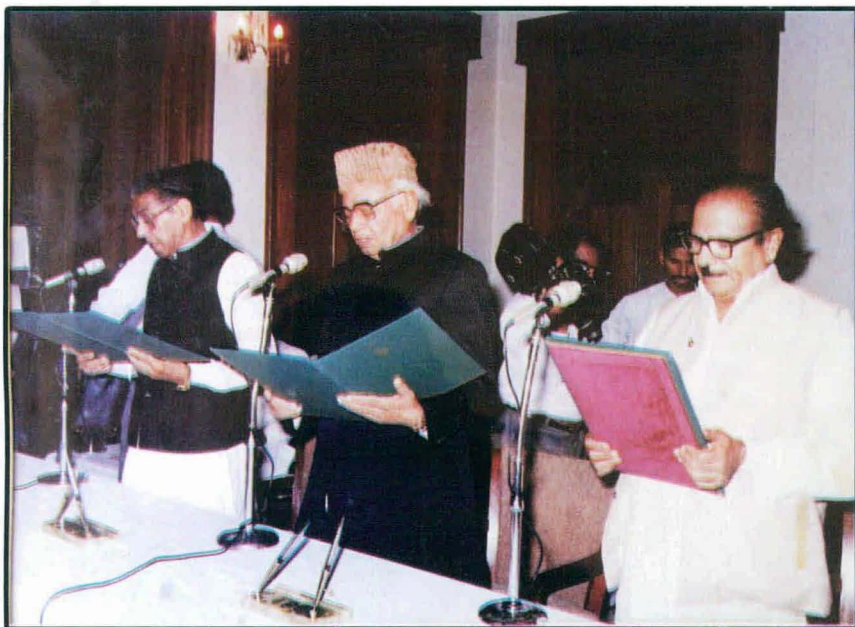
ڈاکٹر نبی بخش بلوچ بحیثیت وزیر تعلیم صوبہ سندھ حلف اٹھاتے ہوئے

سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس حیدرآباد کا وہ تاریخی کمرہ جس میں بیٹھ کر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے جامع سندھی لغات، لوک ادب اور شاہ جو رسالو جیسے منصوبوں کو مکمل کیا

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی تعمیر کردہ جامع مسجد گوٹھ جعفر خان لغاری (ضلع سانگھڑ)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا تعمیر کردہ گورنمنٹ بوائز ہائی اسکول گوٹھ جعفر خان لغاری (ضلع سانگھڑ)

بائیں سے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی و دیگر افراد — دورۂ ایران کے موقع پر

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اسٹیج پر بیٹھے ہیں جبکہ ڈاکٹر اینی میری شمل تقریر کرتے ہوئے

بائیں سے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، حکیم محمد سعید اور بریگیڈیر گلزار احمد

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سابق ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن سے گفتگو کرتے ہوئے

ایک علمی تقریب کے موقع پر بائیں سے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر احمد حسن دانی
، سیّد غلام مصطفیٰ شاہ، ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی اور دو اور افراد

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ بحیثیت ڈائرکٹر انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن سندھ یونیورسٹی

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ بحیثیت وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی پریڈ کی سلامی لیتے ہوئے — 1973 کی ایک یادگار تصویر

بہاء الدین کالج جونا گڑھ کے پرنسپل، اساتذہ اور طلبہ، ۱۹۴۰ء کی یادگار تصویر۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب درمیانی صف میں دائیں سے چوتھے نمبر پر کھڑے ہیں

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔1936ء کی ایک یادگار تصویر جب وہ نوشہرو فیروز مدرسہ کی جانب
سے میٹرک کا امتحان دینے حیدرآباد آئے تھے
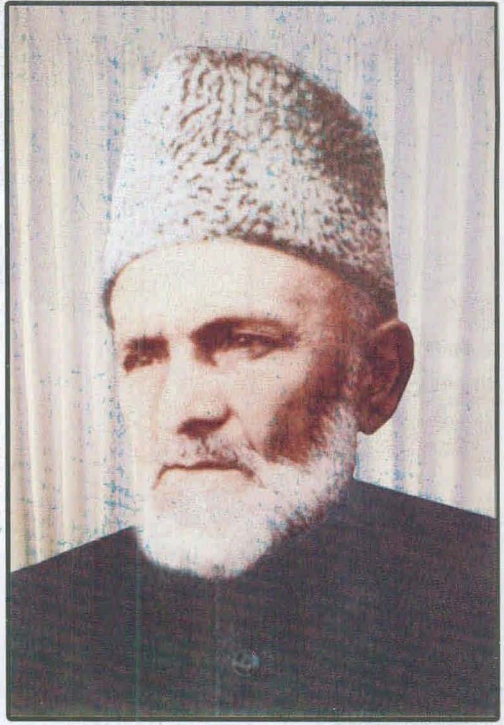
ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے استاد علامہ عبدالعزیز میمن جن سے نھوں نے تحقیق کے گُر سیکھے
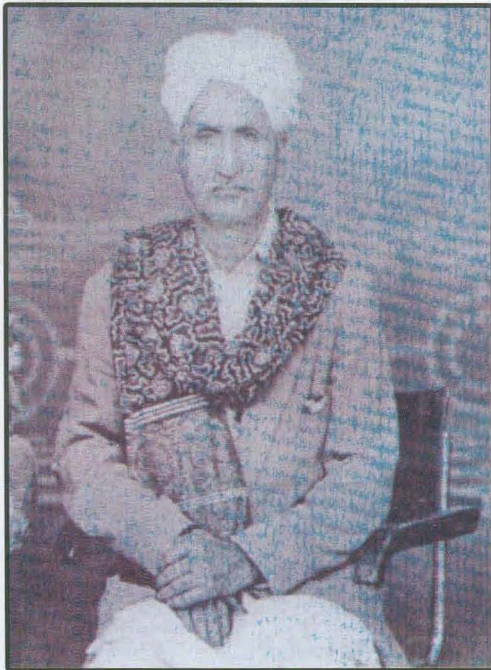
ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے چچا جناب ولی محمد لغاری جنھوں نے ان کی ابتدائی تعلیم کے لیے بھرپور کوششیں کیں

حواشی باب نمبر 7

۱۔ علّامہ آئی آئی قاضی ۹ اپریل ۱۸۸٦ء کو حیدرآباد (سندھ) میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ۱۹۱۱ء میں لندن سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے بطور مجسٹریٹ اور سیشن جج ملازمت کی۔ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۹ء سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ وفات ۱۴ اپریل ۱۹٦۸ء کو حیدرآباد میں ہوئی۔

۲۔ ملاحظہ فرمایئے ''ڈاڪٽر بلوچ هڪ مطالعو'' (ڈاکٹر بلوچ۔ ایک مطالعہ) از ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو ص:۲۸۔

۳۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ماہر سائنس دان اور ریاضی دان تھے۔ آپ کو یہ بھی اعزاز حاصل ہوا کہ پاکستان کی تین یونیورسٹیوں یعنی پشاور یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی اور قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے وائس چانسلر رہے۔ پیدائش: ۲/جنوری ۱۹۰۸ء حیدرآباد دکن۔ وفات ۲/جنوری ۱۹۹۸ء اسلام آباد۔

۴۔ یہ مقالات ہیں:

علامه آءِ. آءِ. قاضي اور

نئين سنڌ يونيورسٽي ڪئمپس - شهر جوبنياد پوڻ

۵۔ سیّد ہاشم رضا معروف بیوروکریٹ، کراچی کے پہلے ایڈمنسٹریٹر اور کئی اہم عہدوں کے علاوہ قائم مقام گورنر مشرقی پاکستان بھی رہے۔ آپ کی ولادت مورخہ ۱٦/فروری ۱۹۱۰ء کو وفات ۳۰/ستمبر ۲۰۰۳ء کو کراچی میں ہوئی۔

٦۔ عترت حسین زبیری انگریزی زبان و ادب کے استاد، اوّلین وائس چانسلر راجشاہی یونیورسٹی اور مشیر تعلیم حکومت پاکستان رہے۔ اس کے علاوہ آپ اردو ڈکشنری بورڈ کے بانی اور اسپین میں پاکستان کے سفیر بھی رہے۔

ولادت: ۱۹۱۲ء بمقام آگرہ، وفات: ۱۴/دسمبر ۱۹٦۴ء بمقام اونٹاریو (کینیڈا)۔ تدفین احاطہ مزار عبداللہ شاہ غازی کلفٹن میں ہوئی۔

باب نمبر 8

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا قیام اسلام آباد
(۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۹ء)

سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے سے اسلام آباد منتقلی اور وہاں بعض اہم ذمہ داریوں کے حوالے سے ڈاکٹر بلوچ نے اپنے مضمون ''وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی یاد میں'' (مشمولہ ماہنامہ پیغام کراچی ،بابت مارچ اپریل 2011ء) میں درج ذیل تفصیلات بیان کی تھیں:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سال ۱۹۷۵ء کے دوران وزیر اعظم بھٹو صاحب نے مجھے حیدر آباد سے اسلام آباد لانے کا سوچا تھا۔ ۲۶/جنوری ۱۹۷۶ء کو میں اسلام آباد پہنچا اور وزیر تعلیم عبدالحفیظ پیرزادہ سے ملا جنھوں نے میرے اسلام آباد آنے کی اطلاع وزیر اعظم صاحب کو دی۔ میرے نئے عہدے کا تعین کرتے وقت پیرزادہ صاحب نے اپنے ایک نوٹ میں مجھے اسپیشل سیکریٹری کر کے لکھا۔ بہر حال چند روز کے بعد میں نے جناب قدرت اللہ شہاب صاحب سے ایجوکیشن سیکریٹری کے (O.S.D.) کے عہدے کا چارج لیا۔ وزیر اعظم بھٹو صاحب کی طرف سے رعایات مراعات کا سلسلہ شروع ہوا۔

۱۹۷۵ء میں قائد اعظم کی ولادت کے آنے کا جشن کا انتظام میرے ذمہ کیا گیا جو میں نے کامیابی سے سرانجام دیا جس سے وزیر اعظم بھٹو بہت خوش ہوئے۔ ۸/اپریل

۱۹۷۵ء کو علامہ اقبال کا جشن ولادت منانے کے سلسلے میں وزیر اعظم بھٹو کے زیر صدارت لاہور میں میٹنگ ہوئی تھی ۔ قائد اعظم کے جشن ولادت کو کامیابی سے منانے کے بعد ۱۹۷۷ء میں جشن اقبال منانے کا انتظام بھی میرے ذمے کیا گیا۔ چودھویں صدی ہجری کے اختتام کے طور پر حکومت برطانیہ کی طرف سے ''جشن اسلامی (Islamic Festival)'' منایا گیا۔ جشن میں پاکستانی وفد میں مجھے بھی ممبر کے طور پر نامزد کیا گیا ۔ ہمارے سربراہ مذہبی امور کے وزیر مولانا کوثر نیازی صاحب تھے۔ جب پے کمیشن (Pay Commission) بنایا گیا تو مجھے بھی کمیشن کا ممبر نامزد کیا گیا۔ کمیشن کے چیرمین جسٹس انوارالحق تھے، پنجاب گورنمنٹ کے ریٹائرڈ چیف سیکریٹری بھی ممبر تھے جنھوں نے میرے کام کو پسند کیا۔ کمیشن کی رپورٹ کے لیے Brain Drain کے باب کو میں نے ڈرافٹ کیا اور یہ کام خیر اسلوبی سے ختم ہوا۔''

وزارتِ تعلیم میں افسر بکارِ خاص (Officer on Special Duty)

جنوری 1976ء میں بلوچ صاحب کو وفاقی وزارتِ تعلیم میں افسر بکارِ خاص (OSD) مقرر کیا گیا اور وفاقی سیکریٹری کا Rank دیا گیا۔ ایک ملاقات کے دوران بلوچ صاحب نے یہ دلچسپ بات بتائی کہ جب وہ اسلام آباد پہنچے تو انھوں نے قدرت اللہ شہاب صاحب (ا) سے چارج لیا جن کی ماتحتی میں وہ 1950ء تا 1951ء کراچی میں کام کر چکے تھے۔ شہاب صاحب سے آپ کا اسلام آباد میں قیام کے دوران قریبی تعلق رہا۔ اسی زمانے میں اس ادارے کے علاوہ بلوچ صاحب Federal Pay Commission کے بھی رکن رہے۔

قومی کمیشن برائے تحقیق تاریخ وثقافت میں خدمات

بلوچ صاحب نے جولائی 1979ء تا 1982ء قومی کمیشن برائے تحقیق، تاریخ وثقافت کے ڈائریکٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ حسب عادت آپ نے ادارے میں پہنچتے ہی علمی و تحقیقی منصوبوں پر کام کا آغاز کر دیا۔

سب سے پہلے آپ نے اعلیٰ معیار کے ایک تحقیقی مجلّے کا انگریزی زبان میں اجرا کیا۔ یہ مجلہ Pakistan Journal of History and Culture کے نام سے شروع ہوا جس میں بلوچ صاحب نے بھی تحقیقی مقالات لکھے اور دیگر محققین سے بھی لکھوائے۔ اس کے علاوہ محققین اور اہلِ قلم کے لیے تحقیقی منصوبوں کا آغاز کیا اور انھیں کام پر راغب کیا۔ یہ ادارہ 1973ء میں قائم ہوا تھا اور بلوچ صاحب کی سربراہی کے آغاز یعنی 1979 تک چھوٹی بڑی دس بارہ کتابیں ہی شائع کر سکا تھا۔ بلوچ صاحب نے محض چار سال کے عرصے میں 34 نئی کتابیں لکھوائیں جن میں سے 25 کتب شائع کرائیں۔ ان کتب میں سے چار یا پانچ سندھ سے متعلق ہیں جن میں مولانا عبداللہ لغاری کی روایت کردہ ''مولانا عبیداللہ سندھی کی کابل کی ڈائری'' جسے ڈاکٹر غلام مصطفی خان نے مرتب کیا، شامل ہے۔ اس کے علاوہ دو جلدوں پر مشتمل ''سندھ سے بمبئی کی جدائی کی تاریخی دستاویزات'' بھی شائع کیں۔

اس ادارے میں قیام کے دوران بلوچ صاحب نے بڑے پیانے پر تاریخی کانفرنس کا انعقاد بھی کیا۔ دیگر تحقیقی منصوبے جن پر کام کا آغاز کیا، وہ یہ ہیں:

۱۔ پورے پاکستان کے تعمیراتی آثار کا مطالعہ

۲۔ ٹھٹہ اور مکلی کی تعمیرات کا مطالعہ

۳۔ اُچ شریف کی تعمیرات کا مطالعہ

۴۔ ملتان کی تعمیرات کا مطالعہ

۵۔ لاہور کی تعمیرات کا مطالعہ

۶۔ زیریں سندھ میں لکڑی کی تعمیرات کا مطالعہ

ان تمام منصوبوں میں سے لاہور کی تعمیرات کے علاوہ بقیہ تمام منصوبوں پر کتب شائع کرائیں جبکہ ادارہ چھوڑتے وقت لاہور کی تعمیرات کا مطالعہ مکمل کرا چکے تھے۔ بلوچ صاحب نے ٹھٹہ اور مکلی کی تعمیرات کے مطالعے کے لیے معروف ماہرِ آثارِ قدیمہ ڈاکٹر احمد حسن دانی صاحب (۲) کو آمادہ کیا اور ان کے ساتھ ٹھٹہ اور مکلی کا سفر بھی کیا۔ اس کتاب کی خاطر بلوچ صاحب نے ٹھٹہ شہر کی بنیاد اور ابتدائی تاریخ پر تحقیقی مقالہ بعنوان The Origin

of Thatta بھی لکھا جسے کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کرایا۔

اس ادارے میں قیام کے دوران بلوچ صاحب نے ایک اور عظیم الشان تاریخی منصوبے کا آغاز کیا تھا اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ اب تک برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے حوالے سے Elliot and Dowson کی تاریخ کو بنیادی ماخذ کی حیثیت دی جاتی ہے۔ بلوچ صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس تاریخ میں بدنیتی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانان برصغیر کی تاریخ کے بہت سے مآخذات مثلاً صوفیائے کرام کی کتب، ان کے مکتوبات اور ان کے ملفوظات سے استفادہ نہیں کیا گیا(۳)۔ بلوچ صاحب نے بڑی محنت سے مسلمانان برصغیر کی مستند تاریخ کا منصوبہ 25 جلدوں میں تیار کیا۔ اس منصوبے کا اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانانِ پاک و ہند کی مستند اور متعصّبانہ آرا سے پاک اور صحیح تاریخ دنیا کے سامنے آئے(۴)۔

اس منصوبے کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:

جلد ا: سندھ میں مسلمانوں کی آمد

پہلا حصہ: فتحنامۂ سندھ کا فارسی متن

دوسرا حصہ: فتحنامۂ سندھ کا انگریزی ترجمہ

تیسرا حصہ: فتحنامۂ سندھ کا عربی ترجمہ

جلد ۲: سندھ میں عرب دورِ حکومت (۷۱۲ھ تا ۱۰۵۰ھ)

جلد ۳: غزنوی دور

جلد ۴: غوری سلاطین ! اور دہلی کے سلاطین خاندانِ غلاماں

جلد ۵: خلجی دور

جلد ۶: تغلق دور

جلد ۷: افغان بادشاہ

پہلا حصہ: لودھی دور

دوسرا حصہ: سوری دور

جلد ۸: مغل بادشاہ: بابر اور ہمایوں

جلد ۹: مغل بادشاہ: اکبر

جلد ۱۰: مغل بادشاہ: جہانگیر اور شاہ جہاں

جلد ۱۱: مغل بادشاہ: اورنگزیب

جلد ۱۲: مغل بادشاہ دورِ زوال

جلد ۱۳: مقامی حکومتیں: سلاطینِ بنگال، سلاطینِ جونپور، سلاطینِ اودھ

جلد ۱۴: مقامی حکومتیں: سلاطینِ دکن و میسور

جلد ۱۵: مقامی حکومتیں: سلاطینِ گجرات و مالوہ

جلد ۱۶: مقامی حکومتیں: سندھ

جلد ۱۷: مقامی حکومتیں: پنجاب و سرحد

پہلا حصہ: پنجاب مغلوں کے بعد

دوسرا حصہ: صوبہ سرحد مغلوں کے بعد

جلد ۱۸: مقامی حکومتیں: بلوچستان

جلد ۱۹: مقامی حکومتیں: کشمیر و شمالی علاقہ جات

پہلا حصہ: کشمیر

دوسرا حصہ: شمال مغربی اور شمالی علاقہ جات

جلد ۲۰: برطانوی دورِ حکومت اور جدوجہد آزادی

جلد ۲۱: اسلامی ورثہ: مختلف حکومتی ادارے اور انتظامیہ

جلد ۲۲: اسلامی ورثہ: تعلیم، معاشرتی علوم، طبیعی علوم، ریاضیات اور دریانوردی

جلد ۲۳: اسلامی ورثہ: مواصلات، شہری ترقی، زراعت، صنعت و حرفت، تجارت

جلد ۲۴: اسلامی ورثہ: فنِ تعمیر و دیگر فنون

جلد ۲۵: اسلامی ورثہ: السنہ وادبیات

اس عظیم علمی منصوبے کی پہلی جلد یعنی فتح نامۂ سندھ عرف چچ نامہ پر بلوچ صاحب نے خود شب وروز محنت کر کے اس کا مستند فارسی متن مع انگریزی ترجمہ شائع کیا اور اس پر انگریزی میں مفید حواشی بھی لکھے۔ اس کتاب کا عربی میں ترجمہ بھی دمشق میں کرایا اور وہیں سے شائع کرایا اور کتاب 1983ء میں شائع کرائی۔ تاریخ مسلمانان پاک وہند کے اس منصوبے پر ابھی کام جاری ہی تھا کہ 1983ء میں بلوچ صاحب کو اس ادارے سے جدا کر دیا گیا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ بلوچ صاحب کے ادارہ چھوڑنے کے بعد اس منصوبے کو بھی سرد خانے کی زینت بنا دیا گیا اور یہ اہم اور قومی اہمیت کا حامل منصوبہ نامکمل رہا۔(۵)

اوّلین وائس چانسلر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

نومبر 1980ء میں بلوچ صاحب کو اسلام آباد میں قائم کی گئی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا پہلا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ یہ عہدہ آپ نے جناب اے کے بروہی صاحب کی ترغیب پر قبول کیا جو اس نوتعمیر یونیورسٹی کے پہلے ریکٹر مقرر کیے گئے تھے۔ ابتدا میں اس یونیورسٹی کی شریعت فیکلٹی میں کل تین طالب علم تھے۔ بلوچ صاحب نے اپنی عادت کے مطابق روزِ اوّل سے ہی یونیورسٹی کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ 3رجنوری 1981ء کو شاہ فیصل مسجد کمپلکس کے ایک کمرے میں 81-1980ء کے تعلیمی سال کا آغاز اے کے بروہی صاحب سے کرایا۔ اس کے بعد بلوچ صاحب نے شب وروز محنت کر کے اکتوبر 1981ء تک تمام ذیلی ادارے قائم کر دیے جن میں بورڈ آف اسٹڈیز، سلیکشن بورڈ، اکیڈمک کونسل، فنانس کمیٹی وغیرہ شامل تھے۔

اس کے علاوہ تعلیمی شعبے اور دیگر شعبوں کا آغاز کیا اور ان کے لیے اساتذہ کا انتخاب کیا۔ طلبہ کے لیے ہاسٹل کا انتظام کیا، یونیورسٹی کے عملے کے لیے رہائش کا بھی انتظام کیا۔(۶)

82-1981ء کے تعلیمی سال کا افتتاح بلوچ صاحب نے کیا اور شعبۂ قانون کے لیے علیحدہ انسٹیٹیوٹ قائم کیا۔ اس ادارے میں ججوں اور اعلیٰ پولیس عہدے داروں کی تربیت کا آغاز بھی کیا۔(۷)

یہاں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اس دور میں بلوچ صاحب بیک وقت دو دو اداروں کے سربراہ کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے۔ قومی کمیشن برائے تاریخ وثقافت کی سربراہی جولائی 1979ء سے آپ کر رہے تھے۔ اسلامی یونیورسٹی میں آپ کا تقرر بطور جز وقتی وائس چانسلر کیا گیا تھا۔ اس یونیورسٹی کا آرڈی نینس نومبر 1980ء میں حکومت نے جاری کیا تھا۔ یونیورسٹی کے قیام سے قبل شریعت فیکلٹی اور قانون فیکلٹی کا آغاز قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں ہو چکا تھا جس کے ۹ طلبہ بھی نوتعمیر اسلامی یونیورسٹی میں شامل ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب (سابق وفاقی وزیر وزارتِ مذہبی امور حکومت پاکستان) نے بلوچ صاحب کی ماتحتی میں اسلامی یونیورسٹی کا ابتدائی دور دیکھا تھا۔ وہ اس یونیورسٹی کے قیام اور اس کی ترقی کے لیے بلوچ صاحب کی خدمات کے حوالے سے اپنے مضمون

Dr. N.A. Baloch The founder Vice Chancellor Islamic University Islamabad میں لکھتے ہیں:

> ''اس زمانے میں یونیورسٹی کا نہ کوئی بجٹ تھا، نہ قواعد وضوابط، نہ دفتر، نہ عمارت، نہ فرنیچر نہ مستقل اساتذہ۔ یونیورسٹی کے پاس صرف اور صرف وہ نو طلبہ تھے جن کا تبادلہ قائداعظم یونیورسٹی سے یہاں کیا گیا تھا۔ کسی کو توقع نہیں تھی کہ ان حالات میں محض چند ہفتوں کے اندر یونیورسٹی میں باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہو جائے گا۔ اس نازک دور میں ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اپنے رفقا کے ہمراہ شب وروز کام کیا۔ یونیورسٹی کے قواعد وضوابط بنائے گئے، اکیڈمک کونسل، بورڈ آف اسٹیڈیز، بورڈ آف ٹرسٹیز و دیگر ذیلی کمیٹیاں قائم کیں۔ ایک Crash پروگرام کے تحت قواعد اور نصابِ تعلیم بنایا گیا۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب ان مقاصد کے حصول کے لیے تمام میٹنگوں میں شرکت کرتے اور ایک نئے تعلیمی ادارے کے قیام کے لیے بھرپور کوششیں کرتے۔
>
> اس زمانے میں یونیورسٹی کے دفاتر اور کلاسیں کرائے کی جدا جدا عمارتوں میں تھیں۔ بلوچ صاحب نے اسلام آباد کے سیکٹر E-7 میں ایک بڑا مکان کرائے پر حاصل کیا

جہاں طالبات کی کلاسوں کا آغاز کرایا۔ ایک اور رہائشی عمارت اساتذہ کی رہائش کے لیے حاصل کی۔ طلبہ کی کلاسوں کا آغاز زیرِ تعمیر فیصل مسجد کمپلیکس میں کیا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کی رہائش کے لیے رہائشی عمارت حاصل کی۔ یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ اور عملے کے لیے وہ عجیب زمانہ تھا۔ نامکمل کمروں میں طلبہ بڑے ذوق وشوق سے تعلیم حاصل کرتے۔ موسمِ برسات میں ان کمروں کی چھتیں دورانِ تعلیم ٹپکتی تھیں۔ بعض اوقات شدید بارش کی وجہ سے طلبہ کے لیے ناممکن ہوجاتا کہ سڑک اور مناسب ذرائع کی عدم موجودگی میں کلاس تک پہنچ پائیں۔ بعض اوقات اساتذہ اور طلبہ شدید بارش کی وجہ سے کلاس روم ہی میں رکنے پر مجبور ہوجاتے۔ ابتدا میں بلوچ صاحب نے اس طرح کام کیا کہ وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کا دفتر تک نہیں تھا۔ انھیں ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی میں ایک معمولی کمرہ دیا گیا تھا۔ یہ ادارہ اس زمانے میں سوک سینٹر سیکٹر G-8 کی ایک عمارت میں تھا۔ بلوچ صاحب اس زمانے میں قومی کمیشن برائے تاریخ وثقافت میں کام مکمل کرنے کے بعد اس دفتر میں آتے اور رات گئے تک کام کرتے رہتے۔

ان مشکل حالات کے باوجود یونیورسٹی کے وائس چانسلر، اساتذہ اور طلبہ کی محنت کے نتیجے میں اس نئے تعلیمی ادارے میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ ابتدا میں چار انسٹیٹیوٹ قائم کیے گئے۔ یہ (۱) شریعت اور قانون، (۲) دعوت اور اصولِ دین، (۳) عربی زبان وادب (۴) معاشیات تھے۔ ان چاروں انسٹیٹیوٹ نے ستمبر 1981ء سے کام شروع کردیا۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کا کیمپس ایک فوجی کیمپ کا منظر پیش کرتا تھا۔ ہر شخص متحرک اور اس نئی یونیورسٹی کی خدمت کے لیے خود کو وقف کرنے والا یعنی dedicated نظر آتا تھا۔ ہر شخص میں ذمّے داری کا احساس موجود تھا۔ ہر شخص ان معمولی سہولیات کو دوسروں سے شریک کرنے پر راضی تھا جو یونیورسٹی نے اسے دی تھیں۔ فی الحقیقت اس دور میں قربانی اور dedication کی نادر مثالیں پیش کی گئیں۔''(۸)

اسی مضمون میں ڈاکٹر غازی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ اگست 1982ء میں بلوچ صاحب وائس چانسلر کے عہدے سے ہٹادیے گئے۔ اس وقت یونیورسٹی اپنے ابتدائی دور میں تھی جبکہ اب اس میں 60 ممالک کے 5500 سے زائد طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں۔ اب یہ بین الاقوامی شہرت یافتہ ادارہ بن چکی ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب نے اس بات پر افسوس کا اظہار بھی کیا کہ یونیورسٹی کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے بلوچ صاحب کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا۔ ان کے ساتھ بھی وہی افسوس ناک طرز عمل روا رکھا گیا جو ہماری تاریخ میں بہت سے مخلص اور dedicated لوگوں کے ساتھ رکھا گیا۔ بلوچ صاحب کی راہ میں موقع پرستوں نے روڑے اٹکائے جن کا آپ نے مردانہ وار مقابلہ کیا اور اپنے کام سے کام رکھا۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کا ایک انٹرویو جامعہء اسلامیہ بہاولپور کے رسالے 'بصائر' بابت ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب جامعہ اسلامیہ اسلام آباد کے وائس چانسلر تھے۔ جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں ڈاکٹر صاحب نے 'حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نظامِ تعلیم' کے موضوع پر مقالہ پڑھا تھا۔ رسالہ بصائر میں ڈاکٹر صاحب نے جامعہء اسلامیہ اسلام آباد کے قیام کے بارے میں یہ فرمایا:

> ''اس جامعہ کے قیام کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک نے ہجرہ پروگرام بنایا تھا کہ پندرھویں صدی ہجری میں کیا کیا جائے۔ جہاں اور بہت سے فیصلے کیے گئے وہاں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ کچھ درسگاہیں خاص علوم وفنون کے متعلق قائم کی جائیں۔ یہ فیصلہ مراکو میں اسلامی کانفرنس میں کیا گیا تھا۔''

اسی انٹرویو میں ڈاکٹر صاحب نے جامعہء اسلامیہ اسلام آباد کے قیام کے مقاصد پر یوں روشنی ڈالی تھی:

> ''یہ جامعہ ایک بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے طور پر قائم کی گئی ہے کہ مسلم ممالک کے نوجوان طلبہ ایک ساتھ تعلیم حاصل کریں اور اکٹھے رہیں۔ اسی طرح اسلامی سلسلوں کو خاص طور پر روح اسلام اور صحیح علوم کو رائج کر سکتے ہیں۔ ابھی تو صرف پاکستانی طلبہ علم حاصل کرتے ہیں لیکن آگے چل کر دوسرے ممالک سے بھی طلبہ آئیں گے جبکہ اب بھی مصر اور سعودی عرب کے اساتذہ یہاں درس تعلیم دے رہے ہیں۔''

بحیثیت مشیر قومی ہجرہ کونسل اسلام آباد

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے 1983ء میں جناب اے کے بروہی کی فرمائش پر قومی ہجرہ کونسل میں مشیر کا عہدہ قبول کیا تھا۔ڈاکٹر صاحب نے اس دوران کئی سیمینار، کانفرنسیں بھی کرائیں اور اشاعتی کام بھی کیا۔ڈاکٹر صاحب نے اس دوران ایک عظیم الشان علمی منصوبے کا آغاز کیا جس کی کوئی مثال پاکستان کے کسی ادارے نے پیش نہ کی تھی۔ڈاکٹر صاحب کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ہمیں اسلام کی محض نعرہ بازی نہیں کرنی چاہیے بلکہ اسلامی دور میں جو علمی، تحقیقی اور سائنسی کام ہوا، اسے دنیا کے آگے پیش کرنا چاہیے تاکہ دنیا میں مسلمانوں کی اس حوالے سے عزت ہو اور انھیں احترام کی نظر سے دیکھا جائے۔اس مقصد کی خاطر ڈاکٹر صاحب نے مسلمان محققین کی سو عظیم کتب کا منصوبہ تیار کیا اور ان کتب کے انتخاب کے لیے عالم اسلام کے نامور محققین کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے اہل علم سے مشورے بھی کیے۔ڈاکٹر صاحب کا پروگرام یہ تھا کہ ان سو کتب کے معیاری انگریزی تراجم کرائے جائیں اور ان پر تحقیقی مقدمے لکھ کر انھیں شایع کرایا جائے۔ڈاکٹر صاحب نے ان سو کتب میں سے 76 کتب کے انگریزی میں تعارف بھی لکھے اور ان پر مشتمل کتاب Great Books of Islamic Civilization کے نام سے ۱۹۸۹ء میں ہجرہ کونسل کی جانب سے شائع کرائی۔اس عظیم علمی منصوبے میں جن جن موضوعات پر کتب شایع کرانے کا پروگرام تھا ان میں سیرت، تاریخ، حدیث، فقہ، سیاسیات، معاشیات، سماج، سوانح عمری، ثقافت، طبعی علوم، علم ہیئت، نباتات، ریاضی، حیوانات، طب، زراعت، ادب و دیگر موضوعات شامل تھے۔اس علمی منصوبے میں دنیائے اسلام کے جن محققین، سائنس دانوں، طبیبوں اور ریاضی دانوں کی لکھی کتب شامل کی گئیں ان میں ان میں خوارزمی، فارابی، البیرونی، ابن سینا، ابن ندیم، الکندی، ابن نفیس، ابن رشد، المقدسی، الاصطخری، عمر خیام، الرازی اور شاہ ولی اللہ شامل تھے۔

ڈاکٹر بلوچ نے ایک ملاقات کے دوران مورخہ 22-6-2006 کو راقم سے فرمایا تھا کہ یہ عہدہ انھوں نے صرف اس شرط پر قبول کیا تھا کہ حکومتی پروپیگنڈے سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوگا اور وہ جو بھی منصوبہ بنائیں گے، انھیں آزادی سے اس پر کام کرنے دیا جائے گا۔جناب بروہی کی یقین دہانی پر بلوچ صاحب نے یہاں کام کا

آغاز کیا اور اپنی عادت کے مطابق ایک عظیم الشان علمی و تحقیقی منصوبے کی داغ بیل ڈالی۔

اسی ملاقات کے دوران اس علمی منصوبے کے بارے میں بلوچ صاحب نے راقم الحروف سے فرمایا تھا:

> ''گزشتہ 1400 برسوں کے دوران مسلمانوں نے علم کے ہر شعبے میں خدمات انجام دیں۔ ان کی علمی اور تحقیقی کتب میں سے بہت سی فنا ہو چکی ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ جو کتب بچ گئی ہیں ان میں سے 100 کتب کا عمدہ انتخاب کیا جائے۔ پھر ان کتب کے معیاری انگریزی تراجم شائع کیے جائیں اور 100 کتب کی یہ اسلامی لائبریری دنیا کے آگے پیش کی جائے جس سے دنیا کو اندازہ ہو کہ مسلمانوں نے کن کن شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس منصوبے میں ہم نے مختلف علوم و فنون کی 100 کتب کا انتخاب کیا۔ ابتدا میں اس منصوبے میں جان ڈالنے کے لیے 100 عظیم کتب کا انتخاب کرنا تھا۔ یہ ایک نازک اور مشکل مرحلہ تھا جس کے لیے دنیا بھر کے محققین اور عالموں سے مشورے کیے۔ ان کتب کے انتخاب کے لیے ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم مقیم پیرس نے ہماری بڑی مدد کی۔ اس منصوبے کے تحت چار کتب میں نے شائع کرائیں اور نو کتب پر کام مکمل کرایا تھا اس کے ساتھ ہی چار مزید کتب شروع ہونے والی تھیں کہ اس ادارے سے ہٹا دیا گیا۔''(۹)

بلوچ صاحب کے بقول اس منصوبے میں کتب کا انتخاب بڑا مشکل مرحلہ تھا جسے انھوں نے بخوبی طے کر لیا تھا۔ بقیہ کام ان کتب کے معیاری انگریزی ایڈیشنوں کی تیاری تھی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی تاریخ کے 25 جلدی منصوبے کی طرح 100 عظیم کتب کا یہ منصوبہ بھی بلوچ صاحب کے جانے کے بعد نامکمل رہ گیا۔

ان 100 عظیم کتب کے تعارف کے لیے بلوچ صاحب نے انگریزی میں ایک کتاب بہ عنوان Great Books of Islamic Civilization لکھی جسے قومی ہجرہ کونسل نے 1989ء میں شائع کیا۔ اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ 100 عظیم کتب کے منصوبے میں درج ذیل موضوعات پر معیاری کتب کی

اشاعت کا پروگرام تھا:

۱ دین واخلاق
۲ تعلیم اور حصولِ علم
۳ فلسفیانہ افکار
۴ سیاسی افکار، حکمرانی وانتظامات
۵ اصولِ قانون
۶ تاریخ
۷ معاشرہ وثقافت
۸ جغرافیہ، واقعہ نگاری، علمِ کائنات، احوالِ عالم
۹ ریاضی
۱۰ سائنس اور فنِ اندمالِ زخم
۱۱ انطباقی سائنس اور ٹیکنالوجی

بلوچ صاحب نے ان 100 عظیم کتب کے مخطوطات کے حصول کے لیے جن کتب خانوں سے معاونت حاصل کی ان میں سلیمانیہ کتب خانہ استنبول، ظاہریہ کتب خانہ دمشق اور شاہی کتب خانہ رباط شامل ہیں۔

اس منصوبے کے تحت بلوچ صاحب کی نگرانی میں جن کتب کے معیاری انگریزی تراجم شائع ہوئے، وہ یہ ہیں:

۱۔ **الجبرا** از الخوارزمی : یہ الخوارزمی کی نویں صدی عیسوی میں لکھی معروف کتاب ہے۔اسی تصنیف کے بعد الجبرا کا علم آب وتاب سے وجود میں آیا تھا۔یہ کتاب ہجرہ کونسل نے ۱۹۸۹ء میں شایع کی تھی جس میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کا عالمانہ پیش لفظ اور ڈاکٹر صاحب کے دوست اور ترکی کے معروف محقق اور اتاترک کلچرل سینٹر انقرہ کے صدر ڈاکٹر آئیدن سیلی کا لکھا ہوا ہے۔اس کتاب کا اصل عربی متن اور اس کا انگریزی ترجمہ شامل کتاب ہے جبکہ وضاحتی حواشی ترکی محقق ملک دوسی کے قلم سے ہیں۔

۲۔ **کتاب الحیل** از ابن موسیٰ : یہ کتاب خودکار میکانیکی حرفتوں سے متعلق ہے جس کا انگریزی ترجمہ انجینیر ڈونالڈ ہل نے ایک عرب محقق کے تعاون سے کیا۔ اس کتاب پر ڈاکٹر بلوچ صاحب کا پیش لفظ ۱۹۸۸ء کا تحریر کردہ ہے۔

۳۔ **کتاب** از الجزری : یہ کتاب بارہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی اور یہ ہائیڈرالک انجینیر نگ سے متعلق ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ڈونالڈ ہل نے کیا تھا۔ اس میں ایک باب چرخے سے متعلق بھی ہے۔ یہ کتاب ہجرہ کونسل کی جانب سے ۱۹۸۹ء میں شایع ہوئی تھی۔

۴۔ **کتاب الجماھر فی معرفۃالجواھر** از البیرونی : یہ کتاب البیرونی نے قیمتی پتھروں اور جواہرات سے متعلق بارھویں صدی عیسوی میں لکھی تھی اور اسے ہجرہ کونسل نے ۱۹۸۹ء میں شایع کیا تھا۔ اس کتاب کے انگریزی ترجمے کا کام حکیم محمد سعید صاحب نے کیا تھا جس کی نوک پلک ڈاکٹر بلوچ صاحب نے سنواری تھی۔ اس پر مقدمہ بھی ڈاکٹر صاحب کا ہی لکھا ہوا ہے۔

بلوچ صاحب نے 1989ء میں قومی ہجرہ کونسل سے سبک دوشی حاصل کی۔ اس وقت تک درج ذیل کتب کا کام مکمل ہو چکا تھا اور یہ طباعت کے لیے تیار تھیں:

۱۔ **کتاب النفس** از ابن ماجہ

۲۔ **تشریح الابدان** از شمس الدین العتافی

۳۔ **کتاب الاموال** از ابوعبیدہ

۴۔ **کتاب** از ابن جماعۃ

۵۔ **کتاب السرد** از احمد قزوینی

۶۔ **کتاب الازمنہ والانواع** از الاجدابی (۱۰)

ان کتب کے علاوہ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے چار مزید کتب کا آغاز کرایا تھا۔ 100 عظیم کتب کے اس منصوبے کے لیے بلوچ صاحب نے پاکستان کے نامور خطاط حضرتِ سیّد انور حسین نفیس الحسینیؒ (نفیس رقم) (۱۱) سے اسمائے کتب کے ٹائیٹلز کی خطاطی کرائی تھی۔

طویل علمی سفر

ڈاکٹر بلوچ صاحب اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک بہت سے ممالک کے سف کیے۔ اندرونِ ملک انھوں نے تقریباً پورے پاکستان کے متعدد اسفار کیے لیکن صوبہ سندھ کا تو چپہ چپہ چھان مارا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ اسفار سیر وتفریح کی خاطر کم اور علمی اور تحقیقی معلومات کے حصول کی خاطر زیادہ کیے ہیں۔ 1986ء میں آپ ''قومی ہجرہ کونسل'' اسلام آباد میں بحیثیت مشیر خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس موقعے پر آپ نے چھے ممالک کا طویل سفر کیا۔ اس دوران آپ کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر محمد شریف بلوچ شریکِ سفر تھے۔ انھوں نے اس سفر کی اہم تفصیلات سندھی زبان میں اپنے مضمون منهنجو والد ڈاڪٽر بلوچ (میرے والد ڈاکٹر بلوچ) میں تحریر فرمائی تھیں۔ یہاں ہم اس اہم مضمون کے اہم مشمولات کا اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں:

''1986ء میں مَیں حیدرآباد ڈویژن کا ڈپٹی ڈائریکٹر ہیلتھ تھا۔ اس وقت ڈاکٹر بلوچ صاحب قومی ہجرہ کونسل اسلام آباد کے مشیر تھے۔ آپ نے دنیا کے چھے ممالک کے دورے کا پروگرام بنایا جس کا مقصد 100 Great Books of Islamic Civilization کے منصوبے کی خاطر حصولِ معلومات تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی ان سو منتخب شدہ کتب کے انگریزی تراجم کرائے جائیں اور مختلف ممالک کے کتب خانوں کا دورہ کر کے ضروری کتب کے عکس اور کتب فروشوں سے ضروری کتب خریدی جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کا تقریباً ایک سال قبل ہی دل کا آپریشن ہوا تھا چنانچہ انھیں اپنے ساتھ ایک آدمی کی ضرورت تھی، جس کے لیے مجھے کہا۔ میں نے ٹکٹ خریدے اور ویزے کا انتظام کیا۔ سب سے پہلے ہم کویت پہنچے جہاں سفارت خانۂ پاکستان کے سیکرٹری ڈاکٹر صاحب کے استقبال کی خاطر ایئرپورٹ آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے وہاں کے اہم کتب خانوں کو دیکھا اور وزیرِ تعلیم اور دیگر اہلِ علم سے ملاقاتیں کیں۔ وہاں سے ہم دمشق اور قاہرہ گئے جہاں سے بڑی تعداد میں عربی کتب خرید کر سفارت خانۂ پاکستان بھیجی تھیں۔ یہاں سے پیرس

پہنچے جہاں ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب سے ڈاکٹر صاحب نے ملاقات کی۔ ڈاکٹر صاحب 100 عظیم کتب کے منصوبے میں ان سے رہنمائی حاصل کرتے رہتے تھے۔

اس کے بعد ہم لندن پہنچے جہاں کتابوں کی تلاش میں کئی کتب فروشوں کے پاس گئے اور ضروری کتب خریدیں۔ لندن یونیورسٹی کے کئی پروفیسروں سے بھی ملاقات کی جن میں قابلِ ذکر پروفیسر بیکنگھام سے علمی ملاقات ہے۔ پروفیسر بیکنگھام یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے اور ڈاکٹر بلوچ صاحب کی فرمائش پر ابنِ بطوطہ کے سفر نامے کے آخری حصے کو ایڈٹ کرر ہے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے سندھ میں ابنِ بطوطہ کے سفر کے بارے میں معلومات حاصل کیں جس کی تفصیلات ڈاکٹر صاحب نے انھیں بعد میں روانہ کر دیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کا لیکچر ''تعلیم'' Education کے بارے میں رکھا گیا جس میں یونیورسٹی کے پروفیسر حضرات نے شرکت کی اور لیکچر کو بے حد پسند کیا۔

لندن کے بعد ہم ترکی روانہ ہوئے جہاں انقرہ ایرپورٹ پر آئدین سائلی چیئرمین اتاترک کلچرل سنٹر نے ہمارا استقبال کیا۔ دوسرے روز وہ ہمیں قونیہ لے گئے جہاں مولانا جلال الدین رومیؒ کے مزار پر حاضری دی۔ یہاں دوپہر کے کھانے کا انتظام ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں مولانا رومی اکیڈمی کے عہدیداروں نے کیا۔ انقرہ سے ہم استنبول پہنچے۔ اس سفر کے دوران ڈاکٹر محمد یعقوب مغل بھی مل گئے اور ڈاکٹر صاحب کے لیے مترجم کی خدمات انجام دیں۔ یہاں دنیا کی مشہور لائبریری سلیمانیہ لائبریری پہنچے جہاں لائبریری کے منتظمِ اعلیٰ جناب معمر الکر نے دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا۔ یہاں ڈاکٹر صاحب نے بہت سی کتب و مخطوطات دیکھے اور ان سے ضروری نوٹس بھی لیے۔

استنبول میں ہم نے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مزار کی زیارت بھی کی۔ یہاں ڈاکٹر صاحب نے مزار سے ملحقہ مسجد کے امام صاحب سے ملاقات کی جنھوں نے

ہمیں چائے پلائی۔ اس تمام سفر کے دوران ڈاکٹر صاحب نہایت خوشگوار موڈ میں تھے اور میرے ساتھ ایک شفیق باپ کی طرح پیار و محبت کا برتاؤ کرتے رہے۔ (۱۲)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مرحوم نے اس سفر کے علاوہ سو عظیم کتب منصوبے کی خاطر عالمی سفر بھی کیا تھا جس میں ان کی معیّت ڈاکٹر محمد یعقوب مغل صاحب نے کی تھی۔ پیش نظر کتاب کے باب نمبر ۲۳ میں ہم اس عالمی سفر کی تفصیلات بیان کریں گے۔ یہ تمام تفصیلات راقم الحروف نے ڈاکٹر محمد یعقوب مغل صاحب سے متعدد نشستوں میں انٹرویو کی شکل میں حاصل کیں اور انھیں قلم بند کیا۔

حواشی باب نمبر 8

۱۔ قدرت اللہ شہاب معروف بیوروکریٹ، ادیب اور مصنف تھے۔ان کی پیدائش مورخہ ۲۶ر فروری ۱۹۱۷ءکوگلگت میں ہوئی اوروفات ۲۴ر جولائی ۱۹۸۶ءکواسلام آباد میں ہوئی۔قدرت اللہ شہاب کی کتابوں میں 'یاخدا' 'ماں جی' 'سرخ فیتہ' شامل ہیں۔ان کی خودنوشت 'شہاب نامہ' معروف کتاب ہے۔

۲۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی بین الاقوامی شہرت یافتہ دانشور اور ماہر آثار قدیمہ تھے۔آپ بسنہ میں مورخہ ۲۰ر جون ۱۹۲۰ءکو پیدا ہوئے اوروفات ۲۶ر جنوری ۲۰۰۹ کواسلام آباد میں ہوئی۔

۳۔ انٹرویوڈاکٹر نبی بخش بلوچ مورخہ ۲۲ جون ۲۰۰۶ء بہ مقام سندھ یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) حیدرآباد۔

۴۔ بحوالہ ''ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ۔قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت کے سربراہ کی حیثیت سے'' از ڈاکٹر محمد سلیم اختر۔یہ مضمون کتاب '' ڈاکٽر بلوچ هڪ مثالي عالم'' حصہ اول میں شائع ہوا۔

۵۔ بحوالہ ''ڈاکٽر بلوچ۔هڪ مطالعو'' ص:306

۶۔ 'ڈاکٽر بلوچ هڪ مثالي عالم'' (حصہ سوم) ،ص3(انگریزی سیکشن)

۷۔ایضاً

۸۔ ملاحظہ فرمایئے کتاب ''ڈاکٽر بلوچ هڪ مثالي عالم'' (حصہ سوم) میں ڈاکٹر محمود احمد غازی کا مضمون:

Dr. N.A Baloch The Founder Vice Chancellor Islamic University Islamabad

۹۔ انٹرویوڈاکٹر نبی بخش بلوچ از محمد راشد شیخ، مورخہ ۲۲ جون ۲۰۰۶ء

۱۰۔ '' ڈاکٽر بلوچ۔هڪ مطالعو'' از ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو، ص: ۴۴۔

۱۱۔سیّد انور حسین نفیس رقم (سیّد نفیس الحسینیؒ) پاکستان کے نامور خطاط، شیخ طریقت، مصنف، شاعر اور کئی دینی

اداروں کے سرپرست تھے۔آپ مورخہ ۱۱رمارچ ۱۹۳۳ءکوگھوڑیالہ(سیالکوٹ)میں پیدا ہوئے اور مورخہ ۵رفروری ۲۰۰۸ءکوآپ نے لاہور میں وفات پائی۔ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مرحوم کا آپ سے بہت محبت اور قرب کا تعلق تھا۔ڈاکٹر صاحب نے جب اپنے گاؤں گوٹھ جعفر خان لغاری کی جامع مسجد کی توسیع کرائی تو قرآنی آیات کی خطاطی کے لیے آپ ہی سے گزارش کی تھی۔سیّد نفیس الحسینیؒ کے خوبصورت خط ثلث میں قرآنی آیات کے دو کتبے آج بھی گوٹھ جعفر خان لغاری کی جامع مسجد میں دیکھے جاسکتے ہیں۔اس کے علاوہ جب بلوچ صاحب نے سو عظیم اسلامی کتب کا منصوبہ بنایا توان تمام کتب کے ٹائٹل کی خطاطی سیّد نفیس الحسینی سے ہی کرائی تھی۔

آپ کے مکمل حالات زندگی، خدمات اور نوادر خطاطی کے لیے ملاحظہ فرمائیں 'ارمغانِ نفیس' از محمد راشد شیخ

۱۲۔ ملاحظہ فرمایئے ''منهنجو والد ڊاڪٽر بلوچ'' (میرے والد ڈاکٹر بلوچ) از ڈاکٹر محمد شریف بلوچ، در کتاب ''ڊاڪٽر بلوچ هڪ مثالي عالم'' حصہ سوم، ص:۲۳۰۔

باب نمبر 9

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا دوبارہ قیام حیدر آباد
(۱۹۸۹ء تا ۲۰۱۱ء)

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی زندگی کا یہ نہایت روشن پہلو ہے کہ انھوں نے ہر زمانے میں علم و تحقیق سے اپنا تعلق قائم رکھا اور حالات کیسے ہی رہے، وہ ہر طرح کے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے علم کی شمع کی لو مدھم نہ ہونے دی۔

گزشتہ باب میں ذکر آچکا کہ 1983ء تا 1989ء بلوچ صاحب نے بحیثیت مشیر قومی ہجرہ کونسل اسلام آباد خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد آپ اسلام آباد سے حیدر آباد منتقل ہو گئے اور تب سے آخر دم تک حیدر آباد میں علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف رہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

سندھی لینگویج اتھارٹی کی سربراہی

19 ر دسمبر 1990ء کو سندھ اسمبلی نے سندھی زبان کی تعلیم اور فروغ کا ترمیمی ایکٹ منظور کیا جس پر 4 ر دسمبر 1990ء کو گورنر سندھ نے دستخط کیے۔ اس ایکٹ کے تحت Sindhi Language Authority یا ''سندھی زبان کا بااختیار ادارہ'' قائم کیا گیا۔

بلوچ صاحب اس زمانے میں قومی ہجرہ کونسل سے سبک دوش ہو چکے تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ برس ہا

برس سے جاری شاہ جو رسالو (یعنی رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی) اور سندھی زبان و ادب کے دیگر موضوعات پر نامکمل تحقیقی منصوبے مکمل کریں گے۔

مارچ 1990ء میں بلوچ صاحب کو سندھی زبان کے بااختیار ادارے کا اوّلین چیرمین مقرر کیا گیا۔ دلچسپ بات یہ کہ یہ اعلان اس وقت کے وزیر اعلیٰ نے بلوچ صاحب سے مشورے کے بغیر ایک پبلک میٹنگ میں کیا۔ یہ بلوچ صاحب کی علمی اور تحقیقی خدمات کی بنا پر کیا گیا تھا۔ بلوچ صاحب نے اس پیشکش کو قبول کر لیا اور اپنی عادت کے مطابق ادارے کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے اور نئے نئے علمی منصوبوں کی تیاری میں دل و جان سے منہمک ہو گئے۔(۱)

سندھ اسمبلی نے اس ادارے کے قیام کے تین مقاصد قرار دیے تھے جو یہ ہیں:

۱ سندھی زبان کی تعلیم

۲ سندھی زبان کا فروغ

۳ سندھی زبان کا استعمال

سندھی زبان کی تعلیم کے مقصد کے حصول کے لیے بلوچ صاحب نے فیصلہ کیا کہ پورے سندھ کے پرائمری اساتذہ میں بیداری لائی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے تحت استادوں کی تربیت کا انتظام سندھ کے مختلف شہروں میں کیا گیا اور پہلے مرحلے میں 653 اساتذہ کی تربیت (Training) کا انتظام کیا گیا۔

سندھی زبان کے فروغ کے تحت بلوچ صاحب نے تین مستند لغات کا منصوبہ بھی بنایا۔ ان میں سے پہلی یک جلدی سندھی۔ سندھی لغت پر بلوچ صاحب نے خود کام شروع کیا۔ اس کے علاوہ یک جلدی سندھی۔ انگریزی لغت اور یک جلدی انگریزی۔ سندھی لغت تیار کرنے کا بھی منصوبہ تیار کیا۔

سندھی زبان و ادب کے فروغ کے تحت ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی خاطر ایک لاکھ روپے کے انعام کا اعلان کیا گیا۔ اس ادارے میں بلوچ صاحب نے تحقیقی و تالیفی کاموں کی نگرانی دسمبر 1991ء سے 6/ مارچ 1994ء تک کی۔ اس دوران ادارے کی علمی و تحقیقی خدمات سے آگاہی کی خاطر ''خبرنامہ'' بھی جاری کیا جس کے آٹھ شمارے شائع ہوئے۔(۲)

ادارے کا اشاعتی پروگرام

بلوچ صاحب جس ادارے میں بھی رہے وہاں انھوں نے علمی و تحقیقی رسائل و جرائد اور کتب کی اشاعت کا خاص انتظام کیا۔ ''سندھی زبان کے بااختیار ادارے'' کی سربراہی کے دوران بھی آپ نے اشاعتی پروگرام پر بھرپور توجہ دی اور محض 27 ماہ کے مختصر عرصے میں 25 علمی و تحقیقی کتب شائع کیں۔ ان کے علاوہ ادارہ چھوڑتے وقت 9 کتب زیرِ طبع تھیں اور چار پر کام شروع کرانے کا پروگرام تھا۔ اس اشاعتی پروگرام کے تحت بلوچ صاحب نے نہ صرف نئی کتب لکھوائیں بلکہ بعض قدیم اور نایاب کتب کے جدید ایڈیشن بھی شائع کرائے۔ اس اشاعتی پروگرام کے تحت نہ صرف سندھی زبان و قواعد اور سندھی رسم الخط وغیرہ پر کتب شائع کرائیں بلکہ سندھی زبان میں سائنس اور ٹیکنالوجی پر بھی کئی مفید کتب شائع کرائیں۔

ادارے میں 6/مارچ 1994ء کو بلوچ صاحب کی بحیثیت چیرمین مدت پوری ہوگئی۔ اس سے قبل ہی آپ نے ادارے کے لیے مستقل زمین حاصل کر لی تھی اور اس کا خوبصورت نقشہ بھی تیار کرایا تھا۔ آج یہ خوبصورت عمارت حیدرآباد میں شمس العماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ لائبریری کے برابر موجود ہے۔ بلوچ صاحب نے بڑے اطمینان سے اس ادارے کا چارج نئے چیئرمین کو سونپا اور فرمایا کہ انھیں اطمینان ہے کہ اس مختصر مدت میں اس ادارے نے جتنا کام کیا پاکستان میں شاید ہی ایسی کوئی دوسری مثال مل سکے۔ (۳)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ بحیثیت وزیر تعلیم حکومتِ سندھ

ڈاکٹر صاحب سندھی زبان کے بااختیار ادارے میں ابھی بحیثیت چیرمین خدمات انجام دے رہے تھے کہ ۱۹۹۳ میں حکیم محمد سعید مرحوم کی سربراہی میں صوبۂ سندھ کی نگران حکومت بنی۔ اس میں حکیم محمد سعید بحیثیت گورنر خدمات انجام دے رہے تھے۔ حکیم محمد سعید اور ڈاکٹر بلوچ صاحب کے قیام پاکستان کے بعد کے ہر زمانے میں قریبی تعلقات رہے۔ حکیم صاحب کی دعوت پر ڈاکٹر صاحب نے بطور وزیر تعلیم صوبۂ سندھ کا عہدہ سنبھالا۔ سندھ کی تاریخ میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے اور تعلیم کے فروغ کے لیے سچا جذبہ رکھنے والے ڈاکٹر بلوچ ہی تھے۔ آپ نے ۱۹۹۳ء میں حکیم محمد سعید مرحوم کی سربراہی میں قائم نگراں حکومت میں بحیثیت وزیر تعلیم

خدمات انجام دیں۔ آپ کل ۲۷ روز تک سندھ کے وزیر تعلیم رہے۔ اس مختصر عرصے میں آپ نے جو جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے:

- اہلیت کی بنیاد پر ساڑھے آٹھ ہزار سے زائد اساتذہ کا تقرر کیا۔ ان تقررات کے لیے جو کمیٹیاں بنائیں ان میں بھی اہلیت اور لیاقت کا معیار پیشِ نظر رکھا گیا۔
- نو سو سے زائد اساتذہ کے رکے ہوئے پروموشن کی رکاوٹ کو دور کیا
- وزیر تعلیم سے ہر ملنے والے کو آسانی ہوگئی۔ مقررہ وقت میں ہر کوئی مل سکتا تھا
- دیہات میں بچیوں کی تعلیم کے لیے زیادہ سے زیادہ اسکول کھولے
- جو ادارے صرف اور صرف پیسہ کمانے کے لیے کھلے تھے اور تعلیم کے معیار پر توجہ نہیں دے رہے تھے انھیں پابند کیا گیا کہ وہ تعلیم کا معیار بلند کریں
- حکیم محمد سعید مرحوم کی مدد سے کراچی میں چارنئی یونیورسٹیوں کو تعلیم کی اجازت دی گئی
- اسکولوں کی نئی عمارتوں کے لیے بھی مناسب رقم کا انتظام کیا گیا اور پرانے اسکولوں کی عمارتوں کی مرمت کا مناسب انتظام کیا گیا۔

دورِ آخر میں علمی خدمات

قیامِ حیدرآباد کے اس زمانے میں بلوچ صاحب کا قیام سندھ یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) اور اس کے بعد سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی حیدرآباد میں رہا جہاں آپ برابر علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف رہے۔ ان علمی کاموں میں تین کام بڑی اہمیت کے حامل ہیں (۱) شاہ جو رسالو پر مکمل تحقیق جس کی 10 جلدیں شائع کرائیں اور بعد میں ایک جلد میں شاہ جو رسالو کا متن مع مختصر حواشی شایع کرائے (۲) جامع سندھی لغات (5 جلدیں) کی مکمل نظر ثانی و تصحیح و اضافوں کے بعد 3 جلدوں میں نئی جامع سندھی لغات کی تکمیل (۳) سندھ کے دیہات میں بولی جانے والی زبان کے محاورات و اصطلاحات کا سلسلہ ''ہیروں کی کان''۔

یہ تینوں علمی منصوبے سندھی زبان میں ہیں اور بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی تفصیلات ہم آگے بیان

کریں گے۔

دورِ آخر کی بعض تفصیلات

بلوچ صاحب کے بارے میں اور خصوصاً ان کے دورِ آخر کے بارے میں ان کی صاحبزادی محترمہ حمیدہ بلوچ صاحبہ نے سندھی زبان میں ایک معلومات افزا مضمون بہ عنوان ''میرے پیارے والد محترم کی یادیں'' (۴) لکھا تھا۔ یہ مضمون نہ صرف ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ان کی صاحبزادی کی یادوں کا خزینہ ہے بلکہ اس مضمون سے ڈاکٹر صاحب کے محاسن اور اوصاف پر بھی عمدہ معلومات ملتی ہیں۔ یہاں ہم اس مضمون کے خاص نکات کا اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں:

میرے والدِ محترم نہ صرف ہمارے خاندان کے بلکہ پورے علاقے کی پہلی شخصیت تھے جنھوں نے اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کی۔ ان کے دل میں فروغِ تعلیم کا بہت جذبہ تھا اور تعلیم کی قدر بھی تھی۔ جب وہ امریکہ سے ڈاکٹریٹ کر کے آئے تو انھوں نے اپنی اولاد کی تعلیم پر بھرپور توجہ دی۔ اس زمانے میں ہمارے گاؤں میں صرف بوائز پرائمری اسکول ہی تھا جس میں تعلیم حاصل کر کے گاؤں کی بچیاں گھر میں بیٹھ جاتی تھیں کیونکہ ان کے لیے مزید تعلیم کی کوئی سہولت موجود نہ تھی۔ اس صورت حال میں جب کہ میری عمر سات یا آٹھ برس تھی میرے والد محترم نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا چنانچہ وہ مجھے گاؤں سے حیدرآباد لے آئے اور گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول میں داخل کرایا۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو انہیں بے حد خوشی ہوئی کیونکہ ہمارے تعلقے میں میں پہلی لڑکی تھی جس نے میٹرک کیا۔ اس کے بعد میں نے مڈل اسٹینڈرڈ اسکالرشپ کا امتحان بھی پاس کیا اور اس کے بعد والد محترم کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں نے بی اے، بی ایڈ اور ایم اے ایم ایڈ تک تعلیم حاصل کی۔

جب والدِ محترم 1976ء میں اسلام آباد چلے گئے تو ہر سال ہم دو ماہ کے لیے ان

کے پاس جاتے اوران کے ساتھ ہم نے کئی شہروں اور علاقوں کی سیر کی۔1990ء میں والد محترم اسلام آباد سے حیدرآباد آ گئے تو سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس والے گھر میں والد محترم کے ساتھ ہم رہنے لگے۔ جب ہم نے سندھی مسلم سوسائٹی قاسم آباد میں اپنا گھر بنالیا تو والد محترم سے اجازت لی کہ اب ہم اپنے گھر میں منتقل ہوجائیں۔ والد محترم نے ظاہری طور پر تو اجازت دے دی لیکن مجھے یاد ہے کہ انھوں نے دل سے اجازت نہیں دی تھی۔ یہاں تک کہ جس صبح ہم اپنے گھر آئے تو والد محترم نے اسی روز شام کوفون کر کے کہا کہ میں آپ لوگوں کو یاد کررہا ہوں آپ لوگ آؤ تا کہ رات کا کھانا ساتھ کھائیں۔ مطلب یہ کہ والد محترم ہر وقت ہر گھڑی مجھے یاد کرتے رہتے تھے۔

2003ء میں امّاں خدیجہ کے انتقال کے بعد والد محترم گھر میں بالکل اکیلے ہو گئے تھے۔ اس صورت میں تقریباً ایک ماہ تک میں والد محترم کے ساتھ رہی۔ اس کے بعد میں نے ان کے پاس روزانہ جانے کا پروگرام بنالیا۔ صبح نو بجے ان کے پاس جاتی اور دوپہر ڈھائی بجے گھر واپس آ جاتی۔ اس دوران ان کے جو بھی کام کاج ہوتے وہ میں کردیتی تھی۔ میں نے والد محترم کو متعدد مرتبہ یہ کہا کہ اب آپ ہمارے گھر ہمارے ساتھ رہیے، اس پر وہ جواب دیتے کہ ابھی مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں اکیلا رہ سکتا ہوں۔ جب اکیلے رہنے کی ہمت باقی نہ رہے گی تو تمھارے پاس آ کے رہوں گا۔ اس دوران ہم یہ کر سکتے ہیں کہ صبح تم میرے پاس آؤ اور شام کو میں تمھارے پاس آؤں۔ اس طرح روزانہ شام والد محترم میرے بھتیجے محمد ارشد کے ساتھ میرے گھر آتے اور رات کا کھانا کھا کر ۱۱ بجے گھر واپس چلے جاتے۔ والد محترم میرے بچوں خصوصاً میرے بیٹے ڈاکٹر فاروق لغاری کے ساتھ باتیں کر کے بہت خوش ہوتے۔ ان باتوں میں اپنے بچپن کی باتیں، اسکول کے زمانے کی باتیں، اپنے استادوں کی باتیں، اسکول کے پٹے والے اور چوکیداروں کے نام اور اس طرح کی جو باتیں انہیں یاد تھیں وہ ہم سے بیان کرتے۔

2006ء میں میں نے بہت اصرار کیا کہ اب وہ مستقل طور پر میرے گھر منتقل ہوجائیں۔اس پر انھوں نے کہا کہ میں اکیلانہیں ہوں بلکہ میرے ساتھ میری کتابیں بھی ہیں اگر میں تمہارے گھر منتقل ہوگیا تو میری کتابیں میرے ساتھ کیسے آئیں گی؟اس پر کتابوں کو منتقل کرنے کی ذمّے داری میرے بیٹے ڈاکٹر فاروق اور بھتیجے ارشد نے اپنے ذمّے لی اس طرح یہ میری خوش نصیبی تھی کہ والد محترم ہمارے گھر رہنے پر راضی ہوگئے۔ والدمحترم ہمارے گھر بہت خوش رہے اور یہ کہتے تھے کہ یونیورسٹی والے گھر میں میں تنہائی اور خاموشی سے بیزار ہوچکا تھا، یہاں سارے گھر والوں کے ساتھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ پورادن کیسے گزرجاتا ہے۔

والدمحترم اپنے سارے کام ٹائم ٹیبل کے مطابق انجام دیتے تھے۔رات سونے سے قبل وہ ان کاموں کونوٹ کرلیتے جو اگلے دن انجام دینے ہوتے۔روزانہ صبح فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے اور اس کے بعد چہل قدمی (Walk) کرتے۔شروع میں چہل قدمی گھر سے باہر کرتے تھے۔بعد میں گھر کے اندر ہی کرنے لگے۔ٹھیک ساڑھے سات بجے اپنے کمرے میں آجاتے اور ناشتے اور چائے وغیرہ سے فارغ ہوکر صبح والی دوائیں کھاتے اس کے بعد ٹھیک 8 بجے لکھنے پڑھنے کا کام شروع کردیتے اور تقریباً بارہ بجے تک یہ کام کرتے رہتے۔اس کے بعد اخبارات کا مطالعہ کرتے جس کے بعد میرا بھتیجا ارشد انہیں دفتر لے جاتا۔اگر کسی وجہ سے صبح دفتر نہ جاپاتے تو شام کو چلے جاتے دوپہر کا کھانا دفتر سے آکر کھاتے۔انھیں زیادہ کھانے کا شوق نہیں تھا لیکن جو چیزیں شوق سے کھاتے ان میں مچھلی اور بھنڈی کا سالن، دہی، کوئی میٹھی چیز اور پھل شامل تھے۔کھانے میں مختصر غذا لیتے حسب ضرورت۔اگر کوئی ملاقاتی ملنے کے لیے آنا چاہتا تو اسے ۱۱ بجے کے بعد کا وقت دیتے۔دوپہر تقریباً 2 بجے سے 4 بجے تک آرام کرتے اور 4 بجے کے بعد عموماً کتابوں اور مقالات کے پروف پڑھتے۔کتاب کا پہلا پروف خود

پڑھتے اور اس کے بعد والے پروف پڑھنے کی ذمہ داری مجھے دی گئی تھی۔شام 5 بجے سے 6 بجے تک کا وقت لوگوں سے ملاقات کا رکھا تھا۔ رات کا کھانا بھی اسی وقت کھا لیتے رات کے کھانے میں عموماً پتلی والی دال سُوپ نما استعمال کرتے ۔کبھی کبھی سوپ بھی رات کے کھانے میں استعمال کرتے ۔شام کو 7 بجے میرا بھتیجا محمد ارشد والد صاحب کو چہل قدمی کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا۔ اگر کسی آدمی سے ملنا ہوتا تو اسی وقت ملاقات کے لیے جاتے۔ رات 9 بجے گھر آجاتے اور اس کے بعد اپنی روزانہ کی ڈائری ضرور لکھتے تھے۔

اس کے بعد گھر والوں سے گفتگو کرتے اور ٹی وی بھی دیکھتے تھے۔ ٹی وی کے دو پروگرام انہیں خاص طور پر پسند تھے ایک کُشتی Wrestling اور دوسرا نیشنل جیوگرافک National Geographic۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ والد محترم نے اپنی زندگی کا آخری زمانہ میرے ساتھ گزارا اور مجھے خدمت کا موقع دیا۔ وہ اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ ہم میں سے ہر ایک سمجھتا تھا کہ وہ سب سے زیادہ مجھ ہی سے محبت کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے عزیز و اقارب اور رشتے داروں کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کے دکھ سکھ میں ان کی مدد کرتے اور رشتے داری پوری طرح نباہنے کی کوشش کرتے تھے۔ 2010ء میں والد محترم کے پیروں میں تکلیف بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے پیدل چلنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے آدمی کی ٹانگیں اس کا گھوڑا ہوتی ہیں جن پر چڑھ کر وہ پیدل چلتا ہے۔ والد محترم نے پورا سندھ جوانی میں اور اس کے بعد پیدل چل کر دیکھا تھا۔ وہ خود کہتے تھے کہ جہاں بھی انہیں کسی سگھڑ (ہنر مند) کی موجودگی کی اطلاع ملتی وہ وہاں تک پہنچتے تھے۔ اگر وہاں پہنچنے کا راستہ نہ ہوتا اور سواری بھی نہ ہوتی تو وہ پیدل چل کر بھی وہاں تک پہنچ جاتے تھے۔ وہ اس سگھڑ کی زبان سے ادبی خزانے سن کر انھیں قلم بند کر لیتے تھے۔ جب پیروں سے معذوری ہوگئی تو وہ کہا کرتے تھے کہ آج ٹانگوں نے جواب دے دیا ہے، اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ان سے میں نے

بہت زیادہ کام لیا ہے۔

والد محترم کے ساتھ رہ کر میں نے ان سے بہت سے اقوال زرّیں سنے اور بہت سی اچھی عادتیں سیکھیں۔ وہ ہمیشہ ہمیں نصیحت کرتے کہ کبھی بھی اپنے سے اوپر والے کو نہیں دیکھنا چاہیے، ہمیشہ اپنے سے نیچے والوں کو دیکھنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ والد محترم لکھنے پڑھنے کا کام باقاعدگی سے کرتے تھے یہاں تک کہ زندگی کی آخری شام بھی انھوں نے لکھنے پڑھنے کا کام نہ چھوڑا۔ اسی شام میں نے ان کے لیے دُھلے ہوئے کپڑے رکھ دیے تھے اور بدلنے کو کہا تھا اور تھوڑی دیر بعد جب میں کمرے میں آئی تو دیکھا کہ کپڑے وہیں رکھے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ نے ابھی تک کپڑے تبدیل نہیں کیے؟ تو کہنے لگے کہ مجھے کپڑے تبدیل کرنے میں کچھ وقت لگتا میں نے سوچا کہ جو کام اس وقت میرے ہاتھ میں ہے اسے پورا کرلوں اور یہ وقت بھی کام میں ہی صرف کرلوں۔

انتقال سے تقریباً ایک ہفتہ قبل جب شام کی چہل قدمی پر والد محترم جانے لگے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ اس روز ہم نے احتیاطاً ایک کرسی بھی ساتھ رکھ لی کیونکہ جب وہ چلنے سے تھک جاتے کچھ دیر کرسی پر بیٹھ کر آرام کرتے اور اس کے بعد پیدل چلتے۔ اس روز انھوں نے مجھ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بے شمار مہربانیاں کیں، مجھے بڑی عمر عطا کی جس میں مَیں نے اپنے سارے کام مکمل کیے، مجھے بڑے بڑے عہدے عطا کیے، میری تمام آل واولاد سلامت ہے، دوستوں یاروں سے مجھے بہت محبت اور عزت ملی اب میری کوئی بھی خواہش باقی نہیں رہی، اگر اب مجھے اللہ تعالیٰ اپنے پاس بلالے تو میں بالکل راضی ہوں۔ والد محترم کی یہ بات سن کر میں بہت غمگین ہوگئی اس پر انھوں نے میرا ہاتھ پیار سے پکڑا اور کہنے لگے کہ بیٹا! تمہارا بابا 94 سال کا ہو چکا ہے کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں 60 سال مزید جیوں گا؟

والدِ محترم کو زندگی میں بہت سارے ایوارڈ اور اعزازات ملے۔ 2011ء میں

صدر پاکستان کی طرف سے ہلالِ امتیاز ایوارڈ ملا جو محترم عبدالغفار سومرو صاحب نے ان کی طرف سے وصول کیا تھا۔اس ایوارڈ ملنے کی خوشی میں مورخہ 3-4-2011 کو سائیں آفتاب شاہ کے بنگلے پر پروگرام رکھا گیا تھا۔جب والد صاحب تقریب سے گھر واپس آئے تو بے حد خوش تھے۔ مجھے ایوارڈ دکھایا اور کہنے لگے کہ آج مجھے دوستوں کی طرف سے اتنی محبت اور عزت ملی ہے کہ لگتا ہے کہ میرا وقت پورا ہو گیا ہے۔بار بار یہی کہنے لگے کہ یہ میرے پیاروں اور دوستوں کی محبت ہے ورنہ میں تو ایک فقیر آدمی ہوں۔یہ الفاظ والد محترم نے اس طرح دل سے ادا کیے کہ میرے آنسو بہہ نکلے۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی زندگی کے آخری آٹھ برس ان کے پوتے محمد ارشد بلوچ نے ان کی شب و روز خدمت کی ۔ارشد بلوچ نے سندھی زبان میں ایک مضمون میں جس کا اردو ترجمہ ''میرے پیارے دادا جان'' (۵) تھا ان آٹھ برسوں کی روداد بیان کی۔اس مضمون کے خاص خاص نکات کا ترجمہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

محمد ارشد بلوچ کے بقول ان کے دادا کے ساتھ گزارے یہ آٹھ برس ان کی زندگی کے بہترین سال تھے جن میں ڈاکٹر صاحب کا ان سے اُنسیت ،قربت ،محبت اور شفقت کا تعلق رہا۔ارشد بلوچ کے بقول ان کی چھوٹی دادی اماں خدیجہ کا انتقال اکتوبر 2003ء میں ہوا۔اس کے بعد ڈاکٹر بلوچ صاحب کے پاس گھر میں کوئی ایسا فرد نہیں تھا جو ان کے ساتھ علمی و ادبی تقریبات میں شرکت کر سکے یا ان کی غیر حاضری میں لائبریری یا گھر میں موجود دفتر کی دیکھ ریکھ کر سکے۔ایک روز شام کو ڈاکٹر صاحب نے ان سے پوچھا کہ یونیورسٹی سے آنے کے بعد ان کی کیا مصروفیت ہوتی ہے؟ارشد نے مودبانہ انداز میں جواب دیا کہ یونیورسٹی سے آ کر وہ فارغ ہوتے ہیں ۔اس پر ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا میرے کچھ ضروری کام ایسے ہوتے ہیں جن میں مختلف سرگرمیاں شامل ہوتی ہیں مثلاً میری لائبریری سے درکار کتاب تلاش کر کے لانا،علامہ آئی آئی قاضی چیئر والے

دفتر سے میرے ڈرافٹ کیے ہوئے خطوط لانا، اسٹاف کو ضروری ہدایات دینا، مہمانوں کی خاطر تواضع اور رہائش کا انتظام کرنا اور اس کے علاوہ گھر کے لان کو سنبھالنے کی ذمّے داری بھی آج کے بعد تم سنبھالو تو بہت اچھا ہو۔ اس پر ارشد نے بڑی نیاز مندی سے یہ ساری ذمّے داریاں سنبھالنے پر رضامندی ظاہر کی۔ ارشد لکھتے ہیں کہ اس وقت میری عمر تقریباً 20 سال اور ڈاکٹر صاحب کی عمر تقریباً 87 سال تھی۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت ایک واکنگ اسٹک (Walking stick) استعمال کرتے تھے اور ان کی عمومی صحت ٹھیک تھی۔

ارشد لکھتے ہیں کہ دوسرے دن سے میں روزانہ شام کے 6 بجے سے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ پہلے دن جب میں ان کے پاس پہنچا تو میں نے انہیں سلام کیا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب لکھنے کے کام میں اتنے محو تھے کہ میری آواز پر توجہ نہ دے سکے۔ میں نے دوبارہ سلام کیا تو انھوں نے فرمایا کہ بابا ارشد آ گئے؟ اس وقت ڈاکٹر صاحب تحریری کام میں محو تھے اور ان کے سامنے رکھی ٹیبل اور صوفوں پہ کتابیں ہی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ارشد تقریباً آدھا گھنٹہ یہاں بیٹھ کر ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے رہے اور اس بات پر حیران ہوئے کہ ڈاکٹر صاحب بڑی توجہ سے تحریری کام میں مصروف تھے اور ان کی پوری ذہنی توانائی قلم اور کاغذ پر مرتکز تھی۔

ارشد کے بقول اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے لیے اور ارشد کے لیے چائے منگائی اور اپنی چائے میں دو چمچ شہد ملا کر پی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے واکنگ شوز پہنے اور اپنی شام کی چہل قدمی پر نکل گئے۔ ارشد کے بقول شام کی چہل قدمی کا معمول ان کی زندگی کے آخر تک رہا اور اس عرصے کے دوران ان کے ساتھ ارشد روزانہ واکنگ پر جاتے۔ ابتدائی ایام میں ایک دن ڈاکٹر صاحب نے ارشد سے پوچھا کہ کیا ان کو موٹر کار چلانی آتی ہے؟ ارشد نے جواب دیا کہ ابھی تک نہیں آتی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے ارشد کے والد اور اپنے بیٹے (محمد رفیق بلوچ) سے کہا کہ ارشد کو آپ موٹر چلانا سکھائیں چنانچہ

تقریباً 15 دن میں ارشد نے موٹر کار چلانا سیکھ لی اور اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کو بٹھا کر اپنی پھوپی محترمہ حمیدہ بلوچ کے گھر لے گئے۔ اس کے بعد ارشد کا یہ روزانہ کا یہ معمول بن گیا کہ شام کو روزانہ ڈاکٹر صاحب کو چہل قدمی کے لیے بھی لے جاتے۔ اس کے بعد اپنی پھوپی کے گھر لے جاتے جہاں رات کا کھانا کھا کر واپس اولڈ کیمپس والے گھر جاتے۔ ارشد اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کو دوائیں وغیرہ کھلا کر اپنے گھر چلے جاتے۔

ارشد لکھتے ہیں کہ 2006 میں انھوں نے ایم اے اکنامکس کیا اور اس کے بعد انہیں ایک کمرشل بنک میں نوکری مل گئی جہاں انہیں صبح ساڑھے آٹھ سے شام 5 بجے تک کام کرنا پڑتا تھا۔ اس صورت میں ڈاکٹر صاحب کو اگر کسی میٹنگ یا پروگرام میں جانا ہوتا تو وہ ارشد کے علاوہ کسی اور کے ساتھ جانے میں دقّت محسوس کرتے۔ اس پر ارشد نے فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کُل وقتی حاضری دے گا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے اسے دُعا دی اور فرمایا کہ جب تک میری زندگی ہے میری خدمت کرو اللہ تعالیٰ تمھارا بیڑا پار کرے گا۔ اس پر ارشد نے فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی بھرپور خدمت کرے گا اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے لائبریری سنبھالنے کی ذمّے داری ارشد کو سونپ دی۔ ارشد کے بقول ڈاکٹر صاحب کی لائبریری اس وقت کتابوں سے اتنی بھر چکی تھی کہ لائبریری میں پیر رکھنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ کتابوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ چون 54 کیبنٹ ہونے کے باوجود چار پانچ ٹیبلیں بھی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ارشد کے بقول اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ کیا کہ اپنی زندگی میں مختلف اداروں کو کتابیں تحفتاً دے دیں گے چنانچہ جن اداروں میں ڈاکٹر صاحب نے کتابیں دیں ان میں سندھ آرکائیوز کراچی، سنٹرل لائبریری سندھ یونیورسٹی، پاکستان اسٹڈی سینٹر سندھ یونیورسٹی، انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی سندھ یونیورسٹی، کیڈٹ کالج لاڑکانہ، لائبریری پیر جو گوٹھ شریف اور دیگر علمی ادارے شامل ہیں۔ ارشد کے بقول کتابیں دینے کا سلسلہ ڈاکٹر صاحب نے آخر دم تک جاری رکھا۔

2006ء سے 2011ء تک ڈاکٹر صاحب کا قیام اپنی صاحبزادی محترمہ حمیدہ بلوچ کے گھر رہا جنھوں نے اپنے والدِ محترم کی بے انتہا خدمت کی۔ ارشد کے بقول اگر کبھی ڈاکٹر صاحب کو حیدر آباد سے باہر کسی میٹنگ یا پروگرام میں شرکت کے لیے جانا ہوتا تو محترمہ حمیدہ بلوچ ان کے استعمال کی چیزیں اور ضروری دوائیں بڑے سلیقے سے رکھ دیتیں اور ارشد کو سمجھا دیتیں کہ کون سی دوا صبح کی ہے کون سی شام کی۔

ارشد کے بقول ڈاکٹر صاحب عموماً اتوار کے دن حیدر آباد سے باہر کسی دوست کے پاس یا سیر تفریح کی خاطر جاتے۔ انہیں برسات کا موسم بہت پسند تھا اور اس موسم میں وہ تھر کا سفر دو تین دفعہ کرتے۔ دورانِ سفر ڈاکٹر صاحب کے پاس اپنا قلم اور نوٹ بک ہر وقت تیار رہتی اور جہاں کوئی کام کی بات سنتے اسے فوراً نوٹ کر لیتے۔ ہر نئی چیز انھیں دریافت کرنے کا شوق تھا۔

ارشد بلوچ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو میں کوئی نہ کوئی سبق آموز نکتہ ضرور ہوتا۔ وہ وقت کی پابندی کا بہت خیال رکھتے اور مجھے بھی وقت کی پابندی کی نصیحت کرتے تھے۔ گفتگو میں خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس سے محبت آمیز گفتگو کرتے۔ اگر دوسرا شخص کوئی بات بیان کرتا تو اس کی بات بڑے غور سے سنتے، روزانہ رات کو سونے سے قبل دوسرے دن کرنے والے کام نوٹ کرتے اور ارشد کو بھی روزانہ ڈائری لکھنے کی نصیحت کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ارشد کو یہ بھی بتایا کہ وہ 1954ء سے مسلسل ڈائری لکھ رہے ہیں اور انھیں ڈائری لکھنے کی نصیحت علامہ آئی آئی قاضی نے کی تھی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب یہ بھی نصیحت کرتے کہ ہمیشہ صاف ستھرا لباس پہننا چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ بھی نصیحت کرتے کہ گفتگو میں اتنی بات کرنا مناسب ہے جس سے مقصد پورا ہو جائے اور غیر ضروری گفتگو سے پرہیز کرنا چاہیے۔

ارشد کے بقول ڈاکٹر صاحب غذا کے معاملے میں سادگی پسند تھے اور انھیں مہنگے

کھانوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کی پسندیدہ غذائیں سبزیاں، دال اور جوار کی روٹی تھیں۔ سبزیوں میں انہیں بھنڈی پسند تھی، پھلوں میں آم، گریپ فروٹ، سیب اور نارنگی پسند تھے۔ ارشد لکھتے ہیں کئی دفعہ ڈاکٹر صاحب اپنے بچپن اور استادوں اور محسنوں کا ذکر کرتے اور محسنوں میں علامہ آئی آئی قاضی اور اساتذہ میں علامہ عبدالعزیز میمن کا ذکر کرتے جن کی نگرانی میں انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم اے عربی گولڈ میڈل لیا۔ ان کے علاوہ نوشہرو فیروز مدرسہ کے علّامہ اللہ بخش نظامانی اور استاد اللہ ڈنو ماچھی کا بھی ذکر کرتے۔ اپنے دوستوں میں محمد اسماعیل نون، قاضی سچیڈنو، عبدالرحمان مہیسر، میر شاہنواز، حاجی محمد سوڈو خان اور غلام محمد بھٹی کو یاد کرتے۔ اپنے شاگردوں میں محمد عمر چنڈ، سیّد سردار علی شاہ، ممتاز مرزا، شیخ محمد اسماعیل، محمد یوسف شیخ، مظہر الحق صدیقی کے علاوہ سندھ کے نامور محقق ڈاکٹر عبدالغفار سومرو کا ذکر کرتے تھے۔

مولف سے بلوچ صاحب کے تعلقات اور آخری ملاقات

اس کتاب کے عاجز مولف کے لیے ڈاکٹر بلوچ صاحب کی شفقت، محبت، علمی کاموں میں حوصلہ افزائی اور سرپرستی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔ راقم الحروف کا بلوچ صاحب سے اولین تعارف تقریباً ۲۸ سال قبل ہوا۔ ملاقات کی وجہ یہ ہوئی کہ راقم ڈاکٹر بلوچ صاحب کے استاد محترم علامہ عبدالعزیز میمن کی سوانح اور علمی خدمات پر ایک مفصل کتاب لکھنا چاہتا تھا۔ اس کتاب کے سلسلے میں راقم بلوچ صاحب سے وقتاً فوقتاً مشورے کرتا تھا۔ دوران ملاقات بلوچ صاحب نے علامہ کے ان کے نام خطوط اور علامہ کے قلم سے ایک عربی میں لکھی سند بھی دی تھی جو بلوچ صاحب کے لیے لکھی تھی (یہ سند اور اس کا ترجمہ پیش نظر کتاب کے باب نمبر 4 کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں)۔

۲۰۰۵ء میں اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کی جانب سے بلوچ صاحب کو خط لکھا گیا کہ اکادمی کے سلسلے 'پاکستانی ادب کے معمار' میں بلوچ صاحب پر کتاب لکھوائی جائے گی اور اس حوالے سے وہ نام پیش کریں کہ یہ کام کون کرسکتا ہے؟ یہ بلوچ صاحب کی شفقت تھی کہ اس کام کی خاطر انھوں نے پہلے فون کر کے راقم کا

عندیہ لیا پھر راقم کا نام پیش کیا۔ چنانچہ تقریباً ڈیڑھ سال کی محنت کے بعد ۲۰۰۷ء میں کتاب 'ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ۔شخصیت اور فن' اسلام آباد سے شایع ہوئی۔ اس کتاب کے بعد راقم نے ایک ملاقات کے دوران بلوچ صاحب کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ان کے اردو مقالات اور اردو خطوط پر بھی کام کیا جا سکتا ہے اور راقم اس کام کے لیے بخوشی رضامند ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ بلوچ صاحب کی انگریزی میں خط و کتابت کا ایک مجموعہ اور انگریزی مقالات کے دو مجموعے شایع ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے سندھی خطوط پر مشتمل ایک مجموعہ اور ان کے نام مشاہیر کے سندھی زبان میں خطوط کی دو جلدیں شایع ہو چکی تھیں۔ راقم الحروف کی اس تجویز پر بلوچ صاحب نے بخوشی رضامندی ظاہر کی۔ الحمدللہ راقم کا مرتبہ، بلوچ صاحب کے اردو مقالات اور خطبات کا معلومات افزا مجموعہ ''گلشن اردو'' کے عنوان سے پاکستان اسٹڈی سینٹر سندھ یونیورسٹی جام شورو سے ۲۰۰۹ء میں شایع ہوا۔ اس سلسلے کی تیسری کتاب یعنی ''خطوط ڈاکٹر نبی بخش بلوچ'' ۲۰۱۱ء میں محکمہء ثقافت حکومت سندھ کراچی کی جانب سے شایع ہو چکی ہے جس میں کل ایک سو تینتیس نادر خطوط مع حواشی شامل ہیں۔ ان خطوط میں ۲۸ خطوط بنام راقم الحروف ہیں۔

راقم الحروف کی بلوچ صاحب سے آخری ملاقات ان کے انتقال سے تقریباً دس ماہ قبل سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی والے گھر میں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۹۳ برس ہو چکی تھی لیکن عمومی صحت اچھی تھی اور حیرت انگیز طور پر حافظہ بہت قوی تھا۔ راقم نے تقریباً تین گھنٹے ان کے ساتھ گزارے۔ اس دوران ان کے استاد محترم علامہ عبدالعزیز میمن، تاریخ سندھ پر مشتمل کتب اور شخصیات سندھ سمیت کئی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ بلوچ صاحب حسب معمول اپنی انسائیکلو پیڈیائی معلومات سے مستفید فرماتے رہے۔ اب افسوس ہوتا ہے کہ کاش اس وقت ٹیپ ریکارڈر ہوتا تو یہ قیمتی گفتگو محفوظ ہو جاتی۔ بعد نماز مغرب راقم نے جب کراچی جانے کی اجازت مانگی تو فرمایا کہ میں آپ کے ساتھ بس اسٹاپ تک جاؤں گا۔ راقم نے گزارش کی کہ زحمت نہ فرمائیں لیکن راقم کا عذر مسموع نہ ہوا اور اپنے پوتے ارشد بلوچ کو بلایا اور فرمایا کہ گاڑی نکالو۔ اس کے بعد بلوچ صاحب، ارشد اور راقم قاسم چوک بس اسٹاپ تک پہنچے۔ وہاں الوداع کہتے وقت بڑی شفقت سے معانقہ کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر ہاتھ اٹھا کر الوداع کہی۔ آج بھی ان کا محبت اور شفقت سے الوداع کہنے کا منظر آنکھوں کے سامنے ہے۔ کیا خبر تھی کہ یہ

بلوچ صاحب سے اس دنیا میں آخری ملاقات ہے اور اس کے بعد کبھی اس سراپا علم و عمل شخصیت کو دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا انتقال اور تدفین

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مورخہ 6/اپریل 2011ء کو علی الصباح سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی حیدر آباد (سندھ) میں وفات پا گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر عیسوی تقویم اور اسکولی سرٹیفیکیٹ کے مطابق 94 برس سے کچھ زائد ہو چکی تھی۔ تدفین اسی روز وصیت کے مطابق علامہ آئی آئی قاضی کے مقبرے کے نزدیک ہوئی۔ اس طرح وہ عالم اور محقق اس دنیا سے کوچ کر گیا جس نے ایک زندگی سے کئی زندگیوں کا کام لیا اور وقت جیسی قیمتی شے کو ضائع کرنے کے بجائے اعلیٰ علمی و تحقیقی کاموں میں بڑی کامیابی سے صرف کیا۔ جوانی میں تو انسان کے قویٰ مضبوط ہوتے ہی ہیں لیکن راقم نے بلوچ صاحب کو 90 سال اور اس سے زائد عمر میں بھی پوری مستعدی اور دل جمعی سے علمی اور تحقیقی منصوبوں کی تکمیل میں مصروف پایا۔ آج کے دورِ انحطاط میں جب کسی ایک زبان کے ماہر ہی نہیں ملتے تو ایسا عالم جو ہفت زبان ہو اور جس نے اپنی عمر عزیز کے دو چار نہیں پورے ستر برس سے زائد نہایت بے غرضی سے علم و تحقیق کے لیے وقف کیے ہوں اور جس نے یہ ساری محنت اور مشقت کسی نام و نمود کی خاطر نہیں بلکہ اہم علمی ضروریات کی تکمیل کی خاطر کی ہو، یسی منفرد شخصیت صرف ڈاکٹر بلوچ مرحوم کی ہی نظر آتی ہے۔

بلوچ صاحب دنیاوی زندگی تو گزار گئے لیکن اپنے کارناموں کی وجہ سے حیات جاوداں پا گئے۔ وہ ان پاک باز انسانوں میں شامل تھے جن کے بارے میں حافظ شیرازی نے کہا تھا:

ہر گز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ڈاکٹر بلوچ کی آخری خواہش جو پوری ہوئی

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر آیا کہ ڈاکٹر بلوچ کو سندھ یونیورسٹی لانے والی شخصیت علامہ آئی آئی قاضی

کی تھی۔ڈاکٹر بلوچ عمر بھر علامہ قاضی کے اس احسان کو نہ بھولے اوران کی دلی خواہش تھی کہ ان کے انتقال کے بعدان کی آخری آرام گاہ بھی علامہ قاضی کے مزار کے نزد بنے۔بلوچ صاحب کی زندگی میں جوخواہشیں کیں ان میں بڑے بڑے علمی منصوبوں کا آغاز اور کامیابی سے ان کی تکمیل شامل تھیں۔اس کے علاوہ ان کی زندگی کے حالات میں ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ ان کی آخری خواہش بھی پوری ہوئی۔اس حوالے سے ہمیں ڈاکٹر بلوچ صاحب کا ایک انگریزی خط ان کی انگریزی زبان میں خط وکتابت کے مجموعے World of work-Predicament of a Scholar میں ملتا ہے۔یہ خط انھوں نے مورخہ 28-2-2003 کو سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو لکھا تھا۔اس خط میں انھوں نے لکھا تھا:

Dear Sir,

I am in good health and containing on my work normally as Allama I. I. Kazi Chair Professor. But as I am reaching the tale-end of my life career, I am planning for a happy exit as and when it comes.

In view of my life long association with Sindh University and dedicated services to it under inspiration from Allama I. I. Kazi, I wish to rest eternally under the University soil and at the feet of Allama Kazi.

I, therefore, beg the University authorities allow me a small piece of fifteen feet square soil for my grave, outside the Allama Kazi mausoleum but adjacent to it on the south as indicated in the sketch.

The request may be allowed as"the only one-time exception" on the following grounds:

-I was the very first teacher appointed in the University(1951)on a permanent

بلوچ صاحب سے اس دنیا میں آخری ملاقات ہے اوراس کے بعد کبھی اس سراپا علم وعمل شخصیت کو دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا انتقال اور تدفین

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مورخہ 6/اپریل 2011ء کو علی الصباح سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی حیدرآباد (سندھ) میں وفات پا گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر عیسوی تقویم اور اسکولی سرٹیفکیٹ کے مطابق 94 برس سے کچھ زائد ہو چکی تھی۔ تدفین اسی روز وصیت کے مطابق علامہ آئی آئی قاضی کے مقبرے کے نزدیک ہوئی۔ اس طرح وہ عالم اور محقق اس دنیا سے کوچ کر گیا جس نے ایک زندگی سے کئی زندگیوں کا کام لیا اور وقت جیسی قیمتی شے کو ضائع کرنے کے بجائے اعلیٰ علمی وتحقیقی کاموں میں بڑی کامیابی سے صرف کیا۔ جوانی میں تو انسان کے قویٰ مضبوط ہوتے ہی ہیں لیکن راقم نے بلوچ صاحب کو 90 سال اور اس سے زائد عمر میں بھی پوری مستعدی اور دل جمعی سے علمی اور تحقیقی منصوبوں کی تکمیل میں مصروف پایا۔ آج کے دورِ انحطاط میں جب کسی ایک زبان کے ماہر ہی نہیں ملتے تو ایسا عالم جو ہفت زبان ہو اور جس نے اپنی عمر عزیز کے دو چار نہیں پورے ستر برس سے زائد نہایت بے غرضی سے علم و تحقیق کے لیے وقف کیے ہوں اور جس نے یہ ساری محنت اور مشقت کسی نام ونمود کی خاطر نہیں بلکہ اہم علمی ضروریات کی تکمیل کی خاطر کی ہو، ایسی منفرد شخصیت صرف ڈاکٹر بلوچ مرحوم کی ہی نظر آتی ہے۔

بلوچ صاحب دنیاوی زندگی تو گزار گئے لیکن اپنے کارناموں کی وجہ سے حیات جاوداں پا گئے۔ وہ ان پاک باز انسانوں میں شامل تھے جن کے بارے میں حافظ شیرازی نے کہا تھا:

ہر گز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ڈاکٹر بلوچ کی آخری خواہش جو پوری ہوئی

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر آیا کہ ڈاکٹر بلوچ کو سندھ یونیورسٹی لانے والی شخصیت علامہ آئی آئی قاضی

اولادواحفاد

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے اپنے ایک انٹرویو(۶) میں فرمایا تھا کہ ان کی پہلی شادی اس وقت ہوئی جب انھوں نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا۔اس کی وجہ یہ بیان کی کہ اس دور میں کم عمری میں شادی کرنے کا رواج تھا۔بلوچ صاحب کی پہلی اہلیہ سے پانچ بچے ہوئے جو ماشاءاللہ سب بقید حیات ہیں۔ان میں سب سے بڑے ڈاکٹر محمد شریف بلوچ ہیں،ان کے بعد انجینیر علی محمد بلوچ،ان کے بعد محمد رفیق بلوچ اور ان کے بعد محمد شفیق بلوچ ہیں۔بلوچ صاحب کی پہلی اہلیہ سے صاحب زادی محترمہ حمیدہ بلوچ ہیں جنھیں یہ اعزاز حاصل ہوا کہ زندگی کے آخری چھے برس انھوں نے اپنے والد مکرم کی بے حد خدمت کی اور ان کی دعائیں لیں۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی دوسری شادی محترمہ خدیجہ بلوچ سے ۱۹۶۵ء میں ہوئی تھی جو علامہ آئی آئی قاضی کی بھتیجی تھیں۔ان سے بلوچ صاحب کے ایک صاحب زادے فریدم بلوچ اور دو صاحب زادیاں محترمہ آمنہ بلوچ اور محترمہ امیمہ بلوچ ہیں۔بلوچ صاحب کی تمام اولاد ماشاءاللہ تعلیم یافتہ ہے اور اپنے اپنے میدانوں میں مفید خدمات انجام دے رہی ہے۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی اولاد کی تفصیلات ان کے شجرے میں موجود ہیں۔بلوچ صاحب کے اہل خانہ سے راقم کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور نومبر ۲۰۱۲ میں ان کے گاؤں قریہ جعفر خان لغاری بھی جانے کا،بلوچ صاحب کی تعمیر کردہ مسجد دیکھنے اور گاؤں کے اہل تعلق سے ملنے کا موقع ملا۔اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی متعدد مرتبہ بلوچ صاحب کی اولاد اور ان کے پوتوں نواسوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔راقم نے ان کی تمام اولاد میں یہ مشترکہ خوبی دیکھی کہ ان کے بچے اور بچوں کے بچے بھی اعلیٰ اخلاق،محبت وشفقت اور مہمان نوازی کے اوصاف سے متصف ہیں۔ان سب سے مل کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ بلوچ صاحب کی دی ہوئی تربیت کے صالح اثرات ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد میں موجود ہیں۔

حواشی باب نمبر 9

۱۔ ملاحظہ فرمائیے ''ڊاڪٽر بلوچ هڪ مثالي عالم'' از ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو، ص : ۱۳۷۔

۲۔ ایضاً، ص:۱۳۹۔

۳۔ ایضاً، ص:۱۴۳۔

۴۔ منهنجي پياري باباسائين جون يادگيريون (میرے پیارے والدمحترم کی یادیں) از محترمہ حمیدہ بلوچ، سہ ماہی مہراݨ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ خاص نمبر، بابت اپریل تا جون 2012ء، صفحہ نمبر 151

۵۔ منهنجو پيارو ڏاڏا سائين (میرے پیارے دادا) از محمد ارشد بلوچ مہراݨ سہ ماہی مہراݨ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ خاص نمبر، بابت اپریل تا جون 2012ء، صفحہ نمبر 344

۶۔ اس تاریخی انٹرویو کے لیے ملاحظہ فرمائیں ڊاڪٽر بلوچ جا انٽرويو جلد پهريون (ڈاکٹر بلوچ کے انٹرویو جلد اوّل) از محمد ارشد بلوچ، ص85

باب نمبر 10

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی شخصیت کے اوصاف ومحاسن

مطالعۂ کتب

ڈاکٹر بلوچ صاحب کو زندگی بھر کتابوں سے عشق کی حد تک محبت رہی ہے۔ آپ جب بھی کسی بیرونی ملک کے دورے سے واپس آتے تو سب سے زیادہ جو چیزیں لے کر آتے وہ کتابیں ہی تھیں۔ ایک ملاقات کے دوران آپ نے راقم سے فرمایا کہ امریکہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے جب وہ واپس پہنچے تو کتابوں کے کئی بنڈل ان کے ساتھ تھے جبکہ دیگر حضرات عام استعمال کی چیزیں لائے تھے۔

بلوچ صاحب کے نزدیک مطالعہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک قسم مطالعے کی یہ ہے کہ جو بھی کتاب ہاتھ آئے اسے پڑھا جائے۔ مطالعے کی دوسری قسم وہ ہے جس میں کسی خاص مقصد کی خاطر مطالعہ کیا جائے تاکہ دورانِ تحقیق جو سوالات سامنے آئیں یا جو مسائل ہوں ان کا حل تلاش کیا جائے۔ بلوچ صاحب نے ہمیشہ دوسری قسم کے مطالعے پر عمل کیا ہے، علی گڑھ میں طالب علمی کے دور میں روزانہ چودہ گھنٹے مطالعہ کرتے تھے۔ دورانِ ملازمت روزانہ آٹھ سے دس گھنٹے مطالعہ کرتے اور زندگی کے آخری دور میں روزانہ پانچ گھنٹے مطالعہ کرتے تھے۔ بلوچ صاحب نے ادبی مطالعے کے ذیل میں مختلف شعراء کا کلام پڑھا۔ اسکول کے زمانے میں وہ علامہ اقبال سے بہت متاثر تھے اور ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' کو بہت لطف لے کر پڑھتے تھے۔ انھوں نے سندھ کے تقریباً تمام شعراء کا کلام پڑھا ہے لیکن شاہ عبداللطیف بھٹائی ان کے ذہن میں رچ بس گئے۔ یہ شاہ لطیف سے عقیدت ہی تھی کہ انھوں نے ''لطیفیات'' کے موضوع پر عظیم الشان علمی و تحقیقی کام کیا۔ فارسی شعراء میں حافظ، سعدی، قاآنی،

انوری اور خاقانی کو پڑھا۔ عربی شعرا میں ابوتمام کو شوق سے پڑھا نیز متنبّی سے بھی انھیں دلچسپی رہی۔ اردو شاعری میں اصغر گونڈوی سے متاثر رہے اور مومن خان مومن کو بھی دلچسپی سے پڑھا لیکن غالب کو تو وہ تمام اردو شعرا پر فوقیت دیتے ہیں۔ ان کے بقول اگر غالب نہ ہوں تو اردو نہ ہو۔(۱)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی اہلیہ محترمہ خدیجہ بلوچ نے ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ایک معلومات افزا مضمون بزبان سندھی لکھا تھا۔ یہاں ہم اس مضمون کے خاص مشمولات کا ترجمہ پیش کریں گے۔

علمی کتب کا حصول

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے ساری زندگی علم اور کتاب سے محبت کی ہے۔ وہ ایک نادر اور قیمتی کتب خانے کے مالک تھے جس میں مطبوعات کے علاوہ مخطوطات کا بھی وافر ذخیرہ تھا۔ اس ذخیرے کا بڑا حصہ اب سندھ آرکائیوز کراچی میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ خدیجہ بلوچ نے ڈاکٹر صاحب کی کتابوں سے محبت کے حوالے سے تحریر فرمایا تھا:

> ''ڈاکٹر صاحب کے پاس دنیا بھر سے رسائل آتے رہتے ہیں، ان میں زیادہ تر انگریزی میں اور بعض عربی و فارسی میں ہوتے ہیں۔ ایک فارسی رسالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے نظر ایک مخطوطے کے ادھورے نام پر پڑی جو تہران کے ایک کتب خانے میں محفوظ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی چھٹی حِس بیدار ہوگئی اور انھیں یقین ہو گیا کہ یہ مخطوطہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا رسالہ ہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مخطوطے کی خاطر تہران کا سفر کیا اور اسی کتب خانے تک پہنچے جو ایک قدیم بازار میں تھا(۲)۔ وہ مخطوطہ ''شاہ جو رسالو'' کا ہی تھا چنانچہ آپ نے اس کی فوٹو اسٹیٹ حاصل کی اور شاہ جو رسالو کی تحقیق کے دوران اس سے استفادہ کیا۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس تمام محنت پر اور تہران کے سفر کے تمام اخراجات ڈاکٹر صاحب نے اپنی جیب سے برداشت کیے۔

ڈاکٹر صاحب کے دل کا آپریشن لندن میں 1985ء میں ہوا۔ اس موقعے پر

میں ان کے ہمراہ تھی۔ جیسے ہی ڈاکٹروں نے انھیں باہر نکلنے کی اجازت دی، انھوں نے لندن کے کتب فروشوں کے پاس جانا شروع کر دیا۔ اس دوران میں تھک کر چُور ہو جاتی اور کسی جگہ بیٹھ جاتی لیکن ڈاکٹر صاحب ماشاء اللہ تھکنے کا نام بھی نہ لیتے بلکہ کتابیں دیکھنے اور اپنی پسند کی کتب خریدنے کے بعد خود کو مزید چاق و چوبند محسوس کرتے تھے۔ یہ تمام کتب کوئی قصے کہانی کی کتابیں نہ ہوتیں بلکہ یہ وہ کتب ہوتیں جو سندھ کے بارے میں تحقیق میں مددگار ثابت ہوتیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ہمیشہ اپنی کمائی کتابوں پر خرچ کی ہے اور آج بھی کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی قیمتی کتاب خریدتے تو گھر آ کر یہی کہتے: ''کیا کروں! کتاب دیکھ کر خریدے بغیر رہ نہیں سکتا۔'' (۳)

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی کتابوں سے محبت اور ان کی جمع آوری کے حوالے سے ان کے فرزندِ اکبر ڈاکٹر محمد شریف بلوچ صاحب نے مورخہ ۱۱ر نومبر ۲۰۱۲ کو دوران انٹرویو درج ذیل معلومات سے آگاہ فرمایا:

''ڈاکٹر بلوچ صاحب کا عشق علم سے اور ادب سے اور پڑھنے لکھنے سے تھا۔ زندگی بھر کتابوں سے محبت کرتے رہے۔ دنیا میں جہاں بھی جاتے واپسی پر ان کے ساتھ کتابیں ضرور ہوتیں۔ ڈاکٹر صاحب نے زندگی بھر سب سے زیادہ رقم کتابوں پر ہی خرچ کی۔''

معمولاتِ یومیہ

ڈاکٹر صاحب کے معمولاتِ یومیہ کے بارے میں محترمہ خدیجہ بلوچ نے یہ لکھا:

ڈاکٹر صاحب کی زندگی مکمل طور پر منظّم قسم کی رہی ہے۔ آپ اوائلی زندگی میں جب سندھ یونیورسٹی کے ''انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن'' کے ڈائریکٹر تھے تو ہفتے کے چھ دن باقاعدگی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔ صبح سویرے اٹھتے، نماز فجر سے

فارغ ہو کر اپنے لکھنے پڑھنے کے کام میں دل جمعی کے ساتھ مشغول ہو جاتے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی بولتا تھا تو خود سنتے بھی نہ تھے۔ دو تین مرتبہ پکارنے کے بعد ایسے چونک کر جواب دیتے جیسے نہایت گہری نیند سے جاگے ہوں۔ اس کے بعد دفتر جاتے تھے۔ دوپہر کو گھر آ کر کھانا کھا کر کچھ آرام کرتے تھے اور پھر شام کی کلاس لینے جاتے تھے۔ میری زندگی بھی درس و تدریس سے وابستہ رہی ہے۔ میں نے کچھ وقت کے بعد یہ سمجھنا شروع کیا کہ کلاس سے پہلے تیاری کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب ہر وقت کلاس لینے سے پہلے ضرور اپنے نوٹس پر نظر ڈالتے تھے۔ آپ جب وائس چانسلر ہوئے تب بھی باقاعدگی سے اپنی کلاس لیتے رہے۔ آخر میں جب کام کی زیادتی بڑھ گئی تو انھیں اپنے اوقاتِ کار بدلنے پڑے۔ کلاس سے فارغ ہو کر رات کو دیر تک ڈکشنری آفس میں کام کرتے رہتے۔ وہ آفس آج تک آباد ہے۔ آپ باقاعدگی سے شام کو پانچ کارکنوں کے ساتھ وہاں بیٹھ کر کام کرتے۔ ''شاہ جو رسالو'' کی لغت پر کام جاری تھا۔ ہفتے میں اتوار کے دن یا کبھی اس میں سنیچر بھی شامل ہو جاتا تھا جو ان کے گھومنے پھرنے اور شکار کے لیے وقف ہوتا تھا۔ میں جب ان کے گھومنے پھرنے کی بات کرتی ہوں تو اس سے مراد یہ ہے کہ ان دنوں میں کوشش کر کے سندھ کے وہ مقامات دیکھتے تھے جہاں سے سندھ کے متعلق مواد حاصل ہو سکے، باخبر سگھڑوں (ہنر مندوں) سے کچہری (عام ملاقاتیں) کر کے مواد حاصل کرتے رہے جس کی بدولت سندھی لوک ادب کی ۴۲ کتابیں ظہور پذیر ہوئیں۔ (۴)

علمی انہماک کا ایک واقعہ

ڈاکٹر صاحب کے علمی انہماک اور کام پر پوری توجہ کے حوالے سے محترمہ خدیجہ بلوچ نے لکھا:

ایک مرتبہ بلوچ صاحب ڈاکٹر اسلام کو تھر گھمانے اور وہاں کی گھاس اور بوٹیوں پر تحقیق کرنے کے لیے لے گئے۔ کہا کہ سارا دن تھر گھوم کر رات کو سب تھک کر سو گئے۔

کسی وقت آنکھ کھل گئی تو دیکھا کہ بلوچ صاحب لالٹین کی روشنی میں لکھنے میں مصروف تھے۔

اسی موضوع پر ڈاکٹر بلوچ صاحب کے ماموں جناب علی بخش لغاری نے مورخہ ۲۳/مارچ ۲۰۱۴ء کو دوران انٹرویو درج ذیل معلومات سے آگاہ فرمایا:

''جب میں حیدرآباد میں ان کے ساتھ مقیم تھا تو وہ روزانہ رات کے ڈھائی بجے تک لکھتے پڑھتے رہتے اور اپنے علمی منصوبوں کو مکمل کرتے رہتے۔ سارے گھر والے سو جاتے مگر ڈاکٹر صاحب اپنے کام میں مشغول رہتے۔ ایک مرتبہ میر علی احمد خان تالپور ڈاکٹر صاحب سے ملنے آئے۔ انھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کا بستر کتابوں سے بھرا ہوا تھا اور ڈاکٹر صاحب لکھنے پڑھنے میں مشغول تھے۔ یہ دیکھ کر میر صاحب ازراہ مذاق کہنے لگے: ''ڈاکٹر صاحب، لگتا ہے آپ نے عشق نہیں کیا، اگر عشق کیا ہوتا تو یہ بستر یوں کتابوں سے بھرا نہیں ہوتا بلکہ اس پر کوئی اور ہوتا۔''

موسمِ سرما میں معمولات

اس بارے میں ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ خدیجہ بلوچ نے کچھ یوں لکھا تھا:

سردیوں میں اتوار کا دن اکثر شکار کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ شکار ان کا بہترین مشغلہ ہوتا تھا۔ ان کے بقول ایک تو شکار میں چلنا پھرنا ہوتا ہے، دوسرا بندوق چلانے اور نشانہ باندھنے کا تجربہ بھی حاصل ہوتا ہے۔(۵)

علمی کام کی ضروریات

اس بارے میں ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ خدیجہ بلوچ نے کچھ یوں لکھا تھا:

آپ جب لکھنے پڑھنے کے کام میں مشغول ہو جاتے تھے تو اس وقت ان کے

لیے دو چیزیں ضروری ہوتی تھیں: ایک چائے اور دوسرے سگریٹ۔ ان کو میں نے ماضی کے صیغے میں اس لیے ڈالا ہے کہ ڈاکٹر صاحب آج بھی اسی انہماک سے کام کرتے رہتے ہیں، لیکن سگریٹ بالکل چھوڑ دی ہے اور چائے بھی کم کر دی ہے۔ آپ سگریٹ کے معاملے میں عجیب ذوق رکھتے تھے۔ ۵۵۵ کے پیکٹ تو کبھی کے ٹو کے پیکٹ پر جا کر رکتے تھے۔ سگریٹ چھوڑا تو سگار شروع کیا۔ اس کے بعد پائپ سے دل بہلایا، لیکن دل کے آپریشن کے بعد ان سب عادتوں کو خدا حافظ کہہ دیا۔(٦)

تفریح کے مشاغل

اس بارے میں ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ خدیجہ بلوچ نے کچھ یوں لکھا تھا:

تفریح کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کو ٹی وی دیکھنا پسند ہے۔ ان کا پسندیدہ چینل ''نیشنل جیوگرافک چینل'' اور سپورٹس میں کشتی Wrestling خاص ہیں۔ کشتی کے پروگراموں کو ایسے دیکھتے ہیں جیسے خود بھی ان کے درمیان موجود ہوں۔ کھیلوں میں ہاکی پسندیدہ کھیل ہے۔ ہمارا چھوٹا فرزند فرید یہاں ہوتا تھا تو اس کے ساتھ شطرنج بھی کھیلتے تھے اور کبھی کبھی بچوں کے ساتھ پیس کوٹ، لوڈو وغیرہ کھیلتے تھے۔(۷)

جانوروں سے لگاؤ

اس بارے میں ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ خدیجہ بلوچ نے کچھ یوں لکھا تھا:

ڈاکٹر صاحب کو جانوروں سے بھی بہت لگاؤ تھا اور اب بھی ہے۔ بلیاں انھیں بے حد پیاری ہیں جن کی خوراک خود ڈاکٹر صاحب کے ذمے ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے نام تھے وہ جسے بلاتے وہ آ کر کھاتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ حضرت ابو ہریرہؓ کے جانشین ہوں۔ اس کے علاوہ گھر میں ایک بارہ سنگھا اور کچھ خرگوش بھی رکھے جو ہمارے

ہاں سے بھاگ گئے۔ بارہ سنگھی رانی باغ کے حوالے کر دی، جسے کبھی کبھار رانی باغ میں دیکھنے جاتے تھے۔ آج ان تمام جانوروں کی جگہ مرغیوں نے گھیری ہے۔ آپ باقاعدگی کے ساتھ صبح شام انھیں دانہ دیتے ہیں، ان سے باتیں بھی کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ ان کی سب باتیں سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو بھی۔ انھیں چھوٹی بندریاں رکھنے کا شوق رہا ہے، لیکن میری وجہ سے یہ شوق تکمیل تک نہ پہنچ سکا ہے۔(۸)

جانوروں سے محبت کا ایک عجیب اور منفرد واقعہ ڈاکٹر صاحب کی صاحب زادی محترمہ حمیدہ بلوچ نے پیشِ نظر کتاب میں شمولیت کی خاطر یوں لکھا ہے:

''باباسائیں جب میرے پاس تھے تب کی بات ہے کہ صبح کی چائے بابالان یا کارپورچ میں بیٹھ کر پیتے تھے۔ وہاں ایک کوّا دیوار پر آ کر بیٹھ جاتا اور کائیں کائیں کی آواز نکالتا۔ جب بابا نے یہ دیکھا تو وہ بھی اس کوے سے بات کرنے کی کوشش کرتے۔ چند روز بعد وہ کوا دیوار سے اتر کر گاڑی پر آ کر بیٹھنے لگا اور کائیں کائیں کرتا۔ بابا نے اس کو کھانے کے لیے بسکٹ دینا شروع کر دیے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ کوا بابا کی ٹیبل پر آ کر بیٹھنے لگا، اس طرح بابا کے ساتھ اس کی دوستی ہوگئی۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ وہ کوا بابا کے کندھے پر آ کر بیٹھ گیا۔ بابا اور کوے کی یہ دوستی کافی دنوں تک چلی۔

باباسائیں کی وفات کے بعد وہ کوا روزانہ دیوار پر آ کر بیٹھتا اور کائیں کائیں کرتا، ایسا لگتا جیسے وہ بابا کو بلا رہا ہو۔''

آرٹ سے رغبت

اس بارے میں ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ خدیجہ بلوچ نے کچھ یوں لکھا تھا:

خوبصورتی، قدرتی نظارے، آرٹ اور آرٹسٹک شارٹ کا انھیں بے حد شوق ہے۔ وہ سب اچھی چیزیں لاتے جو آرٹ کے زمرے میں شامل ہیں خواہ بنے ہوئے مجسمے

یا پینٹنگ وغیرہ ہوں۔ مطلب کہ آرٹ کی ہمت افزائی کرتے رہتے ہیں۔ اجرک بنانے والے کاریگروں، لنگیاں اور کھیس بنانے، کھراد، کاشی کاری کے کاریگروں سے ان کی ملاقاتیں اور محبتیں تھیں۔ ان میں سے ایک مرحوم حاجی عبدالکریم تھے جنہوں نے شاہی بازار، حیدرآباد میں ایک دکان قائم کی تھی جہاں پر سندھی آرٹ کا سامان، اجرک، لنگیاں، کھیس و دیگر سامان موجود ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی باہر کے مہمان ڈاکٹر صاحب کے پاس آتے تھے تو ان کو حاجی صاحب کی دکان پر ضرور لے جاتے تھے آج حاجی صاحب کے نیک فرزندوں نے اپنے باپ کے کام کو کافی بڑھایا ہے اور ڈاکٹر صاحب ان کے پاس جاتے ہیں۔ موسیقی سے بھی ان کو کافی لگاؤ ہے۔ آپ نے موسیقی پر بھی کافی حد تک تحقیق کی ہے۔ میرے خیال میں سندھ کی موسیقی پر جتنی توجہ ڈاکٹر صاحب نے دی ہے اتنی کسی دوسرے نے نہیں دی ہے۔ آپ کی موسیقی کے بارے میں لکھی ہوئی کتاب اور سندھ کے سازوں کے بارے میں انگریزی میں چھوٹی کتاب دنیا بھر میں اہمیت حاصل کر چکی ہے۔ شاہ محمد نانینا، مائی بھاگی، فیض محمد بلوچ، مصری خان، علن فقیر اور دیگر ڈاکٹر بلوچ صاحب کی دریافت ہیں۔ (۹)

بحیثیت مثالی استاد

اس بارے میں ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ خدیجہ بلوچ نے کچھ یوں لکھا تھا:

ڈاکٹر صاحب ایک بااصول استاد رہے ہیں۔ آپ کے پڑھانے کا طریقہ ایسا تھا کہ ایک دفعہ لیکچر توجہ سے سننے کے بعد اس کو دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ میں بی ایڈ کے دوران ان کی شاگرد رہی ہوں۔ آپ ہمیشہ وقت پر کلاس لینے آتے تھے۔ کبھی ایک منٹ کی دیر نہ کرتے تھے۔ آپ کا دستور تھا کہ آتے ہی کلاس کا دروازہ بند کر دیتے تھے۔ جو طلبہ اندر وہ اندر جو باہر وہ باہر ہی رہ جاتے تھے۔ اسی لیے سب وقت پر آتے تھے۔ ان کے طلبہ سے تعلقات ایسے ہوتے کہ کسی کو بے تکلف ہونے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ (۱۰)

بحیثیت شفیق والد

اس بارے میں ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ خدیجہ بلوچ نے کچھ یوں لکھا تھا:

بلوچ صاحب نہایت شفیق والد ہیں۔ آپ اپنے بچوں کے ساتھ بہت پیار و عزت سے پیش آتے ہیں اور تربیت پر بہت زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ اسی کے نتیجے میں ہماری بچیاں نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اپنی حیثیت کو سنوارنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ ہماری بیٹی آمنہ سی ایس ایس کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کر کے فارن سروس میں گئی ہے۔ کچھ وقت کے لیے انکم ٹیکس میں اسسٹنٹ کمشنر بھی رہی اور اپنے والد کی طرح ایک بااصول آفیسر کی حیثیت سے اپنا نام پیدا کیا ہے۔ بڑی بیٹی حمیدہ بی ایڈ اور ایم اے ایم ایڈ کرنے کے بعد محکمہء تعلیم میں ایچ ایس ٹی (ہائی اسکول ٹیچر) ہے۔ چھوٹی بیٹی امیمہ انگریزی میں ایم اے میں نمایاں کامیابی حاصل کر کے اسلام آباد میں انگریزی کی ٹیچر ہے۔ آپ کے فرزندوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور دونوں بڑے بیٹے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ (۱۱)

سادہ طرزِ زندگی

اس بارے میں ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ خدیجہ بلوچ نے کچھ یوں لکھا تھا:

ڈاکٹر صاحب ایک نہایت سادہ طبیعت رکھنے والے شخص ہیں۔ انھیں دنیاوی شان و شوکت اور بڑائی سے بالکل لگاؤ نہیں ہے۔ کبھی بھی مہنگا کھانے اور مہنگا پہننے کی طرف توجہ نہ دی اور نہ دیتے ہیں۔ آپ کے کپڑے لتے کا خیال بھی میں اور بیٹی آمنہ رکھتی ہیں لیکن آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ بیٹا کپڑے کافی پڑے ہیں، فی الحال ضرورت نہیں۔ (۱۲)

ڈاکٹر بلوچ صاحب کے مزاج کی سادگی کے حوالے سے ان کے فرزند اکبر ڈاکٹر محمد شریف بلوچ صاحب نے مورخہ ۱۱ر نومبر ۲۰۱۲ء کو دوران انٹرویو راقم الحروف کو درج ذیل معلومات سے آگاہ فرمایا:

"ڈاکٹر صاحب بہت سادہ طبیعت کے آدمی تھے۔ وہ بے جا تکلفات سے بہت دور رہتے تھے۔ نہ مہنگے کھانے کا شوق تھا اور نہ مہنگے لباس کا۔ اگر ان کی کوئی دعوت کرتا تو کہتے کہ سادہ کھانا پکانا مرغن نہیں۔ سادہ کھانے سے ان کی مراد دال ساگ وغیرہ سے ہوتی۔ اگر کبھی ساگ بھی نہ ملتا تو لسی سے ہی روٹی کھا لیتے۔ ان کا عشق علم سے اور ادب سے اور پڑھنے لکھنے سے تھا۔"

اسی موضوع پر ڈاکٹر بلوچ صاحب کے ماموں جناب علی بخش لغاری نے مورخہ ۲۳/مارچ ۲۰۱۴ء کو دوران انٹرویو درج ذیل معلومات سے آگاہ فرمایا:

"ڈاکٹر صاحب بہت سادہ مزاج تھے لیکن وقت کے بہت پابند تھے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کراچی آئے، میں نے گزارش کی کہ آج میرے گھر رہیں ڈاکٹر صاحب راضی ہو گئے اور رات میرے ہاں قیام کیا۔ جب صبح ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے معلوم کیا کہ سندھ ہائی کورٹ کیسے جاؤ گے تو میں نے کہا کہ کوچ سے یا بس سے۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ مجھے سندھ سیکریٹریٹ جانا ہے اس لیے دونوں میں جلد کون سی سواری پہنچائے گی۔ میں نے کہا کہ شیراز کوچ۔ ڈاکٹر صاحب بلا تکلف میرے ساتھ شیراز کوچ میں بیٹھ گئے اور ہم نے شہر تک یہ سفر عام مسافروں کی طرح کیا۔"

ڈاکٹر بلوچ صاحب کے مزاج کی سادگی اور مہمان نوازی کے ایک واقعے کا گواہ راقم الحروف بھی ہے۔ ہوا یوں کہ نومبر ۲۰۰۷ء میں ایک شام سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس جانا ہوا۔ وہاں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی تعمیر کردہ مسجد کے باہر راقم کے ایک شناسا مل گئے۔ حال احوال کے بعد علم ہوا کہ وہ ڈاکٹر بلوچ صاحب سے ملنے جا رہے ہیں اور راقم سے بھی ساتھ چلنے کو کہا چنانچہ ہم دونوں بلوچ صاحب کے گھر پہنچے۔ بلوچ صاحب نے بڑی محبت سے استقبال کیا اور ہمیں کمرے میں بٹھا دیا جہاں امریکہ سے آئے ایک مہمان پہلے سے بیٹھے تھے۔ کچھ دیر باتیں ہوئیں اور اس کے بعد بلوچ صاحب خاموشی سے گھر کے اندر چلے گئے۔ ابھی ہم لوگ آپس میں باتیں ہی کر رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ بلوچ صاحب ایک بڑی ٹرے اٹھائے کمرے میں آ رہے ہیں۔ اس ٹرے میں

چار کپ چائے اور ایک بڑی پلیٹ میں پاپے تھے۔ یہ دیکھ کر ہم لوگوں کو بہت شرمندگی ہوئی کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب جیسا عالم اپنے مہمانوں کا اس قدر اکرام کر رہا تھا لیکن بلوچ صاحب نے بڑی محبت سے ہم کو چائے پیش کی اور پاپے بھی۔ یہ بلوچ صاحب کے مزاج کی سادگی اور مہمان نوازی کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

گاؤں میں علم کی روشنی پھیلانا

اس بارے میں ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ خدیجہ بلوچ نے کچھ یوں لکھا تھا:

ڈاکٹر صاحب کے گاؤں (قریہ جعفر خان لغاری، ضلع سانگھڑ) میں آج جو شعور آیا ہے وہ ان کی محنت و کاوش کے نتیجے میں آیا ہے۔ آپ نے وہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ پرائمری مڈل اور ہائی سکول قائم کروائے۔ آج گاؤں کے لڑکے اور لڑکیاں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہیں۔ آپ ہمیشہ لوگوں کو تعلیم اور اس کی اہمیت اور افادیت سمجھاتے تھے، نتیجے میں آج اسی گاؤں جعفر خان لغاری کے بے شمار لوگ ڈاکٹر، انجینیر، ڈپٹی کمشنر اور دیگر بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ تین افراد سی ایس ایس کے امتحان میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ اپنے گاؤں کے علاوہ دوسری کئی جگہوں پر دوستوں کو کہا، مدد کی اور اسکول قائم کروائے۔ کوٹ میر محمد عقیل کنگری میں اپنے دادا کی یاد میں (جو وہاں مدفون ہیں) لڑکوں کے لیے پرائمری و ہائی اسکول قائم کروایا اور لڑکیوں کے لیے پرائمری و مڈل اسکول جسے ہائی اسکول بنانے کی فکر میں ہیں۔ (۱۳)

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی فروغ تعلیم کی کوششوں کے بارے میں ان کے فرزندِ اکبر ڈاکٹر محمد شریف بلوچ صاحب نے مورخہ ۱۱ر نومبر ۲۰۱۲ء کو دوران انٹرویو درج ذیل معلومات سے آگاہ فرمایا:

''ہمارے گاؤں میں اسکول بڑی کوشش کے بعد قائم کرنے کی اجازت ملی۔ اس زمانے میں ڈسٹرکٹ کونسل سے منظوری کے بغیر کوئی اسکول نہیں کھل سکتا تھا۔ ڈسٹرکٹ کونسل نواب شاہ کا رکن ایک بنیا تھا جو یہ کہتا تھا کہ مسلمان پڑھیں گے نہیں اور گورنمنٹ کا پیسہ ضایع

ہوگا۔ڈاکٹر صاحب نے بڑی کوشش کے بعد اسکول منظور کرایا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ نہ تو اسکول کی عمارت تھی اور نہ فرنیچر۔اس مشکل کا یہ حل نکالا کہ شہداد پور سے آگے ایک گاؤں میں اسکول بند ہوگیا تھا اس کا فرنیچر بڑی مشکل سے گاؤں تک لائے کیونکہ اس زمانے میں نہ گاڑیاں تھیں، نہ سڑکیں اور نہ ہی ٹرانسپورٹ۔ڈاکٹر صاحب نے ذاتی کوشش سے تین بیل گاڑیوں کا انتظام کیا اور اس گاؤں سے اسکول کے لیے بنچیں، بلیک بورڈ اور ٹیبلیں لے کر آئے۔اب اگلا مرحلہ جگہ کا تھا۔اس کا حل ڈاکٹر صاحب نے یہ نکالا کہ حاجی مصری خان مرحوم کی جگہ خالی تھی جس نے ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر بلا معاوضہ جگہ دی اور اس طرح ۱۹۴۴ء میں اس گاؤں کے پہلے اسکول کا آغاز ڈاکٹر صاحب کی کوشش سے ہوا۔اسی اسکول سے میں نے بھی تعلیم حاصل کی اور میرے بھائی بہنوں نے۔اسکول قائم کرنا ڈاکٹر صاحب کا ایک بڑا کارنامہ تھا کیونکہ اس زمانے میں کسی گاؤں میں اسکول ہوتا ہی نہیں تھا۔اب اگلا مرحلہ اساتذہ کا تھا۔اس کے لیے ڈاکٹر صاحب نے استاد حاجی سومر خان سے گزارش کی جو پلیو خان لغاری کے اسکول میں ڈاکٹر صاحب کے استاد بھی رہ چکے تھے۔وہ راضی ہوگئے اور انھوں نے دو تین سال تک پڑھایا۔"

ڈاکٹر صاحب ساری زندگی لوگوں کو حصول تعلیم پر مائل کرتے رہے۔وہ غریب لوگوں کی بہت مدد کرتے تھے۔وہ غریب بچوں کو کتابیں خرید کر دیتے اور ہیڈ ماسٹر سے بھی معلوم کرتے کہ اگر کسی بچے کو کتابیں درکار ہوں تو وہ فراہم کریں گے۔سندھ یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے گھر کے نزدیک ہی ایک سادہ سی رہائش گاہ بنائی تھی جہاں گاؤں کے غریب طلبہ رہتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔انھی میں ہمارے گاؤں کا ایک غریب بھیل بھی تھا جس کا نام آچر داس تھا۔اس کو بھی ڈاکٹر صاحب نے ہی پڑھایا۔بعد میں وہ مختیار کار اور اسسٹنٹ کمشنر بھی بنا۔ڈاکٹر صاحب کی عادت تھی کہ جب گاؤں کے لڑکے میٹرک پاس کر لیتے تو انھیں ہمت دلاتے کہ آگے بھی تعلیم حاصل

کریں۔انھی کی کوششوں سے اس گاؤں کے لڑکے اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے اوران میں سے بہت سے ڈاکٹر بنے،انجینیر بنے، پروفیسر بنےاور بڑے بڑے عہدوں تک پہنچے۔''

اسی موضوع پرڈاکٹر بلوچ صاحب کے ماموں جناب علی بخش لغاری نے مورخہ ۲۳رفروری ۲۰۱۴ کو دوران انٹرویودرج ذیل معلومات سے آگاہ فرمایا:

''ڈاکٹر صاحب زندگی بھر تعلیم حاصل کرنے پر بہت زور دیتے رہے۔وہ گاؤں والوں سے کہتے تھے کہ اسکول میں منظور کراؤں گا آپ بچوں کوتعلیم کے لیے بھیجیں۔انھی کی کوششوں سے ہمارے گاؤں اورقریبی دوسرے گاؤں میں تعلیم پھیلتی گئی اورلوگ تعلیم یافتہ ہوتے گئے۔''

گاؤں کے باشندوں کی مدد

ڈاکٹر بلوچ صاحب جہاں کہیں بھی رہے' اپنے گاؤں کے باشندوں کوکبھی نہ بھولےاوران کی ہرممکن مدد کی۔گاؤں میں بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے حوالے سے ان کے صاحبزادے ڈاکٹر محمد شریف بلوچ تحریر فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کی کوشش اور بھاگ دوڑ سے 1958ء میں گاؤں (قریہ جعفر خان لغاری) میں بجلی آئی۔اس زمانے میں ٹرانسپورٹ کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے بجلی کے کھمبے بیل گاڑیوں پر لاد کر گاؤں لائے گئے۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کھمبے اپنے کاندھے پر رکھ کر بیل گاڑیوں پر چڑھائے۔گاؤں تک پہنچنے کے لیے کوئی راستہ بھی نہ تھا جس کی وجہ سے آپ نے بڑی کاوش کی۔سڑک کے لیے زمین حاصل کرنے میں بعض زمینداروں کی زمینیں بھی آتی تھیں جوراستے کی خاطر زمین دینے پر تیار نہ تھے۔ڈاکٹر صاحب نے ذاتی کوشش سے کمشنراورڈپٹی کمشنرکی سطح پرکوشش کی اور پہلے کچااور پھر پکاراستہ منظور کرایا۔اپنے گاؤں میں ٹیلیفون کی سہولت بھی آپ ہی کی محنت

سے پہنچی۔ اس کے علاوہ پبلک ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے پانی کے تالاب اور فراہمیٔ
آب کی خاطر پورے گاؤں میں نلکے بھی لگوائے۔''(۱۴)

اپنے گاؤں والوں کی مدد کا جذبہ بلوچ صاحب کے دل میں دورآخر تک موجود تھا۔اس سلسلے میں ان کے پوتے محمد ظفر بلوچ صاحب نے راقم الحروف کو ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے دورِ آخر سے متعلق ایک واقعہ سنایا۔محمد ظفر کے بقول انتقال سے تقریباً ایک ہفتہ قبل وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ شام کی چہل قدمی کر رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب نے ان سے فرمایا کہ کیا ہم نے گاؤں کے لوگوں کے لیے سب کام کر لیے ہیں یا ہم ان کی مدد کے طور پر مزید کام کر سکتے ہیں۔ظفر نے ڈاکٹر صاحب کو جواب دیا کہ ان کے خیال میں ہم گاؤں کے لوگوں کے لیے سب کچھ کر چکے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس طرح نہیں پہلے اچھی طرح سوچو، غور کرو پھر مجھے بتاؤ کہ اب ہم کیا کیا کر سکتے ہیں۔

مستقل مزاجی اوران تھک محنت

ڈاکٹر صاحب کی ایک عادت تھی کہ وہ مستقل مزاجی اوران تھک محنت سے اپنا کام کرتے رہتے اور بے جا تنقید اور اعتراضات کا کوئی جواب نہ دیتے ان کا خیال تھا کہ تنقید کا جواب اور جواب الجواب کے نتیجے میں انسان کا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو وقت مفید اور کارآمد کاموں میں صرف ہوسکتا ہے وہ ضائع ہوجاتا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے ایک خط میں یہ لکھا کہ بعض لوگ اپنے قیمتی وقت کو کسی نہ کسی مفید اور تعمیری کاموں میں صرف کرتے ہیں اور بعض لوگ اپنے وقت کو ان تعمیری کاموں پر تنقید کرنے میں صرف کرتے ہیں اور دونوں ہی طرح کے لوگ اپنے وقت کو اپنے ہی طریقے سے صرف کرتے ہیں اور آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کون صحیح تھا اور کون غلط۔

راقم الحروف نے ایک ملاقات کے دوران یہ سوال کیا کہ آج کل لوگ وقت کی کمی کی بڑی شکایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وقت ہی نہیں ملتا تو کوئی کام کیسے کریں اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ایسے لوگ غلط کہتے ہیں اور اپنے قیمتی وقت کو فضول کاموں میں ضائع کرتے ہیں مزید یہ فرمایا

کہ اگر انسان منضبط انداز سے اپنی زندگی گزارے تو اسی وقت میں بڑے بڑے کام کر سکتا ہے۔

آخر دم تک علم و تحقیق سے تعلق

ڈاکٹر صاحب کی عادت تھی کہ انھوں نے زندگی بھر حصول علم اور فروغ علم کی کوششیں کیں ان کی زندگی سادگی محنت اور ایثار کا نمونہ تھی، مشکل سے مشکل کام بھی اپنے ذمہ لیتے اور انھیں بڑی ہمت اور مستقل مزاجی سے پایہ تکمیل تک پہنچاتے تھے۔ زندگی کا وہ دور جب عام طور پہ لوگ ریٹائر ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو کسی کام کے قابل نہیں سمجھتے عمر کے اس زمانے میں بھی ڈاکٹر صاحب نے بڑے بڑے علمی اور تحقیقی کام اپنے ہاتھ میں لیے اور انھیں بڑی کامیابی سے مکمل کیا۔ کام کام اور مسلسل کام ہی ان کی زندگی تھی۔ انھیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ طویل العمری کی وجہ سے اب کام چھوڑ کر آرام کرنا چاہیے۔ دنیاوی زندگی کے آخری دن تک قلم اور قرطاس سے تعلق نہیں چھوڑا حالانکہ اس وقت ان کی عمر 94 برس ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے ایک ملاقات کے دوران راقم الحروف سے فرمایا تھا کہ ان کا ہمیشہ کا یہ معمول ہے کہ کسی بھی تحریر کی پروف ریڈنگ اور اس میں ترامیم تین مرتبہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کتاب یا مضمون اشاعت کے لیے روانہ کر دیتے ہیں۔ اس طریقے سے بلوچ صاحب کی بے شمار تحریریں چھپ کے محفوظ ہو گئیں اور ان کا افادہ عام ہوا۔ ورنہ راقم نے کئی ایسے اہل قلم بھی دیکھے ہیں جو اشاعت پر توجہ نہیں دیتے بلکہ مسلسل ترامیم و اضافے ہی کرتے رہتے ہیں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اشاعت نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے جتنی محنت کی ہوتی ہے وہ بھی ضایع ہو جاتی ہے۔

علمی اور تحقیقی کاموں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی

ڈاکٹر صاحب کی عادت تھی کہ وہ نہ صرف خود علمی اور تحقیقی کاموں میں مشغول رہتے تھے بلکہ دوسروں کو علمی کاموں کی طرف مائل کرتے، ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتے ان کے علمی کاموں میں رکاوٹوں کو حتی المقدور دور کرتے اور علمی کام کے دوران وقتاً فوقتاً کام کی رفتار بھی معلوم کرتے رہتے تھے۔ راقم الحروف نے جب بلوچ صاحب کے استاد محترم علامہ عبدالعزیز میمن کی سوانح اور علمی خدمات پر کتاب کا آغاز کیا تو سب سے پہلے بلوچ

صاحب ہی سے رابطہ کیا۔ جواباً انھوں نے تحریر فرمایا:

''آپ کا خط مورخ 98-11-23 موصول ہوا۔ خوشی ہوئی کہ آپ استاذ محترم مرحوم المیمنی کی سوانح مرتب کرنا چاہتے ہیں اور ماخذ جمع کرنے میں کافی پیش رفت ہوئی ہے۔'' (مکتوب مورخہ ۲۵ رنومبر ۱۹۹۸ء)

اسی طرح جب اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے بلوچ صاحب پر کتاب لکھنے کا کام راقم کو سونپا گیا تو اس کام کی خاطر راقم نے بلوچ صاحب سے مسلسل رابطہ رکھا اور دو مرتبہ حیدر آباد میں ان کے مفصل انٹرویو بھی ریکارڈ کیے۔ یہ بلوچ صاحب کی شفقت تھی کہ اس کام کو بنظر استحسان دیکھا اور بعد اشاعت کتاب بذریعہ خط درج ذیل الفاظ میں راقم کی حوصلہ افزائی فرمائی:

''آپ کا احسان کہ آپ نے اتنی اچھی کتاب میرے متعلق مرتب کی ہے۔ کتاب پڑھ کر احباب نے بھی تعریف کی ہے۔ اسلام آباد سے کچھ مطبوعہ کاپیاں مجھے بھجوائی گئی تھیں اور میں نے احباب کو دے دی ہیں۔ سب پڑھ کر آپ کی تعریف کرنے لگے۔'' (مکتوب مورخہ ۱۵ رجنوری ۲۰۰۸ء)

اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب روزانہ شام دو گھنٹے سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس کے مشرقی جانب اس سادہ سے کمرے میں باقاعدگی سے آتے اور شاہ جو رسالو کے عظیم علمی منصوبہ پر تحقیق میں مصروف نظر آتے اس وقت اس سادہ کمرے میں ڈاکٹر صاحب اپنے چند معاونین کے ساتھ اس علمی کام میں بڑے منہمک نظر آتے۔ راقم الحروف کی ابتدائی ملاقاتیں ڈاکٹر صاحب سے وہیں ہوئیں اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے استاد محترم کے اولین سوانح کے منصوبے پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور راقم الحروف کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب جب بھی کراچی آتے تو فون پر کام کی رفتار معلوم کرتے اور یہ بھی فرماتے کہ ان کے کتب خانے سے جو کچھ مواد ملا ہے اسے علامہ میمن کی اس سوانح میں کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی شفقت تھی کہ انھوں نے علامہ میمن کے لکھے ہوئے اصل خطوط اور ان کی لکھی ہوئی عربی زبان میں سند راقم الحروف کو فراہم کی۔ یہ سند علامہ میمن نے 1943ء میں ڈاکٹر صاحب کے لیے لکھی تھی۔

راقم کی تالیف ''علامہ عبدالعزیز میمن سوانح اور علمی خدمات'' پہلی مرتبہ شایع ہوئی۔ جب اس کے چند نسخے راقم تک پہنچے تو سب سے پہلا نسخہ راقم نے بلوچ صاحب کی خدمت میں روانہ کیا۔ انھوں نے اپنے استاد محترم کی اس اولین سوانح پر انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا اور راقم کے نام خط میں تحریر فرمایا:

''آپ کو یاد کرتے ہوئے یہ عید مبارک ارسال کر رہا تھا کہ ڈاک میں آپ کا گراں بہا تحفہ یعنی قبلہ میمن صاحب کی سوانح پر لکھی گئی یہ کتاب میرے سامنے آئی گویا آپ کی طرف سے 'عید مبارک' احسن طریقے پر ادا ہوئی۔ میں ممنون ہوں کہ کتاب کی پہلی کاپی آپ نے مجھے بھجوادی اور میں بیحد خوش ہوں اور آپ کو داد دیتا ہوں کہ آپ نے قبلہ استاذ کی سوانح کے سلسلے میں جملہ مآخذ سے خوشہ چینی کر کے یہ تفصیلی تصنیف مرتب کی۔ میں نے کتاب کو سرسری طور پر دیکھا ہے اور اب تفصیل سے پڑھوں گا لیکن استاذ مرحوم سے متعلق آپ کی یہ کتاب ایک بڑی مدت تک معتمد علیہ یادگار رہے گی۔'' (مکتوب مورخہ ۱۸ ر ستمبر ۲۰۰۹ء)

ڈاکٹر بلوچ مرحوم کی علمی سرپرستی اور شخصی محاسن سے متعلق مفید معلومات پروفیسر محمد اقبال مجددی صاحب کے اس کلیدی مقالے میں ملتی ہیں جو انھوں نے ڈاکٹر بلوچ کی برسی کے پروگرام مورخہ 6-4-2015 کو حیدرآباد میں پڑھا تھا۔ اسم مقالے کے اہم نکات ہم پروفیسر مجددی صاحب کے شکریے کے ساتھ یہاں نقل کرتے ہیں:

''میں سال اول کا طالب علم تھا کہ خوش نصیبی سے لاہور کے ایک تاجر کتب مولوی شمس الدین مرحوم کی دکان پر کتب کی تلاش میں جانے لگا۔ وہ دکان کیا تھی، ایک ادارہ تھا جہاں اہل علم حضرات جمع ہو کر علمی مباحث کرتے۔ یہیں پہلی مرتبہ ڈاکٹر این اے بلوچ مرحوم کو دیکھا لیکن ان سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر ایک دن موقعہ پا کر کانپتی ہوئی آواز میں ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کر کے اپنا نام بتایا۔ ان کے سوال کرنے پر بتایا کہ سال اول کا متعلم ہوں، تاریخ اسلام کی کتابیں جمع کرنے اور پڑھنے کا شوق ہے۔ موصوف یہ سن کر بہت مسرور ہوئے، حوصلہ افزائی کے طور پر بہت کچھ فرمایا۔ اس دکان پر عربی زبان و

ادب کے محقق علامہ عبدالعزیز میمن بھی آتے اور گھنٹوں بیٹھتے تھے۔ڈاکٹر بلوچ مرحوم کو ان سے دقیق علمی باتیں کرتے سنا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔کئی ماہ کے بعد علم ہوا کہ علامہ صاحب ڈاکٹر بلوچ کے استاد ہیں پھر ادھر ادھر سے کچھ علم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے سندھ پر اپنی پی ایچ ڈی کا مقالہ انھی کی نگرانی میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شروع کیا تھا لیکن کچھ ناگزیر مسائل کی وجہ سے یہ کام ترک کر دیا۔

ڈاکٹر بلوچ مرحوم جب بھی لاہور تشریف لاتے تو مولوی شمس الدین تاجر کتب نادرہ کی دکان پر ضرور تشریف لے جاتے تھے۔اگر وہاں ان کے استاد علامہ عبدالعزیز میمن آجاتے تو محفل خوب گرم ہو جاتی تھی۔ان دو اکابر کے وہاں تشریف لانے کی خبر سن کر اہل علم و دانش کھنچے چلے آتے تھے۔میں بہت ہی کم سن سال اول کا طالب علم بھلا ان حضرات کے بیان کردہ ذ دقیق نکات کہاں سمجھ سکتا تھا لیکن ہمہ تن گوش صرف سنتا ہی رہتا تھا۔مہمانوں کی چائے سے تواضع میری ذمہ داری تھی۔ایک بار چائے نوشی کے بعد میں نے میز صاف کرنے کے لیے کپڑا پکڑا تو ڈاکٹر بلوچ صاحب نے وہ کپڑا مجھ سے لے لیا اور میز خود صاف کرنے لگے،مولوی صاحب نے منع کیا تو پھر بھی مصروف رہے۔مہمان زیر لب مسکرا کر یہ منظر دیکھتے رہے۔اس علمی مرکز میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر بھی آتے تھے جو میکگل یونیورسٹی مونٹریال میں پروفیسر تھے اور بہت ہی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ڈاکر بارکر کو ایک بار گجرات کے سورت سے بخشو میاں(ف:۱۲۶۵ھ ۱۸۴۸ء)مولف حدیقہء احمدی (تاریخِ گجرات) کی مرتبہ کتاب ملی جو علما و شعرا کا تذکرہ ہے،انھیں یہ بیش بہا تذکرہ بہت ہی کم داموں میں گجرات سے ملا تو بار بار نہایت مسرور کن لہجے میں اس کا ذکر کرتے تھے۔اس وقت ڈاکٹر بلوچ بھی تشریف فرما تھے۔ان سے استفسار پر معلوم ہوا کہ سید ابوظفر ندوی مرحوم نے 'گجرات کی تمدنی تاریخ' میں بخشو میاں اور ان کے خانوادے کا ذکر کیا ہے۔یہ سن کر ڈاکٹر بارکر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میں کنیڈا جا کر یہ کتاب دیکھوں

گا۔ یہ بات دکان کے مالک مولوی شمس الدین سن رہے تھے، وہ اٹھے اور اپنے ذاتی ذخیرۂ کتب میں سے مولانا ابوظفر کی کتاب نکال لائے جسے دونوں حضرات نے توجہ سے دیکھا اور پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ ڈاکٹر بلوچ اور ڈاکٹر بارکر باہم یہیں ملے اور دوستی قائم ہوئی جو مرحوم کی وفات تک جاری رہی۔ ڈاکٹر بلوچ جب بھی لاہور آتے تو ڈاکٹر بارکر کا ضرور دریافت کرتے کہ کیا آج کل وہ پاکستان میں ہیں؟ ان دونوں محققین کی باتیں اور تبادلہء خیالات ہم لوگ کامل توجہ سے سنتے اور یاد کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ علمی محفلیں برسوں جاری رہیں۔ پھر ۱۹۶۸ء میں دکان کے مالک مولوی شمس الدین کا نوعمری میں انتقال ہو گیا تو سب کچھ جاتا رہا، نہ وہ اصحاب اب آتے تھے اور نہ ہی ان مجالس کی رونقیں اور گرمیاں رہیں۔

۱۹۶۸ء کے بعد یہ مجالس لاہور کے معروف طبیب حکیم محمد موسیٰ مرحوم کے مطب میں ہونے لگیں تو میں وہاں جانے لگا۔ ایک روز کیا دیکھا کہ ایک خوش پوش سندھی وہاں بیٹھے کچھ باتیں کررہے ہیں۔ نوجوانی، الھڑپن اور بے تکلفی سے پوچھا کہ کیا آپ ڈاکٹر بلوچ صاحب ہیں؟ مجھے کیا معلوم تھا کہ ان کی یادداشت بہت قوی ہے، فرمایا: ہاں، تم اقبال ہونا؟ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ مجھ جیسے جواں سال کے مقابلے میں میانہ عمر کے بزرگ کا حافظہ کتنا اچھا ہے۔ عمومی گفتگو کے بعد دریافت فرمایا کہ اب کون سی کلاس میں ہو؟ میں نے اپنے بی اے میں داخلے کا ذکر کیا تو مضامین پوچھنے پر جب انھیں علم ہوا کہ میں علم تاریخ کا طالب علم ہوں تو بہت خوشی کا اظہار کرتے ہوتے تاریخ اسلام کی کئی اہم کتابوں کا ذکر فرمایا جن کے نام میں نے گھر پہنچ کر لکھ لیے اور ان کتابوں کا متلاشی رہنے لگا۔

لاہور کے کئی اداروں میں مرحوم نے لکچر زدیے۔ لاہور میوزیم میں ان کا خطاب بہ عنوان Arab Conquest of Sindh بہت مشہور ہوا۔ اس لکچر میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور معروف خطاط سید انور حسین نفیس رقم بھی شریک ہوئے، راقم مسکین بھی سامعین

میں تھا۔ بہت سی کتابیں پڑھ کر سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ عربوں نے کس طریقے سے سندھ فتح کیا تھا۔ چند منٹوں کے اس لکچر نے تمام شکوک وشبہات دور کردیے جو عرصے سے ذہن میں خلجان پیدا کررہے تھے۔ مرحوم نے باقاعدہ نقشہ بنا کر وضاحت فرمائی تھی۔

بلوچ مرحوم جب بھی لاہور آتے تو پنجاب یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں ضرور جاتے تھے۔ ایک قیام کے دوران انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے قلمی نسخہ ''چچ نامہ'' کا مطالعہ کیا اور کئی دنوں تک اپنے مرتبہ نسخے کا مسودہ لاکر اس سے تقابل کرتے رہے، واپسی کے دن قریب تھے کہ درمیان میں ایک دن اتوار کا آگیا تو وہ ہفتہ کے دن لائبریرین سے ملنے گئے اور کہا کہ کل اتوار کو کسی طرح میرے لیے یہ نسخہ مہیا کیا جائے۔ لائبریرین جو عام طور پر اس قسم کے علوم سے بے بہرہ ہوتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی عظمت کا نقش چونکہ ملک کے مقتدر اصحاب پر تھا اس لیے انھوں نے لائبریری کے مخطوطات کے انچارج کو حکم دیا کہ کل اتوار کو وہ لائبریری آئے اور متعلقہ سیکشن میں ڈاکٹر صاحب کے لیے مخطوطہ خوانی کا انتظام کرے۔ بس کیا تھا میرے لیے یہ لمحات عید کی خوشی سے کم نہیں تھے۔ میں بھی تمام وقت لائبریری میں ان کے ساتھ بیٹھا رہا، کئی باریک الفاظ مجھ سے پڑھنے کے لیے فرمایا، میں نے اپنی سی کوشش کرکے وہ الفاظ پڑھے، ایک دو جگہ اختلاف کے ساتھ باقی قرأت مرحوم نے قبول فرمائی لیکن بہت مشکل پسندی سے۔ کئی الفاظ کی تحقیق کے لیے مجھ سے مختلف لغتوں سے رجوع کرنے کا امر فرمایا۔ چونکہ لائبریری کے باقی حصے بند تھے اس لیے موقع پر یہ کام نہ ہوسکا، بعد میں میں نے ان الفاظ کی تشریحات مختلف کتب لغت سے نوٹ کرکے بھجوائیں تو بہت ہی خوشی کا اظہار فرمایا۔

ایک مرتبہ لاہور میں سلسلہ ءنوشاہیہ کے تذکرہ نویس سید شرافت نوشاہی مرحوم ان سے ملنے کے لیے حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے مطب میں گئے، علما وصوفیہ سے متعلق بہت سی باتوں کا تبادلہ ہوا۔ شرافت صاحب نے پوچھا کہ کیا سندھ میں سلسلہ ءنوشاہیہ کے کچھ

آثار ہیں؟اس کے جواب میں ڈاکٹر بلوچ نے فرمایا کہ ہم معلوم کر کے بتائیں گے ۔شرافت نوشاہی صاحب نے بتایا کہ ہمارے جد اعلیٰ حاجی محمد نوشہ گنج بخش قادری (ف:۱۰۶۴ھ) سندھ گئے تھے اور ان کے حلقہءارادت میں داخل قوم ساھی کے افراد بھی ان کے حلقہءمریدین میں شامل ہو گئے تھے۔ڈاکٹر بلوچ نے پوچھا کہ کیا اس بات کا کوئی عصری ثبوت ہے؟جس پر شرافت صاحب نے کہا کہ ہمارے پاس ایک مخطوطہ 'تشریف الفقراء' ہے جس کے مولف فقیر غلام محی الدین بخاری لاہوری (ف:۱۲۴۱ھ) ہیں،اس میں ان امور کی تفصیلات درج ہیں۔ڈاکٹر بلوچ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور بتایا کہ ہمیں ان امور کا پہلے علم نہیں تھا۔شرافت صاحب نے اوڈیرو لال کے بارے میں بھی استفسار کیا جس پر ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ ہمارے ہاں سندھ میں اس نام کا ریلوے اسٹیشن ہے لیکن اس کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات نہیں ہیں۔شرافت صاحب نے بتایا کہ ہمارے ہاں سلسلہءنوشاہیہ کے مخطوطات میں ان کا نام کئی بار آیا ہے۔

۱۹۷۴ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے علم تاریخ میں ایم اے کی سند لے کر پنجاب پبلک سروس کمیشن سے لیکچرر منتخب ہو چکا تھا۔ڈاکٹر بلوچ مرحوم اسی سال لاہور تشریف لائے تو میں ملنے کے لیے حاضر ہوا۔حسب معمول بڑی خندہ پیشانی سے ملے ۔جب میں نے بتایا کہ میں علم تاریخ کا لیکچرر منتخب ہو چکا ہوں تو بہت مسرور ہوئے،مجھ سے کہا کہ میں پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرالوں۔میرے یہ بتانے پر کہ میرے شعبے کے اساتذہ میرے علمی شغف کے باعث مجھ سے سخت حسد کرتے ہیں اور انھوں نے پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو کے دوران جو میرا حال کیا اس کی روداد سن کر مرحوم آبدیدہ ہو گئے۔جب میں نے کہا کہ یہ بزرگ حضرات بھلا مجھ جیسے کو ڈگری کیسے دیں گے تو فرمایا کہ میں پریشان نہ ہوں،رب کریم کوئی سبب پیدا کر دے گا۔

مجھے تصوف کی تاریخ سے خاص دلچسپی ہے۔ میرے ذوق اور کام کو دیکھ کر مرحوم بہت خوش ہوتے تھے۔ ۱۹۷۶ء میں میری کتاب 'حدیقۃ الاولیاء' شائع ہوئی تو لاہور تشریف لانے پر میں نے یہ کتاب مرحوم کو پیش کی۔ کچھ دیر ورق گردانی کرنے کے بعد اٹھ کر کھڑے ہوئے اور مجھے سینے سے لگا کر بہت دعائیں دیں۔ فرمانے لگے کہ اس قسم کا کام جاری رکھنا، کبھی حالات سے متاثر ہو کر علمی کام ترک نہیں کرنا۔ ۱۹۸۱ء کو میری کتاب 'مقاماتِ مظہری' (احوال حضرت میرزا مظہر جان جاناں شہید ۱۱۹۵ھ۔ ۱۷۸۱ء) مولفہ شاہ غلام علی دہلوی ڈاکٹر بلوچ کی عنایت سے شائع ہوئی۔ میں نے کتاب انھیں بھیجی، کوئی جواب ڈاکٹر صاحب کی طرف سے نہ آیا تو میں سمجھ گیا کہ مرحوم ملک سے باہر گئے ہوں گے یا سخت مصروفیت کی وجہ سے رسید نہیں بھیجی۔ اگلے سال لاہور آئے، میں ملنے گیا تو بہت ہی منکسرانہ انداز میں خط نہ لکھنے پر معذرت فرمائی جس سے میں شرمندہ ہوا، فرمانے لگے: اب اس انداز کی کتابیں نہ تو کوئی مرتب کرتا اور نہ ہی اس باریک بینی سے کوئی حواشی لکھتا ہے، تم نے جو کام کیا ہے رہتی دنیا تک باقی رہے گا، اس قسم کے کام جاری رکھنا۔ اسی سال ایک چھوٹا سا رسالہ 'حسنات الحرمین' (ملفوظات و مکاشفات خواجہ محمد معصوم سرہندی ف: ۱۰۷۹ھ۔ ۱۶۶۸ء) میں نے تفصیلی مقدمے اور حواشی کے ساتھ ایڈٹ کیا۔ کتاب ڈاکٹر صاحب کو نہ بھیج سکا۔ ان کے لاہور تشریف لانے پر پیش کی تو تبسم فرماتے ہوئے شکوہ کیا کہ تم نے میرے گزشتہ رویے کی وجہ سے کتاب نہیں بھیجی تو ساتھ ہی فرمایا: اچھا کیا، میں بہت دنوں سے باہر تھا، کتاب ضائع ہو جانے کے امکانات تھے۔ کتاب کی ورق گردانی کرتے رہے لیکن کچھ نہ فرمایا، میں اگلے روز ملاقات کے لیے ہوٹل گیا تو آپ کی اہلیہ اور صاحب زادی بھی ہمراہ تھیں، ان سے تعارف کرواتے ہوئے اتنی تعریف کی جس کا میں کسی طور بھی مستحق نہیں تھا، پھر مذکورہ کتاب کے بارے میں خود ہی گویا ہوئے کہ تم نے تحقیق و ترتیبِ متن کی ایسی روایت ڈالی ہے جو دنیا کے لیے مثال بنے گی، یہ کام ایسے ہیں کہ ان کا

کوئی فوری معاوضہ نہیں مل سکتا اس کا صلہ اس وقت ملے گا جب دنیا اسے وسعتِ قلب ونظر سے دیکھے گی لیکن یہ صفات تو اب دنیا سے مٹتی جارہی ہیں۔تم بددل نہ ہونا اور کام میں مشغول رہنا۔

چودہ سال پہلے مجھے عمرے کی سعادت نصیب ہوئی ،اس دوران ڈاکٹر بلوچ تشریف لائے تو انھیں کسی ذریعے سے میرے عمرے پر جانے کا علم ہوگیا۔میں ملنے گیا تو معانقہ کرتے ہوئے بولے :میاں،ساری نیکیاں اور دعائیں خود ہی سمیٹ لیں یا کچھ ہمارے لیے بھی چھوڑا ہے؟میں نے عرض کی کہ حضرت، میں نے آپ کے لیے بہت عاجزی سے وہاں دعا کی تھی۔جب میں نے بتایا کہ میں دوسوکلووزن کے برابر وہاں سے عربی کتابیں خرید کر لایا ہوں تو بے چین ہو گئے۔فرمایا: تو کب دکھا رہے ہو؟ میں نے کہا :حضرت ،جب آپ چاہیں۔فرمایا، اچھا کل تمہارے ساتھ ہی چلیں گے۔ڈاکٹر صاحب غریب خانے پر تشریف لائے تو میری تو جیسے عید ہی ہوگئی۔میرے والدین نے کبھی اس سے پہلے مجھے اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ایک ایک کتاب بغور دیکھتے اور آفرین کہتے،کبھی شاباش دیتے اور کبھی کہتے کہ میرا تو دل نہیں چاہتا کہ میں یہاں سے جاؤں۔میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ ان میں سے جو کتاب بھی پسند فرمائیں وہ آپ کی نذر کر دوں گا۔بولے:نہیں تم اتنی محنت کر کے دکانوں سے یہ کتابیں تلاش کر کے لائے ہو، میں کیسے لے لوں، یہ تو گناہ ہے۔پھر میں نے پیش کش کی کہ اچھا، ان میں جو کتابیں چاہییں مستعار لے جائیں۔فرمایا: یہ بھی میرے طریقِ کار کے خلاف ہے، میں دوبارہ آکر یہ کتب دیکھوں گا لیکن ڈاکٹر بلوچ مرحوم جیسے انتہائی مصروف بزرگ کے پاس بھلا اتنا وقت کہاں کہ مجھ جیسے عمومی آدمی کے پاس آکر کتابیں دیکھتے۔

لاہور میں مذاکرہ اندلس کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے ڈاکٹر بلوچ لاہور آئے تو اس موقع پر مرحوم سے جو باتیں ہوئیں ان میں مخدوم محمد معین

ٹھٹوی (ف:۱۱۱٦ھ) کا ذکر بھی آیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ کتاب 'التواری علی باب البخاری تصنیف علامہ قاضی ناصر الدین ابی العباس احمد بن ابی المعالی محمد کا ایک نسخہ میری نظر سے گزرا ہے جس کے پہلے خالی ورق پر مخدوم محمد معین کی مہریں و دستخط ہیں۔ یہ سن کر بس اس قدر مسرور ہوئے کہ فرمایا کہ کل اس ورق کی ایک خوبصورت فوٹو کاپی بنوا کر لاؤ، میرا ایک شاگرد مخدوم صاحب پر تحقیقی مقالہ لکھ رہا ہے، ہم یہ تحریر اس مقالے کا حصہ بنائیں گے۔ بہت بعد میں مرحوم کے انتقال کے بعد وہ مقالہ شائع ہوا تو اس میں اس مقالے کا عکس شائع نہ ہو سکا۔ پھر میں نے اسے اپنے مقالات کے مجموعے 'تذکرہ علماء و مشائخ پاکستان' (۱۲۴٦) میں شائع کیا اور اب یہ میری کتاب 'بہجۃ النظار فی براۃ الابرار' (دفاع حضرت مجدد الف ثانی) مولفہ مخدوم محمد معین کے آخر میں بھی شامل ہے۔

میرے تصوف کی طرف علمی و تحقیقی ذوق کو دیکھ کر جب ڈاکٹر مرحوم نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ہسٹاریکل ریسرچ، اسلام آباد کے ڈائرکٹر تھے مجھے برعظیم پاکستان کی تاریخ تصوف پر کام کرنے کے لیے ایک پروجیکٹ دیا اور باقاعدہ میرے ساتھ معاہدہ کیا لیکن مرحوم کے اس ادارے سے علیحدگی کے بعد کسی بھی سربراہ نے اس کام سے دلچسپی کا اظہار نہ کیا تو میرا بھی حوصلہ جواب دے گیا۔ اس کام کی اہمیت کے پیش نظر مرحوم میرے گھر بھی تشریف لائے تھے، گھر میں مرحوم سے بہت سی علمی باتیں ہوئیں، دیگر تحقیقی و تصنیفی مصروفیات پر استفسار کرتے رہے۔ میں نے سندھ کے حوالے سے زیر نظر کام ان کو دکھائے تو اس قدر مسرور ہوئے کہ پہلے کبھی انھیں اس قدر خوش نہیں دیکھا تھا، وہ امور حسب ذیل تھے:

(۱) بہجۃ النظار فی براۃ الابرار (در دفاع حضرت مجدد الف ثانی) تصنیف مخدوم محمد معین ٹھٹوی

(۲) مناقب مخدومین معظمین (حالات مخدوم شاہ صفی اللہ معصومی و مخدوم محمد ابراہیم ٹھٹوی)

(۳) مناقب مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی تالیف مخدوم عبداللطیف بن مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی

یہ کام دیکھ کر مرحوم نے بہت موثر الفاظ میں فرمایا کہ تم مرتب کرو، ان کی اشاعت کی ذمہ داری میری ہوگی۔

ایک بار مجھ بے بضاعت سے ایسا سوال کیا کہ میں دیر تک اس پر غور کرتا رہا۔ دریافت فرمایا کہ ہماری سندھ پر لکھی جانے والی کتابوں میں پنجاب کے دو بزرگوں کے معارف کا حوالہ ملتا ہے، کیا تمھیں ان کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟ ایک حافظ محمد سعید لاہوری نقشبندی قادری (ف: ۱۱۸۰ھ: ۱۷۵۴ء) اور دوسرے شیخ محمد اشرف قادری شطاری لاہوری (ف: ۱۱۰۸ھ: ۱۶۹۶ء) مجھے ان کے حالات و معارف کی ایک عرصے سے تلاش ہے۔ میں نے یہ نام نوٹ کر لیے اور جب دوسری مرتبہ وہ لاہور آئے تو میں نے خوش خبری سنائی کہ ان کے حالات ہم عصر تذکرے میں موجود ہیں۔ بہت ہی خوشی کا اظہار کیا اور پوچھا کہ کہاں ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت، میرے ذاتی ذخیرۂ علمیہ کی زینت ہیں۔ کہا کہ ابھی چلو اور مجھے دکھاؤ۔ مرحوم میرے گھر پر تشریف لائے۔ اول الذکر شخصیت پر قران السعدین (حالات و معارف شیخ محمد سعید لاہوری و شیخ محمد مسعود پشاوری) مولفہ محمد رفیع پشاوری دکھائی تو چوم کر آنکھوں سے لگا کر فرمانے لگے: یہ بہت اہم ماخذ ہے، اسے جلد ایڈٹ کرو۔ دوسری شخصیت شیخ محمد اشرف لاہوری کی تھی، ان کے احوال و ملفاظات پر ان کے ایک مرید سلیمان بن سعد اللہ ملقب بہ فاضل خان نے ان کے حین حیات ان کے ملفاظات جمع کیے تھے، نام مخطوطہ ہے 'احوال مشائخ کبار'۔ فرمایا کہ اسے تو فوراً مرتب کردو، میں نے کہا کہ کوئی دوسرا نسخہ معلوم نہیں ہے اور یہ بہت کرم خوردہ ہے اور خط شکستہ میں ہے۔ فرمایا: تم شروع کردو اور اپنے ناقابلِ قرأت مقامات نوٹ کرتے جاؤ اور میں ان کے حل میں تمھاری مدد کروں گا۔ تاہم میں مرحوم کی سخت مصروفیات کے باعث اپنی علمی مشکلات کو ان سے حل نہ کروا سکا۔ یہ مخطوطہ میں نے ایڈٹ ضرور کرلیا جسے مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد نے شائع کر دیا۔''

ڈاکٹر صاحب علمی اور تحقیقی کاموں میں دوسروں کی کس کس طرح حوصلہ افزائی کرتے تھے اس کا ذکر جناب محمد ہاشم لغاری نے بھی اپنے مضمون ''ڈاکٹر نبی بخش بلوچ باہمت انسان'' (۱۵) میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے جب اپنے استاد مولوی عبدالکریم لغاری کی کتاب کے لیے ڈاکٹر صاحب سے اسلام آباد میں رابطہ کیا اور گزارش کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب اس کا مقدمہ لکھ دیں تو ڈاکٹر صاحب نے اس پر مقدمہ لکھا۔ بعد میں محمد ہاشم لغاری سے یہ بیان کیا کہ مولوی عبدالکریم لغاری کی کتاب سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنے گاؤں گوٹھ جعفر خان لغاری پر کتاب لکھی۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر اسی طرح سندھ کے ہر گاؤں پر کتاب لکھی جائے تو بہت سا نیا مواد سامنے آئے گا اور ایک اہم ضرورت بھی پوری ہوگی۔ جناب ہاشم لغاری مزید لکھتے ہیں کہ انھوں نے اسلام آباد میں قیام کے دوران غلام محمد بھرگڑی پر سوانحی کتاب لکھنے کا آغاز کیا تھا اور یہ کام ان کے مختلف مقامات پر قیام کے دوران جاری رہا۔ جب ان کا قیام لاڑکانہ میں تھا تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنا کام دکھایا۔ اسے دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے بڑی خوشی کا اظہار فرمایا اور ان کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ کام کی رفتار معلوم کرتے اور کبھی کبھی ان کے گھر آ کر کمپیوٹر پہ کتاب کا معائنہ کرتے ،کام کی رفتار سے آگاہی حاصل کرتے اور ضروری مشورے بھی دیتے۔ اس کام کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کتاب کا مقدمہ لکھا اور جب کتاب شایع ہوئی تو بڑی خوشی کا اظہار فرمایا اور مصنف کو شاباشی بھی دی۔ جب کتاب کی تقریب رونمائی ہوئی تو اس میں بھی ڈاکٹر صاحب نے شرکت کی اور تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ یہ اس صدی کی بڑی کتاب ہے۔ محمد ہاشم لغاری یہ بھی لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ یہ تلقین کرتے تھے کہ علمی اور تحریری کام کو نہ چھوڑیں اور یہ خدمت ہمیشہ کرتے رہیں ڈاکٹر صاحب انھیں یہ بھی کہتے تھے کہ کلھوڑوں اور ٹالپوروں کے زمانے میں آب پاشی پر جو کام ہوا اس موضوع پر ایک تاریخی کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے علمی و تحقیقی کاموں میں حوصلہ افزائی کی عادت کے بارے میں ڈاکٹر محمد ادریس سندھی اپنے مضمون ''ڈاکٹر بلوچ سے وابستہ یادیں'' (۱۶) میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے ماہنامہ 'شریعت' سکھر میں سندھی عالموں کے زیرِ مطالعہ سیرتِ شامیہ کا ایک نادر مخطوطہ کے عنوان سے ایک تحقیقی مضمون لکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بعد از مطالعہ مضمون نگار کو بڑا حوصلہ افزائی والا خط لکھا۔ اس خط میں ڈاکٹر صاحب نے اس مقالے کو

بڑا معیاری مقالہ قرار دیا اور انھیں یہ بھی لکھا کہ ان کی معلومات کے مطابق انھوں نے موجودہ دور میں سندھ کے کسی دوسرے عالم کا ایسا معیاری مقالہ نہیں پڑھا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے مزید یہ لکھا تھا کہ جناب ادریس سومرو کو اپنی صلاحیتیں علمائے سندھ کی عربی دانی اور علمی ادبی اور دینی مصنفات کی تاریخ مرتب کرنے میں صرف کرنی چاہیے اور انھیں نزھۃ الخواطر یا الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند کی طرز پر الثقافۃ الاسلامیۃ فی السّند مرتب کرنی چاہیے۔ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ یہ کتاب پہلے سندھی میں لکھی جائے اور پھر اس کا ترجمہ بھی کیا جائے۔ڈاکٹر صاحب نے حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے لکھا کہ محمد ادریس سومرو اس کام کے لیے پوری طرح اہل ہیں۔مزید یہ بھی لکھا کہ ایک زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے خود اس کام کا ارادہ کیا تھا اور ابتدائی طور پر حوالہ جات اور حالات جمع کرنا بھی شروع کیے تھے۔

مولانا محمد ادریس سومرو کو ڈاکٹر بلوچ مرحوم نے ایک اہم خط مورخہ 3-9-2001 لکھا تھا جس میں مذکورہ بالا موضوع پر علمی رہنمائی کی تھی۔خوش قسمتی سے ہمیں یہ خط جناب ارشد بلوچ کی عنایت سے ملا۔سندھی زبان میں لکھے اس خط کا سلیس اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

> ”آپ کا خط مورخہ 8 جمادی الثانی 1422ھ ملا، پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ سندھ کے عالموں کی علمی خدمات اور مصنفات کی تاریخ مرتب کرنے میں میرے مشورے کو اہمیت دیتے ہیں اور اس کے ساتھ کلی طور پر متفق ہیں۔اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ کی مراد پر نظر ہے اور آپ علمی سلسلے کو بیان کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔یہ کتاب پہلے سندھی میں لکھی جائے بعدازاں اس کا ترجمہ عربی و دیگر زبانوں میں شائع کیا جائے۔تاریخی لحاظ سے اوائلی دور اور دوسرے دور کی حدِ فاصل مخدوم جعفر بوبکائی ہیں۔کام کا آغاز مخدوم جعفر سے کیا جائے یعنی دسویں صدی ہجری سے تکمیل چودھویں صدی ہجری پر کی جائے۔یہی دور اہم ہے اور کام میں آسانی اس طرح ہوگی۔مخدوم محمد جعفر سے قبل کے دور پر کام اس کے بعد کیا جائے کیونکہ اس دور کے اکثر حوالہ جات عالم اسلام میں معلوم اور معروف ہیں اور کتابوں میں ہیں۔البتہ مخدوم محمد جعفر اور ان کے بعد کے عالموں کے حالات اور ان کی

مفصل علمی خدمات سے باہر کے عالم پوری طرح واقف نہیں۔فی الحال مخدوم جعفر سے قبل والے دور کو بطور مقدمہ یا بطور باب اول شامل کتاب کیا جا سکتا ہے:

☆ اگر دسویں صدی سے قبل کے اعیان (شخصیات) کا ذکر کیا جائے تو ان کے صدی وار حالات عربی میں موجود ہیں۔

☆ شہروں کے لحاظ سے بھی اعیان، ٹھٹھہ، نصرپور، سیوہن وغیرہ کی اہمیت ہے۔

☆ مدارس کے لحاظ سے جن شہروں کے مدارس کی اہمیت ہے ان میں ٹھٹھہ، ولھار، چوٹیاری، مٹیاری، نصرپور، ہالا، کھڑا، ٹہ پٹ، دیبل، دربیلا، سیوہن اور دیگر بعد کے ادوار کے مدارس

☆ شخصیات کے لحاظ سے جن علماء کا سلسلہ شاگردوں سے آگے چلا اور جن کے پاس حقیقتاً علم تھا ان میں مخدوم جعفر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ان کے بعد مخدوم محمد ہاشم ،مخدوم محمد حیات اور دونوں کے درمیانی دور میں مخدوم ابوالحسن

☆ علوم کے لحاظ سے فقہ، ترجمۂ قرآن، تفسیر، حدیث، تاریخ، فلسفہ، خصوصاً مخدوم محمد معین ٹھٹوی، مخدوم ابوالحسن اور مخدوم محمد حیات، اسی طرح شعروادب کے لحاظ سے ابواب بندی پر غور کیا جائے۔

☆ سندھی کاتبوں نے جن کتابوں کی کتابت کی اور بڑی علمی خدمت کی، ان کے نام بھی ملتے ہیں۔

بہر حال آپ بہتر انداز سے سوچ سکتے ہیں۔پہلے دور کام کا آغاز وہاں سے کیا جائے جہاں آسانی معلوم ہو۔اللہ آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ کام کو آج ہی ہاتھ میں لے کر آغاز کردیں تاکہ کل تک انتظار نہ کیا جائے۔آپ کا مدرسہ کا مدرس ہونا اس کام میں نیک فال ہے۔کام میں تاخیر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔مجھے اپنے استاد محترم علامہ عبدالعزیز المیمنی کا چشم دید حال معلوم ہے۔آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ عربی کے

صدر تھے ۔اس کے ساتھ انتہائی اہم امور بھی سنبھالے اور معیاری کتابیں بھی تصنیف کیں۔خود مجھے دیکھیں حالانکہ اس قدر معیاری نہیں لیکن کافی ہے اور یہ اس وقت کیا جب انتظامی اور تدریسی ذمہ داریاں بھی مجھ پر تھیں۔ آپ بسم اللہ کریں ۔و اللہ هو المستعان و المعین۔"

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی علمی اور تحقیقی کاموں میں حوصلہ افزائی اور سرپرستی کے حوالے سے جناب محمد عمر چنڈ نے بھی مفید علمی کام انجام دیے ہیں۔انھوں نے راقم الحروف کو مورخہ ۴/ مارچ ۲۰۱۴ءکو اپنے انٹرویو میں درج ذیل مفید معلومات سے آگاہ کیا:

"ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مرحوم طویل عرصے تک بھٹ شاہ کلچرل سینٹر کے اعزازی سیکریٹری بھی رہے۔غالباً ۱۹۵۸ء میں انھوں نے اخبارات میں ایک اشتہار شایع کرایا تھا کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس کے موقع پر شاہ لطیف سے متعلق مضامین بھیجیں۔میں اس زمانے میں ساتویں یا آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور میں نے "شاہ لطیف کے کلام میں عشق حقیقی کا تصور" کے عنوان پر مضمون لکھ کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں روانہ کیا۔ڈاکٹر صاحب نے مضمون ملتے ہی مجھے تحسین آمیز خط لکھا اور یہ بھی کہ بھٹ شاہ میں آئندہ عرس کے موقعے پر آپ اپنا مضمون پڑھیں۔میں عرس کے موقع پر وہاں پہنچا اور پنڈال میں جا کر بیٹھ گیا۔سارا پروگرام ختم ہوگیا لیکن میری آمد کی اطلاع ڈاکٹر صاحب کو نہیں تھی اس لیے اسٹیج سے مجھے نہیں بلایا گیا۔بعد میں یہ مضمون ڈاکٹر صاحب نے شاہ لطیف کے بارے میں بھٹ شاہ سے شایع ہونے والے اگلے رسالے میں شایع کر دیا۔

۱۹۶۸ء میں مَیں ایم اے انگریزی کی تعلیم کی خاطر ڈھاکہ یونیورسٹی پہنچا اور مارچ ۱۹۷۱ء میں ایم اے کی ڈگری لے کر واپس آیا۔ڈاکٹر صاحب جب بھی ڈھاکہ آتے مجھ سے ملتے اور ہم مختلف مقامات پر جاتے ۔پاکستان واپس آکر میں ڈاکٹر صاحب سے ملا جنھوں نے میرا تقرر فیکلٹی آف ایجوکیشن، سندھ یونیورسٹی میں کر دیا۔اسکے بعد میں تیرہ سال

تک برونائی دارالسلام میں رہا اور گزشتہ ۱۶ سال سے نیوزی لینڈ میں ہوں۔اس دوران جب بھی حیدرآباد یا اسلام آباد جانا ہوتا ڈاکٹر صاحب سے ضرور ملاقاتیں ہوتیں اور ان سے خط و کتابت کا تعلق بھی برقرار رہتا۔ڈاکٹر صاحب کو اگر کسی کتاب کی ضرورت ہوتی یا اپنی تحقیق میں کسی طرح کی معلومات درکار ہوتیں تو مجھے لکھتے اور میں حتی المقدور ان کو مطلوبہ معلومات فراہم کرتا تھا مثلاً جب وہ اسلام آباد میں تھے تو مجھے لکھا کہ راندیر(گجرات) کے ایک صاحب نورالدین تھے جو انڈونیشیا گئے اور وہاں تبلیغ اسلام کا بہت کام کیا،ڈاکٹر صاحب کو ان سے متعلق معلومات درکار تھیں۔میں نے یہ معلومات فراہم کیں جس پر ڈاکٹر صاحب نے بڑی خوشی کا اظہار فرمایا تھا۔اسی طرح کی اور بہت سی باتیں ڈاکٹر صاحب اور میرے سندھی اور انگریزی خطوط میں محفوظ ہیں جو شایع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اور ان کے بزرگ پیر صاحب پگارا کے مرید تھے اور میرا تعلق بھی ضلع سنجھورو سے ہے جہاں ۱۹۴۲ء میں انگریزوں نے حُروں پر ملٹری آپریشن کیا اور بڑے مظالم ڈھائے تھے۔ان واقعات کو میں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا۔ایک مرتبہ میرے بھائی نے مجھے حرتحریک اور انگریزوں کے مظالم کے بارے میں ایک کتاب دی جسے پڑھ کر مجھے اس تحریک سے مزید دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے فیصلہ کیا کہ اس تحریک پر مزید تحقیق کروں گا۔ ۱۹۹۲ء میں میں نے ایک ٹیپ رکارڈر کی مدد سے ڈاکٹر صاحب کی اس تحریک کے حوالے سے یادداشتیں ریکارڈ کیں اور بعد میں اسے سندھی زبان میں کتابی شکل میں شایع بھی کرایا۔اس کے بعد میں نے مزید تحقیق کی اور انگریزی میں اس تحریک پر کتاب بہ عنوان:

Brutality of British Empire

لکھی اور حیدرآباد سے شایع بھی کرائی۔اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی ان شاءاللہ جلد شایع ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کے حوالے سے ایک اہم کام انجام دینے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی اور وہ ہے ڈاکٹر صاحب کی انگریزی میں خط وکتابت کا ضخیم مجموعہ

World of work : Predicament of a Scholar

اس کتاب کا قصہ یہ ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب کے سندھی زبان میں خطوط کا مجموعہ زیر اشاعت تھا تو یوسف علی زرداری صاحب کے پاس ان کی انگریزی خط وکتابت کا سارا مواد تھا جسے انھیں ترتیب دینا تھا۔ اس کے بعد یہ مواد ڈاکٹر صاحب نے مجھے فراہم کیا اور میں نے بڑی محنت سے تمام خطوط مکتوب نگاروں کے اعتبار سے ترتیب دیے۔ ان مکتوب نگاروں میں پاک وہند کے اسکالرز بھی تھے اور امریکہ، برطانیہ، جرمنی، اٹلی، فرانس اور کئی دیگر ممالک کے بھی۔ میں نے نہ صرف ان خطوط کو عمدگی سے مرتب کیا بلکہ تمام کتاب خود ہی کمپوزنگ بھی کی۔ اس کتاب کی ابتدا میں طویل مقدمہ بھی لکھا جو دراصل ڈاکٹر صاحب سے کیے گئے طویل انٹرویو پر مبنی تھا جس میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے حالات زندگی مجھے ریکارڈ کرائے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کتاب کو خوبصورت انداز سے انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی سندھ یونیورسٹی نے شایع کیا۔ ڈاکٹر صاحب کتاب کی طباعت کے بعد بہت خوش تھے اور انھوں نے میرا لکھا مقدمہ بھی بہت پسند کیا تھا۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی قانون پسندی کے بعض واقعات

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے اپنی زندگی بڑی محنت، ایمانداری، اصول پسندی اور قانون پسندی سے گزاری۔ آپ نے ہمیشہ اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا اور اپنے آپ کو دوسروں کے لیے ایک مثال بنا کر پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی قانون پسندی کے بعض واقعات مختلف حضرات نے راقم الحروف سے دوران گفتگو بیان کیے۔ ان میں سے تین واقعات کا ذکر ہم یہاں کریں گے:

ا) ایک ملاقات کے دوران مولانا ڈاکٹر محمد ادریس سومرو نے راقم سے دوران گفتگو بیان کیا کہ ایک مرتبہ ڈاکٹر

صاحب اپنی گاڑی میں حیدرآباد سے اپنے گاؤں گوٹھ جعفر خان لغاری کا سفر کر رہے تھےاور گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔اس راستے میں بعض خانہ بدوش بھی مقیم تھے۔اچانک ان کا ایک بچہ روڈ پر آ گیااور گاڑی سے ٹکرا کر جاں بحق ہو گیا۔یہ حادثہ اس بچے کی غفلت اور عدم احتیاط کی وجہ سے ہوا تھا۔ڈاکٹر صاحب نے گاڑی سے اتر کر جب یہ منظر دیکھا تو فوراً انھوں نے نزدیکی پولیس اسٹیشن جانے کا فیصلہ کیا جہاں تھانیدار کے آگے اعتراف کیا کہ خانہ بدوش کا بچہ ان کی گاڑی سے ٹکرا کر جاں بحق ہوا ہےاور قانون کے مطابق وہ اس مسئلے کا حل چاہتے ہیں۔تھانیدار ڈاکٹر صاحب سے مقام سے واقف تھا۔اس نے خانہ بدوشوں کو بلایااور مشورہ دیا کہ بچے کی غفلت کے نتیجے میں جو ہونا تھا ہوا،اب بہتر یہ ہے کہ معاوضہ لے کر معاملے کو ختم کیا جائے۔چنانچہ خانہ بدوش اس پر راضی ہو گئےاور ڈاکٹر صاحب نے مطلوبہ معاوضہ انھیں ادا کیا۔

۲)جناب علی محمد بلوچ ڈاکٹر بلوچ مرحوم کے دوسرے نمبر کے صاحب زادے ہیں(سب سے بڑے ڈاکٹر محمد شریف بلوچ ہیں)۔جناب علی محمد بلوچ بحیثیت سول انجینیر محکمہء زراعت (Irrigation Department)سے وابستہ رہے اور اپنی محنت اور اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر صوبائی سیکریٹری کے عہدے تک پہنچے۔انھوں نے مورخہ 11-11-2012 کو حیدرآباد میں راقم کو ایک انٹرویو دیا تھا جس میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ دوران ملازمت اگر کبھی ان کا تبادلہ کسی مشکل مقام پر ہو جاتا تو انھیں وہاں جا کر تمام مشکل حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔اس حوالے سے جب بھی ڈاکٹر صاحب سے ذکر ہوتا تو وہ یہی مشورہ دیتے کہ تم وہاں ضرور جاؤ اور حالات کا مقابلہ کرو اور کبھی یہ نہ سوچو کہ میں اپنے اثر و رسوخ سے تمہارا تبادلہ کسی آسان مقام پر کرادوں گا۔ڈاکٹر صاحب یہ بھی فرماتے کہ تم وہاں ضرور جاؤ، میں تمہاری خاطر اللہ سے دعا کروں گا لیکن سفارش نہیں کروں گا۔

۳)جناب علی محمد بلوچ نے اسی انٹرویو کے دوران بیان کیا کہ جب ڈاکٹر بلوچ سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے ،اس زمانے میں انھیں یونیورسٹی کی جانب سے ایک گاڑی دی گئی تھی۔اس وقت ڈاکٹر صاحب ہمیشہ اگر گاڑی ذاتی کام کی خاطر استعمال کرتے تو پٹرول اپنی جیب سے ڈلواتے تھے۔کبھی ایسا نہ ہوا کہ ذاتی کام کی خاطر پٹرول یونیورسٹی کا استعمال کیا ہو۔

مالی ایثار کی نادر مثال

ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی بھر جو مال بڑی محنت اور ایمانداری سے کمایا اسے ذاتی ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے مفید اور تعمیری کاموں میں صرف بھی کیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے محسن علامہ آئی آئی قاضی کو زندگی بھر نہیں بھولے اور 2010ء میں سندھ یونیورسٹی کو اپنی جیب سے دس لاکھ روپے دیے۔ یہ رقم دینے کا مقصد یہ تھا کہ یونیورسٹی کی جانب سے ہر سال تین پوزیشن ہولڈر طالب علموں کو علامہ آئی آئی قاضی کے نام پر سونے کے تمغے دیے جائیں۔ اسی طرح کیڈٹ کالج لاڑکانہ کے پرنسپل محمد یوسف شیخ صاحب کو بیس لاکھ روپے کی رقم اس مقصد کی خاطر دی کہ کیڈٹ کالج میں علامہ آئی آئی قاضی کے نام مینار علم قائم کریں۔ مینار علم کیڈٹ کالج میں قائم ہو چکا ہے جسے دیکھنے ڈاکٹر صاحب انتقال سے دو ماہ قبل فروری 2011ء میں لاڑکانہ گئے تھے۔

علمی ایثار کی نادر اور منفرد مثال

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے علمی ایثار کی جو منفرد مثال قائم کی وہ دنیا کے محققین اور مصنفین میں شاید ہی کہیں ملے۔ اس ایثار کی نیت انھوں نے جوانی ہی میں کر لی تھی اور پھر زندگی بھر اس پر عمل کیا۔ انھوں نے جوانی ہی میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی کسی بھی کتاب کے پہلے ایڈیشن کی رائلٹی نہیں لیں گے۔ ڈاکٹر صاحب تمام عمر اپنے اس فیصلے پر قائم رہے۔ یہاں تک بھی ہوا کہ ایک موقع پر انھیں رائلٹی کی مد میں ایک لاکھ کا چیک بھیجا گیا لیکن انھوں نے اسے واپس کر دیا اور مذکورہ ادارے کو مطلع کیا کہ انھوں نے زندگی بھر کسی کتاب کے پہلے ایڈیشن کی رائلٹی نہیں لی ہے اور نہ اب لیں گے۔

علمی کانفرنسوں میں شرکت اور حاصل کردہ اعزازات

ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی میں جن جن بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور انھیں جو جو اعزازات ملے اس کی مکمل تفصیلات حاصل کرنا بہت مشکل ہے البتہ کچھ تفصیل درج ذیل ہے:

جنوبی ایشیا میں پرائمری تعلیم کے موضوع پر UNESCO کی کانفرنس منعقدہ میں پاکستان کی نمائندگی کی۔
RCD کے تحت تہران میں منعقدہ کانفرنس میں پاکستانی دہندہ رکن کی حیثیت سے شرکت کی۔
انقرہ میں منعقدہ مولانا جلال الدین رومی پر سیمینار میں ۱۹۷۳ء میں پاکستان کی نمائندگی کی۔
جن جن ممالک میں علمی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی ان میں فرانس ،آسٹریلیا،فلپائن،امریکہ ،بھارت،انڈونیشیا،ایران،ترکی،بنگلہ دیش شامل ہیں۔
ڈاکٹر صاحب کی اپنی زندگی میں جن جن اعزازات سے نوازا گیا ان کی کچھ تفصیل یہ ہے۔

تمغہء پاکستان1962-1968

پرائڈ آف پرفارمس1979

صدراتی ایوارڈ اعزاز کمال1991

ستارۂ امتیاز2001ء

ہلالِ امتیاز 2011ء

حواشی باب نمبر 10

۱۔ ملاحظہ فرمایئے ''ڈاکٹر نبی بخش بلوچ'' ایک ممتاز معلم، محقق، مؤرخ از قمر عباس یہ انٹرویو روزنامہ جنگ کراچی (سنڈے میگزین) ۲۲ ستمبر ۲۰۰۲ء کو شائع ہوا۔

۲۔ ملاحظہ فرمایئے ''ڈاڪٽر بلوچ منهنجي نظر ۾'' (ڈاکٹر بلوچ میری نظر میں) از محترمہ خدیجہ بلوچ در کتاب ''ڈاڪٽر بلوچ هڪ مثالي عالم'' حصہ سوم، ص: ۱۴۔

۳۔ ایضاً: ص ۱۶۔

۴۔ ایضاً: ص ۱۵۔

۵۔ ایضاً: ص ۱۷۔

۶۔ ایضاً: ص ۱۷

۷۔ ایضاً: ص ۱۸۔

۸۔ ایضاً: ص ۱۸

۹۔ ایضاً: ص ۱۹۔

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً: ص ۲۰۔

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً: ص ۲۱

۱۴۔ ملاحظہ فرمایئے ''منهنجو والد ڈاڪٽر بلوچ'' (میرے والد ڈاکٹر بلوچ) از ڈاکٹر محمد شریف بلوچ در کتاب ''ڈاڪٽر بلوچ هڪ مثالي عالم'' حصہ سوم ص: ۲۱۷۔

۱۵۔ ملاحظہ فرمایئے مضمون از جناب محمد ہاشم لغاری بہ عنوان ڈاڪٽر نبي بخش خان بلوچ_همٿ وارو

انسان (ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ۔ایک باہمت انسان) سہ ماہی مهراڻ جامشورو۔ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ خاص نمبر بابت اپریل تا جون ۲۰۱۲ء ، ص ۹۶

۱۶۔ ملاحظہ فرمایئے مضمون از ڈاکٹر محمد ادریس سندھی بہ عنوان ڊاڪٽر بلوچ سان وابستہ ڪجھ يادون (ڈاکٹر بلوچ سے وابستہ کچھ یادیں)، سہ ماہی مهراڻ جامشورو۔ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ خاص نمبر، بابت اپریل تا جون ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۳

باب نمبر 11

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی
علمی و تحقیقی خدمات کا مختصر تعارف

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ برصغیر پاک و ہند کے وہ منفرد محقق تھے جنھوں نے بیک وقت پانچ زبانوں میں علمی و تحقیقی خدمات انجام دی ہیں۔ یہ پانچ زبانیں سندھی، اردو، انگریزی، عربی اور فارسی ہیں۔ ان زبانوں کے علاوہ ڈاکٹر بلوچ سرائیکی زبان پر بھی کامل دسترس رکھتے تھے اور اس زبان میں ان کی تحریریں ملتی ہیں۔ آپ بلا انقطاع تقریباً ستر سال تک خدمت علمی میں مصروف رہے۔ بلا شبہ بلوچ صاحب کی تحقیقی خدمات تمام اداروں کے کاموں پر بھاری ہیں اور آپ کے کام کو دیکھ کر ماضی کے وہ مسلم علما یاد آجاتے ہیں جن کی کتابوں کے صفحات ان کی زندگی کے دنوں سے زیادہ ہوتے تھے۔ اس باب میں ہم نے ان کی جملہ کتب اور علمی کاموں کی فہرست پیش کی ہے۔ اسکے بعد بلوچ صاحب کے خاص علمی کارناموں کی تفصیلات علیحدہ علیحدہ ابواب میں پیش کی جائیں گی۔ قارئین کی سہولت کی خاطر ہم نے ہر کتاب کا نام قوسین میں اردو میں بھی درج کیا ہے۔ اس باب کے آخر میں ہم نے ڈاکٹر بلوچ کے قلم سے تیار کیے گئے وضاحتی نقشے شامل کیے ہیں۔ ان نقشوں سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی بات کی وضاحت کے لیے بڑی مہارت سے وضاحتی نقشے بھی تیار کرتے تھے جن میں ضروری تفصیلات پیش کی جاتی تھیں۔

سندھی کتب

لوک ادب

1. مداحون ۽ مناجاتون (مدحیں اور مناجاتیں) ، 1959ع، سندھی ادبی بورڈ جامشورو
2. مناقبا (مناقب) ، 1960ع، سندھی ادبی بورڈ جامشورو
3. معجزا (معجزات) ، 1960ع، سندھی ادبی بورڈ جامشورو
4. مولود (مولود) ، 1961ع، سندھی ادبی بورڈ جامشورو
5. ٽيھہ اکريون (پاڱو پھريون) (سی حرفیاں پہلا حصہ) ، 1960ع، سندھی ادبی بورڈ جامشورو
6. ٽيھہ اکريون (پاڱو ٻيو) (سی حرفیاں دوسرا حصہ) 1961ع، سندھی ادبی بورڈ جامشورو
7. هفتا، ڏينهن، راتيون ۽ مهينا (ہفتے، دن، راتیں اور مہینے) ، 1961ع، سندھی ادبی بورڈ جامشورو
8. جنگناما (جنگ نامے) ، 1984ع، سندھی ادبی بورڈ جامشورو
9. واقعاتي بيت (واقعاتی شاعری) ، 1961ع، سندھی ادبی بورڈ جامشورو
10. مناظرا (مناظرے) ، 1961ع، سندھی ادبی بورڈ جامشورو
11. سنڌي سينگار شاعري (سندھی شاعری کا سنگھار) ، 1986ع، سندھی ادبی بورڈ جامشورو
12. پروليون، ڏنون، معمائون ۽ ٻول (چیستان، پہیلیاں، معمّے اور اقوال) ، 1965ع،

سندھی ادبی بورڈ جام شورو

13. ڳجھارتون، 1969ع (پہیلیاں) ، سندھی ادبی بورڈ جام شورو
14. ڏور (تمثیلی شاعری) ، 1970ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو
15. ڳيچ (جلد پھريون ۽ ٻيو ڳڏ) (شادی بیاہ کے گیت۔ دونوں جلدیں یکجا) 1963ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو
16. لوڪ گيت (لوک گیت) ، 1965ع، ، سندھی ادبی بورڈ جام شورو
17. بيت (شاعری) ، 1971ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو
18. نڙ جا بيت (سانوڻ ۽ سندس سائيار ي) (نَے کی شاعری۔ سانون اور اس کی ساتھی ، 1970ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو
19. قافيون (جلد پھريون) (قافیاں جلد اوّل) ، 1985ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو
20. قافيون (جلد ٻيو) (قافیاں جلد دوم)، 1987ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو
21. قافيون (جلد ٽيون) (قافیاں جلد سوم)، 1990ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو
22. سنڌي لوڪ ڪھاڻيون-1 (بادشاھن ۽ راڻين، شھزادن ۽ شھزادين جون ڳالھيون)(سندھی لوک کہانیاں ا۔ بادشاہوں اور رانیوں، شہزادوں اور شہزادیوں کی باتیں) 1987ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو
23. سنڌي لوڪ ڪھاڻيون-2 (بادشاھن، وزيرن ۽ سوداگرن جون ڳالھيون) (سندھی لوک کہانیاں ۲۔ بادشاہوں، وزیروں اور سوداگروں کی باتیں) ، 1977ع ، سندھی ادبی بورڈ جام شورو
24. سنڌي لوڪ ڪھاڻيون-3 (پرين، ديون، جادوگرن، ڏائڻين ۽ نجومين جون ڳالھيون)(سندھی لوک کہانیاں ۳۔ پریوں، دیووں، جادوگروں، ڈائنوں اور نجومیوں کی باتیں) ، 1987ع ، سندھی ادبی بورڈ جام شورو

34. مشهور سنڌي قصا: سنڌ جا عشقيه داستان-4، سسئي پنهون (مشہور سندھی قصے: سندھ کی عشقیہ داستانیں ۴۔ سسی پنہون)، 1964ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو

35. مشهور سنڌي قصا: سنڌ جا عشقيه داستان-5، مومل راڻو (مشہور سندھی قصے: سندھ کی عشقیہ داستانیں ۵۔ مومل رانو)، 1975ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو

36. مشهور سنڌي قصا: سنڌ جا عشقيه داستان-6، سورٺ راءِ ڏياچ ۽ هير رانجهو (مشہور سندھی قصے: سندھ کی عشقیہ داستانیں ٦۔ سورٹھ رائے ڈیاچ اور ہیر رانجھا)، 1976ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو

37. مشهور سنڌي قصا: سنڌ جي حب الوطني جو داستان، عمر مارئي (مشہور سندھی قصے: سندھ کی حب الوطنی کی داستان، عمر ماروی)، 1976ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو

38. مشهور سنڌي قصا: سنڌ جا عشقيه داستان-8، ڏوڏو چنيسر (مشہور سندھی قصے: سندھ کی عشقیہ داستانیں ۸۔ ڈوڈو چنیسر)، 1969ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو

39. سنڌ جي سورهيائي ۽ هنرمنديءَ جو داستان، مورڙو ۽ مانگر مڇ (سندھ کی بہادری اور ہنرمندی کی داستان، مورڑو اور مگرمچھ)، 1967ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو

40. مشهور سنڌي قصا: ٻاهريان قصا ۽ عشقيه داستان-7 (مشہور سندھی قصے ۷: بیرون سندھ کے قصے اور عشقیہ داستانیں)، 1964ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو

41. سنڌي سونهن، رسم رواج ۽ شادي وهانءُ جا گيت (شگون، رواج اور شادی بیاہ کی رسمیں)، 1978ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو

42. سنڌي ٻوليءَ ۾ شاعري (سندھی ہنر شاعری)، 1991ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو

ان ۴۲ جلدوں کے علاوہ بلوچ صاحب کی درج ذیل کتب بھی لوک ادب میں شامل کی جا سکتی ہیں:

1-لاکو ڦُلاڻي (لاکھو پھلانی) :1958ع، سندھی مجلس شعبہ سندھی، سندھ یونیورسٹی حیدرآباد

2-ھر گُنيو : (مؤلف: آخوند عبدالرحیم وفا عباسی: مقدمہ او ایڈیٹنگ: ڈاکٹر نبی بخش بلوچ) 1993ع ، سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد

سندھی اساسی (کلاسیکی) شعراء کے کلام پر تحقیق

اس سلسلے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب نے درج ذیل سندھی کلاسیکی شعرا کا کلام بڑی محنت سے جمع کیا اور تدوین وتحشیہ کے بعد شائع کرایا:

1. قاضي قادن جو رسالو (قاضی قادن کا رسالہ)، 1999ع، انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی، سندھ یونیورسٹی، جامشورو
2. شاھہ لطف الله قادريءَ جو ڪلام (شاہ لطف اللہ قادری کا کلام)، انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی، سندھ یونیورسٹی، جامشورو 1968ع
3. مبين شاه عنايت جو ڪلام (مبین شاہ عنایت کا کلام)، 1963ع، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد
4. خليفي نبي بخش صاحب جو رسالو (خلیفہ نبی بخش کا رسالہ)، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد، 1966ع
5. شاھہ شريف ٻاڏائيءَ جو رسالو (شاہ شریف بھاڈائی کا رسالہ)، انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی، سندھ یونیورسٹی، جامشورو 1972ع،

6. راڳنامو: صوفي صادق فقير سومرو(راگنامہ:صوفی صادق فقیر سومرو)، 1981ع ،شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ
7. رسالو غلام محمد خانزئيءَ جو(رسالہ غلام محمد خانزئی)، 1985ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ
8. ڪليات حمل(کلیات حمل)،سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد، 1953ع،
9. ڪلام فقير نواب ولي محمد لغاري(کلام نواب فقیر ولی محمد لغاری)،1968ع ،سندھی ادبی بورڈ،حیدرآباد
10. ڪليات سانگي(کلیاتِ سانگی)، 1969ع،سندھی ادبی بورڈ،حیدرآباد
11. سيف الملوڪ عرف سيفلنامو: مولوي لطف عليءَ جي سرائيڪي (سیف الملوک عرف سیفل نامہ:مولوی لطف علی کی سرائیکی شاعری)، 1960ع، سندھی ادبی بورڈ،حیدرآباد
12 خليفي غلام نبي جو رسالو(رسالہ خلیفہ غلام نبی):2011ع - محرہسٹاریکل سوسائٹی سانگھڑ

لغت نویسی

1. جامع سنڌي لغات جلد پهريون(جامع سندھی لغات جلد اوّل) 1960ع،سندھی ادبی بورڈ،حیدرآباد
2. جامع سنڌي لغات جلد ٻيو (جامع سندھی لغات جلد دوم) 1981ع، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد
3. جامع سنڌي لغات جلد ٽيون(جامع سندھی لغات جلد سوم) 1960ع، سندھی ادبی

بورڈ، حیدرآباد

4. جامع سنڌي لغات جلد چوٿون (جامع سندھی لغات جلد چہارم) 1985ع سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد

5. جامع سنڌي لغات جلد پنجون (جامع سندھی لغات جلد پنجم) 1988ع سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد

6. سنڌي اردو لغت (سندھی اردو لغت: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے اشتراک سے) 1959ع سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد

7. نئين جامع سنڌي لغات جلد پهريون (نئی جامع سندھی لغات جلد اول) 2004ع سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد

8. نئين جامع سنڌي لغات جلد ٻيو (نئی جامع سندھی لغات جلد سوم) 2005ع، سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد

9. نئين جامع سنڌي لغات جلد ٽيون (نئی جامع سندھی لغات جلد سوم) 2007ع، سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد

10. اردو سنڌي لغت (اردو سندھی لغت: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے اشتراک اور معاونت سے): 1960ع، 1989ع، انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی، سندھ یونیورسٹی، جام شورو

11. هڪ جلدي سنڌي لغت (ایک جلدی سندھی لغت): 1998ع، سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد

12. جواهر لغات اڪيچار سنڌي (جواہر سندھی اکیچار مولفہ اخوند عبدالرحیم عباسی، تدوین ڈاکٹر نبی بخش بلوچ) سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد

13. فرهنگ قوام فاروقي (فرہنگ قوام فاروقی (مطالعہ)

14. شاهه جي رسالي جي لغت ڏکيو ٿي (رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی لغت

بعنوان ''روشنی'' 2002ء، سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد

تاریخِ سندھ پر تحقیقات

1. تاريخ معصومي فارسی متن کا سندھی ترجمہ: مخدوم امیر احمد، تحقیق، وضاحتی حواشی اور مقدمہ: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، 1953ء، سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد
2. فتح نامه سنڌ عرف چچنامو (فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ) فارسی متن کا سندھی ترجمہ: مخدوم امیر احمد، تحقیق، وضاحتی حواشی اور مقدمہ: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، 1954ء، سندھی ادبی بورڈ
3. تحفة الکرام، فارسی متن کا سندھی ترجمہ: مخدوم امیر احمد، تحقیق، وضاحتی حواشی اور مقدمہ: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، 1957ء، سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد
4. سومرن جو دور (سومروں کا دور)، 1980ء، سندھی ادبی بورڈ جامشورو

سندھی زبان، ادب اور موسیقی پر تحقیقی کتب

1. سنڌي ٻوليءَ ۽ ادب جي تاريخ (سندھی زبان و ادب کی تاریخ)، اشاعت پہلی 1962ء، اشاعت دوم 1980ء، اشاعت سوم و چہارم مع اضافات 1990ء، 1999ء (پاکستان اسٹڈی سینٹر سندھ یونیورسٹی جامشورو)
2. سنڌي موسيقيءَ جي مختصر تاريخ (سندھی موسیقی کی مختصر تاریخ)، 1978ء، شاہ عبداللطیف بھٹ شاہ ثقافتی مرکز، بھٹ شاہ
3. سنڌي صورتخطي ۽ خطاطي (سندھی رسم الخط اور خطاطی)، 1992ء، سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد
4. سنڌي ٻوليءَ جو آڳاٽو منظوم ذخيرو (سندھی زبان کا اوائلی منظوم ذخیرہ)، 1993ء، سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد

5. علم موسيقي: شاعر رمضان واڍو (علم موسیقی: شاعر رمضان واڈھو) ، 2006ع، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد

متفرق موضوعات پر کتب

1. سپ رنگ (سب رنگ)، 1968ع، مہران آرٹس کونسل حیدرآباد
2. سنڌ جي مڇي-مٺي جي مڇيءَ جو مطالعو (سندھ کی مچھلی: میٹھے پانی کی مچھلی کا مطالعہ)، 1993ع ، سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد
3. سنڌ جي مڇي-کاري جي مڇيءَ جو مطالعو (سندھ کی مچھلی: کھارے پانی کی مچھلی کا مطالعہ)، 1995ع، سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد
4. اسان جو ڳوٺ: جعفر خان لغاري (ہمارا گاؤں: جعفر خان لغاری)، 1999ع ، خلیل کتاب گھر خیرپور میرس
5. رهاڻ هيرن کاڻ جلد پهريون (ہیروں کی کان جلد اول)، 2000ع، خلیل کتاب گھر خیرپور میرس
6. رهاڻ هيرن کاڻ جلد ٻيو (ہیروں کی کان جلد دوم)، 2001ع، نیوفیلڈز پبلی کیشنز حیدرآباد
7. رهاڻ هيرن کاڻ جلد ٽيون (ہیروں کی کان جلد سوم)، 2002ع، مہران اکیڈمی شکارپور
8. رهاڻ هيرن کاڻ جلد چوٿون (ہیروں کی کان جلد چہارم)، 2003ع، نیوفیلڈز پبلی کیشنز حیدرآباد
9. رهاڻ هيرن کاڻ جلد پنجون (ہیروں کی کان جلد پنجم)، 2003ع، سندھی ساہت گھر حیدرآباد
10. رهاڻ هيرن کاڻ جلد ڇهون (ہیروں کی کان جلد ششم) 2005ع، مہران اکیڈمی شکارپور

11. رهاڻ هيرن ڪاڻ جلد ستون (ہیروں کی کان جلد ہفتم) 2007ع، سندھی ادبی بورڈ، جام شورو
12. رهاڻ هيرن ڪاڻ جلد اٺون (ہیروں کی کان جلد ہشتم) 2008ع، انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی، سندھ یونیورسٹی، جام شورو
13. رهاڻ هيرن ڪاڻ جلد نائون (ہیروں کی کان جلد نہم)، 2009ع، مانک موتی تنظیم حیدرآباد
14. رهاڻ هيرن ڪاڻ جلد ڏهون (ہیروں کی کان جلد دہم)، 2010ع، انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی، سندھ یونیورسٹی، جام شورو
15. رهاڻ هيرن ڪاڻ ڏهه جلد ٻن جلدن ۾ (ہیروں کی کان۔ دس جلدیں یکجا دو جلدوں میں)، 2012ع ، محکمہ ثقافت حکومت سندھ
16. گڏھ (گدھا۔ مختصر کتابچہ): 1946ع

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے متعلق تحقیقات

(الف) شاہ جو رسالو یعنی کلام شاہ عبداللطیف بھٹائی کے تحقیقی ایڈیشن کی درج ذیل جلدیں شاہ عبداللطیف بھٹ شاہ ثقافتی مرکز سے درج ذیل سنین میں ہوئیں:

1. شاهَ جو رسالو (جلد اول) 1989ع
2. شاهه جو رسالو (جلد دوم) 1992ع
3. شاهه جو رسالو (جلد سوم) 1994ع
4. شاهه جو رسالو (جلد چہارم) 1997ع
5. شاهه جو رسالو (جلد پنجم) 1997ع
6. شاهه جو رسالو (جلد ششم) 1995ع
7. شاهه جو رسالو (جلد ہفتم) 1998ع

8. شاہ جو رسالو (شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کا مکمل متن: جلد ہشتم اور نہم)، 1999ع

9. شاہ جو رسالو (رسالے کا کلام: جلد دہم)، 1996ع،

نوٹ: رسالے کا کلام سے مراد وہ کلام ہے جو ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحقیق کے مطابق شاہ عبداللطیف بھٹائی کا نہیں بلکہ دیگر شعراء کا ہے لیکن یہ کلام شاہ جو رسالو کے مختلف نسخوں میں پایا گیا تھا۔ اسی وجہ سے اس کلام کو ایک علیحدہ جلد میں یکجا شائع کیا گیا۔ [illegible]

10. شاہ جو رسالو (مکمل کلام مع مختصر حواشی ایک جلد میں)، 2009ع محکمہ ثقافت و سیاحت حکومت سندھ، اشاعت دوم منخانب سندھیکا اکیڈمی کراچی 2012ع [illegible]

(ب) شاہ جو رسالو سے متعلق مزید تحقیقی کام

1. شاہ جي رسالي جا سرچشما جلد پهريون (شاہ جو رسالو کے سرچشمے جلد اوّل) 1972ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

2. شاہ جي رسالي جي ترتيب (شاہ جو رسالو کی ترتیب) 1974ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

3. شاہ جو رسالو: برٽش ميوزيم ۾ محفوظ قلمي نسخن تي آڌاريل (شاہ جو رسالو: برٹش میوزیم میں محفوظ قلمی نسخوں کی بنا پر) 1969ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

4. شاہ جو رسالو: سرڪلياڻ سان شروع ٿيندڙ قلمي نسخن سان ڀيٽي تيار ڪيل (شاہ جو رسالو: سرکلیان سے شروع ہونے والے قلمی نسخوں کے باہمی مقابلے کے بعد تیار کردہ) 1974ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ)

5. شاہ جو رسالو: ڏهن قلمي نسخن تي (آڌاريل سُر سسئي سان شروع ٿيندڙ (شاہ جو رسالو: سُر سسی سے شروع ہونے والے) دس قلمی نسخوں کی بنا پر تیار کردہ۔

1977ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

6. شاھ عبداللطيف: سوانح، رسالي ۽ راڳ بابت تحقيقي مضمون(شاہ عبداللطیف: سوانح، رسالے اور راگوں سے متعلق تحقیقی مضامین)، 1990ع، مہران اکیڈمی شکارپور

7. لطائف لطيفي: فارسی متن از مصنف: میر عبدالحسین سانگی، تدوین وترتیب: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ)، 1967ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

8. پنج گنج:مصنف قادر بخش بیدل: مقدمہ::ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ 1976ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

9. احوال شاھ عبداللطيف ڀٽائي (احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی، مصنف: مرزا قلیچ بیگ، مقدمہ وترتیب نواز: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) 1972ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

(ت) مزید کتب بابت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ:

درج ذیل کتب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی زیر نگرانی وزیر رہنمائی مرتب اور شایع ہوئیں

شاھ جي رسالي ۾ اسلامي اقدار (رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی میں اسلامی اقدار)1967ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

شاھ عبداللطيف ڀٽائيءَ جي ڪلام ۾ اخلاق ۽ ڪردار جو معيار (کلامِ شاہ عبداللطیف بھٹائی میں اخلاق وکردار کا معیار) 1968ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

3- شاھ عبداللطيف ڀٽائي، سنڌي ٻوليءَ جو معمار (شاہ عبداللطیف بھٹائی۔سندھی زبان کے معمار)،1969ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

4. سُر ڪلياڻ جو مطالعو (سُر کلیان کا مطالعہ۔ترتیب) 1970ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

5. سُر جمن جو مطالعو (سُر جمن کا مطالعہ۔ترتیب) 1971ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ
6. سُر کنيات جو مطالعو (سُر کھنبات کا مطالعہ۔ترتیب) 1972ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ
7. سُر سريراڳ جو مطالعو (سُر سریراگ کا مطالعہ۔ترتیب)1973ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ
8. سُر سامونڊيءَ جو مطالعو (سُر سمندری کا مطالعہ۔ترتیب) 1974ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ
9. سُر سهڻيءَ جو مطالعو: (سُر سھنی کا مطالعہ۔ترتیب)1975ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ
10. سُر سسئي آبريءَ جو مطالعو (سُر سسی آبری کا مطالعہ۔ترتیب) 1976ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ
11. سُر معذوريءَ جو مطالعو (سُر معذوری کا مطالعہ۔ترتیب) 1977ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ
12. لطيف سالگرهه مخزن 1-2: (ترتيب) 1960ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ
13. لطيف سالگرهه مخزن 3: (ترتيب) 1961ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ
14. لطيف سالگرهه مخزن 4-5: (ترتيب) 1964ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ
15. لطيف سالگرهه مخزن 6-7-8: (ترتيب) 1967ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی

مرکز بھٹ شاہ

16۔ لطیف سالگرہ مخزن 9: (ترتیب) 1968ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

17۔ لطیف سالگرہ مخزن 10: (ترتیب) 1960ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

18۔ لطیف سالگرہ مخزن11-12: (ترتیب) 1960ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

19۔ لطیف سالگرہ مخزن 12-13: (ترتیب) 1960ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

20۔ لطیف سالگرہ مخزن 14-15: (ترتیب) 1960ع، شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ

فارسی کتب (تاریخ) تدوین وتحشیہ

1۔ دیوان غلام (فارسی) سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد، 1959ء۔

2۔ فتح نامۂ سندھ (عربوں کی فتح سندھ سے متعلق مستند ماخذ) قومی کمیشن برائے تاریخ وثقافت، اسلام آباد، 1982ء

3۔ بیگلارنامہ (سندھ کی تاریخ جسے عہدِ مغلیہ کے ابتدائی زمانے میں لکھا گیا)۔ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد، 1980ء۔

4۔ تاریخِ طاھری (سندھ کی تاریخ جسے مغلیہ عہد کے دوران لکھا گیا) سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد 1964ء

5۔ لبِّ تاریخِ سندھ (سندھ کی تاریخ جسے عہدِ برطانیہ کے دوران لکھا گیا) سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد، 1959ء۔

6- حاصل النہج (فارسی متن از مخدوم محمد جعفر بوبکائی، تدوین و انگریزی مقدمہ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ)، 1969ع، سندھ یونیورسٹی جام شورو

7- تاریخ بلوچی (فارسی متن از عبدالمجید جوکھیو، اردو ترجمہ از خضر نوشاہی، مقدمہ: ڈاکٹر نبی بخش بلوچ) 1996ع، کلھوڑا سیمینار کمیٹی، کراچی

8 تکملۃ التکملہ (سندھی) 2007ع، آرٹس فیکلٹی سندھ یونیورسٹی جام شورو

9- جامع الکلام فی منافع الانام (بارھویں صدی ہجری میں ٹھٹہ کے علما کی عربی فارسی میں خط و کتابت)، تالیف: شیخ عبداللہ بن محمد السندھی، تحقیق و تنقیح: ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، 2006ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو

عربی کتب

۱۔ نتف من شعر ابو عطاء السندی (تحقیق و تدوین) سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد 1961

۲۔ غرّۃ الزیجات (تدوین، تحقیق، تحشیہ)، (علم فلکیات پر سنسکرت کتاب کا عربی ترجمہ۔ سنسکرت سے عربی ترجمہ ابوریحان البیرونی نے کیا تھا)، سندھ یونیورسٹی، 1973

اردو کتب (تدوین، تالیف، ترتیب)

۱۔ دیوانِ صابر (تدوین و تحشیہ)، مرکزی اردو بورڈ لاہور 1984ء۔

۲۔ دیوانِ ماتم (تدوین و تحشیہ)، سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد 1990ء۔

۳۔ طلبہ اور تعلیم (قائداعظم کے بیانات)، وزارتِ تعلیم، اسلام آباد، 1976ء۔

۴۔ سندھ میں اردو شاعری (تحقیق)، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، 1977ء، مکرر اشاعت از محکمہ ثقافت حکومت سندھ 2012

۵۔ مولانا آزاد سبحانی (سوانح)، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 1989

٦۔ گلشنِ اردو مرتبہ محمد راشد شیخ۔ یہ کتاب بلوچ صاحب کے اردو مقالات' خطبات و دیگر تحریروں کا معلومات افزا مجموعہ ہے۔

۷۔ خطوط ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مرتبہ : محمد راشد شیخ، محکمہ ثقافت حکومت سندھ کراچی، بلوچ صاحب کے اردو میں لکھے گئے خطوط کا مجموعہ مرتبہ راقم ۲۰۱۲ میں محکمہ ثقافت حکومت سندھ کراچی سے شایع ہو چکا ہے۔ اس مجموعے کے مکتوب الیہان میں علامہ عبدالعزیز میمن، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، خواجہ عبدالوحید، ممتاز حسن، سیّد انور حسین نفیس الحسینی (نفیس رقم)، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، ڈاکٹر محمد باقر، مشفق خواجہ، الطاف حسن قریشی، محمد راشد شیخ و دیگر حضرات شامل ہیں۔

اسلامی تمدن کی سو کتب Great Books of Islamic Civilization

اس عظیم الشان علمی منصوبے کا بنیادی خاکہ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے تیار کیا تھا۔ اس کے بعد متعلقہ کتب کے قلمی اور مطبوعہ نسخے حاصل کیے اور دنیا بھر کے متعلقہ موضوع کے ماہرین اور عالموں سے رابطہ کر کے ان سے تراجم کرائے اور ان پر قیمتی مقدمے لکھے۔ اس سلسلے کی درج ذیل کتب بڑی اہمیت کی حامل ہیں:

1. كتاب الجبر و المقابلہ: الخوارزمي (انگریزی ترجمہ: ڈاکٹر آئدین سائلی، مقدمہ: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) 1989ع نیشنل ہجرہ کونسل، اسلام آباد
2. كتاب الجماهر في معرفة الجواهر: البيروني (انگریزی ترجمہ: حکیم محمد سعید، نظر ثانی و مقدمہ: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ)، 1988ع نیشنل ہجرہ کونسل، اسلام آباد
3. كتاب الحِيَل: بنو موسى (انگریزی ترجمہ: ڈاکٹر آئدین سائلی، مقدمہ: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) 1989ع نیشنل ہجرہ کونسل، اسلام آباد
4. الجامع بين العلم و العمل النافع في صناعة الحِيَل: الجزري (انگریزی ترجمہ: ڈاکٹر آئدین سائلی، مقدمہ: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) 1989ع نیشنل ہجرہ کونسل، اسلام آباد

ان کے علاوہ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے ادارہ چھوڑتے وقت نو کتب اشاعت کے لیے تیار کر لی تھیں

سندھ کے علما کی کتب

مصلح المفتاح: (یعنی دائرہ والوں کی سندھی) تصنیف: سید علی محمد شاہ، تحقیق، تصحیح، مقدمہ: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، 1970ع،

خزانة المعرفة: (ملفوظات پیر صبغۃ اللہ شاہ راشدیؒ) تالیف: پیر سائیں علی گوہر شاہ اصغر، مقدمہ: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، 1411ھ، جمعیت علماءِ سکندریہ، درگاہ شریف پیر جو گوٹھ

تعلیم سے متعلق تحقیقی کتب

۱۔ **نهج التعلّم**

طریقۂ تعلیم پر قدیم ترین کتاب جو سندھ کے عالم جعفر بوبکائی نے 959ھ میں عربی زبان میں تصنیف فرمائی۔ 1994ء میں اسے بلوچ صاحب نے تدوین و تحشیہ کے بعد سندھ یونیورسٹی سے شائع کرایا

(2)Education Based on Islamic Values, University of Sindh, 2000

(3)National System of Education and Education of Teacher, Larkana Education Society 2003

(4)Teacher Education in the Muslim Society, A Paper Contributed at The First World Conference on Muslim Education,Makkah, Saudi Arabia, 1977

انسائیکلوپیڈیا کے لیے مقالات

(1)Articles of **Baluchistan** and **Sindh** in the latest Edition of Encyclopaedia Brittanica.

(2)Article on **Kandabil** (Gandara in Baluchistan) in the Encyclopaedia of Islam (New Edition).

انگریزی کتب

1. **A National System of Education and Education of Teachers:** Ph.D Thesis 1949, Columbia University, New York, Published by Sind Institute of Policy studies, Larkana (2003).
2. **Bilal: An Esteemed Child of Liberty** (1949).
3. **Arts and Crafts of the Lower Indus Valley:** Mehran Arts Council, Hyderabad (1964).
4. **The Traditional Arts and Crafts of Hyderabad Region:** Mehran Arts Council, Hyderabad, Pakistan (1966).
5. **The Musical Instruments of Sindh:** Mehran Arts Council, Hyderabad, Pakistan (1967).
6. **Spanish Cante Jondo: Its origin in Sindhi Music By Aziz Baloch;** English Translation & one chapter addition by Dr. N.A

Baloch (1968).

7. **Kitab Hasil-al-Nahj':** The earliest work on Education in Sub-continent in Persian, Authored by Makhdoom Jaffar-al Bubakani District Dadu. Discovered and edited with a chapter wise summary in English by Dr. N.A. Baloch, Institute of Education, University of Sindh (1969).
8. **Education in Sindh Before the British Conquest and the Educational policies of the British Government,** Sindh University Press (1971).
9. **The Education Policy: Implications and implementation** (1972).
10. **Development of Music in Sindh:** Sindh University Press, Hyderabad (1973).
11. **The Historical Sindh Era:** Monograph: (1975).
12. **Curriculum And Teachers Education:** The volume on Muslim Education, First World Education Conference, Makkah, 1977. Edited by N.A Baloch jointly with M.H Al-Affendi, published by Hodder and Stoughton, King Abdul-Aziz University, Jiddah, Saudi Arabia (1980).
13. **Seminar on the Documentation of Current History of Pakistan:** Proceedings and Recommendations 1947-80, National

Institute of Historical and Cultural Research(NIHCR), Islamabad (1980).

14. **Advent of Islam in Indonesia:** NIHCR, Islamabad (1980).
15. **World of Islam Today:** Proceedings, Recommendations and Papers of the National Hijra Council on History and Culture, July 1980, NIHCR, Islamabad (1981).
16. **Pakistan: A comprehensive Bibliography of Books and Government Publications edited with annotations 1947-80:** Institute of History, Culture and Civilization, Islamic University Islamabad (1981).
17. **Knowledge for What?** Edited proceedings and papers of the Hijra Seminar on Islamization of Knowledge, held on 7, 8, 9 Rabi' al Awal 1402 H/ 4-6 Jan: 1982, Institute of Education, Islamic University Islamabad (1982).
18. **Fathnama-i-Sindh:** Persian text with comprehensive introduction in English, Islamabad, Institute of Islamic History, Culture and Civilization (1982).
19. **Beruni's Geodical Experiment on Nandana Fort: District Jhelum. A Monograph:** Islamabad (1983).
20. **Muslim Luminaries: Leaders of Religious Intellectual and Political Revival in South Asia. (711-1206 A.D.),** National Hijra

Council, Islamabad, (1988).

21. **Great Books of Islamic Civilization:** National Hijra Council, Islamabad (1989).

22. **Boats in the Indus Delta and on the Coastline of Sindh:Development In Historical Perspective.** Department of Culture and Tourism, Govt of Sindh, Karachi (1990).

23. **The Educator Speaks: Thoughts of Allama I.I Kazi,** Sindh University Press Hyderabad, Sindh (1989).

24. **I.I Kazi: Reflections on Evolution;** Allama I.I Kazi Memorial Society, Hyderabad, Sindh (1992).

25. **Lands of Pakistan: (Perspectives, historical and cultural),** El. Mashriqi Foundation, Islamabad (1995).

26. **Sindh: Studies in History:** A Preliminary Version, Kalhora Seminar Committee, Karachi, (1996).

27. **Islamabad: The Picturesque Capital of Pakistan,** Institue of Islamic History, Culture and Civilization, Islamic University Isamabad,1982.

28. **Allama I.I Kazi: Unpublished Speeches & Writings,** Allama I.I Kazi Chair Publication, University of Sindh (1999).

29. **Education Based on Islamic Values, Imperatives and Implications:** Pakistan Study Centre, University of Sindh,

Jamshoro (2000).

30. **A Programme of Teacher Education for the New State of Pakistan:** Published in parts, and based on his Ph.D. thesis, University of Sindh Educational Journal (1949).
31. **Sindh Studies Historical:** Pakistan Study Centre, University of Sindh, Jamshoro (2003).
32. **Sindh Studies Cultural:** Pakistan Study Centre, University of Sindh, Jamshoro (2005).
33. **World of Work: Predicament of a scholar** Edited by Prof. Muhammad Umar Chand, Institute of Sindhology (2007).
34. **North-West Frontiers of Pakistan and other avenues of Historical Writings:** Pakistan Study Centre, University of Sindh, Jamshoro (2009).
35. **Quranic Concept of Book that Guides:** Mission unto Light International, Published by Professor Muhammad Yusuf Shaikh, Larkana (2010).
36. **Life and Thought of Shah Abdul Latif Bhittai:** based on commentary of Shah Jo Risalo- Poetic Compendium of Shah Latif 's Ten Volumes. Translated in English by Gul Muhammad Umrani. Published by Culture Department Government of Sindh, (2010).

37. **Searching in to Sophia:** Compiled and edited by Prof. Muhammad Yusuf Shaikh, Mr. Books, Islamabad (2010).
38. **The Concepts and Criteria Underlined in the Holy Quran for the 'Book' that guides and educates:** Allama I.I. Kazi Memorial Society, University of Sindh, Elas Kazi Campus, Hyderabad (1991).
39. **Votes for Women, Religion and secular Dichotomy, and other unpublished speachs and writings:** Allama I.I. Kazi Memorial Society, University of Sindh, Elas Kazi Campus, Hyderabad (1999).
40. **Some Aspects of Music Inheritance of Iran, Persian and Turkey:** University of Sindh Press, Hyderabad (1997).
41. **Paper presented at the conference on "Evolution of Political Thought in the Muslim World":** Bahauddin Zakaria University, Multan (1981).
42. **Measurement of Space and Time in the Lower Indus Valley of Sindh:** a paper presented at the Science Conference, Islamabad (1979).
43. **Teacher Education in the Muslim Society:** A paper contributed at the First World Conference on Muslim Education, Makkah, Saudi Arabia (1977).

44. **Folk Literature of Pakistan:** A general survey read at the Pakistan Folklore Seminar, Dacca (1968).
45. **A Survey of Traditional Culture of Pakistan and the Impact of Modern Development on Cultural Tradition:** A field study prepared for UNESCO (1956).
46. **In Search of the Indus Culture Sites in Sind:** The paper read at International Symposium on Moenjodaro, 23-25 Feb, (1973).
47. **Administration of Sindh Under the Calliphate:** Quarterly Journal of the Pakistan Historical Society, July-December, (1998).
48. **Early Advent and Consolidation of Islam in the Lands of Pakistan:** "Aspects of Islamic Studies" International Congress, London 5-15, April (1976).
49. **Historical Writings on Pakistani Tradition and Progress:** A paper presented at the Congress of Pakistan History and Culture, University of Islamabad, April (1973).
50. **Higher Education in Pakistan:** A paper published in Encyclopaedia of Higher Education, USA.

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کے سندھ کی تاریخ سے متعلق مقالات کا مجموعہ

Sindh Studies Historical

اور اس کے مشمولات:

1 The Perspective

2 The Historical Sindh Era

3 Fathnamah-i-Sindh

4 The Most Probable Site of Debal:
The Famous Historical Port of Sindh

5 The Probable Date of the First Arab
Expedition to India

6 Sultan Jalal al-Din Khwarizmshah in Sindh
(1223-24 A.D)

7 Eclipse of the Soomaras

8 The Burial Place of Sultan Muhammad b. Tughlaq

9 Chronology of the Samma Rulers

10 The Origin of Thatta

11 The Tarikh Tabaqat-i-Bahadurshahi

12 The Tarikh-i-Tahiri

13 The Beglar Graveyard

14 A Farman of Abu al-Baqa Amirkhan Emperor
Shah jehan's Governor of Thatta

15 The Last of the kalhora Rulers of Sindh Abdul Nabi and His Descendants

16 The Foundation of Talpur Power in Sindh

17 Antiquity of Karachi

18 Foundation of Runni Kote

19 Lubb-e-Tarikh-e-Sindh

Sindh Studies Cultural

اوراس کے مشمولات:

1 In Search of the Indus Culture Sites

2 Measurement of Space and Time in the Lower Indus Valley of Sindh

3 Irrigation Technology in the Indus Basin
Development of the Sindhian wheel

4 Traditional Arts and Crafts.

5. The Dye Yielding "Kandala' Tree.
6. A Survey of Folk Lore.
7. The Great Music Tradition:Sindhian Melodies and Cante Jondo of Spain.
8. Boats on the Indus and the Coastline of Sindh.
9. Kalmatic Tombs in the Sindh and Baluchistan
10. Sindh Script, Orthography and Calligraphy.
11. The first Translation of Holy Quran.
12. The first Book on "Method of Education"
13. Saints of Sehwan.
14. The Suhrawardi Mianwal Tariqa Initial Formulation and Later Accretions.

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے مقالات کی بعد از وفات کتابی شکل میں اشاعت

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے زندگی بھر جو علمی اور تحقیقی کام کیا اس کے معیار اور مقدار کے بارے میں گزشتہ صفحات میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچ صاحب کا تمام کام اعلیٰ معیار کا ہے اور انھوں نے زندگی کے ہر دور میں جس کام کو بھی انجام دیا، اس موضوع کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی۔ بلوچ صاحب نے مطبوعہ کتب کے علاوہ بڑی تعداد میں علمی اور تحقیقی مقالات بھی لکھے جو مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے ہوئے ہیں۔ الحمدللہ اردو زبان کے مقالات کا مجموعہ راقم الحروف نے بہ عنوان ''گلشنِ اردو'' مرتب کیا تھا جس کی تفصیلات ہم پیش کر چکے ہیں۔ مقام مسرت ہے کہ بلوچ صاحب کی منتشر تحریروں کو اب تک سات مجموعوں کی شکل میں شائع

کر کے محفوظ کیا جا چکا ہے۔ان مجموعوں میں سے ڈاکٹر این اے بلوچ انسٹیٹیوٹ آف ہیریٹیج ریسرچ حیدرآباد کی جانب سے پانچ ،محکمہء ثقافت حکومت سندھ کی جانب سے ایک اور ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ریسرچ فاؤنڈیشن حیدرآباد کی جانب سے ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔یہاں ہم ان کتب کے مشمولات کا مختصر ذکر کریں گے اور قوسین میں سندھی عبارات کے اردو تراجم بھی درج کریں گے تاکہ مقالات کے موضوعات کی تفہیم میں آسانی ہو۔

ا۔ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کے انگریزی مقالات کا مجموعہ

Sindh Studies: Educational and Archeological

Compiled & Edited by: G. M. Umrani & Arshad Baloch

1. The 1st Hostel of The University of Engineering & Technology Nawabshah
2. Imperatives of Education
3. The Quaid-i-Azam on Education
4. Tradition, National Identity and Development
5. Seminar on Primary School Curriculum for South Asia
6. Memorandum presented to the Commission on National Education at Hyderabad
7. Objectives of Education in the Pakistani society before colonial rule
8. Education in Sindh Prior to the British Occupation

9. The Problem of Brain Drain
10. Commission on National Education–1959
 'Education of Teacher'
11. Planning for Patriotism
12. The first foundation of childhood education and pedagogy in Andalus in the 3rd/9th Century
13. Quality of Education: Issues and Solutions
14. Education in Pakistan
15. Tradition, Educational and Social Development and Modernization
16. Objectives of Education in Pakistan: The Past and the Present
17. Universal Primary Education: the neglected national goal
19. Role of the Government Madressah and High School Naushahro Feroze
20. The Pakistan Congress of History and Culture
21. Some new source materials in Archaeology and History
22. Alcuin's Account of his visit to The Ghazna Library
23. Change in Attitudes(with reference to superstitution(A.Fairies and Ghosts
24. The Islamabad Eleventh Session of Islamic Foreign Ministers' Conference(17–22 May 1980)

25. Separation of Sind from the Bombay Presidency
26. Balochi writing in Pakistan
27. Al-Mansurah, the Arab Capital of the Sind Province
28. Marghub Al-Qulub
29. Shah-Ji as I remember him
30. Influence of Pakistani Music of Sindh on the Cante Jondo Folk Music of Spain
31. Khalifa Abdul Hakim A True believer and Patriot who died defending the cause of Islam
32. Introduction to Miftah al Saa'dat
33. Excavations at Mansura
34. The women folk in Sind and their art of Embroidery
35. Early History
36. Hala
37. The pioneers of South-Eastward Voyages:Muslims mobility on the ocean
38. Immediate steps to be taken to save our traditional arts and crafts
39. The potential archaeological sites in the Lower Indus Valley of Sindh
40. Muhammad Ayub Khuhro: His Personality and Character
41. Sindh Arab Relations

42. The Traditional Cultures in West Pakistan
43. The Early Establishment of Muslim Power in Al-Sind and Al-Hind
44. Policing in Sindh: The Past and the Future
45. National Hijra Council of Pakistan
46. The first library at Ghazna under the Muslim rule
47. Excavation at Banbhore
48. Evolution of political thought in the Muslim world
49. The Kalmati Tombs in Sindh and Balochistan
50. Hosh Muhammad Qambrani
51. The dynamics Cultural Planning in Pakistan
52. The possible site of Janani
53. The challenges to cultural identity of Muslim Ummah
54. Men below the Manhiyoon at Banbhore

٢. ڊاڪٽر بلوچ جا مقالا:شاهہ عبداللطيف جي حياتي جو احوال ۽ رسالي جي تاريخ مرتب: ڊاڪٽر عبدالغفار سومرو

(شاہ عبداللطیف۔احوال زندگی اور رسالے کی تاریخ مرتبہ: ڈاکٹر عبدالغفار سومرو)

پاڱو پهريون(پہلا حصہ)

باب پهريون: شاهه عبداللطيف جي سوانح حيات(پہلا باب:شاہ عبداللطیف کی سوانح حیات)

1. نسب نامو، ولادت، ننڍپڻ ۽ ابتدائي تعليم وارو دور (نسب نامہ،ولادت،بچپن اور ابتدائی تعلیم کا دور)
2. والدين جي رهنمائي هيٺ تربيت وارو دور (1115-1120 ؟)(والدین کی رہنمائی میں تربیت والا دور)
3. پاڻ پنهنجي تربيت۽ڪماليت ڏانهن قدم وڌائڻ وارو دور (1120-1142ھ)(اپنی ذاتی تربیت اور کمالیت کی جانب قدم بڑھانے والا دور)
4. ڀٽ تي دائمي سڪونت، فقيري فيض ۽ تربيت، ڪمال چاڙهه ۽ معرف جي فروغ وارو دور (1142-1161ھ) (بھٹ یعنی ٹیلے پر دائمی سکونت،فقیری فیض اور تربیت،کمال اور معرفت کے فروغ والا دور)
5. ڀٽ تي هڪ جاءِ مقيم ٿيڻ وارو آخري دور (1161-1165 ھ)(بھٹ یعنی ٹیلے پر ایک جگہ مقیم ہوجانے والا آخری دور)

باب ٻيو: شاهہ جي رسالي جي اصليت، حقيقت ۽ رسالي جي قليم نسخن ۽ ڇاپن جي سڃاڻپ(دوسرا باب: رسالہ شاہ عبداللطیف کی اصلیت، حقیقت اور رسالے کے قدیم نسخوں اورطباعت کی پہچان)

رسالي جي اصليت ۽ حقيقت (رسالے کی اصلیت اور حقیقت)

قلمي ۽ ڇاپي رسالن جي سڃاڻپ(قلمی اور مطبوعہ رسالوں کی پہچان)

باب ٽريون: رسالي جي تدوين ۽ تاريخ(تیسرا باب: رسالے کی تدوین اور تاریخ)

(الف) اوائلي دور وارا قلمي رسالا (اوائلی دوروالے قلمی رسالے)

(ب) راڳنامي جي صورت ۾ رسالي جو مرتب ٿيڻ(راگنامے کی صورت میں رسالے کا مرتب ہونا)

(ج) وچئين دور جا رسالا(وسطی دور کے رسالے)

(د) پوئين دور وارا رسالا(بعد والے دور کے رسالے)

باب چوٿون: رسالي جي ترتيب(چوتھا باب :رسالے کی ترتیب)

(الف) قلمي ۽ ڇاپي رسالن واري ترتيب(قلمی اور مطبوعہ رسالوں کی ترتیب)

(ب) رسالي جي معياري متن لاءِ معياري ترتيب(رسالے کے معیاری متن کے لیے معیاری ترتیب)

باب پنجون: شاهہ جي ڪلام جي پرک جا معيار(پانچواں باب: شاہ کے کلام کی

پرکھ کے معیارات)

1. مطالعي هيٺ آيل رسالن جي تعداد جو معيار (زیر مطالعہ رسالوں کی تعداد کا معیار)
2. رسالن جي قدامت جو معيار (رسالوں کی قدامت کا معیار)
3. رسالن جي ڀيٽ جو معيار (رسالوں کے باہمی موازنے کا معیار)
4. ٻوليءَ جو معيار (زبان کا معیار)
5. شاعريءَ جو معيار (شاعری کا معیار)
6. اعليٰ فهم ۽ فڪر جو معيار (اعلیٰ فہم اور فکر کا معیار)

باب ڇهون: رسالي جي جامع مستند متن لاءِ صورتخطي (رسالے کے مستند متن کے لیے رسم الخط)

ٻيو ڀاڱو (دوسرا حصہ)

فصل-1 متهلوي (متعلوي) سادات ۽ شاهه عبداللطيف جو نسب نامو (متعلوی سادات اور شاہ عبداللطیف کا نسب نامہ)

فصل-2 شاهه حبيب ۽ سندس ڪٽنب (شاہ حبیب اور ان کا گھرانہ)

فصل-3 شاهه عبداللطيف جي والد شاهه حبيب جي وفات (شاہ عبداللطیف کے والد شاہ حبیب کی وفات)

فصل-4 حضرت شاهه عبداللطيف جي سوانح بابت ويچار (حضرت شاہ عبداللطیف کی سوانح سے متعلق غور وفکر)

فصل-5 شاهه عبداللطيف رح جي سوانح بابت وڌيڪ تحقيق ۽ معلومات (شاہ عبداللطیف کی سوانح سے متعلق مزید تحقیق اور معلومات)

٣. ڊاڪٽر بلوچ جا مقالا - تاريخ

(ڈاکٹر بلوچ کے مقالاتِ تاریخ مرتبہ : ڈاکٹر محمد یعقوب مغل)

1. سنڌ، هڪ تاريخي پس منظر (سندھ، ایک تاریخی پس منظر)
2. حيدرآباد شهر (شہر حیدرآباد)
3. حيدرآباد شهر (شہر حیدرآباد)
4. ٺٽي جو وجودي بنياد يا ٺٽي شهر جو اصل نسل (ٹھٹہ کی وجودی بنیاد یا شہر کی اصل نسل)
5. شڪارپور- هڪ سرسري تاريخي جائزو (شکارپور۔ ایک سرسری تاریخی جائزہ)
6. رني ڪوٽ جو بنياد ۽ ان جي تاريخ (رنی کوٹ کی بنیاد اور اس کی تاریخ)
7. ماضيءَ جي تاريخ کي وڏي ويچار سان سامهون آڻڻ گهرجي (ماضی کی تاریخ کو بڑی سوچ سمجھ سے سامنے لانا چاہیے)
8. پير صاحب پاڳاري حزب الله شاه صاحب جو انگريزن خلاف ترڪي جي سلطان ڏانهن خط (پیر صاحب پگارا حزب اللہ شاہ صاحب کا انگریزوں کے خلاف سلطان ترکی کو خط)
9. پير پاڳارو سيد صبغت الله شاه ثاني رح ۽ حر تحريڪ (پیر پگارا سیّد صبغت اللہ شاہ ثانی اور حر تحریک)
10. سنڌ جا قبيلا ۽ سنڌ جا نسب ناما (سندھ کے قبائل اور سندھ کے نسب نامے)
11. سورهيه هوش محمد جي مزار ۽ اولاد بابت وضاحت (بہادر ہوش محمد کے

مزار اور اولاد سے متعلق وضاحت)

12. وچ ايشيا ۾ اسلامي تهذيب (وسط ایشیا میں اسلامی تہذیب)
13. شهر سيوهڻ ۽ علائقي سيوستان جي قديم تاريخ (شہر سیوہن اور علاقہ سیوستان کی قدیم تاریخ)
14. هنگلاج جو سفر (ہنگلاج کا سفر)
15. سپهه سالار دريا خان جو حسب نسب (سپہ سالار دریا خان کا حسب نسب)
16. تذڪره مشائخ سيوستان (تاریخ مشائخ سیوستان)
17. سنڌ جو آخري سومرو بادشاه ۽ سندس ڀائر (سندھ کا آخری سومرو بادشاہ اور اس کے بھائی)
18. شيخ نظام الدين اولياء جي سنڌ ۾ آمد (شیخ نظام الدین اولیاؒ کی سندھ میں آمد)
19. ڪوٽڙي ڪبير جا عالم ۽ علمي درسگاهون (کوٹڑی کبیر کے علما اور علمی درسگاہیں)
20. اسلام جي سنڌ ۾ آمد ۽ ان جا ثقافتي اثرات (اسلام کی سندھ میں آمد اور اس کے ثقافتی اثرات)
21. حرن جون انگريزن خلاف بغاوتون ۽ جنگيون (حُروں کی انگریزوں کے خلاف بغاوتیں اور جنگیں)
22. سنڌ جو مشهور جهونو شهر نصرپور (سندھ کا معروف قدیمی شہر نصرپور)
23. تاريخي سنڌو سنبت (تاریخ سندھو وکرمی سال)
24. سنڌو تهذيب جي سنڌو لکت جي ياچ (سندھو تہذیب اور سندھو رسم الخط)
25. درگاه چوٽياري (چوٹیاری کی درگاہ)
26. ڪراچيءَ جي تاريخ بابت دليلن جي چنڊڇاڻ (کراچی کی تاریخ سے متعلق دلائل

کی چھان پھٹک)

27. 1857ع ۾ سنڌ طرفان آزاديءَ جي جنگ(۱۸۵۷ء میں سندھ کی جانب سے آزادی کی جنگ)

28. ڳوٺ جعفر خان لغاري جو جاگرافيائي ۽ تاريخي پسمنظر (قریہ جعفر خان لغاری کا جغرافیائی اور تاریخی پس منظر)

29. نئين سنڌ يونيورسٽي ڪئمپس - شهر جو بنياد پوڻ(نئے سندھ یونیورسٹی کیمپس کی بنیاد پڑنا)

انٽرويو(انٹرویو)

1. اج وري تاريخ جا دفتر کُليا(آج دوبارہ تاریخ کے دفتر کھلے)

2- ريڊيو انٽرويو سيريز2

3- اسان سخت غربت ۽ مشڪلاتن ۾ پڙهياسين(ہم نے سخت غربت اور مشکلات میں تعلیم حاصل کی)

4. تاريخ، لوڪ ادب، ٻولي، موسيقي ۽ لغت جي ماهر ڊاڪٽر نبي بخش خان بلوچ جو تاريخي انٽرويو (تاریخ،لوک ادب،زبان،موسیقی اور لغت کے ماہر ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کا تاریخی انٹرویو)

۴۔ ڊاڪٽر بلوچ جا مقالا - علم ، ادب ۽ شخصيتون

(ڈاکٹر بلوچ کے مقالات۔علم،ادب اور شخصیات مرتبہ : محمد ارشد بلوچ)

1. ملفوظات مجمع الفيوضات(ملفوظات مجمع الفیوضات)
2. منهاج المعرفت(منہاج المعرفت)
3. مڪمل شرح ابيات سنڌي(مکمل شرح ابیات سندھی از عبدالرحیم گرھوڑی)
4. قاضي قاضن جي ڪلام جو ناياب ذخيرو (قاضی قاضن کے کلام کا نایاب ذخیرہ)
5. حضرت سلطان باهو ۽ سرائڪي ۾ سندس چيل بيت(حضرت سلطان باھوؒ اور ان کی سرائیکی شاعری)
6. تڪملة التڪمله (تکملۃ التکملۃ)
7. عبدي جو رسالو(رسالہ عبدی)
8. ڪلينيڪل سرجري(کلینیکل سرجری)
9. جمودپرستي خلاف مسلسل جهاد(جمود پرستی کے خلاف مسلسل جہاد)
10. پيرون چونديم پاند ۾ - محمد طالب لوهار جي ڪتاب تي پيش لفظ(محمد طالب لوھار کی کتاب پر پیش لفظ)
11. سوانح نمبر(سوانح نمبر رسالہ مھران)
12. بلوچي زبان(بلوچی زبان)
13. سنڌي ٻولي اختياري بابت ڪجهه تجويزون(سندھی زبان کو اختیار کرنے سے متعلق بعض تجاویز)

14. سنڌي صورتخطي جي تڪميل لاءِ وڏي عالم مبين ابوالحسن جو ڪامياب قدم(سندھی رسم الخط کی تکمیل کے لیے عالم کبیر مبین ابوالحسن کا کامیاب قدم)
15. ٿر ـ ميلو، عمرڪوٽ(تھر میلہ۔عمرکوٹ)
16. لوڪ ڪهاڻين جي علمي اهميت(لوک کہانیوں کی علمی اہمیت)
17. پارس کاڻ(پارس کی کان)
18. شاه صدرالدين عليه رحمت(شاہ صدرالدین رحمۃ اللہ علیہ)
19. حضرت پير سائين سيد علي گوهر شاه اصغر، بنگلي ڌڻي رحمته الله عليه(حضرت پیر صاحب سیّد علی گوہر شاہ اصغر بنگلہ دھنی ؒ)
20. لاکو ڦلاڻي(لاکھو پلانی)
21. مخدوم محمد هاشم ٺٽوي جي سوانح حيات ۽ علميت بابت ڪي ويچار (مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کی سوانح اور علمیت سے متعلق بعض افکار)
22. سنڌ جا سورهيه (سندھ کے بہادر)
23. درويش راضي شاه لڪياري(درویش راضی شاہ لکیاری)
24. عربي زبان جو ماهر عالم علي محمد مهيري رح(عربی زبان کے ماہر عالم۔ علی محمد مہیری ؒ)
25. فقير صاحب نانڪ يوسف(فقیر صاحب نانک یوسف)
26. حافظ عبدالوهاب فاروقي(حافظ عبدالوہاب فاروقی سچل سرمست ؒ)
27. پير پٺو(پیر پٹھو)
28. ڇتو فقير سانگي(چھتو فقیر سانگی)
29. علامه آءِ. آءِ. قاضي(علامہ آئی آئی قاضی)
30. مولوي بهاءُالدين بهائي مرحوم(مولوی بہاالدین بہائی مرحوم)

31. آخوند فيض محمد روهڙوي(آخوند فیض محمد روہڑوی)
32. مرزا قليچ بيگ رح کي مؤدبانه سلام(مرزا قلیچ بیگؒ کومودبانہ سلام)
33. عوام جو طرفدار، سنڌ جو خذمتگار پير الاهي بخش(عوام کے طرف دار ،سندھ کے خدمت گار پیر الٰہی بخش)
34. پياري سڄڻ قاضي فيض محمد جي ياد ۾(پیارے دوست قاضی فیض محمد کی یادمیں)
35. سائين قاضي سچيڏني جي ياد ۾(جناب قاضی سچیڈنو کی یادمیں)
36. مخدوم امير احمد(مخدوم امیر احمد)
37. مولوي عبدالله لغاري(مولوی عبداللہ لغاری)
38. شاعر ثناءُالله ثنائي جي ياد ۾(شاعر ثنااللہ ثنائی کی یادمیں)
39. منهنجو ساٿي ۽ سڄڻ مرحوم محمد اسماعيل نون(میرا ساتھی اور دوست مرحوم محمد اسماعیل نون)
40. خانبهادر علي نواز خان جمالي(خان بہادر علی نواز خان جمالی)
41. قاضي عبدالرؤف مرحوم مورائي(قاضی عبدالرؤف مرحوم مورو والے)
42. اڃان پُڻ آهين(ابھی تک ویسے ہی ہو)
43. يادگيريون ممتاز جون(ممتاز مرزا کی یادیں)
44. مرزا عباس علي بيگ(مرزا عباس علی بیگ)
45. گول لاٽون چورس چگهه(گول لٹو اور چوکور سوراخ)
46. خطاب به ڊي.جي. سنڌ ڪاليج(ڈی جے سندھ کالج سے خطاب)

۵. ڊاڪٽر بلوچ جا مقالا . تاريخ،لغت،ٻولي ، ادبءِ شخصيتون

(ڈاکٹر بلوچ کے مقالات۔تاریخ،لغت،زبان،ادب اور شخصیات)مرتبہ : محمدارشد بلوچ

پاڱو پهريون: تاريخ (حصہ اوّل:تاریخ)

1. پراڻ درياهه جون يادگيريون(پران دریا کی یادیں)
2. سنڌ جا سورهيه: بلو بداڻي(سندھ کے بہادر۔بلوبڈانی)
3. فتح نامو (چچ نامو) ۽ ان جو مترجم علي ڪوفي(فتح نامہ(چچ نامہ)اوراس کا مترجم علی کوفی)
4. سنڌي ڪئلينڊر (سندھی کیلنڈر)
5. سنڌ جا سڄاڻ، هنرمند ۽ ڪاريگر قبيلا(سندھ کے ماہر،ہنرمنداورکاریگرقبائل)

پاڱو ٻيو: لغت(حصہ دوم:لغت)

6. سنڌي لغات جي تحقيق ۽ تدوين بابت اوائلي عالمانه ڪوششون: ڪتاب ”انيس انجمن“ ۾ سنڌي لغات جو ذخيرو(سندھی لغت کی تحقیق اورتدوین سے متعلق ابتدائی عالمانہ کوششیں:کتاب ”انیس انجمن“ میں سندھی لغت کا ذخیرہ)
7. سنڌي لغت تيار ڪرڻ ۾ مدد لاءِ اپيل(سندھی لغت کی تیاری میں معاونت کی اپیل)
8. سنڌي لغت جي ڪم تي سرسري نظر-1(سندھی لغت کے کام پر سرسری نظر۱)
9. سنڌي لغت جي ڪم تي سرسري نظر-2(سندھی لغت کے کام پر سرسری نظر۔۲)
10. سنڌي لغت(سندھی لغت)
11. سنڌي لغت (پهرئين پاڱي جي تڪميل)(سندھی لغت۔حصہ اول کی تکمیل)

ڀاڱو ٽيون: ٻولي ۽ ادب(حصہ سوم:زبان وادب)

12. سنڌي ٻولي: اُن جو ماضي، حال ۽ مستقبل(سندھی زبان:اس کا ماضی،حال اور مستقبل)
13. سنڌي صورتخطي ۽ خطاطي(سندھی رسم الخط اور خطاطی)
14. سنڌي ٻوليءَ جون سرحدون ۽ اُن جو ڪڇي محاورو(سندھی زبان کی سرحدیں اوراس کے کچھی محاورے)
15. سنڌي ٻولي جا تحريري دستاويز: 1137هه ۾ عبدالرزاق جو جوڙيل فقهي منظوميو (سندھی زبان کی تحریری دستاویز:۱۱۳۷ھ میں عبدالرزاق کا کہا ہوا فقہی منظوم رسالہ)
16. سنڌي ٻولي جا تحريري دستاويز: ميين محمد صلاح جي سنڌي(سندھی زبان کی تحریری دستاویز:میین محمد صلاح کی سندھی)
17. ٽي اڳاٽا سنڌي بيت(تین اوائلی سندھی اشعار)
18. آڳاٽن سنڌي بيتن جو ناياب ذخيرو (اوائلی سندھی اشعار کا نایاب ذخیرہ)
19. سنڌي شعر جي تاريخ ۾ نئون اضافو: ميين ونهيين چانهيي ۽ مخدوم عثمان دربيلائي جا بيت(سندھی شاعری کی تاریخ میں نیا اضافہ:میین ونھیین چاھی اور مخدوم عثمان دربیلائی کے اشعار)
20. مرحوم مولوي علي محمد صاحب مهيريءَ جو هڪ شعر (مرحوم مولوی علی محمد صاحب مھیری کا ایک شعر)
21. بلوچي ٻولي، سندس ادب ۽ اديب(بلوچی زبان،اس کا ادب اورادیب)
22. قومي انقلاب ۽ تعمير ۾ ادب جو حصو (قومی انقلاب اور تعمیر میں ادب کا حصہ)
23. هڪ ادبي اپيل: سنڌ جي لوڪ ادب گڏ ڪرڻ جي رٿ(ایک ادبی اپیل:سندھی لوک ادب جمع کرنے کا منصوبہ)
24. مولود: هڪ خالص سنڌي صنف(مولود:ایک مخصوص سندھی صنف)
25. شاعري(شاعری)

پاڱو چوٿون: شخصيتون (حصہ ءچہارم: شخصیات)

کرنے والے چلے گئے: پیر غلام رسول مجددی سرھندی ٹیاروی)

43. مرحوم لعل بخش خان لغاري (مرحوم لعل بخش خان لغاری)
44. فقير عبدالرحمان مهيسر وڏو سالڪ سگهڙ (فقیر عبدالرحمٰن مھیسر ایک بڑا سالک اور ہنرمند)
45. احسان منديءَ پري يادگيري- عبدالله جي ميمڻ (احسان مندی بھری یادیں۔عبداللہ جے میمن)

٦۔ ڊاڪٽر بلوچ جا مقالا

(شخصيتون ، تاريخ، لغت، ٻولي ۽ ادب)

(ڈاکٹر بلوچ کے مقالات۔شخصیات،تاریخ،لغت،زبان وادب مرتبہ : محمد ارشد بلوچ)

پاڱو پهريون: شخصيتون (حصہ اول:شخصیات)

- وزيراعظم ذوالفقار علي ڀٽي جي ياد ۾ (وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی یاد میں)
- مرحوم حاجي نواب گل محمد لغاري (مرحوم حاجی نواب گل محمد لغاری)
- جمن چارڻ بابت تحقيق (جمن چارن کے بارے میں تحقیق)
- هڪ مخلص سچاڻ ۽ محنتي استاد ۽ اديب: عبدالواحد سنڌي مرحوم (تاثر) (ایک مخلص،عقلمند اور محنتی استاد و ادیب:عبدالواحد سندھی مرحوم)
- هڪ خط مان ڪجهه سٽون- گرامي بابت (تاثرات) (ایک خط سے کچھ سطور۔گرامی سے متعلق)
- علامه محمد هاشم مرحوم ڳڙهي ياسيني (علامہ محمد ہاشم مرحوم گڑھی یاسینی)
- مرحوم علامه محمد قاسم ڳڙهي ياسيني (مرحوم علامہ محمد قاسم گڑھی یاسینی)

- پير احسان الله شاهہ راشدي مرحوم(پیراحسان اللہ شاہ راشدی مرحوم)
- مرحوم مولانا دين محمد 'وفائي'(مرحوم مولانا دین محمد وفائی)
- مولوي محمد صادق راڻيپوري(مولوی محمد صدیق رانی پوری)
- رئيس المهاجرين مرحوم جان محمد جوڻيجو(رئیس المھاجرین مرحوم جان محمد جونیجو)
- فولاد علي فقير شر(فولاد علی فقیر شر)
- ميان نور محمد شيخ ننگرپارڪري(میاں نور محمد شیخ ننگر پارکری)

پاڱو ٻيو: تاريخ(حصہ دوم: تاریخ)

- صحيح بخاري جو سنڌ ۽ هند ۾ مطالعو (صحیح بخاری کا سندھ و ہند میں مطالعہ)
- برصغير ”سنڌ و هند“ ۾ قرآن پاڪ جو پهريون ترجمو(برصغیر سندھ و ہند میں قرآن پاک کا پہلا ترجمہ)
- مسلم بنگال جي فارسي ادب جي هڪ اهم تصنيف ڪتاب: ”شرفنامهء احمد منيري“(مسلم بنگال کے فارسی ادب کی ایک اہم تصنیف ”شرفنامہء احمد منیری“)
- ٿر جا مدرسا(تھر کے مدرسے)
- ڪچهري بدين(بدین کی محفل)

پاڱو ٽيون: ٻولي ۽ ادب(حصہ سوم: زبان و ادب)

- سنڌي لغت جي تڪميل(سندھی لغت کی تکمیل)
- سنڌي ٻولي جو بااختيار ادارو ڇا ڪيو ڪري؟(سندھی زبان کا با اختیار ادارہ کیا

کررہاہے؟)

- ٿر ۽ مُهراڻي جا لوڪ گيت(تھراورمہرانی کےلوک گیت)
- سنڌ جي لوڪ ادب گڏ ڪرڻ جي اسڪيم(سندھی لوک ادب جمع کرنے کی اسکیم)
- سنڌ جا سگهڙ-٢ (سندھ کے ہنرمند۔٢)
- مفيد شاعري(مفیدشاعری)
- سنڌ جا دهقاني شاعر-١ (سندھ کےدہقانی شاعر۔١)
- سنڌ جا دهقاني شاعر-٢ (سندھ کےدہقانی شاعر۔٢)
- ڪبير شاهه ۽ شيخ ابراهيم جي ملاقات ۽ شاعرانه مناظرو (کبیرشاہ اور شیخ ابراہیم کی ملاقات اورشاعرانہ مناظرہ)

۷۔ سنڌ جا پاڳارا پير (سندھ کے پگاراپیر)

مرتبہ: ڈاکٹرعبدالرسول قادری

پير صاحبان پاڳارن جو شجرو مبارڪ(پیرصاحبان پگاراکاشجرۂ مبارک)

□ درگاهہ راشدي جي گادي نشينن جا لقب القاب(درگاہ راشدی کےگدی نشینوں کےلقب القاب)

□ **سنڌ جا پاڳارا پير (سندھ کے پگاراپیر)**

□ سنڌ جو هڪ برگزيده خاندان(سندھ کاایک برگزیدہ خاندان)

□ **حضرت شاهہ صدر نيک نظر لڪي**(حضرت شاہ صدر نیک نظر لکی)
□ حضرت شاهہ صدر عليه الرحمة(حضرت شاہ صدر علیہ الرحمۃ)
□ شاهہ صدر الدين عليه الرحمة(شاہ صدر الدین علیہ الرحمۃ)

□ **سيّد محمد راشد "روضي ڌڻي"**(سیّد محمد راشد روضے دھنی)
□ سيد محمد راشد "روضي ڌڻي" ۽ سندس ملفوظات 'مجمع الفيوضات'(سیّد محمد راشد روضے دھنی اوران کے ملفوظات 'مجمع الفیوضات')
□ سيد محمد راشد عالم ۽ عارف روضي ڌڻي (فارسي ترجمو)(سیّد محمد راشد عالم اور عارف روضے دھنی)
□ پير صاحب محمد راشد 'روضي ڌڻي' جون ڪافيون(پیر صاحب محمد راشد روضے دھنی کی کافیاں)

□ **مانائتيون مايون:**(مان مرتبے والی خواتین)
• بيبي سائنڙ صاحبہ، محمد راشد روضي ڌڻي جي وڏي نياڻيءَ(بیبی سائنن صاحبہ، محمد راشد روضے دھنی کی بڑی صاحب زادی)
• بيبي صاحبہ امير زادي، محمد راشد روضي ڌڻي جي پوٽيءَ(بیبی صاحبہ امیر زادی، محمد راشد روضے دھنی کی پوتی)
□ تعارف جمع الجوامع فارسي (انگريزي ترجمو)(تعارف جمع الجوامع فارسی)

□ **سيد صبغة الله شاهہ (اول) "تجر ڌڻي"**(سیّد صبغت اللہ شاہ اول تجر دھنی)
□ حضرت پير سائين سيد صبغة الله شاهه اول ۽ سندس ملفوظات 'خزانة

المعرفت' (حضرت پیر صاحب صبغۃ اللہ شاہ اوران کے ملفوظات 'خزانۃ المعرفت)
□ پير پاڳارو (اول) سيد صبغة الله شاهہ "مسڪين" (فارسي ترجمو) (پیر پگارا اول سید صبغۃ اللہ شاہ مسکین۔ فارسی ترجمہ)

□ **سيد علي گوهر شاهہ (اوّل) "اصغر"، "بنگلي ڌڻي" (سیّد علی گوہر شاہ اول بنگلہ دھنی)**
□ سيد علي گوهر شاهہ (اول) "بنگلي ڌڻي" ۽ اصغر سائين جو ڪلام (سید علی گوہر شاہ بنگلہ دھنی اور اصغر سائیں کا کلام)
□ پير پاڳارو سيد علي گوهر شاهہ "گوهر" (فارسي ترجمو) (پیر پگارا سید علی گوہر شاہ 'گوہر'۔ فارسی ترجمہ)
□ پير صاحب علي گوهر شاهہ "اصغر" جون ڪافيون (پیر صاحب علی گوہر شاہ 'اصغر' کی کافیاں)

□ **سيد حزب الله شاهہ 'مسڪين'، "تخت ڌڻي" (سیّد حزب اللہ شاہ 'مسکین' تخت دھنی)**
□ پير سائين سيد حزب الله شاهہ 'مسڪين' "تخت ڌڻي" ۽ "ديوان مسڪين" (پیر صاحب سید حزب اللہ شاہ 'مسکین' تخت دھنی اور 'دیوان مسکین')
□ پير صاحب پاڳاري حزب الله شاهہ صاحب جو انگريزن خلاف ترڪي جي سلطان ڏانهن خط (پیر صاحب پگارا حزب اللہ شاہ صاحب کا انگریزوں کے خلاف ترکی کے سلطان کو خط)
□ پير پاڳارو سيد حزب الله شاهہ "مسڪين" (فارسي ترجمو) (پیر پگارا سید حزب اللہ شاہ 'مسکین'۔ فارسی ترجمہ)

□ سخي پير پاڳارو جناب حزب الله شاهہ(سخی پیر پگاراجناب حزب اللہ شاہ)
□ علي اصغر شاهہ "اصغر" (سيد حزب الله شاهہ جو فرزند)(علی اصغر شاہ'اصغر'۔سید حزب اللہ شاہ کے فرزند)
□ **سيد صبغة الله شاهہ (ثاني) "پڳ ڌڻي"، "سورهيہ بادشاهہ"(سید صبغۃ اللہ شاہ ثانی پگ دھنی۔بہادر بادشاہ)**
□ سورهيہ صبغة الله شاهہ جو ننڍپڻ (ٻالجتيءَ ۾ عظمت جا آثار)(بہادر صبغۃ اللہ شاہ۔بچپن میں عظمت کے آثار)
□ پير پاڳارو سيد صبغة الله شاهہ ثاني(پیر پگارا سید صبغۃ اللہ شاہ ثانی)
□ سدا حيات سورهيہ صبغة الله شاهہ رح(سدا حیات سورھیہ صبغۃ اللہ شاہ)
□ پير صبغة الله شاهہ ثاني جي ڪافي(پیر صبغۃ اللہ شاہ کی کافی)
□ سورهيه صبغة الله شاهہ جي انگريز سامراج سان جنگ(بہادر صبغۃ اللہ شاہ کی انگریز سامراج سے جنگ)
الف: سورهيہ شهيد جي "رازدار" خليفي احمد لغاري جي لکت ۾ ياد داشت. حُر تحريڪ ۾ فقيرن پنهنجا سر گهوري ڇڏيا(سورھیہ شہید کے'رازدار'خلیفہ احمد لغاری کی تحریر میں یادداشت۔حُر تحریک میں فقیروں نے اپنے سر قربان کردیے)
□ سورهيہ صبغة الله شاهہ خلاف بنايل بغاوت جو مقدمو ۽ ڄُڙتو شاهد(سورھیہ صبغۃ اللہ شاہ کے خلاف بغاوت کا مقدمہ اور جعلی گواہ)
□ حُرن جي انگريزن جي حڪومت سان جنگ(حُروں کی انگریزی حکومت کے خلاف جنگ)
□ حُرن جي انگريز حڪومت سان ٽولا ٽولا جنگ(حُروں کی انگریزوں کے خلاف ٹولے ٹولے بنا کر جنگ)

□ روزاني ڪم کي ڪاميابيءَ سان پوري ڪرڻ لاءِسورهيه صبغة الله شاهه جو ڪيل تاڪيد(روزانہ کا کام کامیابی سے مکمل کرنے کے بارے میں بہادر صبغۃ اللہ شاہ کی تاکید)

□ سورهيه صبغة الله شاهه جي آخري هدايت(بہادر صبغۃ اللہ شاہ کی آخری ہدایت)

□ **پير صاحب پاڳارو شاهه مردان شاهه (ثاني) "چٽ ڌڻي"**(پیر صاحب پگارا شاہ مردان شاہ ثانی۔چھٹ دھنی)

□ پير صاحب پاڳاري شاهه مردان شاهه (ثاني) جي مسند نشيني(پیر صاحب پگارا شاہ مردان شاہ ثانی کی تخت نشینی)

□ مُلڪ اندر صاف سٿري سياست جا امين(اندرون ملک صاف ستھری سیاست کے امین)

□ نئين شاندار "جامعه راشديه ڪتب خاني" جو قيام(نئے جامعہ راشدیہ کتب خانے کا قیام)

□ درگذر ڪرڻ وارو پير سائين پاڳارو(سانگهڙ ۾ ٿلهي مبارڪ تي سائين ڊاڪٽر بلوچ جي آخري تقرير)(درگزر کرنے والا پیر صاحب پگارا۔سانگھڑ میں مبارک تھلے پر ڈاکٹر بلوچ کی آخری تقریر)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی آثار قدیمہ کے تحفظ کے لیے خدمات

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی علمی ادبی ثقافتی خدمات اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ خاص طور پر سندھ کے لوک ادب کو جمع کرنا ان کی عظیم ملی خدمت ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے لوگوں سے ملاقات کر کے انہیں احساس دلایا کہ آثارِ قدیمہ ہمارا تاریخی ورثہ ہے اور اس کا تحفظ ہمارا ملی فریضہ ہے۔ اس کے علاوہ محکمہء آثار قدیمہ کی مختلف میٹنگوں میں شرکت کر کے آثار قدیمہ کے تحفظ کی خاطر مختلف عملی تجاویز پیش کیں اور اپنی خدمات بھی پیش کیں۔ پورے سندھ میں آپ جہاں بھی پرانی مسجدوں اور مقبروں پر جائیں تو علم ہوگا کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب یہاں کتنی مرتبہ آئے ہیں اور مسجدوں و مقبروں کی تصاویر بھی کھینچ کر گئے ہیں۔

یہاں ہم ڈاکٹر بلوچ کی آثار قدیمہ کے تحفظ کے حوالے سے چند اہم خدمات کا ذکر کریں گے:

۱۔ ڈاکٹر بلوچ کی کوشش سے محکمہء آثار قدیمہ نے بھنبھور، منصورہ و دیگر مقامات پر کھدائی کی اور زمین کی تہوں میں صدیوں سے دفن تاریخی آثار برآمد کیے۔

۲۔ ڈاکٹر بلوچ کی کوشش سے آثار قدیمہ سے برآمد اشیا کے تحفظ کی خاطر بھنبھور اور عمرکوٹ میں میوزیم قائم کیے گئے۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے پکے قلعے میں تالپور میوزیم کے قیام میں بھی ڈاکٹر صاحب نے اہم کردار ادا کیا۔

۳۔ ڈاکٹر بلوچ کی کوشش سے قدیمی آثار کے تحفظ کی خاطر ان کی مرمت کا انتظام کیا گیا۔ ان آثار میں حیدرآباد کے پکے قلعے کی دیوار، میاں یار محمد کلہوڑو کی قائم کردہ مسجد، چوکنڈی قبرستان نزد لانڈھی کراچی، قبرستان میاں واہیوں، میر شہداد خان کا مقبرہ و دیگر مقامات شامل ہیں۔

۴۔ ڈاکٹر بلوچ کی کوشش سے رانی باغ حیدرآباد کے نزد سندھ صوبائی میوزیم اور سندھ صوبائی لائبریری قائم کی گئی۔ سندھ صوبائی میوزیم کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے ذاتی ذخیرے سے مختلف فنون کی اشیا، قدیم سکے و دیگر چیزیں بلا قیمت پیش کیں۔

۵۔ڈاکٹر بلوچ کی کوشش سے واشنگٹن کے سمتھ سونین انسٹیٹیوٹ Smithsonian Institution میں 'سندھی گھر' تعمیر کیا گیا جہاں سندھ کی تہذیب وثقافت سے متعلق اشیا رکھی گئیں۔

۶۔ڈاکٹر بلوچ صاحب کے گاؤں کے قریب سنجھورو تحصیل میں ٹنڈو آدم سے جھول روڈ پر جمڑاؤ کینال کے دائیں کنارے پر منصورہ کے آثار قدیمہ موجود ہیں۔عام طور پر لوگ اسی آثار کو ''دلور جا دڑا'' پکارتے ہیں۔ڈاکٹر بلوچ صاحب محترم انر خان اور ڈاکٹر ایس اے خان آثارِ قدیمہ کے ماہرین کو ساتھ لے کر قافلے کی صورت میں پہنچے اور خود بڑے سے بڑے ٹیلے پر کھڑے ہو کر کھدائی کا آغاز کیا جہاں سے کتنے ہی تیسری صدی کے سکّے اور جامع مسجد کے نشان ملے ہیں۔منصورہ کا شہر چار میل علاقے پر پھیلا ہوا ہے۔

۷۔مغل بادشاہ شاہجہاں کے عہد کی ٹھٹہ میں جامع مسجد شاہجہانی تو پوری دنیا میں مشہور ہے لیکن بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ سندھ کے شہر ٹنڈو محمد خان کے نزدیک گاؤں 'سہرانی' میں بھی شاہجہاں کی تعمیر کردہ ایک مسجد آج بھی موجود ہے۔یہ گاؤں ٹنڈو محمد خان سے بیس میل کے فاصلے پر بدین کی جانب ہے۔البتہ یہ بھی ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ کئی صدیوں قبل کی تعمیر اور مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے یہ مسجد آج بھی خستہ حالت میں موجود ہے۔اس مسجد کا جب ڈاکٹر بلوچ کو علم ہوا تو ضعیف العمری کے باوجود ڈاکٹر صاحب خود وہاں گئے اور کئی اور حضرات کو بھی ساتھ لے گئے۔ان حضرات میں جناب درمحمد بھٹی اور ڈاکٹر عبدالغفار سومرو شامل ہیں۔جناب درّ محمد بھٹی نے ڈاکٹر صاحب کے اس دورے کے بارے میں راقم کو بعض تفصیلات سے آگاہ کیا۔ان کے مطابق ڈاکٹر صاحب جب 'سہرانی' پہنچے اور مسجد کو دیکھا تو اسے بہت زبوں حالت میں پایا۔ڈاکٹر صاحب نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ مسجد کی تعمیر تو کرائی جائے اور اس تعمیر کے لیے ایسی ہی اینٹیں استعمال کی جائیں جو مسجد کی تعمیر میں استعمال ہوئی تھیں۔دیگر یہ کہ مسجد کی تعمیر نو کے لیے ٹھٹہ سے خاص اور ماہر قسم کے کاریگروں کا انتظام کیا جائے۔

اس کار خیر کی خاطر ڈاکٹر صاحب نے پچیس ہزار روپے اور باقی حضرات نے پانچ پانچ ہزار روپے دیے تھے۔

جناب درمحمد بھٹی راقم کی خصوصی گزارش پر اگست ۲۰۱۷ء میں دوبارہ اس مسجد کو دیکھنے 'سہرانی' گئے اور مسجد کی کچھ تصاویر بھی کھینچیں اور متولی مسجد سے ملاقات بھی کی۔متولی صاحب نے بیان کیا کہ اس مسجد کی تعمیر کا آغاز ۱۶۴۰ء میں ہوا اور یہ ۱۶۴۸ء میں مکمل ہوئی۔ان کے مطابق جوانی میں شاہجہاں جب سندھ میں مقیم تھا تو

اس گاؤں کے بزرگوں نے اس کی مدد کی تھی چنانچہ جب شاہجہاں بادشاہ بنا تو ان احسانات کو نہیں بھولا اور اس گاؤں میں یہ مسجد تعمیر کی اور زمینیں بھی دیں۔ ان کے بقول شاہجہاں نے اس گاؤں میں شادی بھی کی تھی اور اپنی ایک بیٹی کی شادی بھی گاؤں میں کی تھی۔ اس گاؤں کا نام 'سہرانی' اس لیے پڑا کہ سندھی زبان میں سہرا کے معنیٰ سسرال کے ہیں، اس نسبت سے سہرانی کے معنیٰ ہوئے سسرال والا۔

البتہ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس مسجد کی تعمیر نو جیسی کہ ڈاکٹر بلوچ کرانا چاہتے تھے، نہ ہو سکی اور یہ تاریخی مسجد آج بھی حکومت کی توجہ کی محتاج ہے۔

اس مسجد اور اس گاؤں سے متعلق ہمیں ڈاکٹر بلوچ کا ایک انگریزی خط کتاب World of Work-Predicament of a Scholar میں ملتا ہے جو انھوں نے احمد آباد میں مقیم نامور محقق، کتبہ شناس اور تاریخ دان ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی مرحوم کو لکھا تھا۔ یہ خط ڈاکٹر صاحب نے مورخہ 14-12-1996 کو لکھا۔ یہاں ہم اس خط کے اہم نکات کو نقل کرتے ہیں:

"It was a great good news for me to learn about your scholarly pursuits. I hope the work on Shah Jahan will be a standard one for all times to come. As you already know Jami Mosque at Thatta was constructed during his reign. A photo of this Grand Mosque(unique in its tile works and with an artifice(like the whispering galleries) in the edifice to make Khutbah audible in its distant eastern wing) will be included in the proposed volume. I have also discovered another more modest Mosque in the rural area of Hyderabad district which have same type of concealed shutters to let the air in the main prayer

chamber as in Jami Mosque of Thatta. I presume that Shah Jahan had stayed at this place during his wanderings in Sindh.However I have not studied the subject of his presence in Sindh. If you have the dates of his total period of stay in Sindh, one could surmise more on the period of construction of this modest Mosque."

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے چند مزید علمی منصوبے

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے ایک انٹرویو میں اپنے آئندہ علمی منصوبوں کے بارے میں فرمایا تھا:

''کوئی چاہتا ہے کہ ایسا بھی ہو ویسا بھی ہو لیکن کسی کام کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ حالات سازگار ہوں، اس کے سوا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر میرے ذہن میں ہے کہ تحریری طور پر جو مواد ہے اس کی بنیاد پر ''سندھ کی سماجی تاریخ'' لکھی جا سکتی ہے۔ یہ کسی نے نہیں لکھی ہے۔ سندھ کے نسب نامے، سندھ کی قومیں، قبیلے اور ان میں جو لائق لوگ ہو گزرے ہیں، خاندانوں کی باتیں اور ان کے تعلقات بہت بڑا موضوع ہے۔ اس سلسلے میں لوک ادب کے تحت ہم نے رِیتوں اور رسموں پر ایک کتاب مرتب کی ہے لیکن سندھ کے نسب ناموں کے بارے میں اتنا سارا مواد موجود ہے کہ اسے پانچ سات جِلدوں میں شائع کیا جا سکتا ہے۔ سندھ کے تاریخی مقامات، گاؤں ودیہات کے نام یا دیگر جغرافیائی نام ہیں، ان میں بڑی معنویت ہے۔ ضرورت ہے کہ ایک جامع فہرست یا ڈائریکٹری مرتب کی جائے اور ان ناموں میں جو معنی پوشیدہ ہیں ان پر روشنی ڈالی جائے۔ یہ بذاتِ خود ایک تحقیقی کام ہے جسے ہاتھ میں لیا جائے۔ لیکن ضروری ہے کہ اس کے لیے حالات سازگار ہوں۔

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کے تیار کردہ وضاحتی نقشے

گزشتہ صفحات کے مطالعے سے قارئین کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب اپنی علمی زندگی میں اور علمی و تحقیقی کاموں کی تکمیل کے دوران ہمیشہ نئے نئے پہلوؤں کو تلاش کرتے اور بہت سے مشکل کاموں کو بخوبی مکمل کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بعض اوقات اپنے مقالات کی تحریر کے دوران قاری کی سہولت کی خاطر اپنے ہاتھ سے وضاحتی نقشے بھی تیار کرتے تھے۔ یہ نقشے اس قدر مہارت اور عمدگی سے تیار کرتے کہ جس علاقے سے متعلق یہ نقشہ ہوتا اس کی تمام تفصیلات اس میں موجود ہوتی تھیں۔

اگلے صفحات میں ہم ڈاکٹر صاحب کے قلم سے تین عدد نقشے پیش کر رہے ہیں جن میں:

☆ پہلا نقشہ ڈاکٹر صاحب نے ابن بطوطہ کے سفر سندھ سے متعلق تیار کیا ہے جس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ابن بطوطہ سندھ میں کن کن مقامات پر پہنچا تھا۔ اس نقشے میں بلوچ صاحب نے دریائے سندھ کی مغربی شاخ کی نشان دہی بھی کی ہے جو ابن بطوطہ کے زمانے میں موجود تھی اور جسے اس نے عبور بھی کیا تھا۔ بعد میں یہ شاخ خشک ہو گئی۔

☆ دوسرا نقشہ وہ ہے جو ڈاکٹر صاحب نے اپنے گاؤں یعنی قریہ جعفر خان لغاری کی تاریخ اور وہاں کی شخصیات کے بارے میں کتاب اسان جو ڳوٺ جعفر خان لغاري میں شامل کی ہے۔ اس نقشے میں قریہ جعفر خان لغاری اور قریبی دیہات اور نہروں وغیرہ کی تفصیلات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ دریائے سندھ کے بہاؤ کے قدیمی راستے کی نشان دہی بھی اس نقشے میں کی گئی ہے۔

☆ تیسرا نقشہ ہمیں ڈاکٹر بلوچ کے لوک ادب سلسلے کی ایک کتاب ''مشہور سندھی قصے: عشقیہ داستان ۳ (لیلیٰ چنیسر)'' کے مقدمے سے دستیاب ہوا۔ اس نقشے میں ڈاکٹر بلوچ نے اپنے قلم سے لیلیٰ کا علاقہ دکھایا ہے۔

N
W
E
دریائے سندھ اس وقت
(از ڈاکٹر بلوچ)

باب نمبر 12
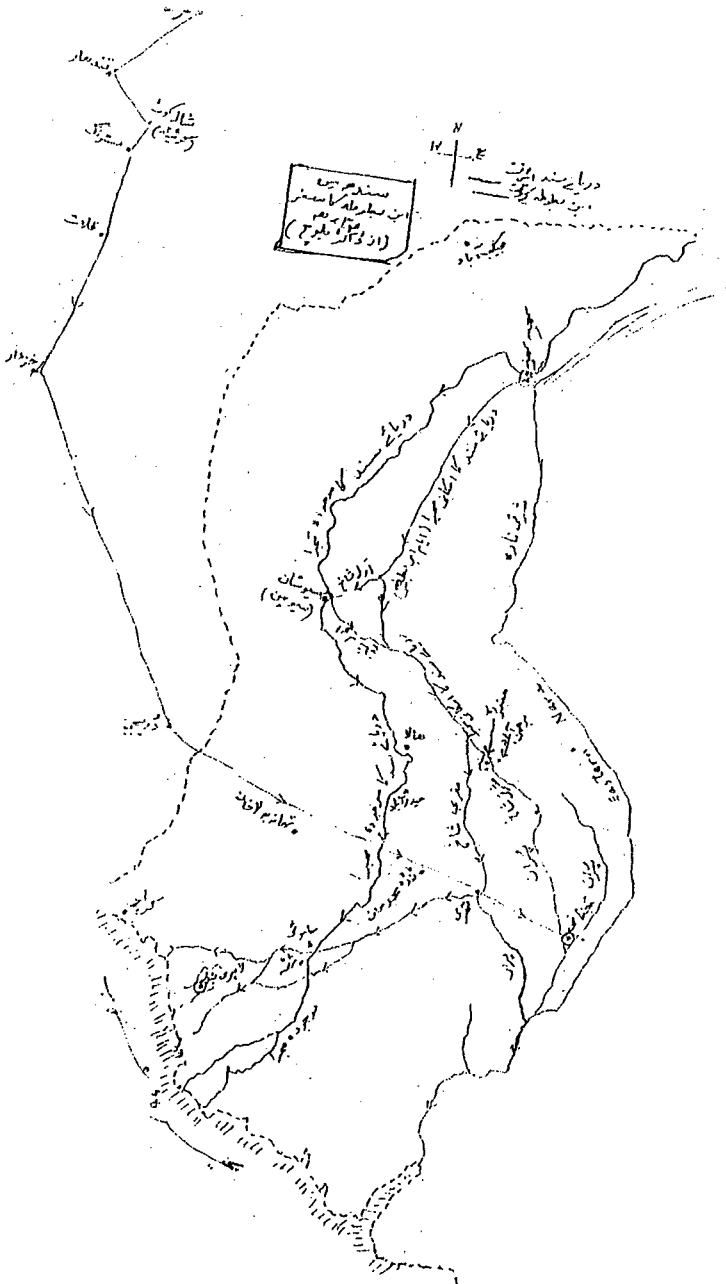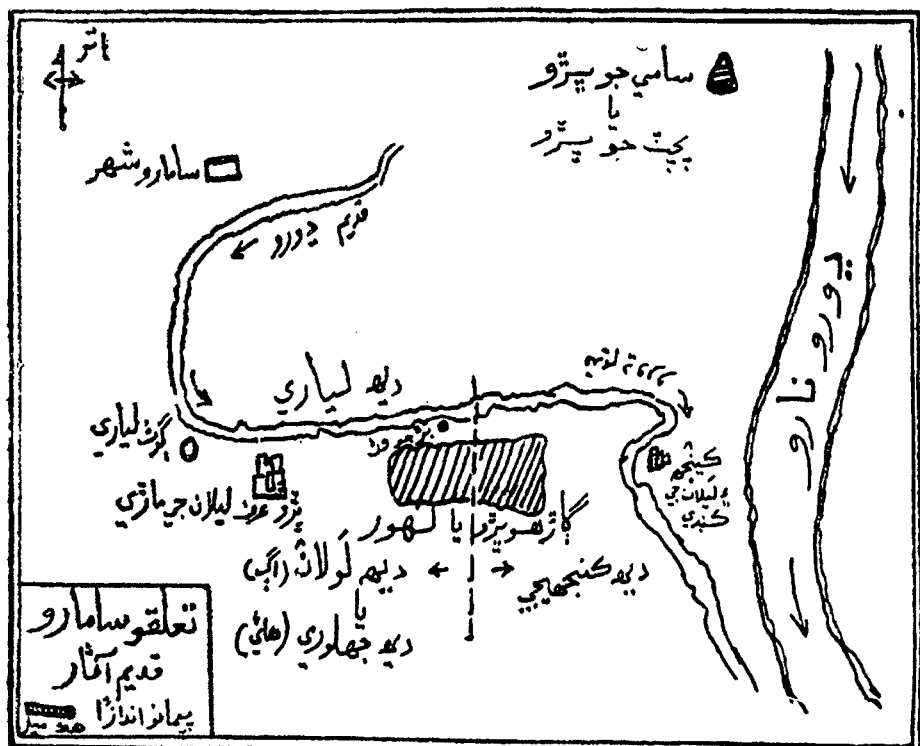
ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی
سندھی زبان وادب اور موسیقی سے متعلق تحقیقات

سندھی زبان

عہدِ قدیم سے صوبہ سندھ میں سندھی زبان رائج ہے جو پنجاب کے جنوبی علاقوں اور بھارت کے بعض علاقوں میں بھی بولی جاتی ہے۔ سندھی زبان دراصل مقامی سرزمین اور ماحول ہی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ محققین کے نزدیک سندھی زبان کی لسانی تشکیل کا سب سے پہلا دور ۴۰۰ء سے ۷۰۰ء ہے۔ ۶۶۲ء سے ۷۱۱ء تک سندھ میں برہمن چچ خاندان کی حکومت رہی۔ پانچویں صدی عیسوی خصوصاً ایرانی بادشاہ کے عہد سے سندھ اور ساسانی سلطنت کے تعلقات اُستوار ہوئے۔ اسی عہد میں فارسی الفاظ سندھ میں رائج ہوئے۔ (۱)

عربوں کے عہد میں سندھ اور سندھی زبان

سندھ میں عربوں یا درست الفاظ میں اسلامی حکومت کا آغاز 711ء میں محمد بن قاسم کی فتحِ سندھ سے ہوتا ہے۔ یہی وہ مبارک عہد تھا جب عوام نے جوق در جوق دینِ اسلام قبول کیا اور اسلامی معاشرے کی

اصطلاحات اور عربی زبان کے الفاظ سندھی زبان کا حصہ بنے۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ کفر و اسلام کی پہلی آویزش یعنی غزوۂ بدر میں ۳۱۳ صحابۂ کرام شریک ہوئے اور سندھ پر عربوں کی اسلامی حکومت بھی ۳۱۳ سال تک ہی رہی۔ یہی وہ عہد ہے جب اسلامی، دینی تعلیمی اور اقتصادی نظام سے اہلِ سندھ روشناس ہوئے اور انھوں نے اسلامی ثقافت کے وہ گہرے اثرات قبول کیے جو مرورِ زمانہ کے باوجود آج تک موجود ہیں۔ اسی عہد میں سندھ میں عربی زبان و ادب کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور سندھی علما و فضلا نے عربی دانی میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ یہی وہ دور ہے جب عربی و دینی علوم میں اہلِ سندھ نے عالمِ اسلام کے اہم مراکز میں سندھ کا نام روشن کیا۔ منصورہ، دیبل اور دوسرے شہروں کی تعلیم گاہوں سے فارغ التحصیل ہونے والے سندھی علماء نے دنیائے اسلام میں علمی خدمات کی بنا پر شہرت حاصل کی۔ آج بھی تاریخ کی مستند کتب میں ان علما کا ذکر اور کارنامے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی عہد میں متعدد عرب قبائل نے سندھ کو اپنا وطن بنایا اور ان کی آنے والی نسلیں ہمیشہ کے لیے سندھ میں آباد ہو گئیں۔ انھوں نے عربی کے ساتھ ساتھ سندھی زبان میں بھی مہارت حاصل کی۔ ''عجائب الہند'' کے مصنف بزرگ بن شہر یار لکھتے ہیں کہ اسی عہد میں یعنی ۲۷۰ھ منصورہ کے ایک عالم نے دیسی بھاشا (سندھی زبان) میں قرآن مجید کا اوّلین ترجمہ کیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب عرب شعرا مثلاً مطیع بن ایاس، علزمہ بن عبداللہ، القیشری اور دیگر شعراء اور علماء سندھ میں آئے اور سندھی شعرا مثلاً ابوعطا سندھی، عبا سندھی وغیرہ نے عربی شاعری میں بلند مقام حاصل کیا۔ ابوعطاء سندھی کا دیوان ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی تحقیق سے شائع ہو چکا ہے۔ (۲)

مندرجہ بالا حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں کا ۳۱۳ سالہ دورِ حکومت ہی وہ دور ہے جب سندھی اور عربی زبان کے باہمی روابط کا آغاز ہوا اور یہ روابط مزید استوار ہوئے۔ عربی اور سندھی کے باہمی رشتے اور فروغ سے آٹھویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک تقریباً تین سو برس میں ایک مشترکہ سندھی زبان وجود میں آئی جس نے عربی کی بہترین خوبیاں جذب کر لی تھیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سندھی زبان لکھنے کے لیے خطِ نسخ کا استعمال کیا گیا۔ یہ ایک نا قابلِ فراموش حقیقت ہے کہ تب سے اب تک سندھی زبان کا خط، خطِ نسخ ہی ہے۔ یہی وہ خط ہے جس میں ایک ہزار سال سے زائد عرصے سے قرآنِ پاک کی کتابت کی جا رہی ہے۔ (۳)

سندھی زبان کا تعمیری اور ارتقائی دور

محققین کے نزدیک ۱۰۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک کا دور سندھی زبان کا تعمیری دور کہلاتا ہے۔ ۱۱۰۰ء تک سندھی زبان کے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر ہو چکی تھی اور یہی وہ زمانہ ہے جب سندھی زبان آج کے پورے سندھ، بلوچستان کے بعض علاقوں، بھارت کے چند اضلاع اور ملتان تک کے علاقوں میں رائج ہو چکی تھی۔ سندھ میں سومروں کا دورِ حکومت ۱۰۵۰ء سے ۱۳۵۰ء تک رہا۔ سومروں کی طاقت کے مراکز ہاکڑہ اور پران دریاؤں کی اراضی میں یعنی سندھ کے مشرقی اور جنوبی خطوں میں قائم ہوئے۔ جنوبی خطّے سے متصل ''کچھ'' کے علاقے میں سمہ قبائل کی حکومت قائم ہوئی۔ انہی آبادیوں کے سبب سندھی زبان کچھ تک پھیل گئی۔ اسی زمانے میں سندھی زبان کے مشہور رومانوی قصے سسی پنوں، سہنی میہار، عمر مارئی، مومل رانو، مورڑو مگرمچھ، سورٹھ رائے ڈیاچ وغیرہ وجود میں آئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب دو بھائیوں یعنی دودو اور چنیسر کے درمیان حصولِ تخت کی بنا پر نزع پیدا ہوا اور معروف رزمیہ داستان ''دودو چنیسر'' لکھی گئی۔ اسی دور میں سندھی اصنافِ شعر ''بیت'' اور ''کافی'' (۴) کا رواج رہا۔ عربی میں قصیدے کو ''قافیہ'' اور ''کلمہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ اسی سے متاثر ہو کر ''قاضی وکلام'' کے عنوان سے نظمیں کہی گئیں۔ یہی صنفِ سخن آج تک سندھ میں رائج ہے۔

سمہ خاندان کے عہد میں سندھی زبان کا ارتقا

سندھ میں سمہ خاندان کا دورِ حکومت ۱۳۵۰ء سے ۱۵۴۰ء تک رہا ہے۔ اس عہد میں بنیادی تبدیلی یہ آئی کہ عربی کے بجائے فارسی سرکاری زبان بنی البتہ عربی زبان کا درس وتدریس سے تعلق برقرار رہا۔ یہ سلسلہ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر تک جاری رہا۔ سمہ عہد میں ہی دو معروف عوامی داستانیں یعنی ''نوری جام تماچی'' ''دولھہ دریا خان'' سے سندھ کی روایتی داستانوں کی اصناف میں اضافہ ہوا۔ اسی عہد میں سندھی زبان میں نہایت اعلیٰ اخلاقی شاعری کا آغاز ہوا جس کے اس عہد کے نمائندہ شاعر قاضی قادن (۵) ہیں۔ ان کی شاعری کی بنا پر سندھی زبان کے شعری سرمائے کے علاوہ ذخیرۂ الفاظ میں بھی بے حد اضافہ ہوا۔ قربِ مکانی کی بنا پر سندھی اور سرائیکی زبانوں میں قریبی اتصال پیدا ہوا۔ اس عہد میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ ملتانی کی تبلیغ کا خاص مرکز

سندھ رہا۔ سندھی ذاکر حضرت بہاء الدین زکریاؒ ملتانی کی محافلِ سماع میں سندھی بیت اور کافیاں گانے لگے اور موجودہ پنجاب کے جنوبی علاقوں میں بھی سندھی زبان کو فروغ حاصل ہوا۔(٦)

ارغون، ترغان اور مغلیہ عہد میں سندھی زبان

ارغون، ترغان اور مغلیہ عہد زمانی اعتبار سے ۱۵۲۰ء سے ۱۷۰۰ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس عہد میں بھی گذشتہ عہد ہی کی طرح فارسی زبان علمی وادبی اور تعلیمی حیثیت میں فوقیت کی حامل رہی۔ اس عہد میں سندھی زبان کو مزید ارتقا حاصل ہوا۔ نئے نئے موضوعات اور نئے نئے خیالات کو شعرائے کرام نے نظم کیا۔ اس عہد کے صوفیائے کرام کے حلقوں سے جو معروف شاعر سامنے آئے ان میں شاہ عبدالکریم، شاہ لطف اللہ قادری اور شاہ عنایت اللہ رضوی معروف ہیں۔ ان شعرائے کرام نے فکر و معانی کی نئی راہیں استوار کیں۔ اسی عہد میں فارسی زبان کی جگہ سندھی زبان کی نئی نئی اصطلاحات رائج ہوئیں جن کی بناء پر سندھی زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں بے حد اضافہ ہوا۔

عہد کلہوڑا وتالپور میں سندھی زبان کا ارتقا

سندھی شاعری کے دورِ عروج کا زمانہ محققین کے نزدیک ۱۷۰۰ء تا ۱۸۴۳ء کہلاتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جب مغلیہ حکومت کو زوال اور عہدِ برطانیہ کا آغاز ہوا۔ اس دور میں پہلے کلہوڑوں کا دورِ حکومت ۱۷۰۰ء سے ۱۷۸۴ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد تالپوری عہد آیا جو ۱۷۸۴ء سے ۱۸۴۳ء تک جاری رہا۔ اس دور کے آغاز میں عظیم صوفی شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ پیدا ہوئے جن کی شاعری کی بناء پر سندھی زبان کو عالمی شہرت حاصل ہوئی۔ اسی عہد میں سندھی زبان کو ابتدائی تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا۔ اسی وجہ سے شیخ ابوالحسن بن عبدالعزیز ٹھٹھوی نے ۱٦۸۸ء کے لگ بھگ دینی نصاب پر مشتمل کتاب ''مقدمۃ الصلوٰۃ'' سندھی زبان میں لکھی جسے سندھی زبان کی پہلی درسی کتاب کا درجہ حاصل ہوا۔ ان کے بعد مخدوم ضیا الدین ٹھٹھوی (۷) نے بھی درسی کتاب لکھی۔ بعد میں تحریر وتصنیف کا یہ سلسلہ تیرھویں صدی عیسوی تک چلا۔ اسی عہد کے عظیم عالم حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی (۸) حضرت مخدوم عبداللہؒ (۹) اور دیگر بزرگوں نے سندھی زبان میں درجنوں کتب تصنیف کیں۔ اس

کے ساتھ ساتھ فارسی سندھی اور سندھی فارسی لغات پر معیاری کام ہوا۔

انگریزی عہد میں سندھی زبان

سندھ پر انگریزوں کی حکومت ۱۸۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک رہی۔ یہ عہد اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل تھا کہ انگریزوں نے صدیوں سے رائج فارسی زبان کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان قرار دیا۔ ساتھ ہی سندھی کو ۱۸۸۱ء میں سرکاری، کاروباری اور انتظامی امور کے لیے اہم زبان کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ ۱۸۵۲ء میں سندھ کے اسسٹنٹ کمشنر بی ایس ایلس نے علمائے سندھ کے وضع کردہ سندھی حروف کو سرکاری طور پر تسلیم کرلیا جس سے درسی و دیگر کتب لکھنے کی راہ ہموار ہوگئی۔ ابتدا میں لیتھو اور اس کے بعد ٹائپ کے چھاپے خانوں کے قیام سے سندھی زبان کی کتب کی اشاعت میں انقلاب آیا اور ہر موضوع پر کتب شائع ہونے لگیں۔ ۱۹۳۵ء میں جب سندھ بمبئی سے علیحدہ ہوا تو میٹرک تک سندھی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد سندھی زبان کا ارتقاء

قیامِ پاکستان کے بعد سندھی زبان کو بے حد ترقی حاصل ہوئی۔ سندھی زبان اور سندھی کے علمی و ادبی سرمائے کے تحفظ کے لیے کئی ادارے قائم کیے گئے جن میں سندھی ادبی بورڈ، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ ثقافتی مرکز اور سندھی لینگویج اتھارٹی نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان اداروں نے سندھی زبان کے فروغ اور ترقی کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان اداروں کی شائع کردہ علمی و ادبی و تاریخی کتب کے علاوہ سندھی زبان کے اخبارات، رسائل، ڈائجسٹوں نے بھی زبان کی بے انتہا خدمت انجام دی۔

سندھ کے نامور محقق اور عالم شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ کے مطابق دورِ اول کے سندھی ادب کے نمونے ناپید اس لیے ہوئے کہ سندھی علماء نے عربی اور فارسی زبانوں پر بھرپور توجہ دی جس کی بنا پر وہ مقامی زبان پر توجہ نہ دے سکے۔ یہی وجہ ہوئی کہ ابتدائی زمانے کا کلام ضائع ہوگیا۔ البتہ مجہول اشعار باقی رہ گئے۔(۱۰)

سندھی نثر کا آغاز وارتقاء

قدیم زمانے کی سندھی نثر کے نمونے غیر موجود ہیں۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤپوتہ کے مطابق اس کی بڑی وجہ سندھی علما کی عربی و فارسی زبانوں پر بھرپور توجہ اور مقامی زبان سے بے رغبتی ہے۔ سندھی نثر کے قدیم ترین نمونے عبدالرحمن گڑھوری کے اخلاقی رسالوں میں ملتے ہیں۔ قدیم زمانے کی سندھی نثر عربی و فارسی متون کا لفظی ترجمہ ہوتا تھا جس کی واضح مثال اخوند عزیز اللہ مٹیاروی (۱۷۴۶۔ ۱۸۲۴ء) کا کیا ہوا قرآن پاک کا ترجمہ ہے۔ سیّد میراں محمد شاہ، غلام حسین اور کیول رام نے سندھی نثر کو اپنی مفید تصانیف و تالیفات کے ذریعے مزید ترقی دی۔ شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ (۱۸۵۵۔۱۹۲۹ء) سندھی نثر کے عظیم عالم اور بے شمار کتابوں کے مصنف و مؤلف تھے۔ ابتداء میں انہوں نے شاہ لطیف کی سوانح لکھی نیز بعض انگریزی ڈراموں کے سندھی ترجمے بھی کیے۔ ان کے معروف سندھی ڈراموں ''خورشید'' اور ''زینت'' میں ان کی نثر اعلیٰ سندھی نثر کا نمونہ نظر آتی ہے۔ اسی عہد کے دیگر نثر نگار مثلاً احمد خان تگیو، خان جلبانی وغیرہ نے سندھی مقفیٰ نثر نگاری کی۔ اردو زبان کی معروف داستان ''فسانۂ عجائب'' کا سندھی ترجمہ اخوند لطف اللہ نے ''گلِ خنداں'' کے عنوان سے کیا جو سندھی نثر کا اعلیٰ شاہکار ہے۔ اس کے علاوہ قاضی ہدایت اللہ مشتاق بھی ایک نامور نثر نگار تھے جنھوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت پر ''مصباح العاشقین'' اور ''نصرۃ العاشقین'' نامی کتب لکھیں۔ مولوی محمد بخش واصف اور حکیم فتح محمد سیوہانی بھی سندھی زبان کے نامور نثر نگار گزرے ہیں۔ اسی طرح عبدالرزاق میمن (وفات ۱۹۴۲ء) نے نظم اور نثر دونوں میں امتیاز حاصل کیا۔ مولانا دین محمد وفائی (وفات ۱۹۵۱ء) سندھی نثر کے عظیم نمائندے اور معروف اخبار ''الوحید'' کے ایڈیٹر تھے۔ اسی طرح محمد صدیق میمن نے بھی سندھی نثر نگاری کے نمونے چھوڑے۔ قاضی عبدالرزاق اور محمد صالح بھٹی نے بھی سندھی نثر نگاری کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔ (۱۱)

بعد کے سندھی نثر نگاروں میں عثمان علی انصاری، محمد اسماعیل عرسانی، آغا تاج محمد، پیر علی محمد راشدی، سید حسام الدین راشدی، رحیم داد خان مولائی شیدائی، مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ، لطف اللہ بدوی، محمد عثمان ڈیپلائی اور دیگر حضرات کے سندھی نثری کارنامے تاریخ کا حصہ ہیں۔

سندھی نثر کے ارتقاء میں ہندو مصنفین کی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔ان مصنفین میں ڈاکٹر گر بخشانی، جیٹھ مل، بھیرومل چنداڈوانی،لیکھراج کشن چندعزیز کا نام اوران کی خدمات سندھی نثر کی تاریخ کا انمٹ حصہ ہیں۔(۱۲)

سندھی زبان کا تاریخی پس منظر

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی دیگر علمی وتحقیقی یادگاروں کے علاوہ ہمیں اردو زبان ان کے معلومات افزا مقالات اور مضامین ملتے ہیں۔ان کا ایک اہم مقالہ ماہنامہ قومی زبان کراچی بابت مارچ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا جس کا عنوان ''قیام پاکستان کے بعد سندھی ادب کا فروغ'' ہے۔اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے سندھی زبان کے تاریخی پس منظر کے بارے میں درج ذیل مفیداور معلومات افزا حقائق پیش کیے تھے:

۱۔آج سے تیرہ سو برس پہلے سندھی زبان کی تحریری وحدت مستحکم ہوئی۔سندھ میں آمد اسلام کے وقت مختلف علاقوں کے اپنے اپنے مخصوص رسم الخط تھے۔جب لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے اور کلام پاک کی تعلیم عام ہوئی تو ہر جگہ قرآنی رسم الخط کو اپنایا گیا اور اس تحریر وحدت سے معیاری سندھی زبان جس کو بیرونی نے منصورہ کے مرکزی علاقے کی 'سیندھوی (ع:سیندب) کہا ہے، پروان چڑھی۔چنانچہ عرب اسلامی دور میں سندھی کو عربی کے شانہ بشانہ فروغ حاصل ہوا۔

۲۔چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں دنیائے اسلام کے علمی حلقوں میں سندھی لغات و مصطلحات کی علمی حیثیت مسلم ہوئی چنانچہ چوتھی صدی ہجری میں محقق بشر بن عبدالوہاب الغزاری نے اپنی کتاب 'تفاسیر الادویۂ' میں اور بعد میں بیرونی نے اپنی کتاب 'الصیدنہ' میں جڑی بوٹیوں کی ان کے بین الاقوامی اسما اور مصطلحات سے نشان دہی کی تو برصغیر کی زبانوں میں سے صرف سندھی اور ہندی نام گنوائے۔

۳۔ساتویں صدی ہجری سے لے کر سندھ کے صوفیائے کرام نے اپنی دل پسند

نظموں (مولود، قافی اور بیت) میں توحید، انسانی برادری اور رواداری کی اعلیٰ اسلامی اقدار کو پیش کیا جس کے نتیجے میں نویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی تک فارسی اور ہندی یا ہندوی کے ساتھ ساتھ سندھی برصغیر میں تصوف کی زبان بن گئی۔ چنانچہ بابا فرید ثانی، بابا گرو نانک، شیخ عبدالجلیل چوہڑ بندگی لاہوری، فقیر پراٹھ ناتھ کاٹھیاواڑی، درویش دادو دیال احمد آبادی جے پوری جیسے مشہور صوفیوں اور سنتوں نے تصوف کی اس مانی ہوئی زبان، سندھی میں دوہڑے، اشلوک اور بیت کہے۔ جمال الدین ابوبکر الہ آبادی نے اپنی کتاب 'تذکرۂ قطبیہ' میں جو ۹۴۷/۹۶۱ (۱۵۴۰۔۱۵۵۴ء) کے دوران مرتب کی، سماع کی ان محفلوں کا ذکر کیا ہے جو لاہور میں حضرت شیخ عبدالجلیل کی درگاہ پر منعقد ہوتی تھیں، جن میں جب سندھی ذاکر اور قوال سندھی میں عارفانہ کلام گاتے تھے تو سامعین پر وجد طاری ہو جاتا تھا۔ غوثی نے اپنی کتاب 'گلزارِ ابرار' (اردو ترجمہ 'اذکارِ ابرار') میں سندھ کے باکمال عالم وصوفی قاضی قادن (۸۷۰۔۹۰۸ھ/۱۴۶۰۔۱۰۰۸ء) کا ذکر کیا ہے جو اس نے ۱۶۰۲ء میں برہان پور میں سنے۔

۴۔ گیارھویں صدی ہجری (سترھویں صدی عیسوی) میں سندھ کے علما اور اساتذہ نے طریقۂ تعلیم میں یہ انکشاف کیا کہ جب نو آموز بچے کو ابتدائی تعلیم اپنی مادری زبان میں دی جاتی ہے تو وہ جلدی اور آسانی سے سیکھتا ہے اور اس میں زبان دانی کی وہ بنیادی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے بعد میں وہ دوسری زبانیں آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے صدیوں سے رائج تدریس کے نظام کو بدل ڈالا اور بچوں کو پہلے سندھی اور بعد میں فارسی اور اس کے بعد عربی پڑھانے لگے۔ اندازاً ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) سے مادری زبان سندھی میں ابتدائی تعلیم دینے کا یہ طریقہ رائج ہوا اور کئی درسی کتابیں لکھی گئیں جو سندھی میں ہونے کی وجہ سے 'سندھی' کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ان میں گیارھویں صدی ہجری کے آخر میں علامہ ابوالحسن کی لکھی ہوئی درسی کتاب 'سندھی' کو ابتدائی تعلیم کے نصاب میں مرکزی حیثیت حاصل ہوئی

۔دوسرے علما نے مختلف علوم اور موضوعات پر درجنوں مستند اور معیاری کتابیں سندھی میں لکھیں جو ثانوی اور اعلیٰ سطح پر پڑھی اور پڑھائی جانے لگیں۔"

موسیقی اور سندھی موسیقی پر تحقیقات

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی دلچسپی کے موضوعات میں فن موسیقی اور خصوصاً سندھی موسیقی بھی تھا۔آپ نے مختلف اوقات میں مطبوعہ کتابوں کی شکل میں اپنی تحقیقات کو شائع کرایا اور محفوظ کر دیا۔دراصل بچپن ہی سے ڈاکٹر صاحب کو راگوں سے دلچسپی تھی اور وہ بچپن میں اپنے گاؤں سے بارہ میل کا فاصلہ پیدل چل کر بھٹ شاہ راگ سننے جاتے تھے۔آپ نے زندگی کے مختلف اوقات میں سندھ کے موسیقاروں اور ماہرین موسیقی سے نہ صرف ملاقاتیں کیں،ان سے موسیقی کے اسرار و رموز کا علم حاصل کیا بلکہ ان کی سرپرستی بھی کی۔آپ نے سندھ کے کئی موسیقاروں اور لوک فنکاروں کو ریڈیو اور ٹی وی پر متعارف بھی کرایا اور ان کی معاشی مشکلات کے حل میں معاونت بھی کی۔یہاں اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ فن موسیقی کی اصطلاحات دقیق اور غیر عام فہم ہیں۔پیش نظر مضمون میں ہمارا اصل مقصد ڈاکٹر بلوچ کی اس موضوع پر خدمات کا جائزہ لینا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جب تک فن موسیقی کی اصطلاحات کی تفہیم نہ ہو ان دقیق علمی مباحث کا سمجھنا آسان نہیں۔

فن موسیقی کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی درج ذیل کتب اہمیت کی حامل ہیں:

۱۔**Introduction to Classical Sindhi Music**: ۱۹۵۰ء میں منعقدہ پاکستان موسیقی کانفرنس کی روداد اور اس میں پڑھے گئے مقالات کو ڈاکٹر بلوچ نے Pakistan Music Congress نامی کتابچے میں مرتب کیا اور شائع کرایا تھا۔اس موقع پر ڈاکٹر بلوچ نے مذکورہ بالا مقالہ پڑھا تھا جس میں سندھی کلاسیکی موسیقی سے متعلق اپنی تحقیقات پیش کی تھیں۔

۲۔**Spanish Cante Jondo-Its origin in Sindhi Music**: اس کتاب میں ڈاکٹر بلوچ نے ہسپانوی موسیقی کی صنف یعنی لوک گیت کانتی خوندو پر سندھی موسیقی کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔یہ کتابچہ بلوچ

صاحب نے موسیقار عزیز بلوچ سے لندن میں ملاقات کے بعد لکھا تھا۔

۳۔ Amir Khusrau's discourses on differentiation in Fundamental and Subsidiary principles of Music: یہ ڈاکٹر بلوچ کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جو انھوں نے ۱۹۷۵ء میں امیر خسرو کے سات سو سالہ جشن ولادت کے موقع پر اسلام آباد میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں پڑھا تھا۔ اس مقالے کی خاطر ڈاکٹر صاحب نے امیر خسرو کی تمام تحریروں کا مطالعہ کیا تھا بالآخر انھیں 'رسائل الاعجاز' میں امیر خسرو کا مقالہ 'انشعاب اصول وفروع الموسیقی' ملا۔ اس مقالے میں امیر خسرو نے تفصیل سے فن موسیقی اور سازوں سے متعلق اپنی تحقیقی اور جدید نظریات پیش کیے تھے۔ ڈاکٹر بلوچ کے مطابق اس مقالے سے امیر خسرو کی فن موسیقی پر دسترس اور تخلیقی ذہن کی بھر پور عکاسی ہوتی ہے مزید یہ کہ امیر خسرو وہ پہلے ماہر موسیقی تھے جنھوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ موسیقی با قاعدہ علم ہے اور یہ علم ریاضی کے اصولوں کے مطابق ہے۔

۴۔ سندھی موسیقی کی تاریخ: ڈاکٹر بلوچ نے اس موضوع پر عمر بھر کی تحقیقات کو سندھی زبان میں شائع شدہ اس کتاب میں پیش کیا۔ یہ کتاب ۱۹۷۸ء میں شاہ عبداللطیف بھٹائی ثقافتی مرکز بھٹ شاہ سے شائع ہوئی تھی۔ چودہ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں سندھی موسیقی کی مکمل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس بیان میں خصوصی توجہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ایجاد کردہ راگوں پر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں ڈاکٹر بلوچ نے سندھی موسیقی کے ایرانی، عراقی اور ترکی موسیقی پر اثرات کا جائزہ بھی لیا ہے۔

سندھی موسیقی کی تاریخ میں ڈاکٹر بلوچ لکھتے ہیں کہ وہ گانے یا نغمے جنہیں اوائلی دور سے لے کر وقت بوقت آج تک راگ کا نام دیا گیا اور جن کو ہند کے راگوں کی ابتدائی روایتوں کے مطابق ہندوستانی راگ اور ہندوستانی راگنیوں کے نام سے پکارا گیا انہیں ہم نے آسانی کی خاطر کلاسیکی راگوں کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔ سندھ میں کلاسکی راگوں کی روایت کو سمجھنے کے لئے سندھ کی قدیم تاریخ کے ساتھ ساتھ سماجی اور جغرافیائی پس منظر کو مدنظر رکھنا پڑے گا۔ قدیم دور سے ہی سندھ پر آریائی اثرات کے دائرے سے محفوظ کیا گیا۔ موہن جودڑو کے دور کی سندھی تہذیب ایک غیر آریائی تہذیب تھی۔ اس قدیم زمانے میں جن غیر آریائی قوموں کا سندھ اور اس کے اردگرد سے تعلق رہا ان میں دراوا اور بھیرون اقوام کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

سندھ و ہند کے مشترکہ راگوں سے متعلق ڈاکٹر بلوچ تحریر فرماتے ہیں کہ وہ راگ جو سندھ کے موجودہ راگوں کا لازمی جز ہیں اور یہی راگ ہندوستان کے راگوں کے سلسلے میں بھی شامل ہیں خصوصاً سر راگ اور سارنگ۔ یہ دونوں راگ سندھ اور ہند کے مشترک سرمائے میں شمار ہوتے ہیں۔ سارنگ سندھ کی ابتدائی سُر والی موسیقی کے سلسلے میں شامل ہے۔ یہ سندھ کے عام مقبول عوامی گیتوں کی تمام اصناف گیچ ،لوک گیت، مولود اور کافی میں سمایا ہوا ہے۔

نڑ کی ایک ابتدائی دھن کو دیسی کہا جاتا ہے۔ اس کے سروں کے بندھن بھی بنیادی طور پر سارنگ اور ملاد کے سروں میں سے ہیں۔ سر یراگ کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سندھ کے پہلے دور کا راگ ہے۔ یہ ایک خاص راگ ہے اور خاص راگ کے طور پر شامل ہے۔

سندھی کلاسیکی راگوں کا دوسرا دور آٹھویں صدی عیسویں میں شاہ عبداللطیف بھٹائی صاحب سے قبل کا دور ہے لہٰذا اس دور کے تحت سندھ میں کلاسیکی موسیقی کے سلسلے پر غور کرتے ہوئے درج ذیل پہلو نمایاں نظر آتے ہیں:

(الف) سندھ کی موسیقی نے راگ اور وجھت (وجت) میں غیر معمولی ترقی کی منازل طے کیں نیز سندھ کی موسیقی کو بیرون ملک بھی روشناس کرایا گیا۔

(ب) عرب اور ایرانی راگ سندھ میں رائج ہوئے اور ہندوستان کے دوسرے حصوں تک پہنچے۔

(ج) سندھ میں جنگنامے اور افسانے گیت کی صورت میں گانے کا فن اوج کمال تک پہنچا اور سُر والی موسیقی کی بنیاد بنا۔

(د) سندھ اور ہند میں گائے جانے والے راگوں کے درمیان ملاپ ہو۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے قریب آئے اور ان کے باہمی ملاپ سے نئے راگ تخلیق کیے گئے۔

ذیل میں ہم اس دور کے چار خاص پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ دوسری اور تیسری صدی عیسویں میں سندھ اور اس کے اردگرد کے علاقوں سے جب کہ یابنیہ قوم کے قبیلے سندھ میں آباد تھے اور میر نامی نسل کے افراد جنوبی سندھ میں سمندری کنارے پر آباد تھے، ان تمام اقوام کے شادی بیاہ کے گیت اور گانے

سندھی راگ کے جز بنے۔ جغرافیائی لحاظ سے سندھ کے شمال کی طرف جاتے ہوئے پنجاب کے جنوب میں تاک قوم کا دیس تھا جس کے مغرب کی جانب دریائے سندھ کے کنارے پر سوڈیر قوم کا سودیر دیس تھا۔ تاک قوم کے ذریعے سندھ کا ان اقوام سے رابطہ اور تعلق تھا اور اس سماجی تعلق کی بناء پر ہی باہمی راگوں اور گیتوں کا تعلق پیدا ہوا۔ جنوب میں کچھ کاٹھیاواڑ اور گجرات سے کھمبات تک تمام ممالک بشمول سندھ ایک لمبے عرصے تک سا کن سیاست اور ثقافت کے زیر اثر رہے لہذا سندھ اور ان ممالک کے راگوں میں قریبی تعلق پیدا ہوا۔ اس طرح قدیم دور سے ساتویں صدی عیسوی تک غیر آریائی اقوام کے راگ اور گیتوں کے علاوہ سندھ کے شمالی و جنوبی پڑوسی ممالک کے راگ اور سندھ کی اپنی سرزمین کے راگ اور سندھ اور ہند کے مشترکہ راگ سندھ کے پہلے کلاسیکی دور کے راگوں کا سرمایہ ہیں۔

سندھ کے کلاسیکی ادب میں کلاسیکی راگوں کا ابتدائی دور سے متعلق ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اپنی تحقیقات کے نتائج بیان کرتے ہوتے لکھتے ہیں کہ ابتدائی کلاسیکی ادب کی تاریخ کے سلسلے میں سندھ کے موجود اور قدیم راگوں کی روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ابتدائی دور سے لے کر آٹھویں صدی عیسوی تک کے اوائلی کلاسیکی دور میں درج ذیل راگ اور راگنیاں سندھ میں رائج تھیں:

بلاولی، آساری، دھناسری، جھجونتی اور کامودوری۔ یہی راگ آج تک سندھی راگوں کی تمام اصناف بشمول سندھی شادی بیاہ کے گیت (گیچ) لوک گیت، مولود اور کافیوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ بلاولی دراصل دراوڑی لفظ ویلالی راگوں کی یادگار اور بلاولی راگوں کا سرچشمہ ہے آساوی اور دھناوری جو سنسکرت میں بے معنی نام ہیں یہ قدیم غیر آریائی راگوں کی یادگار ہیں۔ ان کا تعلق بنیادی طور پر سندھ اور ملتان کے راگوں کے سلسلے کے ساتھ ہے۔

آساوری اور دھناوی کی رفاقت میں ہی سندھ کے دیگر راگ (سندھی آساوری/ ملتانی ،دھناوری) وجود میں آئے۔ توڑی جو کہ موجود ہے کسی غیر آریائی دراوڑی راگ کی یادگار ہے۔ جھجونتی کے سلسلے میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اپنی تحقیق کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں جھجونتی بھی غیر سنسکرتی مادے جھٹ سے مشتق ہے۔ سندھی راگوں کی ایک روایت کے مطابق یہ جھجھوٹی ملاپ سے ایجاد کیا گیا ہے اور یہ دونوں سندھی راگ ہی

ہیں۔

سندھ کے شمالی طرف آبادتا کا اور سوویر اقوام کے راگوں سے متعلق ڈاکٹر بلوچ نے اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کرتے ہوئے جن راگوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے ان میں دراوڑ بھیروں، آ بھیروں، ساکن سویرتا اور میر نامی اقوام کے راگ شامل ہیں۔ دراوڑی راگ بلاولی اور بھیروں راگ بھیروی دور قدیم میں راج ہوئے اور یہ قدیم دور میں مختلف ناموں مثلاً آ بھیری، آ بھری آ ھری آ ھیری یا آ ھیر کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ دور قدیم میں ان کی صورت کیا تھی اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ ہندوستانی موسیقی میں ان راگوں کی ابتدائی شکل ملاپ کی صورت میں رہی جو کہ دیگر غیر آریائی اور سندھی راگوں کے سلسلے سے وابستہ ہیں۔ جبکہ جوگھیا اور آساوری کے ملاپ سے آ ھیری نامی راگنی نسبتاً کچھ بعد کے دور میں شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ ان کے اوائلی صورت ٹوڑھی اور سندھورا کی رفاقت والی تھی۔ سندھ میں اس وقت صرف شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمتہ اللہ علیہ کے راگوں میں قدیم سُر آبری (آ بھری) کے نام سے یادگار ہے۔ یہ سندھ اور پھر گجرات میں رائج ہوئے اس کے بعد ہندوستان میں شہرت پائی۔ شروع میں (سکہ) گانے کو راگ گیتی کے بدلے یادادھارت گیتی کے سلسلے میں شمار کیا گیا البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سک گانے کو راگ کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا۔

سندھ تا کھمبات جنوبی خطے کے راگوں سے متعلق اپنی تحقیقات میں ڈاکٹر بلوچ لکھتے ہیں کہ سندھ سے لے کر گجرات اور کھمبات تک سارا خطہ ساکوں کی حکومت کے زیر اثر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کے مختلف علاقائی راگ تمام خطے میں رائج تھے۔ سندھ کی سرزمین سے وابستہ راگوں کا راگ راسڑی کہلاتا تھا جو کہ بعد میں سورٹھ یا سورٹھی کے نام سے مشہور ہوا جبکہ گجرات تک آباد گرجر (گجر) قوم کا راگ گجری تھا کھنبات ملک کا راگ دور قدیم میں کامپورجی کاموجی کمباتی، یا کمیاتی کے نام سے جانا جاتا تھا اور یہی راگ بعد میں کماج یا کماچ گیتوں کے نام سے باقی رہا۔ سورٹھ گجری اور کھنباتی راگنیاں موجودہ سندھی راگ کی بنیاد میں سمائی ہوئی ہے۔

سندھ میں پیدا شدہ دیگر راگوں سے متعلق ڈاکٹر بلوچ اپنی تحقیقات کے نتائج بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ساکا اور تاکا قوم کے سک اور تک راگ بنیادی طور پر سندھ سے ہی وابستہ راگ تھے جو بعد میں سندھ سے باہر ہند میں بھی مشہور ہوئے۔ سندری، سندھی، وارتی، سندرا، سندھورا، سندھری، سندھو، سہر سندھو، سندھا سندھ کے

نام سے منسوب وہ راگنیاں ہیں جو سندھ کے باہر کے علاقوں میں بھی مشہور رہی ہیں۔انھوں نے اتنی شہرت حاصل کی کہ ہندی راگوں کے دائرے میں داخل ہوگئیں۔سندھ میں ان کے علاوہ دیسی راگوں کی دیگر اقسام اور کئی قسم کی دھنیں رائج رہیں ہیں۔دیسی جو کہ سندھ کی موجودہ سریلی موسیقی کا ایک خاص سُر (راگ) ہے اور اس کے علاوہ سندھ کی عوامی موسیقی میں نڑ کی ایک قدیم دھن توڑی جو لوک گیتوں میں شامل ہے۔یہ سندھ کے پرانے دیسی راگوں کی یادگار ہے۔

سندھی موسیقاروں کی بیرون ملک شہرت کے بارے میں ڈاکٹر بلوچ لکھتے ہیں کہ آٹھویں صدی کے اوائل میں سندھ دمشق کی اموی خلافت اور بعد میں عباسی خلافت کا ایک صوبہ بنا اور اسلامی تہذیب وثقافت کے اثرات سے مشرف ہوا۔سندھ کے علما فقہا، مؤرخین موسیقار، صراف اور دیگر فنکاروں نے شام اور عراق کے درباروں تک رسائی حاصل کرکے بڑی شہرت حاصل کی۔اس دور میں سندھی موسیقی کے اثرات اندلس تک جا پہنچے تھے۔آج تک سندھی بھیروی راگ اندلس کے لوک گیت کانتی خوندو کی تین مختلف لے سیکد لا، سولیا اور گندنگو کی صورت میں موجود ہے۔ڈاکٹر بلوچ نے ثابت کیا ہے کہ سندھی بھیروی اور لوڑھاؤ کو سندھی موسیقاروں نے اسلامی دور میں عرب ممالک اور اندلس میں مشہور کردیا تھا۔

عرب ایرانی راگ اور سازوں کا سندھ میں رائج ہونے سے متعلق ڈاکٹر بلوچ اپنی تحقیقات میں لکھتے ہیں کہ اسلامی دور کی مشترکہ ثقافتی سرمایہ کے سبب جن عرب ایرانی راگوں اور سازوں کا سندھ میں رواج ہوا اور رفتہ رفتہ یہ راگ سندھی موسیقی کے جز خاص بنے۔آگے چل کر سندھ کے مشرقی جانب ہند کے علاقوں تک قبول عام کرتے گئے اور ہندوستانی موسیقی کے لازمی جز قرار پائے۔ان راگوں میں درج ذیل شامل ہیں:

زنگولہ: عرب ایرانی موسیقی کے اہم راگوں میں سے ایک اہم راگ ہے۔اس کا پہلا شعبہ چارہ کاہ ہے جس کی چار راگنیاں ہیں دوسرا شعبہ غزل کا ہے اور اس کی پانچ راگنیاں ہیں۔یہ راگ سب سے پہلے سندھ میں مشہور ہوا سندھی میں اس جھنگلو اور ہندوستان میں جنگلہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

حُسینی: سندھ میں حُسینی راگ قدیم دور میں رائج ہوا اور سندھی ماہرین موسیقی نے اسے سماع کی محافل کے ذریعے سندھ سے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا تھا۔شاہ عبداللطیف بھٹائی کی راگ کی تنظیم میں ''حسینی

''پانچ سُروں میں سے ایک اہم سُر ہے اور یہ انفرادی صورت میں گایا جاتا ہے۔
ایمن: یہ راگ سندھ میں قدیم زمانے سے ہی رائج ہے۔ ہندوستان میں امیر خسرو نے اس راگ کے ملاپ سے مزید نئے راگ ایجاد کیے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمن خود جداگانہ اتنا زیادہ نہیں گایا گیا۔ ماہرین موسیقی کی ایک رائے بھی ہے کہ ایمن جو کہ کلیان ٹھاٹھ کا پہلا راگ ہے وہ اصل میں عربی ایرانی راگ ہی ہے اور یہ ایمن کا ہی بگڑا ہوا نام ہے۔ ایک روایت کے مطابق ایمن کو امیر خسرو نے ہندول اور تبریز کے ملاپ سے ایجاد کیا ۔اس کے علاوہ ایمن اور کاموڈ کے ملاپ سے پوریا ایجاد کیا۔ سندھ کی موسیقی میں ایمن شاہ عبداللطیف بھٹائی کے راگ کی تنظیم میں جمن کے نام سے موجود ہے اور گایا جاتا ہے۔
آھنگ: ایرانی راگ آہنگ پہلے سندھ اور پھر ہند میں رائج ہوا اور سندھ و ہند کے مقامی لوک گیتوں کی بہت سی طرزوں پر اثر انداز ہوا۔ موسیقی کی دیسی راگنی کو آہنگ کی پڑپوتی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آھنگ سے مراد ایرانی راگ ہی ہے جس کی پوتی سندھی دیسی طرز تھی ۔سندھ کے راگوں میں دیسی اس وقت دو صورتوں میں موجود ہے ایک شاہ عبداللطیف بھٹائی کے راگ سر دیسی اور دوسرا عوامی دیسی ۔ یہ لے نڑ اور سندھ کے کئی لوک گیتوں میں سمائی ہوئی ہے۔

عرب ایرانی راگوں کے سندھ میں رواج پانے کے حوالے سے ڈاکٹر بلوچ اپنی تحقیقات میں بیان کرتے ہیں کہ دف، دائرہ ،نغمارا، دھل، گزی کے ساز اور الفاظ عرب ایرانی سازوں میں سے سندھ میں مشہور ہوئے ۔سازوں کے اسی سلسلے میں نوبت'' اور نوبت خانہ کا رواج بھی سندھ میں ہوا۔ عربی موسیقی کے سلسلے میں النوبہ کا پہلا ذکر مصنف ابوالفرج اصفہانی کی کتاب 'کتاب الاغانی' میں ملتا ہے جس سے مراد گانوں کا ٹولہ ہے ۔اسی دور میں کئی عظیم المرتبت اولیائے کرام کے مزارت، درگاہوں پر بھی نوبت بجانے کا رواج پیدا ہوا۔ سومروں کے دور حکومت میں سہون کے حضرت شیخ عثمان مروندی (قلندر) لال شہباز اور ضلع ٹھٹھہ کے مشہور ولی شیخ حسین عرف پیر پٹھو کی درگاہوں پر نوبت بجنی شروع ہوئی اور آج تک بجتی ہے۔

اسی کتاب میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے سماع سے متعلق تحقیقات کے نتائج تحریر کرتے ہوئے لکھا کہ ساتویں صدی ہجری (13 ویں صدی عیسوی) میں حضرت غوث بہاء الحق ملتانی کے دور سے سندھ میں سماع کا

سلسلہ جاری ہوا جو آئندہ تین سو سالوں تک سندھ کے علاوہ سندھ سے باہر بھی جاری رہا۔صوفی بزرگوں کے ہاں سماع کا سلسلہ حق اور حقیقت کی جانب مائل کرنے والے پاکیزہ احساسات اور قلبی سرور پیدا کرنے کی خاطر جاری کیا گیا۔

دسویں صدی ہجری میں ٹھٹہ میں مبین سید علی شاہ شیرازی نے سماع کی محفلیں منعقد کیں اور ان کے بعد ان کے معاصر شاہ کریم نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا

غوث بہاء الدین ملتانی کے ہاں سماع کے سلسلے کی بنیاد ذکر پر رکھی گئی تھی۔

مخدوم نوح ہالائی کی درگاہ میں بھی سماع کا سلسلہ جاری تھا۔

جھوک میدان پور میں بھی سماع کا سلسلہ جاری رہا جو اب تک جاری ہے۔

پیر صاحب پگارہ کی درگاہ پر سماع کا سلسلہ جاری ہے جو بغیر کسی ساز و سرور کے ہے۔

سماع کی ان محافل کا اصل مقصد پاکیزگی اور تزکیہ نفس تھا۔سماع کے سلسلے میں اہم بات سماع میں استعمال کرنے والے الفاظ ہیں۔قوالی کے موجد امیر خسرو قرار دیے گئے ہیں جبکہ مولود خالصتاً سندھ کی صنف سخن ہے۔مولود میں دراصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں اشعار ایک خاص اور منفرد طریقے سے پڑھے جاتے ہیں جو سندھ کے ساتھ مخصوص ہے۔سندھ میں مولود کی تاریخ اندازاً 300 سال قدیم ہے۔شاہ عنایت رضوی نصرپوری، شاہ عبداللطیف بھٹائی، مخدوم عبدالرؤف بھٹی اور مخدوم محمد اسماعیل کے کلام میں مولود بھی شامل ہیں۔

سندھی موسیقی پر ایک اہم کتاب کی تحقیق واشاعت

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے سندھی موسیقی کی تحقیقات کے حوالے سے ایک اہم کام شاعر رمضان واڈھو کی کتاب ''علم موسیقی'' کی تحقیق،تصحیح اور بعد ازاں سندھی ادبی بورڈ کی جانب سے ۲۰۰۶ء میں اس کی اشاعت بھی ہے۔اس کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر بلوچ نے لکھا کہ یہ کتاب سندھ میں موسیقی کی روایت کے آئینے کی حیثیت رکھتی ہے۔شاعر رمضان واڈھو ایک ذہین اور ہنرمند شخص تھا جس نے ہندوستانی موسیقی کے راگوں اور تانوں کا دقت نظری سے مطالعہ کیا تھا اور پھر انھیں سندھی کافیوں کی لے سے ملانے کی بھرپور کوشش کی۔ڈاکٹر بلوچ مزید

لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۳ء میں جب وہ طالب علم تھے انھوں نے شاعر رمضان واڈھو کے پوتے امام علی فقیر کے پاس رمضان واڈھو کے لکھے ہوئے مسودات دیکھے تھے۔ انھی مسودات سے ڈاکٹر صاحب نے رمضان واڈھو کی کتاب ''علم موسیقی'' اور کافیوں کے دیوان اپنے قلم سے نقل کیے تھے۔ ساٹھ سال بعد ڈاکٹر صاحب نے اس مواد کی مدد سے رمضان واڈھو کی علم موسیقی پر لکھی تحریروں کو یکجا کیا اور ''علم موسیقی'' کے عنوان سے شائع کرایا۔

سندھی زبان میں تحقیق اور محقّقین

سندھی زبان میں علمی تحقیق اور محقّقین کے حوالے سے جہاں اہلِ سندھ میں سے علماء شامل ہیں وہیں مستشرقین نے بھی تحقیقی خدمات انجام دیں۔ ان مستشرقین میں کیپٹن جان اسٹک، جان بیمس، ارنسٹ ٹرمپ، سر راف ٹرنر، سر جارج گیریسن و دیگر شامل ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ ہندو محقّقین مثلاً جیرامداس، ڈاکٹر چھمن مولچند خوبچندانی، بھیرومل مہرچند آڈوانی، ڈاکٹر ہوتچند مولچند گربخشانی' ڈاکٹر مرلی دھر جیٹلے و دیگر شامل ہیں۔ سندھ کے جن مسلمان محقّقین نے سندھی زبان و ادب کے فروغ اور تحقیق میں نمایاں خدمات انجام دیں ان میں سرفہرست نام ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ صاحب کا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ، ڈاکٹر غلام علی الانہ، ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو' محمد سومار شیخ، ڈاکٹر حید رسندھی، پروفیسر علی نواز میمن، مرزا قلیچ بیگ، ڈاکٹر الھداد بوھیو، سراج میمن، ڈاکٹر خادم بروہی، حکیم فتح محمد سیوہانی و دیگر حضرات شامل ہیں۔ ان تمام حضرات میں محقّقین کے نزدیک علمی، تحقیقی اور معیاری لحاظ سے تین نام سرفہرست ہیں یعنی ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ اور مرزا قلیچ بیگ۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کی حیات و خدمات پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ بقیہ حضرات کے بارے میں سندھی زبان میں خاصا تحریری مواد موجود ہے جسے اردو زبان میں منتقل کر کے اردو دان حضرات کو ان محقّقین کی علمی و تحقیقی خدمات سے متعارف کرانا ضروری ہے۔

سندھی میں تحقیق سے متعلق ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی رائے

سندھ میں تحقیق کے حوالے سے ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ تحقیقی سلسلے میں سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد سندھی میں اطمینان بخش کام ہوا ہے خصوصاً سندھی کلاسیکی ادب، لوک ادب اور سندھی لغات کے بڑے بڑے ذخیرے مطالعے میں آ کر شائع ہو چکے ہیں۔ سندھی صرف نحو پر اگر چہ کافی بنیادی کام ہوا ہے مگر اس ضمن میں ابھی مزید تحقیق کی ضرورت باقی ہے۔ سندھی زبان کی تاریخ پر خاطر خواہ تحقیق ہوئی ہے اور اس سلسلے میں جتنی معلومات مہیا ہوئی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کی دوسری ملکی زبانوں کے بمقابلہ سندھی زبان کے متعلق تحریری صورت میں زیادہ قدیم تاریخی شواہد موجود ہیں جن کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ چوتھی پانچویں صدی ہجری (۳۵۰۔۴۵۰) میں اسلامی دنیا کے علمی اور تحقیقی حلقوں میں سندھی زبان کی انفرادیت اور بین الاقوامی حیثیت تسلیم ہو چکی تھی۔ اس کا ثبوت ''صیدنہ یا صیدلہ'' یعنی پنسار (Pharmacology) کے متعلق اس دور کے دو علماء کی تحقیق سے ملتا ہے جس کا رکارڈ خوش قسمتی سے سلامت رہ گیا ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں بشر بن عبدالوہاب فزاری نامی عالم سندھ میں آئے اور انہوں نے جڑی بوٹیوں اور پنسار کے متعلق معلومات حاصل کیے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''تفاسیر الادویہ'' میں پنسار کے کئی نام سندھی اور ہندی میں درج کیے۔ چالیس پچاس سالوں کے بعد ۱۰۵۰۔۵۱ عیسوی میں مشہور محقق ابوریحان بیرونی نے جب پنسار کے متعلق کتاب لکھی تو اس میں مختلف جڑی بوٹیوں کے اسما کو یونانی، سریانی عربی اور فارسی کے علاوہ سندھی اور ہندی زبانوں میں لکھنا بھی ضروری۔ اس وقت یہ ضروری سمجھا گیا کہ بین الاقوامی سطح پر علم صیدنہ یا فارماکولاجی کے مطالعے کے لیے جڑی بوٹیوں، دواؤں اور پنسار کی اشیا کے نام اس برصغیر کی دو خاص زبانوں ہندی اور سندھی میں دیے جائیں۔ بیرونی غالباً خود سندھ میں منصورہ تک آیا اور جتنے سندھی اور ہندی نام اس سے قبل فزاری نے دیے تھے ان پر اپنی کتاب میں اضافہ کیا۔ بیرونی کی کتاب ''الصیدنہ میں پچھتر (۷۵) کے قریب جڑی بوٹیوں ادویات اور اشیاء کے نام سندھی میں درج ہیں جو کہ اس دور میں سندھی زبان کی انفرادیت اور بین الاقوامی اہمیت کے متعلق دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اتنے سارے ناموں سے سندھی میں نہ صرف طبی لغات کی وسعت کا پتہ چلتا ہے بلکہ ان ناموں کی

نوعیت کے متعلق بھی کچھ نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں مثلاً (۱) جیرو، شیروشنو، ہملو (ہرملو) منگرو یاگ، منگرو ناموں کی ساخت سے ثابت ہوتا ہے کہ آج سے ایک ہزار سال قبل کی سندھی زبان میں بھی مذکر اسموں میں آخری حرف واو ہوتا تھا۔ (۲) کھتھور۔ بلاڑی، مین۔پھل، سون۔ کٹ، رپار۔کٹ، بھائن۔ رت، رنگ ساون اور ناگھن لفظوں کی ترکیب سے ظاہر ہے کہ اس وقت سندھی زبان میں اضافی تراکیب مضاف الیہ اور مضاف، کے باہمی جوڑ والی تھیں یعنی علیحدہ حروف اضافت، جو (کا) جے (کے) وغیرہ جداگانہ استعمال نہیں ہوتے تھے (۳) لفظ۔ مور۔ کرنیوں میں مضمر نسبتی لاحقے، کا قاعدہ بھی اسی دور میں رائج ہو چکا تھا۔ (۱۳)

فزاری اور بیرونی کے قلمبند کیے ہوئے الفاظ کے ذخیرے۔ یا اس سے قبل کی عربی تصانیف میں سندھی زبان کے الفاظ اور لغات سے خصوصاً تاریخی کتاب 'فتح نامہء سندھ عرف چچ نامہ' میں شامل سندھی الفاظ کے تحقیقی مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ آج سے پندرہ سو سال قبل، پانچویں سے ساتویں صدی عیسوی میں موجودہ سندھی زبان کی بنیاد پڑی، آٹھویں سے گیارھویں صدی عیسوی کے دور میں اس کی تشکیل ہوئی اور اس کی انفرادیت اور بین الاقوامی اہمیت تسلیم ہوئی۔ (۱۴)

عباسی کلہوڑا کے بعد ٹالپور امیروں (۱۷۸۴ء ۱۸۴۳ء) نے علما و فضلا و شعراء کی بڑی قدردانی کی۔ خاص طور پر مدارس اور معروف علما کے لیے وقف و وظائف کا انتظام کیا۔ ان اقدامات سے تعلیم کو فروغ حاصل ہوا اور بعض مدرسے اعلیٰ ترین تعلیمی درسگاہیں بن گئیں۔ ۱۸۵۱ء میں مشہور و معروف انگریز ادیب و عالم رچرڈ برٹن نے، جو سندھ میں آئے تھے، ٹالپور عہد کے چھے مدرسوں (سیوہن، کھوہڑا مٹیاری، ٹرپٹ ولہار اور چوٹیاری) کالج کی سطح کی درسگاہوں میں شمار کیا ہے۔ کتاب خانے مدرسوں کا لازم و ملزوم جزو تھے اور جوں ہی مدارس اجڑ گئے تو کتاب خانے بھی اجڑ گئے۔ انگریزوں نے ۱۸۴۳ء میں جب سندھ پر قبضہ کیا تو مدارس کے وقف وظائف بند کر دیے۔ ایسے حوالے بھی ملتے ہیں کہ اہل کاروں نے مدارس کے اساتذہ اور علما سے جب بھی موقع ملا بے اعتنائی برتی۔ فارسی زبان کو بطور مملکتی زبان کے ختم کر دیا گیا جس سے تعلیمی نظام اور تصنیف و تالیف میں اس کی اہمیت ختم ہونے لگی۔ آئندہ ساٹھ سال کے بعد ۱۹ ویں صدی کے آخر تک، فارسی کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے والے کچھ باقی رہ گئے۔ اسلاف کے بعض جاہل پس ماندگان نے کتابوں کو ورثے کے طور پر مقفل کمروں میں بند کر دیا

جہاں پر بالآخر دیمک اور چھتوں سی گرتے ہوئے پانی نے ان کو تباہ کر دیا۔ بعض نے کتابوں کو سستے داموں بیچ دیا۔(۱۵)

ڈاکٹر بلوچ صاحب سندھ کے کتب خانوں کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ پچھلے پچاس برس میں سندھ میں صحرانوردی کے دوران راقم کو عموماً بارہویں صدی ہجری میں مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی، ان کے معاصرین اور بعد کے متاخرین علما وفضلا کے کتاب خانوں کے آثار نظر آئے۔ مجھے صرف اتنی مہلت ملی کہ کتابوں کے اور کاتبوں کے نام لکھ سکا، چناں چہ اکثر کتابیں جو بچ گئی ہیں نصابی ہیں تاہم بعض علمی کتابوں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔(۱۶)

سندھی زبان کی ترقی میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی خدمات

سندھی زبان کی ترقی میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کی خدمات اس قدر زیادہ ہیں کہ صرف ان خدمات پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سندھی زبان کی علمی اور تحقیقی خدمات کی بنا پر ماضی و حال کا کوئی محقق ایسا نہیں جس کی اس قدر وسیع اور عمیق خدمات ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمات کے دائرے میں جامع سندھی لغات، سندھی۔ اردو لغت، اردو سندھی لغت، رسالو شاہ عبداللطیف بھٹائی، لوک ادب، یک جلدی سندھی۔ سندھی لغت، سندھ کے صوفی شعرا (قبل شاہ عبداللطیف بھٹائی) کے کلام کی تحقیق وتدوین، سندھ کی مستند تواریخ کی تدوین وتحقیق اوراسی طرح کے دیگر کارنامے شامل ہیں۔ اسی طرح کے تمام کارناموں کے مختصر تعارف کے لیے ملاحظہ فرمائیں پیشِ نظر کتاب کا باب نمبر ۱۱۔ اس کے علاوہ پیش نظر کتاب کے علیحدہ علیحدہ ابواب میں ہم نے ڈاکٹر بلوچ صاحب کی مختلف میدانوں میں علمی اور تحقیقی خدمات کی تفصیلات پیش کی ہیں۔

مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی علمی اور تحقیقی خدمات کی بنا پر بلوچ صاحب ایک منارۂ نور یا Living Legend کا درجہ پا چکے ہیں اور جیسے جیسے وقت گزرے گا ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی علمی وعملی خدمات سے زیادہ سے زیادہ لوگ آگاہ ہوتے جائیں گے۔

حواشی باب نمبر 12

۱۔ملاحظہ فرمائیں مقالہ 'سندھی زبان' از ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ در اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، جلد۱۱، ص : ۳۴۷

۲۔دیوان نتف من شعر ابو عطا السندی - ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی تحقیق کے بعد ۱۹۶۱ء میں سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد سے شائع ہوا۔

۳۔خطِ نسخ سے قبل کتابتِ قرآن مجید کے لیے خطِ کوفی مستعمل تھا۔

۴۔سندھی زبان میں لفظ 'بیت' شعر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی جمع ابیات ہے۔ 'کافی' سندھی زبان میں نظم کی ایک قسم کا نام ہے۔

۵۔قاضی قادن بن قاضی ابوسعید بن زین العابدین بکھری حافظ قرآن اور مختلف علوم کے ماہر تھے۔ جب ۹۳ ہجری میں ٹھٹہ پر مرزا شاہ بیگ ارغون نے چڑھائی کی تو قاضی قادن کی کوششوں سے ٹھٹہ کے باشندوں کو امان نصیب ہوئی۔ قاضی قادن نے جام فیروز سمہ، مرزا شاہ بیگ ارغون، مرزا شاہ حسن اور سلطان محمود بکھری کے ساتھ زندگی گزاری۔ مرزا شاہ بیگ ارغون قاضی صاحب پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ اس کی وفات ۹۲۸ ہجری کے بعد اس کے فرزند مرزا شاہ حسن نے قاضی صاحب کو بکھر کا قاضی مقرر کیا۔ قاضی صاحب فیصلے انتہائی دیانت داری اور شرع کے مطابق کرتے تھے۔ جب سیّد محمد جونپوری سندھ میں آئے تو قاضی قادن ان کے مرید ہو گئے۔ قاضی قادن سندھی زبان کے قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ انہوں نے پیرانہ سالی میں بکھر کی قضا کے عہدے سے استعفادے کر خود کو یادِ الٰہی میں مشغول کر لیا تھا۔ ان کا انتقال ۹۵۸ ہجری میں ہوا۔

۶۔ملاحظہ فرمائیں مقالہ 'سندھی زبان' از ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ در اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، جلد۱۱، ص : ۳۴۷

۷۔مخدوم ضیاء الدین ٹھٹوی کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (وفات : ۶۳۲ ھ) سے ملتا ہے۔ مخدوم

صاحب ۱۰۹۱ ہجری میں ٹھٹہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مکرم کا نام مخدوم ابراہیم تھا۔ انہوں نے ٹھٹہ کے نامور عالم مخدوم عنایت اللہ سے تعلیم حاصل کی جن کے شاگردوں میں مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی (وفات ۱۱۷۴ء) بھی شامل تھے۔ مخدوم ضیاء الدین اپنے عہد کے نامور عالم تھے۔ انہوں نے ٹھٹہ میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا جہاں صدہا افراد نے تعلیم حاصل کی۔

انہوں نے عام لوگوں کی سہولت کی خاطر نماز، روزے اور زکوٰۃ کے مسائل کو سندھی دوہوں میں کتابی شکل میں لکھا جسے ''ضیاء الدین کی سندھی'' کہا جاتا ہے۔ مخدوم ضیاء الدین کا انتقال تقریباً اسی برس کی عمر میں ۱۱۷۱ء میں ہوا۔

۸۔ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی سندھ کے نامور عالم تھے۔ آپ کے والد گرامی کا نام عبدالغفور بن عبدالرحمن تھا۔ مخدوم محمد ہاشم مورخہ ۱۰ ربیع الاول ۱۱۰۴ ہجری کو بھورو میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی جبکہ بقیہ تعلیم ٹھٹہ کے مشہور عالم مخدوم محمد سعید اور مخدوم ضیاء الدین سے حاصل کی۔ مخدوم صاحب نے پہلے بھورو اور اس کے بعد ٹھٹہ میں مدرسہ قائم کیا جہاں سینکڑوں طلباء آپ کے درس میں شریک ہوئے۔

مخدوم صاحب ۱۱۳۵ ہجری میں حج بیت اللہ کی غرض سے حرمین شریفین گئے اور مکہ اور مدینہ منورہ کے علما سے حدیث اور تصوف کی اسناد حاصل کیں۔ حج سے واپسی پر سورت شہر میں قیام کیا اور وہاں کے بزرگ سید میر سعد اللہ سورتی سے بیعت کی۔ مخدوم صاحب نے ٹھٹہ میں قیام کے دوران بدعات اور محرم کے ماتم کو روکنے اور عورتوں کے قبروں پر جانے کے خلاف بڑا کام کیا اور کافی حد تک کامیابی حاصل کی۔ اس وقت کے حاکم سندھ میاں غلام شاہ کلہوڑو مخدوم صاحب کے معتقد تھے جن سے مخدوم صاحب نے بدعات فرو کرانے کے لیے حکم نامہ جاری کرایا تھا۔ مخدوم صاحب کی خط و کتابت نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی سے بھی تھی۔ مخدوم صاحب نے عربی، فارسی اور سندھی زبانوں میں ۱۵۰ سے زائد چھوٹی بڑی کتب تصنیف فرمائیں۔ آپ کی دو عربی کتب کے تراجم مولانا محمد یوسف لدھیانوی نے کیے جو شائع ہو چکے ہیں۔ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی نے ستر سال کی عمر میں ۶ ر رجب ۱۱۷۴ ہجری کو وفات پائی۔

مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کے حالات اور خدمات پر ڈاکٹر عبدالرسول قادری صاحب نے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جو شایع ہو چکا ہے۔

۹۔ مخدوم عبداللہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے خلفاء میں ایک کامل بزرگ تھے۔ آپ کی کرامات مشہور ہیں۔ آپ

کا مقبرہ فیروز شاہ تعلقہ میہڑ میں معروف ہے۔ یہ بزرگ ساتویں صدی کے ولیوں میں شامل ہیں۔۔

۱۰۔ملاحظہ فرمائیں مقالہ 'سندھی زبان' از ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ در اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، جلد ۱۱، ص : ۳۴۷

۱۱۔ایضاً

۱۲۔ایضاً

۱۳۔ملاحظہ فرمایئے 'صدارتی خطبہ۔ بین الاقوامی سندھی کانفرنس ۱۹۸۸ء از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔ یہ صدارتی خطبہ کتاب ''گلشنِ اردو'' مرتبہ محمد راشد شیخ کے صفحہ نمبر ۳۳۹ پر دیکھا جاسکتا ہے۔

۱۴۔ایضاً ص ۳۴۱

۱۵۔ایضاً ص ۳۴۹

۱۶۔ایضاً ص ۳۵۰

باب نمبر 13

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی
لُغت نویسی میں خدمات

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی علمی خدمات کے کئی پہلو ہیں۔ آپ بیک وقت ایک محقق، ماہرِ تعلیم، استاد، شارح، تاریخ داں، ماہر لوک ادب اور لُغت نویس تھے۔ دیگر میدانوں کی طرح لُغت نویسی میں بھی آپ نے شدید محنت، غور وفکر، تحقیق وتدقیق کے نتیجے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ اس حوالے سے آپ نے سب سے زیادہ سندھی زبان میں لُغت نویسی پر توجہ دی اور کیفیت اور کمیّت دونوں کے لحاظ سے وہ کارنامے انجام دیے جو آج تک کوئی انجام نہ دے سکا، جس کی تفصیل آگے پیش کی جائے گی۔

سندھی زبان میں لغت نویسی کی مختصر تاریخ

سندھ میں لُغت نویسی کا فن تو خاصا قدیم ہے لیکن ''سندھی لُغت نویسی'' کا آغاز اٹھارھویں صدی کے وسط سے ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزوں نے اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کی خاطر سندھی گرامر اور سندھی زبان میں لُغت نویسی کی جانب توجہ دی۔ 1835ء میں جیمس پرنسیپ نے سندھی زبان کی گرامر بہ عنوان A Grammar of Sindhee Language اور 1836ء میں ڈبلیو ایچ واتھن نے سندھی زبان کی گرامر اور اس کے ساتھ الفاظ کی مختصر فہرست بہ عنوان:

A Grammar of Sindhi Language بمبئی سے شائع کیں۔ ان دونوں نے بمبئی میں مقیم سندھی تاجروں سے سندھی زبان سیکھی تھی۔(۱)

1843ء میں انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کیا۔ اسی سال دو انگریز فوجی افسروں یعنی کیپٹن ایسٹوک اور لیفٹیننٹ آر۔ لیچ نے ''سندھی زبان کے الفاظ کا مختصر ذخیرہ'' رومی رسم الخط میں انگریزی معانی کے ساتھ شائع کیا۔ کیپٹن ایسٹوک نے سندھ میں ڈپٹی کلکٹری کے دوران سندھی زبان میں مہارت حاصل کی پھر 1874ء میں سندھی زبان کی گرامر تیار کی اور انگریزی سندھی اور سندھی انگریزی لغات پر کام کا آغاز کر دیا۔ اس کی انگریزی سندھی لُغت اور سندھی گرامر 1849ء میں چھپی۔ اس لغات میں بارہ ہزار انگریزی الفاظ کے سندھی معانی دیے گئے تھے۔ کیپٹن ایسٹوک نے ایک اور لُغت بھی بعنوان ''سندھی انگریزی ڈکشنری'' تیار کی جس کی خاطر سندھی زبان کے دو ماہرین پنڈت سچانند اور پنڈت جیٹھا رام سے معاونت بھی حاصل کی۔ اس لُغت کی اشاعت سے قبل ہی کیپٹن ایسٹوک کا انتقال ہو گیا چنانچہ یہ لُغت 1855ء میں بمبئی سے بی ایچ ایلس بیرواسسٹنٹ کمشنر سندھ نے اپنی نگرانی میں شائع کرائی۔ اس لُغت میں تقریباً بیس ہزار الفاظ تھے۔ اسی زمانے میں سندھ کے ایک عالم اخوند عبدالرحیم عباسی نے پہلی سندھی فارسی لُغت بہ عنوان ''جواہر لغات اکچار سندھی'' مرتّب کی جو 1845ء تا 1851ء کے عرصے میں تیار ہوئی۔ اس کے علاوہ پادری شرٹ اڈارم نے انگریزی سندھی لغات شائع کی۔ اسی پادری نے صادق علی مرزا کی معاونت سے ''سندھی انگریزی ڈکشنری'' بھی تیار کی۔ اور 1879ء میں اسے شائع کیا۔ اس لُغت میں اکیس ہزار چار سو پچاس الفاظ کا ذخیرہ تھا۔ ان لغات کے علاوہ 1886ء میں سنسکرت الاصل سندھی الفاظ کا مجموعہ جھمٹل نارومل نے شائع کیا۔ اس سے قبل ایک یورپی جے اے مرے نے

(۱) Verteberate Zoology of Sindh اور

Plants and Drugs of Sindh(2)

1881ء میں شائع کیں جس میں سندھ کے پرندے، درختوں، جڑی بوٹیوں کے نام رومن رسم الخط میں انگریزی معانی کے ساتھ شائع کیے۔

بیسویں صدی میں بھی سندھ میں لُغت نویسی کا کام مزید آگے بڑھا۔ اس صدی کے ابتدائی نصف میں درج

ذیل لغات شائع ہوئیں۔(۲)

''انگریزی سندھی ڈکشنری'' از دیوان کوڑے مل، 1904ء

''غریب اللغات'' از بھیرو مل مہرچند اڈوانی، 1907ء

''سندھی۔انگریزی ڈکشنری'' از پرمانند میورام، 1910ء

''انگلش۔سندھی ڈکشنری'' از پرمانند میورام، 1933ء

''لغاتِ لطیفی'' از مرزا قلیچ بیگ، 1913ء

''لغاتِ قدیمی'' از مرزا قلیچ بیگ، 1922ء

ان تمام لغات کے باوجود اب تک سندھی زبان کی جامع اور مبسوط لُغت کی ضرورت ہر دور میں محسوس کی جاتی رہی۔ سندھی زبان کی اس سب سے بڑی لُغت کا کام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کے مقدر میں لکھا تھا جنھوں نے شدید محنت کے بعد پانچ ضخیم جلدوں میں یہ کام مکمل کیا اور اس کے بعد ان جلدوں پر مکمل نظرِ ثانی اور اضافات بھی کیے اور یہ اضافہ شدہ ایڈیشن بھی اپنی زندگی ہی میں دیکھا۔ اس کی مزید تفصیلات آگے پیش کی جائیں گی۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی لُغت نویسی سے متعلق رائے

لغت نویسی کے موضوع پر ڈاکٹر بلوچ صاحب لکھتے ہیں:

''لُغت سازی ایک مسلسل عمل ہے، کسی بھی زبان کی لُغت ایک دفعہ بنا کر پھر چھوڑی نہیں جاتی لیکن بار بار بنائی جاتی ہے وہ اس لیے کہ کسی بھی زبان کے جملوں لفظوں اور اصطلاحوں کو فقط ایک ہی کوشش سے مرتب کرنا مشکل ہے۔ خاص طور پر سندھی زبان اپنی لُغت کے سرمائے کے لحاظ سے اتنی بڑی دولت مند زبان ہے جو کسی پہلی شائع شدہ لُغت کے دس دوسرے ایڈیشن شائع کیے جائیں اور ہر ایڈیشن میں بچے ہوئے الفاظ اور اصطلاحوں کا اضافہ کیا جائے تو بھی کچھ الفاظ اور اصطلاح رہ جائیں گی۔

دوسرے، علمی اور فنی لحاظ سے بھی لُغت کے پہلے ایڈیشن کو سنوارا جاتا ہے

اور ترتیب، اضافے اور سنوار ہر ایڈیشن میں چلتی رہتی ہے۔ تیسرا یہ کہ ہر زندہ زبان میں کچھ عرصے کے بعد کچھ نئے الفاظ اور اصطلاحات رائج ہوجاتی ہیں جنھیں وقت کے معیاری استعمال کے مطابق لُغت کے ہر نئے دور میں داخل کرنا پڑے گا۔ جامع سندھی لُغات کی تیاری اور تکمیل ایک جذبے اور جوش کا نتیجہ تھا اس وقت تمام اہل علم حضرات کو بڑی یہ فکر دامن گیر تھی کہ ابھی تک سندھی زبان کی اپنی سندھی سے سندھی لُغت بھی موجود نہیں۔ کسی بھی لُغت کے مطالعے سے پہلے پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ

(الف) لُغت کسے کہتے ہیں؟

(ب) لُغت نویسی کیا ہے؟

(ت) لُغت نویسی کے کون کون سے اصول اور پیمانے ہیں؟

(ث) لُغت کی کون کون سی اقسام ہیں؟

(ج) روزمرہ کے استعمال میں رائج الفاظ پر مشتمل لغات کے لیے کون کون سی باتیں ضروری ہیں؟

جہاں تک لغات کی اقسام کا تعلق ہے ان کی خاص خاص اقسام یہ ہیں:

(الف) لہجے دار یا ابھاشا، ابھاشاؤں پر مشتمل لغات: اس اقسام والی لُغتوں میں کسی بھی زبان کے کسی بھی لہجے یا ایک سے زیادہ لہجوں میں رائج شدہ الفاظ اور اصطلاحوں کے ذخیرے کو جمع کیا جاتا ہے۔

سندھ میں سندھی زبان کے لیے اس سلسلے میں سندھی زبان کے لہجوں پر زیادہ کام نہیں ہوا ہے۔ کاکا بھیرومل نے اپنی کتاب 'سندھی زبان کی تاریخ' میں سندھی زبان کے لہجوں کے بارے میں کچھ قدرے چھان بین کی ہے۔ اس کا مدار بھی گریئرسن کی کتاب ''لنگوسٹک سروے آف انڈیا'' کی آٹھویں جلد میں شامل کیے گئے مواد پر منحصر ہے ۔سندھی لینگویج اتھارٹی نے اس سلسلے میں کچھ لہجوں پر تحقیق کرائی اور یہ کتاب شائع کرائی۔

فی الحال سندھی زبان کے جن جن لہجوں پر تحقیقی کام ہوا ہے ان میں ان لہجوں کے لحاظ سے ان خطوں میں وہاں کی روزمرہ کی زبان اور زبانوں پر کافی معلومات ملتی ہیں۔

'جامع سندھی لغات' ایک بہترین اور بامقصد لُغت کہی جاسکتی ہے۔ اس لغت کی خاطر ڈاکٹر بلوچ مرحوم کی نگرانی میں کن کن طریقوں سے الفاظ اور اصطلاحات کے ذخائر جمع کیے گئے اس بارے میں انھوں نے فرمایا:

''اس لُغت کے لیے پورے سندھ کے کونے کونے سے عام رائج لفظوں اور اصطلاحوں کو مرتب کرنے کے لیے بڑی کوشش کی گئی۔ سندھ کے ہر ضلعے کے اہم حصوں میں مقامی لوگوں کو مقرر کیا گیا تا کہ وہ اپنے علاقے کی زبان اور الفاظ و اصطلاح جمع کر کے بھیجیں مثلاً کمی کاسبی، کمہاروں، لوہاروں، کوریوں، بڑھیوں، نائیوں، دھوبیوں، وغیرہ کے الفاظ اور اصطلاحات۔ اجناس کے نام جیسے کہ گھاس، پات، جیتوں (کیڑوں)، پھولوں اور پرندوں وغیرہ کے نام، عوامی رسم و رواج جیسے کہ شادی، غمی، میلوں کی اصطلاحات، گھریلو الفاظ جیسے کہ عورتوں کی اصطلاحات اور کڑائی سلائی وغیرہ کے نام وغیرہ۔ اونٹوں، گھوڑوں کے ساز، سنگھار اور بیماریوں کے نام۔ کاشت کی تمام اقسام اور کاشت سے لے کر فصل سنبھالنے تک کے الفاظ اور اصطلاحات۔ پھلوں جیسا کہ آم اور کھجور وغیرہ کی اصطلاحات اور الفاظ۔ اس سلسلے میں یہ احتیاط بھی رکھی گئی کہ سندھی زبان کے تمام اہم محاوروں جیسا کہ کارسری، تھر، کاچھو، کھارو، کچھ اور لس بیلے کی مخصوص زبانوں کے انوکھے عام رائج الفاظ اور اصطلاحات اس لُغت میں شامل کیے جاسکیں۔'' (۳)

جامع سندھی لغات کی تدوین کی مختصر تاریخ:

جامع سندھی لغات کی تاریخ پر اگر غور کیا جائے تو بات ۱۹۴۰ء تک پہنچتی ہے یہ وہ سال ہے جب جی ایم سیّد سندھ کے وزیر تعلیم بنے اور انھوں نے جامع سندھی لغات کی ضرورت محسوس کی اور لُغت نویسی کے ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی اور یہ کام اس کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔ اس کمیٹی میں سندھی زبان کے محقق اور لغت نویسی کے ماہر

بھیرومل مہر چندآ ڈوانی اور لعل چند امر ڈنومل بھی شامل تھے۔اس کمیٹی نے ابھی سندھی زبان کے ابتدائی چار حروف پر لُغت کا مسودہ ہی تیار کیا تھا کہ تقسیم برصغیر کا واقعہ ہو گیا اور یہ کام نامکمل رہ گیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا 1949ء میں ڈاکٹر بلوچ صاحب امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے واپس پہنچے۔آپ نے مئی 1949ء سے اگست 1950ء تک سندھ کے چپے چپے کا دورہ کیا اور ضروری معلومات جمع کیں۔اس کے بعد ڈاکٹر بلوچ صاحب کی جناب جی ایم سیّد سے ملاقات ہوئی جنھوں نے ''جامع سندھی لغات'' کے اہم کام کی طرف بلوچ صاحب کو راغب کیا۔

1951ء میں جناب جی ایم سیّد کی سربراہی میں سندھی ساہتیہ مرکزی صلاح کار بورڈ کی تشکیل نو کی گئی اور اس ادارے کا نام سندھی ادبی بورڈ رکھا گیا۔اس کے ساتھ ہی جامع سندھی لغات کی تیاری کا منصوبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے کاندھوں پہ رکھا گیا اور انہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ تین سال کے عرصے میں جامع سندھی لغات کا مسودہ تیار کر لیں ۔1951ء میں سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر علامہ آئی آئی قاضی نے سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس کے ایک کمرے میں اس منصوبے کی تکمیل کی خاطر مرکزی دفتر قائم کیا۔اس منصوبے کا باقاعدہ آغاز جنوری 1952ء میں کیا گیا۔جامع سندھی لغات کے منصوبہ کی خاطر ڈاکٹر بلوچ صاحب نے شب و روز محنت کی اور پورے سندھ میں ذخیرہ الفاظ کی جمع آوری کی خاطر ایک نیٹ ورک Network تیار کیا اور اسے ایک تاریخی فریضہ سمجھ کر مکمل کیا۔ڈاکٹر صاحب نے لُغت کے مقدمے میں لکھا ہے کہ قومی جذبہ کے تحت وہ روزانہ ۱۲ گھنٹے اور بعض اوقات ۱۵ سے ۱۶ گھنٹے محنت سے کام کرتے تھے۔اسی شب و روز کی محنت کا یہ نتیجہ نکلا کہ تین سال کے عرصے میں ڈاکٹر صاحب جامع سندھی لغات کا ابتدائی مسودہ ہاتھ سے لکھی ہوئی 20 جلدوں کی شکل میں دسمبر 1954ء تک مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کے بعض قریبی اعزہ نے راقم کو مطلع کیا کہ ان دنوں ڈاکٹر صاحب روزانہ رات کے ڈھائی بجے تک لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔جامع سندھی لغات کی خاطر الفاظ اور اصطلاحات کی جمع آوری کے لیے ڈاکٹر صاحب نے درج ذیل ذرائع سے یہ ذخیرہ جمع کیا:

ا۔ادبی و دیگر موضوعات پہ لکھی ہوئی کتب اور رسائل

۲۔اس وقت تک لکھی ہوئی تمام انگریزی۔سندھی اور سندھی۔انگریزی لغات
۳۔کلاسیکی شعرا کے غیر مطبوعہ کلام میں موجود الفاظ کا ذخیرہ
۴۔غیر مطبوعہ لغات میں محفوظ الفاظ کا ذخیرہ
۵۔سندھ کے تمام علاقوں میں بولی جانے والی زبان کے لہجے اور اصطلاحات کا ذخیرہ
۶۔سندھ کے مختلف ضلعوں اور تعلقوں میں مقرر کیے گئے کارکنوں سے موصولہ الفاظ کا ذخیرہ
۷۔عربی اور فارسی الفاظ جو سندھی زبان میں مروجہ ہو چکے ہیں، ان کا ذخیرہ

جامع سندھی لغات کے ابتدائی مسودہ کی تیاری کے دوران ڈاکٹر صاحب نے خود بھی پورے سندھ کے مختلف علاقوں کے بار بار سفر کیے اور ان علاقوں میں موجود بزرگوں، سگھڑوں (ہنرمندوں)، کسانوں شاعروں اور استادوں سے ملاقاتیں کیں۔

جامع سندھی لغات کی تیاری کے دوران ڈاکٹر صاحب کی معاونت بہت سے لوگوں نے کی جنھوں نے ڈاکٹر صاحب کے جذبے اور ان کی محنت کو دیکھتے ہوئے انتہائی قلیل معاوضے پر بڑی محنت اور جانفشانی سے یہ کام انجام دیا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ڈاکٹر صاحب نے شب و روز محنت کے بعد دسمبر 1954ء تک جامع سندھی لغات کا ابتدائی قلمی مسودہ بیس جلدوں میں تیار کر لیا تھا۔اس کے بعد پروگرام کے مطابق یہ کام باقی تھا کہ طباعت سے قبل ڈاکٹر صاحب علمی بنیادوں پر ایک ایک جلد کی پریس کاپی تیار کرتے اور یہ کام مطبوعہ شکل میں محفوظ ہوتا جاتا لیکن ڈاکٹر صاحب کے بقول جب یہ کام تکمیل کے مراحل سے گزر کر طباعت کے مرحلہ پر پہنچا تو نام نہاد رکاوٹوں اور رقابتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لُغت کی پہلی جلد طبع ہونے میں پورے چھ سال لگ گئے اور یہ پہلی جلد 1960ء میں جا کر طبع ہوئی۔

جامع سندھی لغات کی اشاعت میں رکاوٹیں

ڈاکٹر صاحب نے جامع سندھی لغات کی پانچویں جلد کے مقدمے میں بقیہ جلدوں کی تیاری کے سلسلے

میں رکاوٹوں کی کچھ تفصیلات لکھی ہیں ۔ان کے بقول پہلی جلد کی پریس کاپی دوسال محنت کے بعد تیار ہوچکی تھی جب کہ اس جلد کوطبع ہونے میں ٦ سال صرف ہوگئے ۔اس کے بعد والی جلدوں میں رکاوٹوں کا سلسلہ مزید دراز ہوگیا چنانچہ دوسری جلد کے ابھی 142 صفحات ہی تصحیح و تحقیق کے بعد طباعت کے لیے تیار ہوسکے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کی طرف سے بعد کی جلدوں کی مرحلہ وار ایڈیٹنگ کے منصوبے کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کا تیار کردہ ابتدائی مسودہ مختلف لوگوں کو پیش کیا گیا اور اس تمام عمل سے ڈاکٹر صاحب کو دور رکھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بات بڑے دکھ سے بیان کی کہ لُغت کی دوسری، تیسری اور چوتھی جلدیں مختلف حضرات کی زیر نگرانی شائع کی گئیں اور اس عمل سے ڈاکٹر صاحب کو دور رکھا گیا۔دوسری جلد طویل عرصے کے بعد 1981ء میں تیسری جلد 1984ء میں اور چوتھی جلد 1985ء میں شائع کی گئی۔

1984ء میں جب ڈاکٹر بلوچ صاحب سندھی ادبی بورڈ کے ممبر بنے تو انہوں نے جامع سندھی لغات کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری پہ زور دیا۔ڈاکٹر صاحب لُغت کی دوسری، تیسری اور چوتھی جلدوں کے معیار سے مطمئن نہیں تھے اور ان کا خیال تھا کہ 1957ء سے 1977ء تک سندھی لوک ادب اور سندھی کلاسیکی شعراء کے کلام کی تدوین کے دوران الفاظ اور اصطلاحات کا جو وسیع ذخیرہ حاصل ہوا ہے اسے بھی اس عظیم الشان لُغت میں شامل کیا جانا ضروری تھا۔

جامع سندھی لغات کی پانچویں جلد ڈاکٹر بلوچ صاحب کی ایڈیٹنگ کے بعد 1988ء میں شائع ہوئی جس کے مقدمے میں ڈاکٹر صاحب نے اس لُغت کی مختصر تاریخ اور اس دوران رکاوٹوں پہ محتاط انداز سے روشنی ڈالی تھی۔

جامع سندھی لغات تو پانچ جلدوں میں مکمل ہو کر شائع ہوئی لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنے مزاج کے مطابق اس لغت کے ایک ایک لفظ پر دوبارہ تحقیق کی اور مفید اصلاحات اور اضافے کیے۔اس مرتبہ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے لغت میں ان الفاظ اور اصطلاحات کا اضافہ بھی کیا جو سندھی لوک ادب اور اساسی سندھی شعراء کے کلام سے حاصل ہوئی تھی۔اس مرتبہ لُغت کو کمپیوٹر کمپوزنگ کے بعد سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد نے تین ضخیم جلدوں میں ''نئی جامع سندھی لغات'' کے عنوان سے شائع کیا۔اس نئی لُغت کی پہلی جلد سنہ 2004ء میں، دوسری

جلد 2005ء میں اور تیسری جلد 2007ء میں حیدر آباد سے شائع ہوئی۔نئی جامع سندھی لغات کی تینوں جلدوں کی کل ضخامت 2066 صفحات ہے۔

اب ہم جامع سندھی لغات اور نئی جامع سندھی لغات کی انفرادی جلدوں کی ضخامت اور سنہ اشاعت بیان کریں گے:

جلد	صفحات	اشاعت کا سال
جامع سندھی لغات جلد اوّل	1 to 516	1960ء
جامع سندھی لغات جلد دوم	517 to 1047	1981ء
جامع سندھی لغات جلد سوم	1048 to 1525	1984ء
جامع سندھی لغات جلد چہارم	1526 to 2194	1985ء
جامع سندھی لغات جلد پنجم	2195 to 3088	1988ء

نئی جامع سندھی لغات کی اشاعتی تفصیل درج ذیل ہے:

نئی جامع سندھی لغات جلد اوّل	1 to 781	2004ء
نئی جامع سندھی لغات جلد دوم	782 to 1500	2005ء
نئی جامع سندھی لغات جلد سوم	1501 to 2066	2007ء

سندھی زبان کی اس سب سے بڑی لُغت کی خاطر ڈاکٹر بلوچ صاحب نے چند اصول وقواعد مرتب کیے تھے جو درج ذیل ہیں:

(1) ابجد کی نئی تختی کے مطابق الف تا ی الفاظ کی ترتیب۔

(2) بنیادی لفظ کا ذکر پہلے کیا گیا اور اس کی خاطر (☆) نشان مقرر کیا گیا پھر اس سے مشتق الفاظ لکھے گئے جن کے لیے (۔) نشانی مقرر کی گئی۔

(3) ہر حرف کے لیے بالترتیب مد، پھر زبر پھر زیر پھر پیش والے الفاظ لکھے گئے۔

(4) ہر لفظ کے درست تلفظ کی خاطر اعراب کا خاص اہتمام کیا گیا۔ اسی طرح سندھ کے مختلف علاقوں میں ایک ہی لفظ کے مختلف تلفظ کی وضاحت کی گئی۔

(5) ''اسم'' کی صورت میں ہر لفظ کو واحد جمع اور مذکر مؤنث کی شکل میں لکھا گیا۔

(6) مختلف علاقوں کے مخصوص الفاظ کی نشان دہی کی گئی۔

(7) ہر لفظ کے درست املا کے بعد تشریحی نشانی (:) لکھی گئی جس کے بعد اس لفظ کی نحوی شکل، اشتقاقی شکل اور معنی کی شکل لکھی گئی۔

(8) ایک لفظ کے ایک سے زائد معانی نحوی حالت کے مطابق لکھے گئے۔

(9) ہر نئے لفظ کی تصدیق کی خاطر اس لفظ سے متعلق محاورہ، شعر یا نثری حوالہ دیا گیا۔

(10) دیگر زبانوں کے مروج الفاظ اصلی حالت میں لکھے گئے۔(۳)

''جامع سندھی لغات'' کی تکمیل کی خاطر الفاظ' محاورات اور اصطلاحات جمع کرنے کا کام پورے سندھ میں بڑے پیمانے پر کیا گیا۔ اس مقصد کی خاطر کراچی، کوہستان، ماتلی، زیریں سندھ، پیر جو گوٹھ، خیر پور، سکھر، شکار پور، تھرپارکر، شاہ بندر، سانگھڑ، لاڑکانہ، دادو و دیگر علاقوں کے ماہرینِ زبان اور اصحابِ قلم کی خدمات حاصل کی گئیں جنھوں نے ان علاقوں کے مخصوص الفاظ، اصطلاحات اور محاورات حیدر آباد میں قائم لُغت کے مرکزی دفتر میں روانہ کیے۔(۴)

جامع سندھی لغات کی خصوصیات

جامع سندھی لغات میں نہ صرف زبان کی صیغات کو سمیٹا گیا ہے بلکہ آگے قدم بڑھا کر سندھ کے تمام اسماء و اجناس کی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس طرح یہ لُغت کم و بیش سندھ پر انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے مثلاً روزمرہ کی زبان کے الفاظ' خطے کے الفاظ و اصطلاحات، مشہور شخصیات سندھ کے تاریخی مقامات، شہر، گاؤں، جھیل، تالاب، ندی نالوں، ٹپہ، تحصیل، اضلاع، پھول، درخت، بیل بوٹے، ریگستان، صحرا، حکیموں طبیبوں کی

اصطلاحات، جڑی بوٹیوں کی نیز دیگر بیماریوں، ریتوں، رسموں رہن سہن اوران کی اصطلاحات، ہنر مند و کاریگر، راج مستری، بڑھئی، کمہار، جولاہے، موچی، مچھیروں، کسانوں، قوموں، قبیلوں، ذاتوں، محلوں، پرندوں، کیڑوں مکوڑوں، جانوروں، مچھلیوں وغیرہ۔ علم و ادب اور شاعری کی اصطلاحات، آسمانی سیاروں اور ان سے متعلق اصطلاحات، آب و ہوااوران کی اصطلاحات وغیرہ۔

سندھی اردولُغت اوراردوسندھی لُغت

حکومتِ پاکستان کی وزارتِ تعلیم نے 54-1953ء میں سندھ یونیورسٹی کو مذکورہ بالا دو لغات کی طباعت اور اشاعت اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کے اردو ترجمے کے لیے گرانٹ دی۔ اس زمانے میں سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر علامہ آئی آئی قاضی تھے جنھوں نے اس پیشکش کو منظور کیا اور دونوں لغات اور کلام شاہ عبداللطیف بھٹائی کے اردو ترجمے کی خاطر مفصل خاکہ تیار کرایا۔ اس تجویز میں یہ بھی مذکور تھا کہ دونوں لغات دو سال کے عرصے میں تیار کر لی جائیں۔ اس عرصے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بلوچ صاحب نے پانچ پانچ سو صفحات کی دو لغات کا ازسرِ نو خاکہ تیار کیا جس کو وزارتِ تعلیم نے منظور کر لیا۔ بلوچ صاحب نے اس خاکے میں لغات کی جامعیت اور افادیت کا پورا خیال رکھا اور الفاظ کے ساتھ محاورات کو بھی شامل کیا۔ ان کی تیاری میں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھی گئی کہ یہ دونوں لغات عام علمی ضروریات کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی ضروریات بھی پوری کریں۔ اس طرح ''سندھی اردو لُغت'' 866 صفحات اور 23675 الفاظ و محاورات پر مشتمل 1959ء میں شائع کی گئی۔ ''اردو سندھی لُغت'' کے کل صفحات 589 اور الفاظ و محاورات کی تعداد 19660 ہے۔ یہ 1960ء میں شائع کی گئی۔ (۵)

ان لغات کی تدوین کے وقت درج ذیل امور کا خاص خیال رکھا گیا:

(1) دونوں لغات میں عربی و فارسی کے وہ الفاظ شامل نہیں کیے گئے جو اصل حالت میں سندھی اور اردو میں موجود ہیں۔

(2) اردو کے وہ محاورات جو عام گفتگو میں مستعمل نہیں، شامل نہیں کیے گئے۔

(3) لُغت کی جامعیت اور افادیت کا خاص خیال رکھا گیا۔

(4) اردو الفاظ، اصطلاحات اور محاوروں کی خاطر ''فرہنگِ آصفیہ'' اور ''جامع اللغات'' کو بنیادی لغات قرار دیا گیا۔

(5) ان لغات کی تیاری کے دوران جان ٹی پلیٹس (John T. Platts) کی ہندوستانی۔انگریزی اردو لُغت سے بھی استفادہ کیا گیا۔

(6) دونوں لغات کی ترتیب اور الفاظ کی پہچان کے لیے ''جامع سندھی لغات'' کے اصولوں پر عمل کیا گیا۔(۷)

ان دونوں لغات میں اردو حصے کی خاطر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (سابق صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی) کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ان لغات کی تکمیل اور اشاعت ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی (وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی) کی معاونت اور ذاتی کوشش کی بنا پر ہوسکی۔ نصف صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد آج بھی ان لغات کی افادیت قائم ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میں مزید الفاظ و اصطلاحات کا اضافہ کیا جائے اور ان کے نئے ایڈیشن شائع کیے جائیں۔

ایک ملاقات کے دوران ڈاکٹر بلوچ صاحب نے راقم الحروف سے فرمایا تھا کہ ان دونوں لُغات کی تکمیل میں یہ پہلو بھی قابلِ غور تھا کہ جو افراد صرف سندھی جانتے ہیں وہ ان کی مدد سے اردو سیکھیں اور جو صرف اردو جانتے ہیں وہ سندھی سیکھیں اور اس طرح ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ بلوچ صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ان دونوں لغات کی تکمیل کے بعد ان کا اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کا خیال تھا کہ آئندہ زمانے میں ان لغات میں ضروری اضافات بھی کریں گے لیکن افسوس یہ کام نہ ہوسکا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں لغات اضافے نہ ہونے کے باوجود آج بھی بہت مفید ہیں۔

جواہر لغات اکیچار سندھی

اس لُغت کے مؤلف انیسویں صدی کے معروف عالم اخوند عبدالرحیم عباسی تھے۔ یہ لُغت انھوں نے

1845ء سے 1851ء کے عرصے میں تیار کی تھی۔ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اس نایاب اور مفید لُغت کی اشاعت کی اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا۔ یہ لُغت سندھی لینگوئج اتھارٹی حیدرآباد کی جانب سے 1993ء میں شائع کی گئی۔

یک جِلدی سندھی لُغت

جیسا کہ پہلے ذکر آیا 1991ء میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کو سندھی لینگوئج اتھارٹی حیدرآباد کے چیئرمین کا منصب سونپا گیا۔ بلوچ صاحب نے یہ ذمّے داری قبول کرتے ہی تن دہی سے علمی و تحقیقی کتب کی اشاعت کی جانب توجہ مبذول کی۔آپ نے چار لغات کی تیاری کا منصوبہ تیار کیا جو درج ذیل ہے:

(1) جامع سندھی لغات (پانچ ضخیم جلدیں) کے اختصار پر مشتمل یک جِلدی سندھی لُغت۔

(2) مفصل سندھی۔انگریزی لُغت

(3) مفصل۔انگریزی سندھی لُغت

(4) اطلاعاتی۔صحافتی لُغت

ان لغات میں سے یک جلدی سندھی لُغت کی تیاری کی ذمہ داری بلوچ صاحب نے خود قبول کی۔ 1994ء میں بلوچ صاحب ادارے کے چیئرمین کے منصب سے سبکدوش ہو گئے، اس لیے یہ کام درمیان میں رک گیا۔اس کے بعد بلوچ صاحب کے ایک مکتوب کی روشنی میں نئے چیرمین نے مختصر عملہ فراہم کیا اور یہ کام دوبارہ شروع ہو گیا۔ بالآخر جون 1997ء میں یہ کام تکمیل کو پہنچا اور اگست 1998ء میں لُغت شائع ہوئی۔ یہ لُغت 729 صفحات اور 27000 الفاظ و اصطلاحات پر مشتمل ہے۔(۹)

'شاہ جو رسالو' کی لُغت

سندھ کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام میں وارد مشکل الفاظ و اصطلاحات کی عام فہم تشریح کی خاطر یہ لُغت بلوچ صاحب نے تیار کی اور اس 'روشنی' کے نام سے ۲۰۰۲ء میں سندھی لینگوئج اتھارٹی حیدرآباد نے شایع کیا۔

حواشی باب نمبر 13

۱۔ملاحظہ فرمایئے مضمون لغت نويسي ۾ ڊاڪٽربلوچ جون ورتل ڪوششون (لغت نویسی میں ڈاکٹر بلوچ کی کوششیں)از تاج جویو، سہ ماہی مہراڻ جام شورو(اپریل تا جون ۲۰۰۲ء) ،ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ خاص نمبر،صفحہ 196

۲۔ان معلومات کے حصول کے لیے جناب تاج جویو کے سندھی زبان میں لکھے مضمون ''سنڌ جو عظيم لغات نويس ڊاڪٽر نبي بخش بلوچ (سندھ کے عظیم لغت نویس ڈاکٹر نبی بخش بلوچ) سے استفادہ کیا گیا ہے۔یہ مضمون'' ڊاڪٽر بلوچ هڪ مثالي عالم ''(ڈاکٹر بلوچ۔ایک مثالی عالم)مرتبہ تاج جویو کے حصہ اوّل میں شائع ہوا۔ملاحظہ فرمائیں صفحہ ۱۱۱ تا ۱۱۶۔

۳۔ایضاً

۴۔ملاحظہ فرمایئے مضمون لغت نويسي ۾ ڊاڪٽربلوچ جون ورتل ڪوششون (لغت نویسی میں ڈاکٹر بلوچ کی کوششیں)از تاج جویو، سہ ماہی مہراڻ جام شورو ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ خاص نمبر

۵۔ایضاً

۶۔ایضاً

۷۔ایضاً

۸۔ایضاً

۹۔ایضاً

باب نمبر 14

سندھی لوک ادب کے تحفّظ کا عظیم الشان منصوبہ

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کے عظیم الشان علمی اور تحقیقی کارناموں میں سندھی لوک ادب کی جمع آوری اور کل ۴۲ ضخیم جلدوں میں مطبوعہ حالت میں محفوظ کرنا ایک اہم کارنامہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر بلوچ صاحب صرف اور صرف یہی ایک کام کر لیتے تب بھی ان کا نام تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھا جاتا۔ عموماً اردو دان قارئین ڈاکٹر بلوچ صاحب کے اس عظیم الشان کارنامے سے کماحقہٗ واقفیت نہیں رکھتے اس لیے ہم پیش نظر باب میں لوک ادب کی تعریف، لوک ادب کی تاریخ اور اس کی جمع آوری کے لیے بلوچ صاحب کی شب و روز محنت کے موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے تاکہ علم ہو سکے کہ فردِ واحد نے کتنا بڑا علمی کارنامہ انجام دیا۔

مورخہ ۲۲ جون ۲۰۰۶ء کو ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے راقم الحروف کو ایک طویل انٹرویو دیا تھا جو راقم کے پاس ریکارڈ شدہ شکل میں محفوظ ہے۔ اس انٹرویو میں لوک ادب کی تعریف، ماہیت اور اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے درج ذیل معلومات سے مطلع فرمایا تھا:

> ''امریکہ میں قیام کے دوران ہم نے دیکھا اور محسوس کیا کہ لوک ادب Folklore بڑی اہم چیز ہے۔ دراصل ادب کا خام مال Raw Material اسی لوک ادب یا Folklore کے ذریعے حاصل ہوتا ہے مثلاً شیکسپیر کے ڈرامے دراصل Folklore کی کہانیاں تھیں جو نسل در نسل چلی آ رہی تھیں، شیکسپیر نے انھیں ڈراموں کا رنگ دیا۔

لوک ادب کے تحفظ کا یہ منصوبہ میں نے ہی سندھی ادبی بورڈ کے آگے پیش کیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ابتدا سے سندھ کے چپے چپے پر جانے اور وہاں کے لوگوں سے ملنے کا شوق تھا۔ اسی وجہ سے میں سندھ کے ہر علاقے میں جاتا اور ہنرمندوں سے مل کر لوک ادب کا خزانہ لکھ لیتا تھا۔ اس منصوبے کے دوران ہم نے کتابوں کو مختلف موضوعات کے تحت تقسیم کیا تھا۔ جس موضوع کا مواد پہلے جمع ہو جاتا، اسے پہلے شایع کر دیا جاتا اور جس کا بعد میں اس کو بعد میں۔ اس سلسلے کی آخری جلد 1996ء میں آئی اور اس کے بعد یہ منصوبہ بند کر دیا گیا حالانکہ ابھی مزید دس بارہ جلدیں آسکتی تھیں جن کی منصوبہ بندی میں کر چکا تھا۔''

لوک ادب کیا ہے

لوک ادب دراصل انسانوں کی تہذیب و تمدّن کا سرچشمہ ہے اس کے علاوہ یہ سیاسی اور سماجی حالات کا آئینہ دار بھی ہوتا ہے۔ یہ انسانوں کا مزاج ہوتا ہے کہ وہ ایسے قصے اور کہانیوں کو پسند کرتے ہیں جن میں خوشی ،حیرت، عشق و محبت، مہم جوئی اور اس طرح کی دیگر خصوصیات ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ عام اصطلاح میں کہانی یا واقعے میں کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن لوک ادب کے حوالے سے فنی پہلوؤں اور مفاہیم میں تخصیص کرنا ضروری ہے۔ کہانیوں کے کردار عموماً دیو، پریاں، جن وغیرہ ہوتے ہیں جب کہ لوک ادب میں ایسا نہیں ہوتا۔ لوک ادب میں عموماً انسانوں کی یادیں، تجربات، اوہام اور وساوس کا مطالعہ نظر آتا ہے۔ جہاں تک لوک ادب کے واقعات کا تعلق ہے کسی واقعے کے پیچھے کوئی مقامی اور جغرافیائی پس منظر ضرور ہوتا ہے جب کہ کہانی اس طرح کے پس منظر سے آزاد ہوتی ہے۔ لوک ادب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ عوام کا لوک ادب سے تعلق محبت آمیز ہوتا ہے۔ لوک ادب میں مختصر اور طویل حکایتیں ہوتی ہیں جن میں زندگی اور سماج کے چھوٹے بڑے کردار نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی رائے میں لوک شاعری دراصل سندھی تاریخ ادب کی روح ہے اس کی

اہمیت سندھی شاعری و تاریخ میں وہی ہے جو پھول اور خوشبو جسم و روح اور چاند اور چاندنی کے درمیان ہوتی ہے کہ پھول بغیر خوشبو جسم بغیر روح اور چاند بغیر چاندنی بے کار ہے۔ اسی طرح ادب بغیر لوک ادب کے بے کشش و بے مزہ ہے۔ لوک ادب میں عوام کے خیالوں اور جذبوں کا فطری اظہار ہوتا ہے جس کے خالق بھی عوام ہیں اور ان کی حفاظت بھی یہی کرتے ہیں۔ اس ادب کا اکثر حصہ دیہات کے دیہاتیوں کے درمیان پروان چڑھتا ہے اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سندھی لوک ادب سندھ کے دیہاتی ماحول کا حصہ ہے جو کہ سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر ہم تک پہنچا اور جسے تاریخ میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے لکھ کر شایع کرایا اور محفوظ کر دیا ہے۔

ادب کے معنی اس طرح بیان کیے جاسکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی تحریر ہوتی ہے جو زیبائی ولطافت اور حسن و رعنائی سے آراستہ ہو، شائستگی ولطافت سے پُر ہو اور زندگی کی حقیقتوں کی ترجمانی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اور ان تمام خوبیوں سے انسان کو مزین کرنے میں مددگار ثابت ہو۔ قدیم و جدید ادوار میں ادب کے علم اور مقصد کو تمام انسانی علوم سے افضل مانا گیا ہے اور علمِ ادب تمام علوم پر حاوی بھی ہے۔ ادب کا انحصار تعلیم و تربیت پر ہے۔

ادب کی ترقی و ترویج کے لیے علمِ ادب کا حاصل کرنا ضروری ہے اس کے لیے بچوں کو والدین اور اساتذہ کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی رہنمائی میں بچہ مہذب اور شائستہ شخصیت کا مالک بن کر معاشرے کے لیے کارآمد اور مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ تربیت کے لیے تعلیم اور تادیب انتہائی ضروری ہے اس کے بغیر ادب کی منزل پانا مشکل ہے۔ ادب میں اخلاقی و تعمیری مضامین مقالات، افسانے، ناول، تمثیل نگاری، شاعری، قصہ اور کہانی وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

لوک ادب بھی ادب ہی کی ایک اہم اور قابل ذکر صنف ہے۔ لوک ادب کے ادارے دنیا کے تمام ترقی یافتہ اور مہذب ممالک میں قائم ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں لوک ادب پر نہایت محنت اور سنجیدگی سے کام ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ملکی حکومتوں کی مالی امداد کے علاوہ ملک کے خانگی ادارے اور فاؤنڈیشن بھی لوک ادب کے سلسلے میں تحقیق کرنے والے اداروں سے لے کر محنتی و جفاکش محققین کی بھرپور مالی امداد کرتی ہیں۔ لیکن یہاں بلوچ صاحب کو کوئی اتنے بڑے فنڈ نہیں ملے تھے بلکہ انھوں نے یہ سارا کام صرف اور صرف اپنی ہمت اور محنت کے بل بوتے پر انجام دیا تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ سندھی لغت کے کارکنوں کو جز وقتی پچیس سے پچاس روپے ماہانہ تک

دینے کا آغاز ہوا تھا پھر آہستہ آہستہ معاوضہ بڑھایا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے رقم اور وسائل کی عدم دستیابی کے باوجود اس پہاڑ جیسے علمی کام کا بیڑہ اٹھایا اور اسے جس مقام تک ممکن ہوا کامیابی سے مکمل کیا۔(۱)

لوک ادب کے بارے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کے خیالات

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے لوک ادب کے بارے میں ایک معلومات افزا مضمون ''لوک کہانیوں کی علمی اہمیت'' (۲) کے عنوان سے سندھی میں لکھا تھا جو سہ ماہی مہران شمارہ نمبر ا بابت 1963ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ لوک کہانیاں لوک ادب کا انتہائی اہم حصہ ہیں کیونکہ یہ نہ صرف لوک ادب کے قدیم ترین نمونے ہیں بلکہ یہ انسانی نفسیات، توہّمات اور ابتدائی اعتقادات اور آثار کے نمونے بھی ہیں۔ انسانوں کے ہر گروہ کی لوک کہانیاں اس کے بچپن کی بھولی ہوئی یادیں ہوتی ہیں اور مجموعی طور پر ساری اقوام کی لوک کہانیاں ان کے گزشتہ ادوار کے داستانیں اور دستاویز ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوک ادب کے گہرے مطالعے سے انسانوں کے نفسیاتی اور ذہنی ارتقا کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ لوک کہانیوں میں انسانوں کے بچپن کے زمانے کی نشانیاں موجود ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ عقل کی بلوغت اور جوانی کے بعد والے ادوار کے وہم، وسوسے، ٹونے ٹوٹکے، جادو اور منتر، تعویذ، دھاگے، دیو اور پریاں جن اور چڑیل انسان کی کائنات کے اہم کردار تھے اور انسانوں کی عملی زندگی میں ان کا دخل تھا۔ جس طرح قدیم ٹیلوں اور پرانی عمارتوں میں قدیم تہذیبوں اور تمدنوں کے آثار محفوظ رہتے ہیں اسی طرح لوک کہانیوں میں الفاظ اور بیان کی صورت میں قدیم کھنڈرات ہوتے ہیں جن کے ذریعے انسانوں کی خوشیاں، مرادیں اور مقاصد، حیلے اور حکمتیں اور کامیابی کے مختلف نمونوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مجموعی طور پر لوک کہانیوں کے ذریعے انسانوں کے رسوم و رواج، نفسیاتی الجھنیں اور سماجی رجحانات کے قدیم ترین آثار ملتے ہیں۔ انہی لوک کہانیوں کے ذریعے کسی مخصوص انسانی گروہ کے ذہنی نشوونما کے نشانات نظر آتے ہیں۔

لوک کہانیاں کب بنائی گئیں یہ کسی کو بھی معلوم نہیں لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ گزشتہ دور میں یہ کہانیاں بنی ہیں اور پوری طرح عوام میں راسخ ہوگئی ہیں جس طرح بارش کسی پہاڑ کی چوٹی پر برستی ہے تو ایک چھوٹا سا چشمہ بن جاتا ہے یہی چشمہ آگے جا کر بڑا چشمہ بن جاتا ہے اور ایسے کئی چشمے مل کر نہر بن جاتی ہے پھر آگے یہی پانی ایک

دریا کی شکل اختیار کرتا ہے۔لوک کہانیوں کی مثال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ابتدا میں کسی اتفاقی وہم، وسوسہ، ذاتی کارنامہ یا کسی خاص واقعے کی وجہ سے کسی ایک بات کا بیج ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے اور اس طرح مختلف لوگوں کی مدد سے یہ پودا ذہنوں میں بڑا ہوتے ہوتے کسی لوک کہانی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ایک دوسری مثال لوک کہانیوں کی یوں دی جاسکتی ہے کہ لوک کہانیاں کسی فقیر کی گٹھڑی ہے جس میں مختلف طرح کے اناج موجود ہوں یا ایک اور مثال لوک کہانیوں کی یوں سمجھیں کہ لوک کہانیاں کسی لنگر کی دیگ ہے جس میں لوگ مختلف طرح کی چیزیں ڈال رہے ہوں۔اس دیگ میں جو، گندم، چاول، مونگ، دال، پیاز اور کھانے والی کچھ چیزیں ڈالی جارہی ہوں۔ اس کے بعد کسی نے اس میں پانی ڈالا، کسی نے لکڑیاں جلائیں اور اس طرح دیگ کا کھانا تیار ہوا لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں کہ یہ دیگ کس نے چڑھائی تھی، کب چڑھائی گئی، اس دیگ میں مختلف چیزیں کس کس مقدار میں ڈالی گئیں اور کس نے انہیں آپس میں ملایا۔

لوک کہانیوں کے بعض کردار البتہ ایسے بھی ہیں جن کے تخیّل کی ابتدا کو ہم ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں مثلاً دیو پریوں اور جنوں کے کردار انسانی تاریخ کے اوائلی دور کی یادگار ہیں۔یہ دور انسان کے محدود علم اور تجربے کا تھا۔ جب وہ فطرت کے طبعی خواص اور مشاہدات کی ماہیّت سے بے خبر تھا۔اس دور میں سورج، چاند، آگ، پانی اس کے لیے اس کے دیوتا ہوتے تھے۔مختلف آوازیں مثلاً برسات اور طوفان ان کو وہ دیوتا سمجھتا تھا، دل فریب اور چاندنی رات کو محبوب کی آمد تصور کرتا تھا۔انسان نے ابتدائی دور میں پہلے خارجی طاقتوں کو محسوس کیا اور ان سے متاثر ہوا۔اس کے بعد اسے اپنی ہستی اور طاقت کا شعور پیدا ہوا اور اس شعور کے نتیجے میں اس نے خارجی طاقتوں کے مقابلے کے لیے مختلف تجاویز پر غور کیا۔ابتدا میں تو خارجی طاقتیں اس کے لیے آفت کا درجہ رکھتی تھیں۔آہستہ آہستہ انسان نے اپنے شعور اور خوداعتمادی سے ان پر قابو پالیا۔اس کے بعد بعض انسانوں نے جادوٹونے کے ذریعے مختلف طرح کے علاج اور مسائل کے حل پر توجہ دی اور انسانوں نے ان جادوٹونے کے ماہرین کے ذریعے کسی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ یہ چیزیں جب ایک فن کا درجہ حاصل کر گئیں تو اسے جادو کہا گیا ۔بہر حال جادوگروں اور جادوگرنیوں اور چڑیلوں کا تخیل بعد کے دور کی پیداوار ہے اور انہی تجویزوں اور تدبیروں کے ذریعے انسانوں نے جنوں پریوں اور دیووں کا مقابلہ کرنا اور انہیں مطیع کرنے کی کوشش کی اور یہی

جادو انسانوں کے لیے نہ صرف مدافعت بلکہ مقابلے کا ذریعہ بنا۔

اس کے بعد انسانی تاریخ کا وہ دور آتا ہے جب اس کی زندگی میں بادشاہوں، وزیروں، شہزادوں اور شہزادیوں کے کردار آتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب انسانوں نے مل جل کر بستیاں بسائیں اور وہاں رہنا شروع کیا۔اسی زمانے میں جب اس کے سماجی نظام کا دائرہ وسیع ہوا اور انسان کی زندگی میں باپ دادا اور مقامی سرداروں سے بڑھ کر بڑے منظم اور طاقتور سردار داخل ہوئے جنہیں راجہ یا بادشاہ تسلیم کیا گیا۔انہی کے وجود سے وزیروں، شہزادوں اور شہزادیوں کا وجود سامنے آیا۔کہا جاسکتا ہے کہ گویا یہ دور انسانی تاریخ کے گزشتہ پانچ ہزار سال کا زمانہ ہے۔اس دور کا واضح یا حتمی آغاز بتانا ممکن نہیں البتہ یہی وہ دور ہے جس میں فراعینِ مصر کا بادشاہی تجمل پورے ٹھاٹھ سے نظر آتا ہے۔موجودہ رجحانات اور آغاز کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ دور بادشاہوں اور راجاؤں کے فتوحات کا دور ہے۔اگر تاریخ نے خود کو نہ دھرایا تو آج سے پانچ سو سال بعد بادشاہوں، وزیروں ،شہزادوں اور شہزادیوں کا دور بھی اسی طرح انوکھا لگے گا جیسا کہ اس وقت دیووں اور پریوں کا لگتا ہے۔

دنیا کی ہر زبان کی ابتدائی لوک کہانیوں کے کرداروں میں دیو اور پریاں، جن اور جادوگر اور چڑیل وغیرہ کے کردار نظر آتے ہیں۔ یہ کردار انسانوں کے وہم اور وساوس کے قدیم آثار ہیں۔اس زمانے میں دیووں اور پریوں کا انسانوں کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن یہ اس کے اوہام اور وساوس سے ضرور تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد والی لوک کہانیوں کے اہم کرداروں میں مختلف جانور ملتے ہیں جن میں وہ انسانوں سے گفتگو بھی کرتے ہیں۔ان جانوروں میں مختلف پرندے اور چوپائے نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد وہ دور آتا ہے جب لوک کہانیوں کے کرداروں میں بہادر انسانوں کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں جو نسل در نسل بیان ہوتے ہوتے حکایات کے رنگ میں نظر آتے ہیں۔اس دور میں ہمیں وزیروں اور بادشاہوں کی کہانیاں بھی ملتی ہیں جن میں سننے والوں کی تفریح کی خاطر رنگ آمیزی بھی کی گئی۔

سندھی لوک کہانیوں میں جب بادشاہوں کا ذکر ہوتا ہے تو عام طور پر ان کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :بادشاہوں کا بادشاہ اللہ ہے لیکن ایک زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔سندھی لوک کہانیاں نسل در نسل اور سینہ بسینہ زبانی روایتوں کے ذریعے چلتی آئی ہیں۔اس لیے ہر راوی کا اپنا الگ اسلوب ہوتا تھا، اس لیے سندھی لوک ادب

کی کہانیوں کو قلم بند کرتے وقت یہ خاص احتیاط کی گئی ہے کہ ان کی اصلیت کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی جائے ۔جن کہانیوں کی ایک سے زیادہ روایتیں ملی ہیں ان کی ترتیب میں کوشش کی گئی ہے کہ باہمی موازنے کے ذریعے اس سلسلے کی مستند روایت کو قلم بند کیا جائے ۔ یہ تمام کہانیاں سندھی لوک ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں جنھیں بڑی کوشش اور احتیاط سے مرتب کیا گیا ہے۔(۳)

سندھی لوک ادب کی ایک اور تعریف

سندھی زبان میں لوک ادب کیا ہے اور اس کا آغاز کیسے ہوا؟ اس بارے میں سندھی اور اردو کے محقق جناب مظہر جمیل صاحب نے اپنے ایک مضمون میں بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''لوک ادب عام انسانوں کے فطری جذبات، خیالات، احساسات، خدشات اور توہمات کا ایسا برملا اور بے ساختہ اظہار ہوتا ہے جسے کسی مصنوعی قاعدے، کلیے اور قانون وضابطے کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ عوامی جذبات واحساسات، خوشی وغمی، رنج وافسوس، توقعات ،خواہشات، امکانات اور ناکامی اور ملال کی وہ ساری کیفیات جن سے کوئی خاص معاشرہ کسی خاص لمحے میں گزر رہا ہوتا ہے اس کا عوامی سطح پر اظہار بھی ہو رہا ہوتا ہے۔ لوگ خوشی اور مسرت کے موقع پر گاتے بجاتے اور رقص کرتے ہیں، غم والم اور دکھ کے مواقع پر اجتماعی درد و رنج کا اظہار کرتے ہیں ۔فصلیں کٹتی ہیں تو دیہاتوں میں زندگی ایک نئی کروٹ لیتی ہے اور کسان کاشت کار غرض وہ سب لوگ جن کی زندگیاں کھیتوں اور کھلیانوں سے بندھی ہوتی ہیں، خوشی و مسرت سے جھوم جھوم اٹھتے ہیں اور ٹولیاں جمع ہو کر عجیب وغریب مسرت بھرے راگ الاپتی ہیں ۔اندھیری طویل راتوں میں آگ کے الاؤ کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو سنی سنائی داستانیں ، قصے ، کہانیاں سناتے ہیں ۔لطائف ، ضرب الامثال، کہاوتیں اور چٹکلے ہیں جو آئے دن زندگی میں درپیش آتے ہیں جن میں سے کچھ لوگوں کی اجتماعی یادداشت میں محفوظ رہ جاتے ہیں اور بہت کچھ فراموش کاری کے گرد

باد میں شامل ہوکراڑ جاتا ہے۔کل کی جو باتیں یادرہ جاتی ہیں وہ نسل درنسل سفرکرتی رہتی ہیں اورلوک ادب کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔کبھی لوگ ان میں مزید اضافے کرتے ہیں اور کبھی کوئی اورردوبدل یا تبدیلی کے عملے سے دوچار ہوتے ہیں۔غرض انجانی مدت تک یہ سلسلہ یونہی چلتا چلا جاتا ہے۔کوئی نہیں جانتا کہ یہ خودروگیت، نغمے،لوریاں،ترانے الاپیں کہانیاں،داستانیں، قصے چٹکلے لطیفے اور کہاوتیں کب سے رائج ہیں۔ان کا نہ کوئی خاص مصنف ہوتا ہے اور نہ اس کی کوئی خاص حد بندی۔عام لوگوں ہی کے درمیان یہ گیت کہانیاں اور قصے چٹکلے مشہور ہوتے ہیں اورنسل درنسل سفرکرتے ہیں اوریوں ہر دور میں کوئی نئ بات،کوئی نیا انداز ان میں شامل ہوجاتا ہے اور اس طرح اس دور کا عکس اجتماعی یادداشت میں محفوظ رہ جاتا ہے۔چنانچہ لوک ورثے کو علمی طور پر علم بشریات (انتھروپولوجی)ہی کا ایک اہم شعبہ سمجھا جاتا ہے۔" (۴)

اسی مضمون میں لوک ادب کی جمع آوری اور تحفظ کے لیے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مرحوم کی مسلسل محنت ،کوشش اورمستقل مزاجی اورجمع کردہ ذخیرے کی مقدار کے حوالے سے مظہرجمیل صاحب لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے سندھی لوک ورثے کی تلاش وجستجو میں پچاس ساٹھ برس جس طرح گاؤں گاؤں اورقریہ قریہ خاک چھانی ہےاوردورافتادہ مقامات پرقدیم قبائل اورخاندانوں تک رسائی حاصل کی ہے اورلوگوں کے درمیان رہ کران کے بزرگوں سے سنے سنائے گیتوں،نغموں،قصوں،کہانیوں اور کہاوتوں کے ذخیرے جمع کیے ہیں،وہ اپنی مثال آپ ہے۔ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے اپنے جمع کیے ہوئے قدیم عوامی گیتوں اور قصے کہانیوں کو بیالیس بڑی ضخیم جلدوں میں مرتب کیا ہے۔یہ ایک یقیناً مہتم بالشان کارنامہ ہے جو شاید ہی کسی دوسری زبان میں کبھی کیا گیا ہو۔انہوں نے لوک ورثے کے اس عظیم ذخیرے کوصرف یکجا ہی نہیں کیا بلکہ اسے تاریخی تناظر میں اڑتیس اہم موضوعات میں تقسیم بھی کیا ہےاوران کی علمی،تاریخی،ثقافتی اورسماجی اہمیت پرگراں قدرمقدمے بھی لکھے ہیں

۔لوک ادب کے اس عظیم ذخیرے میں نثری قصے، کہانیاں بھی ہیں اور منظوم شعری داستانیں اور حکایتیں بھی، شادی بیاہ کے گیت بھی ہیں اور غم و ماتم گساری کے حامل نوحے بھی۔ فصلوں کی اگائی اور کٹائی پر گائے جانے والے اجتماعی گیت اور ترانے بھی ہیں اور جنگوں کے رجز نامے بھی۔غرض عوامی اجتماعی یادداشت میں محفوظ وقیع ذخیرے میں زندگی کے سب ہی رنگ شامل ہیں اور اہل سندھ بجاطور پر اپنی تہذیب وثقافت کے اس وسیع تنوّع پر فخر کر سکتے ہیں۔ایک ہی تہذیبی دائرے میں کئی بہت سے چھوٹے تہذیبی دائرے اور گوشے شامل ہیں، اس کا اندازہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے مرتب کردہ عوامی لوک ادب کے ذخیرے سے ہوتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے جمع کردہ ذخیرے میں بھی اتنا مواد ہنوز باقی ہے جنہیں کتابی صورت میں جمع کرنے کے لیے مزید دس بارہ جلدوں کی ضرورت ہوگی۔"(۵)

سندھی لوک ادب کی جمع آوری کی مختصر تاریخ

دیگر کئی علمی منصوبوں کی طرح سندھی لوک ادب کے تحفظ کا عظیم منصوبہ بھی ڈاکٹر بلوچ صاحب کی انتھک محنت کی وجہ سے کتابی شکل بھی محفوظ ہوسکا۔ڈاکٹر صاحب نے لوک ادب کے تحفظ کی تجویز 1955ء میں سندھی ادبی بورڈ کو پیش کی تھی۔اس کے بعد 1956ء میں اس اسکیم کو بورڈ نے منظور کیا اور یہ محنت طلب اور صبر آزما کام بھی ڈاکٹر صاحب ہی کو سونپا گیا کہ وہ اس عظیم علمی منصوبے کی خاطر اپنی توانائیاں صرف کریں۔وہ لوک ادب جو اب تک سینوں میں محفوظ تھا اور خطرہ یہ تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کہیں یہ قیمتی خزانہ ضایع ہی نہ ہوجائے، اسے ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت اور مستقل مزاجی سے کام کیا 42 ضخیم جلدوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔لوک ادب کے تحفظ کے دوران ڈاکٹر صاحب کی مسلسل محنت اور مستقل مزاجی کا اندازہ اس حقیقت سے لگائیے کہ یہ کام 36 سال تک جاری رہا۔

سندھی لوک ادب کے تحفظ کی خاطر ڈاکٹر صاحب نے 1957ء میں سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس کی

تاریخی عمارت کے مشرقی گوشے میں ایک سادہ سے کمرے میں لوک ادب کا مرکزی دفتر قائم کیا اور پورے سندھ میں کئی سو کارکن مقرر کیے جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کی دی گئی ہدایات کے تحت مختلف علاقوں کے سگھڑوں (ہنرمندوں) سے لوک ادب کے تحفظ کا آغاز کیا۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب خود بھی قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں جاتے اور لوک ادب کے تحفظ کی خاطر ہر طرح کی مشکلات اور جفاکشی بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے اور اپنے ہاتھ سے لوک ادب کو قلمی صورت میں لکھتے جاتے۔لوک ادب کے سلسلے کی پہلی کتاب 1959 میں ''مدّاحون مناجاتوں'' کے نام سے شایع ہوئی اور اس سلسلے کی 40 ویں کتاب 1991ء میں ھنر کے عنوان سے شایع ہوئی۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے 1945ء میں ایک کتاب تحریر کی جس نے تاریخ ادب سے تعلق رکھنے والے ادباء وشائقین فن کو چونکا دیا یہی وہ دور تھا جب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے اپنی ذہنی کاوشوں کا رخ سندھی ادب کی اصل روح سندھ کے لوک ادب کی طرف موڑا تھا۔ڈاکٹر صاحب کی پہلی ملاقات شائق لوک ادب سے 1945ء میں ان کے گاؤں، گوٹھ میر محمد میں ہوئی۔ان کے ساتھ ہونے والی اس محفل میں شائقین لوک ادب اور شعرا کے تذکرے نے آپ کی توجہ لسبیلہ کے شائقین لوک ادب کی طرف مبذول کرائی۔اس کے فوراً بعد ضلع ٹھٹھہ میں ملک رئیس احمد خان، عبدالمجید اور عبداللہ خان کی بیٹھکوں میں ہونے والی ادبی محفلوں میں شعراء اور شائقین لوک ادب کے تذکروں نے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے دل میں ان سے ملاقات کے شوق کو مزید بھڑکا دیا اور آپ نے اگست 1964ء میں لسبیلہ پہنچ کر شیخ ابراہیم کے سندھی کلام کا مطالعہ کیا اور اس کے اہم نکات نوٹ کیے۔آپ کی یہ تمام ملاقاتیں اور سفر لوک ادب کو مستند صورت میں اکٹھا کرنے کی کاوشوں کا حصہ تھے۔1949ء میں آپ نے ''بیلاین جابول'' نامی کتاب کا مسودہ تیار کیا۔یہ مسودہ سندھی لوک ادب میں تحقیق کی بنیاد کا پہلا سنگ میل ثابت ہوا۔اہل سندھ کے لیے آپ کی یہ تحریر ایک بالکل نئی اور اچھوتی چیز تھی جس نے اس کی محدود ادبی اور ثقافتی سوچ کو نئی راہیں فراہم کیں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے سندھی لوک ادب کی تدوین کا بارگراں اپنے کاندھوں پر اٹھا کر اس کی درست اور دلکش صورت عوام اور اہل علم کے سامنے لانے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا۔

اسی سوچ کے تحت سندھی لوک ادب کی جمع وتدوین کے لیے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے 1955ء

میں سندھی ادبی بورڈ کے سامنے لوک ادب کو جمع کرنے کی جامع تجویز رکھی۔ بورڈ نے 1956ء میں اس تجویز کو منظور کر کے اس کی تمام تر ذمہ داری ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کے سپرد کی۔ یہاں یہ بات بڑی اہم ہے کہ دیگر عظیم الشان علمی اور تحقیقی کاموں کی طرح اس عظیم منصوبے کا خیال بھی ڈاکٹر بلوچ صاحب کے ذہن میں آیا اور انھوں نے ہی مسلسل محنت اور پختہ عزم سے اس کا آغاز کیا اور بڑی کامیابی سے تکمیل بھی کی۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے مزید تحریر فرمایا کہ اس کام کے لیے تعلقہ وار کارکن مقرر کیے گئے تھے جو دی گئی ہدایات کے مطابق گاؤں، دیہاتوں سے متعلقہ مواد اکٹھا کر کے حیدرآباد میں قائم مرکزی آفس روانہ کرتے۔ یہ مرکزی آفس سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس کے مشرقی جانب ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ یہیں جامع سندھی لغات کا دفتر تھا اور یہیں لوک ادب کا مرکزی آفس قائم کیا گیا تھا۔

لوک ادب کے ذخیرے میں سندھی ادب کی معیاری اصناف مثلاً مدحین، مولود، تیس اکھریوں (سی حرفیاں)، کافیاں وغیرہ بھی شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سندھی لوک ادب میں موجود منفرد اصناف کی بنا پر اور لوک ادب کی مذکورہ تعریف کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے مغربی لوک ادب (Folk Lore) سے مطابقت دینا درست نہ ہوگا۔

چونکہ سندھی ادب کا محور گاؤں اور دیہات ہیں، اسی بنا پر سندھی ادب کا تمام ذخیرہ سندھی عوام کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھی زبان کے لوک ادب اور معیاری ادب کے درمیان کوئی دیوار یا حد فاصل قائم نہیں کی جاسکتی۔ سندھی ادب کا بڑا ذخیرہ سینہ بہ سینہ چلنے والی روایتوں میں محفوظ تھا اسے اکٹھا کر کے کتابی صورت نہیں دی گئی تھی۔ اس ذخیرے میں اس میں معیاری ادب اور دیگر اصناف بھی شامل تھیں۔

لوک ادب کی جمع آوری کے لیے ڈاکٹر بلوچ صاحب کی محنت کا اندازہ اس حقیقت سے لگائیے کہ اعلیٰ منصب اور عہدے کا حامل فرد ہونے کے باوجود انھوں نے جنگلوں بیابانوں، دیہاتوں، ریگستانوں اور پتھریلے راستوں کے سفر پیدل طے کیے۔ منزلوں پر منزلیں عبور کر کے سیلانیوں اور سنیاسیوں سے فکر کا فقیر بن کر یہ خزانہ جمع کیا۔ لوگوں کی اوطاقوں اور درباروں میں بیٹھ کر سالکوں سے ان کے سینوں میں محفوظ لوک ادب کے ایک ایک نکتے کو نکلوا کر ان موتیوں کو کتابی صورت میں پیش کیا۔ ایسا کر کے ڈاکٹر بلوچ صاحب نے سندھی ادب اور عوام پر

احسان عظیم کیا۔ ڈاکٹر نبی بخش صاحب کی بڑی ادبی دیانت داری یہ ہے کہ لوک ادب کی کوئی بھی صنف چاہے روایت ہو یا پہیلی کو جیسا اور جہاں ہے کی بنیاد پر کسی بھی قسم کا اضافہ یا کمی کے بغیر عوام تک جوں کا توں پہنچا دیا۔

بلوچ صاحب نے لوک ادب کی کتب کا مواد مندرجہ ذیل تین طریقوں سے جمع کیا اور انھیں کتابی شکل میں محفوظ کیا:

(۱) سگھڑوں (ہنرمندوں) یعنی زبانی راویوں سے سن کر قلمبند کیا گیا

(۲) قلمی بیاضوں سے تلاش کر کے حاصل کیا گیا

(۳) قدیم دور سے لے کر موجودہ دور کی کتابوں سے لیا گیا

سندھی لوک ادب کے موضوعات

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی لوک ادب کو جمع و محفوظ کرنے کی اسکیم و تجویز ایسی جامع اسکیم تھی کہ جس کی وجہ سے ہزاروں برس کا انمول ادب کتابی شکل میں محفوظ ہو کر ایک جگہ جمع ہو گیا اور اسی منصوبے کے تحت لوک ادب کی 42 جلدیں تیار کی گئیں۔ لوک کہانیوں کی تقریباً دس جلدیں اور پہیلیوں کی تقریباً آٹھ جلدیں تیار کی گئیں اور انھیں ہر عام و خاص کے لیے منظر عام پر لایا گیا۔ ان جلدوں میں سندھی پہیلیوں کے باریک نکات کو جس طرح ڈاکٹر بلوچ صاحب نے عام فہم انداز میں بیان کیا ہے، اس کی مثال پورے پاک و ہند میں نہیں ملتی۔

سندھی لوک ادب کے موضوعات میں لوک شاعری کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لوک شاعری میں ''سینگار'' سے بڑھ کر کوئی صنف نہیں۔ سینگار لوک ادب کی وہ صنف ہے جس میں حقائق کو لغوی مفاہیم میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی بڑی اہم ہے کہ سینگار میں موجود الفاظ و اصطلاحات جتنی قدیم ہیں، اتنی ہی مشکل بھی ہیں اور ان کے معانی و مفاہیم کا ادراک آسان نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس صنف ادب میں سندھی، ہندی، سنسکرت، عربی، فارسی، کوہستانی اور بلوچی زبان کے الفاظ آئے ہیں جن کو سمجھنے کے لیے ان کے مکمل لفظی و اصطلاحی معنوں کے علم کے بغیر شاعری کا ادراک ناممکن ہے۔ لوک شاعری میں ''سینگار'' کا ایک اپنا مقام ہے سندھی سینگار میں شاعری کی بنیاد ہندی کی سینگار شاعری پر ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کا مشہور

مقالہ ''سندھی اور ہندی شاعری کی باتیں'' سندھی ادبی بورڈ کے معروف علمی و ادبی رسالے سہ ماہی مہران میں 1953ء میں تین اقساط میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے سندھی اور ہندی شاعری کے باہمی تعلق پر سیر حاصل بحث کی۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے سینگار کی دریافت اور اسے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے تقریباً نصف صدی تک کام کیا ہے اور اسی محنت شاقہ نے آپ کے فہم و ادراک کی قوت میں اس حد تک اضافہ کیا کہ آپ صنف ادب پر اور ہر طرح کے موضوع سے متعلق کتاب بہ آسانی لکھ لیتے تھے۔

لوک شاعری میں لوک گیتوں کا بڑا حصہ ہے جس نے شاعری کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اس کے اکٹھا کرنے میں بھی آسانی پیدا کی۔ دیسی عوامی گانے وہ بنیادی ذخیرہ ہیں جن سے راگ، سُر اور رسمی راگوں کے سلسلے پیدا ہوئے۔ سندھ میں موسیقی اور کلام گا کر پڑھنے کا ذوق قدیم ایام سے جاری ہے۔ یہ لوک گیت مختلف محافل اور تقریبات میں گائے جاتے ہیں۔ اس وقت بھی یہ گانے لوک گیتوں اور شادی بیاہ کے نغموں وغیرہ کی صورت میں رائج ہیں۔ ان ہی گیتوں کی مشہور اقسام کو ڈاکٹر بلوچ صاحب نے لوک ادب کی متعلقہ کتابوں میں بے حد تلاش و تحقیق کے بعد جمع کیا ہے۔ لوک گیتوں کے متعلق بلوچ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ لوک گیت عوامی گانوں کی نسبت زیادہ معروف ہوتے ہیں۔ ان کو کبھی صرف مرد اور کبھی صرف عورت اور کبھی دونوں مل کر گاتے ہیں۔ انھی لوک گیتوں میں ایک معروف گیت ''ھو جمالو'' ہے۔ ''ھو جمالو'' کی طرح اور بھی کتنے ہی لوک گیت ڈھولک کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ سندھ میں لوک گیتوں کی کئی اقسام رائج ہیں۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ لوک ادب کی جمع آوری کے دوران ۱۹۰۷ء تا ۱۹۶۰ء کے عرصے میں گائے جانے والے معروف سات اقسام کے لوک گیت سندھ کے مختلف حصوں سے ملے ہیں۔ ان گیتوں کو ڈاکٹر صاحب نے لوک ادب کے سلسلے میں کتاب ''لوک گیت'' میں جمع کیا اور ان کی تفصیلات بھی تحریر کی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں کہ لوک گیت نامی کتاب کے مقدمے میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عوامی موسیقی کے ان گیتوں کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ ان کی سرپرستی کی جائے۔ اسی طریقے سے قومی موسیقی کے اس ذخیرے کو محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

لوک گیتوں کے متعلق ایک اور جگہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ لوک گیت ہر ملک اور زبان کے ادب کا اہم اور قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں جس کے ذریعہ سے اس ملک و قوم کی عوامی سوچ کا پتہ چلتا ہے

۔سندھی لوک گیت بھی سندھ کی ثقافت اور عوامی ادب کا آئینہ دار ہیں جس میں اہل سندھ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا عکس بھرپور طریقے سے نظر آتا ہے۔ڈاکٹر بلوچ صاحب کی رائے میں لوک گیتوں کی ابتدا کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کی جاسکتی کہ یہ کس نے بنائے اور کب سے گائے جارہے ہیں۔البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ عوامی اجتماعی زندگی کا اظہار ہیں اور قدیم زمانے سے ہی موجود ہیں۔ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں کہ تمام اقسام کے لوک گیت عوامی ادب کے نرالے نمونے ہیں اور لوک گیتوں کے لفظوں میں وزن سے بڑھ کر عوامی موسیقی کی لَے بھری ہوتی ہے۔عوامی موسیقی کے یہی گیت اور نغمے ہماری قومی موسیقی کے خزانے ہیں جن کو محفوظ رکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔

''گِیچ'' (شادی بیاہ کے نغمے) کے لفظی معنی ہیں وہ کلام جو گایا جاسکے جب کہ اصطلاحی معنوں کے لحاظ سے گیچ وہ گیت یا کلام ہے جو صرف شادی یا خوشی کے موقع پر عورتیں گاتی ہیں۔گیچ عام فہم اور سادہ تراکیب پر مشتمل ہوتے ہیں ان میں جذبات و احساسات کی موزونیت ہے مگر گیچ کے الفاظ وزن (عروض) کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔

''نڑ جابیت'' دراصل وہ طویل شاعری ہے جو اکثر ''کافی'' کے کلام میں استعمال کی جاتی ہے۔یہ عوامی نغموں کا ایک منفرد انداز ہے۔یہ ایک درد بھرے ساز کا نام بھی ہے۔

شاعری کے بعد ہم لوک ادب کی نثری داستانوں کے موضوعات پر ڈاکٹر بلوچ صاحب کی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں۔یہ نثری داستانیں بھی لوک ادب کا سرمایہ ہیں جن کے جمع کرنے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کی کاوشوں کا بڑا عمل دخل ہے۔

نثر کے ذخیرے میں لوک کہانیاں، عشقیہ داستانیں اور سندھ کے باہر سے حاصل شدہ قصے وغیرہ شامل ہیں۔اس سلسلے میں سندھی لوک کہانیوں کی کل سات جلدیں مرتب کی گئی ہیں۔ان میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔لوک کہانیاں اور آکھانیوں کی بنیاد ایک ہی ہوتی ہے مگر ایک باریک فرق بھی ہوتا ہے۔ان میں سے نسبتاً قدیم کہانیوں کو ان کے غیبی کرداروں کے سبب ''کہانی'' کہا جاتا ہے جب کہ ایسی کہانی جس کے کردار انسان ہوں ''آکھانی'' کہتے ہیں۔اس سلسلے کی جلدوں میں کہانیوں اور آکھانیوں کو ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے۔پہلی جلد

بادشاہوں، رانیوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے کرداروں پر مشتمل ہے۔ اس جلد کے ابتدا میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کا تفصیلی مقدمہ بھی موجود ہے جس میں لوک کہانیوں کی ابتدا اور ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے لوک کہانیوں کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔

نثر کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر شاعری کی طرف آتے ہیں اور شاعری کی صنف بھی وہ جن کا لوک ادب سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ''مدحین اور مناجاتیں'' لوک ادب کے سلسلے کی پہلی کتاب ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس میں موجود اصناف آج بھی عملی طور پر سندھی سماج کا اہم حصہ ہیں۔ میلادوں اور مولودوں کی طرح مداحین اور مناجاتیں عام طور پر مخصوص مواقع پر منعقد ہونے والی محافل اور مساجد میں پڑھی جاتی ہیں۔ ان مواقع میں عیدین اور رمضان شریف شامل ہیں۔ مداحین (قصیدے) اور مناجاتیں رسول اکرم ﷺ کے چاروں خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم، حضرت پیران پیر دستگیر شیخ عبدالقادر شاہ جیلانی، حضرت غوث بہاء الحق، حضرت شاہ مکی، شاہ عبداللطیف بھٹائی اور پیر پگارو کی شان میں لکھی ہوئی ہیں۔ مداحوں اور مناجاتوں میں اپنی نجات کے لیے عرض پیش کی جاتی ہے اور ممدوح کی تعریف اور اس سے عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ایسے شعرا جن کا کلام اس لوک ادب کی اس پہلی کتاب میں شامل کیا گیا ہے ان کی مختصر سوانح بھی کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔ ان شعرا میں ثمن چارن سے لے کر موجودہ دور کے شاعر احمد ملاح (1989-1969ء) تک کے شعراء اور کچھ گزشتہ دور کے قدیم شعراء بھی شامل ہیں۔ کتاب ''مداحوں اور مناجوتوں'' کی اشاعت بھی سب سے پہلے یعنی (1959ء) میں ہوئی۔

لوک ادب کے سلسلے کی ایک اہم کتاب ''مناظرے'' بھی ہے۔ اس مجموعے میں ڈاکٹر صاحب نے قدیم بڑے شعرا کا اس صنف سخن میں کلام شامل کر کے محفوظ کر دیا ہے۔ ان شعرا میں شاہ محمد دیدڑ و دیگر شعرا شامل ہیں۔ اس کتاب میں کل 109 مناظرے اور شعرا کی مختصر سوانح عمریاں شامل ہیں۔ یہ لوک ادب کے سلسلے کی انتہائی اہم کتاب ہے۔ (٦)

لوک ادب کی اصناف ادب میں ایک اہم صنف ''کافیوں'' بھی ہے۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کے لوک ادب کی جمع آوری اور اشاعت کے منصوبے سے قبل ''کافیوں'' کی ایک مختصر تعداد موجود تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے

اس صنف ادب کا مزید خزانہ دریافت کیا اور اس خزانے کو کافیوں کی تین جلدوں میں شائع کر کے محفوظ کر دیا۔ بلوچ صاحب نے کافیوں کی جلد دوم کے پیش لفظ میں لکھا کہ کافیوں کا یہ جمع شدہ مواد گذشتہ تیس چالیس سالوں کے عرصے میں محنت سے الگ الگ مقامات سے جمع کیا گیا ہے۔ اس مواد کے حصول کی خاطر زبانی روایات کے علاوہ مطبوعہ کتب اور قلمی بیاضوں سے مدد لی گئی۔ پہلی جلد میں ۲۳۷ شعرائے کرام کی ۱۰۲۷ کافیاں ہیں۔ دوسرے حصے میں ۲۴۰ شعراء کی ۷۰۶ کافیاں ہیں اور تیسرے حصے میں کل ۳۲۷۷ کافیاں ہیں۔ کافیوں جلد اوّل میں قدامت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس میں ساٹھ شعرائے کرام کو سلسلوں میں بانٹا گیا ہے۔ قدامت کے خیال سے پہلے مبین شاہ عنایت، شاہ شریف اور بلاول شاہ اور اس کے بعد شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی وائی، کافیوں اور ''شاہ جو رسالو'' میں آئے ہوئے شعراء کی کافیاں دی گئی ہیں۔ اس کے بعد تاریخ کے حوالے سے دوسرے سلسلے دیے گئے ہیں۔ ہر جلد کے متن کی ترتیب کی منصوبہ بندی بھی بلوچ صاحب نے خود ہی بڑی ذہانت سے کی ہے اور اس میں تاریخی ارتقاء اور مختلف نوعیت کے سلسلوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ لوک ادب کا یہ بڑا مواد زیادہ تر سگھڑوں اور عام لوگوں کے خزانوں سے حاصل کرنے کے بعد عمدہ ترتیب سے منظرِ عام پر لایا گیا ہے البتہ کچھ جلدوں کا غیر مطبوعہ مواد، سندھ کے گوشے گوشے سے حاصل کر کے مواد کو ملا کر چھپے ہوئے ذخیرے سے بھی حاصل کیا گیا ہے۔ ایسی جلدوں میں مداحیں، مناقبا، مناجاتیں، مولود، معجزات پرولیاں، پہیلیاں، ہنر، سینگار اور دیگر جلدیں آتی ہیں۔

لوک ادب کے سلسلے میں ''سومروں کا دور'' تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ان میں پہلی دو جلدوں میں ''دودو چنیسر'' کے قصے کے بارے میں مختلف روایات دی گئی ہیں اور تیسرے حصے میں روایات کی روشنی میں سومروں کے دور کا تاریخی و تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔

لوک ادب کی ہر جلد چار سو صفحات سے زیادہ ضخامت پر پھیلی ہوئی ہے۔ ان میں سے کچھ جلدیں چھ، سات اور آٹھ سو صفحات پر بھی مرتب کی گئی ہیں۔ پہیلیوں والی جلد ۸۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سندھی لوک ادب کی تمام جلدیں کتنے صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ بلوچ صاحب نے سندھی لوک ادب کے لیے جو پیش لفظ لکھے ہیں وہ علمی و تحقیقی شان کے حامل ہیں۔ یہ تمام پیش لفظ سندھی زبان میں دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلوچ صاحب نے معیاری کام کی خاطر گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ جس بھی گاؤں میں جانا ہوتا،

وہاں کے لوگ بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب سات آٹھ سال پہلے سندھی لوک ادب جمع کرنے کی خاطر یہاں آئے تھے۔ ''سندھی ہنر شاعری'' کی کتاب میں ''تجنیس'' پر بھی ایک جلد پیش کی ہے۔ایک کتاب ''جنگنامہ'' ہے اس کا آغاز ''سومروں کے دور'' سے ہوا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اس پر بڑی تحقیق کر کے اپنے دلائل دیے ہیں۔ کتاب ''مناظرا'' میں ٹوپی صافے کا جھگڑا بڑا دلچسپ ہے۔''واقعاتی بیت'' بھی لوک ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ڈاکٹر بلوچ صاحب نے پہلی مرتبہ یہ نام تجویز کیا اور کتاب کا یہی نام رکھا ہے۔اس وقت کے شاعر سگھڑوں نے ان واقعات سے متاثر ہو کر شعر کہے ہیں جو کتاب میں شامل ہیں۔''گھارتون'' اور ''ڈور'' دونوں ضخیم کتابیں ہیں۔(۷)

سندھی لوک ادب کے سلسلے کی ایک اہم کتاب ''ڈور'' بھی ہے۔اس موضوع پر سندھی لوک ادب میں اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں ملتی تھی۔ یہ کتاب ڈور کے فن پر مکمل روشنی ڈالتی ہے اور اس کے بہت سے معنی ،طرز، فنی ارتقا، ابتدا اور اس صنف کی فنی خصوصیات پر کافی وضاحت ملتی ہے۔ڈاکٹر صاحب نے سندھ کے مختلف مقامات سے اس سلسلے میں مواد اکٹھا کیا اور پھر مستند مواد کو کتابی صورت میں پیش کیا۔ یہ کتاب 1970ء میں سندھی ادبی بورڈ کی وساطت سے شائع کی گئی کتاب کا مقدمہ 32 صفحات پر مشتمل ہے۔کتاب کے آخر میں ان شعرا اور سگھڑوں کی مختصر سوانح دی گئی ہیں جن کا کلام اس کتاب میں درج کیا گیا ہے۔38 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے چار ابواب ہیں جن میں سب سے پہلے سوا لاکھ انبیاء کرام اور حضرت آدم علیہ السلام سے نبی کریم رؤف الرحیم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم تک کے ادوار کے حوالے سے مختلف شعرا کے اشعار معانی اور مطالب کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔دوسرے باب میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم تیسرے باب میں اولیاء کرام کی کرامات اور آخری باب میں اللہ عزوجل کی قدرت بیان کیے گئے ہیں۔

لوک ادب کے اس سلسلے میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے لوک ادب سے متعلق دوسری کتابوں کے ساتھ سندھی قصے اور بیرونی عشقیہ داستانوں کو یکجا کیا ہے۔اس میں ''مومل رانا کا قصہ'' مختلف نوعیت کا ہے۔اس کتاب کا مقدمہ 37 صفحات پر مشتمل ہے جس میں اس قصے کا تاریخی پس منظر، ابتدا اور ارتقا سے متعلق خوب معلومات فراہم کی گئی ہیں۔اس قصے کے سلسلے میں 5 روایتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔پہلی روایت تاریخ سندھ کی معروف کتاب

''تحفتہ الکرام'' سے ماخوذ ہے۔ دوسری روایت میں اس قصے سے متعلق قدیم ترین گانے والوں کی نظمیں اور اشعار دیئے گئے ہیں جب کہ تیسری اور چوتھی روایت کی بنیاد سندھ کے مختلف عوامی شعراء کی نظمیں ہیں۔ پانچویں روایت نثر میں ہے۔ یہ قصہ ھمیر سومرو کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کتاب 1970ء میں سندھی ادبی بورڈ کی جانب سے شائع ہوئی۔

سندھی لوک ادب کا ایک معروف قصہ ''عمر ماروی'' بھی ہے۔ عمر ماروی کے قصے کا آغاز کس دور میں ہوا اس سلسلے میں کسی بھی ادیب یا عالم کو قطعی ثبوت نہیں مل سکا۔ اس قصے کی بنیاد بھی زبانی روایات پر مبنی ہے۔ سندھی ادبی بورڈ نے اسے 1976ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کا مواد نثر اور نظم کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب 324 صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کے قلم سے 20 صفحات کا عالمانہ مقدمہ بھی اس میں شامل ہے۔ عمر ماروی کی داستان کتنی قدیم ہے اس کا جواب مختلف شاعروں، سگھڑوں کے کلام، ادبا اور علما کی تحریروں سے ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کا مواد جو کہ نثر اور نظم پر مشتمل ہے اپنے اندر ایک انوکھی دل کشی اور کشش سموئے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے کوشش کی ہے کہ عمر ماروی کی داستان کے ہر پہلو کو زیادہ سے زیادہ عمدگی سے اجاگر کیا جائے۔

لوک ادب کے سلسلے کی ایک اہم کتاب ''سسی پنوں'' بھی ہے۔ یہ لوک ادب سلسلے کی 32 ویں کتاب ہے اور یہ 1976ء میں سندھی ادبی بورڈ کے ذریعے منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں سسی پنوں کے عشقیہ قصے کی ابتدا سے آخر تک کی مختلف حکایتیں اور روایتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس میں 12 شعراء کی نظموں اور گیتوں پر مشتمل قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی چھٹی روایت میں خلفیہ نبی بخش لغاری کے قصے (مثنوی) میں بیان شدہ گفتگو اور خدا بخش مثنوی بیان کی گئی ہے جب کہ ساتویں روایت میں محمد واصل درس کی مثنوی سے متعلق سنی ہوئی گفتگو پیش کی گئی ہے۔

سندھی لوک ادب کی پہلی کتاب اور اس کا عالمانہ مقدمہ

لوک ادب سلسلے کی پہلی کتاب ''مداحیں اور مناجاتیں'' ہے جس کے مقدمے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب

لکھتے ہیں کہ یہ کتاب سندھی زبان میں موجود آنحضرت ﷺ کی مدح میں شاعری اور بزرگان دین کی شان میں مناجات کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ سندھی کی تمام مدحیہ اور مناجاتی شاعری پر مشتمل نہیں کیونکہ سندھی ادب کا یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ کم از کم دو تا ڈھائی صدیوں سے یہ صنف سخن سندھی میں عام طور پر مروج اور مقبول ہے ۔مدحیہ شاعری اور مناجات مساجد اور مدارس میں سعادت کے طور پر پڑھی جاتی ہے۔اس کے علاوہ دیہات اور دیگر علاقوں میں عید بارات اور شادی بیاہ کی محافل میں اس صنف سخن کو ایک خاص لے میں پڑھا جاتا ہے۔ڈاکٹر بلوچ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ اس صنف سخن کا بڑا حصہ شاعروں اور مدح پڑھنے والوں کی رحلت کی وجہ سے ضائع بھی ہوگیا ہے البتہ کوشش کی گئی ہے اس کتاب کے ذریعے مدحیہ اور مناجاتی شاعری کا ایسا مجموعہ ترتیب دیا جائے جس سے موضوع کے تمام خصوصی پہلو روشن ہوسکیں۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی لوک ادب میں خدمات کے تفصیلی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ لوک ادب کو محفوظ و یکجا کرنے کی منصوبہ بندی کے تحت کل 38 اصناف پر کام کیا گیا اور اس سلسلے کی 42 جلدیں شایع کی گئیں۔لوک ادب سلسلے کے اشاعتی دور کے ابتدا میں کام بڑی تیزی سے کیا گیا مگر بعد میں کچھ ناگزیر وجوہات اور مشکلات کی بنا پر دو مرتبہ یہ کام تعطل کا شکار بھی ہوا۔اس کے بعد ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے اپنی ذاتی کاوشوں سے اس وقت کے سندھی ادبی بورڈ کے چیرمین اور ممبران کو قائل کیا کہ سندھی عوامی ادب کے اس ذخیرے کی اشاعت کے رکے ہوئے کام کا دوبارہ آغاز کیا جائے چنانچہ یہ کام دوبارہ شروع ہوا۔دوبارہ کام شروع کرنے کے بعد آخری جلد سندھی ہنر شاعری 1991ء میں شائع کی گئی۔ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اس سلسلے کی کل ۴۲ جلدیں شایع کرائیں لیکن وہ تمام عمر مزید مواد کی جمع آوری کے لیے کوشاں رہے۔ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اپنی محنت کوشش سے مزید اتنا مواد جمع کرلیا تھا کہ جس کی مدد سے اس منصوبے کے تحت مزید 10 جلدیں شائع کی جاسکتی تھیں۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی محنت کا اس بات سے اندازہ لگائیں کہ انھوں نے لوک ادب کی ہر جلد کے ابتدا میں جو مقدمہ لکھا وہ اس جلد کے نہ صرف موضوع سے متعلق ہے بلکہ اس میں الفاظ اور اصطلاحات بھی وہی لکھی ہیں جو اس موضوع سے متعلق ہوں۔

یہاں ہم بطور مثال ’لوک ادب سلسلے‘ جلد اوّل بہ عنوان ’مدحیں اور مناقب‘ اور

آخری جلد بہ عنوان 'عام رسوم ورواج اور شادی بیاہ کی رسوم' کے مقدمات کے اردو تراجم پیش کرتے ہیں:

مدحیں اور مناقب

مواد کی نوعیت اور ترتیب

اس کتاب کا مواد بہت ساری جگہوں سے لیا گیا ہے پورے سندھ کے سگھڑوں ،مدح پڑھنے والوں، تحریروں اور مطبوعہ کتب میں سے ''ایک سو ایک'' مداحیں اور مناجاتیں منتخب کر کے ہر شاعر کے دور کے حساب سے مرتب کی گئی ہیں۔ مدحوں اور مناجاتوں میں کل 69 شاعروں کی کہی گئی مداحیں اور مناجاتیں شامل کی گئی ہیں جن میں سے 63 شعراء حضرات وفات پا چکے ہیں اور 6 زندہ اور باحیات ہیں۔ ان کے علاوہ 53 شاعر حضرات تو ایسے ہیں جن کا علم اسی کتاب کے ذریعے ہوتا ہے۔

ہر مدح کے شروع میں اس کے شاعر کی مختصر سوانح عمری دی گئی ہے، 18 شاعر حضرات ایسے ہیں جن کے حالات زندگی معلوم ہی نہ ہو سکے۔ ایک سو ایک مداحوں اور مناجاتوں میں سے 68 ایسی ہیں کہ اس کتاب سے پہلے شائع ہی نہیں ہوئی تھیں۔ اس کتاب میں غیر مطبوعہ مواد کو ترجیح دی گئی ہے اور مطبوعہ مواد میں سے 33 مداحیں اور مناجاتیں اس کتاب میں شامل ہیں۔ اگر کسی شاعر کی ایک سے زائد مدحیں اور مناجاتیں تھیں تو اس صورت میں صرف وہ مداحیں اور مناجاتیں شامل کی گئی ہیں جو صحت کے اعتبار سے معیاری ہیں۔ اس کام کے دوران تقریباً 200 مداحیں اور مناجاتیں نظر میں آئیں لیکن ان میں سے صرف ایک سو ایک شامل کی گئی ہیں۔ کچھ ایسی بھی مدحیں اور مناجاتیں ہیں جنھیں کتاب کے آخر میں شامل کیا گیا ہے۔

روایت اور صحت

ہر ایک مدح اور مناجات کے شروع کے صفحے پر حاشیے میں اس کی روایت کو واضح کیا گیا مطلب یہ کہ جس کارکن کے ذریعے یا علاقے یا تحصیل میں سے وہ روایت ملی ہے تو اس کا ذکر کیا گیا ہے اگر ایک سے زیادہ روایتیں ملی ہیں تو اس صورت میں جانچ پڑتال کے بعد متن کی تصحیح کی گئی ہے اور حاشیہ میں ہی اختلافی الفاظ یا جملوں کو بیان کیا گیا ہے۔شاعر جس علاقے کا رہنے والا تھا اس علاقے کی زبان کے اعتبار سے متن میں وہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔

معنی اور مقصد

سب سے پہلے مدح اور مناجات کے معانی کو سمجھنا ضروری ہے۔'مدح' اصل میں عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں تعریف اور تعریف کرنے والے کو عربی میں مادح یا مداح کہتے ہیں۔ٹھیک اسی طرح سندھی زبان میں بھی مدح تعریف کے معنی میں آتا ہے لیکن اس کا استعمال خالص ادبی ہے جو صرف پڑھے لکھے طبقے تک محدود ہے۔لغت کے اعتبار سے مدح ایک خاص معنی میں استعمال ہوتا ہے۔جیسا کہ ذکر کیا گیا، عربی میں لفظ مدح کے معنی تعریف کے ہیں خواہ وہ تعریف کسی بادشاہ کی ہو یا دوست کی یا ایک آدمی کی لیکن سندھی زبان میں مدح کا ایک خاص مفہوم ہے یعنی نظم کی صورت میں وہ تعریف جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں کی گئی ہو یا صحابہء کرام یا کسی ولی اور درویش کی شان میں کی گئی ہو۔یہ ایسی تعریف ہوگی جو صرف دلی محبت اور عقیدت و احترام سے کی گئی ہو۔اس معنی کے لحاظ سے لفظ مدح کو ہم نعت یا ثنا کے ہم معنی کہہ سکتے ہیں۔مدح کہنے والے کو سندھی زبان میں مداحی کہا جاتا ہے۔

لفظ مناجاۃ کا عربی مادہ ناجی یا مناجاۃ ہے اور اس کے معنی دل کا احوال بتانے کے ہیں۔ سندھی زبان میں مدح کی طرح مناجات بھی سندھی نظم کی ایک خاص صنف ہے جس میں شاعر اپنے دکھوں اور تکلیفوں کا حال بتا کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی مشکلات میں آسانی کے لیے دعا کرتا ہے۔ یا وہ اپنی ذاتی عقیدت کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا صحابہ کرامؓ یا کسی ولی اور درویش کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے بلاتا ہے۔ مناجات میں اللہ کی تعریف نبیؐ اور صحابہؓ کی ثنا یا کسی ولی یا درویش کی تعریف کا جذبہ بھی شامل ہوتا ہے۔

تاریخی پس منظر

تاریخی طور پر مدح کا سلسلہ عرب کے شاعر کعب بن زہیرؓ سے شروع ہوتا ہے جنھوں نے اسلام کی حقیقت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا اور آنحضرتؐ کی خدمت میں آ کر اپنا مشہور قصیدہ پڑھا اس قصیدہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں خوبصورت اشعار کہے تھے۔ جب کعبؓ نے قصیدہ پورا پڑھ کر سنا دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے کاندھے مبارک سے اونی چادر اتار کر کعب کو اوڑھا دی۔ کعبؓ کا خود چلے آنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے قصیدہ پڑھنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس کو نوازنے کا یہ قصہ آگے چل کر مسلم معاشرے اور تمدن کا ایک اہم حصہ بنا۔ اس کے بعد آنے والے ادوار میں شاعر حضرات کا دربار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آ کر مدح کرنا اور من چاہے انعام وصول کرنا ایک طرف تو ایک یہ رسم بن گئی تو دوسری طرف کسی اچھے انسان سے محض محبت اور عقیدت کی بنیاد پر اس کی نیکیوں اور اچھائیوں کو شعر کے ذریعے بیان کیا جانے لگا۔

سندھی معاشرے اور اخلاق اور کردار کی یہ ایک خصوصیت رہی ہے کہ کسی لالچ یا طمع کی خاطر تعریف کو بڑا معیوب سمجھا جاتا ہے اور اسی وجہ سے سندھی شاعری میں قصیدہ گوئی نے کوئی ترقی نہیں کی۔ اور یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ سندھی شعرا نے

اگر کسی کی تعریف کی ہے تو صرف اور صرف اس کی خوبیوں اور اچھائیوں کی وجہ سے ہی اس کی تعریف کی ہے۔

مداحوں کا پڑھنا

مدحوں اور مناجاتوں کی مقبولیت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان میں باری تعالیٰ کی حمد اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف ہوتی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مداحیں اور مناجاتیں شاعروں کی طرف سے محض شعر کے طور پر نہیں کہے گئے بلکہ اس طرح کے اشعار کہے گئے ہیں کہ عام مجلسوں میں بھی پڑھے جا سکیں۔ عید، عرس، جمعہ اور دوسرے مبارک دنوں کے مواقع پر مداحوں اور مناجاتوں کا پڑھا جانا قدیم زمانے سے چلتا آ رہا ہے۔ اسی طرح شادی بیاہ یا دوسری خوشی کی محفلوں میں مولود اور مداحوں کی محفلیں سجائی جاتی ہیں۔ سندھ میں اس وقت بھی مولود اور مدح پڑھنے والے گروہ سندھ کے مختلف حصوں میں موجود ہیں۔

مدحوں کا مضمون

اعتقادی طور پر مدحوں کے مضمون میں ایک جاذبیت ہے۔ باری تعالیٰ کی حمد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ثنا، صحابہ کرامؓ اور نیک بزرگوں کی تعریف ایک دینی سعادت اور روحانی تسکین کا باعث ہے۔ انسان کے ذہنی انقلاب کی تاریخ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت مسلم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید کے انقلابی نظریے سے انسانی ذات کی وحدت اور انسان کی ذہنی سربلندی کا سنگ بنیاد رکھا، رسم کے مقابلے میں روح کو زندہ کیا، فکر کو آزاد کر کے عالمگیر بنایا، وہم کے بجائے عمل اور تجربے کا راستہ روشن کر دیا، سمع و بصر علم و عقل کو عام استعمال کیا، چاند، سورج زمین اور آسمان کی تسخیر کی بشارت دی، کائنات اور نفسیات کے مطالعے سے زمین کی حقیقت کو سمجھنے کی تلقین کی۔ انسانیت کے ایسے عظیم محسن اور رہبر، ان کے

ساتھیوں اور ان کے چاہنے والوں کی ثنا اور تعریف ہر شخص کے لیے بڑی سعادت کی بات ہے۔

سندھ میں صوفی بزرگوں کی تعلیم اور تلقین کی وجہ سے ہندوؤں اور غیر مسلموں نے بھی آنحضرت ﷺ کی حمد و ثنا کو عین عبادت سمجھا ہے۔ شاعروں نے مداحوں اور مناجاتوں میں جو تعریف کی ہے وہ ان کی دلی محبت اور عقیدت کی وجہ سے ہے اور انھوں نے اپنے لہجے اور سادہ خیالات کو ایسے ہی بیان کیا ہے جیسے ان کے ذہن میں آئے تھے۔ علمی طور پر آنحضرت ﷺ کے مان اور مرتبے کو سمجھ کر بلند معیار مدح کرنا عام شاعر کے بس کی بات نہیں، البتہ مولوی احمد ملاح کی کہی گئی مداحوں میں ایسے بلند معیار کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔

عام رُسوم و رواج اور شادی بیاہ کی رسوم

عام رسوم و رواج اور شادی بیاہ کی رسوم اور اوہام و وساوس کا مطالعہ ''علم الانسان'' کا اہم باب ہے۔ رسوم و رواج اور شادی بیاہ کی رسوم کب بنیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا کوئی ٹھوس جواب دینا مشکل ہے البتہ مجموعی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ریت و رسوم ہر قوم، قبیلے اور ہر سماجی گروہ کی اپنی مخصوص سماجی اور نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جنم لیتے ہیں اور بعد میں جب تک یہ ضرورتیں باقی رہتی ہیں، رسمیں بھی زندہ موجود رہتی ہیں اور جب کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی تب یا تو وہ ختم ہو جاتی ہیں یا برائے نام عملی صورت میں باقی بچتی ہیں یا تبدیل شدہ شکل میں اوہام و وساوس کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ سطحی طور پر دیکھنے سے کچھ رسوم فضول نظر آتی ہیں یا محض وساوس معلوم ہوتی ہیں لیکن تاریخی لحاظ سے یہ انسانی گروہ کی سوچ بچار کے نشان، سماجی عمل کو آسان بنانے کا سامان یا ان کی نفسیاتی خوشی اور اطمینان کا بندوبست کرنے کا سامان ہوتے ہیں۔

رسوم و رواج کی ابتدائی تاریخ نہایت اہم ہے اور اس کا آغاز انسانی ذات کے بچپن کے عہد تک پہنچتا ہے۔ اپنے بچپن کے دور میں انسان بہت ہی کمزور، لاغر اور بے بسی

کی حالت میں تھے۔ بیرونی خوف و خطرات کے علاوہ اپنے اندرونی اوہام اور وسوسوں میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی۔ اس کے لیے خود اس کی زندگی کے راستے حیران اور پریشان کرنے والے تھے۔ بچے کی زندگی کا آغاز اور ماں کے پیٹ میں اس کا پلنا، بڑا ہونا، جوان ہونا، شادی کرنا، گھر بسانا پھر بوڑھا ہو کر بیمار رہنا، پھر بیماری میں بچنا یا مرجانا، یہ سب زندگی کے عجیب و غریب کرشمے تھے جن سے خیر سے گزرنے کے لیے انسانوں کو اپنی سوجھ بوجھ کو استعمال کر کے نہایت کٹھن مراحل طے کرنے پڑے۔

انسانوں کے لیے اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں دیکھنا، سننا وغیرہ بچکانہ اعمال تھے۔ اس کے بعد ان کی مہارت میں اضافہ ہوا اور تجربہ بھی وسیع ہوا اور عقل بھی جوان ہوئی۔ پھر اس کے عقل اور تجربے دونوں میں وسعت آئی اور اسے فکری پختگی حاصل ہوئی۔ بہر حال ہر دور میں انسان اپنی نسل کی حفاظت اور اپنی راحت کے لیے جتن کرتا رہا یہاں تک کہ اس کی یہ جتن کرنے والی عادت پختہ ہوگئی۔ زندگی کے ہر دور میں اس کی جتن کرنے والی اس عادت کی صورتیں بھی مختلف رہیں مگر اس کے پس منظر میں دو اہم جذبات کارفرما رہے یعنی اولاً عاجزی والتجا اور منت و نذر و نیاز اور ثانیاً مدافعت اور مقابلہ۔

زمین پر رہنے والے خطرناک جانور جیسے سانپ و بلائیں یا آگ اور بارش و طوفان جیسی طبعی قوتیں یا چاند گرہن سورج گرہن اور چاند ستارے یا کوئی اور ایسی چیزیں جو انسان کی سمجھ سے بالاتر تھیں جیسے دیو، پری، جن بھوت، یہ تمام چیزیں انسان کے لیے بڑی طاقتور چیزیں تھیں۔ اسی وجہ سے ایک طرف انسان ان کے سامنے بازو باندھ کر، سر جھکا کر ان کو دیوتا تسلیم کرتا تھا اس امید پر کہ وہ راضی ہو جائیں اور ان سے انسان کی مرادیں پوری ہوں اور وہ جان و مال کے نقصان سے بچ بھی سکے۔ دوسری جانب انسان اپنے علم اور عمل سے کام لے کر ان چیزوں سے مقابلے اور مدافعت اور بچاؤ کی منصوبہ بندی بھی کرتا تھا۔ بچاؤ کی ان تدابیر میں جادو ٹونا، ٹک ساٹھ، منتر، پڑھائی، سگے دھاگے، تعویز، پرہیز

،جنتر، سرود باجا، جھنڈے گاڑنا اور آگ کا الاؤ روشن کرنا، دیئے جلانا وغیرہ یہ سب اپنے بچاؤ یا حفاظت یا مقابلے اور مدافعت کے طور طریقے یا حیلے تھے۔

خود انسانوں کے مختلف گروہ آپس میں جھگڑے اور ایک دوسرے پر حملے کرتے رہتے تھے۔ قبائلی زندگی اور سماجی نظام کی ترقی کے نتیجے میں مختلف گروہ آپس میں یا دوسروں کے ساتھ صلح صفائی سے رہنا، جھگڑے کو ٹالنا، محبت بڑھانا اور ان مقاصد کے لیے جھگڑا سنوارنا اور اس مقصد کی خاطر امانت دار اور صالح لوگوں کو اکٹھا کرنا اور رسم و رواج کا قائم کرنا، آپس میں رشتہ داریاں کرنا، محبت کے ناطے جوڑنا۔ یہ سب گھریلو زندگی بلکہ سماجی عمل کی آسانی کی خاطر مختلف طور طریقے تسلیم کیے گئے ہیں۔

اولاد کی خوشیاں، بچوں کا لاڈ پیار، بالغوں کی شادیوں کے ساتھ ساتھ شادی بیاہ کی تقریبات کے گیت، بیماروں کی دیکھ بھال اور اس کی صحت مندی کے لیے مختلف جتن کرنا، مرحوم کے اہل خانہ کے لیے دل دلاسا اور مرحوم کی تجہیز و تکفین کے انتظامات کرنا۔ یہ تمام طور طریقے خوشیاں منانے، سماجی حقوق ادا کرنے، شکایات دور کرنے، ہمدردی کرنے اور آپسی محبت بڑھانے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں اور انھیں تسلیم شدہ رواج یا رسوم کا درجہ حاصل ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ان طور طریقوں کی غیر موجودگی میں انسانوں کی انفرادی اور گھریلو زندگی، سماجی اور معاشرتی زندگی نہ صرف پھیکی بلکہ مشکل ہو جاتی بلکہ نفسیاتی طور پر فرد یا گروہ کی خوشی اور راحت، تسلی اور غم خواری، تفریح و دل لگی، اعتماد اور اطمینان میں توازن کے بجائے عدم توازن پیدا ہو جاتا۔

۲۵ سال قبل جب 'لوک ادب اسکیم' کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں تب ایک لائق آدمی نے مشورہ دیا اور تاکید بھی کی کہ سندھ کی ریتوں اور رسموں کے حوالے سے مواد اکٹھا کیا جائے اور ایک جلد بطور خاص اس مقصد کے لیے شائع کی جائے۔ بظاہر یہ

موضوع آسان اور عام فہم لگا لیکن علمی اور تحقیقی لحاظ سے نہایت توجہ طلب تھا۔کون سی ریتیں اور رسمیں لی جائیں اور کن کن قبائل کی رسمیں لی جائیں اور کہاں کہاں سے لی جائیں؟ یہ ایسے سوالات تھے جن کا آسان جواب سمجھ میں نہ آسکا۔غور کرتے کرتے وقت گزر گیا اور بالآخر کسی بڑے منصوبے کا خیال ترک کر کے چند مخصوص کارکنوں کو ضروری ہدایات دی گئیں اور یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ جس گاؤں اور قبیلے کی رسوم کے بارے میں معلومات مل سکیں انھیں دی گئی ہدایات کے مطابق قلمبند کیا جائے ۔یہ مواد اور یہ کتاب اسی کوشش کا نتیجہ ہے۔اگر ''علم الانسان'' کے اصولوں سے واقف کارکنوں کے ذریعے اور تحقیق و تفتیش سے کام لے کر مواد اکٹھا کیا جاتا تو مزید بہتر شکل سامنے آتی۔البتہ ابتدائی کوشش کے طور پر فی الحال اس موضوع کے مطالعے کی غرض سے یہ کوشش کسی حد تک کافی ہے۔

اس کتاب کا بڑا حصہ یعنی پہلے پانچ بڑے ابواب انسانی زندگی کی پوشیدہ راہوں کے بارے میں ہیں یعنی یہ ان رسوم و رواج،طور طریقوں وغیرہ کے بارے میں ہیں جو رشتے داروں اور اولاد کے لیے دعا اور بچے کی شکم مادر میں پرورش اور پیدائش سے لے کر جوانی کی عمر،شادی اور مرنے تک رائج ہیں۔باب نمبر ۶ سے باب ۱۴ تک کتاب کے آٹھ ابواب دوسرے حصے کے موضوعات کا تعلق زندگی کے خاص شعبوں ،تجربات اور مشاہدات اور ان کے متعلقہ اوہام و بھرم سے ہے۔اگر غور کیا جائے تو یہ اوہام اور بھرم قدیمی رسوم اور اوہام کی یادگار ہیں البتہ موجودہ صورت میں یہ مٹی ہوئی شکل میں ہیں مثلاً اس وقت بھی کئی علاقوں میں کالا جادو،جادو کے علاج کی خاطر کچھ پڑھنا،دغا دھوکا،طلسم ،تعویز وغیرہ کسی قدیمی زمانے کے کالے جادو کے بچے کھچے آثار ہیں کیونکہ اب ان میں نہ تو اتنا جادو باقی ہے اور نہ ہی کالا پن۔جنوں کے سائے، پریوں کی پرچھائیاں،بھوتوں کے اثرات،آدمی پر جن کا اثر ہو جانا یا دیدار، یہ سب قدیمی ادوار کے مشاہدات اور فریب ہیں جن کی مدافعت کے لیے ہر وقت جناتی فقیر لانا،دھوپ

واس (ہندوؤں کا طریقہ جس میں اگر بتی یا کوئی اور خوشبو دار چیز جلائی جاتی ہے)، آسیب نکالتے وقت سرود کی محفل، نوک دار سلاخ گھونپنا، چوتارا بجانا، الوداع کہنے کے حیلے اور علاج اور متعلقہ شخص سے جادو کا اثر رخصت کرنے والا حیلا اور علاج اب تک چند قبائل میں رائج ہیں۔ اسی طرح چاند گرہن اور سورج گرہن کے وقت حاملہ بیوی اور اس کے شوہر کا آپسی پرہیز، نحس ایام اور تاریخیں یاد کرنا، نحس تارے کے سامنے نہ جانا اور اسی قسم کے اعمال قدیمی زمانے کے نجومیوں اور جوتشیوں کے اختراع کردہ اعتقادات کے بچے کھچے آثار ہیں۔ آگ جلانے اور شادی بیاہ ک موقع پر دولہا اور دلہن کے باراتیوں کے درمیان مصنوعی جنگ والے برائے نام باقی آثار غالباً ''گندھارا'' والے قدیم ہندو رسم کے بقیہ آثار ہیں۔ اسکے علاوہ روزمرہ کے کچھ کام یا سفر پر جانے کے بارے میں رسوم بھی ابھی تک باقی ہیں۔ ان سب اعمال کے علمی اور تاریخی مطالعے میں قدیمی دور سے لے کر انسانوں کے اوہام، سوچ بچار اور خوف اور خطروں سے تحفظ و مدافعت کی خاطر مختلف حیلوں کے اختیار کرنے کی حقیقت معلوم ہوسکتی ہے۔

انھی مذکورہ بالا وجوہات کی وجہ سے کتاب کے دوسرے حصے کی خاطر زیادہ مواد کی ضرورت تھی لیکن جیسا کہ 'لوک ادب اسکیم' کی تکمیل کے لیے سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے معاونت ختم ہو چکی تھی اور کارکن رکھنے، مزید مواد جمع کرنے کے لیے وسائل موجود نہیں تھے، اسی وجہ سے فی الحال جمع شدہ مواد ہی کو مرتب کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ زمانے کے محققین اس موضوع پر تفصیلی مطالعے کی خاطر زیادہ سے زیادہ مواد جمع کر کے اس موضوع کا مزید گہرائی سے علمی و تحقیقی مطالعہ کریں گے۔ البتہ ایسی کوشش جس قدر جلد ہو جائے اتنا ہی بہتر ہوگا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سندھ کے باشندوں کے رہن سہن اور رسوم و رواج میں انقلاب آچکا ہے جس نے سندھ کے باشندوں کی ثقافت کو ہلا کر رکھ دیا ہے خصوصاً قریبی زمانے میں اجنبی نظروں کے غلبے، اپنے اصل یقین کو فراموش کرنا اور اپنی

اچھی رسوم سے بیگانہ ہونا شروع کر دیا ہے۔ کچھ پڑھے لکھے لوگ بیرونی رسوم ورواج کو اختیار کرنے اور اپنی قدیمی رسوم ورواج سے بالکل بے خبر اور بیزار ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہروں میں سندھی سماج اپنی قوت کو گنوا چکا ہے۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویزن کے مسلسل دباؤ اور اقتصادی حالات کے بدلنے کی وجہ سے سندھ کی دیہاتی زندگی کے طور طریقے اور رسوم ورواج کی تبدیلی اب زیادہ دور کی بات معلوم نہیں ہوتی۔

''تبدیلی'' زندگی کا لازمی جزو ہے اور اس سے اپنے آپ کو بچانا مشکل ہے لیکن کسی بھی معاشرے میں یہ تبدیلی اگر سوچ بچار کے بغیر اور ربتدریج نہ آئے تو اس معاشرے کی یگانگت اور انفرادی حیثیت اور ناموس وعظمت ختم ہو سکتی ہے۔ قدیم رسوم و رواج مثلاً وہم ووساوس مستقبل میں بھول اور بھرم لگیں۔ اس کے باوجود کسی بھی معاشرے کی ثقافتی سلامتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس وقت تک اپنے قدیمی رسوم ورواج کو ترک نہ کرے جب تک اس کے متبادل کے طور پر دوسری اور خوبصورت رسوم ورواج اختیار نہ کر لے۔ ثقافتی زوال کے آنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ اپنی ریت رسموں کو کم تر جان کر ترک کر دیا جائے اور دوسروں کی رسوم کو اعلیٰ یا برتر جان کر اختیار کیا جائے۔ ہمیں ''علم الانسان'' کے مطالعے سے ایک بڑا سبق یہ بھی ملتا ہے کہ کسی بھی انسانی گروہ کی ثقافت میں وقت گزرنے سے تبدیلیاں آتی ہیں۔ کچھ تبدیلیاں ان کو باقی رکھتی ہیں اور کچھ ان کو ختم کر دیتی ہیں۔

خادم العلم

نبی بخش

سندھی لوک ادب سلسلے کی پہلی اور آخری کتب کے انگریزی مقدمات

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے سندھی لوک ادب سلسلے کی ہر کتاب کے لیے سندھی اور انگریزی میں عالمانہ مقدمات بھی لکھے تھے۔ یہاں ہم ان سلسلے کی کتب میں سے پہلی اور آخری کتابوں کے انگریزی مقدمات پیش

کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے ڈاکٹر بلوچ کی تیار کردہ فہرست کی ترتیب کے لحاظ سے تو آخری کتاب 'ہنر' ہے لیکن اشاعت کے لحاظ سے آخری کتاب 'عام رسوم ورواج اور شادی بیاہ کی رسوم' ہے۔ اسی لیے ہم نے ان دو کتب کے انگریزی مقدمات یہاں نقل کیے ہیں:

POEMS IN PRAISE OF GOD, THE HOLY PROPHET, AND THE REVERED SAINTS

October 31st, 1959.

This is the First book compiled under the Sindhi Adabi Board's 'Folklore and Literature Project.In1956,the Board approved this 5-year research project(1957-1961)aimed at the collection, compilation and publication of Sindhi folklore and literature. The work was started in January, 1957,and the first two years were devoted mainly to the collection of material. The compilation and publication work commenced from the current year(1959).The required material has been collected both from the oral tradition of the village folk and the written record. The oral tradition was reduced to writing through a network of field workers, one stationed in each taluka.

The Project aims at publishing representative works pertaining to the following selected segmentsof Sindhi folklore and literature:

a. Fables and Fairy-tales,

b. Pseudo-historical Romances,

c.Tales of historical nature,

d.Folk Poetry,

e.Folk-songs,

f. Marriage songs,

g.Dirges over the dead,

h. Riddles,

i. Proverbs,

j.Wit and humour,

k.Folk Customs and Superstitions. It is expected that forty basic works will be compiled under the above main categories by the end of 1961.

The scheme has been deliberately named as'Folklore and Literature Project.At the present stage,a considerable body of verse and tales in prose is current through verbal tradition among the village folk with which the educated and the intellectuals are not familiar. All this material in verse and prose is'folklore in the sense that it is popular and preserved with the village folk yet, a considerable part of it is'standard literature,and will be recognized as such after it is published.

Two types of laudatory poems closely connected in substance and style to Jorm a category by themselves are the subject of the present work. These are(i) the madah and(ii) the munajat. Sindhi madah is derived from Arabic, madah, the difference being that while madah in Arabic

poetry may be a panegyric, aeulogy or an encomium composed to please someone,madah in Sindhi is always a laudatory poem inspired by faith and composed only in praise of the Prophet,his companions and the revered saints. The munajat is a laudatory poem which contains mainly the supplications of the composer to God, the Prophet and his companions, or to the revered saints, seeking blessings to get rid of personal difficulties. In a madah Folklore of Sindh: Anthology of Prefaces the element of admiration and praise predominates,while in a munajat the supplications of the composer become the main burden.

Both the madah and the munajat are long laudatory poems. The idea of their composition in Sindhi was probably inspired by the well-known Arabic Poems in praise of the Prophet, al-qasidat al-burdat of Ka'b b.Zuhair and the lamiyyah of al- Busiri. One of the Sindhi poets alludes to Ka'b's panegyric and also mentions the famous poet Labid.

From the point of form and technique—particularly style, meter and rhyme scheme these poems may be divided into two parts: i) those which have developed under the influence of the Arabic qasida and in which a uniform rhyme is employed,and(ii)the others, more numerous and popular,composed under the influence of Persian poetry. The former are composed in indigenous meters and are usually couched in simple but classical Sindhi idiom,while the latter are composed in a variety of

Arabic-Persian meters and in a more'modern style'characterized by an admixture of Persian words and idioms.

In all, 101 representative laudatory poems 48 madahs and 53 munajats-have been included in the present work. Of these, 6are in praise of God, 67in praise of the Prophet, 8in praise of the companions, and 30 in praise of the revered saints. In all, 69 poets represented, 6living and 63 dead. Of these 53new poets have been laid under contribution their names fare either been unknown or their verses have not seen published previously. From the point of duration, Juman Charan is the earliest poet (d. 1151)Folklore of Sindh: Anthology of PrefacesA.H /.1738 A.D.)whose madah, which is popular throughout the country to this day, has been included. This indicates that this type of laudatorypoems have been popular with the people for the last 250years.

RITES AND RITUALS CEREMONIES AND SUPERSTITIONS

JULY 23rd, 1978

This is the Thirty-ninth book, in serial order,compiled under the Sindhi Adabi Board's'Folklore and Literature Project,pproved in 1956,for

the collection, compilation and publication of Sindhi Folklore. The work on this project was started in January1957,and the first two years were mainly devoted to the collection of the oral tradition and thewritten record. The oral tradition was reduced to writing through a network of field workers one stationed in each taluka area. The compilation and publication work commenced from 1959.So far 34volumes have been published and this is the thirty fifth of the forty volumes proposed to be published under this project. The Lower Indus Valley of Sindh, because of its peculiar geographical isolation, preserved its traditional culture in a large measure till the beginning of the modern developments. The first impact was that of the British colonial rule(1843)which introduced a new legal and a new educational system as also the imported goods from the West. In the beginning, these factors influenced some limited segments of native life, but their impact was felt by the turn of the 19th century. Yet, it was'external rather than'internal,in character. From the beginning of the 20th century,a more extensive and intensive impact on the traditional culture came through the extensions of road and railways and new irrigation system. Travel facilities increased socio-cultural contacts between the different communities throughout Sind, and the new irrigation system with its perennial canals changed the way of life of about 80%of the agricultural population. This impact was internal and

of a permanent nature. Prior to 1900,only summer crops were sown and the Lift System of irrigation based on the technology of the Sindhian Wheel(known asPersian Wheel elsewhere(kept the farmer, the carpenter, the potter and the ironsmith, close together. Winter provided a long period of leisure which was used for feasts and festivals, games,sports, and varied other cultural pursuits. With the introduction of Flow System of irrigation, first partially in 1900-1902and then extensively in 1932with the construction of the Sukkur Barrage,disappeared the centuries old Sindhian Wheel and the community of village artisans and with the perennial supply of water, the farmer and the farm labour constituting 80%of the population became busy sowing the seasonal crops all the year round. Elimination of the leisure season(winter),cut short cultural pursuits, and the more busy life sliced the traditional ceremonials, and reduced the magnitude of the rites of passage.

Despite all this, some segments of(traditional culture)with the possible presence of some primitive elements have survived to this day, even though the process of disintegration and effacement has accelerated since the achievement of national independence due to extension of education and means of communication and expansion of industrialization and urbanization. Mainly, however,the traditional way

of life has come to be seriously strained under the impact of economic considerations and compulsions.

Realising that traditional culture was likely to disintegrate under the impact of modern developments, it was proposed to study the folkways and ceremonials which are still popular in quite a few, if not all, of the more illiterate and rural communities.However, so very quick appears to be the pace and process of transition that what was recorded for this volume during the course of a decade, mainly from1958 to 1968, might have already been modified/given up by now in more than one locality/community.

For the purpose of the present Volume, a somewhat selective approach was adopted,concentrating more on'rites of passage. Information was collected from different localities distributed all over Sind, covering at least 8out of the total 10 Districts. Most of the ethnic groups were covered without any distinction of religion, language or socio¬ economic status. The Field Assistants, mostly primary school teachers who belonged to the localities and were close to the communities, served as informants and reporters. They were all laymen in the sense that they were not professionally trained for this job. They were given only one direction in simple and understandable terms, viz. to describe a rite, ritual or ceremony clearly in local phraseology without

omitting any significant and relevant information.

The following conclusions, among others, emerge from the study of the information received and included in this Volume:

1.Social/ psychological satisfaction, a sense of security and protection, recreation and enjoyment including fun and frolic would appear to be the main objectives served by most of the rites, rituals and ceremonies.

2.Rites of passage are observed more universally.

3.Marriage ceremonies are more prolonged and elaborate than any others. These include series of rituals as part of the different ceremonies commencing from the announcement of the betrothal and continuing even after the conclusion of the marriage, as an immediate follow-up.

4.Songs and singing are an integral part of the marriage ceremonies, while instrumental music is often used to cure the patient possessed by the Jinn(Evil Spirit).

5.Rites and rituals among the Hindu Communities of the Tharparkar district are comparatively of a more primitive nature than those obtained any where else

6.Influence of eclipses on pregnant women is accepted more widely, and complete rest and no action or easy movements are recommended as a precautionary measure.7.Child care during pregnancy in some cases, include measures which are more of a superstitious nature but diet and

exercise are also prescribed as part of cultural tradition.

8.The chapter(IX) on ailments and remedies would indicate the need for studying the different aspects of Folk Medicine in depth. It also confirms that the knowledge of domestic cure was wide-spread among the communities in the Lower Indus Valley of Sind.

9.The Chapter on Dreams(XIV) absolutely inadequate in its present form, suggests another area of. a very promising study of'Dream Experiences of the people in the Lower Indus Valley of Sind.

With the advancement of education and modern development most of the traditional superstitions have either been entirely forgotten, or are considered to be'things of the past and have ceased to be a living force in the lives of the people.

However, some of the ancient and primitive superstitions, rites and rituals have survived in some of the isolated and illiterate communities. Of these, some primitive ones are the remnants of what may be called'black magic.Belief in'Evil Spirits has also persisted. Some superstitions regarding'Evil Star and auspicious or inauspicious'days and dates'would seem to have lingered on as a legacy of the astrologer priests of the Indus Valley.

Black Magic

Black magic, as such is a species of the past. The following practices are

known today in some backward areas but they are not taken seriously.

a) Veer Muthh. Literally it means"the first of the powerful."The man who has mastered this witch craft is supposed to be able to kill his subject by exercising the formula while holding in his closed hand (muthh) a) handful of the subject's hair and'Fuller's Earth together. This notion is prevalent in some of the non-Muslim communities of theTharparkar district. When a patient fails to recover and dies, his death is attributed to his enemies who have got the Veer Muthh exercised over him.

b. Akhar(letter) or Parhia(the read) and written formula(or Ta'wiz)amulet.This practice is resorted to in order to afflict a particular person with sickness. Those who practice this craft, plan for deceiving their credulous customers well in advance. They prepare crude statues, or human forms, made out of clay, pierce them with needles, and then bury them along with a bunch of human hair and amulate, adjacent to the house of the sick person, near the village, or in the village graveyard. The relatives of sick would be given to understand that someone"has done him/her the akhar or ta'wiz(اکر يا تعويذ ڪرڻ)"or has put the parhia.(پڙهيا وجهڻ)So they would call this professional(پڙهين وارا) who would read all sorts of formulas, and finally out the spot which is to be excavated in order"to take out the parhias or ta'wiz".When they dig in

and find the stuff, all are taken by surprise. The needles are removed from the doll human form which is supposed to represent the body of the sick person. On hearing this good news, the patient feels tremendously relieved which helps him to recover.

c)Some other practices of black magic now stand diluted in the form of improvisations against the bridegroom known as Khireb(pp.203-209(or in the more innocent bridal songs known as Kamin(p.384(which represent their ancient prototypes in invocations and incantations.

Evil Spirits

Influence of supernatural beings such as Fairies(paryoon) and Evil Spirits(Jinn(is recognized in the form of'affliction by the Mysterious cast by the Fairy(pari jo pachho) and'the Jinn possessing a person.The poor patient may actually be suffering from an emotional disturbance,same inexplicable physical ailment, or neurosis. The Jinn may also choose to frighten the inmates of a house by mysterious actions. The Jinn is supposed to be sensitive to music, and is entertained accordingly to agree'to leave the patient.Alternatively, the Jinn may suffer a severe punishment(which is actually inflicted on the poor patient).Belief in Jinn was widely spread and strengthened by the early members and founders of the Kalhora dynasty by the turn of the 17th centuary.

They propagated that the Jinns were under their control and they delegated part of their power to their faqirs who went all over the country visiting those who were sick, as cribing their malady to the Jinn, and assuring the patients that they would ward off the evil Jinns. The patients thanked the faqirs and their eventual recovery confirmed their belief in the Jinns. As a result, the Kalhora rulers through a host of their faqirs, came to exercise great influence over village population by leading them to believe that they had followers not only among men but also among the Jinns.

Presently, superstitions regarding the Jinn are fairly wide spread in the more isolated rural areas.The Jinns are supposed to dwell in graveyards, lonely trees and abandoned structures. They appear in the form of young children and old men in the form of animals(goats, sheep, cow, camels or cobras;(or in the form of fire(oil lamp, burning coal, fire flames(.They harm men and women who are"with uncleanhead)"who have not taken bath)or who happen to pass, after sunset, through un-inhabited areas or graveyards. To be safe, an amulet(ta'wiz) is worn on the arm or around the neck.

But when a Jinn has"entered into the person of someone,"or"possessed a person",he/she is immediately afflicted with some malady. All cases of hysteria and neurology would be conveniently ascribed to the"Jinn

having entered into the person"of the patient. Thus, the senseless talk of the patient is considered to be of the Jinn in him/her. A professional faqir now must be called to"take the Jinn out."The faqir is accompanied by a Surandai(the musician who plays on the Surando instrument).

The sitting takes place at night when relatives and neighbours gather in the patient's house, a woodfire is lit in the center, the bed of the patient is made on one side, while the faqir and the'harper sit on the other side. This gathering, with the faqir preparing,"to take the Jinn out of the person" of the patient is known as Jagar(a wakeful assembly.(The harper begins to play on the Surando and sweet music has a soothing effect on the patient who begins to behave as a normal person. In the 'Jagar the, patient is allowed to talk freely(the relatives will not object to it even if the patient is a lady(and this talk also heals the patient.

But the village folk are not prepared to rationalize in this way. Any signs of quick recovery must be due to the Jinn being a kind fellow not inclined to trouble the patient anymore. But the Jinn could be an evilone. In that case, the procedure prolongs. The music of surando and the odour of the'dhoop)gum of ashrub(which is burnt on the occasion(technically known as"ذوپ واس کرڻ"to spread the odour of dhoop)do affect the "Jinn in the person of the faqir" and also the"Jinn in the person of the patient."If the Jinn in the person of the patient is weaker he keeps quiet

(i.e.the patient keeps quiet X(but if he is haughty and naughty, he prepares for a fight with the"Jinn in the person of faqir so he throws a challenge(the patient begins to talk threatening the faqir,but we must believe that it is the Jinn in him/her who is talking(:that is the patient would sit up and begin to whirl his head around o then the faqir's Jinn also gets excitedand he(the faqir) also begins to whirl his head more vehemently. An actual fight may take place and the faqir must see that he wins. So he keeps his cane ready by his side, to teach the Jinn in the patient a lesson once for all. The music continues on more vigorously. The faqir and the patient whirl their heads more vehemently, challenge and threaten each other, and even come to grips. The verbal dual and the whirling of heads continue on so that all who witness are satisfied that the curing process has taken place effectively. When, the faqir and the patient get tired they begin to calm down slowly. The faqir recites the Kallma and assures the relations of the patient that the Jinn has left the person of the patient and gone away. If the patient happens to recover subsequently, all credit goes to the faqir's charm. But if he does not recover, his Jinn is considered to be too powerful for the faqir. So, either another faqir is to be called, or other means are to be adopted for the patient's recovery.

Astrology.

Astrology was being practiced in the Indus Valley from times immemorial. The following superstitions having their source in astrology have survived to this day.

a(Eclipses. A pregnant woman is advised not to indulge in any activity during the course of asun-eclipse or a moon-eclipse. If she peels potatoes, for instance, the child might be born with a bald head if she cuts something, the child might be born with a cut on some part of the body.

b.Taro(The Star).Starting with the new moon,'The Star is supposed to be in the East on the1st and the 2nd day: in the South on 3rd and 4th in the West on 5th and 6th in the North on 6th or 7th in the Earth on 9th and in the Sky on 10th.The Star being inauspicious,one must not proceed on any given date in the direction in which'The Star lies. Thus, one should not travel in the western direction on 5th and 6th one should not start digging a well on the 9th and one should not start picking dates on the 10th.

c. The Week Days. Some week days areauspicious and others inauspicious for doing certain things. The hari(farmer) should put into motion his hurlo(Sindhian wheel)preferably on a Saturday, Sunday, or a Monday. Marriage should not take place on a Saturday. One should not

go to sympathize with someone who has lost a relative on a Wednesday and Friday, the proper day beingThursday.

d. Dates. Certain dates of the month are not auspicious for starting any new programmes.These are supposed to be 3,5,6,8,13,17,18,21,23,2630. Excepting these, the rest are all favourable ones.

e. Travel. While proceeding on travel in aparticular direction, the'days and the'Star'are to be considered. One should not proceed towards East on Saturday and Monday,towards South on Thursday, and towards North on Tuesday and Wednesday. On Friday, one should not go anywhere before offering the Friday prayers. Also one should not leave home immediately after having a glass of water .As one leaves home and meets an old man with white head, it is a bad omen.If one meets a man with empty jars, one should try to avoid passing by his side: if the jars are full of water one should touch them.As one gets started and remembers that he has forgotten something, it is a bad omen to proceed any further. As one starts and his turban, shirt or trousers get stuck up (say in the doorway, or outside in the branch of at horny bush(it is considered to be a warning against proceeding any further. If one sees a fox on the way, it is a good omen. While going on, it is a good omen if one hears a partridge crying on the left hand side in the forenoon and on the right hand side in the afternoon: it is a bad omen if it is otherwise.

While going, if one sees a snake on the right hand side, a donkey or an ass on the left hand side, or a bier of the dead just in front of him, he is sure to meet success.

Parr Janj or Dhingano

In this marriage ritual those on the bride's side intercept, and improvise a fake attack upon the bridegroom's marriage procession(Janj(coming to the village/house of the bride. This ritual may represent the faint memories of the actual fights on the occasion of the ancient Gandharra form of Hindu marriage.

Besides the more important species, there existmany a harmless little superstitions such as follows: It is a good omen if a cat has be gotten kittens in the house one should not inform anyone but rather start some kind of rumour when a mare gives birth to her colt if the cock cries immediately after sunset, a famine is likely to occur, the particular funny cries of the dog(ruroonرُوڑن)when the whole village is asleep, is indicative of a famine or a death one should not look at the mirror at night if one cuts one's nails and throws on the ground, a quarrel is likely to take place in the house feeling like scratching the palm of one's hand suggests that one is likely to get money from somewhere one should not touch the oil Tuesday, etc.etc.

سے ترتیب دے کر شائع کیا جاتا تو یہ ایک عالی شان کارنامہ ہوتا۔ میرے اندازے کے مطابق صرف ''سندھی محاوروں'' پر تین یا چار جلدیں شائع ہوتیں تو اس کام کی تکمیل ہو جاتی لیکن افسوس اس تمام کام کو بند کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ سندھ میں ظرافت اور طنز و مزاح کے ادب کا اس قدر بلند معیار ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی، اگر یہ تمام مواد یکجا کر کے شائع کیا جاتا تو کم از کم تین جلدیں اس کی بن جاتیں۔ اس کے علاوہ سندھ کے مویشی، کھیتی باڑی، ہواؤں کا حساب، تاروں کا حساب، موسموں کی معلومات، جڑی بوٹیاں اور درخت، پرندے اور مختلف جانور، گھوڑوں اور اونٹوں کی سواری سے متعلق معلومات، سندھ کے ہنرمند کاریگروں کے اوزار اور اصطلاحات وغیرہ سے متعلق مواد یکجا کر کے شائع کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح سندھ کے پہلوانوں اور سندھ کی خاص کشتی ''ملھ'' پر ایک کتاب شائع ہو سکتی تھی۔ لوک ادب سلسلے کی بندش کے بعد یہ تمام امیدیں ختم ہو گئیں اور ان موضوعات پر کتب شائع نہ ہو سکیں۔ جن مہربانوں نے اس کام کو بند کرایا انھیں اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ موجودہ عہد میں لوگوں کی زیادہ توجہ سیاسی کمائی والی باتوں میں ہے اور ایسے علمی اور مستقل اہمیت کے کاموں کی اہمیت نہیں سمجھی جاتی۔''

سندھی لوک ادب سلسلے کی تکمیل پر آمادگی

سندھی لوک ادب کے تحفظ کے اس عظیم الشان منصوبے کی غیر شائع شدہ کتب کی تفصیل آ چکی۔ ڈاکٹر بلوچ کی زندگی کے آخری دور میں، اس کے بعد بھی ایک موقع ایسا آیا تھا کہ ڈاکٹر بلوچ نے اپنی ضعیف العمری کے باوجود اس سلسلے کی تکمیل پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ اس بارے میں ہمیں جناب محمد ارشد بلوچ کی عنایت سے ڈاکٹر بلوچ کا ایک خط ملا جو سیکریٹری، سندھی ادبی بورڈ جام شورو کو لکھا گیا۔ یہ خط ڈاکٹر صاحب نے مورخہ ۲۱رفروری ۲۰۰۹ء کو لکھا تھا۔ یہاں ہم اس خط کا آسان اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں:

''آپ کا خط مورخہ 17/1/2009 میرے سامنے ہے۔ لوک ادب کے سلسلے کا کام جاری

تھا کہ میرے مشورے کے بغیر بورڈ نے اسے بند کر دیا۔ مجھ میں اب جوانی والی ہمت تو نہیں لیکن اپنی زبان کے سرمائے کے تحفظ کی خاطر میں کچھ نہ کچھ کام کروں گا بشرطیکہ بورڈ بھی اس کام میں اپنی ذمہ داری پوری کرے اور درج ذیل اصول اگر قبول ہوں تو مجھے مطلع کریں تا کہ بسم اللہ کی جائے:

۱۔ میں بلا معاوضہ کام کروں گا، بشرطیکہ کتابیں فوری طور پر شائع کی جائیں، تاخیر نا قابل قبول ہے۔

۲۔ ہر کتاب کا مواد میری طرف سے جمع کیا جائے گا لیکن بورڈ کی جانب سے کم از کم ایک کارکن بطور نقل نویس Copyist میری نگرانی میں کام کرے گا۔ اس کی خاص ذمہ داری ہوگی کہ دیا گیا مواد خوش خط لکھنا، فوری طور پر پریس میں دینا اور پروف پڑھنا۔

۳۔ ہر کتاب کے ابتدائی صفحات میں یہ عبارت ہوگی جملہ حقوق بحق مصنف۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بورڈ کی جانب سے اس میں کسی طرح کا بھی دوسرا مواد شامل نہ کیا جائے گا۔ اگر یہ کتاب مستقبل میں دوبارہ شائع کی جائے تو میری اجازت اور میرے لکھے پیش لفظ کے ساتھ شائع کی جائے گی۔

۴۔ ہر کتاب کا پہلا ایڈیشن میری جانب سے علم وادب کی خدمت کی خاطر بورڈ کو بلا معاوضہ دیا جائے گا اور اس بات کا ذکر اسی طرح کتاب میں کیا جائے گا۔

۵۔ ہر کتاب کی 20 یا 30 کاپیاں مجھے دی جائیں گی۔

اگر یہ شرائط قبول ہوں تو ایک خط کی شکل میں منظوری اور تحریری معاہدہ مجھے بھجوادیں۔ دوسرے خط میں منظوری کے طور پر یہ بھی لکھا جائے کہ بورڈ کے عملے سے کون سمجھ دار بیدار مغز کارکن میرے ساتھ کام کرے گا۔

ابتدائی طور پر درج ذیل دو کتب پریس میں برائے طباعت جائیں گی۔

۱۔ سندھ کے بارے میں چارٹوں کا ادبی خزانہ

۲۔ میین غوث محمد شاہ لکھپت (کچھ بھوج) والے کا رسالہ"

افسوس ڈاکٹر صاحب کی اس آمادگی کے باوجود لوک ادب کے منصوبے پر کوئی مزید کام نہ ہو سکا۔

سندھی لوک ادب کی جلدوار اشاعت اور ہر جلد کی ضخامت

سندھی لوک ادب کے تحفظ کے اس عظیم الشان منصوبے کی کچھ تفصیلات ہم پیش نظر کتاب کے باب نمبر ۱۱ میں پیش کر چکے ہیں۔ یہاں ہم ہر کتاب کا نام اور متعلقہ جلد کی کل ضخامت پیش کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے یہ کام کس قدر جان فشانی اور مستقل مزاجی سے مکمل کیا۔ باب نمبر ۱۱ میں ہم نے ہر جلد کے نام کا اردو ترجمہ اور سنہ اشاعت بھی تحریر کیا ہے:

نام کتاب	کُل صفحات
مداحون ۽ مناجاتون	532
مناقبا	391
معجزا	290
مولود	408
تيهه اکريون-1	509
تيهه اکريون-2	481
هفتا ڏينهن، راتيون ۽ مهينا	431
جنگناما	535
واقعاتي بيت	479
مناظرا	752
سنڌي سينگار شاعري	323

پرولين ڏٺون معمائون ۽ پول	270
ڳجهارتون- ڳجهارتون-2	765
ڏور	606
ڳيچ	348
لوڪ گيت	405
بيت	522
نڙ جا بيت	418
ڪافيون-1	642
ڪافيون-2	1143
ڪافيون-3	1545
سنڌي لوڪ ڪهاڻيون-1	480
سنڌي لوڪ ڪهاڻيون-2	259
سنڌي لوڪ ڪهاڻيون-3	222
سنڌي لوڪ ڪهاڻيون-4	297
سنڌي لوڪ ڪهاڻيون-5	420
سنڌي لوڪ ڪهاڻيون-6	229
سنڌي لوڪ ڪهاڻيون-7	289
دودو چنيسر-1	636
دودو چنيسر-2	572
مشهور سنڌي قصا-1	513
سنڌ جا عشقيه داستان-2	398

ترکی کے نامور محقق کی تحسین

ڈاکٹر محمد یعقوب مغل صاحب نے لوک ادب منصوبے کے بارے میں ایک موقع پر راقم سے فرمایا کہ 1975ء میں ترک وزیر اعظم کے مشیر ڈاکٹر محمد اوندر Sindh Through Centuries سیمینار میں شرکت کے لیے آئے تھے اور اٹھارہ روز تک قیام کیا تھا۔ ڈاکٹر مغل صاحب ترکی زبان میں مہارت کی بنا پر ان کے ساتھ ساتھ رہے اور ترکی سے اردو میں ترجمانی کے فرائض بھی انجام دیے۔ ڈاکٹر محمد اوندر ڈاکٹر بلوچ صاحب سے ملاقات کی غرض سے ان کے گھر بھی گئے۔ وہاں سندھی لوک ادب کی 42 جلدیں موجود تھیں جنھیں دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ کام تو کسی ادارے نے کیا ہوگا۔ یہ سن کر بلوچ صاحب نے فرمایا کہ یہ پورا کام اس ناچیز نے کیا ہے۔ یہ سن کر ڈاکٹر محمد اوندر بہت حیران ہوئے اور فرمایا کہ آپ کا صرف یہی کام اتنا بڑا علمی کارنامہ ہے کہ اس پر آپ کو ادب کا نوبل پرائز ملنا چاہیے۔

حواشی باب نمبر 14

۱۔ملاحظہ فرمائیں ڈاڪٽر نبي بخش خان بلوچ جا ابتدائي ڪتاب ۽ لوڪ ادب جي نثري صنفون (ڈاکٹر بلوچ کی ابتدائی کتابیں اور لوک ادب کی نثری اصناف) از ڈاکٹر تہمینہ مفتی، سہ ماہی مهراڻ جام شورو، ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ خاص نمبر، صفحہ نمبر 303

۲۔ملاحظہ فرمائیں لوڪ ڪهاڻين جي علمي اهميت (لوک کہانیوں کی علمی اہمیت) از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔یہ مضمون ڈاکٹر بلوچ صاحب کے مقالات کے مجموعے ڊاڪٽر بلوچ جا مقالا - علم ۽ ادب ۽ شخصيتون مرتبہ محمد ارشد بلوچ میں موجود ہے۔ملاحظہ فرمائیں اس کتاب کا صفحہ نمبر 159

۳۔ایضاً

۴۔ملاحظہ فرمائیں ''پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ'' از سیّد مظہر جمیل۔یہ مضمون کتاب ڊاڪٽر نبي بخش خان بلوچ (شخصيت،فن ۽ فڪر) مرتبہ پروفیسر محمد سلیم میمن میں موجود ہے۔ملاحظہ فرمائیں اس کتاب کا صفحہ نمبر 175

۵۔ایضاً

۶۔ ملاحظہ فرمائیں جناب عبدالرحمن پلیجو کے سندھی زبان میں لکھے مضمون ڊاڪٽر نبي بخش بلوچ :لوڪ ادب جو مطالعو (ڈاکٹر نبی بخش بلوچ:لوک ادب کا مطالعہ)۔یہ مضمون کتاب ' ڊاڪٽر بلوچ هڪ مثالي عالم' مرتبہ تاج جویو کے حصہ اوّل میں شائع ہوا۔ملاحظہ فرمائیں صفحہ ۲۵۴ تا ۲۶۰۔

۷۔ایضاً

باب نمبر 15

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی
'شاہ جو رسالو' پر منفرد تحقیق اور تکمیل

گزشتہ ڈیڑھ صدی سے جن محققین نے ''شاہ جو رسالو'' یعنی حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے مجموعۂ کلام کے موضوع پر تحقیقی کام کیا ہے، ان میں مرزا قلیچ بیگ، میر عبدالحسین تالپوری سانگی، ڈاکٹر گربخشانی، مولانا دین محمد وفائی، شمس العلما عمر بن محمد داؤد پوتہ، مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی، کلیان آڈوانی اور علامہ آئی آئی قاضی کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ڈاکٹر بلوچ صاحب کی خدمات اس سلسلے میں تاریخی نوعیت کی ہیں۔ اس سے قبل شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کو شائع کیا گیا ہے لیکن ڈاکٹر بلوچ صاحب شاہ لطیف کے رسالے کو جمع کرنے اور رسالے کے ماخذات کو جمع کرنے اور ان سب کو ترتیب سے شائع کرنے میں پچھلے تمام علماء کو پیچھے چھوڑ گئے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اپنی مسلسل محنت، عزم اور حوصلے سے وہ کارنامہ انجام دیا جو سندھی زبان و ادب میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب سے قبل کے محققین میں سے کئی نے اس کام کا آغاز کیا اور کافی آگے تک پہنچایا لیکن یہ بات بھی ان کے مقدر میں لکھی تھی کہ اس منصوبے کا از سرِ نو آغاز بھی وہ کریں اور اس کی تکمیل بھی۔

شاہ جو رسالو کی تکمیل کی خاطر ڈاکٹر بلوچ صاحب کی محنت

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی عادت تھی کہ وہ علمی تحقیقات کے لیے صرف کتب و رسائل اور مخطوطات ہی سے

استفادہ نہیں کرتے تھے بلکہ عملی میدان میں داخل ہوکر Field Work بھی کرتے تھے۔اس منصوبے کی تکمیل کی خاطر بلوچ صاحب نے سندھ سے باہر ہند، ایران، ترکی اور برطانیہ تک کے علمی مراکز اور لائبریریوں کا سفر کیا۔اس سے قبل برٹش میوزیم میں شاہ جو رسالو کے مخطوطے کا ڈاکٹر گربخشانی نے ذکر کیا تھا لیکن ڈاکٹر بلوچ صاحب نے نہ صرف اس مخطوطے کو حاصل کیا بلکہ انڈیا آفس لائبریری لندن سے دوسرا قلمی نسخہ بھی حاصل کیا۔اس قلمی نسخے سے ان سے قبل کسی نے استفادہ نہیں کیا تھا۔اس کے علاوہ شاہ کے مختلف سُروں کے مقامات کو سمجھنے کے لیے بحیرۂ عرب کے کناروں اور ان جزیروں میں بھی گئے جن کا ذکر شاہ لطیف کی شاعری میں آیا ہے۔(۱)

شاہ عبداللطیف بھٹائی سے متعلق کتابوں کی اشاعت

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی جائے پیدائش بھٹ شاہ سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ان کے گاؤں میں ایسے لوگ تھے جو بھٹ شاہ پر ہر جمعہ کی رات شاہ لطیف کے کلام کی محفلِ سماع کی خاطر درگاہ شریف پر حاضری دیتے تھے۔اس کے علاوہ ان کے گاؤں کے نزدیک ہی بھٹائی صاحب کے فقیروں وگویوں کے آستانے تھے۔بلوچ صاحب بچپن سے لے کر ابتدائی تعلیم کے زمانے تک شاہ لطیف کے کلام کو سنتے رہے۔

ڈاکٹر بلوچ نے ساٹھ کی دہائی میں شاہ لطیف ادبی کلچرل کمیٹی کے سیکرٹری کی حیثیت سے طاقتور منصوبے تیار کیے، جن کا مقصد یہ تھا کہ ایسا علمی مواد شائع کیا جائے جو آئندہ شاہ لطیف کے متعلق کام کرنے والوں کو بنیادی ماخذ کے طور پر کام آئے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۶۶ء میں تحقیقی اشاعتی کام شروع کیا اور ۱۹۷۶ء تک ۱۸ کتب شائع کیں۔سب سے پہلے میر عبدالحسین تالپور سانگی کی کتاب ''لطائفِ لطیفی'' کا فارسی سے سندھی ترجمہ ۱۹۶۸ء میں شائع کرایا۔یہ کتاب میر صاحب نے ۱۸۰۸ء میں لکھی تھی۔ڈاکٹر صاحب کا یہ انتخاب ان کی نگاہ کی گہرائی ظاہر کرتا ہے۔میر عبدالحسین سانگی شاہ صاحب کے عاشق تھے۔وہ اپنے محبوب مرشد یعنی حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے حالات کے سلسلے میں جن فقرا سے ملے، ان سے حاصل کردہ معلومات کو بھرپور عقیدت سے فارسی میں قلمبند کیا(۲)۔

شاہ جو رسالو کی تحقیق میں ڈاکٹر بلوچ صاحب نے کتاب کے دیباچے میں مخدوم پنج پاکے، مخدوم

عبدالرؤف بھٹی کے منظوم شدہ واقعات کی مزید جانچ پڑتال پر زور دیا ہے اور کربلا کے سفر سے متعلق واقعے پر شک کا اظہار کیا ہے جس میں ان کی تحقیقی وعلمی سوچ کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے علاوہ مرزا قلیچ بیگ (۳) والی کتاب احوال شاہ بھٹائی ۱۹۷۲ء میں شائع کرائی۔ ۱۹۶۹ء میں برٹش میوزیم والا نسخہ اور ۱۹۷۲ء میں جونا گڑھ والا نسخہ بھی شائع ہوا۔ ''شاہ جا سُر چشما'' نامی کتاب ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی فکر اور محاسن کلام

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی فکر اور ان کے کلام کے محاسن کے بارے میں لکھتے ہیں :توحید اور رسالت حضرت شاہ صاحب کے پیغام کے دو بنیادی ستون ہیں۔ اپنے ایک بیت میں جو اس وقت رسالہ میں بسم اللہ کے طور پر پہلا بیت ہے۔،شاہ صاحب نے فرمایا:

سب سے اوّل اللہ پاک ہی ہے
جو علیم و اعلیٰ اور سارے عالم کا مالک ہے
وہ قادر اپنی قدرت سے ہی قدیم اور قائم و دائم ہے
وہ والی ہے اور اپنی وحدانیت میں واحد ہے
اور وہ رازق و رب رحیم ہے
تو ان کی ہی حمد کر، تو ان کی ہی ثنا کرتا رہ
یہ اس کریم کا ہی کرم ہے کہ جس نے
جوڑے (Pair) سے کل کائنات کی تخلیق فرمائی

چونکہ خالق اکبر ہی کلی طور پر کارساز ہے اور کائنات میں کل اختیار کا مالک ہے لہذا انسان اس ہی سے کچھ مانگ سکتا ہے کیونکہ وہی دینے والا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے پورے خشوع وخضوع سے محض مالکِ حقیقی کی طرف رجوع کرنے اور نہایت ہی نیازمندی سے خالق اکبر کی طرف دست بدعا ہونے کو اپنا شعار بنایا:

جتنا بڑا تیرا نام اللہ ہے مجھے بھی اتنا ہی تیرے کرم کا سہارا ہے
اے خالق اکبر ! تیرا تحمل و عفو بے کران و بے پایاں ہے
اس لیے تیرا ہی نام ورد کر کے کلی طور پر مطمئن ہوں
تو ہی حبیب ہے، تو ہی طبیب ہے تو ہی درد کا درمان ہے
میرے دل کی دوا صرف تیرے ہی ذکر میں ہے
میں تیرے ہی سامنے گڑگڑا رہا ہوں کیونکہ دوسروں سے علاج ہو ہی نہیں سکتا (۳)

شاہ صاحب کے ہاں اس کائنات میں مخلوق کے لیے توحید کا اقرار ناگزیر ہے۔ ایسے اقرار کا انسان سے منطقی طور پر یہ تقاضا ہے کہ وہ رسالت پر ایمان لائے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی توحید کی حقیقت تک پہنچنے اور قرب الٰہی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ فرماتے ہیں:

اگر وحدہٗ لاشریک لہٗ پر تیرا پختہ ایمان ہے
تو پھر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کو تو اپنی سچائی سے وسیلہ کر کے مان
یہ کیا ہے کہ تو دوسروں کے سامنے جا کر اپنا سر جھکاتا ہے!

شاہ صاحب دکھاوے کی زندگی اور ریاکاری سے بیزار ہیں۔ اعتقاد کے سلسلے میں خاص طور پر نیت کی صفائی اور عمل کی سچائی کی زوردار تلقین فرماتے ہیں۔ وہ ایک رسمی کافر، اور رسمی ہندو کو کہتے ہیں کہ:

تو جب کفر سے سچا نہیں تو پھر خود کو کافر مت کہلا
جب تو صحیح معنوں میں ہندو نہیں تو پھر یہ زنار تمھیں زیب نہیں دیتا
تلک بھی وہ لگائیں کہ جو شرک کے ساتھ سچے ہیں

محض نام کے مسلمان سے یوں مخاطب ہیں کہ:

یہ تو ایمان نہیں کہ تو خود کو کلمہ گو کہلاتا پھرتا ہے
حالانکہ تیرے دل میں دغا و شرک و شیطان بسے ہوئے ہیں
تو محض باہر سے دکھاوے کا مسلمان ہے مگر اندر میں تو آزر (بتوں کا پجاری) ہی ہے

شاہ صاحب کے ہاں، اس کائنات میں جہاں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، قدرت اور ربوبیت جاری وساری ہے وہاں انسان کے لیے قرب الٰہی حاصل کرنا اور کمال تک پہنچنے کا راز بھی خالق اکبر کے سامنے عجز و عاجزی، نیاز مندی اور بندگی میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کمال کے پیکر ہیں، وہ محبوب الٰہی ہیں کیونکہ عبد ہیں۔ عبدیت کا یہ مقام اتنا ارفع واعلیٰ ہے کہ اس کا احاطہ محال ہے۔ اس بارے میں فرمایا:

عبد کی نہ تو ابتدا ہے اور نہ ہی انتہا
جنھوں نے حقیقی مالک کو پہچان لیا (اور عبدیت کا حق ادا کیا)
وہ ارفع سے ارفع مقامات تک منزلیں طے کرتے رہے(۴)

اپنے کلام و بیان میں شاہ صاحب بذات خود ایک طرف عشق الٰہی میں تسلیم و رضا کے پیکر ہیں تو دوسری طرف عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سرشار ہیں۔ قصوں کہانیوں کے تمثیلی کرداروں کے حوالے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی حضرت شاہ صاحب کے پنہوں ہیں، رانہ ہیں، جکھرہ ہیں۔ فرمایا کہ:

بھنبھور تو ایک بری بستی تھی، پنہوں نے آ کر اس کو پاک کیا
اس عالی جاہ نے خوف کے سب خیالوں سے بچا لیا
(ان کی برکت سے) جو یتیم بچیاں تھیں وہ بھی اہل ہنر بن گئیں
اس گوہرِ یکتا کی آمد سے جو دکھی تھیں وہ سب سہاگنیں ہوگئیں

رانہ کا احسان اس طرح بیان کیا کہ:

گزشتہ شب کو ہی تو رانہ نے یہ نیا پیغام پہنچایا
لطیف کہتا ہے کہ یہ کریم کا ہی کرم تھا کہ ہمیں یہ انعام ملا
اس خالق کے ہاں ذات پات ہے ہی نہیں
یہاں جو بھی دل کے حضور سے آیا وہ مقبول ہوگیا

جکھرہ کے حوالے سے فرمایا:

جکھرہ ہی ہمہ صفت یکتا ہے، باقی دوسرے سب اپنے اپنے مقام تک معزز ہیں

جو سہرا جکھرہ کے سر پر ہے وہ کسی دوسُرے کے سُر پر نہیں
اس مٹی کا بس خمیر ہی اتنا تھا کہ جس سے جکھرہ کی تخلیق ہوئی(۵)

مثنوی مولانا روم اور کلام شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ میں فکری مماثلت

اس موضوع پر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ پچھلے چھ سو سال سے برصغیر ہند میں اسلامی فکر کو جلا دینے میں مولانا رومی کی مثنوی کو بڑا دخل رہا ہے۔ ان سب علاقوں اور خطوں میں جہاں جہاں اسلامی تعلیم کے مراکز اور مدارس قائم ہوئے، مثنوی کے مطالعے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوئی، لیکن یہ مطالعہ ایک بڑی حد تک مثنوی کے فارسی متن اور معنی کو سمجھنے میں صرف ہوا۔ چنانچہ مثنوی کی کئی شرحیں لکھی گئیں، لغات مرتب کی گئیں، اور ساتھ ہی مثنوی کو سعادت مندی سے پڑھنے کا ذوق اس حد تک پہنچا کہ قرات مثنوی بذات خود ایک غنائی فن بن گیا۔ بعض اہل دل بزرگوں نے اپنی تصانیت واشعار میں مثنوی کے اسلوب بیان کو اپنایا اور مولانا کے حسن بیان، معانی و افکار کی عقیدت مندانہ داد دی۔

لیکن مثنوی کے سلسلے میں سرزمین پاکستان کی دو قابل قدر ہستیوں کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ سب سے پہلے حضرت شاہ عبداللطیف کو اور پھر حالیہ دور میں علامہ اقبال کو اپنی اپنی جگہ پر یہ منفرد مقام حاصل ہے کہ انھوں نے مولانا روم کی اعلیٰ اسلامی فکر کو اپنا کر اس کو اپنے روح پرور کلام میں ایسے آفاقی انداز میں پیش کیا کہ جس سے انسانی معاشرے کی اصلاح ہو اور خاص طور پر اسلامی معاشرہ ایمان واستحسان کی بنیادوں پر استوار ہو سکے۔

حضرت شاہ صاحب کے پیغام کا نقطہ عروج انسان کا اعلیٰ کردار ہے۔ انھوں نے محبت کی آزمائشوں، پیشہ ورانہ زندگی کی کاوشوں، دکھ درد کی مشکل ساعتوں یا خوشی کے لمحوں میں نفسیاتی کیفیات، احساسات و جذبات کی اس طرح عکاسی کی ہے کہ انسان کے اعلیٰ اخلاق و کردار کی صورت سامنے آجاتی ہے، بلکہ ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ اعلیٰ مقصد کو سامنے رکھنا اس کی طرف ہمت ومردانگی سے پیش قدمی کرنا، مسلسل طور پر تلاش وجستجو میں رہنا نہ فقط ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کرنا بلکہ صعوبتوں کو راحتیں جان کر لذت جستجو سے آشنا ہونا، تکلیف کی قطعاً شکایت نہ کرنا، اور درد کی سختی کے باوجود بیرونی تڑپ سے بچنا...... یہ سب اعلیٰ انسانی کردار کی اہم خصوصیات میں

سے ہیں کہ جن کو شاہ عبداللطیف نے نہایت موثر بلکہ سحر آمیز الفاظ میں چمکایا ہے۔

شاہ صاحب نہ تو عام اصطلاح میں عالم تھے اور نہ ہی روایتی مفہوم میں صوفی۔ انھوں نے اپنی زندگی بے تکلفی سے عام مسلمانوں کی طرح بسر کی اور ہر طبقے کے لوگوں سے قریب تر ہو کر ملے جلے۔ وہ بذات خود اعلیٰ اسلامی اخلاق و کردار کے پیکر تھے اور اپنے کلام میں بھی ان اعلیٰ اقدار کو پروان چڑھایا۔ انھوں نے فطرت انسانی میں ہی فطرۃ اللہ کا مشاہدہ کیا۔

شاہ عبداللطیف سندھی زبان کے سرتاج شاعر ہیں، مگر حقیقت میں وہ ایک ایسے اعلیٰ شعور اور عرفان کے حامل ہیں کہ اعلیٰ انسانی کردار کی عکاسی کے حوالے سے بین الاقوامی فکری و ادبی حلقے ان کی طرف متوجہ ہوں۔ ایسی قدردانی کی راہ میں جو چیز حائل رہی ہے وہ ہے ان کی زبان۔ شاہ صاحب کا کلام کم و بیش ڈھائی ہزار بیتوں اور دو سو وائیوں پر مشتمل ہے۔(۶)

حضرت شاہ عبداللطیف نے عشق کی آزمائشوں کو اور عاشقی کے معیار کو اپنے کئی ابیات میں بیان کیا ہے۔ خصوصاً ان کے رسالو کے پہلے باب سُرو دکلیان کی ایک پوری داستان کا یہی موضوع ہے۔ یہاں پر ان کے بارہ ابیات کا ترجمہ بغیر کسی توجیہہ اور تشریح کے پیش کیا جاتا ہے تاکہ عشق و عاشقی کے موضوع پر حضرت شاہ صاحب کے نقطہ نظر اور اسلوب بیان کا کچھ اندازہ ہو سکے حالانکہ ترجمے میں نہ وہ شعری لطافت اور نہ ہی وہ معنوی بلاغت سما سکتی ہے جو کہ اصل میں پائی جاتی ہے۔ شاہ صاحب یوں فرماتے ہیں:

عشق اور تختہ دار دونوں کی حقیقت ایک ہی ہے
جان دیے بغیر دونوں کی تشفی نہیں ہوتی
اگر جرعہء مے محبت کی تمنا کرتے ہو تو قدم کو پیچھے مت ہٹاؤ
اے عاشقوں کے علمبردار تو پہلے اپنا سر کٹوا پھر عشق کی بات کر
عشق کی راہ آسان نہیں اس میں سنبھل کے قدم رکھ
قتل ہوئے بغیر کوئی محبت کی تمنا ہی کیوں کرے
تمھیں کس نے کہا کہ تُو محبوب کی راہ میں اپنا قدم رکھ

تجھے تو سکھ کی تمنائیں ہیں اور محبوب کو دکھ پسند
اگر محبت کا نام لینا ہے تو اپنی جان کو نیزوں پر لگادے (۷)

شاہ جو رسالو پر ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحقیق

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے یک جلدی شاہ جو رسالو کے مقدمے میں اس منصوبے کی کچھ تفصیلات بیان کی تھیں۔ ہم یہاں اس مقدمے کے بعض اہم نکات کا سلیس اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں:

۳۲ سال کی مسلسل محنت اور مطالعے سے ''شاہ جو رسالو'' کا مستند معیاری متن تیار کیا گیا اور شاہ عبداللطیف کی فکر اور سوانح سے متعلق تحقیق کو اس کے منطقی انجام تک پہنچایا گیا۔ اس سلسلے میں ''شاہ جو رسالو'' کے مختلف نسخے نہ صرف سندھ بلکہ سندھ سے باہر بھی دیکھے اور 50 قلمی نسخوں اور تمام مطبوعہ نسخوں کے متن کا باہمی موازنہ کر کے اعراب کے ساتھ درست شکل میں شایع کیا گیا۔ یہ تحقیقی منصوبہ 10 جلدوں کی اشاعت کے ساتھ 1980ء تا 1996ء کے سولہ برسوں میں مکمل ہوا۔

اس منصوبے کی تکمیل سے بعض ایسے امور پر روشنی پڑتی ہے جن پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ پہلے یہ محسوس ہوا کہ شاہ صاحب کے بیتوں (اشعار) اور وائیوں (سندھی نظم کی ایک صنف) کا صحیح متن معلوم ہونے کے بعد انھیں معیاری سندھی نثر میں لانا چاہیے تاکہ کلام کے معانی پر مزید روشنی پڑ سکے۔ اس مقصد کی خاطر ہم نے پہلے دو سُروں یعنی سُر کلیان اور سُر یمن کا سندھی نثر میں ترجمہ کیا جو ''شاہ جو رسالو'' کی پہلی جلد میں شایع کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ شاہ صاحب کے درست کلام کی اشاعت کے بعد اسے دیگر زبانوں میں ترجمہ کرنے کی راہ ہموار ہوگئی۔ اس سے قبل کلام کے جو تراجم کیے گئے اس میں شاہ صاحب کے اصلی اور صحیح کلام کو مدنظر نہیں رکھا گیا تھا۔ تیسرے یہ کہ شاہ صاحب کے صحیح کلام کی اشاعت سے ان کی عارفانہ فکر کی تشریح کے لیے صورت حال سازگار ہوگئی۔

ایک انٹرویو میں ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اپنے عظیم علمی و تحقیقی کارنامے ''شاہ جو رسالو'' میں منہج تحقیق کے حوالے سے فرمایا:

''سوانح حیات کے دو پہلو جو پہلے مبہم تھے ان کو میں نے واضح کیا ہے۔ بہت پہلے میں نے اپنے ایک مضمون میں کافی تحقیق سے واضح کیا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کہاں پیدا ہوئے، ان کی والدہ کون تھیں اور ننھیال کون تھے۔ اس مسئلے کے بارے میں اس سے قبل پوری تحقیق کے بجائے نقلی روایتوں سے کام لیا جاتا رہا۔ دوسری بات جو واضح کی گئی ہے وہ حضرت شاہ صاحب کی تعلیم اور طریقے کے بارے میں ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے دو خط شائع کیے ہیں۔ ایک خط حضرت شاہ عبداللطیف نے مخدوم معین ٹھٹھوی کو لکھا اور دوسرا جو مخدوم معین ٹھٹھوی نے لکھا۔ ان خطوط سے پہلی مرتبہ یہ ثبوت ملا کہ حضرت شاہ صاحب ان پڑھ نہ تھے۔ میر علی شیر قانع نے شاہ صاحب کو ''اُمّی'' لکھا ہے۔ لیکن اُمّی کے معنی کیا ہیں؟ قانع کی اس تحریر کے سوائے دیگر تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے باقاعدہ نصابی تعلیم پوری کر کے عالمیت کی دستار نہیں باندھی تھی لیکن اس وقت کے رواج کے مطابق شاہ صاحب نے بنیادی تعلیم یعنی قرآن شریف اور ابتدائی فارسی، اساتذہ سے پڑھی تھی۔ مزید اللہ تعالیٰ نے نھیں ایسا ذہن دیا تھا جس کی بنا پر وہ ایک عظیم آفاقی شاعر بن گئے۔ (۷)

اسی انٹرویو میں ڈاکٹر بلوچ صاحب نے علمی و تحقیقی کاموں کے لیے ضروری چیزوں اور اس علمی منصوبے کی خاطر کی گئی محنت کے حوالے سے فرمایا:

''علمی و تحقیقی کاموں کے لیے ضروری ہے تحقیق اور مطالعے کی فضا جس کے لیے حالات سازگار ہوں اور ماخذ معلوم ہوں۔ میں جب شاہ عبداللطیف ثقافتی کمیٹی کا سیکرٹری تھا تب میں نے 1966ء میں ایک تجویز پیش کی تھی کہ صحیح معنی میں خدمت جو یہ ادارہ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کی زندگی اور حضرت شاہ صاحب کے رسالے کا تحقیقی مطالعہ ہو اور کمیٹی نے یہ تجویز منظور کی لیکن کوئی خاص تحقیقی شعبہ منظور کرنے کے بجائے یہ بوجھ میرے

کاندھوں پر ڈالا اور یہ شرط بھی عائد کی گئی کہ اوّل بنیادی مطالعہ پورا کیا جائے اور پھر رسالے کا جامع مستند متن تیار کیا جائے۔ مجھے اکیلے ہی محدود ذرائع کے ساتھ اس بنیادی مطالعے پر کام کرتے ہوئے تقریباً گیارہ سال (1966ء تا 1977ء) لگ گئے۔ یہ بنیادی مطالعہ اس لیے تھا کہ ہمیں حضرت شاہ عبداللطیف کے رسالے کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہوسکیں۔ مثال کے طور حضرت شاہ عبداللطیف کا رسالہ کس نے چھاپا اور کہاں سے چھپا؟ حقیقت میں یہ معلوم نہیں کہ رسالہ کتنی دفعہ اور کہاں سے چھپا ہے۔ بمبئی چھاپہ عام طور پر مشہور ہے لیکن کون سا بمبئی چھاپہ؟ بمبئی سے تقریباً آٹھ مرتبہ رسالہ چھپا ہے دوسرا یہ کہ رسالے کے بنیادی قلمی نسخے کون سے ہیں؟ کون سے اصل ہیں اور نقلی کون سے ہیں؟ ان قلمی رسائل کا پتہ کیسے لگایا جائے اور یہ قلمی نسخے کیسے حاصل کیے جائیں۔ ہم نے پہلے بھی ایسی کوششیں کیں جن سے معلوم ہوا کہ کئی قلمی رسائل گم ہو گئے ہیں۔ بہر حال میں نے تلاش شروع کی اور خدا کے فضل سے اڑتیس (۳۸) قلمی نسخے ڈھونڈ نکالے۔ گربخشانی صاحب کو لندن میں ایک رسالہ ملا تھا لیکن وہاں دوسرا بھی قلمی نسخہ تھا جس کی انھیں خبر نہ تھی، میں نے وہ ڈھونڈ نکالا۔ ایک قلمی رسالہ اتفاق سے مجھے ایران کے شہر تہران کے ایک کتب خانے میں ملا۔ اسی طرح بڑی تلاش کے بعد ۳۸ قلمی نسخے جمع کیے گئے۔ اس کے بعد ہم نے ان کا بغور مطالعہ کیا۔ جس سے اس نتیجے پر پہنچے کہ رسالے کو دو صورتوں میں لکھا گیا ہے۔ شروع شروع میں جو رسالے لکھے گئے ہیں ان میں ''سسی'' پہلے رکھا گیا اور اس کے بعد دیگر سُر۔ پہلے دور والے رسالے جو ہمیں ملے ہیں وہ سب ''سسی'' سے شروع ہوتے ہیں۔ اس کے بعد 13 ویں صدی ہجری (19 ویں صدی عیسوی) میں تالپور امیروں کے دور میں حضرت شاہ صاحب کے رسالے اور راگ کا بہت زیادہ رواج ہوا۔ تالپور امیروں کے حرم میں بھی رسالے پڑھے جاتے تھے اور ان کے لیے باقاعدہ رسالے لکھوائے جاتے تھے۔ حکمران اور صاحبزادے خود بھٹ شاہ جاتے تھے۔ آخری

دور میں عبدالحسین سانگی نے یہ سلسلہ قائم رکھا اور خود اپنی وصیت کے مطابق دفن بھی وہیں بھٹائی صاحب کے روضے کے سائے میں ہوئے ہیں۔ اسی توجہ کی وجہ سے راگ نے بھی زور پکڑا اور راگ کے لحاظ سے رسالے کی نئے سرے سے ترتیب وتدوین ہوئی۔ وہ اس طرح کہ پہلے جو لکھے ہوئے رسائل تھے وہ ''سسی'' سے شروع ہوتے تھے لیکن اب راگ کے لحاظ سے سُر ترتیب دیئے گئے ہیں کیونکہ راگ شام مغرب کے بعد ہی شروع ہوتا ہے اور یہ وقت ''سُر کلیان'' کے گانے کا ہے اس لیے پہلا'' سُر کلیان '' لکھا ہے۔ ایسے رسالوں میں سے پہلے پہلے ارنسٹ ٹرمپ نے ۱۸۶۶ء میں جرمنی کے شہر لیپزگ سے رسالہ شائع کیا جس کے آغاز میں ''سُر کلیان'' ہے۔ ہم نے کوشش کی کہ یہ دیکھیں کہ اس ۱۸۶۶ء یعنی ۱۲۸۲ ہجری میں چھپے ہوئے رسالے سے پہلے کا کوئی رسالہ لکھا ہوا ہے؟ بمبئی والا چھاپہ بھی ایک سال بعد ۱۲۸۳ ہجری میں چھپا۔ مسلسل کوشش سے ہم نے ایسے تین رسالے ڈھونڈ نکالے جو ٹرمپ والے چھاپے سے ۱۲ سال پہلے کے طبع شدہ ہیں۔ پھر ان تینوں رسالوں کا موازنہ کر کے ہم نے ایک ایڈیشن شائع کیا' جو موجود ہے۔ ہم نے ان رسالوں کے حوالے دیئے ہیں۔ یہ ۱۲۶۹ ہجری، ۱۲۷۰ ہجری اور ۱۲۷۱ ہجری کے لکھے ہوئے ہیں۔

اب ہمیں ایک قلمی رسالہ ہاتھ آیا ہے جو ۱۲۶۷ ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ یہ قدیم ترین رسالہ ہے جس کی ابتداء سُر کلیان سے ہوتی ہے۔ ان شاء اللہ ان کے پہلے تین رسائل سے موازنہ کر کے دوسرا ایڈیشن شائع کریں گے جو سُر کلیان سے شروع ہونے والے رسائل میں قدیم ترین مستند متن ہوگا۔ ہم سسی کے سُر سے شروع ہونے والے نو قلمی رسالے حاصل کر کے ان کا موازنہ کر کے ایک الگ متن شائع کر چکے ہیں۔ ''سسی'' سے شروع ہونے والے رسالوں کا ایک جامع متن ہے۔ دو مزید کتابیں ''شاھ جي رسالي جا سُرچشما'' اور ''شاھ جي رسالي جي ترتيب'' شایع کی گئی ہیں۔

اس بنیادی مطالعے کے بعد ۱۹۸۰ء سے ہم نے رسالے کے جامع مستند متن

تیار کرنے کی جانب قدم بڑھایا ہے اور اسی پر کام چل رہا ہے۔ اس وقت تک ایک جلد تیار ہو چکی ہے جس میں ''سُر کلیان'' اور ''سُر ایمن'' آ جاتے ہیں۔ یہ بڑا مشکل کام ہے تقریباً ۵۲ رسالوں کا موازنہ کرنا ہے۔ جس میں سے چالیس کے قریب قلمی ہیں اور دیگر چھپے ہوئے ہیں۔ ان پچاس سے زائد رسالوں میں ہر ایک کو دیکھنا ہے کہ اس میں ایک ایک بیت کیسے لکھا ہوا ہے۔ اس کی ہر ایک سطر میں الفاظ کیسے لکھے ہوئے ہیں اور معنی کے لحاظ سے کون سے الفاظ زیادہ صحیح ہیں۔ اسی طرح راقم نے رسالے کے پہلے دوئیروں کا جامع مستند متن تیار کیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ہر بیت، وائی کے سطر بہ سطر معنی بھی لکھے ہیں۔ مشکل الفاظ کے معنی بھی دیئے ہیں۔ یہ بڑا کام ہے پہلی جلد زیرِ طبع ہے، چھپ کر مکمل ہو تو دیکھتے ہیں کہ آگے کون سا قدم اٹھایا جائے۔''

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جس وقت ڈاکٹر بلوچ صاحب نے یہ انٹرویو دیا اس وقت تک ۳۸ قلمی نسخے حاصل کر چکے تھے۔ اس کے بعد مزید ۱۲ قلمی نسخے ڈاکٹر صاحب نے حاصل کیے اور ان سب سے استفادہ کیا۔

'شاہ جو رسالو' پر ایک صدی سے جاری تحقیق کی تکمیل

دیگر علمی و تحقیقی کارناموں کے علاوہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کے علمی اور تحقیقی کاموں میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام ''شاہ جو رسالو'' کی تحقیق، ترتیب، تدوین اور تشریح بھی شامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی عظیم شاعر کے کلام پر کی گئی یہ تحقیق نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ دنیا کے مشہور شاعروں کے کلام کی تحقیق و تدوین کے معیار کے برابر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کام کسی کی فرمائش پر نہیں بلکہ اپنے ذاتی ذوق اور جذبے سے مکمل کیا اور اس کی تکمیل میں 32 سال کا طویل عرصہ صرف ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیقی محنت کا اندازہ اس حقیقت سے لگائیں کہ اس علمی کارنامے کی کماحقہٗ تکمیل کی خاطر انھوں نے شاہ جو رسالو کے 50 قلمی اور 16 مطبوعہ نسخوں کے ایک ایک لفظ کی تحقیق کی اور پہلی مرتبہ شاہ جو رسالو کا مستند متن اعراب کے ساتھ پیش کیا۔ (۸)

تاریخی طور پر شاہ جو رسالو کے مستند متن کی تحقیق کے کام کا آغاز 100 سال قبل ہوا تھا اور اس طویل عرصے میں مختلف محققین نے اس کام کا آغاز کیا اور کافی حد تک تحقیق بھی کی لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کام کو مکمل نہ کر پایا۔ یہ اعزاز دیگر اعزازات کی طرح ڈاکٹر بلوچ صاحب کے مقدر میں تھا کہ مکمل شاہ جو رسالو کا تحقیقی متن مع تشریح پہلی مرتبہ مکمل شکل میں پیش کر سکے۔ قدرت نے ان کو یہ اعزاز بھی عطا کیا کہ شاہ جو رسالو کی مکمل تحقیق نہ صرف مکمل کی بلکہ اس کو مطبوعہ شکل میں دیکھ سکے۔

عموماً اردو دان قارئین شاہ جو رسالو اور اس کی تدوینی اور تحقیقی تاریخ سے واقفیت نہیں رکھتے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم شاہ جو رسالو کے کلام کی جمع آوری اور تدوینی تاریخ کا مختصر احوال پیش کریں جس کے لیے ہم نے ڈاکٹر عبدالغفار سومرو صاحب کے مضمون ''شاہ عبداللطیف بھٹائی پر ایک سو سال سے جاری تحقیق کی تکمیل'' سے استفادہ کیا ہے۔ یہ مضمون ڈاکٹر بلوچ صاحب کے مرتبہ 'یک جلدی شاہ جو رسالوٗ کے ابتدا میں شایع کیا گیا۔ اس مضمون کے ضروری نکات کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

سندھی زبان کے عظیم صوفی شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی 1690ء میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال 1752ء میں بھٹ شاہ میں ہوا۔ وہ دنیا کے اس لحاظ سے منفرد ترین شاعر تھے کہ انھوں نے اپنا کلام نہ تو خود لکھا اور نہ ہی مثنوی مولانا روم کی طرح اپنے مصاحب کو لکھوایا۔ فی الحقیقت شاہ لطیف کا سارا کلام ایک خاص کیفیت کی پیداوار ہے جب وہ اس خاص کیفیت میں اپنا کلام بیان کرتے تو وہاں بیٹھے ہوئے فقیر اسے یاد کر لیتے۔ بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ شاہ لطیف کا کلام ان کی زندگی میں ہی جمع کر لیا گیا تھا جسے انھوں نے کراڑ جھیل (جو بھٹ شاہ کے نزدیک ہے) میں ڈال دیا تھا حقیقت یہی ہے کہ اب تک شاہ جو رسالو کے جتنے نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جو ان کی زندگی میں جمع کیا گیا ہو شاہ جو رسالو کا قدیم ترین نسخہ ''گنج'' ہے جس کی کتابت شاہ لطیف کی وفات کے 42 سال بعد کی گئی ''گنج'' صرف شاہ لطیف ہی کے کلام کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں فارسی، ہندی، سرائیکی اور پنجابی شاعروں کا کلام بھی موجود ہے۔ گنج میں جن فارسی شعراء کا کلام موجود ہے ان میں ثنائی اور حافظ شیرازی قابل ذکر ہیں۔ شاہ لطیف کے علاوہ جن سندھی شعراء کا کلام موجود ہے ان میں قاضی قادن شاہ کریم شاہ لطف اللہ اور شاہ عنایت اللہ کا کلام بھی موجود ہے۔

جہاں تک شاہ جو رسالو کے مطبوعہ نسخوں کا تعلق ہے یہ پہلی مرتبہ 1867ء میں بمبئی میں چھپا اور اس کے بعد مسلسل چھپتا رہا۔ اس سے قبل قلمی شکل میں نقل در نقل کے ذریعے پھیلے شاہ جو رسالو کے مختلف نسخوں میں بیتوں اور وائیوں میں بھی باہم فرق نظر آتا ہے۔ 1913ء میں سندھی زبان کے نامور مصنف مرزا قلیچ بیگ نے بھی شاہ جو رسالو مرتب کیا اور شائع کرایا۔ جہاں تک شاہ جو رسالو کی جدید انداز کی تحقیق و تدوین کا تعلق ہے اس کا آغاز بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ڈاکٹر گربخشانی نے کیا جو ولایت سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر آئے تھے جو تحقیق کے جدید طریقوں سے واقف تھے اس کام کی خاطر ڈاکٹر گربخشانی کے ساتھ شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔

ڈاکٹر گربخشانی کی کوشش یہ تھی کہ شاہ جو رسالو کا ایسا مستند شرح تیار کیا جائے جس میں شاہ لطیف کے کلام کو دیگر شعراء کے کلام سے الگ کر کے جدید تحقیقی اصولوں کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ ان کی تحقیق کے نتیجے میں شاہ جو رسالو کی پہلی جلد 1923ء میں دوسری جلد 1924ء میں اور تیسری جلد 1931ء میں شائع ہوئی۔ انھوں نے پہلی مرتبہ یہ کام کیا کہ شاہ لطیف کے بیتوں کی شرح بھی پیش کی اور مشکل الفاظ کے معانی مع اشتقاق پیش کیے۔ دیگر یہ کہ انھوں نے اپنی شرح میں مثنوی مولانا روم کے حوالے سے شاہ کے زیادہ سے زیادہ بیتوں کی تشریح پیش کی لیکن ڈاکٹر گربخشانی کی مورخہ ۱۱ر فروری ۱۹۴۷ء کو وفات کی وجہ سے یہ کام ادھورا رہ گیا۔ 1951ء میں سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے شاہ جو رسالو کی ترتیب اور تحقیق کا کام ڈاکٹر داؤد پوٹو کے حوالے سے کیا گیا اور انھوں نے 1958ء تک 30 قلمی نسخوں کے متن کا باہمی تقابل کر لیا تھا لیکن ۲۲ر نومبر 1958ء کو ان کے انتقال کی وجہ سے یہ کام ادھورا رہ گیا۔

اس صورت میں 1966ء میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی پیش کی گئی تجویز کے مطابق بھٹ شاہ ثقافتی مرکز نے اس کام کی اہمیت کے پیش نظر اس کام کی ذمہ داری ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کو سونپی کہ وہ اس مشکل کام کو مکمل کریں۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحریر کے مطابق انھوں نے اس کام کا جو خاکہ بنایا تھا، اسے دو مراحل میں مکمل کرنا تھا: پہلے مرحلے میں شاہ جو رسالو اور شاہ لطیف کی سوانح کے بارے میں جو ماخذ ہیں انھیں تلاش کرنا اور تحقیقی انداز میں شائع کرنا تھا جب کہ دوسرے مرحلے میں شاہ جو رسالو کا جامع مستند اور معیاری متن تیار کرنا تھا۔

پہلے مرحلے کی تحقیق کے دوران شاہ جو رسالو کے تین جدا جدا متن دریافت ہوئے جنھیں تحقیقی انداز میں شائع کیا گیا ۔ان کی اشاعتی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔ 1971ء میں برٹش میوزیم میں محفوظ شاہ جو رسالو کا اوائلی نسخہ شائع کیا گیا جس کی کتابت 'گنج' سے قبل یعنی بارھویں صدی کے آخر کی ہے۔

۲۔ 1974ء میں سُر کلیان سے شروع ہونے والے تین نسخوں کے متن مع حواشی باہمی تقابل کے بعد شائع کیے۔

۳۔ 1977 میں سُر سسی سے شروع ہونے والے 10 قلمی نسخوں کے متن کا تقابل کر کے مثالی متن شائع کیا۔

اس علمی و تحقیقی منصوبے کا دوسرا مرحلہ 1980ء میں شروع ہوا لیکن بعض اسباب کی وجہ سے کام کی رفتار سست رہی ۔ بالآخر 1989ء میں شاہ جو رسالو کی پہلی جلد منظر عام پر آئی جس میں سُر کلیان اور یمن کلیان کے معیاری متن مع تشریح شائع کیے گئے۔اس کے علاوہ اس جلد میں پہلی مرتبہ شاہ لطیف کی سوانح پر جدید تحقیقی انداز سے روشنی ڈالی گئی اور ہر نئی معلومات مستند ذرائع سے پیش کی گئی۔شاہ جو رسالو کی دوسری جلد تین سال کے وقفہ سے 1992ء میں شائع ہو سکی جس میں چار سُر شامل تھے۔(۹)

1994ء میں جب ڈاکٹر عبدالغفار سومرو صاحب حیدر آباد ڈویژن کے کمشنر تھے تو بھٹ شاہ ثقافتی مرکز کے چیرمین کی ذمہ داری بھی ان پر عائد کی گئی ۔اس وقت تک شاہ جو رسالو کی صرف 3 جلدیں شائع ہو سکی تھیں اوران کی اشاعت میں دس سال سے زائد عرصہ صرف ہو چکا تھا۔انھوں نے اس کام کی رفتار تیز کرنے کے سلسلے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب سے مشورہ کیا جنھوں نے فرمایا کہ اگر ضروری وسائل فراہم کر دیے جائیں تو کام کی رفتار تیز ہو سکتی ہے اور اصل منصوبے کے تحت بقیہ 7 جلدیں شائع ہو سکتی ہیں ۔اس کے بعد ڈاکٹر سومرو صاحب نے تمام ضروری وسائل کی فراہمی کا انتظام کیا چنانچہ درج ذیل ترتیب سے شاہ جو رسالو کی بقیہ جلدیں شائع ہوئیں۔

'شاہ جو رسالو' کی دس جلدوں کی انفرادی ضخامت اوران کے سن اشاعت درج ذیل ہیں:

جلد نمبر	کل صفحات	سنہ اشاعت
1	622	1989
2	517	1992

3	602	1994
4	402	1997
5	786	1997
6	576	1995
7	648	1998
8,9 (مشترکہ جلد)	548	1999
10	855	1996
مکمل صفحات	**5556**	

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے رسالے کے اصل کام کی ابتدا ان آٹھ اصولوں کے تحت کی جو آپ نے کلام کی پرکھ کے لیے مقرر کیے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

زیرِ مطالعہ رسالوں کی تعداد کا معیار

اسی معیار کے تحت قلمی اور طبع شدہ نسخوں کو زیرِ مطالعہ لائے جن کی تعداد ۶۸ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس وقت زندہ محققین، سگھڑوں اور دانا فقیروں سے بھی برس ہا برس صحبتیں اختیار کیں جن سے رسالے کا ایک جامع اور معیاری متن مرتب ہوا۔ اس معیار کے تحت زیادہ سے زیادہ کلام ملا، درست پڑھائی کا انداز سامنے آیا، سمجھنے میں آسانی ہوئی اور نامکمل اشعار و وائیاں مکمل صحت سے واضح ہوئیں۔

رسالوں کی قدامت کا معیار

اس معیار کے تحت سب سے قدیم اشعار اور وائیوں کے اہم ہونے کا علم ہوا کیونکہ یہ رسالے شاہ صاحب کے قریبی وقت کے تھے۔

رسالوں کے موازنے کا معیار

اس معیار کے تحت ہر شعر اور وائی کا متن مختلف رسالوں میں دیا گیا ہے۔ وہ موازنہ کر کے دیکھا جائے تو

جدا جدا قرأت سامنے آتی ہے۔ الفاظ اور زبان کی اصلیت سے لے کر پختہ و ناپختہ کا علم ہوتا ہے۔ اپنے اور پرائے کلام کے ہونے کا پتہ چلتا ہے اور کلام کی درست شکل معلوم ہوتی ہے۔

زبان کا معیار

یہ بالکل بنیادی معیار ہے جس کے مطابق کسی شعر اور زبان کا عیب پرکھا جاتا ہے۔ الفاظ ومحاورات ترتیب کے مطابق نہیں ہیں تو وہ کلام شاہ صاحب کے معیار سے کم ہے مطلب یہ کہ شاہ کا کلام نہیں ہے۔

شاعری کا معیار

یہ ایک بنیادی پیمانہ ہے جو کلام اس معیار کے مطابق نہیں ہے وہ ہرگز ہرگز شاہ کا ہو ہی نہیں سکتا۔ وزن، قافیہ، تلفظ، روانی، سلاست، بلاغت وغیرہ شاہ صاحب کے اشعار کا معیار ہیں۔

بیان کا معیار

اس سے زبان کی خوبصورتی، جلوہ، رونق، روانی اور بلاغت وغیرہ کے معیار مراد ہیں۔

معنی ومفہوم کا معیار

اس معیار کے مطابق ضروری ہے کہ ہر لفظ اور ہر سطر معنی کے لحاظ سے درست ہو اور اس کا مفہوم واضح اور ظاہر ہو۔

اعلیٰ فہم وفکر کا معیار

اس معیار کے مطابق اعلیٰ شاعری کی پرکھ ہوتی ہے۔ شاہ لطیف کے کلام میں آنسوانتہائی فکر انگیز مضمون ہے جس کے تمام وزنی معنی اور معاملات بیان کیے گئے ہیں جن کو ہر ادیب، عالم و دانشور نے اپنے علم کے مطابق پرکھا ہے۔ قاری کی فکری پرواز جتنی بلند ہوگی، اتنا قریب سے سمجھے گا۔ ہر مفکر اپنی اپنی دانائی اور دانش وبینش کے مطابق واضح کر سکے گا جیسے علامہ آئی آئی قاضی صاحب نے شاہ کے عظیم شاعر ہونے کے پیمانے بیان کیے ہیں، وہ اسی ترازو کے پیمانے ہیں۔

بقول بلوچ صاحب شاہ کی عالمگیر فکر کی روح اسلامی ہے مزید مقرر معیار کے مطابق لکھتے ہیں۔ شاہ صاحب ان باکمال اور عارف شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اسلامی تصوف، طریقت کی روشنی میں انسان اور

انسان کی عارضی زندگی سے متعلق دائمی حقیقتوں کے بارے میں اعلیٰ علمی علامات دیں جن میں یہ اہم ہیں: کائنات کی تخلیق میں وحدت و کثرت، خالق اور مخلوق کا رشتہ، توحید اور رسالت، انسان کے لیے ارادے، نیت، عقیدے اور ایمان کی سچائی کی ضرورت وغیرہ۔ ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ بالا معیار مقرر کر کے اس کے تحت کلام کے معنیٰ، مفہوم اور شرح بیان کی ہے جو کلام کے حقیقی مقصد کی روح ہے۔ ہر ذی شعور آدمی اندازہ کرسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کتنا وقت صرف کیا اور کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ (۱۰)

کلام شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ پر مزید کام

ڈاکٹر بلوچ جیسے مستقل مزاج اور ان تھک محقق نے عمر عزیز کے بتیس سال کی محنت کے بعد یہ دس جلدی منصوبہ تو مکمل کر لیا لیکن اس کے بعد دو اور کام شاہ جو رسالو سے متعلق انجام دیے۔ ان کاموں میں پہلا شاہ جو رسالو کی لغت ہے جس میں مشکل الفاظ، اصطلاحات، عبارات، فقروں اور جملوں کے آسان سندھی میں معانی دیے ہیں۔ یہ کتاب روشنی کے عنوان سے سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد نے 2002ء میں شائع کی۔

دوسرا کام ڈاکٹر بلوچ صاحب نے یہ کیا کہ عام افراد کی سہولت کی خاطر شاہ جو رسالو کے اصل متن اور مختصر تشریح پر مشتمل یک جلدی نسخہ تیار کیا۔ شاہ جو رسالو کی دس ضخیم جلدوں کی کل ضخامت 5556 صفحات ہے۔ عام افراد کے لیے یہ تمام جلدیں پڑھنا آسان نہیں چنانچہ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے بڑی محنت سے ان دس جلدوں سے شاہ جو رسالو کا مستند کلام اور مختصر وضاحتی حواشی کے ساتھ ایک جلد میں مرتب کیا۔ شاہ جو رسالو کا یہ یک جلدی نسخہ پہلی مرتبہ ۲۰۰۹ء اور دوسری مرتبہ 2012ء میں کراچی سے شائع ہوا۔

شاہ جو رسالو کی خاطر ڈاکٹر بلوچ کی یہ تحقیق ایک شاہ کار علمی کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے۔ علمی اور تحقیقی دنیا میں اس معیار اور اس مقدار کے کارنامے کم ہی نظر آتے ہیں۔

حواشی باب نمبر 15

۱۔ملاحظہ فرمائیں ''شاھ جو شارح:ڈاڪٽر بلوچ'' (شاہ کے شارح۔ڈاکٹر بلوچ)
از رسول بخش تمیمی در کتاب ''ڈاڪٽر بلوچ هڪ مثالي عالم'' حصہ اوّل،ص:۲۷۰۔

۲۔ایضاً

۳۔شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ کے والد مرزا فریدون بیگ روس کی ریاست جارجیا سے بچپن ہی میں سندھ میں آ گئے تھے۔مرزا قلیچ بیگ سندھ کے کثیر التصانیف صاحبِ قلم تھے۔آپ ۱۴/اکتوبر ۱۸۵۳ء حیدرآباد (سندھ) میں پیدا ہوئے۔تعلیم حیدرآباد اور بمبئی میں حاصل کی۔ضلع شکارپور میں مختیار کار اور پھر اپنی محنت سے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچے۔مرزا صاحب عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، سندھی اور اردو کے ماہر تھے۔انہوں نے تیس برس ملازمت کی لیکن کوئی دن ایسا نہ گزرا جب صفحہ یا آدھا صفحہ نہ لکھا ہو۔ہزار ہا نادر و نایاب کتب پر مشتمل ان کا کتب خانہ حیدرآباد میں تھا۔انہیں علم کا اس حد تک شغف تھا کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اپنا تمام وقت تصنیف و تالیف میں صرف کرتے۔انہوں نے تقریباً چار سو پچاس کتابیں لکھیں۔مرزا صاحب کو ان کی علمی خدمات کے صلے میں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا گیا۔مرزا صاحب نماز کے سخت پابند اور تہجد گزار تھے۔انہوں نے کبھی نماز قضا نہیں کی۔مرزا صاحب کا انتقال ۳/جولائی ۱۹۲۹ء کو حیدرآباد میں ہوا۔انہوں نے ایک فارسی قطعہ میں اپنی سالِ وفات کی پیشین گوئی کر دی تھی جو درست ثابت ہوئی۔سندھی زبان میں مرزا صاحب کی دلچسپ آپ بیتی سندھی ادبی بورڈ جامشورو سے شائع ہو چکی ہے۔

۴۔ملاحظہ فرمائیں مضمون ''حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی'' از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔یہ مضمون کتاب ''گلشنِ اردو'' مرتبہ محمد راشد شیخ کے صفحہ نمبر ۶۸ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

۵۔ایضاً

۶۔ایضاً

۷۔ملاحظہ فرمایئے مضمون ''حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ہاں عشق و عاشقی کا معیار'' از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔یہ

مضمون کتاب ''گلشنِ اردو'' مرتبہ محمد راشد شیخ ، ص۷۸ پر دیکھا جاسکتا ہے۔

۷۔ایضاً ص ۷۱

۸۔ملاحظہ فرمایئے مضمون شاهہ عبداللطيف ڀٽائي تي هڪ صدي کان هلندڙ تحقيق جي تڪميل (شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ پر ایک صدی سے جاری تحقیق کی تکمیل) از ڈاکٹر عبدالغفار سومرو ۔ یہ مضمون ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کے مرتبہ یک جلدی شاہ جو رسالو کے ابتدا میں شایع کیا گیا۔

۹۔ایضاً

۱۰۔ایضاً

باب نمبر 16

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی
تاریخ نویسی میں خدمات

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے دیگر علمی اور تحقیقی کاموں کے علاوہ تاریخ نویسی سے متعلق بھی کئی یادگار تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے سندھ کی فارسی تاریخوں کے حوالے سے جو جو تحقیقی کام کیے ان کی تفصیل پر ہم نے پیش نظر کتاب کے باب نمبر ۱۸ میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

پیش نظر باب میں ہم ڈاکٹر صاحب کا نظریہ تاریخ ،تاریخی اصول اور بعض اہم تاریخی واقعات کے حوالے سے ان کے تحقیقی نتائج کی تفصیل بیان کریں گے۔ان نتائج سے ڈاکٹر صاحب کی تاریخی خدمات اور ان کے نقطہ نظر کی وضاحت ہوگی۔ان معلومات کے لیے ہم نے ڈاکٹر عبدالغفار سومرو صاحب کے مقالے
ڈاڪٽر نبي بخش خان بلوچ ۔عالم،اديب،محقق،مورخ ۽سندس نظريہ ۽تاريخ
سے استفادہ کیا ہے جو رسالہ مهراڻ کے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ خاص نمبر میں شایع ہوا تھا:

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے تاریخ نویسی کے اصول

جیسا کہ اوپر ذکر آیا، ڈاکٹر بلوچ صاحب نے محض تاریخی مقالات اور کتب لکھی ہی نہیں بلکہ تاریخ نویسی کے لیے اہم اصول بھی وضع کیے۔درج ذیل تفصیلات سے علم ہوگا کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے پاکستان میں جدید

تاریخ نویسی کے حوالے سے کون کون سے اصول وضع کیے جن سے ان کے نظریہ تاریخ کی وضاحت ہوتی ہے۔

(۱) تحقیق کا رُخ متعین کرنا: (Principles of Direction)

سب سے پہلے ایک تاریخ نویس کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے آگے واضح مقصد رکھے اور اس لحاظ سے اپنے رخ کا تعین کرے۔ ہر تاریخی تحریر کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوتا ہے اور تاریخ نویس کے لیے اس کا ہونا باعثِ عیب نہیں۔ تاریخ نویس کو چاہیے کہ اس مقصد کو دوسروں کے لیے کھول کر بیان کرے تاکہ اس کی تحریر کو صحیح انداز سے پرکھا جاسکے۔ معروضیت یا Objectivity کبھی بھی مکمل یا مطلق نہیں ہوسکتی ہے بلکہ یہ ہمیشہ حالات سے منسلک یا وابستہ ہوتی ہے۔ اسی لیے ہر مورخ کے ساتھ کہاں، کون اور کیسے کی اضافت ہمیشہ لگی ہوتی ہے جو اس سے جدا نہیں ہوسکتی۔

(۲) استناد اور صداقت کے اصول (Principles of Authenticity)

اس سے مراد درست اور موزوں مواد کا استعمال ہے۔ اس کے ساتھ اس اصول کے تحت دستاویزات کا باہمی موازنہ بھی کیا جاتا ہے تاکہ واقعے کے بارے میں صحیح معلومات جمع کی جاسکیں۔ موقع محل کی جانچ پڑتال ،معائنہ (Field Research) اس اصول کا ایک اہم جز ہے جس سے زیر تحقیق واقعے کی درستگی کے بارے میں مزید معلومات ملتی ہیں۔ مسلمان تاریخ نویسوں نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا ہے اور اس کا استعمال بھی کیا۔ جدید تاریخ نویسی میں کتبے (Epigraphy) اور فن سکہ شناسی (Neumetics) خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

(۳) پس منظر اور ماحول کی صحیح معلومات (Principle of context)

کسی بھی واقعے کے بارے میں وقت، جگہ اور حالات کی پوری معلومات رکھنا بے حد ضروری ہے۔ خصوصاً اگر کوئی واقعہ قدیم ہو تو اس سے متعلق ممکن ہے محض سرسری معلومات ملیں لیکن اس واقعے کے پیچھے کیا عوامل کارفرما تھے وہ بہت کم واضح ہوتے ہیں۔ اس لیے ایک مورخ کے لیے لازمی ہے کہ درست نتائج تک پہنچنے کے لیے خود کو اس ماحول کا عادی بنائے جس میں یہ واقعہ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھے کہ مذکورہ واقعے کے شریک

اس سے کیا محسوس کر رہے تھے۔اسی صورت میں مورخ درست نتائج تک پہنچے گا اور اس واقعے کو معروضی طور پر بیان کر سکے گا۔تاریخ نویس کے لیے لازمی ہے کہ اس وقت کے ماحول کا حوالہ کارگر سمجھے ورنہ اگر وہ اپنے وقت اور زمانے کے نظریات یا فکر کے مطابق ان کو سمجھے گا تو غلط نتائج تک پہنچے گا۔

۴)ہر واقعے کو وضاحت سے پیش کرنا(Principle of Clarity)

اس سے مراد مواد کو غیر مبہم اور عام فہم انداز میں پیش کرنا ہے جس میں ربط اور تسلسل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

(۵)واقعات کی مطابقت کو سمجھنا(Principle of Consistency)

اس سے مراد وہ اندرونی اعتقادات ہیں جن کی مدد سے کسی واقعے کے بارے میں ملنے والے تضادات کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے۔اس سلسلے میں ضروری ہے کہ ہر معاشرہ یا قوم اپنی ترجیحات کو طے کر کے آگے قدم بڑھائے۔ایسے کرنے سے ماحول کو صحیح تناظر میں پیش کیا جا سکے گا۔لیکن اگر ایسا نہیں کیا گیا تو وہ لوگ تاریخ لکھیں گے جو اس فن کے ماہر نہیں۔یہی کام اکثر ہوا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے لوگ اپنے نقطہءنظر کے مطابق تاریخ لکھنا شروع کرتے ہیں۔اس کے بعد یہ مرحلہ آتا ہے کہ اس نقطہءنظر کے رد میں یا صرف دفاع میں تاریخ لکھی جاتی ہے۔

(۶)تاریخی مواد اور ماخذات تک رسائی(Availability of source Materials)

تاریخ نویسی تاریخ سے متعلق مواد کے بغیر ممکن نہیں اور مواد کے بغیر تاریخ لکھنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔یہ ایک مثبت پہلو ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ سے متعلق کافی مواد موجود ہے۔اس مواد میں مکتوبات،اسناد یا اسی قسم کے کاغذات،سوانحی شجرے وغیرہ شامل ہیں۔ضرورت ہے کہ اس تمام مواد کو یکجا کر کے عمدہ انداز میں پیش کیا جائے اور اس کی روشنی میں تاریخ کی تعبیر و تشریح کی جائے۔

جدید تاریخ نویسی کے یہ مختصر طور پر ابتدائی اصول ہیں جن کے بغیر سائنسی انداز میں تاریخ لکھنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے دیگر میدانوں کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی کے حوالے سے علمی اور تحقیقی کارنامے انجام دیے۔انھوں نے یہ کام تاریخ نویسی کے مذکورہ بالا اصول اور قواعد کی روشنی میں انجام دیے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق تاریخ لکھنا ایک فن ہے اور تاریخ نویسی سے قبل اس کے اصول وقواعد طے کرنا لازمی ہے۔تاریخ نویسی سے قبل اصول وقواعد طے کرنے سے مراد یہ ہے کہ تاریخ نویسی اس طرح کی جائے کہ تاریخی گتھیوں کو سلجھا کر ترتیب سے قاری کے سامنے اس طرح تاریخ پیش کی جائے کہ کوئی بھی گتھی باقی نہ رہے۔

اس کے علاوہ تاریخ نویسی کے بارے میں ان کا یہ نقطۂ نظر بھی تھا کہ تاریخ نویس کے سامنے کوئی واضح مقصد ہونا ضروری ہے جس کی روشنی میں تاریخ نویس اپنے رخ کا تعین کرے۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے تاریخ کے موضوع پر بھی بہت سے علمی اور تحقیقی مقالے لکھے تھے جو ان کی زندگی میں شایع بھی ہوئے۔مثلاً انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے پندرہویں ایڈیشن 1974ء میں سندھ اور بلوچستان کے بارے میں شامل مقالات ڈاکٹر صاحب ہی کے تحریر کردہ ہیں۔اسی طرح انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے بریل ایڈیشن 1978ء کی چوتھی جلد میں قدیم تاریخی ورثے ''قندابیل'' کے بارے میں شامل مضمون بھی ڈاکٹر صاحب ہی کا تحریر کردہ ہے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی دلچسپی کا ایک اہم موضوع تاریخ سندھ بھی تھا۔اس موضوع کے حوالے سے علمی و تحقیقی کتب لکھیں اور شایع کرائیں:

1951ء میں تحریر کردہ ایک مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے سندھی زبان کی ابتداء کے بارے میں اہم نظریہ قائم کیا کہ سندھی زبان براہ راست سنسکرت سے نہیں نکلی جیسا کہ اس وقت تک سمجھا گیا تھا بلکہ یہ سنسکرت سے پہلے والے دور میں سندھو تہذیب/ وادی سندھ کی کسی مقامی پراکرت سے نکلی ہے۔

2۔1975ء میں ''سندھ صدیوں سے سیمینار'' میں پڑھے گئے ایک عالمانہ مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے کتاب الھند میں البیرونی کے دیے ہوئے حوالے کے بنیاد پر ثابت کیا کہ عربوں کی فتح سے قبل سندھ میں اپنا کیلنڈر

(Calendar) رائج تھا جو شمسی حساب کے مطابق تھا۔

3۔''سندھی زبان اور ادب کی تاریخ'' نامی کتاب میں عرب سیاحوں اور تاریخ دانوں کے حوالے سے اور خصوصاً البیرونی کی تحریروں کی بنیاد پر یہ واضح کیا کہ عربوں کے دور سے لے کر سندھی زبان کی مستقل جداگانہ حیثیت کا پتہ چلتا ہے بلکہ سندھی زبان کے قدیم ترین نمونوں کا پتہ البیرونی کی ''کتاب الھند'' سے ملتا ہے۔ اس بات کی تصدیق جرمن مستشرق سخاؤ نے بھی کی تھی جو البیرونی کے حوالے سے تحقیقی کام کی وجہ سے معروف ہے۔

4۔''سندھی رسم الخط اور خطاطی'' نامی کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے واضح کیا کہ موجودہ سندھی الف ب کم از کم ایک ہزار سال سے مروج ہے۔ جس کے بعد سندھ کے عالموں نے وقتاً فوقتاً کتاب لکھ کر ترقی دلائی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ موجودہ رسم الخط انگریزوں نے بنایا یا ان کے دور میں یہ رسم الخط بنا۔

5۔سندھی موسیقی یا سنگیت کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی تحقیق ہے کہ یہ سندھ کی تاریخ سے پیوستہ ہے۔ اس کی بنیاد آریوں سے قبل یہاں کی دراوڑی تہذیب سے میل کھاتی ہے۔ سندھ کا سنگیت ہندوستان کے سنگیت سے الگ قسم کا ہے اور اس کی اپنی شناخت ہے۔

6۔ڈاکٹر صاحب نے البیرونی کے ایک ہزار سالہ جشن پیدائش کے موقعے پر 1973ء میں اس کی کتاب غرّت الزیجات کے عربی متن کو ایڈٹ کیا اور اس کا انگریزی میں عالمانہ مقدمہ لکھا تھا۔ یہ کتاب اصل میں بجیا نند بنارسی کی علم ہئیت سے متعلق کتاب ''کرانا تلک'' کا عربی ترجمہ تھا جو البیرونی نے 427ھ مطابق 1036ء میں کیا تھا۔ یہ کتاب یونیسکو کے تعاون سے انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی، جام شورو کی طرف سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب اس کتاب کے مقدمے میں نہایت اہم تحقیقی انکشاف کرتے ہیں کہ سندھ کی فتح کے فوری بعد شہر منصورہ کے قیام کے ساتھ ہی علمی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ مشہور ہندو ہیئت دان برھما گپتا کی کتاب ''کھنڈا کھڈیک'' کا پہلا ترجمہ 117ھ مطابق 735ء میں سندھ کے دارالخلافہ منصورہ میں ''زیج الرکنڈ'' کے نام سے ہوا۔ یہ ترجمہ البیرونی کی نظر سے گزرا تھا۔ اس ترجمے میں بطور مثال اور بطور تشریح جن شہروں کے نام دیے ہیں ان میں ''بھمنوا'' بھی شامل ہے جس سے یقین ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ سندھ میں ہوا۔ بڑی بات یہ ہے کہ اس میں کلینڈر کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ اس کا مترجم ابراہیم الفرازی ہے۔ برھما گپتا کی دوسری کتاب

''برھما سدھانتا'' کا عربی ترجمہ السند والھند کے نام سے بھی اندازہ ہے کہ سال 117 ہجری مطابق 735ء کے دوران ہوا اور اس کا مترجم بھی ابراہیم الفرازی ہی ہے۔

یاد رہے کہ عباسیوں نے بغداد شہر کی بنیاد 154 ہجری مطابق 762ء میں رکھی تھی۔ کتاب الھند میں البیرونی نے چھ مرتبہ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ عباسی دور حکومت میں سندھ سے علما اور ہیئت کے ماہر بغداد جاتے تھے۔ البیرونی کو یہ حوالے ان کتابوں سے ملے جو بعد میں بغداد کے علما کرام نے لکھیں اور البیرونی کے وقت تک یہ کتابیں ضرور موجود تھیں۔

یہاں پہنچ کر ڈاکٹر صاحب یہ نتیجہ قائم کرتے ہیں کہ بغداد میں ''بیت الحکمت'' کا قائم ہونا اور وہاں یونانی علوم کے تراجم ہونا دراصل دوسرا مرحلہ ہے۔ اس سے قبل پہلے مرحلے میں خاص طور علم ہیئت کے حوالے سے عربوں کے پاس پہلے دو کتابیں پہنچی تھیں جو ''کھنڈا کھڈ یک'' یعنی زیج الرکنڈ اور دوسری ''برھما سدھانتا'' جو السند والھند کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ان کتابوں کے نام سے بھی یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ یہ کتابیں سندھ سے ہی عرب پہنچیں۔

یاد رہے کہ برھما گپتا 595ء میں بھلمال میں پیدا ہوا اور یہ شہر چھٹی ساتویں صدی میں گجرات کا دارالخلافہ تھا۔ اس نے ''برھما سدھانتا'' 628ء میں لکھی تھی۔ گجرات سندھ کا پڑوسی ملک تھا اس لیے اس کتاب کا سندھ میں پہنچنا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

ڈاکٹر بلوچ کی یہ علمی تحقیق جب ترکی پہنچی تو ترکی کے نامور مورخ اور تاریخ دان پروفیسر آئیدن سیلی نے 1980ء میں ایک خط میں ڈاکٹر صاحب کو لکھا:

You seem to be a unique master researcher on such intricate subjects concerning which Beruni has supplied us with otherwise non-existent information of vital importance.

اس خط میں آگے لکھتے ہیں کہ آپ کی تحقیق شدہ البیرونی کی غرّت الزیجات کے انگریزی

مقدمے کا ترکی ترجمہ ڈاکٹر دوست کر رہے ہیں جو اردم (Erdam) رسالے میں جلد شائع کیا جائے گا۔

البیرونی اور نندنہ سے متعلق تحقیقات

1983ء میں اسلام آباد میں ایک بین الاقوامی سیمینار میں ڈاکٹر صاحب نے البیرونی اور نندنہ میں اسکے تجربے کا تجزیہ کیا تھا جس میں البیرونی نے زمین کے قطر اور گھیر کی پیمائش کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ تجزیہ اپنے ایک مقالے میں کیا تھا جو اسی کانفرنس میں پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے البیرونی کے اصل ماخذ کو سامنے رکھتے ہوئے ریاضی اور ٹرگنا میٹری کے اصولوں کو جدید طرز میں بیان کیا اور اس سرزمین کا معائنہ بھی کیا جہاں یہ تجربہ ممکنہ طور پر کیا گیا تھا۔ جرمنی کے پروفیسر ڈاکٹر ایڈارڈ ویٹ نے ڈاکٹر صاحب کے اس مقالے کو پڑھنے کے بعد تعریف اور تصدیق کا خط لکھا جس میں کہا کہ البیرونی کی پیمائش میں صرف اعشاریہ دو فیصد تک غلطی کا امکان تھا یعنی وہ اس قدر صحیح و درست تھی۔

البیرونی اور محمود غزنوی کے تعلقات کے بارے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحقیق

اسلامی دنیا کے بڑے سائنسدان اور ماہر علم ہیئت ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی (973ء تا 1048ء) ترکستان کے تاریخی شہر خوارزم کے مضافات یعنی بیرون شہر کے ایک معمولی گھر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی جوانی کے کئی قیمتی سال خوارزم کے حکمران سامانی خاندان سے وابستگی میں گزارے لیکن جب اس خاندان میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا تو وہ خوارزم چھوڑ کر جرجان چلے آئے جہاں انھوں نے اپنی پہلی مشہور تصنیف "آثار الباقیہ عن قرون الخالیہ" 1000ء میں مکمل کی اور اسے وقت کے حکمران شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کی جانب منسوب کیا جو ان کے سرپرست و قدردان تھے۔ البیرونی جرجان میں دس سال سے زیادہ رہ نہ سکے اور خوارزم میں حالات بہتر ہوتے ہی واپس لوٹ آئے جہاں بعد میں علی بن ماموں حکمران بنے لیکن 1008ء میں جب ان کی وفات ہوگئی تو ان کے بھائی العباس کے لقب سے خوارزم کے حکمران بنے۔ وہ بڑے علم دوست تھے اور کئی علمائے کرام ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ اس دربار سے کچھ عرصے کے لیے ابن سینا بھی وابستہ

ہوئے تھے۔ العباس 1017ء میں اندرونی خلفشار اور بدانتظامی کے سبب قتل ہو گئے۔ کیونکہ وہ محمود غزنوی کے بہنوئی تھے اس لیے محمود نے بغیر کسی تاخیر کے خوارزم پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور وہاں اپنا نائب التونتاش کو مقرر کر دیا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ محمود غزنوی باپ کے مرنے کے بعد 997ء میں تخت نشین ہوا اور آنے والے بیس سالوں میں اس نے ہندوستان کے دور دراز کی مہمات میں مسلسل کامیابی حاصل کی تھی۔ لیکن اس نے اپنی آہنی طاقت کا اصل سرچشمہ خراسان اور وسط ایشیا ہی کو سمجھا تھا۔ اسی وجہ سے جب خوارزم کے حالات خراب ہوئے تو اسے فتح کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ اس فتح کی وجہ یہ بھی تھی کہ محمود ایل خانوں سے ممکنہ چپقلش اور خطرات کا خاتمہ بھی چاہتا تھا۔

سلطان محمود علوم وفنون کا سرپرست اور دلدادہ تھا۔ ''تذکرہ دولت شاہ'' کے مطابق اس کے دربار سے چار سو سے زیادہ عالم، طبیب اور شاعر وابستہ تھے۔ ایک روایت کے مطابق محمود نے خوارزم فتح کرنے کے بعد البیرونی سمیت کئی عالموں کو بلا کر اپنے دربار میں رکھا۔ اس وقت البیرونی کی عمر 45 سال تھی لیکن تاریخ اور تذکروں کی کچھ روایات کے مطابق محمود غزنوی خوارزم فتح کرنے کے بعد البیرونی و دیگر علما کو زبردستی قید کر کے غزنی لے آیا تھا۔ البیرونی کے بارے میں یہ بات بعض مصنفین نے بالکل غلط لکھی کہ اس کے بعد وہ مسلسل نظر بندی کا شکار رہے بلکہ جتنا وقت وہ ہندوستان یعنی موجودہ پاکستان کے علاقے میں رہے جو دس سال سے زیادہ وقت تھا یہ سارا وقت انھوں نے نظر بندی میں گزارا۔ ایک لحاظ سے غزنی پہنچنے کے بعد اسی زمانے سے البیرونی کی زندگی کے نہایت کامیاب تخلیقی دور کا آغاز ہوتا ہے جہاں وہ ایک رصدگاہ قائم کرتے ہیں اور جہاں وہ اپنی سائنسی کھوج و تحقیق کو جاری رکھتے ہیں۔ اسی دوران وہ افراد المقال، کتاب التحدید، کتاب التفهيم ، قانون مسعودی اور کتاب فی تحقیق ما للهند جیسی یادگار تصنیفات کو مکمل کرتے ہیں۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ نظام عروضی سمرقندی جس نے اپنی کتاب ''چہار مقالہ'' سال 552ھ میں تصنیف کی یعنی البیرونی کے غزنی آنے سے ایک صدی کے بھی بہت بعد میں اس سلسلے میں عجیب روایات بیان کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ جب ابوالعباس خوارزم کا حکمران تھا تو سلطان محمود نے اس سے فرمائش کی کہ وہ اپنے دربار کے

پانچ نامور عالموں، البیرونی، ابن سینا، ابونصر عراق، ابوالخیر خمار اور ابوسہل مسیحی کو غزنی کے شاہی دربار بھیج دے تاکہ وہ ان کے علم و فضل سے فیضیاب ہو سکے۔ البیرونی، ابوالخیر اور ابونصر جانے کے لیے آمادہ ہو گئے لیکن ابن سینا اور ابوسہل نے جانے سے انکار کیا اور وہاں سے بھاگ نکلے۔

ڈاکٹر سخاؤ کی جانب داری اور ڈاکٹر بلوچ صاحب کی عمدہ تحقیق

علمی دنیا میں البیرونی کی خدمات کو جن محققین نے روشناس کرایا ہے ان میں سرفہرست جرمن مستشرق ڈاکٹر سخاؤ ہیں جنھوں نے البیرونی کی دو کتابوں آثار الباقیہ اور کتاب فی تحقیق ماللھند پر بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کیا۔ سخاؤ نے کتاب فی تحقیق ماللھند کا عربی متن ایڈٹ کر کے 1885ء میں شائع کیا اور اس کے بعد اس کے جرمن اور انگریزی ترجمے 1883ء میں شائع کیے۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحقیق کے مطابق انگریزی مقدمے میں ڈاکٹر سخاؤ ایک غیر جانبدار محقق کا کردار ادا نہ کر سکا اور اس نے سلطان محمود غزنوی کے کردار سے انصاف نہیں کیا۔ سخاؤ نے اپنی اس کتاب میں یہ تاثر دیا کہ محمود غزنوی نے البیرونی سے اچھا سلوک نہ کیا اور وہ علم دوست نہیں تھا۔ یہاں یہ بات بڑی اہم ہے کہ ڈاکٹر سخاؤ اس مقصد کے لیے البیرونی کی تحریروں کو کھینچ تان کر ان سے اپنا مقصد نکالتے ہیں اور البیرونی کو مسلسل سلطان محمود غزنوی کی زیر نظر بندی دکھاتے ہیں۔ البیرونی دس سال سے زیادہ عرصہ سندھ اور پنجاب کے علاقے میں رہے جہاں وہ سنسکرت اور ہندوؤں کے علوم کے بارے میں مہارت حاصل کرتے رہے۔ سخاؤ کہتے ہیں کہ اس پورے عرصے میں وہ قید جیسی حالت میں تھے بلکہ اپنی طرف سے یہ نتیجہ قائم کرتے ہیں کہ البیرونی ملتان میں نظر بند رہے۔ سخاؤ مزید کہتے ہیں کہ البیرونی کو آزادی کا ماحول محمود کی وفات کے بعد ملا جب سلطان مسعود تخت نشین ہوا۔ بقول ان کے سلطان مسعود علم کا قدردان اور سرپرست تھا اور اس نے ہی البیرونی کی سرپرستی کی جس کی وجہ سے البیرونی نے علم ہیئت کی اپنی مشہور تصنیف ''قانون مسعودی'' کو ان کی جانب منسوب کیا تھا۔

سخاؤ کی اس جانی بوجھی پھیلائی ہوئی غلط فہمی کی بنیاد کتاب فی تحقیق ماللھند کے پہلے باب میں مختصر اقتباس ہے جس کا انھوں نے انگریزی میں اس طرح ترجمہ کیا ہے:

I have found it very hard to work my way in to the subjest......

اصل عبارت جس کا سخاؤ نے ترجمہ کیا وہ اس طرح ہے:

ولقد اعیتنی المداخل فیہ مع حرصی الذی تفرّدت بہ فی ایّامی و بذلی الممکن غیر شحیح علیہ فی جمع کتبھم من المظان والاستحضار من یھتدی لھا من المکامن۔ ولمن غیری مثل ذلک الّا من یرزق من توفیق اللہ ما حرمتہ فی القدرۃ علی الحرکات عجزت فیھا عن القبض والبسط فی الامر والنّھیٰ طویٰ عن جانبھا۔والشّکر للہ ما کفیٰ منھا۔

ترجمہ: باوجود اتنی حرص کے جس میں میں یگانہ روزگار ہوں، حقیقت یہ ہے کہ ان راہوں پر چل چل کر میں تھک گیا۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق پیسہ بھی خرچ کیا اور اس میں بخل سے کام نہیں لیا، اس لیے جہاں بھی ممکن ہوا پوشیدہ جگہوں سے ان کی کتابیں حاصل کیں اور ایسے لوگوں سے واسطہ رکھا جنھیں اس کام کا شعور تھا۔ مجھ سے زیادہ کوئی دوسرا ایسا نہ کر سکا۔ ہاں اگر ایسا کوئی خاص آدمی ہو جسے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اتنی جستجو کا اختیار ملا ہو جس سے میں محروم تھا۔ میں تو ہاتھ کھولنے اور بند کرنے، روکنے اور ٹوکنے سے بھی عاجز ہو گیا یہاں تک یہ سب راہیں بند ہو گئیں پھر بھی اللہ کا شکر ہے کہ میرا مقصد پورا ہو گیا۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے سخاؤ کے پیدا کیے ہوئے غلط اعتراضات اور غلط فہمیوں کا نہایت تحقیقی اور تنقیدی انداز میں جائزہ لیا ہے اور اپنا تجزیہ مندرجہ ذیل نکات کی شکل میں پیش کیا ہے:

(الف) کیا البیرونی خوارزم فتح ہونے کے بعد قیدی کی صورت میں غزنی آئے تھے جیسا کہ سخاؤ کہتے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں متعلقہ تاریخی مواد اور تذکروں کی روشنی میں لکھا ہے کہ البیرونی نے کسی بھی جگہ ایسی کوئی بات تو کیا بلکہ اشارہ تک نہیں کیا۔ پھر یہ بھی نظامی عروضی سمرقندی تھا جس نے ''چہار مقالہ'' میں ایک دوسری حکایت

بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ البیرونی غزنی میں سلطان محمود کی خاص مجلس میں موجود تھے کہ سلطان ان سے ایک سوال کے جواب پر خفا ہو گئے اور انھیں چھ ماہ کے لیے نظر بند کر دیا۔لیکن اس روایت سے خود اس بات کی تردید ہوتی ہے کہ سلطان محمود البیرونی کو خوارزم سے ہی قید کر کے لائے تھے اور وہ سلطان کی وفات تک یعنی باقی تیرہ سال شاہی نگرانی یا نظر بندی میں رہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ''چہار مقالہ'' میں ایسی کئی دیگر حکایات ہیں جن میں واقعی افسانوی رنگ بھرا ہوا ہے۔ڈاکٹر بلوچ صاحب کی ایک دوسری اہم دلیل یہ ہے کہ البیرونی خوارزم کے حکمران ابوالعباس کے خاص معتمد تھے اور ان کے دربار سے سات سال سے زیادہ عرصہ وابستہ رہے۔ ابوالعباس محمود کے بہنوئی تھے جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان تحفوں کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔

مذکورہ بالا حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ البیرونی کو محمود غزنوی کے علم پروری اور ہندوستان میں فتوحات کے بارے میں ضرور خبر ہوئی ہوگی۔ بلکہ محسوس یوں ہوتا ہے کہ البیرونی کو علم ہیئت اور ریاضی کا کتنا شوق تھا اور اس بارے میں انھوں نے ہندوؤں کی ان علوم میں مہارت کے بارے میں کچھ سنا اور معلوم کیا تھا۔ اسی بنا پر انھوں نے چاہا کہ کسی طرح غزنی کے دربار میں ان کی پہنچ ہو خصوصاً جب ان کے سرپرست اور قدردان ابوالعباس قتل ہو چکے تھے تو اس صورت میں غزنی آنا ان کے لیے یقیناً زیادہ فائدہ مند تھا۔ بہرحال سخاؤ کی اس پیدا کردہ غلط فہمی کا شکار سید حسین برنی جیسا عالم بھی ہوا جس نے 1915ء میں علی گڑھ سے البیرونی کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں تحقیقی کتاب شائع کی۔ وہ خود اس بات کی تہہ تک نہیں پہنچے نہ اس کا ازالہ کر سکے۔اس کتاب کا 1927ء میں دوسرا نظر ثانی ایڈیشن شائع ہوا لیکن اس میں بھی کوئی نئی تحقیق سامنے نہ آ سکی۔ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا اور اس کے حوالے بھی انھوں نے البیرونی سے متعلق اپنے مقالے میں دیے تھے۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اگر محمود غزنوی علما کا قدردان نہ تھا تو کیا البیرونی کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ غزنی سے چل کر تقریباً تیرہ سال ہندوستان کے اس علاقے میں گزارتا اور ہند کے عالموں اور پنڈتوں سے ملتا جلتا رہتا۔اس حوالے سے البیرونی خود لکھتے ہیں کہ انھوں نے کتب کی خریداری پر جتنا پیسہ ہو سکا خرچ کیا۔ اگر یہ حقیقت ہے تو یہ پیسا کہاں سے آیا؟ البیرونی کی آمدنی کا کونسا ذریعہ تھا؟ ڈاکٹر بلوچ صاحب کا کہنا ہے کہ کتاب الھند کے جملوں میں البیرونی ایک محقق عالم کی طرح اپنی نہ ختم ہونے والی علمی پیاس کا ذکر کرتا ہے بلکہ ان جملوں

میں در پردہ یہ شکایت بھی ہے کہ ہندو عالم ان کے ساتھ تعاون کم کرتے تھے۔ یہاں یہ حقیقت سامنے رکھنی چاہیے کہ ایسے وقت میں جب محمود غزنوی ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں فتوحات کر رہا تھا تو اسی دوران ایک مسلمان عالم وہاں آ کر سالوں کے سال رہے اور وہاں کے علما اور پڑھے لکھے لوگ اس سے تعاون کریں یہ کیسا مشکل معاملہ تھا؟ اس لیے البیرونی کہتے ہیں کہ میں نے اپنی بساط کے مطابق کیسے بھی حالات ہوں یہ کچھ کر سکا ہوں اس سے زیادہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت درکار ہے جس سے مراد لاتعداد دولت اور نہ ختم ہونے والی جسمانی اور ذہنی قوت ہی ہو سکتی ہے۔

(ب) سخاؤ نے اپنے مقدمے میں البیرونی کو ایک سیاسی کردار دینے کی بھی کوشش کی ہے وہ یہ بھی الزام لگاتا ہے کہ وہ سلطان محمود کا در پردہ دشمن تھا۔ وہ محمود کو پسند نہ کرتا تھا جس کی وجہ سے اس نے اپنی کوئی کتاب محمود کی جانب منسوب نہ کی۔ سخاؤ کہتا ہے کہ سلطان محمود کے مقابلے میں البیرونی سلطان محمود کے بیٹے مسعود سے عقیدت رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے انھوں نے ہیئت کے بارے میں مشہور کتاب ''قانونِ مسعودی'' ان کے نام سے منسوب کی۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کے تجزیہ کے مطابق سخاؤ نے یہ غلط فہمی جان بوجھ کر پیدا کی ہے تاکہ البیرونی کی نظر بندی کا جواز سمجھ میں آ سکے۔ اس کے علاوہ سخاؤ کو یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ وہ البیرونی کو ابوالعباس کا ایسا سیاسی مشیر سمجھ بیٹھا ہے جو البیرونی کے مشورے کے سوائے کوئی کام نہیں کرتا۔ یہ حقیقت ہے کہ آخری وقت میں ابوالعباس اور محمود کے درمیان اس بات کا اتفاق نہ تھا کہ ایل خانیوں کے بارے میں کیا پالیسی اختیار کی جائے لیکن اس کے لیے البیرونی کو ذمے دار سمجھنا اس لیے غلط ہوگا کہ ابو العباس اور البیرونی کے درمیان میں جو صلاح مشورے ہوتے تھے وہ البیرونی نے اپنی یادداشت المسامرۃ میں تحریر کی ہیں جو تاریخِ بیہقی میں ہو بہو شامل ہیں۔ جس محقق نے تاریخِ بیہقی کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ ہرگز البیرونی کو اس صورت حال کا ذمے دار قرار نہیں دے سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ البیرونی اول سے آخر تک ایک سائنسدان اور علم کا متلاشی انسان نظر آتا ہے۔ اس نے اپنی تحریروں میں کبھی اور کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ اس نے کسے کون سے مشورے دیے البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ وقت کے حکمرانوں کے آگے سچ بولتا رہا اور صحیح رائے کا اظہار کرتا رہا ہے۔ ایسے واقعات کا ذکر اس کی تحریروں

سے ملتا ہے۔

(ج) سخاؤ کہتا ہے کہ البیرونی کو ملتان میں نظر بند رکھا گیا اور حسن برنی ''قانون مسعودی'' کے مقدمے میں کہتے ہیں کہ البیرونی کو نندنہ میں نظر بند رکھا گیا۔ سخاؤ ''کتاب الھند'' کے مقدمے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''خوارزم فتح کرنے کے بعد شاہی خاندان کے کئی افراد کو غزنی میں اور البیرونی کو ملتان میں شاہی قیدی کی حیثیت سے رکھا گیا۔''

یہ گمان وہ اس لیے قائم کرتا ہے کہ البیرونی نے اس کتاب میں ملتان کا زیادہ ذکر کیا اور وہاں کے پنڈت درلبھ سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتا ہے لیکن کتاب الھند میں ایک عبارت اس طرح کی بھی ہے۔ یہاں ہم اس عبارت کا آسان اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں:

''میں نے خود قلعہ لاہور کے عرض البلد کی پیمائش کی ہے جو 34 درجہ اور 3 منٹ ہے۔ کشمیر اور لاہور کے درمیان 54 میلوں کا فاصلہ ہے آدھا راستہ آسان ہے تو آدھا راستہ بیمار کرتا ہے۔ دیگر عرض البلد جو میں نے خود معلوم کیے ان میں غزنی، کابل کندی، لمغان، پرشاور، واھند، جہلم، دنپور اور قلعہ نندنہ شامل ہیں۔ نندنہ اور ملتان کے درمیان میں 200 میلوں کا فاصلہ ہے۔ اس کے بعد سیالکوٹ منڈاکا کر اور ملتان کے عرض البلد دیے ہیں۔ البیرونی آخر میں لکھتے ہیں ہم ان مقامات سے آگے ان کے ملکوں میں نہیں گئے اور نہ ہی ہندوؤں کی کتابوں میں عرض البلد کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔''

مندرجہ بالا بیان سے زیادہ اور کیا وضاحت ہوسکتی ہے کہ البیرونی کو اپنی مرضی کے مطابق گھومنے پھرنے، مشاہدے اور تجربے کرنے کی مکمل آزادی تھی نندنہ کے مقام پر تجربے کے بارے میں البیرونی نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ اس طرح ہیں:

ولما اتفق الی المقام بقلعۃ ننندنہ

یعنی جب ہم کو نندنہ قلعہ والے مقام پر پہنچنے کا اتفاق ہوا......

البیرونی نے نندنہ کا ذکر ایک مرتبہ نہیں بلکہ مختلف موقعوں پر چار دفعہ کیا ہے یہ عرصہ سولہ سالوں پر پھیلا ہوا ہے۔

ایرانی محقق کی گواہی

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے سلطان محمود اور البیرونی کے تعلقات کے بارے میں جرمن مستشرق سخاؤ کی طرف سے پھیلائی گئی غلط فہمی کے متعلق یہ تحقیق مکمل کی تو ایران کے نامور محقق اور عالم بدیع الزمان فروزانفر اپنی مشہور تصنیف ''تاریخ ادبیات ایران بعد از اسلام تا پایان تیموریان'' میں بھی اسی نتیجے تک پہنچے۔

سلطان محمود کے تاریخی کردار کے بارے میں تحقیق:

محمود غزنوی کے دورِ حکومت (1030ء-998ء) کی تاریخی حیثیت کو کسی حد تک وسطی دور کے مورخوں نے جس میں تاریخ فرشتہ کے مصنف محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ شامل ہیں اور پچھلے دور کے تاریخ دان جن میں خاص طور پر برطانوی دور کے مورخ ایلٹ اور ڈاؤسن آ جاتے ہیں غلط رنگ دے کر پیش کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحقیق کے مطابق محمود غزنوی کے کردار کو زیادہ مسخ کرنے میں بہرحال مغربی جدید تاریخ نویسوں یا نوآبادیاتی نقطۂ نظر (Colonialist Viewpoint) رکھنے والے مورخیں کا بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس سوال کا جواب دینا مشکل نہیں اول تو انھوں نے جیسے ہی برصغیر میں قدم رکھا تو اس وقت یہاں مسلمان حکمران تھے۔ گویا ان کا مقابلہ مسلمانوں سے تھا اور ان سے انھیں جہاں لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ دوسرا انھیں ہندوؤں کی غالب اکثریت سے ہمدردی کی سخت ضرورت تھی۔ انھوں نے ہندوؤں کو ہر طرح باور کرانا چاہا کہ انگریز انھیں مسلمانوں کی صدیوں کی غلامی سے نجات دلانے والے ہیں لہٰذا انھوں نے ہر ایسا قدم اٹھانا چاہا جس سے وہ ہندوؤں کی نظر میں زیادہ عزت بلکہ اعتماد حاصل کر سکیں۔

نوآبادیاتی تسلط کے تحت تاریخ کو مسخ کرنے کی اس سے زیادہ کون سی تاریخی مثال ہو سکتی ہے کہ 1842ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ایلن برو نے ایک شاہی فرمان جاری کر کے افغانستان میں برطانوی افواج کے کمانڈر جنرل ناٹ کو حکم کیا کہ وہ غزنی میں محمود غزنوی کے مقبرے میں لگے ہوئے صندل کی لکڑی کے وہ

دروازے اکھاڑ کر ہندوستان لے آئے جو محمود غزنوی سومناتھ کے مندر کو توڑتے وقت اپنے ساتھ لے گیا۔ اس مسئلے پر 1843ء میں برطانوی دارالعلوم (House of Commons) میں بڑا شور ہوا اور کئی دن تک بحث چلی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایلنبرو ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا: ایک افغانستان میں برطانوی افواج کی ذلت آمیز شکست کا وہ بدلہ لینا چاہتا تھا دوسرا اس نے ہندوستان پر محمود غزنوی کے سترہ حملوں کی جوابی کارروائی کے طور پر ہندوستانی عوام کے بڑے طبقے میں انگریز قوم کی عزت میں اس طرح اضافہ کرانا چاہا۔ حالانکہ تاریخ کی کسی بھی کتاب میں سومناتھ سے صندل کے دروازے لے جانے کا ذکر تو کیا کہیں اشارہ بھی نہیں ملتا۔

ڈاکٹر بلوچ ایک مورخ کی حیثیت میں سب سے پہلے سلطان محمود کے ہندوستان پر حملے کے بارے میں اصل پس منظر کو نہایت وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی کے درمیاں میں الپتگین، جو اصل میں ترک غلام تھا اور سلطانی خاندان کی طرف سے خراسان کا عملدار مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے خود کو غزنی کا خود مختار حکمران بنانے کا اعلان کیا۔ اس نے آٹھ سال حکومت کی اور 963ء میں وفات کر گیا۔ یہ وقت تھا جب پنجاب میں راجہ جے پال جیسا مضبوط حکمران تخت نشین تھا اور اس کی حکومت کی سرحدیں پشاور کابل تک پھیلی ہوئی تھیں۔ 977ء میں ابو علی جو ابوبکر لاوق کا بیٹا تھا اور جس سے الپتگین نے غزنی چھین کر قبضہ کیا تھا، اس نے راجہ جے پال کے بیٹے کی مدد سے غزنی پر لشکر کشی کی، غزنی کے لشکر کی قیادت سبکتگین کر رہا تھا جو الپتگین کا داماد بھی تھا۔ لڑائی میں ابو علی اور جے پال کا بیٹا مارا گیا۔ اس فتح کے نتیجے میں سبکتگین جس کا تعلق ترک نسل سے تھا، 977ء میں غزنی کا حکمران اور غزنوی خاندان کی بنیاد ڈالنے والا بن گیا۔ اس نے پھر دس سال حکومت کی اور غزنی کے حکمران غزنوی خاندان اور پنجاب کے حکمران جے پال کے درمیان مسلح لڑائیوں کا آغاز ہوا۔ دوسری لڑائی 376ھ مطابق 986ء میں ہوئی جب راجہ جے پال نے خود لشکر کی قیادت کی اور لمغان اور غزنی کے درمیاں غزک کے مقام پر دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے۔ اس لڑائی میں نوجوان محمود بھی شامل تھا جس کی عمر اس وقت 15 سال تھی۔ جے پال جب شکست کھانے کے قریب تھا تو اس نے صلح کی پیش کش کی جو سبکتگین نے تاوان کی شرط پر قبول کر لی۔ بعد ازاں جے پال اپنے معاہدے سے پھر گیا اور ایک بڑی جنگ کی تیاری کرنے لگا اور دہلی، اجمیر، قنوج، کالنجر کے ہندو راجاؤں سے مدد لے کر ایک لاکھ افواج کی تیاری سے غزنی

کی طرف پیش قدمی کی لیکن اس مرتبہ بھی جے پال نے شکست کھائی اور سبکتگین نے پھر صلح قبول کی۔ اس مرتبہ جے پال نے لمغان سے پشاور تک کا علاقہ سبکتگین کے حوالے کیا۔ اس لڑائی میں بھی محمود شامل رہا اس وقت اس کی عمر 17 سال تھی اس طرح جے پال اور سبکتگین کے درمیان چار دفعہ مقابلہ ہوا اور ہر دفعہ جے پال نے شکست کھائی اور اس کے نتیجے میں اس کی حکمرانی کی سرحدیں دریائے سندھ کے مغربی حصے سے بالکل ختم ہوگئیں۔

سبکتگین نے 990ء میں وفات پائی۔ کچھ عرصے بعد محمود 27 سال کی عمر میں غزنی کا حکمران بنا۔ محمود نے اپنی دانائی کا اس وقت بڑا ثبوت دیا جب دو سال کے مختصر عرصے بعد اس نے بغداد کے خلیفہ سے یمین الدولہ کا خطاب حاصل کیا اور اپنے لیے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ محمود نے جب سے ہوش سنبھالا تب سے ہی باپ کے ساتھ لڑائیوں میں شامل رہا۔ اس نے دیکھا کہ غزنی کے تخت کو پنجاب کے حکمران پالا خاندان سے ہر وقت خطرہ تھا اور آخر میں تو اس نے یہاں تک دیکھا کہ آس پاس کے ہندو راجہ بھی پالا خاندان کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ لہٰذا تاریخی روایت کے مطابق اس نے تخت نشین ہوتے ہی یہ عہد کیا کہ وہ آئندہ ہندو راجاؤں کے خلاف اپنی مہم جاری رکھے گا۔ اسی وجہ سے اس نے محسوس کیا اس کا پہلا نشانہ جے پال ہونا چاہیے جو خود پشاور حاصل کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ تین سال بعد پشاور کے قریب دونوں میں مقابلہ ہوا جس میں جے پال نے 15 شہزادوں سمیت بری شکست کھائی اور قید کیا گیا۔ آخر صلح کی شرائط پر آزاد ہوا جس کے بعد جلد ہی وہ مر گیا۔ یہ مقابلہ سنہ 1001ء میں ہوا۔

جے پال کی موت کے بعد اس کا بیٹا اور پوتا انند پال اور ترلوکن پال پورے 20 سال محمود سے مقابلے کرتے رہے لیکن وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکے۔ یہاں تک کہ وہ کبھی کبھی ہند کے آس پاس کے راجاؤں سے مدد بھی حاصل کرتے رہے بلکہ انند پال نے ملتان کے قرمطی حکمران داؤد سے گٹھ جوڑ کر کے محمود کی پیش قدمی کو روکنے کے سازش کی تو اس میں بھی اسے ناکامی ہوئی۔ آخر 1008ء میں انند پال ایک مرتبہ پھر پشاور پر قبضہ کرنے کے لیے بڑا لشکر تیار کر کے آگے بڑھنے لگا۔ سلطان محمود کو جب یہ پتا چلا تو وہ دریائے سندھ کو پار کر کے ہنڈ کے مقام پر پہنچا جہاں انند پال کو بری شکست نصیب ہوئی۔ سلطان کی فوج نے مسلسل پیش قدمی جاری رکھی اور بیاس ندی پار کر کے نگرکوٹ کا علاقہ فتح کر لیا۔ اس صورتحال میں انند پال نے اپنی تخت گاہ جہلم ضلع کے مشہور مقام نندنہ کو

بنایا جہاں اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا ترلوکن پال مسند نشین ہوا۔ سلطان محمود نے نندنہ کو 1014ء میں فتح کیا جہاں سے ترلوکن پال اپنی حکمرانی کی آخری حد یعنی تھانیسر چلا گیا۔ سلطان محمود ترلوکن پال کے تعاقب میں تھانیسر پر حملہ آور ہوا تو وہ وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ ترلوکن پال نے ابھی سبق نہیں سیکھا اور ایک مرتبہ پھر کالنجر کے راجہ گنڈا سے ساز باز کر کے گوالیار کے راجا کو ساتھ ملا کر قنوج کے راجہ راجیپال سے تعلقات مضبوط کرنے لگا۔ محمود ایک سال بعد ترلوکن پال کو سبق سکھانے کے لیے غزنی سے 1019ء میں روانہ ہوا اور ہرملا یو دوار کے قریب دریائے گنگا پار کر کے ترلوکن پال کا پیچھا کیا جس کے نتیجے میں وہ زخمی ہو گیا لیکن وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ آخر ترلوکن پال 1021ء کو اپنے لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کا بیٹا بھیم پال پانچ سال بعد 1026ء میں فوت ہو گیا اور اس طرح غزنوی اور پالا خاندان کے درمیان چلنے والی کشمکش اور لڑائیوں کا خاتمہ ہوا۔

سلطان محمود نے 1021ء میں پالا خاندان کے خاتمہ کے بعد کالنجر کے راجہ گنڈا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا لیکن اس نے اس کا مثبت جواب نہ دیا اور جنگ کی تیاریوں میں لگ گیا۔ سلطان نے جب حملہ کیا تو وہ بھاگ گیا جس کی وجہ سے سلطان نے اپنی فوجوں کا رخ گوالیار کی طرف کیا جہاں کالنجر کے راجہ کا نائب تھا۔ اس نے شکست قبول کی اور 35 ہاتھیوں کا تحفہ پیش کیا۔ سلطان نے ایک مرتبہ پھر کالنجر کا رخ کیا اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ چند روز بعد گنڈا صلح کے لیے راضی ہوا۔ اس نے سالانہ خراج اور تین سو ہاتھی بطور تاوان دینے قبول کیے۔

سومناتھ کی مہم سے متعلق اصل حقائق

سلطان محمود کی آخری مہم سومناتھ کی فتح ہے جو اس نے سال 1025ء میں مکمل کی جس کا بظاہر مقصد سومناتھ کے بت کو توڑنا تھا جیسا کہ ہم عصر تاریخی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں عجیب وغریب روایات ملتی ہیں۔ ہندوؤں کی روایات کے مطابق جو البیرونی نے نقل کی ہیں یہ لنگ کا مندر تھا۔ بقول ان کے یہ سوم اور ناتھ یعنی چاند دیوتا کا مندر۔ کچھ مسلمان تاریخ نویسوں نے سومناتھ سے مراد منات کا بت لیا ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ ایک عوامی روایت کے مطابق جب محمود نے ہندوستان میں فتوحات کیں تو عوام میں یہ بھی

عقیدہ تھا کہ سومناتھ کا یہ بڑا بت دیگر چھوٹے بتوں پر ناراض ہے تب ہی تو محمود یہ علاقے فتح کر رہا ہے۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحقیق کے مطابق سومناتھ کی شہرت صرف مندر اور بت کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ وہاں ایک مضبوط قلعہ بھی موجود تھا جس کی نشان دھی البیرونی نے بھی کی ہے۔ دراصل سومناتھ، گجرات، کچھ اور کاٹھیاواڑ کی سمندری شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے سمندری جہازوں کے لیے ایک اہم لنگر گاہ کی حیثیت رکھتا تھا جہاں سے مشرقِ وسطیٰ اور چین کے تجارتی جہاز گزرتے تھے۔ سومناتھ کی اسی جغرافیائی اہمیت کے باعث کئی مسلمان تاجر یہاں رہتے تھے جن کی بحری تجارت تھی لیکن کچھ وقت سے وہاں کے راجہ نے مسلمانوں پر بڑی سختی شروع کردی تھی۔ یہاں تک کہ ایک لوک روایت کے مطابق سومناتھ مندر میں مسلمانوں کی قربانی دی جاتی تھی جس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اس علاقے میں بحری قزاق مسلمان تاجروں اور جہازوں کو لوٹتے تھے اور پھر قتل کردیتے تھے۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کا کہنا کہ سومناتھ کے حملے کو اس پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ یہی وہ سبب تھا کہ سومناتھ کی فتح کے بعد سلطان محمود کو بغداد کے خلیفہ کی جانب سے خاص خلعت اور خطاب سے نوازا گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی دوسری سب سے بڑی تحقیق یہ ہے کہ ہندوستان پر 17 حملوں کی تعداد بھی نوآبادیاتی تاریخ نویسوں نے ہی دی ہے جو اصل حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ یہ تاریخ نویس الیٹ اور ڈاؤسن تھے لیکن عتبی کی معاصر تاریخ کے مطابق یہ تعداد کسی بھی صورت میں بارہ تیرہ سے زیادہ نہیں۔ ان بارہ تیرہ حملوں میں بھی تین حملے ملتان، سندھ اور خضدار کے شامل ہیں۔ اس طرح گویا 391 سے 416ء کے 26 سال کے دوران یہ تعداد دس بنتی ہے۔ اس کا آغاز جے پال سے بدلہ لینے سے شروع ہوا کیونکہ اس سے قبل جے پال نے جس کی حکمرانی میں کابل بھی شامل تھا غزنی پر حملہ کرایا تھا۔ جے پال کے بعد اس کے بیٹے انند پال سلطان سے بھرپور مقابلہ کرتا رہا اور غزنوی اور پالا خاندان کے درمیان لڑائیاں چلتی رہیں جس کا خاتمہ 1023ء میں ہوا۔ اس وقت غزنوی سلطنت کی حدود میں پشاور اور پورا پنجاب شامل ہو چکا تھا بلکہ پنجاب کے مشرق میں کالنجر بھی آ گیا تھا۔

تاریخ کا نوآبادیاتی نظریہ اور ڈاکٹر بلوچ:

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی علمی تحقیق کا ٹھوس معیار اور طریقہء کار اس وقت تک دی گئی مثالوں سے ظاہر ہو

چکا۔ایک محقق اور مورخ کی حیثیت میں ڈاکٹر صاحب کی تاریخ کے بارے میں ادراک نہایت وسیع اور گہرا ہے۔ اس سلسلے میں 1973ء میں ڈاکٹر صاحب نے قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں پہلے پاکستانی تاریخ وثقافت کانفرنس کے موقع پر ایک اہم مقالہ پڑھا تھا۔اس مقالے کا عنوان تاریخ نویسی کی ترقی (Development of Historical writing) ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کی تاریخ نویسی کے ارتقا کے اصولوں جس میں خبر، روایت، سند اور محل موقع کی جانچ (Field Research) کے حوالے سے مفید معلومات پیش کی تھیں۔ڈاکٹر صاحب نے اس مقالے میں اس امر کی وضاحت کی کہ مسلمانوں نے تاریخ کے علم میں کس کس طرح کیسے کارنامے سرانجام دیے ہیں جس کی بنا پر یہ ممکن ہوسکا کہ مسلمانوں کی وجہ سے علم تاریخ نے خبر اور حکایت سے آگے بڑھ کر حقیقت اور شہادت پر مبنی دستاویز کی حیثیت حاصل کی۔مثلاً راویوں اور سند کے اعتبار سے تاریخ طبری اوائلی عالمی (Universal) تاریخ کی اعلیٰ مثال ہے اسی طرح تیسری صدی ہجری کے آخر یا چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں مسعودی کی تاریخ مروج الذهب Field Research کی بہترین مثال ہے۔

مسلمانوں نے تاریخ لکھنے کی کئی اقسام ایجاد کیں جن میں خاص یہ ہیں:

1۔سن والی تاریخ نویسی (Chronlogical)

2۔خاندان کے حساب سے تاریخ نویسی (Dynastic)

3۔طبقات یا عہد کے مطابق تاریخ نویسی (Periodic)

اس کے علاوہ سوانح نگاری، مکتوبات، ملفوظات اور آخر میں وقائع نویسی کے فن نے مسلمانوں کی آمد کے بعد شاندار ترقی کی اور ایسی مثالیں بھی قائم کیں جن کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی۔مسلمانوں کی تاریخ نویسی کی یہ شاندار روایت نوآبادیاتی تسلط کے قائم ہونے تک برقرار رہی لیکن جیسے ہی نوآبادیاتی تسلط کی ابتدا ہوئی تو اس سے تاریخ کی ایک خاص قسم کا نظریہ مسلط کرنے کی کوشش کی گئی جس کی جھلک مغرب کے مشہور مورخ گبن کی ''تاریخ زوال سلطنتِ روما'' (The Decline and fall of the Roman Empire) میں بھی کسی حد تک دیکھا جاسکتا ہے۔

مغربی مورخین اور کچھ مستشرقین نے مقامی تاریخ نویسوں کے موضوعی (Subjective) یعنی حقیقت

سے دور ہونے کا طعنہ دیا اور کہا کہ ان کی تحریریں معروضی (Objective) نہیں تھیں یا ان کی تحریروں میں حقیقت پسندی نہیں تھی حالانکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ مغربی مورخین نے تاریخ کو ہمیشہ اپنی مخصوص عینک اور مخصوص مفادات کے لحاظ سے ہی دیکھا ہے۔ یہ نوآبادیاتی مورخ ہی تھے جنھوں نے ہندو مسلم تفریق (Hindu Muslim Difference) کی بنیاد رکھی اور جنھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مسلمان حکمرانوں کا کردار ظلم وجبر کی علامت تھا۔ نوآبادیاتی مورخین نے مقامی تاریخ کو انگریزی میں ترجمہ کرنے پر بھی توجہ دی لیکن تشریح اور حواشی وغیرہ میں اپنا رنگ بھرنے لگے۔ یہ ایک ایسا ہتھیار ثابت ہوا جس سے یہاں کے عوام کا اپنے مورخین پر اعتماد اٹھ گیا بلکہ یہاں تک ہوا کہ وہ اپنے ورثے سے بالکل متنفر ہوگئے۔

انیسویں صدی کے پہلے نصف میں ایچ ایم ایلٹ جو گورنر جنرل کے محکمہ خارجہ میں سکریٹری تھا۔ اس نے ایک نئی ترکیب سوچی اور مقامی تاریخوں کا انتخاب کرکے انگریزی میں ترجمہ کرایا جسے اس کے رفیق ڈاؤسن نے آٹھ جلدوں میں شائع کرایا اور اس کا نام رکھا:

The History of India as told by its own Historians

اصل تاریخیں زیادہ تر عربی و فارسی میں تھیں۔ ان کا انتخاب جو برصغیر پاک وہند کے متعلق تھا اسے انگریزی میں ترجمہ کرایا گیا، مثلاً سندھ کی تاریخ کے بارے میں عربی فارسی کتابوں میں جو مواد تھا وہ مواد لیا گیا۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کے بقول یہ قدم کسی حد تک قابل قدر تھا کیونکہ اس طرح اصل ماخذ تک پہنچ آسانی سے ہوگئی اور سات آٹھ صدیوں تک پھیلا ہوا مواد ایک جگہ جمع ہوگیا۔ لیکن یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ اس مواد کی بڑی ضرورت برطانوی حکمرانوں کو تھی جنھوں نے اسے اپنے نقطہ نظر سے استعمال کرنا چاہا تھا اور جس میں وہ کامیاب ہوگئے۔ اسی کے نتیجے میں ''نوآبادیاتی نظریہء تاریخ'' نے جنم لیا۔

ایلٹ نے یہ کیا کہ منتخب تاریخی مواد پیش کرنے کے بعد تشریح کی خاطر اس میں جو جو حاشیے لکھے اس میں وہ مسلمانوں کے دور کو ہر جگہ ظلم وزیادتی کی تصویر کے طور پر پیش کرتا ہے جس نے دوسرے طبقے یعنی ہندوؤں کو ابھرنے نہ دیا اور وہ مسلسل زیادتی کا نشانہ بنتے رہے۔ اس کی تاریخ میں مسلمان بادشاہوں میں سراسر عیش پرستی اور خونریزی کا تصور ہی نظر آتا ہے۔ اس کی وضاحت ایلٹ کی سندھ کے بارے میں لکھی ہوئی جلد (The

(History of Sindh as told by its own Historian) میں سے چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ سندھ میں عرب انتظام کے تحت عربوں کو مذہبی انتہا پسند (Fanatics) کہہ کر دوسری جانب انھیں (Furious Zealots) یعنی جنونی شدت پسند کہتا ہے تیسری جگہ (Usual bigotary and cruelty) عام مذہبی کٹر پن اور اندھیر نگری کے طعنے دیتا ہے۔

اس طرح مندروں کی تباہی عوام کی لوٹ مار اور بے انصافی مسجدوں کی زبردستی تعمیر، مذہبی منافرت یہاں تک کہ زبردستی ختنہ کی دھمکی دے کر پیسے لینے جیسے الزام اور ناروا سلوک بھی ان حوالوں اور تشریح میں ملتے ہیں۔ ایک جگہ جہاں ایلٹ سندھ فتح کرنے کے بعد عربوں کی لوٹ مار میں حاصل ہونے والے مال کا تخمینہ لگاتا ہے تو وہاں خود بھی تسلیم کرتا ہے کہ سندھ سے اتنی آمدنی تو کجا اس کا آدھا بھی نہیں ہوسکتا۔ لیکن وہ بیک وقت مصر اور شام کے بارے میں گبن کے اعداد و شمار کو درست قرار دیتا ہے۔ ایلٹ کی ذہنی بد دیانتی اور اصل مقاصد تب ظاہر ہوتے ہیں جب اس کے قلم سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:

> "It is expedient that these matters should be often brought back as nenembrance and pondered on for the inhabitants of modern India, as well as our clamorous demagogus at home who are very apt to forget the very dapth of degradation from which the great man of the people have been raised under the protection of British supermacy
>
> ترجمہ: یہ انتہائی ضروری ہے کہ ایسی باتیں بار بار دھرائی جائیں اور ان پر غور کیا جائے۔ یہ نہ صرف جدید ہندوستان کے باشندوں کے لیے ضروری ہے بلکہ ہمارے اپنے ملک میں سیاسی اور جذباتی نعرے بازی کرنے والوں کو منہ دینے کے لیے بھی اس کی ضرورت ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ یہ باتیں بھول بیٹھے ہیں کہ عوام کا بڑا طبقہ کتنی ذلت اور پستی میں گرا ہوا تھا اور برطانوی راج کے تحفظ کے نتیجے میں وہ کتنا اوپر ابھر کر نمودار ہوئے ہیں۔

اب یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ مغربی مورخیں یا مستشرقین یا نوآبادیاتی نقطہ نظر رکھنے والوں کے آگے تاریخ نویسی کا اصل مقصد کیا تھا؟

محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے حوالے سے تاریخی تحقیقات

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا یہ ایک روشن پہلو ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی محنت اور تحقیق پر بھروسہ کیا اور مضبوط دلائل کی بنیاد پر اگر وہ تحقیقی طور پر کسی نتیجے پر پہنچے تو ایک اٹل چٹان کی طرح اپنے اصول اور نظریات پر جمے رہے انہی مسائل میں ایک محمد بن قاسم کی شخصیت، خدمات اور کردار کے حوالے سے ہے۔ڈاکٹر صاحب مضبوط دلائل کی بنیاد پر محمد بن قاسم کو محسن سندھ سمجھتے تھے۔یہ محمد بن قاسم ہی کی شخصیت تھی جس کی وجہ سے سندھ اندھیروں سے نکل کر اسلام کی روشنی میں آیا۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے سندھ کی تاریخ کے اہم ترین ماخذ یعنی ''فتح نامہ ءسندھ عرف چچ نامہ'' پر بڑی محنت سے تحقیق کی اور محمد بن قاسم کی شخصیت اور کردار پر لگائے گئے غیر علمی اور غیر تحقیقی اعتراضات کا علمی و تحقیق کی روشنی میں مفصل جواب لکھا اس موضوع پر ڈاکٹر بلوچ صاحب کی شخصیت اس لحاظ سے منفرد ترین تھی کہ انھوں نے برس ہا برس سندھ کی محمد بن قاسم کے ہاتھوں فتح اور اس کے بعد کے تقریباً سوا تین سو سال کے عرب دورِ حکومت پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں علامہ عبدالعزیز میمن کی زیر نگرانی میں تحقیق کی تھی۔ڈاکٹر بلوچ صاحب کی اس دور کے تمام عربی اور فارسی ماخذ پر گہری نظر تھی خواہ یہ ماخذ مطبوعہ شکل میں تھے یا مخطوطات کی شکل میں۔

اس وقت ہمارے پیش نظر فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ کا دوسرا ایڈیشن ہے جسے سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد نے 1966ء میں شائع کیا تھا۔اس کتاب کے دیباچے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب نے لکھا کہ سندھی ادبی بورڈ کے پہلے اجلاس مورخہ 10/اکتوبر 1951ء میں فیصلہ کیا گیا کہ تاریخ سندھ کے تین اہم ترین ماخذات یعنی:

۱۔فتح نامہ ءسندھ عرف چچ نامہ

۲۔تاریخ معصومی

۳۔تحفتہ الکرام

کے فارسی سے سندھی تراجم کرائے جائیں اور انھیں سندھی ادبی بورڈ کی جانب سے شائع کیا جائے۔ سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے ترجمہ کی ذمہ داری مخدوم امیر احمد صاحب پرنسپل اورینٹل کالج حیدرآباد کو سونپی گئی اور ترجمہ کے اس کام کی نگرانی کی ذمہ داری ڈاکٹر بلوچ صاحب نے خود سنبھالی۔ تاریخ سندھ کے اہم ترین ماخذ پر اس سلسلے کی پہلی کتاب تاریخ معصومی 1953ء میں بورڈ کی طرف سے شائع ہوئی جب کہ فتح نامہء سندھ عرف چچ نامہ کا یہ محقق ایڈیشن پہلی مرتبہ سندھی ترجمے اور ڈاکٹر بلوچ صاحب کے تحقیقی مقدمے اور قیمتی اور مفصل حواشی کے ساتھ 1954ء میں شائع ہوا۔

کتاب کے دیباچے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ ''فتح نامہء سندھ عرف چچ نامہ'' کا تعلق سندھ کی تاریخ کے قبل اسلام اور اوائلی اسلامی فتوحاتی دور سے ہے۔ اس کتاب کا اصل عربی نسخہ فنا ہو چکا ہے اور اب اس کا فارسی ترجمہ ہی دستیاب ہے۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحریر کے مطابق فاضل مترجم مخدوم امیر احمد صاحب نے فارسی سے سندھی ترجمہ بڑی محنت اور خوش اسلوبی سے کیا لیکن صرف ترجمہ شائع کرنے سے تاریخ کا حق کماحقہ ادا نہیں ہو سکتا تھا اس کی اصل اور سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ اصل عربی کتاب کی فنا پذیری کی وجہ سے جو فارسی ترجمہ دستیاب ہے اس میں علمی اور تحقیقی لحاظ سے تصحیح کی خاصی گنجائش موجود ہے۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر بلوچ صاحب نے فیصلہ کیا کہ محض فارسی سے سندھی ترجمہ سے آگے بڑھ کر اس کتاب کا نئے سرے سے ایک تحقیقی ایڈیشن تیار کیا جائے۔ اس نئے تحقیقی ایڈیشن کی ضرورت سندھ کے نامور محقق پیر حسام الدین راشدی مرحوم (۳) نے بھی محسوس کی تھی اور اس کام کی انجام دہی کی خاطر ڈاکٹر بلوچ صاحب سے پرزور اصرار کیا تھا۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے بڑی محنت اور مستقل مزاجی سے یہ کام دو سال کے عرصے میں مکمل کیا ان کی محنت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایئے کہ اس میں فتح نامہ سندھ کا فارسی متن صرف 248 صفحات پر مشتمل ہے جب کہ اس تحقیقی سندھی ایڈیشن کی کل ضخامت تقریباً 700 صفحات ہے۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ تصحیح اور تحقیق کے لحاظ سے یہ سندھی ایڈیشن اس کتاب کے اب تک شائع شدہ تمام ایڈیشنوں سے قاری کو بے نیاز کر سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ آئندہ زمانے میں اگر کوئی اس کتاب یا اس موضوع پر تحقیق کرے تو ایسے محقق یا مورخ کے لیے اس ایڈیشن سے استفادہ کرنا لازمی ہوگا۔ اس

دیباچے کے آخر میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے فاضل استاد علامہ عبدالعزیز میمن سابق صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا بھی شکریہ ادا کیا ہے جن سے ڈاکٹر صاحب نے قیام علی گڑھ کے دوران اس موضوع سے متعلق قیمتی تاریخی وادبی معلومات حاصل کی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ڈاکٹر صاحب علامہ میمن کی نگرانی میں تاریخ سندھ کے عربوں کے دور حکومت سے متعلق تحقیق کر رہے تھے۔ڈاکٹر صاحب نے اس ایڈیشن کی خاطر ایک طویل اور عالمانہ مقدمہ بھی لکھا جو کتاب کے تقریباً 70 صفحات پر مشتمل ہے۔اس مقدمے میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ اس قدر اہم کتاب ہے کہ یہ نہ صرف مسلمانوں کی فتح سندھ کے بارے میں پہلی بنیادی کتاب ہے بلکہ برصغیر پاک و ہند کے تاریخی سلسلے کی قدیم ترین کتاب بھی یہی ہے ۔ڈاکٹر صاحب نے اس مقدمے میں سندھی ترجمے مع حواشی کی خاطر جن اصولوں کی بنیاد پر تحقیق کی گئی ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ اصول وقواعد مختصراً درج ذیل ہیں:

ا۔کتاب کے قلمی نسخوں کے متن کا باہمی تقابل کیا گیا۔

۲۔اصل عربی کتاب کے کاتبوں کے ہاتھوں اوراس کے فارسی مترجم علی کوفی کے سہو کی بنا پر جو حصے حذف ہو چکے ان عبارتوں کو مستند عربی کتابوں کی مدد سے تلاش کیا گیا۔

۳۔اس ترجمے میں اشخاص اور اماکن کے ناموں میں سھواً جو اغلاط مختلف نسخوں میں جگہ پا چکے تھے، ان کا تحقیق کے بعد درست املا لکھا گیا ہے۔

۴۔جس قدر ممکن ہوا تنا ان اشخاص اور مقامات کی شناخت کی گئی ہے جن کا ذکر فتح نامہ ءسندھ میں آیا ہے۔

۵۔فتح نامہ سندھ میں مذکور شاعروں کے حالات پر حتی الامکان روشنی ڈالی گئی اور ان کے دواوین نیز عربی ادب کی دیگر کتب کی مدد سے کتاب میں مذکور عربی اشعار کا درست املا لکھا گیا ہے۔

٦۔محمد بن قاسم کے بارے میں ہر پہلو سے ضروری تحقیق کی گئی ہے اور محمد بن قاسم کے خاندان اور اس کی شادی کے بارے میں فتح نامہ میں درج متضاد اور مشکوک بیانات کی مستند تاریخی حوالوں سے تحقیق کے بعد درست نتائج پیش کیے گئے ہیں۔

اسی سلسلے میں محمد بن قاسم کی سندھ سے واپسی ،نظر بندی اور وفات کے بارے میں فتح نامہ سندھ

میں درج راجہ داہر کی بیٹیوں کے حوالے سے افسانے کا علمی اور تحقیقی طور پہ رد بھی کیا گیا ہے۔اس ایڈیشن کی خاطر ڈاکٹر بلوچ صاحب نے بڑی محنت سے وضاحتی حواشی بھی لکھے جو کتاب کے صفحہ نمبر 317 تا 557 پر موجود ہیں ۔ماٰخذ و مصادر جو کتاب کے آخر میں درج ہیں ان کی کل تعداد 110 ہے۔

ان وضاحتی حاشیوں میں دیگر موضوعات کی تحقیق و تصحیح کے ساتھ ساتھ فتح نامہء سندھ کے فارسی ترجمے میں درج اس افسانے پر بڑی عمدگی سے تحقیق کی ہے جس کا تعلق محمد بن قاسم کے کردار سے ہے۔اس افسانے میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ فتح سندھ کے بعد راجہ داہر کی دو بیٹیوں کو دارالسلطنت بغداد بھیجا گیا جہاں انھوں نے خلیفہ وقت کے آگے یہ افسانہ طرازی کی کہ خلیفہ کے پاس بھیجنے سے قبل محمد بن قاسم نے انھیں تین روز تک اپنے پاس رکھا اور ان کی آبرو ریزی کی۔ یہ سن کر خلیفہ وقت نے فوراً احکامات جاری کیے کہ محمد بن قاسم جہاں تک پہنچا ہوا سے جانور کی کھال میں بند کر کے دارالخلافہ بھیجا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور خلیفہ کے پاس محمد بن قاسم کی لاش پہنچی۔اس کے بعد راجہ داہر کی بیٹیوں نے خلیفہ وقت کے آگے یہ اعتراف کیا کہ محمد بن قاسم کے بارے میں انھوں نے یہ جھوٹا افسانہ تراشا تھا اور محمد بن قاسم ان کے لیے باپ اور بھائی کی طرح تھا اور اس نے ان کے ساتھ کسی طرح بھی دست درازی نہیں کی تھی ۔راجہ داہر کی بیٹیوں نے یہ بھی کہا کہ اس افسانہ طرازی کی اصل وجہ یہ تھی کہ محمد بن قاسم نے سندھ میں اسلامی حکومت قائم کر کے ان کے باپ دادا کی بادشاہت کو ختم کر دیا تھا اور یہ افسانہ طرازی انھوں نے محمد بن قاسم سے انتقام لینے کی خاطر کی تھی ۔ یہ سن کر خلیفہ نے ان کو زندہ دیوار میں چنوانے کا حکم دیا اور ایسا ہی کیا گیا۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے فتح نامہء سندھ کے اس فارسی ترجمے میں درج اس افسانے کا کتاب کے کئی صفحات میں علمی اور تحقیقی انداز سے رد کیا ہے ان میں سے چند اہم نکات کی تلخیص ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

ا۔فتح نامہء سندھ کے اس ترجمے میں اس افسانے کو تاریخی رنگ دینے کے لیے اسے محمد بن علی اور ابوالحسن مدائنی کی جانب منسوب کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ درست نام علی بن محمد ابوالحسن مدائنی تھا جو ایک معتبر راوی تھا۔اس کی طرف منسوب تمام روایتیں تاریخ کی کسوٹی پر درست ثابت ہوتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس افسانے کو فتح نامہء سندھ میں شامل کرنے والے نے ابوالحسن مدائنی کی جانب سے منسوب کرنے کے بدلے اس کے ساتھ محمد بن علی

نامی ایک گمنام راوی کو بھی شامل کیا ہے۔

۲۔ فتح نامہ میں موجود بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ راجہ داہر لارڈ کے قلعے میں قتل ہوا تھا۔ اور وہاں سے صرف اس کی بیوی کی گرفتاری کا قصہ موجود ہے۔ فتح نامہ میں آگے ایک اور مقام پر یہ مذکور ہے کہ راجہ داہر کی بیوی اور اس کی دو بیٹیاں برہمن آباد کی فتح کے وقت گرفتار ہوئیں۔ ایک ہی کتاب میں راجہ داہر کی بیٹیوں کے حوالے سے یہ دو متضاد قصے اس افسانے کو غیر معتبر ثابت کرتے ہیں۔

۳۔ فتح نامہء سندھ کے اس فارسی ترجمے میں یہ عبارت بھی ملتی ہے کہ محمد بن قاسم نے داہر کی بیٹیوں کو حبشی غلاموں کے ہمراہ دارالخلافہ بغداد روانہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد بن قاسم کی فتوحات کے وقت بغداد کا کوئی وجود ہی نہیں تھا بلکہ اس واقعے کے 40 سال بعد بغداد کے شہر کا آغاز ہوا۔ اس واقعے کے وقت دارالخلافہ بغداد نہیں بلکہ دمشق تھا۔ دمشق کی جگہ بغداد لکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ یہ افسانہ بعد میں گھڑا گیا اور کتاب کے فارسی ترجمے میں شامل کیا گیا اور یہ اصل عربی کتاب میں موجود نہیں تھا۔

۴۔ اس واقعے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ خلیفہ وقت کے حکم پر محمد بن قاسم کو جانور کی کھال میں بند کر کے صندوق میں ڈالا گیا اور صندوق خلیفہ کے پاس بھیجا گیا جہاں صندوق سے محمد بن قاسم کی لاش برآمد ہوئی۔ تمام معتبر عربی تاریخوں میں سے کہیں بھی یہ ذکر نہیں بلکہ تمام مستند اور معتبر تاریخوں میں درج ہے کہ محمد بن قاسم کو جیل کی سزا دینے کے لیے شہر واسط کی جیل میں ڈالا گیا اور جیل ہی میں محمد بن قاسم کا انتقال ہوا۔ اس حقیقت سے بھی ظاہر ہے کہ یہ محض افسانہ ہے۔ محمد بن قاسم کو جیل میں ڈالنے کی وجوہات آگے بیان ہوں گی۔

۵۔ پانچویں دلیل یہ کہ اس قصے میں درج ہے کہ جب خلیفہ کو علم ہو گیا کہ داہر کی بیٹیوں نے محمد بن قاسم سے انتقام لینے کی خاطر یہ افسانہ گھڑا تو خلیفہ کے حکم پر ان کو زندہ دیوار میں چنوا دیا گیا۔ تمام معتبر عربی تاریخوں میں اس طرح کا کوئی اشارہ بھی موجود نہیں کہ ایسا کبھی ہوا تھا۔

اب آیئے اس افسانے کے آخری حصے یعنی محمد بن قاسم کی موت کی اصل وجہ کے بارے میں دیکھیں کہ حقیقت کیا تھی اور افسانے میں کیا بیان کیا گیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آیا کہ فتح نامہ ء سندھ کے فارسی ترجمے میں درج واقعے کے مطابق خلیفہ کے حکم سے محمد بن قاسم کو جانور کی کھال میں لپیٹ کر صندوق میں بند کیا گیا اور جب صندوق

خلیفہ کے آگے کھولا گیا تو اس میں محمد بن قاسم کی لاش برآمد ہوئی۔ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحقیق کے مطابق تمام معتبر عربی تاریخوں میں کہیں بھی محمد بن قاسم کی موت کا سبب یہ نہیں بیان کیا گیا ہے۔تمام مستند تاریخوں کے مطابق اصل واقعہ یہ ہوا کہ خلیفہ ولید کے عہد میں عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کا ستارۂ کمال اوج پر تھا اور اسکے پاس بہت سے اختیارات تھے۔اس زمانے میں حجاج کی اختیار کردہ پالیسیوں کی بنا پر بعض لوگ حجاج کے دشمن بن گئے تھے۔جب ولید کے انتقال کے بعد سلیمان خلیفہ بنا تو یہ لوگ سلیمان کے مشیر بن گئے اور حجاج سے دشمنی کی بنا پر اس کے خاص آدمیوں خصوصاً محمد بن قاسم سے بدلہ لیا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ اس وقت حجاج کی وفات 95 ہجری ہو چکی تھی اور اس سے بدلہ لینا ممکن نہ تھا جبکہ ولید کی وفات اس کے ایک سال بعد 96 ہجری میں ہوئی۔

جس روز ولید کا انتقال ہوا اسی دن سلیمان نے بحیثیت خلیفہ اقتدار کی بیعت لی اور حجاج کی جگہ خلیفہ ولید نے جس شخص کو عراق کا گورنر مقرر کیا تھا اس کی جگہ حجاج کے دشمن یزید بن مھلب کو عراق کا گورنر مقرر کیا گیا۔محمد بن قاسم حجاج کا عزیز اور خاص آدمی تھا اس لیے یزید بن مھلب نے انتقامی کارروائی کر کے محمد بن قاسم کی جگہ یزیز بن ابی کبشہ سکسکی کو سندھ کا نیا گورنر مقرر کیا۔یہ وہ وقت تھا جب محمد بن قاسم کی پوری توجہ ہندوستان کو فتح کرنے کی جانب تھی اور محمد بن قاسم کی فوجیں قنوج کو فتح کرنے ہی والی تھیں۔محمد بن قاسم کو جب اپنی معزولی کا حکم ملا تو اس نے اس حکم کی بجا آوری میں خود کو نئے گورنر کے آگے پیش کر دیا۔اس وقت محمد بن قاسم ایک طاقتور فوج کا سربراہ تھا اور مقامی باشندوں میں اپنے عدل انصاف اور رواداری سے اس قدر محبوب بن چکا تھا۔جب وہ یہاں سے گیا تو لوگوں نے اس کی محبت میں اس کی تصاویر تیار کر کے لگائیں۔محمد بن قاسم نے اپنے بارے میں جو اشعار عربی زبان میں کہے وہ اشعار اور ان کا سندھی ترجمہ بھی ڈاکٹر بلوچ صاحب نے کتاب میں پیش کیا ہے اور وضاحت کی ہے کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کو قوی امید تھی کہ نیا خلیفہ سلیمان اس سے حسنِ سلوک کا برتاؤ کرے گا۔اسی وجہ سے محمد بن قاسم نے طاقتور فوج اور مقامی باشندوں میں بے انتہا ہر دل عزیزی رکھنے کے باوجود خلیفہ سے بغاوت کا راستہ اختیار نہ کیا اور خود کو نئے گورنر کے سپرد کر دیا۔لیکن افسوس، نئے خلیفہ سلیمان نے اپنے مشیروں کے انتقامی جذبے کے تحت اس کی قدر نہ کی اور نہ صرف فاتح سندھ محمد بن قاسم بلکہ فاتح افریقہ موسیٰ بن نصیر اور فاتح

چین قتیبہ ابن مسلم بھی نئے حکمرانوں کے شدید تعصب اور انتقام کا شکار ہو گئے۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے مستند عربی تاریخوں کے حوالے سے لکھا کہ اس کے بعد یزید بن مھلب کا بھائی معاویہ بن مھلب محمد بن قاسم کو قید کر کے عراق کے شہر واسط لے گیا اور اسے صالح بن عبدالرحمن (رونیو آفیسر عراق) کے آگے پیش کیا۔ صالح بن عبدالرحمن کی حجاج بن یوسف اور اسکے قبیلے آل ابن عقیل سے خاص دشمنی تھی چنانچہ اس نے واسط کے قید خانے میں محمد بن قاسم کو سخت اذیتیں دیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسی قید خانے میں محمد بن قاسم نے صبر اور شکر کے ساتھ اپنی جان دی۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب آخر میں لکھتے ہیں کہ محمد بن قاسم کی موت کا اصل سبب نئے حکمرانوں کے دل میں انتقامی جذبہ تھا اور اس کا راجہ داہر کی بیٹیوں کے حوالے سے من گھڑت افسانے سے کوئی تعلق نہیں۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا ایک اہم تاریخی مضمون 'شہر حیدر آباد کے دوسو سال'

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مرحوم نے اپنی تحریروں میں پاکستان کے جن جن شہروں کے بارے میں مفید اور معلومات تحریریں یادگار چھوڑی ہیں ان میں اسلام آباد، ٹھٹہ، سیوہن اور حیدر آباد (سندھ) شامل ہیں۔ حیدر آباد کی تاریخ کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کا ایک یادگار مضمون 'شہر حیدر آباد کے دوسو سال' ہے۔ یہ مضمون راقم کو ڈاکٹر صاحب کے لائق پوتے جناب ارشد بلوچ کی عنایت سے حاصل ہوا۔ یہ ایک نایاب مضمون ہے جو اب تک کسی کتاب میں شامل نہ ہو سکا اس لیے ہم یہاں افادۂ عام کی خاطر اس مضمون کو مکمل شکل میں پیش کرتے ہیں:

شہر حیدر آباد کے دوسو سال

''حیدر آباد شہر اور قلعے کی آبادی کا سلسلہ 'نیرون کے قلعے' کی بنیاد سے شروع ہوتا ہے۔ یہ قلعہ چھٹی صدی عیسوی کے لگ بھگ رائے خاندان کی حکومت میں برہمن آباد کے گورنر کے تحت تھا۔ ساتویں صدی عیسوی کے اواخر میں راجہ ڈاہر کی جانب سے اس قلعے کا حاکم بدھ مذہب کا ایک بھکشو تھا لیکن قلعے کی فوجی اہمیت کی وجہ سے راجہ ڈاہر کا بیٹا جے سینھ

بھی وقتاً فوقتاً یہاں آ کر مقیم ہوتا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں محمد بن قاسم کے دیبل فتح کرنے کے بعد یہاں آنے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس وقت سے مصدقہ طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جس پہاڑی پر قلعہ تعمیر کیا گیا تھا، اس پہاڑ کا نام نیرون تھا اور اسی نسبت سے اس قلعے کو نیرون پہاڑی کا قلعہ یا ''قلعہ نیرون'' کہا جاتا تھا۔ یہی قلعہء نیرون بعد میں ''نیرون کوٹ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ کہنا کہ یہ قلعہ نیرون نامی ایک کافر نے تعمیر کرایا تھا اور اسی کی وجہ سے اس کا نام نیرون کوٹ تھا محض ایک کہانی ہے جو بعد میں مشہور ہوگئی تھی۔

فتح نامہ عرف چچ نامہ میں محمد بن قاسم کی آمد پر یہاں کے حالات درج کیے گئے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد بن قاسم قلعہ نیرون سے باہر بروری کے علاقے میں ایک چراگاہ میں منزل انداز ہوا جسے ''بلہار'' کہتے تھے، مہران (دریائے سندھ) کا پانی اس وقت تک یہاں نہیں آیا تھا اس وجہ سے لشکر کو پانی کی سخت تکلیف ہوئی۔ کچھ عرصے بعد بارش ہوگئی اور شہر سے باہر جتنے تالاب تھے پانی سے بھر گئے۔ شہر کی آبادی قلعے کے اندر تھی اور دروازے بند تھے لہٰذا شہر کے لوگوں سے کسی قسم کی خرید و فروخت نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ قلعہ نیرون پہاڑی پر ہے، اس کے قریب ایک تالاب ہے جس کا پانی عاشقوں کی آنکھوں سے زیادہ صاف اور اس کی چراگاہ باغِ ارم سے زیادہ دل فریب ہے۔ ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ ایک ایسی جگہ کا ذکر ہے جہاں ایک پہاڑی ہے، اس پر ایک قلعہ ہے اور آس پاس تالاب ہیں، بیرونی علاقے میں سرسبز و شاداب چراگاہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس وقت سے اب تک حیدرآباد کے جغرافیے میں کوئی خاص فرق نہیں آیا ہے البتہ اس وقت مہران دریا اس کے قریب نہیں بلکہ بہت دور مشرق میں بہتا تھا۔ اندازہ ہے کہ محمد بن قاسم یہاں فروری مارچ کے مہینوں میں آیا ہوگا اور اس وقت تک دریا میں اتنا پانی نہیں آیا ہوگا جس سے نہریں بہہ سکتیں البتہ موسمِ بہار کی بارش ہوئی ہوگی تو تالاب پانی سے بھر گئے ہوں گے۔ جس چراگاہ میں محمد بن قاسم منزل انداز ہوا اس کا نام

''بلہار'' تھا۔ بلہار سندھی لفظ ''ولھار'' کی دوسری صورت ہے جس کے معنیٰ سرسبز جگہ ہے۔ بہرحال نیرون کے قرب وجوار میں جس جگہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ غالباً انھی میدانوں میں تھا جو پہاڑی کے مغرب اور جنوب میں ٹنڈو جہانیاں اور گدو بندر، ٹنڈو میر غلام حسین اور ریلوے اسٹیشن کے جنوب میں پھیلا ہوا تھا۔ محمد بن قاسم جنوب کی جانب دیبل سے آتے ہوئے غالباً اس علاقے میں کہیں منزل انداز ہوا ہوگا۔ اس دور میں نیرون کے قلعے میں بدھ مذہب کے پیروکار آباد تھے اور اس کے حاکم کا نام چچ نامہ میں ''بھندرکو'' لکھا ہوا ملتا ہے۔ یہ غالباً اصل میں ''بھنڈرکھیو'' یا ''بدھ رکھیو'' ہوگا۔ اس حاکم نے خط وکتابت کر کے عراق کے گورنر حجاج سے دوستانہ مراسم قائم کر لیے تھے چنانچہ اس کے اور محمد بن قاسم کے درمیان معاہدہ ہو گیا تھا۔ محمد بن قاسم کی آمد کے موقع پر قلعے کے دروازے کھول دیے گئے تھے اور وہ اپنے سربرآوردہ سرداروں کے ساتھ قلعے کے معائنے کے لیے آیا تھا۔ اس نے قلعے کے اندر ایک مسجد تعمیر کرانے کا حکم دیا اور شکرانے کے طور پر نماز کی دو رکعتیں بھی ادا کیں۔ یہ فروری مارچ ۷۱۲ء کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد نیرون کوٹ کا اسلامی دور شروع ہوتا ہے۔

آٹھویں صدی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک نیرون کوٹ کے متعلق عرب راویوں کا کوئی آنکھوں دیکھا حال نہیں ملتا۔ نیرون کوٹ پہلے برہمن آباد کے گورنر کے ماتحت تھا۔ عرب دور حکومت میں محمد بن قاسم کی فتح کے تقریباً ۲۰۔ ۲۲ سال بعد برہمن آباد کے قریب محمد بن قاسم کے بیٹے عمر نے نئے دار الخلافہ ''منصورہ'' کی بنیاد رکھی جس کے کھنڈرات یہاں سے ۴۵ میل دور شہداد پور کے قریب ولور میں موجود ہیں۔ اسلام سے پہلے سندھ کا دار السلطنت اروڑ موجودہ روہڑی کے جنوب میں کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ اس لیے دور دراز کے قلعوں کو فوجی اہمیت حاصل تھی۔ نئی تخت گاہ ''منصورہ'' اتنی قریب تھی کہ نیرون کوٹ کی وہ اہمیت باقی نہ رہی، اس کے باوجود بھی عرب دور حکومت میں اسے اہمیت

حاصل تھی کیونکہ نیرون کوٹ اس شاہراہ پر واقع تھا جو عراق، ایران اور مکران سے دیبل بندر تک آتی تھی اور دیبل سے نیرون کوٹ، منصورہ، اروڑ ہوتی ہوئی ملتان تک پہنچتی تھی۔ دسویں صدی ہجری میں عرب سیّاح اصطخری، ابن حوقل اور مقدسی نے وادیِ مہران کو اپنی سیاحت اور جغرافیائی تحقیق کے لیے منتخب کیا، وہ لکھتے ہیں کہ نیرون کا قلعہ دیبل سے منصورہ جانے والی شاہراہ پر درمیانی علاقے میں واقع ہے، البتہ منصورہ سے زیادہ قریب ہے۔

اس شاہراہ پر ہونے کی وجہ سے وقتاً فوقتاً یہاں مسلمان سیاح، محققین اور علماء آتے رہے۔ تقریباً بارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ایک برگزیدہ شخص مکہ سے آئے جنھوں نے اس بستی کو اپنی آرام گاہ بنایا۔ یہ برگزیدہ شخصیت شیخ سعد محمد مکّی تھے جن کی درگاہ شاہ مکائی یا 'جیۓ شاہ' کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔ سیّد محمد مکی بن محمد شجاع بن ابراہیم بن ابی القاسم بن ابی المکارم محمد بن جعفر الاصغر بن ابی المعالی حمزہ الملک الامیر المشہور بہ ہارون بن عقیل بن ابی عقیل بن ابی الغنائم ناصر بن اسمٰعیل بن جعفر الصادق ہفتہ کی رات ۲۲ رمحرم ۵۱۰ ہجری مکہ میں پیدا ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بشارت پر ان کا نام حمزہ رکھا گیا لیکن انھیں محمد اور محمود بھی کہتے تھے۔ بالآخر وہ محمد مکّی کے نام سے مشہور ہو گئے اور سندھ کی طرف ہجرت کی۔ قرین قیاس ہے کہ انھوں نے چالیس سال کی عمر میں ہجرت کی اور اس رو سے وہ ۵۶۰ ہجری یا اس کے کچھ بعد سندھ میں آئے ہوں گے۔ یہاں آنے کے بعد سندھ اور پنجاب کی سیر کی کیونکہ ایک روایت ہے کہ ان کے تکیے پنجاب اور لدھیانہ کی طرف بھی موجود ہیں۔ بالآخر نیرون کوٹ کی بستی کو اپنے مستقل قیام کے لیے منتخب کیا جہاں انھوں نے ۸ رذوالحجہ ۶۵۸ ہجری میں وفات پائی۔ ان کے ایک فرزند مخدوم صدر الدین خطیب کے نام سے مشہور ہوئے۔ مخدوم صدر الدین کے چار بیٹے مخدوم بدرالدین، مخدوم علاء الدین، مخدوم تاج الدین اور مخدوم علی تھے جن کی اولاد

روہڑی، اچ، ملتان، لاہور، لدھیانہ، دہلی اور احمد آباد (گجرات) تک پھیلی اور شہرت پائی۔ تاج الدین محمد مکی نے بکھر میں سکونت اختیار کی اور اپنی درویشی کی وجہ سے وہاں مشہور ہوئے۔ حیدرآباد اور کوٹری کے میر بحروں کے مطابق ''پلّہ مچھلی'' حضرت جیئے شاہ کے پوتے یعنی تاج الدین محمود مکی بن مخدوم صدر الدین خطیب بن سیّد محمد مکی کی زیارت کے لیے یہاں سے بکھر جاتی ہے۔ سیّد محمد مکی کے دوسرے پوتے مخدوم علاء الدین کے بیٹے مخدوم فخر الدین کی اولاد پشت ہا پشت سے درگاہ کے متولی رہے۔ اب خلیفہ دین محمد درگاہ کے متولی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بارھویں صدی کے بعد محمد مکی کی درگاہ نیرون کوٹ کی نمایاں علامت رہی۔ قلعہ کی اراضی اور قرب و جوار میں عربوں کے ابتدائی دور کے بزرگ بھی مدفون تھے۔ ہوسکتا ہے کہ قلعہ کے سامنے 'اصحابی کا مزار' اوائلی دور کے بزرگوں سے کسی ایک کا ہو۔ نسبتاً بعد کے دور میں بخاری سیّدوں کے کچھ بزرگ بھی آکر نیرون کوٹ میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان سب میں قدیم غالباً قلعہ کے جنوب میں مدفون بزرگ شاہ بخاری تھے جن کا مزار قلعہ میں نئی کالونی کی تعمیر کے وقت موجود تھا، دوسرے شاہ بخاری سیشن کورٹ کے سامنے مدفون ہیں۔ مخدوم احمد نامی ایک درویش نے ۹۳۶ ہجری (مطابق ۱۵۲۹ء) میں نیرون کوٹ کے مقام پر رحلت کی۔ چونکہ یہ بزرگ باہر سے آئے تھے اس لیے وہ یہاں دفن نہیں کیے گئے۔ یہ سولھویں صدی عیسوی کے ابتدا کا واقعہ ہے۔ اسی طرح بارھویں صدی کے اواخر سے لے کر سولھویں صدی کے اوائل تک ایسے بزرگوں کے حوالے ملتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس عرصے میں نیرون کوٹ کی بستی ان بزرگوں کی دعاؤں کی وجہ سے آباد رہی۔

نیرون کوٹ کے متعلق تاریخی حوالے پھر ہمیں سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں ارغون، ترخان اور مغل دور میں ملتے ہیں مثلاً میرزا محمد باقی نے نیرون کوٹ کا علاقہ مرزا

محمد ترخان اور قاسم علی سلطان ساربان کے حوالے کیا تھا۔ میرزا غازی بیگ کے عہد میں ٹھٹہ کے نواب خسرو خان کا نواسہ نیرون کوٹ کا حاکم تھا۔ خواجہ عبید اللہ احرار کی اولاد میں سے خواجہ کمال الدین جو ارغونوں کے ساتھ آئے تھے، ٹھٹہ میں سکونت پذیر تھے۔ ان کے پوتے خواجہ میر ابوتراب بن خواجہ میر شہاب الدین نیرون کوٹ میں اپنی جاگیر پر رہتے تھے۔ یہ وہیں رہے، وفات کی اور مدفون ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ارغون اور ترخان دور میں نیرون کوٹ کو ایک ضلع کی سی اہمیت حاصل تھی جو ٹھٹہ کے تابع تھا۔ میرزا غازی بیگ شہنشاہ اکبر کے دور میں نواب تھا اور اس وقت نیرون کوٹ کی انتظامی صورت یہ ہی تھی۔ جہانگیر کے دور حکومت میں شہزادہ خرّم سندھ میں آکر پناہ گزین ہوا اس لیے جب شاہجہاں کے نام سے تخت نشین ہوا تو اس نے سندھ کو فراموش نہیں کیا۔ ٹھٹہ کی جامع مسجد کے علاوہ سیوہن میں قلندر شہباز اور چُھٹے امیرانی کے مزارات کے متصل شاہجہاں کے نوابوں نے مسجدیں تعمیر کروائیں۔ اسی شاہجہانی عہد میں ٹھٹے کے نوابوں نے سیّد محمد مکی کی درگاہ پر بھی توجہ دی او رفرمان جاری کر کے مخدوموں کے آپس کے اختلافات ختم کرائے۔ شاہجہاں کے عہد میں اس قسم کا پہلا فرمان ۱۰۳۸ء میں جاری ہوا۔ دوسرا فرمان نواب ابوالبقا امیر خان کی جانب سے ۱۴ ارشعبان ۱۰۵۲ء میں صادر ہوا، تیسرا فرمان نواب محمد رضا کی جانب سے ۱۰۶۱ء میں جاری ہوا۔ اسی طرح عالمگیر کے عہد میں پہلا فرمان نواب عزت خان کی طرف سے ۱۰۷۶ء میں اور دوسرا نواب غضنفر علی خان کی جانب سے ۱۰۷۷ء میں جاری کیا گیا۔ پانچ سال کے بعد ۱۰۸۲ء میں غالباً نواب عزت بیگ کی کوششوں سے سیّد محمد مکی کا مقبرہ پایۂ تکمیل کو پہنچا جیسا کہ اس کتبے سے ظاہر ہوتا ہے جو مقبرے کے سامنے مغرب کی طرف پکی دیوار میں نصب ہے:

ز عزت بنا یافت خوش منظرے
کہ از فیضِ حق می زند موجِ نور

بہشت آستاں بوسِ خدامِ اُو
ز خاکِ درش سرمہء چشمِ حور
بجستم ز دل سالِ تعمیر اُو
بگفتا خرد زیب بزمِ حضور

ان فرامین سے واضح ہوتا ہے کہ سترھویں صدی عیسوی میں مغلیہ دورِ حکومت میں نیرون کوٹ کی آبادی قائم تھی لیکن بطور علاقے کے اس کی سابق حیثیت ختم ہو چکی تھی کیونکہ ان فرامین میں ''نیرون کوٹ'' کے بجائے ''چاگر بالا پرگنہ'' لکھا گیا ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں جب مغلیہ سلطنت کا تسلط ختم ہوا اور سندھ میں کلہوڑوں نے اپنی آزاد سلطنت قائم کی تو نیرون کوٹ کی سوئی ہوئی قسمت جاگ اٹھی ۔کلہوڑوں کو تخت گاہ کی ضرورت تھی اور دریائے سندھ رخ بدل رہا تھا۔ بالآخر جب دریائے سندھ نیرون کوٹ کے قریب سے بہنے لگا تو غلام شاہ کلہوڑا نے نیرون کوٹ کی جگہ نیا قلعہ تعمیر کرایا۔ مورخ میر علی شیر قانع ٹھٹوی نے اپنی کتاب 'تحفۃ الکرام' میں نیرون کوٹ کی قدیم بستی پر نئے شہر اور قلعہ کی تعمیر کے یہ حالات لکھے ہیں: ''ماہ ذوالقعدہ ۱۱۸۲ ہجری میں نیرون کوٹ کی سرزمین پر جو ایک مضبوط پہاڑ ہے، تخت گاہ کی تعمیر کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ نیرون کوٹ جو ملک کا قدیم اور مشہور قلعہ ہے، کافی وقت ہوا مسمار ہو چکا ہے اور اب چھوٹے سے گاؤں سے زیادہ نہیں ہے۔ ۱۱۸۲ ہجری میں میاں غلام شاہ کلہوڑا نے اس مقام کو اپنی سکونت کے لیے منتخب کیا اور مضبوط قلعے اور شان دار شہر کی بنیاد رکھی (قلعے کی تعمیر کے دوران) کچھ لاشیں دریافت ہوئیں جو عجائبات میں شامل تھیں۔ یہاں مدفون بزرگوں کی لاشیں جنھیں فوت ہوئے کافی زمانہ گزر چکا تھا، بالکل سلامت نکلیں، ان میں سے ایک عورت اور مرد کی لاشیں تو ایسی تازہ تھیں گویا زندہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ دونوں عاشق و معشوق تھے۔ نئے قلعے اور شہر کا نام ''حیدرآباد'' مقرر ہوا۔ قلعے کی مضبوطی کا کیا ذکر کیا جائے، واقعی

اس سے قبل سندھ میں ایسا شان دار قلعہ مشکل سے نظر آئے گا۔قلعہ کی تعمیر ۱۱۸۲ہجری میں مکمل ہوئی۔اس کے سامنے پہاڑی پر شہر تعمیر کیا گیا تا کہ عوام کی آبادی قلعے کی حفاظت میں رہے۔ماہ ذوالحجہ میں دیرہ غازی خان سے واپسی پر میاں غلام شاہ نے اس قلعے میں سکونت اختیار کی۔''

میر علی شیر قانع کے اس بیان کے مطابق ماہ ذوالقعدہ ۱۱۸۲ہجری میں قلعے کی تعمیر کی تجویز عمل میں آئی اور ۱۱۸۲ہجری میں قلعے کی تعمیر تکمیل کو پہنچی،ذوالحجہ میں میاں غلام شاہ اس میں رہنے لگے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کام بہت تیزی اور جذبے سے ہوا اور صرف دو ماہ کے مختصر عرصے میں یہ عظیم الشان قلعہ تعمیر ہو گیا۔قلعے اور شہر کی تعمیر کا سال ۱۱۸۲،اس قرآنی آیت سے برآمد ہوتا ہے:

یاربّ اجعل هذا البلد اٰمنا

یعنی''اے مالک اس شہر کو امن والا کر''۔یہ ہی مادۂ تاریخ سنگ مرمر پر کندہ کروایا گیا جو بطو سنگِ بنیاد قلعے کے دروازے کے اوپر نصب کرایا گیا۔یہ امر بھی واضح ہے کہ یہ نیا قلعہ قدیم نیرون کوٹ کی اراضی پر تعمیر کرایا گیا اس لیے کہ کھدائی کے وقت یہاں پہلے لوگوں کی لاشیں برآمد ہوئیں۔سامنے جو شہر تعمیر کروایا گیا اس کے متعلق موجودہ روایتوں سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی یہ اراضی شمال میں قلعے کے ساتھ اور موجودہ شاہی بازار کے مشرق میں طاہر بازار کے آس پاس تھی۔

۱۱۸۵ہجری میں میاں غلام شاہ نے حضرت سیّد محمد مکی کے مزار کی حفاظت کے لیے کچا قلعہ تعمیر کروایا جسے شمال میں کافی توسیع دی گئی۔اس شمالی حصے کا دروازہ مشرق کی طرف الگ ہے۔اس طرف جو برج نظر آتے ہیں وہاں غالباً میاں صاحب نے اپنے فوجی دستے تعینات کیے تھے تا کہ جنوب سے حملہ کی صورت میں یہ فوجی چوکی کے طور پر مدافعت کر سکے۔پہاڑی کے آخری شمالی حصے پر موجودہ جیل کے شمال مغرب میں میاں صاحب

نے اپنے مقبرے کے لیے جگہ منتخب کی اور اس کی حفاظت کے لیے کچا قلعہ تعمیر کرایا۔ اس قلعے کے برج دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی فوجی چوکی قائم کی گئی تھی۔ میاں غلام شاہ کے دور میں حیدرآباد کی آبادی اور رقبہ مجموعی طور پر اسی قدر تھا۔ قلعے کی تکمیل کے بعد چوتھے سال ۱۱۸۶ ہجری میں میاں غلام شاہ کا انتقال ہو گیا۔ کسی نے ان کی وفات کی تاریخ یوں کہی: ''میاں خفتہ'' (یعنی میاں سو گئے) جس سے ۱۱۸۶ نکلتا ہے۔ انھیں شہر کے شمال میں تعمیر کردہ کچے قلعے میں دفن کیا گیا۔ ان کے بیٹے میاں سرفراز نے ان کے مزار پر مقبرہ تعمیر کروایا جو فن تعمیر کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مقبرے کی جنوبی دیوار پر محراب کی طرح بنے ہوئے دروازے کے اوپر میاں غلام شاہ کی وفات پر میاں سرفراز کے خوبصورت اشعار لکھے ہوئے ہیں جن کا آخری مصرع 'جنات فیھا خالدا' ہے جس سے میاں صاحب کی رحلت کا سال ۱۱۸۶ برآمد ہوتا ہے۔

میاں غلام شاہ کی توجہ سے اس شہر کی تقدیر تو جاگی لیکن ابھی تک یہ پایۂ تخت نہیں بنا تھا۔ ان کے بیٹے میاں سرفراز نے ہالا کے قریب ''خدا آباد'' کو اپنی تخت گاہ بنایا۔ اس وقت سے لے کر میر فتح علی خان کے دنوں تک خدا آباد کو تخت گاہ کی حیثیت حاصل رہی۔ چونکہ میاں غلام شاہ حیدرآباد میں مدفون تھے اس لیے کلہوڑوں نے اپنا قبرستان حیدرآباد میں بنایا۔ میاں غلام نبی جب میر بجار خان کے مقابلے میں لیاری (نزد جھول تعلقہ سنجھورو ضلع سانگھڑ) کی جنگ میں مارے گئے تو ان کو بھی یہاں لا کر دفن کیا گیا۔ میاں غلام نبی کا مقبرہ میاں غلام شاہ کے مقبرے اور گرلز کالج کے درمیان ایک وسیع ایوان میں ایک کشادہ چبوترے پر بہت خوبصورت طرز میں تعمیر کیا گیا ہے۔ میاں غلام شاہ کے بھائی میاں عطر خان بھی یہیں مدفون ہیں۔ اس کے بعد جب میاں عبدالنبی نے میاں سرفراز اور دوسرے کلہوڑا شہزادوں کو قلعے کے ایک قید خانے میں قتل کروایا تو انھیں پہاڑی سے نیچے مغرب میں دفن کیا گیا۔ یہ جگہ شہیدوں کے قبرستان کے نام سے مشہور ہے جہاں بعد میں

طاہر خدمت گار اللہ داد چنڈ ااور دوسری اہم شخصیتیں بھی مدفون ہوئیں۔

۱۱۹۸ ہجری مطابق ۱۷۸۳ء میں کلہوڑا حکومت ختم ہوئی اور ٹالپروں کا دور شروع ہوا۔ ابتدا میں ٹالپروں کی تخت گاہ بھی خدا آباد رہی۔ ۱۷۸۹ء میں فتح علی خان خدا آباد کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر با قاعدہ تجویز اور تیاری کے ساتھ حیدر آباد آئے اور اس شہر کو پایہء تخت اور مرکزِ حکومت بنایا گیا۔ پہلے شہر کی ترتیب اور آبادی پر توجہ دی گئی۔ جس طرح خدا آباد میں شہر کے درمیان شاہی بازار تھا اسی طرح حیدر آباد میں بھی موجودہ شاہی بازار قائم کیا گیا۔ چونکہ ابتدا میں یہاں کی آبادی اس شاہی بازار کی ابتدا میں شمال کی طرف تھی اور یہ سب مسلم آبادی تھی اس لیے انھوں نے یہاں مسلمانوں کو آباد کیا۔ سب سے زیادہ توجہ کاریگروں اور ہنر مندوں کی آبادی پر توجہ دی گئی تا کہ صنعت اور حرفت کو ترقی ہو اور کارخانوں کے ذریعے شہر کو پُر رونق اور مال دار بنایا جائے۔ خدا آباد سے بڑھئی اور مستری لائے گئے۔ ان خدا آبادی بڑھیوں کو ''واڈھن جے پڑ'' میں آباد کیا گیا اور مستریوں کو موجودہ کھائی روڈ کے علاقے میں بسایا گیا۔ فوجی ضرورت کے لیے ''نیورا'' (صیقل گر) قوم کے لوگ جو تلواریں بناتے اور صاف کرتے تھے آباد ہوئے۔ نعل بند اور نقارے بنانے والے ہنر مند یہاں لا کر بسائے گئے۔ گولہ انداز کلہوڑوں کے خاص آدمی تھے، پہلے ان کو مشکوک سمجھا گیا لیکن بعد میں ان کی بھی دل جوئی کی گئی۔ بندوقیں اور ہتھیار بنانے والے کاریگر اور خاطو بند جو لکڑی اور ہاتھی دانت کا کام کرتے تھے، مستقل طور پر یہاں آباد کیے گئے۔ بھائی خان جس کے نام پر چاڑھی بھی ہے، تلواریں بنانے کا ماہر تھا۔ بہر حال میر فتح علی خان کے عہد اور اس کے بعد حیدر آباد ان ہنر مندوں اور کاریگروں کا مرکز بن گیا۔ جلاہے، دھوبی، رنگ ریز، زردوز، پاٹولی (ریشم رنگنے والے)، سنار، چوڑی گر، دیئبھر (موتیوں کا کام کرنے والے)، نقاش وغیرہ شہر کی آبادی کا اہم حصہ بن گئے۔ اس عام آبادی کے علاوہ ٹالپر حکمرانوں نے اپنے نواب، خدمت گاروں، آخوندوں

اور طبیبوں کے لیے موزوں جگہیں فراہم کیں۔ شہر کی آبادی کے خاص حصے شاہی بازار کی دونوں طرف کی گلیاں مختلف محلوں اور پڑوں کے نام سے مشہور ہوگئیں۔

یہ تھا ٹالپری عہد کے حیدرآباد اور اس کی آبادی کا خاکہ۔ اس کے بعد اس شہر نے دو بڑے انقلاب دیکھے: ۱۸۴۳ء پر سندھ پر انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ اور اس کے تقریباً سو سال بعد ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام۔ انگریزوں کے تسلط نے یہاں کے اخلاق، تمدن اور روایات پر جتنا اثر ڈالا اتنا ہی حیدرآباد شہر کے در و دیوار سے وہ فرق ظاہر ہوا۔ حیدرآباد تخت گاہ باقی نہ رہا، یہاں کے حکمران کلکتہ میں قید رہے اور قلعے کی عمارتیں برباد و تباہ ہوگئیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد حیدرآباد کی مردم شماری اتنی بڑھی جس کی مثال اس کی گزشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ شہر کے گوشے گوشے میں نئی آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ''شاہ لطیف آباد'' جیسی آبادی حیدرآباد کا نیا حصہ بن گئی۔ کوٹری برج کی تعمیر، بڑے کارخانوں کا قائم ہونا، سندھ یونیورسٹی کا حیدرآباد میں منتقل ہونا، ریڈیو پاکستان کے علاقائی اسٹیشن اور کمشنری کا قیام اس دور کے اہم واقعات ہیں۔ اس دورِ ترقی میں حیدرآباد ایک مرتبہ پھر نئی مرکزی حیثیت کا مالک بن رہا ہے جس کی آئندہ تاریخ کا جائزہ لینا قبل از وقت ہے۔''

سندھ کی ثقافتی اور سماجی تاریخ کا ایک دلچسپ مرقّع

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی زندگی کے علمی اور تصنیفی کاموں میں آخری اہم کام'' رهاڻ هيرن کاڻ ''یعنی ''ہیروں کی کان'' ہے۔ یہ کتاب دراصل سندھ کی ثقافتی اور سماجی تاریخ کا ایک دلچسپ مرقّع ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی عادت تھی کہ وہ کہیں بھی جاتے یا کوئی اگر ان سے ملنے آتا تو یادداشتیں نوٹ بک کی شکل میں محفوظ کر لیتے۔ ڈاکٹر صاحب کے پوتے جناب ارشد بلوچ نے راقم کو ایک ملاقات کے دوران بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد ان کے ذخیرے سے تقریباً چھ سو ڈائریاں اور نوٹ بکس ملی ہیں جن میں مختلف زبانوں میں تحریر کردہ یادداشتیں ان کے اپنے قلم سے موجود ہیں۔ اس دلچسپ کتاب کی مختلف اوقات میں اور مختلف اداروں سے

دس جلدیں شائع ہوئیں اور یہ جلدیں دراصل ڈاکٹر صاحب کی انہی قلمی یادداشتوں کی مدد سے وجود میں آئیں یہ دس جلدیں دراصل پچاس سالہ دور 1950ء تا 2000ء کے دوران سندھ کے عالموں، ہنرمندوں و دیگر اہل فن سے مختلف اوقات میں جو گفتگو ہوئی اور جو کام کی باتیں ڈاکٹر صاحب نے سنیں ان کا ریکارڈ ہے۔ اس کے علاوہ سندھ کے دیہاتوں، شہروں اور مختلف علاقوں میں ڈاکٹر صاحب نے جن جن محافل میں شرکت کی اور ان محافل میں جو اہم باتیں سنیں ان کا بھی یہ مستند ریکارڈ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان یادداشتوں کو دلچسپ ادبی رنگ میں لکھا ہے انھیں پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے کسی محفل میں گفتگو ہو رہی ہو اور ڈاکٹر صاحب اہل محفل سے خطاب کر رہے ہوں۔

مورخہ ۲۲ جون ۱۹۹۶ء کو ڈاکٹر بلوچ صاحب نے راقم الحروف سے دوران انٹرویو "ہیروں کی کان" سلسلے کو لکھنے کی وجوہات پر کچھ یوں روشنی ڈالی تھی:

> "میں نے دیکھا کہ ادب کے اونچے طبقے یعنی Higher Society میں بڑی بڑی باتیں کی جاتی ہیں لیکن عام انسانوں کی باتیں کوئی نہیں کرتا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں ان عام انسانوں کی باتیں انھی کے الفاظ میں لکھی جائیں۔ "ہیروں کی کان" سلسلے میں میں نے ان ان موضوعات پر لکھا جو بڑی کتابوں میں نہیں آسکتے۔ یہ کام میں نے ذاتی شوق کی بنا پر کیا ہے اور اس کام کو کرنے کے لیے ضروری تھا کہ جن لوگوں کی باتیں لکھی جا رہی ہیں، لکھنے والے کو ان سے ہمدردی ہو۔" (۴)

ڈاکٹر صاحب کی تحریر کا انداز کچھ ایسا ہے کہ جیسے بات میں سے بات نکل رہی ہو اور قاری کو نئی نئی معلومات مل رہی ہوں۔ یہاں ہم اس کتاب کی ہر جلد کے مشمولات کا ذکر کریں گے جس سے اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب نے مختلف موضوعات کے تحت ان کتابوں میں کس قدر دلچسپ معلومات جمع کر دی ہیں:

پہلی جلد:

ضخامت: 185 صفحات　　　　اشاعت: 2000ء

پہلی جلد کے چند موضوعات درج ذیل ہیں:

(۱) اپنی سوچ کے پیمانے کو وسیع رکھو (۲) چاہت ہی چاہت کو بلاتی ہے (۳) سندھ کے الگ الگ حصوں کے مقامی نام (۴) دینے والا اور مانگنے والا (۵) سندھ کی تاریخ (۶) سندھی زبان (۷) سندھ کی نامور عورتیں (۸) دانا اور عقلمندوں کے اشعار (۹) گلی کوچے میں غزل (۱۰) جوانی (۱۱) ہنرمند، شاعر اور قصے (۱۲) بہادر اور بہادری (۱۳) کافی اور سندھ کی گائیکی (۱۴) ظرافت، خوش طبعی اور تمسخر (۱۵) سندھ کی پہلوانی کا دنگل (۱۶) بدین کی محفل

دوسری جلد:

ضخامت: 174 صفحات اشاعت: 2001ء

دوسری جلد کے چند موضوعات درج ذیل ہیں:

(۱) سندھی لفظ کچھری (۲) تاریخ (۳) سامراجی حکومت کے خلاف سندھ کا خلافت تحریک میں بھرپور حصہ (۴) تاحیات بہادر صبغۃ اللہ (۵) زمانہ بدل گیا (۶) جوہر شناس چلے گئے (۷) سندھی زبان (۸) سندھ کی نباتات کا مطالعہ (۹) دیہاتی اور اس کی غذا (۱۰) غریبوں کی خوراک اور دیہاتی (۱۱) سندھ کے کھیل (۱۲) باتیں کشتی اور کشتی کے مقابلوں کی (۱۳) عوامی فلسفی (۱۴) اژدھے کا منکا (۱۵) یہ دنیا بازیگر کی بازی (۱۶) سندھ کی نامور عورتیں (۱۷) سندھ کے لوہاروں کی کاریگری (۱۸) سندھی مقامات (۱۹) گول لٹو اور ہم چور س سوراخ (۲۰) موسموں کا لوٹنا اور پیارے لوگوں کی یادیں

تیسری جلد:

ضخامت: 173 صفحات اشاعت: 2002ء

تیسری جلد کے چند موضوعات درج ذیل ہیں:

(۱) تاریخ (۲) سندھی لغات سے متعلق ایک تاریخی خط (۳) بڑے عالم اور عربی کے شاعر علی محمد مہیری (۴) جوہر شناس چلے گئے (۵) سندھ کے باز پالنے والے اور باز کی تربیت کرنے میں ان کی مہارت (۶) رسالے کی

محفل (۷) جنگ نامہ (۸) ظرافت، مزاح، ہنسنا اور خوشی (۹) سندھ کے چوپائے پالنے والے اور جانوروں کے نشانات لگانا (۱۰) سگھڑ شاعر اور قصے (۱۱) سندھ کے قبیلے اور نسب نامے (۱۲) سہتار (۱۳) راٹھور (۱۴) شنبانی (۱۵) نوحانی (۱۶) جاکھرا (۱۷) سمیجا (۱۸) جت بلوچ (۱۹) روس کا سفر (۲۰) اروڑ کے نیچے دریا کا بہنا اور پرانا دریا۔

چوتھی جلد

ضخامت: 152 صفحات اشاعت: 2003ء

چوتھی جلد کے چند موضوعات درج ذیل ہیں:

(۱) تاریخ (۲) تاریخ کے علمبردار (۳) سندھ کا آسمان (۴) نحس تارے اور وہم اور وسوسے (۵) چاند کی منزلیں اور تارے (۶) وہ ستارے جن کا نام ہوتا ہے (۷) چار بڑے ستارے قطب (۸) صبح کا ستارہ شام کا تارہ (۹) چار پائی (۱۰) حیرت انگیز باتیں (۱۱) ہماری معلومات اور علم میں اضافہ (۱۲) چاند، زمین اور آسمان کا سنگار (۱۳) جوہر شناس چلے گئے (۱۴) غازی فقیر سیال (۱۵) ظرافت اور خوش طبعی (۱۶) سندھ کے شہر نصرپور اور اگھم کوٹ (۱۷) مست وتایو فقیر (۱۸) سندھ کی جڑی بوٹیاں (۱۹) نواب غیبی خان کی محفل (۲۰) سندھ میں پانی کی پیاس اور امید (۲۱) جاوا سوماٹرا کا سفر (۲۲) سندھ کے قبیلے (۲۳) لاشاری، کل جانگ، راٹھوڑ

پانچویں جلد:

ضخامت 158 صفحات اشاعت: 2003ء

پانچویں جلد کے چند موضوعات درج ذیل ہیں:

(۱) تاریخ (۲) میاں نصیر کا فقیر شاہ وسایو (۳) رسالے فتحی میں قدیم اور نایاب سندھی نظم (۴) نامور عورتیں (۵) جوہر شناس چلے گئے (۶) (۷) (۸) سگھڑ شاعر اور قصے (۹) شاعر گلو میانہ (۱۰) تبدیلی اور ترقی کے رہنما (۱۱) حاجی سراج الدین سومرو۔ ٹیلوں پر گاڑیاں چڑھانے والا (۱۲) ظرافت اور مزاح (۱۳) سندھ میں

طب (۱۴) سندھ کا شاہی قلعہ رنی کوٹ (۱۵) سندھ کے نسب نامے اور قبیلے (۱۶) بدین اور نورائی کے جیلانی پیروں کا شجرۂ نسب (۱۷) سندھ کے مہکانی مری خاندان کا شجرہ نسب (۱۸) تھر کالڑیہ قبیلہ (۱۹) تھر کے سودے (۲۰) سندھ کی پہچان ہنر مند خاندان اور قبیلے (۲۱) نارو کی محفل

چھٹی جلد:

ضخامت: 158 صفحات　　　　اشاعت: 2005ء

چھٹی جلد کے چند موضوعات درج ذیل ہیں:

(۱) تاریخ (۲) بہادر صبغت اللہ شاہ کی شخصیت (۳) جوہر شناس چلے گئے (۴) سندھ میں تصوف کی تاریخ (۵) سندھی صوفی میاں مظفر فقیر (۶) ظرافت اور خوش طبعی (۷) گلن مستوئی اور بھینس کے نشان (۸) شیخ عبدالمجید سندھی کا بچپن (۹) مخدوم عبداللہ نڑئی اور ٹھٹھہ عالم (۱۰) نوح ہوتھیانی (۱۱) ہوتھی خاندان کے مشائخ (۱۲) مخدوم سانہ یا سعد (۱۳) شاہ یقیق بخاری (۱۴) میون عثمان عباسی (۱۵) حُروں کی انگریز حکومت کے ساتھ جنگ (۱۶) معجون شاہ عبداللطیف (۱۷) سندھ کے باورچی اور کھانے پکانے میں ان کی مہارت (۱۸) جنوں کی تلاش (۱۹) سندھ کے نسب نامے اور قبیلے لکی کے لکیاری سید، پالاری، گبول، کاچھی کے لغاری، آرسیر، درس، کھارو کی محفل

ساتویں جلد:

ضخامت: 150 صفحات　　　　اشاعت: 2007ء

ساتویں جلد کے چند موضوعات درج ذیل ہیں:

(۱) تاریخ (۲) بہادر صبغت اللہ شاہ کی آخری ہدایت (۳) حُروں کی انگریزوں سے گروہ در گروہ جنگ (۴) جوہر شناس چلے گئے (۵) سندھی نظم کی قسم منظوم بند (۶) ظرافت اور خوش طبعی (۷) شاعر ثناء اللہ ثنائی کی یاد میں (۸) نظمیں تصوف کے قانون میں (۹) سندھ کے قدیم شاعر اور لازوال حسن (۱۰) خواجہ خضر اور مہتر الیاس (۱۱) معلوم نہیں عشق کیا ہے؟ (۱۲) مشاعرہ (۱۳) قلمی کتابوں میں سندھ کے عالموں کی

تحریریں (۱۴) صاحبڈنو تتنیہ فقیر (۱۵) نسب نامے اور قبیلے (۱۶) ڈیرہ (۱۷) ناریجا (۱۸) باریچا (۱۹) ٹھٹھ شہر میں ذاتیں اور قبیلے (۲۰) چھپر کوہستان کے رند (۲۱) ماجھند (۲۲) اوٹھا، بکیرا (۲۳) چھپر کوہستان کی محفل

آٹھویں جلد:

ضخامت: اشاعت: 2008ء

آٹھویں جلد کے چند موضوعات درج ذیل ہیں:

(۱) تاریخ (۲) سندھ کے تاریخی آثار کی حفاظت (۳) شہید، بہادر صبغت اللہ شاہ پگارو کی انگریز سامراج کے ساتھ جنگ (۴) روز کا کام کامیابی سے پورا کرنے کے لیے بہادر صبغت اللہ شاہ کی تلقین (۵) نامور خواتین (۶) 1857ء میں انگریز گورنر جنرل کا فارسی اور سندھی میں اعلان (۷) غلام محمد خان بھرگڑی اور سندھ محمڈن ایسوسی ایشن (۸) وکرو کے بخاری سیّد (۹) ہالہ کنڈی کے بھٹی بزرگ (۱۰) جوہر شناس چلے گئے (۱۱) ظرافت اور خوش طبعی (۱۲) سندھ کا مشہور چوپایہ بھینس (۱۳) عوامی فلاسفر خمیسو متیلو (۱۴) میاں محمد علی پٹھان کا کلام (۱۵) فقیر غلام محمد ٹالپر اور فولاد فقیر (۱۶) سندھ کے نسب نامے اور قبیلے کرنانی، سما، درس، راجپر، جتوئی، شر براهوی، کھاڑک، بھیا کھوڑ، نوتیار، مندھرا، لنجا، سندھ کے پڑوسی علاقے کچھ کی محفل

نویں جلد:

ضخامت: 155 صفحات اشاعت: 2009ء

نویں جلد کے چند مشمولات درج ذیل ہیں:

(۱) تاریخ (۲) جوہر شناس چلے گئے (۳) سندھ کے عالموں کی عظمت (۴) علم و عرفان کے بغیر پڑھنے والوں کے لیے ہدایت (۵) سالک حمزہ کی کہی گئی تعریف (۶) گائے (۷) شاہ عبداللطیف کی دین داری (۸) سائیں احمد ملاح عشق کے میدان میں (۹) خودداری اور اخلاق کی بلندی (۱۰) فقیر رستم لغاری کا کلام (۱۱) ظرافت اور خوش طبعی۔ مزاحیہ کانفرنس سے استقبالیہ خطاب (۱۲) بڑی معلومات والا کھیل کود (۱۳) فقیر حاصل وسائے بولڈ کی پیشین گوئیاں (۱۴) مرغ کا اڑنا کب بند ہوا؟ (۱۵) نسب نامے اور قبیلے، ڈنور، تھرپارکر کے منجھانی شاہ، سنگھا

سویرہ ،نارے کے مچھیرے ،پھلیولڈ ،راجیس بولڈ، بھلبھرا ،مندھرا،شجرا گھمرا ،ھنجرا ،احمدانی ،رونجھے ،سنہڑہ ،بلوچوں کا قدیم شجرہ نسب، ناریجا، شنھااور براہنمائی، راہومہ(۱۶) تھر کی محفل

دسویں جلد:

ضخامت: اشاعت:2010ء

دسویں جلد کے چند موضوعات درج ذیل ہیں:

(۱) تاریخ (۲) جوہر شناس چلے گئے (۳) تذکرۃ العاشقین (۴) بہادر صبغت اللہ شاہ کے خلاف کی گئی بغاوت اور جھوٹا کیس (۵) زیریں سندھ کے تین اولیا (۶) شیخ حسین دیولی عرف پیر پٹھو(۷) شیخ ریحان (شیخ بھر کیو کا تیار (۸) چھوٹے چوپائے ،بھیڑ(۹) لوک ادب کو یاد کرتے ہوئے (۱۰) میاں نصیر محمد کے ساتھی میاں مانجھی سلطان (۱۱) عالم اور استاد دولہاری میاں (۱۲) سندھ کی درسگاہوں کے کتب خانے (۱۳) اپنے پڑوسی پرندے (۱۴) نسب نامے اور قبیلے ۔کاٹھ بابھن ٹنڈو رحیم خان کے جنگوں جمالی ،احمدانی لغاری ،کاٹھوڑ، کوریجا، ہنگورجا، مگلا ،گالہجہ، بگھیاڑ (کلمتی) تھر (کی گہرائی ،راجن شاہ ماتائی

رھاڻ هيرن کاڻ (’ہیروں کی کان‘ کی دس جلدیں جن کی اشاعتی تفصیل ہم نے گزشتہ صفحات میں بیان کی دو ضخیم جلدوں میں 2012ء میں محکمہ ثقافت حکومتِ سندھ کی جانب سے شایع ہوئیں۔

حواشی باب نمبر 16

۱۔ملاحظہ فرمائیں ڈاکٽر نبي بخش خان بلوچ - عالم ، اديب ،محقق ،مورخ ۽ سندس نظريہ ءتاريخ (ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ۔عالم،ادیب،محقق،مورخ اوران کانظریہ ءتاریخ) از ڈاکٹرعبدالغفارسومرو ،سہ ماہی مھراڻ جام شورو، ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ خاص نمبر، ص47

۲۔ملاحظہ فرمائیں فتح نامہء سنڌ عرف چچ نامو ترجمہ : مخدوم امیر احمد ، مقدمہ و مفصل حواشی: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ،سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد، اشاعت دوم ۱۹۶۶ء

۳۔پیر حسام الدین راشدی۔ فارسی،سندھی اوراردو کے نامور محقق اور کئی علمی کتابوں کے مصنف تھے۔آپ مورخہ ۲۰ رستمبر ۱۹۱۱ءکولاڑکانہ میں پیدا ہوئے اور مورخہ یکم اپریل ۱۹۸۲ءکوکراچی میں انتقال ہوا۔
پیر حسام الدین راشدی کی معروف کتب میں تحفۃ الکرام (ترجمہ وحواشی)،مکلی نامہ،فارسی زبان وادب،ہفت مقالہ،مرزاغازی بیگ ترخان اوراس کی بزم ادب اورتذکرہ شعرائے کشمیر شامل ہیں۔

۴۔ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کا یہ انٹرویو مورخہ ۲۲رجون ۲۰۰۶ء کوان کی رہائش گاہ واقع سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں ریکارڈ کیا تھا۔

باب نمبر 17

سندھی اساسی (کلاسیکی) شعرا کے کلام کا تحفّظ

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے سندھی زبان و ادب کے حوالے سے جو بڑے بڑے علمی منصوبوں کا آغاز کیا اور بڑی کامیابی سے انھیں مکمل کیا۔ ان میں سندھی زبان کے اساسی شعراء کے کلام کی تحقیق اور جدید اصولوں کے تحت ان کی تدوین بھی شامل ہے۔ سندھی زبان کے اساسی شعرا وہ ہیں جنھوں نے سندھ کے سب سے بڑے شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی سے قبل کے ادوار میں شاعری کی۔ یہ سب باکمال شعرا تھے۔

سندھی اساسی (کلاسیکی) شعراء کے کلام کی جمع آوری، تحقیق اور تحفظ کے کام کا آغاز شمس العلما ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتو نے تقسیم سے قبل کیا تھا اور دیگر اعزازات کے ساتھ ساتھ یہ اعزاز بھی ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے مقدر میں تھا کہ اس کام کو مکمل انھوں نے کیا۔(۱)

کسی بھی زبان کے اساسی یا کلاسیکی شعرا کے کلام کی بے حد اہمیت ہوتی ہے کیونکہ یہی کلام دراصل اس زبان کے ادب کو زندہ جاوید رکھتا ہے۔ سندھی اساسی شعرا کے کلام کی یہ بھی اہمیت ہے کہ اس کلام میں باشندگان سندھ کی اعلیٰ انسانی اور اخلاقی اقدار موجود ہیں۔ اب ہم ان اساسی شعراء کا علیحدہ علیحدہ ذکر کرتے ہیں جن کا کلام ڈاکٹر بلوچ صاحب نے بڑی محنت سے جمع، اور مدون کیا اور اسے محفوظ کیا۔

(۱) قاضی قادن کا رسالہ

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحقیق کے مطابق سندھی زبان کے اساسی شعرا کے سلسلے کا پہلا بڑا شاعر قاضی قادن (۲) تھا۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحقیق کے مطابق طویل عرصے تک قاضی قادن کے صرف سات اشعار ہی دستیاب ہو سکے تھے جن کا ذکر شاہ عبدالکریم کے ملفوظات کے مجموعے ''بیان العارفین'' میں موجود ہے۔ یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ قاضی قادن کے کلام کا بڑا ذخیرہ مشرقی پنجاب کے ایک مندر سے دستیاب ہوا جسے ہیرالال ٹھکر نے دہلی سے ۱۹۷۸ میں شائع کیا۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے جون 1979ء میں دہلی کا سفر کیا اور قاضی قادن کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں۔ قاضی قادن سندھی زبان کے وہ شاعر ہیں جنھوں نے سندھی شاعری کی روایات کو تبدیل کر کے اس میں صوفیانہ فکر اور علم و عرفان کے موضوعات کا آغاز کیا۔ اس کے علاوہ قاضی قادن کے کلام میں دانش مندی اور ذہانت کے نکتے بھی ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے قاضی قادن کے کلام سے قبل قاضی قادن کے حالات زندگی بھی تحقیقی انداز سے لکھے۔ 'قاضی قادن کا رسالہ' انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی جامشورو نے 1999ء میں شائع کیا۔

ڈاکٹر بلوچ مرحوم کا ایک اہم معلومات افزا مضمون بہ عنوان ''قاضی قادن کے کلام کا نایاب ذخیرہ'' روزنامہ عبرت حیدرآباد مورخہ 10 اکتوبر 1978ء میں سندھی زبان میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ قاضی قادن کے کلام کا نیا اور نایاب ذخیرہ ہندوستان کے صوبے ہریانہ کے ایک گاؤں میں ایک مندر سے قلمی صورت میں ملا ہے جسے دہلی کے لائق ادیب ہیرالال ٹھکر نے مرتب کر کے شائع کرایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ 500 سال کا عرصہ گزرنے کے بعد قاضی قادن کے کلام کا مزید حصہ دستیاب ہونا نہایت نیک فال ہے۔ اس سے قبل قاضی قادن کے صرف 7 یا 8 بیت موجود تھے جو شاہ عبدالکریم کے ملفوظات بیان العارفین اور شاہ جو رسالو میں موجود ہیں۔ اب اس نئے ذخیرہ کی دریافت کے بعد قاضی قادن کے سو سے زائد ابیات دستیاب ہوئے ہیں۔ کتاب کے مرتب ہیرالال ٹھکر کے مطابق قاضی قادن کے 112 مزید بیت دستیاب ہوئے ہیں قاضی قادن کے کلام کا جو نیا ذخیرہ دریافت ہوا ہے، وہ ایک بڑے قلمی مجموعے میں شامل تھا جو دادو دیال کے ایک بھگت نے جمع کرایا تھا اس نے موجود صوبہ ہریانہ کے ایک گاؤں میں ایک مندر بنایا اور وہاں یہ ذخیرہ

محفوظ کرایا تھا۔(۴)

قاضی قادن کا ذکر میر معصوم بکھری نے اپنی معروف کتاب ''تاریخِ معصومی'' میں کیا۔قاضی قادن کی وفات 1551ء میں ہوئی۔اس وقت میر معصوم بکھری کی عمر تقریباً 24 سال تھی۔قاضی قادن کے سوانح اور کلام پر معیاری تحقیق ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے کی۔ڈاکٹر بلوچ کی تحقیق کے مطابق قاضی قادن کا خاندان اہل علم کا خاندان تھا۔قاضی قادن کی جائے پیدائش بکھر ہے۔قاضی قادن نے قرآن مجید،تفسیر،حدیث،فقہ،تصوف اور دیگر علوم پر مہارت حاصل کی تھی۔ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تحقیق کے مطابق قاضی قادن نے اعلیٰ تعلیم اس وقت کے علمی مراکز ٹھٹہ،سیوہن اور گجرات کے شہروں نہر والہ(پٹن) اور احمد آباد میں حاصل کی تھی۔اس زمانے میں سندھ اور گجرات کے درمیان گہرے ثقافتی تعلقات تھے اور دونوں علاقوں کے طالب علم ایک دوسرے کے ہاں برائے حصول علم آتے جاتے رہتے تھے۔یہ تعلقات طویل عرصے تک جاری رہے۔تحصیل علم کے بعد قاضی قادن نے زندگی کے حقیقی معاملات میں ناموری حاصل کی۔انھوں نے بطور قاضی سندھ کے جن جن حکمرانوں کے ادوار دیکھے ان میں سمہ حکمران جام نظام الدین، جام فیروز اور ارغون حکمران شاہ بیگ اور شاہ حسن شامل ہیں۔ان حکمرانوں کے عہد میں اپنے وسیع علم اور دانش کی بنا پر وہ ان حکمرانوں کے بااعتماد آدمی کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔قاضی قادن عالم فاضل ہونے کے باوصف ایک صوفی بھی تھے۔وہ سیّد میراں محمد مہدی کے مرید ہوگئے تھے۔

قاضی قادن کے اشعار سب سے پہلے شاہ کریم نے اپنے مریدوں کے آگے پڑھے تھے جو شاہ کریم کے رسالے میں محفوظ ہوگئے۔یہ کل سات اشعار تھے۔1978ء میں دہلی سے ہیرالال ٹھکر نے ''قاضی قادن کا کلام'' نامی کتاب شائع کی جس میں قاضی قادن کے پہلی مرتبہ 112 نو دریافت اشعار پیش کیے۔یہ کلام مرتب کو صوبہ ہریانہ کے ایک مندر سے مخلوطے کی شکل میں ملے تھے۔ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے قاضی قادن پر معیاری تحقیق کی اور کئی دیگر مآخذ کی مدد سے قاضی قادن کی سوانح اور کلام پر مشتمل کتاب ''قاضی قادن کا رسالہ'' 1999 میں شائع کرایا جس میں 135 اشعار شامل ہیں۔ڈاکٹر بلوچ لکھتے ہیں کہ قاضی قادن کے کلام کی پرکھ معیار اس کی زبان ہے جو 16ویں صدی کے دور میں بکھر اور بالائی سندھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔قاضی قادن سندھ و ہند کے بڑے صوفی شاعر اور عارف تھے اور سندھ کی صوفیانہ فکر کے قائد تھے۔(۵)

(۲) شاہ لطف اللہ قادری کا کلام

شاہ لطف اللہ قادری کا کلام اور ان کی ایک نادر فارسی کتاب ''منهاج المعرفت'' کی دریافت بھی ڈاکٹر بلوچ صاحب کی کوشش سے ہی ہو سکی۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب اس حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ 1963ء میں وہ حافظ احمد لاکھو کے گاؤں تعلقہ میر پور بٹھورو گئے جہاں ان کے بزرگوں کا کتب خانہ دیکھا۔ حافظ احمد لاکھو نے بلوچ صاحب کو ایک قلمی کتاب دکھائی جس میں دیگر کتابوں کے علاوہ ''منهاج المعرفت'' بھی شامل تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مخطوطے کے حاصل کرنے کے بعد شاہ لطف اللہ قادری کا کلام بڑی محنت سے مرتب کیا جس میں اس کلام کا شاہ لطف اللہ قادری سے قبل اور بعد کے شعراء سے موازنہ بھی کیا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1968ء میں انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی جام شورو سے شائع ہوئی۔ (٦)

(۳) میین شاہ عنایت رضوی کا کلام:

شاہ عنایت اللہ عرف میین شاہ عنایت رضوی کا کلام اعلیٰ سندھی شاعری کا پہلا شاہکار ہے۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کے مطابق شاہ عنایت کے کلام کی اشاعت کلاسیکی سندھی شاعری کے میدان میں ایک بڑے انقلاب سے کم نہیں۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب سنہ 1944ء سے شاہ عنایت کے کلام میں گہری دلچسپی لے رہے تھے اور خواہش مند تھے کہ جدید تحقیقی اصولوں کی روشنی میں شاہ عنایت کے کلام کو مرتب کر کے شائع کروائیں۔ تب سے لے کر 1963ء تک ڈاکٹر صاحب شاہ عنایت کے کلام کی جمع آوری کے لیے کوشاں رہے اور اکتوبر 1963ء میں اسے جدید تحقیقی اصولوں کی روشنی میں مرتب کر کے پہلی مرتبہ سندھی ادبی بورڈ سے شائع کرایا۔ اس کتاب میں شاہ عنایت کے 469 بیت اور 42 وائیاں موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کی گہرائی کا اس حقیقت سے اندازہ لگائیں کہ اس کتاب کے لیے ڈاکٹر صاحب نے جو مفصل مقدمہ لکھا وہ 109 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مقدمے میں شاہ عنایت کے حالات زندگی، ان کے کلام کی خصوصیات اور شاہ عنایت اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کا تقابلی جائزہ بھی پیش کیا۔ (۷)

(۴) خلیفہ صاحب کا رسالہ

سندھی اساسی شعرا میں خلیفہ نبی بخش لغاری بھی ایک اہم شاعر گزرے ہیں جن کی پیدائش 1776ء میں اپنے آبائی گاؤں مٹھی میں ہوئی اور ان کا انتقال 1863ء میں ہوا۔ خلیفہ نبی بخش لغاری پیر صاحب پگارہ سید محمد راشد کے فیض یافتہ تھے اور سندھی زبان کے اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ خلیفہ نبی بخش لغاری نے سندھی کے علاوہ سرائیکی، ہندی، ریختہ ڈھاٹکی (تھر کے ایک علاقے کی زبان) اور اردو میں بھی شاعری کی۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے خلیفہ نبی بخش لغاری کا کلام بچپن میں اپنے نانا لعل بخش لغاری سے سنا تھا۔ اسی بنا پر خلیفہ نبی بخش کے کلام کی جمع آوری اور اس سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ خلیفہ نبی بخش کا کلام ان کی اولاد اور ان کی جماعت کے فقیروں تک ہی محدود تھا اور علمی حلقے عموماً اس سے باخبر نہیں تھے۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مرحوم نے بڑی محنت سے خلیفہ نبی بخش لغاری کا کلام ''خلیفہ صاحب کا رسالہ'' کے عنوان سے مرتب کیا۔ اس کتاب میں خلیفہ نبی بخش لغاری کے 745 بیت اور 101 وائیاں موجود ہیں۔ خلیفہ صاحب کا رسالہ سندھی ادبی بورڈ جامشورو نے 2005ء میں شائع کیا۔ (۸)

(۵) کلّیاتِ حمل

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی کوشش سے سندھی اساسی شعرا میں سے ایک اہم شاعر حمل فقیر لغاری کا کلام کتابی صورت میں محفوظ ہوا۔ حمل فقیر لغاری نے سندھی کے علاوہ سرائیکی میں بھی شاعری کی۔ ان کے کلام میں تصوف ،فقیری، عشق، جذب لوک روایات اور اس طرح کے دیگر موضوعات موجود ہیں۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے کلیات حمل کے دیباچے میں لکھا کہ خود ان کا تعلق بھی لغاری قبیلے سے تھا اس لیے حمل فقیر لغاری کے کلام کی تلاش و تحقیق اور اس کلام سے دلچسپی انہیں بچپن سے ہی ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کو حمل فقیر کے حالات زندگی کی تحقیق سے بھی دلچسپی تھی اور پہلی مرتبہ 1951ء میں اپنے مضامین کی شکل میں فقیر حمل لغاری کے حالات اور کلام رسائل میں شائع کرائے۔ اس کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب حمل فقیر کے کلام کی تلاش کرتے رہے اور اس تلاش کے

دوران انہیں ایک بیاض بھی ملی جس کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب نے حمل فقیر کے کلام کو سندھی، سرائیکی اور ہندی کلام کو جدا جدا کیا اور اسے ''کلیات حمل'' کے عنوان سے شائع کرایا۔کلیات حمل پہلی مرتبہ سندھی ادبی بورڈ نے 1961ء میں شائع کی۔(۹)

(۶) شاہ شریف بھاڈائی کا رسالہ:

شاہ شریف بھاڈائی کا کلام 24 سُروں میں موجود تھا جبکہ کچھ کلام ضائع بھی ہوگیا لیکن ڈاکٹر بلوچ صاحب کی محنت اور تحقیق کے نتیجے میں یہ کلام 1972ء میں پہلی مرتبہ انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی سندھ یونیورسٹی جام شورو سے شائع ہوا۔اس کتاب میں شاہ شریف کے 1268 بیت اور 112 وائیاں محفوظ ہیں، شاہ شریف کے کلام میں جن موضوعات پر ان کی شاعری ہے ان میں توحید اور معرفت شامل ہیں۔(۱۰)

(۷) غلام محمد خانزئی کا رسالہ:

یہ کتاب سندھی اساسی (کلاسیکی) شعرا کے سلسلے کے آخری شاعر غلام محمد خانزئی کے کلام کا مجموعہ ہے۔یہ کلام ڈاکٹر بلوچ صاحب کی محنت سے پہلی مرتبہ کتابی شکل میں محفوظ ہوا۔ڈاکٹر بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ رسالہ شاہ عبداللطیف کے رسالے کی تعبیر یا تفسیر کہی جاسکتی ہے۔غلام محمد خانزئی اندازاً 1250ہجری میں پیدا ہوئے۔خانزئی دراصل بلوچ قبیلہ بروہی کی نسل میں تھے اور یہ پیر جھنڈا کے مرید تھے غلام محمد خانزئی کا رسالہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی تحقیق سے پہلی مرتبہ بھٹ شاہ ثقافتی مرکز نے 1985ء میں شائع کیا۔(۱۱)

(۸) کلام فقیر نواب محمد لغاری:

نواب ولی محمد لغاری ۱۱۶۵ہجری میں آبھپور (تعلقہ سنجھورو) میں پیدا ہوئے۔وہ بیک وقت ایک قادرالکلام شاعر، نثرنویس اور سیاست دان ہونے کے باوصف دیگر کئی علوم وفنون کے ماہر تھے۔ان کا انتقال ۱۸۲۳ء میں لاڑکانہ میں ہوا۔

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے بڑی محنت سے نواب ولی محمد خان لغاری کا کلام جمع کیا اور تقریباً ۱۸۰ صفحات پر مشتمل عالمانہ مقدمہ لکھا جس میں نواب ولی محمد لغاری کے حالات زندگی کے علاوہ ان کے بزرگوں کے حالات اوران کی اولاد کے حالات بھی لکھے۔اس کے علاوہ نواب ولی محمد لغاری کے کلام کی خصوصیات اور محاسن پر بھی روشنی ڈالی۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی۔

(۹) کلّیاتِ سانگی:

یہ کتاب میر عبدالحسین سانگی کے کلام کا مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر بلوچ نے چھے مختلف بیاضوں سے بڑی محنت سے نقل کیا اورایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا۔اس مفصل مقدمے میں ڈاکٹر بلوچ نے میر عبدالحسین سانگی کی سوانح خصوصاً ولادت، بچپن، تعلیم، نوجوانی کے زمانے کا عشق، بڑھاپا اور وفات کا ذکر کیا۔اس کے علاوہ سانگی کی شخصیت، کرداراور زندگی کے دیگر پہلوؤں پر عالمانہ انداز سے روشنی ڈالی۔ یہ کتاب ۱۹۶۹ء میں سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سے شائع ہوئی۔

(۱۰) خلیفہ غلام نبی کا کلام:

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کو ۱۹۶۵ء میں دوران تحقیق ایک مخطوطے کے آخر میں خلیفہ غلام نبی کا کلام ملا تھا۔ یہ قلمی رسالہ شہر دھوراجی (جوناگڑھ) کے باسی فقیر محمد بن حاجی ولی محمد نے ۱۳۱۹ ہجری میں نقل کیا تھا۔اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کو سانگھڑ کے باسی فقیر میر محمد نظامانی سے خلیفہ غلام نبی کے کلام کا ایک اور مخطوطہ ملا۔ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت سے ان نسخوں کی مدد سے خلیفہ غلام نبی کا کلام مرتب کیا اور ابتدا میں ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا۔اس کتاب کو حُر ہسٹاریکل سوسائٹی سانگھڑ نے ۲۰۱۰ء میں شائع کیا۔

(۱۱) راگناموں:

یہ کتاب فقیر محمد صدیق کے آغاز کردہ راگ کی یادگار ہے۔فقیر محمد صدیق نے درگاہ شاہ عنایت

شہید (جھوک شریف) پر روحانی راگ کی محفل کا آغاز کیا تھا۔ڈاکٹر بلوچ نے استاد حاجی سومر خان کی معاونت سے جناب عطاء اللہ ستاری (سجادہ نشین درگاہ جھوک شریف) سے 'راگ ناموں' کا قلمی نسخہ حاصل کیا اور اسے بڑی محنت سے مرتب کیا۔ابتدا میں ایک مقدمہ بھی لکھا جس میں اس کتاب کی اہمیت اور قلمی نسخے کے حصول کے بارے میں لکھا۔یہ کتاب پہلی مرتبہ بھٹ شاہ ثقافتی مرکز سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی۔اس کا دوسرا ایڈیشن محکمہء ثقافت حکومتِ سندھ کی جانب سے ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔

(۱۲) سیف الملوک عرف سیفلنا موں:

یہ کتاب سرائیکی زبان کا بہترین شاہکار ہے۔اس میں لطف علی کے 'سیف الملوک اور بدیع الجمال' کو مولوی محمد صدیق رانی پوری نے مرتب کیا تھا۔اس کتاب کی خاطر مفصل اور عالمانہ مقدمہ ڈاکٹر بلوچ نے لکھا جس میں کتاب کے محاسن کے علاوہ اس کتاب کے دیگر نسخوں کا بھی ذکر کیا۔اس کتاب کو سندھی رسم الخط میں سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا تھا۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی محنت اور جستجو کے نتیجے میں سندھی اساسی شعرا کا کلام جو مختلف مقامات پر بکھرا ہوا تھا ہمیشہ کے لیے کتابی شکل میں محفوظ ہو گیا اور اس کا افادہ بھی عام ہوا۔اس کے علاوہ سرائیکی زبان کا ایک اہم شاہکار بھی شائع ہو کر محفوظ ہو گیا۔

حواشی باب نمبر 17

۱۔ ملاحظہ فرمائیں مضمون سنڌي اساسي شاعري ۽ ڊاڪٽر نبي بخش خان بلوچ (سندھی اساسی شاعری اور ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) از ڈاکٹر ناہید پروین، سہ ماہی مھراڻ جام شورو۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ خاص نمبر، ص 326

۲۔ قاضی قادن بن قاضی ابوسعید بن زین العابدین بکھری حافظ قرآن اور مختلف علوم کے ماہر تھے۔ جب ۹۲۳ ہجری میں ٹھٹہ پر مرزا شاہ بیگ ارغون نے چڑھائی کی تو قاضی قادن کی کوششوں سے ٹھٹہ کے باشندوں کو امان نصیب ہوئی۔ قاضی قادن نے جام فیروز سمہ، مرزا شاہ بیگ ارغون، مرزا شاہ حسن اور سلطان محمود بکھری کے ساتھ زندگی گزاری۔ مرزا شاہ بیگ ارغون قاضی صاحب پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ اس کی وفات ۹۲۸ ہجری کے بعد اس کے فرزند مرزا شاہ حسن نے قاضی صاحب کو بکھر کا قاضی مقرر کیا۔ قاضی صاحب فیصلے انتہائی دیانت داری اور شرع کے مطابق کرتے تھے۔ جب سیّد محمد جونپوری سندھ میں آئے تو قاضی قادن ان کے مرید ہو گئے۔ قاضی قادن سندھی زبان کے قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ انھوں نے پیرانہ سالی میں بکھر کی قضا کے عہدے سے استعفٰی دے کر اپنے آپ کو یادِ الٰہی میں مشغول کر لیا تھا۔ ان کا انتقال ۹۵۸ ہجری میں ہوا۔

۳۔ ملاحظہ فرمائیں روزنامہ عبرت حیدرآباد، مورخہ ۱۰/ا اکتوبر ۱۹۷۸

۴۔ ملاحظہ فرمائیں سنڌي اساسي شاعري ۽ ڊاڪٽر نبي بخش خان بلوچ (سندھی اساسی شاعری اور ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ) از ڈاکٹر ناہید پروین، سہ ماہی مھراڻ جام شورو۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ خاص نمبر، صفحہ نمبر 326

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً 329

۷۔ ایضاً 330

۸۔ ایضاً 331

۹۔ ایضاً 332

۱۰۔ ایضاً 333

۱۱۔ایضاً

باب نمبر 18

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی
فارسی اور عربی زبانوں میں خدمات

بیسویں صدی میں سندھ میں کئی دانشور اور اہلِ علم ایسے تھے جنھوں نے علم و تحقیق کی شمعیں روشن کیں اور اپنی محنت اور عزم سے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان علما اور محققین میں دو ایسے نام ہیں جو تحقیق کے شعبے میں نمایاں کارناموں کی وجہ سے معروف ہیں۔ ان دو میں پہلا نام شمس العلما ڈاکٹر عمر بن محمد بن محمد داؤد پوتہ کا اور دوسرا نام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا ہے۔ ان دو محققین میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا کام کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ اس علمی و تحقیقی کام کا خلاصہ ہم نے پیشِ نظر کتاب کے باب نمبر ۱۱ میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی مرتبہ، مؤلفہ اور مدون کتب کی تعداد اور ان میں اعلیٰ علمی تحقیقی شان آپ کو تمام محققین سے ممتاز کرتی ہے۔ دیگر زبانوں کے علاوہ بلوچ صاحب نے فارسی اور عربی زبانوں میں بھی تحقیقی کارنامے انجام دیے جو اب تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان دونوں زبانوں میں سے بلوچ صاحب کا زیادہ کام فارسی زبان میں موجود ہے اور اس زبان میں بھی سب سے زیادہ کام تاریخ سندھ کے فارسی ماخذات سے متعلق ہے۔

سندھ اور ایران کی باہمی قربت کی وجہ سے صدیوں سے ایک دوسرے سے قریبی تعلق رہا ہے۔ ایرانی ادبیات اور فارسی زبان کے سندھ پر اثرات آج بھی قدیم عمارات پر واضح ہیں۔ سندھ میں سومروں کا دور نہایت

اہم دور کہلاتا ہے۔ اسی عہد میں فارسی زبان و ادب سے سندھ کے تعلق کا آغاز ہوتا ہے۔ سومروں کے بعد سمہ حکمرانوں کا دور آیا، جس عہد میں فارسی زبان کے سندھ میں مزید شعرا کا پتہ چلتا ہے۔ سمہ عہد کے بعد سندھ میں ارغون عہد آیا جس دوران فارسی زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوگئی۔ یہ سرپرستی ارغون عہد سے شروع ہوکر میروں کے عہدِ زوال تک باقی رہی اور اس دور میں فارسی زبان و ادب اور فارسی میں تاریخ پر بے انتہا کام ہوا۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ کراچی سے فارسی اخبارات کا بھی اجراء ہوا اور فارسی عام بول چال کی زبان بنی۔(۱)

قیامِ پاکستان کے بعد کے عہد میں عربی کی طرح فارسی پر بھی زوال آیا اور اب سندھ میں فارسی صرف ماضی کا حصہ بن چکی ہے، حال سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی علمی خدمات سندھی، اردو، انگریزی اور عربی کے علاوہ فارسی زبان میں بھی کیفیت اور کمیّت دونوں لحاظ سے ناقابلِ فراموش ہیں۔ یہاں ہم ڈاکٹر صاحب کی فارسی زبان میں مرتب اور تحقیق شدہ کتب کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں۔

فتح نامۂ سندھ عرف چچ نامہ

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا سندھ میں فارسی زبان و ادب کے آغاز کے نشانات سومروں کے دور سے ملتے ہیں۔ سندھ میں سومروں کے دور کا آغاز 1010ء (401ہجری) سے ہوتا ہے۔ یہ دور تین صدیوں سے زائد عرصے تک باقی رہا۔ علی بن حامد کوفی نے اس عہد میں فارسی زبان میں کتاب ''چچ نامہ'' کا ترجمہ مکمل کیا۔ اس کے علاوہ محمد بن عوفی نے فارسی میں شعراء کا تذکرہ ''لباب الالباب'' مرتب کیا۔ یہ کتاب 1984ء میں تہران سے استاد سعید نفیسی کی تحقیق کے بعد شائع ہوئی۔(۲)

قباچہ کے دربار کی دوسری یادگار کتاب ''چچ نامہ'' ہے۔ یہ کتاب اصل میں کسی عرب مصنف نے عربوں کی فتح سندھ کے بارے میں عربی زبان میں لکھی۔ کس نے اصل کتاب لکھی اس بارے میں زیادہ معلومات میسر نہیں ہیں البتہ عربی کتاب کا فارسی ترجمہ علی بن حامد کوفی نے سن ۶۱۳ ہجری بمطابق ۱۲۱۶ء میں مکمل کیا اور اسے قباچہ کے وزیر کے بیٹے عین الملک فخر الدین حسین کے نام سے منسوب کیا۔ شبہ ہے کہ اصل کتاب کا نام ''فتح نامۂ سندھ'' تھا اور فارسی میں ترجمہ ہوا تو ''چچ نامہ'' رکھا گیا۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ کتاب میں راجہ چچ کا کافی ذکر ملتا

ہے۔ سندھ کی تاریخ کے بارے میں یہ پہلی دستاویزی تحریر ہے نہ صرف اتنا بلکہ پورے برصغیر پاک و ہند میں تاریخ کے بارے میں یہ اوّلین تحریری ماخذ نظر آتا ہے۔ اس کے بعد ہی اس خطے میں تحریری کتابیں لکھنی شروع ہوئیں۔ کتاب میں اسلام سے پہلے کے سندھ کے دو حکمران خاندانوں رائے گھرانے اور برہمن خاندان کے مفصل حالات ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ عرب فتوحات کا تفصیلی مواد بھی اس کتاب کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اس کتاب سے سندھ کی تاریخ نویسی کا آغاز ہوا اور پھر ہر دور کے مؤرخ نے ''چچ نامہ'' کا مطالعہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس کے بعد تاریخ نویسی کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا چنانچہ یہ سلسلہ میر معصوم شاہ بکھری سے ہو کر خان بہادر خداداد تک پہنچا۔

''چچ نامہ'' دراصل ایک عربی کتاب کا فارسی ترجمہ ہے۔ عربی کتاب ''فتح نامۂ سندھ'' کے نام سے معروف ہے۔ اصل عربی کتاب مرورِایام سے ناپید ہوگئی اور اس کا فارسی ترجمہ ''چچ نامہ'' کے نام سے علی بن حامد کوفی نے کیا جو محفوظ ہے۔ ''چچ نامہ'' کہلانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں راجہ چچ کا کئی مقامات پر ذکر موجود ہے۔ یہ کتاب نہ صرف سندھ بلکہ برصغیر پاک و ہند مسلمانوں کی تاریخ کے حوالے سے اوّلین ماخذ ہے۔ اس کتاب کے بعد ہی اس خطے میں تاریخ نگاری کا آغاز ہوا۔ کتاب میں عربوں کی فتح سندھ سے قبل کے حکمرانوں کا احوال بھی ملتا ہے۔ نیز محمد بن قاسم کی سربراہی میں عربوں کی فتح سندھ (93ہجری) کی تفصیلات موجود ہیں۔ اس کے بعد کی عرب فتوحات کا ذکر بھی کتاب میں موجود ہے۔ (۳)

جدید دور شروع ہوتے ہی ''چچ نامہ'' کی اہمیت اجاگر ہونے لگی۔ ایلٹ نے ۱۸۵۱ء میں ہند کے بارے میں تاریخ کا خاکہ آٹھ جلدوں میں اس عنوان سے شایع کیا:

History of India as told by its own Historians

الیٹ کی اس کتاب کی جلد اوّل میں اس نے کتاب پر روشنی ڈالی اور کچھ اقتباسات انگریزی میں بھی ترجمے کیے۔

شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ مرحوم نے ''چچ نامہ'' کو مکمل طور پر انگریزی میں ترجمہ کیا جسے ۱۹۰۰ء میں کمشنر پریس کراچی نے شائع کیا۔ آگے چل کر مرزا صاحب نے اس کو دو حصوں میں سندھی میں شائع کیا۔ اس کے

باوجود بھی علی کوفی کے اصل فارسی ترجمے کی اشاعت شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ اس ضرورت کے تحت ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ صاحب نے ''چچ نامہ'' کا فارسی ایڈیشن تیار کیا جسے حیدرآباد دکن کی ''مجلس مخطوطات فارسیہ'' نے سن ۱۹۳۹ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مقدمہ نگاری سے لے کر تالیفات تک پورا کام فارسی زبان میں مکمل کیا۔ سندھی ادبی بورڈ نے اس ایڈیشن کی مدد سے ''چچ نامہ'' کے سندھی اور اردو ترجمے شائع کیے۔ اس کے باوجود بھی علمی دنیا کو اس کتاب کے مزید مستند اور معتبر فارسی ایڈیشن کی ضرورت محسوس ہوئی۔

۸۰۔۱۹۷۹ء کے دوران حکومتِ پاکستان نے پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کے وقت ''نیشنل ہجرہ کمیٹی'' تشکیل دی جو بعد میں کونسل ہوگئی اور جس کے مشیر ممتاز عالم ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ تھے۔ موصوف نے ہجرہ کمیٹی میں موقع کی مناسبت سے علمی و تحقیقی منصوبے بنائے۔ ان منصوبوں میں ایک پراجیکٹ کے تحت پاک و ہند کی اسلامی تاریخ کو پچیس جلدوں میں پیش کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ اس اسکیم کے تحت پہلی جلد ''سندھ میں مسلمانوں کی آمد'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس جلد کو پھر تین حصوں میں بانٹا گیا:

۔حصہء اوّل ''چچ نامہ'' کا فارسی ایڈیشن؛

۔حصہء دوم اس کا انگریزی ترجمہ

۔حصہء سوم اسی کتاب کا عربی ترجمہ

اس طرح ''فتح نامہ سندھ'' عرف ''چچ نامہ'' کا جدید فارسی ایڈیشن تیار ہوا جسے اسلام آباد کے قومی ادارہ برائے تاریخ و تمدن نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔

کئی برس قبل ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اس کتاب کے سندھی ادبی بورڈ کے لیے کیے گئے اردو اور سندھی تراجم پر نظرِ ثانی کی تھی اور وضاحتی، علمی اور تاریخی حاشیے تحریر کیے تھے۔ اس وقت ہی انہیں ''چچ نامہ'' کے جدید اور مکمل فارسی ایڈیشن کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اس طرح کچھ اور اسباب بھی تھے جن کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے اس کام پر توجہ دی۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کا خیال تھا کہ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم نے یہ علمی کام نہایت عجلت میں پورا کیا ہے۔ اس لیے کتاب کا ان کا مرتبہ ایڈیشن نامکمل تھا۔ اس سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی میں محفوظ سن ۱۰۶۱ء کا نقل شدہ ''چچ نامہ'' کا مخطوطہ بھی جدید ایڈیشن کے لیے ایک جواز پیدا کرتا رہا۔ قلمی نسخوں میں اس کتاب کا یہ قدیم ترین نسخہ ہے جو دنیا میں

موجود ہے۔ڈاکٹر داؤد پوتہ نے بھی اس قدیم ترین نسخے کو استعمال کیا ہے لیکن اسے اتنی اہمیت نہیں دی لہٰذا ڈاکٹر بلوچ نے اس قدیم نسخے کو اساس بنا کر اور مزید دو نسخوں کو استعمال کر کے ''چچ نامہ'' کا نیا متن تیار کیا۔ یہ دو نسخے ڈاکٹر داؤد پوتہ کو دستیاب نہیں ہوئے تھے۔

اس کے علاوہ کتاب کے درست اور مکمل متن تیار کرنے کے لیے بڑی تعداد میں عربی ادبی تاریخی مآخذات کو استعمال میں لایا گیا ہے تاکہ نقل کرنے والوں کی غلطیوں کا ازالہ کیا جا سکے۔ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اس ایڈیشن کے حوالے سے لکھا تھا کہ متن کی صحت کے سلسلے میں انہیں کافی کامیابی حاصل ہوئی۔اس ایڈیشن میں تمام قلمی نسخوں کے اختلاف آخر میں دیے گئے ہیں جس کی وجہ سے کتاب کا صاف ستھرا متن تیار ہو گیا ہے۔موجودہ متن کی خاص خوبی یہ ہے کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے انگریزی زبان میں ۱۸ صفحات کے مقدمے سمیت ۱۵۸ صفحات پر مشتمل تاریخی اور وضاحتی حاشیے دیے۔اس کے علاوہ مختصر مقدمہ فارسی زبان میں بھی لکھا گیا۔

اس طرح ڈاکٹر بلوچ صاحب کی جدوجہد اور محنت سے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی اس اہم ترین تاریخ کا مستند فارسی متن مع حواشی شایع ہو سکا۔ڈاکٹر بلوچ صاحب نے کتاب کا انتساب ڈاکٹر داؤد پوتہ اور اپنے استاد محترم علامہ عبدالعزیز میمن کے نام کیا۔(۴)

''چچ نامہ'' کی مکمل تحقیق کے بعد بلوچ صاحب نے چند اہم نتائج تحریر فرمائے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ عربوں کی فتح سندھ کے بارے میں ''چچ نامہ'' مفصل تحریری دستاویز ہے۔ یہ معلومات کسی اور کتاب میں دستیاب نہیں۔اس طرح یہ کتاب برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی پہلی مستند دستاویز کہی جا سکتی ہے۔

2۔ سندھ کی فتح کی خاطر کافی پہلے سے تیاری کی گئی تھی جس میں جنگی حکمتِ عملی کا بھرپور خیال رکھا گیا تھا۔اس مقصد کے لیے بحری قوت کا استعمال بھی کیا گیا۔نہایت معتبر فوجی سربراہوں کی خدمات حاصل کی گئیں جو ایک کے سوا تمام اپنے کمانڈر (محمد بن قاسم) سے وفادار رہے۔

3۔ جنگ کی خاطر سندھ اور عراق کے مابین بہترین مواصلاتی نظام قائم کیا گیا تھا۔

عراق کے شہر ''واسط'' میں حجاج بن یوسف کے دفتر کو ملٹری ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال

کیا گیا۔

4۔ اس دور میں سندھ میں بدھ مذہب کے پیروؤں کی اکثریت تھی جو برہمن حکمرانوں کے ظلم وستم کی وجہ سے ان سے سخت نفرت کرتے تھے۔ ان بدھ مذہب کے پیروکاروں نے عرب فاتحوں کی بھرپور مدد کی تھی۔

5۔ سندھ میں اسلام کی آمد سے قبل ہمسایہ ریاستوں مثلاً کشمیر، جیسلمیر، قنوج، کھمبات اور گجرات کے بارے میں قیمتی معلومات اور سندھ سے ان ریاستوں کے تعلقات کے بارے میں قیمتی معلومات بھی اس کتاب سے ملتی ہیں۔ (۵)

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلوچ صاحب کا تیار کردہ ''چچ نامہ'' کا یہ متن اب تک اس کتاب کا مستند ترین اور محقق نسخہ ہے۔

حاصلِ النّہج

سندھ میں سمہ حکمرانوں کا دور 1520ء میں ختم ہوا۔ اس کے بعد ارغون دور شروع ہوتا ہے جو 1736ء تک جاری رہا۔ ارغون دور سے ہی سندھ میں فارسی زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی۔ ارغون عہد کے بعد میاں نور محمد کلہوڑو نے مقامی حکومت کا آغاز کیا۔ یہ دونوں عہد سندھ میں فارسی زبان کی ترقی اور ترویج کے سنہری ادوار کہے جا سکتے ہیں۔ اسی زمانے میں ایران، خراسان اور وسط ایشیا سے سینکڑوں شعرا، ادبا اور علما سندھ میں آئے۔ ان حضرات نے فارسی زبان میں تاریخ، تبصرے اور دواوین کی شکل میں اپنی بہترین تخلیقات پیش کیں۔ اسی زمانے میں مخدوم نوح ہالائی نے فارسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا جو سندھی ادبی بورڈ کے تحت شائع ہو چکا ہے۔

سندھ کے ایک اور نامور عالم مخدوم جعفر بوبکائی (۶) نے فارسی میں کئی کتب تصنیف فرمائیں۔ مخدوم جعفر کا تعلق بوبک (نزد دادو) سے تھا اور انہوں نے علم اور تعلیم کے موضوع پر بیش بہا تصنیفی سرمایہ چھوڑا۔ مخدوم جعفر عربی زبان کے بھی عالم تھے۔ انہوں نے عربی میں طریقۂ تعلیم کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب نہج التّعلم تصنیف فرمائی۔ بعد ازاں اس ضخیم عربی کتاب کا حاصل النہج کے نام سے فارسی زبان میں خلاصہ تیار کیا۔

حاصل النھج صفر 976ء میں مکمل ہوئی۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے نھج التّعلّم کو برصغیر پاک و ہند میں طریقۂ تعلیم پر اوّلین کتاب قرار دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب اپنی دیگر حیثیات کے ساتھ ساتھ ایک ماہرِ تعلیم بھی تھے۔ آپ نے تعلیم کے حوالے سے نہ صرف بہت سے عملی کام کیے بلکہ علمی کام بھی۔ آپ کے علمی کاموں میں حاصل النھج کی اشاعت بھی شامل ہے۔ آپ نے بڑی کوشش کے بعد حاصل النھج کا مخطوطہ تلاش کیا اور انگریزی زبان میں ایک عالمانہ مقدمے کے ساتھ 1969ء میں سندھ یونیورسٹی شعبۂ تعلیم کی جانب سے شائع کیا۔ اس زمانے میں بلوچ صاحب اسی شعبے کے سربراہ تھے۔

اس اہم کتاب کا سندھی ترجمہ ڈاکٹر عبدالرسول قادری صاحب نے کیا جسے 1993ء میں سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد نے شائع کیا۔

ماہرِ مخطوطات ڈاکٹر محمد ادریس سومرو صاحب کی تحقیق کے مطابق مخدوم جعفر بوبکائی کی اصل عربی کتاب نھج التّعلّم کا ایک مخطوطہ نسخہ مولانا آزاد عربک اینڈ پرشین انسٹی ٹیوٹ ٹونک میں محفوظ ہے۔

بیگلار نامہ (1017ء)

''بیگلار نامہ'' سندھ کے ایک اہم دور کی نہایت اہم تاریخ ہے۔ سندھ میں سمہ حکمرانوں کے زوال کے بعد ارغون عہد میں وسط ایشیا سے بڑی تعداد میں قبیلوں اور خاندانوں نے ہجرت کر کے سندھ کو اپنا مسکن بنایا۔ ان لوگوں نے سندھ میں اپنی جاگیریں بھی بنائیں۔ ان لوگوں میں ارغونوں کا ''بیگلار خاندان'' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی خاندان کا ایک فرد ادارکی بیگلاری تھا جو بیک وقت بہترین مصنف اور شاعر تھا۔ اس نے ''بیگلار نامہ'' لکھ کر اپنے خاندان کی تاریخ محفوظ کی ہے۔ بیگلار خاندان کے تین افراد کو بڑی شہرت ملی:

(1) شاہ قاسم خان جن کے حالات کی بابت ''بیگلار نامہ'' کتاب لکھی گئی

(2) میر ابوالقاسم سلطان۔ جن کی فرمائش پر ''مثنوی چنیسر نامہ'' لکھی گئی۔

(3) میر شاہ مقیم سلطان۔ جن کی تحریک پر اور جن کی روایتوں کی بنا پر ''بیگلار نامہ'' کتاب تصنیف کی گئی۔

بظاہر یہ ایک خاندان کی تاریخ ہے لیکن فی الحقیقت اسے تاریخِ سندھ کے ایک اہم ماخذ کی حیثیت

حاصل ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بیگلاروں نے سندھ کی تاریخ پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

''بیگلار نامہ'' کے اقتباسات کا انگریزی ترجمہ الیٹ اینڈ ڈاؤسن نے اپنی تاریخ ہند میں دیا ہے۔ 1947ء میں اس کتاب کا مختصر سندھی ترجمہ محمد صدیق میمن نے کیا جسے ''سندھ مسلم ادبی سوسائٹی'' نے شائع کیا۔اس اہم فارسی کتاب کا مستند متن شائع کرنے کی ذمہ داری ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے قبول کی اور 1980ء میں تاریخ سندھ کے اس اہم ماخذ کو سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد نے شائع کیا۔ڈاکٹر بلوچ صاحب نے حسبِ عادت بڑی محنت سے اس کتاب کی تدوین (Editing) کی اور مفصل مقدمے کے علاوہ انگریزی زبان میں مختصر نوٹ بھی لکھے۔(۷)

تاریخ طاہری

''تاریخ طاہری'' کے نام سے دراصل ٹھٹہ کے باشندے سید طاہر محمد نیسانی نے ٹھٹہ شہر کی تاریخ 1030ء میں لکھی۔اس کتاب کا اصل نام ''تاریخ بلدہ ٹھٹہ'' ہے لیکن بعد میں مصنف کے نام کی وجہ سے یہ ''تاریخ طاہری'' کے نام سے مشہور ہوئی سید طاہر محمد کا تعلق ٹھٹہ کے باغائی سادات سے تھا۔وہ 990ء میں ٹھٹہ میں پیدا ہوئے اور 1051ء میں یہیں وفات پائی۔ان کا مزار مکلی میں موجود ہے۔سیّد طاہر محمد اور ان کے والد میاں حسن سندھ کے ارغون۔ترخان حکمرانوں کے دربار سے وابستہ رہے۔

تاریخِ طاہری، دراصل دس ابواب میں لکھنے کا پروگرام تھا لیکن اس کے صرف پانچ باب ہی مکمل ہو پائے جو یہ ہیں: سومرا، سماجام، مرزا شاہ حسن ارغون، مرزا عیسیٰ ترخان اور مرزا غازی بیگ ترخان۔ یہ کتاب ٹھٹہ کے مقامی حکمرانوں کے بارے میں اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔الیٹ اینڈ ڈاؤسن نے اپنی تاریخِ ہند میں اس کے انگریزی میں اقتباسات دیے تھے، اس کے بعد محمد صدیق میمن نے 1928ء میں ''انتخاب تاریخِ طاہری'' کے عنوان سے فارسی کتاب کا انتخاب اور اس کا سندھی ترجمہ شائع کیا۔

سندھی ادبی بورڈ نے جب تاریخِ سندھ کے فارسی مآخذات کی اشاعت کا پروگرام بنایا تو اس میں اس اہم کتاب کو بھی شامل کیا۔اس کی تدوین (Editing) کی ذمہ داری ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کو سونپی گئی جنھوں

نے بڑی محنت سے اس کی تدوین کی اور فارسی میں قیمتی حواشی بھی لکھے۔ان حواشی میں مصنف کی بعض اغلاط کی تصحیح بھی کی۔آخر میں انگریزی میں ایک عالمانہ مقدمہ لکھا۔یہ کتاب سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد نے 1964ء میں شائع کی۔تاریخِ سندھ کے اس اہم فارسی ماخذ کا سندھی ترجمہ نیاز ہمایونی نے کیا جسے اسی ادارے نے 1988ء میں شائع کیا۔(۸)

دیوانِ غلام

سندھ میں تالپور حکمرانوں کا عہد 1782ء تا 1843ء قائم رہا۔اس عہد میں نواب ولی محمد خان لغاری اپنے وقت کے بااثر امیر، وزیر اور کامیاب سفارت کار تھے۔وہ علم وادب کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ان کے بھتیجے غلام محمد لغاری تھے جو تالپور دورِ حکومت کے آخری زمانے میں نامور امیر اور مصاحب گزرے ہیں۔وہ فارسی زبان کے شاعر بھی تھے جس کا ثبوت فارسی زبان میں ''دیوانِ غلام'' کی شکل میں موجود ہے۔غلام محمد لغاری اپریل 1789ء میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کے بعد میر مراد علی خان (1828ء تا 1833ء) کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔انھیں زیادہ اہمیت میر مراد علی خان کی وفات (1833ء) کے بعد حاصل ہوئی جب ان کے دو بیٹے میر نور محمد خان اور میر نصیر خان حکمران بنے۔میروں کی حکومت کے خاتمے کے بعد غلام محمد لغاری نے ''تاجپور'' نامی شہر آباد کیا۔

''دیوانِ غلام'' ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے بڑی محنت سے ایڈٹ کیا اور 1959ء میں اسے سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد نے شائع کیا۔ساتھ ہی انگریزی زبان میں کتاب پر عالمانہ مقدمہ لکھا۔(۹)

لطائفِ لطیفی

سندھ میں فارسی زبان وادب کا سنہری دور میروں کے عہدِ حکومت کے خاتمے (1843ء) تک باقی رہا۔اس دور کے خاتمے کے باوجود بعض حضرات نے فارسی زبان وادب سے رشتہ برقرار رکھا اور یادگار کارنامے انجام دیے۔انہی حضرات میں میر عبدالحسین سانگی بھی تھے جنھوں نے سندھ کے عظیم صوفی شاعر حضرت شاہ عبداللطیف

بھٹائی کے بارے میں فارسی زبان میں ''لطائفِ لطیفی'' نامی کتاب 1888ء میں تصنیف فرمائی۔ میر عبدالحسین خان سانگی سندھ کے آخری تالپور حکمران میر نصیر خان تالپور کے پوتے تھے۔ انگریزوں نے 1843 میں سندھ پر قبضہ کرلیا اور تالپور حکمران اور ان کے اہلِ خانہ کو کلکتہ میں قید کیا تھا۔ کلکتہ ہی میں 1851ء میں میر عبدالحسین خان سانگی پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں کلکتہ سے حیدرآباد آ گئے۔ اس لیے ان کی ابتدائی تعلیم کلکتہ اور حیدرآباد میں ہوئی۔ ان کا انتقال 12 جون 1924ء کو حیدرآباد میں ہوا اور تدفین بھٹ شاہ میں ہوئی۔ ان کی تصنیف ''لطائفِ لطیفی'' حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی سوانح کے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا زیادہ تر مواد شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بارے میں زبانی روایتوں کو لکھ کر محفوظ کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے شاہ صاحب کی حیات، ان کے فقیروں اور خدمت گاروں کی روایات، ان کی کرامات، حسب نسب و دیگر مفید معلومات سے متعلق روایات جمع کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کی حیات اور کلام پر تحقیق کے دوران اس اہم کتاب کی اشاعت کی سفارش کی جسے بھٹ شاہ ثقافتی مرکز نے 1962ء میں شائع کیا۔ تدوین (Editing) کا مکمل کام بلوچ صاحب نے انجام دیا۔ اسی ادارے کی جانب سے اصل فارسی کتاب کا سندھی ترجمہ 1986ء میں عبدالرسول قادری نے شائع کیا۔

لُبِّ تاریخِ سندھ

''لُبِ تاریخ سندھ'' فارسی زبان میں سندھ کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ اس کے مؤلف منشی خداداد خان تھے جنھوں نے 1318 ہجری مطابق (1900ء) میں فارسی زبان میں یہ تاریخ لکھی اور اسے امرتسر سے شائع کیا۔ منشی خداداد خان پرانے سکھر کے باشندے تھے جنھوں نے فارسی زبان میں اور بھی کئی کتب تصنیف کیں لیکن ان میں سب سے زیادہ شہرت ''لُبِ تاریخِ سندھ'' ہی کو حاصل ہوئی۔ ان کا انتقال 1903 میں پرانے سکھر میں ہوا۔

لُبِ تاریخ سندھ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب سندھ کے عمومی تعارف پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب

رائے خاندان سے تالپوروں کے زوال تک کے دور کا احاطہ کرتا ہے۔ تیسرا باب جدید دور پر مشتمل ہے جس میں چارلس نیپیئر سے آر جائلس تک کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1900ء میں امرتسر سے شائع ہوا تھا لیکن اس میں کئی خامیاں اور کمیاں تھیں۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے بڑی محنت سے اس کا مستند متن تیار کیا جس کی خاطر کتاب کے قلمی نسخے سے بھی استفادہ کیا اور وہ معلومات پیش کیں جو مطبوعہ نسخے میں غیر موجود تھیں کتاب کی خاطر مختصر لیکن مفید حواشی بھی لکھے اور انگریزی زبان میں ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا جس میں منشی خداداد خان کی سوانح اور کتابی ورثے سے متعلق مفید معلومات تحریر کیں۔ ''لُبِ تاریخِ سندھ'' کا یہ مستند ایڈیشن سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد نے 1959ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کا روسی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔(۱۱)

باقیات از احوالِ کلھوڑا

یہ کتاب کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں بلکہ بلوچ صاحب نے برس ہا برس کی تلاش و جستجو کے بعد سندھ کے کلھوڑا حکمرانوں سے متعلق جو قیمتی مواد حاصل کیا اسے ''باقیات ازاحوال کلھوڑا'' کے عنوان سے 1996ء میں شائع کیا۔ کتاب میں عہدِ کلھوڑا سے متعلق نہایت قیمتی دستاویزات بھی شائع کی گئیں جن سے تاریخِ سندھ کے اس اہم ترین دور سے متعلق نہایت قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کتاب میں جو معلومات بلوچ صاحب نے پیش کی ہیں وہ اس سے قبل کسی مطبوعہ ماخذ میں موجود نہ تھیں۔

تاریخِ بلوچی

تاریخِ سندھ کا ایک اہم ماخذ ''تحفۃ الکرام'' ہے جسے 1774ء میں میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے مکمل کیا۔ اس کے بعد کی تاریخ کو میر عظیم الدین ٹھٹھوی نے اپنی فارسی مثنوی ''فتح نامہ'' میں لکھ کر محفوظ کیا۔ یہ کتاب 1803ء میں مکمل ہوئی۔ اسی سال عبدالمجید جوکھیو نے فارسی میں تاریخِ سندھ پر کتاب لکھی جس میں مثنوی فتح نامہ کی طرز پر

مواد پیش کیا اور کئی مفید اضافے بھی کیے۔ یہ اہم کتاب ناپید ہو جاتی اگر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب اس کا واحد نسخہ حاصل کر کے شایع نہ کراتے۔ اس کا واحد مخطوطہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کے پاس محفوظ تھا جس سے مولانا غلام رسول مہؔر نے اپنی کتاب ''تاریخِ کلھوڑا'' میں بھی استفادہ کیا تھا۔ تاریخِ سندھ کا یہ اہم فارسی ماخذ کا اردو ترجمہ ڈاکٹر بلوچ صاحب اور ڈاکٹر خضر نوشاہی کی کوشش سے 1996ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ (۱۰)

اس کتاب کا سندھی ترجمہ ڈاکٹر عبدالرسول قادری نے کیا جو ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا۔

تکملۃُ التّکملۃ

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی زندگی کے آخری علمی کاموں میں ایک اہم کام تکملۃ التکملۃ بھی ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ کتاب کے نام تکملۃ التکملۃ سے ظاہر ہے کہ یہ تذکرے ماضی میں لکھے گئے سندھ کے فارسی شعراء کے دو سو تذکروں یعنی قانع کے 'مقالات الشعرا' اور خلیل کے 'تکملہ مقالات الشعرا' کے سلسلے کی اگلی کڑی ہے۔ ڈاکٹر صاحب آگے لکھتے ہیں کہ فارسی زبان کے آثار کو موجودہ دور میں محفوظ کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اب حالات بدل چکے ہیں کہ فارسی دانی کی محفلیں باقی ہیں نہ مشاعرے اور نہ موازنے۔ بعض علمی گھرانوں کے افراد نے فتاویٰ اسناد مکتوبات، اشعار اور دواوین کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی لیکن بالآخر وہ بھی تھک گئے۔ علمی ذخیرے ضائع ہوئے، کتب خانے برباد ہو گئے اور بچے کھچے علمی ذخائر بھی ضائع ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مزید اس مقدمے میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب 'مقالات الشعرا' اور 'تکملہ مقالات الشعرا' کی توضیح ہے۔ میرے سامنے اس کتاب کی تصنیف کا اصل مقصد یہ تھا کہ سندھ میں فارسی اور خاص طور پر فارسی شاعری کی باقیات الصالحات کو جس قدر ممکن ہو محفوظ کیا جائے۔ سندھ میں فارسی شاعری کے ذخیرے سے انتخاب کرنے کا زمانہ ختم ہوا کیونکہ جب مواد ہی محفوظ نہ رہا تو انتخاب کیسے ہوگا۔ اس وقت جب کہ سندھ میں فارسی ذریعہ تعلیم اور تربیت کے دور کو ختم ہوئے 150 سال گزر چکے ہیں تو ایسی صورت میں فارسی شاعری کے باقی ماندہ ذخیرے میں جو بھی صنف دستیاب ہو وہ غنیمت ہے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی عربی خدمات

۱۔ نتف من شعر ابی عطاء سندھی

یہ دراصل سندھ کے نامور عربی شاعر ابوعطا سندھی کا دیوان ہے۔اس کی ترتیب کے لیے بلوچ صاحب نے کئی کتابوں سے اشعار جمع کر کے دیوان کی صورت میں مرتب کیا۔ایسی چونتیس (۳۴) کتابوں سے مخطوطات پنجاب کی ایک درگاہ سے حاصل ہوئے، مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں۔ادب صادق، قطبی' الھدانی، اصفھانی، تاریخ طبری، طول شعراء، کتاب الدنیا، جلال الدین سعدی۔

کتاب کے مقدمے میں فاضل محقق علامہ استاد عبدالعزیز میمن صاحب نے فخریہ انداز سے لکھا ہے کہ کتاب کے اشعار جمع کرنے کے عمل میں صرف ایک دو کتابوں سے ہی استفادہ نہیں کیا گیا بلکہ اشعار کئی کتابوں سے ملے ہیں۔بلوچ صاحب نے عالمانہ حاشیے لکھ کر اشعار کا درست متن ترتیب دیا ہے۔اسلوبیاتی بیان مخطوطات میں اشعار کو قافیہ پر ترتیب دے کر فاضل محقق ڈاکٹر بلوچ صاحب نے جو زبان استعمال کی ہے وہ گویا صاحبِ لسان کی ہے۔

بلوچ صاحب کے تمام حواشی ان کی علمی فضیلت اور عربی دانی کا واضح اظہار ہیں ۔ دیوان کا دوسرا ایڈیشن سندھی ادبی بورڈ سے ۱۹۶۱ء میں طبع ہوا۔(۱۱)

غرّة الزیجات از البیرونی

بلوچ صاحب کا دوسرا عظیم کارنامہ البیرونی کی کتاب ''غرّة الزیجات'' کی ترتیب وتدوین ہے۔ ہندوستان کے علوم میں زبانوں پر کئی کتابیں لکھیں جن میں ''کتاب ماللھند'' ان کی کلاسیکی یادگار ہے۔خاص کتب جو ان کی ہیں۔ القانون مسعودی، تمیز المستقبر ،''امرات المکان'' ان کتابوں میں ذکر آیا ہے۔غرة

الزیجات کا، ابوریحان البیرونی نے اپنی ۱۵۰ تصنیفات میں سے کم از کم بیس پچیس کتابیں ہندوستان کے علمِ نجوم پر لکھی ہیں۔

اس کتاب کا قلمی نسخہ فقط ایک تھا جو پیر محمد شاہ کی درگاہ احمد آباد میں موجود تھا۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اس کا ذکر البیرونی کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی سے بلوچ صاحب کے قریبی تعلقات تھے۔ دونوں کی تعلیمی ادبی محفلوں میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ دونوں بزرگوں کے تعلقات پر ہم نے پیش نظر کتاب کے باب نمبر 3 میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ قاضی صاحب جب احمد آباد گئے تو واپس آ کر بلوچ صاحب کو مبارک باد دی کہ کتاب لائبریری پیر محمد شاہ احمد آباد میں موجود ہے۔ وہاں سے منگوائی جائے۔ بلوچ صاحب نے علامہ آئی آئی قاضی مرحوم سے عرض کیا کہ وہ کتاب کا مخطوطہ احمد آباد سے منگوائیں۔ علامہ قاضی صاحب، بلوچ صاحب کی آراء کی قدر کرتے تھے۔ انہوں نے فوراً انچارج لائبریری کو سرکاری خط لکھا پھر وہاں سے کتاب آ گئی جسے بلوچ صاحب نے تحقیق کے بعد شائع کیا۔(۱۲)

۔جامع الکلام فی منافع الانام (بارھویں صدی ہجری میں ٹھٹہ کے علما کی عربی فارسی میں خط و کتابت)، تالیف: شیخ عبداللہ بن محمد السندھی، تحقیق و تنقیح: ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، اشاعت 2006ع، سندھی ادبی بورڈ جام شورو

حواشی باب نمبر 18

۱۔Fatahnama-i-Sindh (A History of Arab-Muslim Conquest of Sindh, Institute of History and Culture, Islamabad 1982.

دیکھیں ''فتح نامہ سندھ'': اصل فارسی متن، تفصیلی انگریزی مقدمہ اور حواشی از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، 1983ع نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ، اسلام آباد

۲۔ دیکھیں تكملة التكملة۔سندھ میں فارسی شاعری کا آخری دور از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

۳۔ دیکھیں تكملة التكملة۔سندھ میں فارسی شاعری کا آخری دور از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ

۴۔ دیکھیں ''فتح نامہ سندھ'': اصل فارسی متن، تفصیلی انگریزی مقدمہ اور حواشی از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ

۵۔ایضاً

۶۔ مخدوم جعفر بوبکائی کا تعلق بوبک ضلع دادو سے تھا۔ بوبک سہون سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر مغربی جانب واقع ہے۔ بوبک دراصل ابوبکر کی تبدیل شدہ شکل ہے جو اس گاؤں کے بانی اور مخدوم جعفر کے آباؤاجداد میں سے ایک تھے۔ مخدوم جعفر کے والد بھی عالم تھے جن کا ۹۴۹ ہجری میں ٹھٹہ میں انتقال ہوا۔ مخدوم جعفر کے ابتدائی حالات نامعلوم ہیں۔ وہ دیگر علوم پر بھی عبور رکھتے تھے اور قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ ان کی درست تاریخ یا سالِ وفات کا علم نہیں۔ اندازاً انہوں نے دسویں صدی ہجری کے اواخر میں انتقال کیا۔ ان کی تدفین بوبک میں ان کے آبائی قبرستان میں ہوئی جہاں ان کی قبر آج تک موجود ہے۔

۷۔ ملاحظہ فرمائیں جناب غلام محمد لاکھو کا مضمون 'فارسي ادبيات جی ترقي خاطر ڈاکٽر نبي بخش بلوچ جون خدمتون'' (فارسی ادبیات کی ترقی کی خاطر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی خدمات) یہ مضمون ''

ڊاڪٽر بلوچ هڪ مثالي عالم'' کے حصہ اوّل میں شائع ہوا۔ ملاحظہ فرمائیں ص:۸۵۔

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ملاحظہ فرمائیے ''ڊاڪٽر بلوچ جا عربي ۾ ايڊٽ ٿيل ڪتاب'' (ڈاکٹر بلوچ کی عربی میں تدوین شدہ کتب) یہ مضمون کتاب ''ڊاڪٽر بلوچ۔ هڪ مثالی عالم'' کے تیسرے حصے میں شائع ہوا، اس کے مضمون نگار پروفیسر ڈاکٹر مدد علی قادری ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ص ۲۷

۱۲۔ ایضاً

باب نمبر 19

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی
اردو میں علمی و تحقیقی خدمات

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ پاکستان کے وہ نامور محقق اور دانشور تھے جنھوں نے سندھی انگریزی، فارسی اور عربی کے علاوہ اردو زبان میں بھی دادِ تحقیق دی۔ بلوچ صاحب کی تحقیق کی ایک خاص بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ نے جس موضوع پر بھی کتاب لکھی، اس میں بعد والوں کے لیے اضافہ کرنا مشکل ہوگیا۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے اپنی ہر کتاب میں تحقیق کا حق ادا کیا۔ آپ کی اردو کتب کا معاملہ بھی یہی ہے۔ یہاں مثال کے طور پر بلوچ صاحب کی صرف ایک اردو کتاب ''سندھ میں اردو شاعری'' کا ذکر کافی ہے۔ اس کتاب کی اشاعتِ اول کو چالیس برس ہو چکے ہیں لیکن اب تک اپنے موضوع پر یہ واحد اور مستند کتاب ہے اور راقم الحروف کی معلومات کی حد تک اب تک اس میں کوئی اضافے نہ کر سکا۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق بلوچ صاحب کی تحقیق و تدقیق کے بعد اب تک اردو زبان کی پانچ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان پانچ میں تین شاعری کی اور دو نثر کی کتابیں ہیں۔ یہاں ہم ان کتب کا تاریخی ترتیب سے تعارف پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر بلوچ صاحب کی اردو تحریروں پر مشتمل راقم الحروف کی مرتبہ کتب کا ذکر کریں گے۔

سندھ میں اردو شاعری (از عہدِ شاہجہاں تا قیام پاکستان)

جیسا کہ ذکر کیا گیا یہ کتاب بلوچ صاحب کی اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے منفرد اور اہم ہے۔اس کتاب میں بلوچ صاحب نے بڑی محنت سے ۱۶۵۸ء سے ۱۹۳۵ء تک کے سندھ کے 71 شعرا کے حالاتِ زندگی اور کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔ محققین اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ قدیم شعرا کے حالات اور ان کے کلام کا کھوج لگانا کس قدر مشکل کام ہے۔ بلوچ صاحب نے اس مشکل کام کا بیڑا اٹھایا اور سندھ سے تعلق رکھنے والے 71 شعراء کے مستند حالات اور اردو کلام جمع کیا۔ان 71 شعرا میں سے دو یعنی میر محمود صابر اور حاجی فضل محمد ماتم کے دواوین کو بلوچ صاحب نے بعد میں مرتب فرما کر شائع کیا اور ان پر عالمانہ مقدمات بھی لکھے۔۔سندھ میں اردو شاعری کی اشاعتِ اول کے تعارف میں بلوچ صاحب اس کتاب کی وجہِ تالیف اور شامل مواد کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس کتاب اور اس میں شامل مواد کے متعلق چند گذارشات ضروری ہیں اول یہ کہ یہ تالیف اس موضوع پر کوئی تحقیقی مقالہ نہیں بلکہ ایک اجمالی خاکہ ہے تفصیلی جائزہ نہیں بلکہ ایک مثالی کوشش ہے لہٰذا سندھ میں اردو شاعری کی تاریخ کے ہر دور میں سے نمائندہ شعرا کو پیش کیا گیا ہے۔ان کے علاوہ اور بھی شعرا ہیں جن کے نام معلوم ہیں اور بعض کا کلام بھی موجود ہے، لیکن سردست جو مواد اور معلومات راقم کے پاس موجود تھیں یا آسانی سے حاصل ہو سکیں۔ان کو اس کتاب میں مرتب کیا گیا ہے۔
>
> دوم یہ کہ صرف ایسے شعرا کو لیا گیا ہے جن کا تعلق خاص خطہء سندھ سے رہا ہے۔ یہ عہد شاہجہاں سے لے کر تقریباً ۱۹۳۵ء تک کے شعرا ہیں۔ان میں سے ان متاخرین کو لیا گیا ہے جن کی علمی اور ذہنی تربیت ۱۹۶۰ء سے پہلے ہوئی۔ حالانکہ وہ ۱۹۳۵ء تک زندہ رہے، یعنی ایسے شعرا کو لیا گیا ہے جن کا کلام نسبتاً خالص سندھی ماحول کی پیداوار ہے تا کہ سندھ میں اردو کی مستقل نشو ونما کی تاریخ کے خدوخال روشن ہو سکیں۔
>
> سوانح کا مواد کافی کوشش سے جمع کیا گیا ہے۔شعرا کی زندگی کے حالات

خصوصاً ولادت، وفات اور بود و باش کے اہم پہلوؤں کو روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر وقت کی قلت کی وجہ سے تفصیلی معلومات فراہم نہ ہوسکیں۔ جہاں ولادت اور وفات کی صحیح تاریخیں نہ مل سکیں وہاں ذیلی مطالعے اور قرائن سے ولادت اور وفات کے سال اندازاً لکھ دیے گئے ہیں، تاکہ شاعر کے دور کا حتی الامکان اندازہ کیا جاسکے۔

مئی اور جون ۱۹۶۶ء کے قلیل عرصے میں اس کتاب کی تالیف اور طباعت کی تکمیل کے باعث بعض پہلو تشنہء تحقیق رہ گئے ہیں، جن کی تلافی کو دوسرے ایڈیشن پر ملتوی کیا گیا ہے کہ کارے کسی تمام نکرد۔''

مہران آرٹس کونسل حیدرآباد کے صدر اور کمشنر حیدرآباد جناب مسرور حسن خاں صاحب (تمغہء پاکستان سی۔ایس۔پی) نے اس تالیف کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے کونسل کی طرف سے اس کی اشاعت کی تجویز کا خیر مقدم کیا اور کونسل نے کتاب کو چھاپنا منظور کرلیا۔''(۱)

اس اہم کتاب کی اشاعتِ اول ۱۹۶۷ء میں مہران آرٹس کونسل حیدرآباد کی جانب سے ہوئی جس میں ۶۶ شعراء کے حالات اور کلام پیش کیا گیا۔ اشاعتِ دوم ۱۹۷۰ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے ہوئی جس میں چار مزید شاعروں کی شمولیت کے بعد کل شعرا کی تعداد ۷۰ ہوگئی۔ ہمارے پیشِ نظر اس کتاب کی اشاعتِ سوم ہے جسے مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور نے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا اور شعرا کی تعداد ۷۱ ہے۔ مہران آرٹس کونسل اور مجلس ترقی ادب کے ایڈیشن ٹائپ میں تھے۔ اس کے بعد محکمہء ثقافت حکومتِ سندھ کی جانب سے 2012 میں اس اہم کتاب کا جدید ایڈیشن بعد کمپیوٹر کمپوزنگ شائع کیا گیا۔

اس کتاب کی تیاری میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کی معاونت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں سابق صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی نے کی جن کا بلوچ صاحب نے خصوصی شکریہ ادا کیا۔

طلبہ اور تعلیم (قائداعظم نے کیا سوچا اور کیا کہا)

قائداعظم کے تعلیم سے متعلق اقوال کا یہ مفید کتابچہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے ۱۹۷۶ء میں مرتب فرمایا۔ اس کے پیش لفظ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''جشن صد سالہ قائداعظم ۱۹۷۶ء کی مطبوعات کمیٹی کی خواہش پر قائداعظم کے ان ارشادات کو بعض مطبوعہ کتب اور وفاقی وزارتِ تعلیم اسلام آباد میں محفوظ ذخیرۂ کاغذات قائداعظم سے مرتب کیا گیا ہے۔''(۲)

یہ مفید اور کارآمد کتابچہ اب تک کم از کم چھ مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ اس کی ناشر قائداعظم اکیڈمی کراچی ہے جس نے طبع ششم ۱۹۸۸ء میں شائع کی۔

دیوانِ شوق افزا عرف دیوانِ صابر

دیوان شوق افزا عرف دیوان صابر سندھ کے ایک قدیم شاعر میر محمود صابر کا اردو دیوان ہے جسے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے بڑی محنت سے مرتب کیا اور ۴۴ صفحات پر مشتمل عالمانہ مقدمہ بھی لکھا۔ اس دیوان میں صابر کی کل 616 غزلیں ہیں۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی تحقیق کے مطابق میر محمود صابر کے آبا و اجداد ایران کے شہر استر آباد کے رضوی سادات سے تھے۔ ان کے والد ایران سے دہلی آ گئے اور دہلی کو انھوں نے اپنا وطن بنالیا۔ یہیں ۱۱۱۰ھ کے لگ بھگ میر محمود صابر کی ولادت ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد میر محمود زیارات کی خاطر دہلی سے روانہ ہوئے۔ واپسی میں جب وہ ٹھٹہ پہنچے تو اس شہر کی رونق اور چہل پہل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ دہلی جانے کا خیال ترک کر کے یہیں کے ہو رہے۔ یہ واقعہ اندازاً ۱۱۳۵ھ تا ۱۱۴۰ھ کے درمیان کا ہے۔ انھوں نے ٹھٹہ ہی میں شادی کی اور صاحبِ اولاد ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ٹھٹہ پر شاہانِ دہلی کے صوبیداروں کی حکمرانی کا دورِ آخر تھا۔ ساتھ ہی کلہوڑا خاندان کی سیاسی قوت روز بروز مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔ ٹھٹہ کی تعلیم کا علمی و ثقافتی لحاظ سے یہ سنہری دور تھا کیونکہ اسی زمانے میں مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی (متوفی ۱۱۷۴ھ) اور مخدوم محمد معین ٹھٹوی (متوفی ۱۱۶۱ھ) جیسے نامور

علماء یہاں علم وفن کی محفلیں روشن کر رہے تھے۔ میر محمود صابر بھی انہی محفلوں سے مستفید ہوئے اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی بنا پر میاں نور محمد خدایار خان والیٔ سندھ کے دربار تک رسائی حاصل کی۔ جب ۱۱۶۷ھ میں میاں نور محمد کی وفات ہوئی تو تاریخ لوحِ مزار میر محمود ہی سے لکھوائی گئی۔ اس زمانے میں میر محمود صابر ٹھٹہ شہر کے معزز اور باوقار لوگوں میں شامل تھے۔ جنھیں فارسی اور اردو شاعری میں اس حد تک کمال حاصل تھا کہ میر علی شیر قانع ٹھٹوی اپنی معروف کتاب ''تحفۃ الکرام'' میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میر محمود صابر کی سرعتِ فکر کا یہ عالم ہے کہ تقریباً ایک لاکھ اشعار ان کی زبانِ فصاحت بیان سے نکل چکے تھے اور ان کا کلام خاصا مقبول تھا۔

دیوان شوق افزا کے حصول اور اس پر تحقیق کے حوالے سے بلوچ صاحب لکھتے ہیں:

''۱۹۵۸ء ۱۹۶۰ء کے دوران میں سندھ کے قدیم شہر نصرپور (ضلع حیدرآباد سندھ) کے تاریخی آثار کے مطالعے میں مشغول تھا کہ وہاں کے اجڑے ہوئے کتب خانوں کی باقیات صالحات میں سے کچھ اوراق پارینہ ملے جن کو محفوظ کر لیا، مگر سندھ یونیورسٹی میں اپنے فرائض منصبی اور دوسرے علمی مشاغل کی وجہ سے اس ذخیرے کو مطالعہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ۱۹۶۲ء میں جب اس ذخیرے کی چھان بین کی تو اس میں دیوان شوق افزا جیسا نایاب تحفہ نظر آیا، مگر یہ عقدہ حل نہ ہوسکا کہ اس دیوان کے شاعر المتخلص بہ صابر کون ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے فاضل رفیق ومحقق ڈاکٹر غلام مصطفی خان (۳) صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی سے رجوع کیا، جنھوں نے اپنے وسیع مطالعے اور حیدرآباد دکن سے شائع شدہ تازہ فہارس کی تفتیش کے بعد آخری طور پر اپنی رائے سے یوں مطلع فرمایا کہ ''صابر غیر معروف لیکن باکمال شاعر ہے۔ یہ دیوان نایاب ہے اور شائع کرنے کے لائق ہے۔''

۱۹۶۵ء میں تاریخی آثار کی تلاش وتحقیق کے سلسلے میں سندھ کے کلہوڑہ عباسی خاندان کے حکمران میاں نور محمد خدایار خان عباسی کے مقبرہ پر جانے کا موقع ملا، جہاں پر اندرونی دروازے کے دائیں طرف اور متصل احاطہ کے بیرونی دروازے کے دائیں اور

بائیں طرف فارسی میں تین کتبے نصب شدہ دیکھے۔غور سے پڑھنے پر معلوم ہوا کہ ان میں سے دو تو ایک ہی کتبے کے دو ٹکڑے ہیں، اور مزید یہ کہ اس طویل قطعہ تاریخ کو منظوم کرنے والا شاعر صابر ہے۔ اس وقت پہلی بار یہ خیال آیا کہ شاید دیوان شوق افزا کا مصنف یہی صابر ہو۔لہذا بیرونی تذکروں کے بجائے ان کو اندرون سندھ کے ماخذوں میں تلاش کیا جائے کیونکہ دیوان شوق افزا کا یہ قلمی نسخہ بھی سندھ کے شہر نصر پور ہی میں دستیاب ہوا ہے۔

یہ خیال آتے ہی مزید تحقیق کے لیے راہ روشن ہوگئی۔ چنانچہ میر علی شیر قانع کی تصنیف'' مقالات الشعرا'' میں میر محمود صابر کا تذکرہ پایا اور داخلی شہادتوں اور خارجی ماخذوں کے تجزیے سے یہ متحقق ہوا کہ سیّد میر محمود ٹھٹوی المتخلص بہ صابر ہی دیوان شوق افزا کے مصنف ہیں۔

میر محمود صابر کے کلام سے متاثر ہوکر سندھ کے مقامی شعرا کے کلام کو جمع کرنے کا خیال آیا چنانچہ ۱۹۶۶ء میں کافی ذخیرہ جمع ہوگیا جس کو سندھ میں اردو شاعری کے عنوان سے کتابی صورت میں مرتب کیا گیا۔ یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں مہران آرٹس کونسل حیدرآباد کی طرف سے شایع ہوئی۔ میر محمود صابر کی مختصر سوانح اور دیوان شوق افزا میں سے تقریباً بیس غزلوں کا انتخاب اس کتاب میں شامل ہے۔''(۴)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے حسبِ عادت بڑی محنت اور سلیقے سے دیوانِ شوق افزا مرتب کیا اور میر محمود کے حالاتِ زندگی تحریر فرمائے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ میر محمود اردو شاعری کے باوا آدم ولی دکنی (گجراتی) کے فوری بعد کے شعراء میں شامل تھے۔اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''ٹھٹہ میں ۱۱۶۱ھ تا ۱۱۸۱ھ کا دور صابر کا دور کہا جاسکتا ہے۔ ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہتے ہیں۔ ولی فوت ہوئے اور میر محمود صابر جوان ہوئے۔گویا میر محمود کو متقدمینِ شعرائے دہلی کا ہم عصر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ۱۱۵۱ء تا ۱۱۶۵ھ میاں نور محمد عباسی کے دورِ

حکمرانی میں صابر ٹھٹہ کے زمرۂ شعراء میں اعلیٰ مقام حاصل کر چکے تھے۔ میر صابر کے زمانے میں ولی کی شہرت گجرات سے سندھ تک پہنچ چکی تھی۔ اس کی شہادت خود صابر کے کلام سے ملتی ہے۔ ولی کا کلام ان کی نظر سے گزرا تھا (جیسا کہ فرماتے ہیں):

سن ریختہ ولیؔ کا دل خوش ہوا ہے صابر
حقا ز فکرِ روشن ہے انوریؔ کے مانند

ولی کے تقدم اور شاعرانہ کمال کو مانتے ہوئے صابر بجا طور پر اپنے متعلق کہتے ہیں:

گر ریختہ ولیؔ کا لبریز ہے شکر سوں
مضمونِ شعر صابرؔ قند و شکر تری ہے (۵)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے دیوانِ شوق افزا بڑے سلیقے اور محنت سے مرتب فرمایا اور ۴۴ صفحات کے عالمانہ مقدمے میں صابر کے حالاتِ زندگی، شاعرانہ کمال اور ان کے اردو کلام پر روشنی ڈالی ہے۔ دیوانِ شوق افزا کی اشاعت ۱۹۸۴ء میں اردو سائنس بورڈ لاہور نے کی۔

قارئین کی ضیافتِ ذوق کی خاطر ہم میر محمود صابر کے چند منتخب اشعار پیش کرتے ہیں:

تجھ لب کی مٹھائی کی چکھی چاشنی جس نے
شربت اسے تریاق ہوا قند و شکر کا
آئینہ میں مت دیکھ لٹاں چھوڑ کے مکھ پر
تا بُرج میں عقرب کے نہ دور آوے قمر کا

ہیں کاتبِ قدرت خطِ یاقوت کے حیراں
تفسیر ترے حسن کی پر کون سکے گا
اسیرِ حلقۂ زلفِ رسا ہوں
جو دل آشفتگی سوں مبتلا ہوں

کوئی زاہد کا کوئی شیخ کا ہے
شہِ معجز نما کا میں گدا ہوں
کبھی خوش ہوں ز شوقِ وصل صابرؔ
کبھی ناخوش زہجرِ دل رُبا ہوں

شب زندہ رکھ کہ صبح کا دیکھے ظہور و نور
سووے گا کب تلک کہ کمائی ہے جاگ میں
زاہد کی دیکھ گنبد دستار ،بھول مت
مکروریا کی پوٹ ہے سب اس کی پاگ میں
صابرؔ مجھے قبول ہے کچکول فقر کا
الواں مزہ ہے جو کی چپاتی و ساگ میں

اہلِ معنیٰ پسند کرتے ہیں
تازہ مضمون و انتخابِ سخن

خوشی رہ صابر و خرم، فراق و وصل میں ہر دم
اگر ہے عیش یا ہے غم ادھر سوں یو ادھر سوں وو

میر محمود صابر کا انتقال ٹھٹہ شہر میں ہوا اور تدفین مکلی میں ہوئی۔

مولانا آزاد سبحانی۔تحریکِ آزادی کے ایک مقتدر رہنما

مولانا آزاد سبحانی برصغیر پاک و ہند کے ممتاز علما میں سے ایک تھے۔انھوں نے قیامِ پاکستان کی خاطر

تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا لیکن پاکستان منتقل ہونے کے بجائے ہندوستانی مسلمانوں کی خدمت کے جذبے سے انھوں نے وہیں قیام کیا۔ مولانا آزاد سبحانی فلسفیانہ ذہن رکھتے تھے۔ فلسفۂ دین کی تعلیم کی خاطر انھوں نے کانپور میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔

مجلس عاملہ ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، جامعہ پنجاب کے اجلاس (۱۹۸۶۔۸۷ء) میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے تجویز پیش کی کہ آزادیٔ وطن کے ان رہنماؤں کی سوانح کو مرتب کیا جائے جن پر خاطر خواہ کام نہ ہوسکا۔ اس اجلاس میں مولانا آزاد سبحانی کی سوانح کو مرتب کرنے کی ذمہ داری بلوچ صاحب نے خود قبول کی۔ انھوں نے مولانا آزاد سبحانی کی سوانح پر کتاب لکھنے کی دو وجوہ بیان کی ہیں۔ پہلی یہ کہ مولانا نے تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیا تھا دوسری وجہ یہ کہ قیامِ پاکستان سے چند ماہ قبل جب بلوچ صاحب کولمبیا یونیورسٹی امریکہ میں ڈاکٹریٹ کی تحقیق کی خاطر مقیم تھے تو اسی زمانے میں مولانا آزاد سبحانی امریکہ تشریف لائے تھے۔ بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں انھیں مولانا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور وہ مولانا کی قلندرانہ شخصیت، علمی تبحر اور خاص طور پر ان کی اولوالعزمی سے بہت متاثر ہوئے۔ بلوچ صاحب کو مولانا کے اس وصف نے بے حد متاثر کیا کہ حصولِ پاکستان کے بعد بھی مولانا پاکستان نہیں آئے بلکہ ہندوستان ہی میں رہ کر وہاں کے مجبور مسلمانوں کی خدمت کرتے رہے۔ امریکہ میں قیام کے دوران مولانا سے بلوچ صاحب کا قریبی تعلق قائم ہوا اور باہمی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مولانا جب نیویارک سے جانے لگے تو وہ اپنی شعری بیاض بھی بلوچ صاحب کو عنایت کر گئے۔ اس کتاب کی خاطر بلوچ صاحب نے مولانا آزاد سبحانی کے مستند حالاتِ زندگی، تحریک پاکستان میں مولانا کا کردار، مولانا کا فکر و فلسفہ، مولانا کے مطبوعہ سفرنامہ سے اقتباسات، ان کی شاعری کا انتخاب اور مولانا کی ربانی تحریک سے متعلق بلوچ صاحب کے انگریزی مضامین پیش کیے ہیں۔ مستند معلومات کے حصول کے لیے مولانا کی صاحبزادی محترمہ ناظرہ خاتون سے انٹرویو بھی لیا جس سے کتاب میں استفادہ کیا ہے۔ ابتدا میں دس صفحات پر مشتمل پیش لفظ بھی لکھا ہے۔ یہ کتاب فروری ۱۹۸۹ء میں ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، پنجاب یونیورسٹی لاہور سے شائع ہوئی۔ (۶)

دیوانِ ماتم

دیوان ماتم حیدرآباد (سندھ) سے تعلق رکھنے والے شاعر حاجی فضل محمد ماتم کا دیوان ہے جسے بڑی محنت سے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے مرتب کیا اور سندھی ادبی بورڈ جامشورو نے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا۔ دیوانِ ماتم کے چند عکسی صفحات بھی شائع کیے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ دیوان کا قلمی نسخہ انتہائی خستہ حالت میں تھا، جس میں مصرعوں کی قرأت ایک مشکل کام تھا۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے بڑی خوبی اور سلیقے سے ان مشکلات کو حل کیا۔ قلمی دیوان کا نسخہ بلوچ صاحب کو مرزا اسد بیگ صاحب سے ملا جنھوں نے بلوچ صاحب کو بتایا کہ یہ نسخہ حاجی فقیر کو ہٹڑی کے گاؤں سے نہایت خستہ حالی میں ملا تھا۔

دیونِ ماتم کے دیباچے میں ڈاکٹر بلوچ، صاحبِ دیوان حاجی فضل محمد ماتم اور ان کے دیوان کے حصول کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''صاحب دیوان فضل محمد عباسی حیدرآبادی کو فوت ہوئے اتنا بڑا عرصہ نہیں گذرا تاہم ان کے متعلق معلومات کمیاب تھیں۔ اس خلا کو پورا کرنے کے لیے کافی کاوش کے بعد ان کی ذاتی سوانح اور خاندان کے حالات ان کے قبیلہ کی ایک معمر شخصیت مائی مراد خاتون مقیم حیدرآباد سے جولائی ۱۹۶۰ء میں حاصل کیے گئے جب کہ ان کی عمر نوے سال تھی۔
>
> دیوان ماتم کا قلمی نسخہ راقم کو حیدرآباد کے علمی خاندان کے چشم و چراغ مرزا اسد بیگ مرحوم سے ملا۔ نسخہ اتنا خستہ حال تھا کہ مرزا صاحب نے فرمایا کہ اس کو صحیح طور پر پڑھ کر نقل کرنا ممکن نہ تھا لہٰذا اشاعت کے لیے پیش رفت نہ ہو سکی۔ مزید فرمایا کہ ٹنڈو قیصر کے شاعر و ادیب حاجی فقیر مرحوم کو یہ نسخہ چند سال قبل ہٹڑی کے گاؤں سے دستیاب ہوا تھا جہاں پر ماتم نے وفات پائی۔
>
> دیوان کا یہ نسخہ انتہائی خستہ حال ہے۔ بعض اوراق پانی سے گیلے ہو کر باہم چسپاں ہو گئے ہیں اور کئی الفاظ اور عبارتیں مسخ ہو گئی ہیں۔ نسخہ کی کتابت میں اردو املا کو مدنظر نہ رکھنے کی وجہ سے بعض الفاظ و عبارات کو صحیح طور پر پڑھنے میں کافی دقّت پیش آئی۔ بعض جگہ

کاتب سے الفاظ رہ گئے اور اشعار میں سکتہ کی صورت پیدا ہوگئی حالانکہ ماتم قادر الکلام شاعر تھے اور سکتہ کو ان کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ باوجود نقائص کے، ماتم کے اس دیوان کو سندھ میں اردو کے اعتبار سے دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔

دیوان کی طباعت ۸۸۔۱۹۸۹ء کے دوران شروع ہوئی جب میں نیشنل ہجرہ کونسل اسلام آباد میں اپنے فرائض کے سلسلہ میں کثیر المشاغل تھا۔ اس حالت میں محترم سیّد شرف الحسن زیدی مہتمم کتبخانہ قومی ہجرہ کونسل اسلام آباد نے میرا ہاتھ بٹایا اور پروف پڑھنے میں مدد فرمائی۔ میں ان کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔" (۷)

فضل محمد ماتم کے بارے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ وقت کے رواج کے مطابق انھوں نے اچھی تعلیم پائی۔ جوانی کے زمانے میں بنگال میں کچھ عرصہ رہے۔ انھوں نے فن طب کا مطالعہ کیا اور کوٹڑی شہر میں طبابت کو بطور مشغلہ اختیار کیا۔ حرمین شریفین کو بھی گئے اور حج بیت اللہ کیا۔ حاجی فضل محمد ماتم نے حیدرآباد اور اس کے نواح میں زندگی بسر کی۔ کچھ عرصہ شہر حیدرآباد سے سات میل شمال کو "ہٹڑی" نام کے گاؤں میں رہے اور زندگی کے آخری ایام بھی وہیں گزارے۔ اور غالباً وہیں پر ۱۳۱۲ ہجری کے لگ بھگ وفات پائی۔ حاجی فضل محمد نے ماتمِ آلِ عبا میں تخلص ہی "ماتم" اختیار کیا البتہ سندھ کی مذہبی روایات میں تعصب کا نام ونشان نہ تھا۔ ماتم ہی کا شعر ہے:

آل و اصحابِ حضرت نبویؐ
رہِ ایمان کے چراغاں ہیں

حاجی فضل محمد ماتم اپنے عہد کے سربرآوردہ شعرا میں سے تھے۔ وہ سندھی اور اردو کے قادرالکلام شاعر تھے۔ اس عہد کے معروف شعراء نے ان کو داد دی اور ان کے تتبع میں غزلیں کہیں۔ حاجی فضل محمد ماتم نے ۱۲۹۴ ہجری میں دیوان کی تکمیل کی۔ ان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت وہ پیرسن تھے۔ ان کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ وہ خواجہ حیدر علی آتش کو اپنا استاد سمجھتے تھے اور کلام میں ان کو دل کھول کر داد دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حاجی فضل محمد ماتم نے آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس قبل اردو زبان کو اپنایا اور اس میں اتنی دسترس پہنچائی کہ ان کو

اہلِ زبان سے دعوائے ہمسری کی ہمت ہوئی۔ یہاں ہم حاجی فضل محمد ماتمؔ کے چند منتخب اشعار پیش کرتے ہیں:

ماتمؔ نہ نا امید خدا کے کرم سے ہو
محروم کب کریم کے در سے گدا گیا

صاحبِ بد سے رہو دُور کہ لیتا ہے دلا
نیکواں کو اثرِ صحبتِ اشرار لپیٹ

کیا کرے گا عاشقوں کا چارہ گر ناداں علاج
دردِ دل کا سخت مشکل ہے، نہیں آساں علاج
اے میاں جرّاح یہ مرہم لگانا ہے عبث
کیا ہے زخمِ خنجرِ خونی نگاہاں کا علاج

ساتھ ہوتے تھے سدا یا منہ بھی دکھلاتے نہیں
یا نہ ہوتے تھے جدا یا ہے جدائی اس قدر

بلبلِ باغِ قناعت ہے تمام آرام سے
در جہانِ خرمی عنقا ہے آرامِ حریص

پیدا کرے ہزار گلِ لالہ زار رنگ
لائے کہاں سے پر ترے رخ کا نگار رنگ

اگر اے دل رُبا دیکھیں ترا رخ اک نظر پریاں
تو دل دے کر تجھے چٹ پٹ وہیں ہو جاویں سب چڑیاں

ہم کو فکرِ رسا پہ فخر ہے یار
تم کو زلفِ دراز پر اپنے

پُر ہے ہمہ حسین و صبیح و ملیح سے
گویا ہے کانِ حسن جہاں میں مکانِ سندھ

گلشنِ اردو۔اردو مقالات نبی بخش بلوچ مرتبہ محمد راشد شیخ

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مرحوم کی زندگی ہی میں راقم نے ان کے اردو مقالات اور خطبات کی کتابی شکل میں اشاعت کی تجویز ان کی خدمت میں پیش کی تھی۔اس کے ساتھ راقم نے اپنے پاس محفوظ اردو مقالات کی فہرست بھی پیش کی تھی۔ڈاکٹر صاحب نے بخوشی اس اہم مواد کو کتابی شکل میں مرتب کرنے کی اجازت دی اور وقتاً فوقتاً قیمتی مشورے بھی دیتے رہے۔چنانچہ راقم الحروف نے اردو زبان میں لکھے بلوچ صاحب کے علمی اور تحقیقی مقالات،خطبات اور انٹرویو جمع اور مرتب کیے اور انھیں ۲۰۰۹ء میں پاکستان اسٹڈی سینٹر سندھ یونیورسٹی جام شورو نے ''گلشنِ اردو'' کے عنوان سے شایع کیا۔

اس کتاب کے مشمولات درج ذیل ہیں :

- اردو زبان کی قدیم تاریخ
- دیدہ ور (علامہ اقبال کو خراج عقیدت)
- شیخ نظام الدین اولیا کی سندھ میں آمد

- مولانا آزاد سبحانی۔تحریک آزادی کے رہنما
- نظریاتی مملکت میں ادیب کا کردار
- دیوانِ شوق افزا عرف دیوانِ صابر
- دیوان فضل محمد ماتم
- حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی
- حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ہاں ''عشق و عاشقی'' کا معیار
- سندھ میں اردو شاعری
- ہمارا نظامِ تعلیم (۱۹۸۳ء)
- پاکستانی ثقافت کے مسائل
- ایام علی گڑھ (۱۹۴۱ء۔۱۹۴۵ء)
- محاضراتِ میمنی
- مرحوم ممتاز حسن۔ایک سچے محب وطن
- قاضی احمد میاں اختر اور جونا گڑھ کی یاد میں
- میرے استاد بھائی۔ڈاکٹر مختار الدین احمد
- ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
- ابن بطوطہ کا سفر نامہ اور اس کے گمنام گوشے
- مسلم بنگال کے فارسی ادب کی ایک اہم تصنیف، کتاب ''شرفنامہ احمد منیری''
- ترکی کے کتب خانے اور ان میں محفوظ علمائے سندو ہند کی تصنیفات
- قلمی مجموعہ رسائل اردو
- بلوچی شعرا کا ایک نادر مخطوطہ
- قیام پاکستان کے بعد سندھی ادب کا فروغ

- بین الاقوامی سندھی ادبی کانفرنس ۱۹۸۸ء
- سندھ کے اجڑے ہوئے کتب خانے

اس کے علاوہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کی زندگی ہی میں ان کے اردو خطوط کا مجموعہ ''خطوط ڈاکٹر نبی بخش بلوچ'' کے عنوان سے راقم الحروف نے مرتب کیا اور وضاحتی حواشی بھی لکھے۔اس کتاب کا تعارف ہم پیش نظر کتاب کے باب نمبر ۲۲ میں پیش کریں گے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی مزید اردو تحریریں

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مرحوم نے اپنی زندگی میں اردو زبان وادب کے حوالے سے بھی قابل ذکر علمی و تحقیقی خدمات انجام دیں۔ یہاں بطور مثال ہم کتاب ''اردو زبان کی قدیم تاریخ'' پر بلوچ صاحب کے لکھے عالمانہ مقدمے کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اردو زبان کی قدیم تاریخ کے موضوع پر ان کی کتنی گہری نظر تھی۔اس مقدمے میں بلوچ صاحب لکھتے ہیں:

> ''ایک خاص نظریہ جس کو مصنف نے کافی وثوق سے پیش کیا ہے کہ وادی سندھ کی زبانوں کی مورث اعلیٰ سنسکرت نہیں بلکہ بالواسطہ طور پر دراوڑی زبانیں ہیں۔(ص ۶۳) اور پنجابی زبان کا دھارا بھی دراوڑی زبانوں سے پھوٹا ہے۔(ص ۶۲)۔آج سے ایک سو سال پیشتر اور پچھلی صدی کے نصف آخر میں شمالی ہند کی زبانوں کی اصلیت کے بارے میں دو نظریے قائم ہو چکے تھے۔محققین کا ایک طبقہ ان کو سنسکرت سے اور دوسرا دراوڑی گروہ کی زبانوں سے مشتق قرار دینے لگا تھا۔سنہ ۱۸۵۹ء میں آر جی۔لیتھام کی وضاحت (ص ۱۲۹) سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔اسی دور کے ایک دوسرے محقق جارج شرٹ نے سنہ ۱۸۷۸ء میں سندھی زبان میں دراوڑی عنصر تلاش کرنے کی کوشش کی اور اس موضوع پر ایک مضمون لکھا۔ہمارے فاضل مصنف نے وادی سندھ کی زبانوں میں دراوڑی عنصر کو اجاگر کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے اور اس موضوع پر دو باب تفصیل سے

لکھے ہیں (ص ۱۲۸۔۱۸۶) جو اس کتاب کی جان ہیں۔ مصنف نے اپنے استدلال میں موجودہ دراوڑی اور شمالی ہند کی عوامی زبانوں کے مشترکہ لغوی ذخیرہ (الفاظ افعال، ضمائر وغیرہ) کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ ایک دلچسپ ذخیرہ ہے کہ جس کی مزید چھان بین ہو سکتی ہے۔ منڈا اور دراوڑی گروہوں کی زبانوں میں مستعمل ایسے الفاظ کہ جن کے مستعار ہونے کا شائبہ نہ ہو اس مشترکہ ذخیرہ کا ایسا سرمایہ ہیں کہ جس کو بڑے شوق سے عوامی زبانوں کے ماخذ کے طور پر مانا جاسکتا ہے۔ البتہ کئی ایسے الفاظ بھی اس ذخیرہ میں پائے جاتے ہیں جو غالباً مستعار ہیں مثلاً توشہ، گماشتہ زال وغیرہ فارسی الاصل ہیں۔ دلال اور معیب عربی الاصل ہیں اور کارو (کالا black) ترکی الاصل ہے۔ (۸)

بعض مقامات پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مماثلت لغات کو بطور شواہد تسلیم کرتے ہوئے قطعی قسم کے کچھ فیصلے قلمبند کر دیے ہیں (ص ۱۲۵ اور ص ۲۱۰) تاہم ان کو بخوبی معلوم ہے کہ کئی ایک محققین محض الفاظ کے اشتراک کی بنا پر کوئی فیصلہ صادر کرنا مناسب نہیں سمجھتے تا وقت کہ اس کے صرفی ونحوی پہلو سے بھی اس کی تائید نہ ہوتی (ص ۱۹۷) لہٰذا انھوں نے آگے قدم بڑھا کر مزید تقابلی موازنہ سے دراوڑی گروہ اردو اور پنجابی کے درمیان صرفی ونحوی مماثلت کی مثالیں پیش کی ہیں جو قابل قدر اور قابل غور ہیں۔ اس کتاب کا بڑا حصہ ایسے مباحث پر مشتمل ہے کہ مجموعی طور پر اس کا نام ''شمالی ہند کی عوامی زبانوں کا لسانی خمیر'' بھی تجویز کیا جاسکتا ہے لیکن مصنف کے سامنے ایک خاص مقصد یہ تھا کہ اردو زبان کی قدیم تاریخ کا سراغ لگایا جائے لہٰذا کتاب کا نام بھی ''اردو زبان کی قدیم تاریخ'' ہی رکھا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں فاضل مصنف نے جو مقدمات اور نتائج پیش کیے ہیں وہ یہ ہے کہ اردو سنسکرت سے نہیں نکلی بلکہ اس کا سرچشمہ وادی سندھ کی قدیم زبان ہے (ص ۵۸) اور اردو پنجابی سے مشتق ہے (ص ۸۷) ان کی مراد غالباً یہ ہے کہ وادی سندھ کی قدیم نمایندہ زبان پنجابی ہے لہٰذا وہی اردو کا سرچشمہ ہے علاوہ اس کے پنجابی اور

اردو میں بالکل ہی قریبی لسانی مماثلت موجود ہے جس سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ یہ سب غور طلب دلائل ہیں جو اس ضمن میں مزید تحقیق کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ہندوستان ،دکھن، پنجاب، سندھ اور گجرات میں اردو کی نشوونما کے نظریے ایک مدت سے پیش ہو چکے ہیں ۔راجستھانی خطہ کے حق میں بھی دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں ۔اتنے وسیع جغرافیائی خطوں میں کچھ ایسے لسانی خمیر کی موجودگی کہ جس سے مختلف لب ولہجہ اور لغات پر مبنی ایک ملتی جلتی زبان معرض وجود میں آئے، ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے کہ جس کو اس برصغیر میں ہمہ گیر لسانی ارتقاء کا مظہر قرار دیا جاسکتا ہے لہٰذا ایک نقطہ نظر سے اردو کی نشوونما کی لسانی یا جغرافیائی حد بندی کے منافی ہوسکتی ہے۔

فاضل مصنف کے اپنے لسانی اور لغوی مباحث و دلائل کا سلسلہ شمالی ہند اور خصوصاً وادی سندھ کی زبانوں تک محدود نہیں ہوتے بلکہ برصغیر کی اکثر زبانوں پر یکساں لاحق ہو سکتے ہیں۔ایک توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ پنجابی، سرائیکی اور سندھی تینوں وادی سندھ کی ہمسایہ زبانیں ہیں لہٰذا پنجابی اور سرائیکی ،سرائیکی اور سندھی اور سندھی اور پنجابی میں ایک قریبی لسانی مماثلت پائی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ بعض علما نے سرائیکی کو سندھی کا جز تسلیم کیا ہے اور ہمارے فاضل مصنف اس کو پنجابی کا ایک محاورہ شمار کرتے ہیں (ص ۷) سرائیکی جو کہ اپنے مختلف محاوروں (ملتانی، بہاولپوری، دیرہ والی وغیرہ) پر مشتمل اور پنجابی اور سندھی کی درمیانی کڑی ہے اپنی انفرادی خصوصیات کی حامل ہے۔لہٰذا سرائیکی کو وادی سندھ کی ایک مستقل زبان تسلیم کرنا حقائق کے زیادہ قریب تر ہوگا۔ ''برصغیر ہند کے لسانی جائزہ'' میں گریئرسن نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے۔

ایک محقق کے لیے اس کتاب کے ہر باب میں سوچ اور فکر کا سامان موجود ہے۔وہ بار بار سوالات پوچھ سکتا ہے اور تحقیق طلب مسائل کی طرف اشارہ کرسکتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ فاضل مصنف نے نہایت ہی پیچیدہ لسانی مسائل کا قابل داد تجزیہ

کیا ہے۔ یہ ایک خالص علمی کتاب ہے جس سے مصنف کے وسیع مطالعے موضوع سے محبت اور مسائل کی توضیح و تنقیح میں مشقت کا پتا چلتا ہے۔

اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو شمالی ہند کی عوامی زبان کی اصلیت کی نشان دہی کرتی ہے اور خصوصی طور پر منڈا، دراوڑی، سنسکرت اور وادی سندھ کی مقامی زبانوں کے باہمی تعلق اور لسانی خمیر کی کمیت اور کیفیت کی آئینہ دار ہے۔ موضوع اتنا وسیع ہے کہ باوجود ضروری وضاحت اور تفصیل کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فاضل مصنف نے سردست اختصار اور اجمال سے کام لیا ہے اور اپنی اس تصنیف میں مختلف نظریوں کے خاکے مرتب کیے ہیں تاکہ مزید تحقیق کے لیے راہیں کھل سکیں۔ بعض مقامات پر انھوں نے مزید تحقیق کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ اس سلسلہ میں مصنف خود بھی ''ہڑپائی تہذیب کے لسانی رشتے جیسے تحقیق طلب موضوع پر ایک جداگانہ کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں (ص ۹۴)''(۹)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کو اردو کے جن جن شعرا کے کلام سے خاص دلچسپی تھی ان میں مرزا غالب اور علامہ اقبال شامل ہیں۔ علامہ اقبال کے کلام اور ان کے پیغام کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''اسلام کی روح پرور تعلیم اسلامی نظام حیات کے شارح قرآن حکیم کو منبع حکمت اور حقیقت اور نبی خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشعل رشد و ہدایت ماننے اور سمجھنے والے! جسم کے بجائے روح کے راز دار اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے مبلغ! جغرافیائی تفریق اور نیشنلزم کے محدود اور مہلک تخیل کے بجائے وحدت انسانی اور ملت اسلامی کے ہمہ گیر نظریے کو پروان چڑھانے والے! سرمایہ داری اور سامراجیت یا اشتراکیت اور ملوکیت پر اسلام کے فلسفہ زندگی اور علم و فکر و عدل توحید پر مبنی نظام حیات کو ترجیح دینے والے ان کی نظر میں اشتراکیت اور ملوکیت:

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب
ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں راخروج آں را خراج
درمیان ایں دو سنگ آدم زجاج

مشرق کو پیغام بیداری دینے والے اور اقوام شرق میں احساس زیاں اور خودشناسی کا جذبہ ابھارنے والے اپنے وسائل پر انحصار اور خوداعتمادی، عسکری قوت انفرادی اور اجتماعی عزت نفس کا درس دینے والے نے یہ بتایا کہ مغرب کی اندھی تقلید سے شرق اجتناب کرے اور مغرب کے علم و ہنر کو اختیار کرے۔ مغرب کی اصل طاقت اور ترقی کا راز اس طرح سمجھایا کہ

قوّتِ مغرب نہ از چنگ ورباب
نے ز رقصِ دخترانِ بےحجاب
قوّتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

ایشیا کی انفرادیت اور اجتماعی شخصیت کی نشاندہی کی اور ایشیا میں ملت اسلامیہ کی آزادی کو پورے ایشیا کی آزادی سے تعبیر کیا۔

ربط و ضبطِ ملّتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

برصغیر ہند میں مسلمانوں کی آزاد مملکت کے قیام کے لیے فکری اور عملی جدوجہد کرنے والے پنجاب اسمبلی (لاہور) سے گول میز کانفرنس تک ایک مسلسل سیاسی عمل سے اس نظریے کی آبیاری کی مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ میں شامل ہو کر ایک صحیح اور مثبت کردار ادا کیا تا آنکہ خطبہ الہ آباد میں برصغیر میں ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا

گویا قیام پاکستان کی پیش گوئی کی۔''(۱۰)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے اردو میں ایک تحقیقی مضمون بہ عنوان ''حضرت نظام الدین اولیا کی سندھ میں آمد'' لکھا تھا۔ اس مضمون میں وہ مضبوط دلائل کی بنیاد پر تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت کی سندھ میں آمد ثابت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''شہادت کے مزید تجزیہ کے لیے تاریخی ماخذوں سے رجوع کیا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں خطہ ملتان کے عرفاء نے مسلک چشتی اور مسلک سہروردی کی روشنی میں اصلاح نفس اور صحیح عمل کے لیے اپنی متصوفانہ تبلیغ کا دائرہ ایک طرف سندھ اور دوسری طرف ہند تک بڑھادیا۔ ملتان کے عارف بہاء الدین زکریا غوث (وفات ۶۶۱ھ) سہروردی مسلک کے شیخ تھے اور پاک پتن کے فریدالدین مسعود گنج شکر (وفات ۶۶۴ھ) سلسلہ چشتیہ کے شیخ تھے۔ غوث بہاء الدین زکریا نے جنوب کی طرف راجستھان اور سندھ پر توجہ فرمائی اور سندھ میں ان کا فیض عام ہوا۔ شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر نے ہند کی طرف توجہ فرمائی اور دہلی چشتی مسلک کا مرکز بن گیا۔

روایت ہے کہ جب سندھ کا ذکر آیا تو شیخ فریدالدین نے فرمایا کہ سندھ برادر بہاءالدین کی زمین ہے۔ تاہم انھوں نے سندھ کو یاد فرمایا جس کا ذکر 'فوائد الفواد' ملفوظات شیخ نظام الدین اولیا تالیف امیر حسن سجزی (ف ۷۳۶ھ/ ۱۳۳۵ء) میں اور اس کے بعد 'سیئر الاولیا' تصنیف مولانا حامد بن فضل الدین جمالی (ف ۹۳۴ھ/ ۱۳۳۶) میں موجود ہے۔ ان دونوں ماخذوں سے تصدیق ہوتی ہے کہ شیخ فریدالدین نے عارف نام اپنے خلیفہ کو سیوستان (سندھ) بھیجا تھا اور جب وہ واپس آئے (تو ان کے اچھے کام سے) خوش ہو کر انھیں خلافت نامہ عطا کیا اور فرمایا کہ وہ پھر سے سیوستان جائیں۔ خلیفہ عارف نے معذرت کی کہ اتنی بڑی ذمہ داری کا کام اس ضعیف کے بس سے باہر ہے اور مکہ شریف جانے کی اجازت مانگی۔ شیخ نے اجازت دی اور وہ مکہ شریف گئے جہاں سے ان کی واپسی

نہ ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام جو سندھ میں شروع ہوا تھا شیخ اس کو جاری رکھنا چاہتے تھے اس لیے خلیفہ عارف کو دوبارہ سندھ بھیجنا چاہتے تھے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ شیخ کے کسی دوسرے خلیفے کے نظام الدین اولیاؒ نے اس کی طرف توجہ فرمائی ہو اس لیے کہ وہ شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر سے فیض یاب ہونے کے لیے دہلی سے اجودھن (پاک پتن) آتے رہتے تھے اور ان کو سندھ پر اپنے شیخ کی توجہ کا علم تھا۔ سیر الاولیا اور سیئر العارفین میں ذکر ہے کہ نظام الدین اولیاؒ پاک پتن آئے تھے اور شیخ فرید کے جماعت خانے میں ٹھہرے تھے۔ یہ محقق ہے کہ وہ تین بار دہلی سے پاک پتن میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پہلی بار ۶۵۵ء (۱۲۵۷ء) میں آئے اور یوم اربع'' کو وہ شیخ کی خدمت میں حاضر تھے۔ آخری بار جمادی الاول سنہ ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۵ء میں آئے جب شیخ نے ان کے حق میں دعا فرمائی اور واپس جانے کی اجازت دی۔

ظاہر ہے کہ نو سال (۶۵۵۔ ۶۶۴ھ) تک نظام الدین اولیاؒ کی توجہ ملتان سے قریب اپنے شیخ کے مسکن پاک پتن کی طرف رہی۔ اس کے علاوہ خطہ ملتان سے وہ اپنے مرید امیر خسرو کے توسط سے بھی مانوس تھے۔ امیر خسرو نے جوانی میں اپنی ایک غزل میں ٹھٹھہ کا نام لیا ہے:

سرو چون تو در اچہ و در تتہ نباشد
گل مثل رخ خوب تو البتہ نباشد

بعد میں امیر خسرو پانچ سال (۶۷۸۔ ۶۸۳ھ) تک سلطان غیاث الدین بلبن کے فرزند خان شہید کے ساتھ ملتان میں رہے۔

میرا گمان ہے کہ امیر خسرو ملتان سے غالباً سندھ تب آئے جب وہ قید مغول سے آزاد ہوئے۔ سندھ کی موسیقی ''کافی'' سے آگاہ ہوئے اور کافی کو اپنے نظام موسیقی میں اپنایا۔

ان قرائن کے باوجود کہ شاید نظام الدین اولیاؒ ملتان سے سندھ گئے ہوں، کوئی

یقینی حوالہ اس کی تصدیق میں دستیاب نہ ہوا تا آنکہ اپنے کرم فرما سیّد نفیس الحسینی مدظلہ العالی کے یہاں (ادارہ النفائس، نفیس منزل ۱۷۷۔ کریم پارک راوی روڈ لاہور) حاضر ہوا۔ جب اس موضوع پر گفتگو ہوئی تو فرمایا کہ خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے ملفوظات میں اس کا ذکر ہے۔ سال (۱۴۲۲ھ) میں سیّد نفیس رقم جب عازم حرمین شریفین تھے تو کراچی جاتے ہوئے حیدرآباد میں راقم کو زیارت کا شرف بخشا اور اپنے حوالے کی تصدیق کی۔ بعد میں مطبوعہ ملفوظات (شائع کردہ نفیس اکیڈمی، اسٹریچین روڈ کراچی) میں سے وہ صفحات ارسال فرمائے جن میں یہ ذکر فارسی متن اور اردو ترجمہ میں موجود ہے۔

میں جناب سیّد نفیس رقم صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس نہایت ہی ثقہ اور اہم ماخذ کی طرف میری توجہ دلائی اور حوالہ فراہم کیا جس سے تحقیق ہوا کہ شیخ نظام الدین اولیاء ٹھٹہ تشریف فرما ہوئے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شمالی سندھ میں سے گذرے اور شہر ٹھٹہ گئے ہوئے تھے، اور جب وہ وہاں تھے، اس عرصہ میں ان کے مریدوں کے درمیان ملفوظات کی شہرت ہوئی اور اس سے تائید ہوتی ہے کہ نظام الدین اولیاء سندھ کے شہر ٹھٹہ اور اس کے گردونواح میں کچھ وقت رہے۔ لہٰذا ہوسکتا ہے کہ میرپور بٹھورو کے نزدیک ویرانے میں جو قبر ہے، جس کے پہلو پر شاہ نظام کندہ ہے وہ نظام الدین اولیاء کے کسی مرید کی ہو۔ لیکن پیر آدم کلمتی کے بارے میں کافی وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ تھے کیونکہ وہاں پر شاہ نظام دہلی کی طرف چلہ منسوب ہے۔ تاہم ان آثار وروایات کی اہمیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور اہم حوالہ غور طلب ہے۔ سندھ کے قدیم شہر اگھم کوٹ (ضلع حیدرآباد) کے جو آثار ہیں ان میں ایک روضہ شیخ بایزید کا ہے اور یہ شیخ باجید (بایزید) شیخ فرید شکر گنج پاک پتن والے کے پڑپوتے تھے۔ راقم کو یہ بات یہاں کے باخبر مجاور مرحوم غلام نبی نے بتائی جب میں ۱۹۵۹ء میں اگھم کوٹ (اگھامانو) کے تاریخی

آثار کے معائنہ کے لیے آیا۔ اگھم کوٹ میں مشہور ولی مخدوم محمد اسمٰعیل سومرہ (وفات ۹۷۵ھ) کی درگاہ ہے اور اس درگاہ کے مجاور دسویں صدی ہجری میں حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ (دہلی) سے یہاں آئے۔ شجرہ بیان کرتے غلام نبی مرحوم نے بتایا کہ یہاں پر مقیم مجاوروں کے جدامجد مخدوم ابراہیم تھے جو دہلی سے یہاں آئے۔ شجرہ کے مطابق مخدوم محمد اسمٰعیل سومرہ، مخدوم ابراہیم اور اجمیر کے میراں داتار شہید تینوں ہم زلف تھے اور ان کے گھروں میں تین ہمشیرہ ویراول (حدود جوناگڑھ) کے امیر یا بزرگ کی صاحبزادیاں تھیں۔ مزید بتایا کہ پاکستان سے پہلے یہاں کے بزرگ اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے دہلی جایا کرتے تھے۔"(۱۱)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کا اردو زبان میں ایک اہم اور قابل غور مقالہ "نظریاتی مملکت میں ادیب کا کردار" ہے۔ اس موضوع پر وہ تحریر فرماتے ہیں:

"ایک نظریاتی معاشرے یا مملکت کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ وہ اندرونی طور پر اپنے نظریے کی نشوونما پر خصوصی توجہ دے اور بیرونی طور پر اپنی نظریاتی حدود کی حفاظت کرے لیکن اگر معاشرہ یا مملکت اس میں تغافل برتے یا اس سلسلے میں جو اقدام کرے وہ سوچ اور تدبر سے نہ کرے تو پھر اختلافات اور انتشار کی ذمہ داری اس معاشرے و مملکت پر بھی عائد ہوتی ہے۔

ضروری ہے کہ پاکستان میں ہم خود سے یہ سوال پوچھیں اور سوچنے کے بعد دیانت داری سے اس کا جواب دیں کہ صحیح اسلامی معاشرے کے کیا کیا تقاضے ہیں اور وہ کیسے پورے ہو سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی فکر کی رو سے اسلامی معاشرے میں ادیب کا مقام نہایت بلند ہے۔ ان کا فکر ان کے اعمال اور افعال سب کے سب شائستگی اور سنجیدگی کا مظہر ہوتے ہیں۔ ادیب نام ہی اس کردار کا ہے کہ جس میں حسن ادب اور شائستگی ہو۔ اسلامی فکر کے اعتبار سے ادیب کا مفہوم محض تحریر اور تصنیف کی صلاحیت

یا شاعری میں مہارت تک محدود نہیں بلکہ اس سے وسیع تر ہے۔شاعر، فلسفی، مورخ، نجومی ،طبیب، ماہر لغت، ریاضی دان، اور مختلف علوم میں مہارت رکھنے والے دوسرے علماء جن کو آج کل کی اصطلاح میں سائنسدان کہا جاتا ہے یہ سب کے سب ادیبوں میں شمار ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ان کی مخصوص علمی مہارت کے ساتھ ساتھ ان میں حسن عقیدہ اور حسن کردار بھی ہو۔اسلامی روایات کی روشنی میں ان سب کو مشہور مصنف یاقوت نے اپنی بلند پایہ کتاب معجم الادباء یا ارشاد الاریب میں بجا طور پر ادیب شمار کیا ہے۔

اسلامی فکر کی روشنی میں ادیبوں کے کردار کو اگر مزید تفصیل سے بیان کیا جائے تو کچھ اس طرح کہنا ہوگا کہ وہ کتاب کے سطحی مفہوم سے زیادہ تر کتاب کی معنوی حکمت اور حقیقت کو سمجھتے ہیں۔اپنے تحریری یا زبانی خطاب کو سامعین کی سوجھ بوجھ کی سطح پر پیش کرتے ہیں۔احسن طریقے سے استدلال کرتے ہیں۔طعنہ زنی اور دشنام طرازی سے پرہیز کرتے ہیں تاکہ مخالف ان پر طعنہ زنی اور دشنام طرازی سے کام نہ لے۔وہ تنقید و موازنے میں انصاف برتتے ہیں۔اختلاف کی صورت میں وہ مخالف کو اور خود کو یہ حق دیتے ہیں کہ ''لکُم دینُکم وَلِیَ دِین''حسن کردار ہی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ملک وملّت اور انسان کی خدمت کا نیک جذبہ ان کے کردار کا منبع ومشرب ہوتا ہے۔خود پرستی کے بجائے حق پرستی اور غرور اور گھمنڈ کے بجائے تواضع اور انکساری ان کا خصوصی شیوہ ہوتا ہے۔وہ چلتے ہیں تو بھی دھیرے نرم خرام چلتے ہیں۔وہ لغو اور پست افکار اور افعال سے اپنا دامن بچا کر عزت سے گزر جاتے ہیں۔

اسلامی فکر کی رو سے وہ شخص جو کتابی مطالعے اور تحریر و تصنیف میں دسترس رکھتا ہو مگر اخلاقی پستی کی طرف جھکا ہوا ہو اور جس کا کردار انسانی زندگی کی اعلیٰ قدروں کے خلاف ہو وہ ادیب کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔جو کتابیں پڑھتا ہو، مضامین لکھتا ہو یا شعر کہتا ہو، مگر اعزاء واقارب کا پاس نہ رکھتا ہو، جو محلہ اور پڑوسی کا بھی خواہ نہ ہو، جو وطن کی حب سے

عاری ہو، جو انسانی ہمدردی سے خالی ہو، جس کے قول اور فعل میں تضاد ہو، اور جو اپنی گفتگو تحریر اور تصنیف میں پست موضوعات اور پست خیالات کی طرف مائل ہو تو ایسا لکھا پڑھا، ذہین اور ہوشیار مصنف اور مقالہ نگار کہلا سکتا ہے لیکن ادیب نہیں کہلا سکتا۔ اس نے محض کتابی مطالعہ اور معلومات کا بے نتیجہ بوجھ اٹھا رکھا ہے، مگر نہ وہ خود اس سے صحیح معنوں میں مستفید ہوتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ لغت کے مفہوم میں ادیب کے معنی ایسے عالم کے ہیں کہ جو علم و ادب میں دسترس رکھتا ہو، لیکن علم و ادب کا اصطلاحی مفہوم بھی ادب کے مفہوم پر مبنی ہے۔ قرون اولیٰ والے اسلامی معاشرے کے علمی اور عملی احقائق کی روشنی میں نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ادیب وہ ہے جس کے عقیدے، ارادے، علم اور کردار میں حسن نمایاں ہو۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے بڑے ادیب تھے اور ان کا کردار اسوۂ حسنہ والا مثالی کردار تھا، آپ نے وضاحت فرمائی کہ ادبنی ربی فاحسن تادیبی۔ اب تک تو یہ ہے کہ اس حقیقت افروز ارشاد کو وعظ کے طور پر یاد رکھا جائے۔ دوسرا یہ کہ اس حدیث عالی سے صحیح نتیجہ اخذ کر کے اس کو عملی طور پر اپنایا جائے۔ پیغمبر عالی جناب کا مودب تو خالق اکبر ہی ہو سکتا ہے، اور ان کے تادیب کا مقام سوائے اس کے ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ احسن ترین ہو لیکن انسانی معاشرے کی رہنمائی کے لیے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ادیب خود بخود پیدا نہیں ہوتے بلکہ ان کی نشوونما کے لیے مودب اور تادیب دونوں کی ضرورت ہے اور مزید یہ کہ جو بھی حالات ہوں ان میں مودب اعلیٰ پایہ کا ہو اور طریقہ تادیب بھی احسن ہو۔ نتیجے کے طور پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلامی فکر کے اعتبار سے اسلامی معاشرے اور مملکت میں ادیب کا مقام اعلیٰ و ارفع ہے کیونکہ اس کا کردار مثبت اور حسین ہے لیکن اسلامی معاشرے میں ادیب خود بخود پیدا نہیں ہوتے وہ تعلیم و تربیت اور تادیب کے اصولوں پر مبنی نظام تعلیم سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ

بنیادی نشوونما کے بعد ادیب کے کردار کو استوار کرنے اور حسین تر بنانے کے لیے مسلسل
ترغیب لازمی ہے تاکہ اس کے سماجی وفکری تجزیے تخلیقی اور تعمیری ہوں۔''(۱۲)

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تین یادگار اردو تحریریں

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کا تمام عمر علم وتحقیق سے مضبوط تعلق قائم رہا۔ان کی عادت تھی کہ وہ علمی اور تحقیقی کاموں میں نہ صرف بھرپور حوصلہ افزائی کرتے بلکہ ہر ممکن معاونت بھی کرتے۔اگر اردو زبان میں بھی کوئی تحقیقی کام کرتا تو ڈاکٹر صاحب بڑی خوشی اور خندہ پیشانی سے حوصلہ افزائی کرتے۔اگر کوئی ڈاکٹر صاحب سے کتاب کے لیے مقدمہ، پیش لفظ یا فلیپ لکھنے کی گزارش کرتا تو خوشی سے لکھ کر دیتے۔اب ہم اردو زبان میں لکھی ایسی ہی دو یادگار تحریریں نقل کرتے ہیں۔ان میں سے پہلی تحریر ڈاکٹر وفا راشدی کی محققانہ تالیف ''تذکرہ علمائے سندھ'' کے تعارف پر مشتمل ہے۔یہ تحریری تعارف ڈاکٹر وفا راشدی کی کتاب ''میرے بزرگ میرے ہم عصر'' مطبوعہ ۱۹۹۵ء کے بیک ٹائٹل پر شائع ہوا تھا۔ایک ملاقات کے دوران ڈاکٹر وفا راشدی مرحوم نے راقم الحروف سے فرمایا تھا کہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے یہ تحریر ان کی گزارش پر فی البدیہ لکھ کر دی تھی۔ڈاکٹر بلوچ صاحب اس تعارف میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''ڈاکٹر وفا راشدی صاحب ایک لائق فائق ادیب اور محقق ہیں جن کی جستجو کا دائرہ کافی وسیع ہے۔انھوں نے اپنی بیش بہا تصانیف میں ہمارے لیے موجودہ دور کے اردو ادب اور شاعری کے قیمتی مواد میں سے کافی کچھ محفوظ کر لیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ سندھ کی تاریخ اور سندھی ادب پر بھی ان کی خاص توجہ رہی ہے اور اس شعبہ میں ''مہران نقش'' مطبوعہ ۱۹۸۶ء ان کی قابل قدر کتاب ہمارے سامنے آچکی ہے جس میں شعرا کے ساتھ ساتھ سر برآوردہ علما کا ذکر بھی کافی موجود ہے۔
>
> اب محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحقیق کا دائرہ کافی وسیع کر دیا ہے اور ان کے سامنے تذکرہ علمائے سندھ مرتب کرنے کا منصوبہ ہے۔یہ اس تذکرے کی پہلی جلد ہے اور

دوسری جلد پر کام جاری ہے۔ان شاء اللہ وہ اپنی انتھک کوشش سے اس منصوبے کو پایہء تکمیل تک پہنچائیں گے۔

اس جلد میں شروع ہی سے ہر عالم کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی دینی خدمات اور ان کی تصانیف کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔مزید یہ کہ تاریخی واقعات اور اہم حالات کے سلسلے میں جن ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے، ان کے حوالے فراہم کیے گئے ہیں۔

امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس قلمی کوشش اور کاوش میں کامیاب ہو کر آگے قدم بڑھائیں گے۔اللّٰھم زد فزد''

اسی طرح کا ایک یادگار اردو زبان میں لکھا ہوا پیش لفظ سیّد ادیب حسین کی کتاب ''کراچی اور اس کی بندرگاہ'' کے لیے لکھا تھا۔اس پیش لفظ میں بلوچ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''شہر کراچی اور کراچی کی بندرگاہ کی ایک طویل تاریخ ہے جس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے تا کہ اس تاریخ کے جملہ خدوخال روشن ہو سکیں۔ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ جو کچھ ہمارے علم میں ہے اس کو صحیح طریقے سے اور سہل زبان میں نوجوان نسل کے سامنے لایا جائے۔سیّد ادیب حسین صاحب نے اردو زبان میں یہ کتاب مرتب کر کے قابلِ تعریف خدمت انجام دی ہے۔یہ کتاب اس لیے بھی اہم ہے کہ مولف نے کراچی بندرگاہ پر گزارے پینتیس سالوں کے اپنے تجربات کے ساتھ وہاں کے ریکارڈ اور مختلف کتابوں میں سے ان حوالوں کو جو بندرگاہ سے متعلق تھے احسن طریقہ پر جمع کر دیا ہے۔

ساحلی تجارت کے لیے کراچی کے محل وقوع کی اہمیت کو پہلی بار میر فتح علی خان تالپور کے عہد میں محسوس کیا گیا اور بندرگاہ کی حفاظت کے لیے میر صاحب کے حکم سے قلعہ منوڑا تعمیر ہوا۔مصنف نے اس کتاب میں تالپور دور کے ترقیاتی تعمیری دور اور بعد میں برطانوی حکومت کی سیاسی مصلحتوں اور منصوبوں کی تکمیل کے لیے بندرگاہ کے ترقیاتی

کاموں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

مزید تحقیق و تدقیق کی گنجائش کے باوجود یہ کتاب شہر کراچی اور اس کی بندرگاہ کے بارے میں تاریخی حوالوں سے بھرپور اور نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ کا درجہ رکھتی ہے۔

لائق مصنف سیّد ادیب صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سہل اردو میں اتنی جامع کتاب لکھ کر شہر کراچی کے ساتھ اپنے ادارے کا حق بھی احسن طریقے سے ادا کیا ہے۔"

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی ایک یادگار اردو تحریر وہ ہے جو انھوں نے دیوانِ فرید مرتبہ نور احمد خان فریدی کے مقدمے کے طور پر بہ عنوان 'تقریب' لکھی۔ یہاں ہم ڈاکٹر صاحب کی یہ یادگار اردو تحریر نقل کرتے ہیں:

"امامِ شریعت سرکارِ طریقت، قطب الموحدین حضرت خواجہ غلام فرید علیہ الرحمہ چشتی نظامی کا شمار اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے، آپ نے ۱۹۰۱ء میں انتقال فرمایا۔ تقریباً ایک صدی ہونے کو آئی لیکن آپ کی یاد ابھی تک تازہ ہے۔ آپ کے مریدوں کا تو کوئی شمار نہیں بڑے بڑے تاجدار اور مشائخ وقت آپ کی غلامی پر ناز کرتے تھے اور اب بھی آپ کا نامِ نامی اسم گرامی سنتے ہی ارداتمندوں کی نگاہیں فرطِ ادب سے بے اختیار جھک جاتی ہیں۔ خواجہ صاحب اپنے آباء کرام کی طرح وحدت وجودی مسلک کے بہت بڑے داعی اور مبلغ تھے۔ حسنِ ازل کے سچے پرستار تھے آپ کے نزدیک کائنات کا ہر پیکر حسن ازل کا ایک حصہ ہے۔ جسن محیط کل ہے۔ امر ہے۔ لافانی ہے اس کا شیدائی یوم الست سے ہی سکر اور خمار کی مستی لے کر آتا ہے۔ جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے:

در رند الستوں ہیں مخمور

محبوبِ ازل جب اپنے بندے پر مہربان ہوتا ہے تو اس پر کشف اور الہام کی نوازشات شروع ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کی دلدازیوں کو جمال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ وجود مطلق جلال میں آتا ہے تو پھر کس کی مجال ہے کہ اسے ایک آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ

سکے۔اس کی طرف سے مکرر سہ کررااس امر کا اظہار ہونے لگتا ہے۔کہ ہم تک کسی کی رسائی نہیں ہوسکتی اسی شان جلالی سے عشاق کی جان جاتی ہے اور بڑے بڑے اہل اللہ کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔چنانچہ خواجہ صاحب پر بھی ان کیفیات کا نزول ہوتا رہتا تھا۔اس وقت بے اختیار آپ کی زبان سے کافیوں کی صورت میں جذبات کا اظہار ہونے لگتا تھا۔آپ نے شاہ لطیف بھٹائی، سچل سرمست،شاہ حسین لاہوری اور بلھے شاہ قصوری (رحمہم اللہ) کی طرح اپنی مادری زبان کو اظہار جذبات کا ذریعہ بنایا اور ایسے درد انگریز اسلوب میں قلبی کیفیات کو ظاہر فرمایا کہ خود بھی روئے اور دنیا کو بھی تڑپا دیا۔آپ کے کلام میں اتنا سوز و گداز ہے کہ جو شخص سرائیکی نہیں جانتا اس کے دل پر بھی بے اختیار کرب و بے چینی کے آرے چلنے لگتے ہیں۔

مولانا نور احمد خاں فریدی خواجہ صاحب کے عقیدتمندوں میں بڑا مقام رکھتے ہیں اور 'تذکرہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی' اور 'تاریخِ ملتان' جیسی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔جیسا کہ انہوں نے مقدمہ میں لکھا ہے دیوان شریف کے ترجمہ اور شرح کو مدون کرنے کے لئے انہوں نے صرف خواجہ صاحب کے ملفوظات اور دوسری عارفانہ کتب پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ اپنے سلسلہ کے اکابرین سے بھی برابر مستفید ہوتے رہے ہیں ۔مولانا ایک واسطے سے خواجہ صاحب کے مرید ہیں۔میرا یقین ہے کہ مرید نے اپنے شیخ کے سوز گداز اور جذب واثر سے بہرۂ وافر پایا ہے اور خداوند کریم نے تصوف کے اسرار ورموز کو سمجھنے کے لئے ان کے سینے کو کھول دیا ہے اور انہوں نے اپنے شیخ کے کلام کی تشریح ایسے پیارے اور موثر اسلوب اور انداز میں کی ہے،جس سے قارئین کو خواجہ صاحب کے کلام کو سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوگی یہ تصنیف چودہ سو سے زیادہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ۔اس کے ترجمہ اور تشریحات میں جگہ جگہ ماخذ اور ان کے اقتباسات نظر آتے ہیں۔کہیں کہیں مختلف آراء پر جرح ومحاکمہ بھی ملتا ہے جس سے صحتِ روایت اور بیان کی متانت

کا پورے طور پر اندازہ ہوسکتا ہے۔مولانا نے خواجہ صاحب کے حالات کو بھی نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔حضرت خواجہ صاحب اپنے مہمانوں، مریدوں اور درویشوں سے کس طرح ملتے تھے،لنگر خانے کا انتظام کیا تھا،آپ کے دسترخوان کی کیفیت کیا تھی، آپ کے تصرفات اور ملفوظات، مریدوں کی تربیت، اصلاح احوال کا انداز جود سخا، مخالفین سے مروت ،معتقدات ،فلسفہ ہمہ اوست ،خواجہ صاحب کی شاعری حسن وعشق ،ہجر وفراق ،رجائیت ،صوفیانہ اصطلاحات ،خواجہ صاحب کے مجددانہ تصرفات، اصطلاحات کے استعمال کا انداز، وسعت مطالعہ، وغیرہ سب پر مولانا نے سیر حاصل بحث کی ہے۔الغرض مولانا کی یہ کاوش اپنی افادیت کے سبب بے حد اہم ہے۔جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔حضرت خواجہ فرید ان کے حالات زندگی اوران کے عارفانہ کلام اس تفصیل اور تحقیق سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ۔مولانا کی جگہ کاوی کا عظیم شاہکار دو مجلدات کی صورت میں ہدیہ ناظرین ہے۔سرائیکی زبان اور خواجہ صاحب کا یہ شعری مجموعہ برصغیر کے کسی ایک صوبہ سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اہل پنجاب سے زیادہ سندھی اور بلوچ اس کے دلداہ اور شائق ہیں۔ امید ہے کہ پاکستان کے سرکاری اور غیر سرکاری کتب خانے اسے اپنی الماریوں کی زینت بنائیں گے اور صوفی مذاق حضرات اس کے مطالعہ سے اپنا قلوب کو منور کریں گے۔وما توفیقی الا بااللہ العلی العظیم

حواشی باب نمبر 19

۱۔ ملاحظہ فرمائیں ''سندھ میں اردو شاعری'' از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ص ۱

۲۔ ملاحظہ فرمائیں پیش لفظ کتابچہ ''طلبہ اور تعلیم۔ قائدِ اعظم نے کیا سوچا اور کیا کہا۔''

۳۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء کو جبل پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جبل پور میں اور انٹر میڈیٹ ۱۹۳۱ء میں علی گڑھ سے کیا۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم اے اور ۱۹۴۷ء میں ناگپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی اور پھر ۱۹۵۹ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ تقسیمِ برصغیر سے قبل آپ ناگپور یونیورسٹی کے صدر شعبہء اردو رہے۔ تقسیم کے بعد آپ کراچی تشریف لے آئے اور اردو کالج میں صدر شعبہ اردو کے طور پر ۱۹۵۶ء تک خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۶ء میں علامہ آئی آئی قاضی کے ایما پر سندھ یونیورسٹی حیدرآباد میں بحیثیت صدر شعبۂ اردو تقرر ہوا۔ اس عہدے پر آپ ۱۹۷۶ء تک فائز رہے اور بے شمار طالب علموں کو فیض یاب کیا۔ ۱۹۷۶ء سے وفات تک آپ سندھ یونیورسٹی میں بطور پروفیسر ایمریطس خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد ۸۵ سے زائد ہے۔ ۲۵ ستمبر ۲۰۰۵ء کو حیدرآباد (سندھ) میں آپ نے وفات پائی۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ایک عظیم استاد ہونے کے باوصف ایک بلند پایہ روحانی شخصیت اور سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگ بھی تھے۔ آپ نے اپنے اخلاق اور تعلیمات سے بے شمار افراد کو فیض پہنچایا۔

۴۔ ملاحظہ فرمائیں ''سندھ میں اردو شاعری'' از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

۵۔ ملاحظہ فرمائیں ''دیوان شوق افزا'' کا مقدمہ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

۶۔ ملاحظہ فرمائیں مولانا آزاد سبحانی۔ تحریک آزادی کے ایک مقتدر رہنما'' از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔

۷۔ ملاحظہ فرمائیں ''دیوانِ ماتم'' کا پیش لفظ از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔

۸۔ ملاحظہ فرمائیں مقدمہ برائے کتاب ''اردو زبان کی تاریخ'' از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔ یہ مضمون کتاب ''گلشنِ اردو'' مرتبہ محمد راشد شیخ کے ص ۱۳ پر موجود ہے

۹۔ملاحظہ فرمائیں کتاب ''گلشنِ اردو'' مرتبہ محمد راشد شیخ ، ص ۱۳
۱۰۔ملاحظہ فرمائیں کتاب ''گلشنِ اردو'' مرتبہ محمد راشد شیخ ، ص ۲۲
۱۱۔ملاحظہ فرمائیں کتاب ''گلشنِ اردو'' مرتبہ محمد راشد شیخ ، ص ۲۵
۱۲۔ملاحظہ فرمائیں کتاب ''گلشنِ اردو'' مرتبہ محمد راشد شیخ ، ص ۳۹

باب نمبر 20

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ
بحیثیت ماہرِ تعلیم اور ان کی تعلیمی خدمات

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ دیگر خصوصیات کے باوصف ایک نامور ماہرتعلیم بھی تھے۔ وہ ان باکمال انسانوں میں شامل تھے جن کی شخصیت اور خدمات وسیع الاطراف اور وسیع الموضوعات ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب دیگر شعبوں کے ساتھ ساتھ ایک قابل استاد اور تعلیمی ماہر بھی تھے ستمبر 1951ء میں علامہ آئی آئی قاضی کی فرمائش پر آپ نے سندھ یونیورسٹی کے پہلے پروفیسر کی ذمہ داری سنبھالی اور شعبہ تعلیم کا بحیثیت ڈائریکٹر آغاز کیا(۱)۔ دوسرے الفاظ میں سندھ یونیورسٹی میں شعبہ تعلیم کے آپ ہی بانی تھے اس کے بعد شعبہ سندھی کا آغاز آپ ہی نے کیا اور اس شعبہ کا اعزازی پروفیسر اور سربراہ بھی بنے (۲)۔ شعبہ سندھی میں ڈاکٹر صاحب ہی نے تحقیق کا آغاز کرایا تحقیق کا اندازہ اس حقیقت سے لگائیں کہ 1953ء سے 1961ء تک ایم اے فائنل کے لیے 50 مقالات لکھے گئے جن میں سے 35 مقالات معروف انگریزی کتابوں کے نوٹ اور حواشی کے تراجم ہیں اور 15 مقالات طبع زاد ہیں ۔بعد میں ایم اے ان مقالات میں سے چار شائع بھی ہوئے (۳)۔ سندھ یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم میں ڈاکٹر صاحب 1951ء سے 1976 تک سربراہ رہے اور اس شعبے کے علمی وقار اور معیار کو بلند سے بلند تر کیا۔

ڈاکٹر صاحب ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ تعلیم ہی کسی قوم کا اصل اسلحہ ہوتا ہے اور تعلیم یافتہ قوم کوئی شکست نہیں دے سکتا(۴)۔ تعلیم میں بھی خصوصاً ابتدائی تعلیم کی اہمیت کا بہت زیادہ ذکر کرتے۔ ڈاکٹر

صاحب نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ بھی تعلیم کے موضوع پر ہی لکھا تھا۔ وہ صرف کتابی تعلیم ہی کے ماہر نہیں تھے بلکہ انھوں نے اپنے ذاتی سرمائے سے بھی عملی طور پر تعلیم کے فروغ میں حصہ لیا جس کی تفصیل آگے پیش کی جائے گی۔

شعبۂ تعلیم اختیار کرنے کی وجوہات

ایک انٹرویو میں ڈاکٹر صاحب نے شعبۂ تعلیم اختیار کرنے کی وجوہات یوں بیان کی تھیں:

''میں سوچا کرتا تھا کہ وہ کون سا پیشہ ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے ممتاز کرتا ہے وہ میرے نزدیک اعلیٰ کردار کے معلم کا پیشہ ہے۔ معلم کا درجہ بہت بلند ہے وہ طلبہ کا روحانی باپ اور قوم کا معمار ہوتا ہے۔ آئندہ نسلوں کی سیرت سازی اس کے ذریعے ہوتی ہے اس لحاظ سے اسے اعلیٰ اوصاف و کردار کا مالک ہونا چاہیے۔ (۵)

جب میں نے معلم کا پیشہ اختیار کیا اس وقت پاکستان کو عملی افراد کی ضرورت تھی جو مادر وطن کی ترقی کا کام کرسکیں۔'' (۶)

ڈاکٹر صاحب زندگی کے ہر شعبے میں اخلاقی اقدار پر مضبوطی سے عمل کرنے پر زور دیتے تھے۔ اسی حوالے سے لکھتے ہیں:

''علم خواہ کوئی بھی ہو، اس علم کے پس پردہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا احساس اپنے اندر قائم رکھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس علم سے اخلاقی قدروں یا انسانی بقا پر کوئی آنچ نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان اور ایقان ایسی کسوٹی ہے جس کی وجہ سے انسانی معاشرے کی اخلاقی بنیادیں قائم رہتی ہیں۔ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر یہ اخلاقی بنیاد موجودہ ترقی میں شامل ہوجاتی تو ایٹم بم کے دھماکوں سے لاکھوں افراد ہلاک و مجروح نہ ہوتے اور آتشیں ہتھیار جمع کرنے کا جنون قوموں میں پیدا نہ ہوتا اور ایٹمی ہتھیاروں کا اتنا ڈھیر نہ لگ جاتا جو کسی طفلانہ غلطی سے اگر پھٹ جائیں تو نوع انسانی کو کرۂ ارض میں جائے

پناہ نہ ملے۔ان ہتھیاروں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ کرۂ ارض کئی مرتبہ تباہ ہوسکتا ہے۔
اگر نظریہ تعلیم کا یہ بنیادی اصول اخلاقیات آج سائنسدانوں،علمی مفکروں اور دانشوروں کا
معیار بن جائے تو سائنس کسی بھی طور پر انسان کے لیے باعث نقصان نہیں بنے گی۔''(۷)

تعلیم اور تعلیمی مسائل کے حل کے حوالے سے اہم انٹرویو

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ محض ماہر تعلیم ہی نہیں تھے بلکہ ہمارے تعلیمی مسائل کے حل بھی انھوں نے وقتاً فوقتاً پیش کیے۔تعلیم کے حوالے سے ان کا ایک اہم اور فکر انگیز انٹرویو ہفت روزہ ورلڈ اسلامک ٹائمز اسلام آباد میں مورخہ 4-9-1983 کوشائع ہوا تھا۔اس انٹرویو کے اہم نکات ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

''یہ نظام تعلیم ان بنیادوں پر استوار ہے جو ہمیں کالونیل دور سے ملی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ دورآزادی میں ہم نے اس نظام میں کافی تبدیلیاں کی ہیں لیکن اس کو بہتر اور مفید بنانے کے لیے کافی اصلاحات کی ضرورت ہے کیونکہ یہ نظام تعلیم پاکستان کے دولت مند طبقے کے لیے تو موزوں ہے لیکن پاکستان کے اس غریب طبقے کے لیے مناسب نہیں ہے جو کل آبادی کا اسی فیصد ہے یعنی یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ نظام تعلیم ایک مخصوص طبقے کے لیے ہے۔''

''ہمارے پاس مغربی طرز کا جو نظام تعلیم ہے وہ ہمارے لیے اجنبی نظام ہے۔وہ اجنبی اس لحاظ سے ہے کہ جہاں تک اطلاعات کا تعلق ہے وہاں تک تو مفید ہے لیکن جہاں تک جذبات واحساسات،ارادے اور کردار کی تعمیر کا تعلق ہے وہاں پر اس کی کارکردگی صفر ہے کیونکہ میرے نقطۂ نظر سے مغربی نظام تعلیم دراصل ایک تعلیم کا سلسلہ ہے،نظام نہیں ہے ،وہ ایک تنظیمی ڈھانچہ ہے لیکن صحیح معنوں میں تنظیم کا جو تصور ہمارے ذہنوں میں ہے وہ تنظیم اس میں نہیں ہے۔''

''۱۹۸۱ء میں اسلامی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس میں پاکستان میں

پہلی مرتبہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ اور کالجوں سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے والوں کو ایک جگہ جمع کیا گیا اور انھیں ایک ساتھ پڑھنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے اور یہ عمل چل رہا ہے تاکہ جدید و قدیم علوم رکھنے والے ایک دوسرے کے قریب آئیں اور وہ ان دونوں نظام ہائے تعلیم سے مستفید ہوں۔''

''صرف جدید سائنس و ٹکنالوجی کے علوم ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس علم کی بھی ضرورت ہے جو ہمارے کردار، افکار، اخلاق اور معاشرت کو بہتر بنائے اور ہم میں حب الوطنی اور اسلام کی محبت کو اجاگر کرے۔ جب تک ہم میں پاکستانیت کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا ہماری شخصیت کی تعمیر نہیں ہوگی، ہمارے کردار درست نہیں ہوں گے، ہماری روحانی تسکین نہیں ہوگی اس وقت تک نہ تو ہم خوش حال ہو سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی نظام تعلیم ہمارے لیے مفید ہوسکتا ہے۔ یہ تو درست نہیں کہ ہم صرف ذہین لوگ پیدا کرلیں لیکن ان میں وطنیت کا جذبہ نہ ہو، اپنے مذہب سے لگاؤ نہ ہو، اپنی اقدار سے محبت نہ ہو، اپنے ماضی کی روایات کا احساس نہ ہو اور اپنی تہذیب و ثقافت کی وہ پروا نہ کریں تو ایسے لوگ قوم و ملک کے لیے کس طرح مفید ہو سکتے ہیں۔''

''انگریزی دور میں سیاست کا تعلیمی شعبے میں کوئی دخل نہیں تھا اور تعلیمی ادارے سیاسی فریب کاریوں اور ہنگاموں سے بہت دور تھے۔ ہم نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ سیاست کو تعلیمی اداروں میں داخل کیا اور طلبہ کو اپنا آلہء کار بنا کر انھیں سیاسی مقاصد کی خاطر استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے تعلیمی ادارے سیاسی ادارے بن گئے۔''

''ایک اور غلطی جو ہم سے گزشتہ دور میں ہوئی وہ یہ تھی کہ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو قومی ملکیت میں لیا گیا حالانکہ حکومت کے پاس اس قدر وسائل نہیں ہیں کہ وہ تمام تعلیمی اداروں کے اخراجات برداشت کر سکے اور انھیں بہتر طریقے سے چلا سکے۔ پرائیویٹ اداروں میں لوگ خود دلچسپی لیتے ہیں اور ان کی توجہ تعلیم کی جانب مرکوز ہوتی ہے، انجمن حمایت اسلام

لاہور، سندھ مدرسہ کراچی، اور پشاور میں اسلامیہ کالج بہترین پرائیویٹ تعلیمی ادارے تھے جنھیں پرائیویٹ لوگوں یا انجمنوں نے چلایا۔''

''جب تک نظم وضبط قائم نہ ہو معیار تعلیم بہتر نہیں ہوسکتا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جب نہ استاد پڑھائیں اور نہ شاگرد پڑھیں، دونوں غیر ضروری امور میں اپنا وقت صرف کریں تو کس طرح معیار تعلیم بہتر ہوگا یا درست ہوگا۔''

''ہمارا تعلیمی سلسلہ صرف کتابوں اور لفظوں تک محدود ہے اور ہمارے بچوں کی اکثریت پرائمری یا مڈل سطح سے تعلیمی اداروں کو خیر باد کہنا شروع کر دیتی ہے کیونکہ جب ان بچوں کے والدین دیکھتے ہیں کہ نہ تو استاد پڑھا رہا ہے اور نہ شاگرد پڑھ رہا ہے اور وقت ضائع ہو رہا ہے تو بہتر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بچے کو یا تو کوئی ہنر سکھایا جائے یا اسے کاشت کاری پر لگایا جائے تا کہ جوان ہونے تک وہ روزی کمانے کے قابل ہو۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ہم اسکولوں میں عملی تعلیم کو داخل کریں اور دیہاتی زندگی کے مظاہر کو تعلیمی نصاب میں شامل کریں تا کہ طلبہ کے والدین کو علم ہو کہ ان کے بچے نہ صرف جدید علوم سے آشنا ہو رہے ہیں بلکہ اپنی روایتی ہنر کاری بھی ان کو سکھائی جا رہی ہے۔''

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا ایک اہم انٹرویو روزنامہ جنگ کراچی (ادبی صفحہ) مورخہ یکم جون ۱۹۹۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس انٹرویو میں دیگر موضوعات کے علاوہ تعلیم کے حوالے سے بھی انھوں نے مفید اور خیالات اور اپنی وسیع معلومات کا اظہار کیا تھا۔ اس موضوع پر انھوں نے درج ذیل معلومات سے آگاہ کیا:

''پاکستان میں تعلیمی حوالے سے جو کمیٹی اور کمیشن قائم کیے گئے، ان میں میں بھی شامل ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں پہلا تعلیمی کمیشن ایوب خان کے دور میں قائم کیا گیا تھا، اس کا بھی میں ممبر رہا۔ اس کے بعد میری موجودگی کو اس انداز کے کمیشن میں ضروری سمجھا گیا اور میں نے اپنی بساط کے مطابق پاکستان میں تعلیم کی بہتری اور فروغ کے لیے مشورے اور تجاویز دیں۔ ہمارے یہاں ایک بنیادی خرابی یہ ہے کہ امریکہ اور دیگر ممالک سے واپسی

پر آنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ تہذیب اور روایات میں ان معاشروں سے مختلف ہے لہٰذا ان ممالک کی چیزوں کو اسی انداز میں رکھنا مناسب نہیں ہوتا بلکہ ہمیں اپنی تہذیب اور روایات کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ پاکستانی انداز کو اختیار کیا جائے۔ اس کام کو میں نے کسی قدر آگے بڑھایا۔ یہ بھی دیکھا کہ ہمارے تعلیم کے ماہر کون تھے تا کہ ان کی مدد سے اپنے ماضی کو سمجھیں۔ قیام پاکستان سے قبل اسلامی دنیا میں تعلیم کے حوالے سے جو کام ہوا اسے بھی سامنے رکھا جائے۔ یوں مغرب کے مقابلے میں اسلامی پس منظر سامنے آجائے گا۔ برصغیر میں مسلمانوں نے طویل عرصے تک حکومت کی، اس زمانے میں تعلیم پر کس طرح سوچا گیا، یوں تحقیق کے طور پر مجھے یہ کام کرنا پڑا۔ ہم پاکستانیوں کے لیے جو بات باعث فخر ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ اسلام میں تعلیم کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ مراکش کے ایک مسلمان ماہر تعلیم جو تیسری صدی ہجری کے دوسرے عشرے میں فوت ہوئے انھوں نے سب سے پہلے طریقہء تعلیم پر کتاب لکھی تھی، اس کے بعد ان کے شاگرد نے اسی موضوع پر کتاب لکھی۔ اس زمانے میں یورپ میں لوگ تعلیم سے آشنا بھی نہیں تھے یعنی علم اور تعلیم میں جو فرق ہے اس سے لوگ واقف بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس کے بعد وسطی ایشیا میں مسلمان ماہر تعلیم پیدا ہوئے۔ ساتویں صدی ہجری میں تاشقند کے رہنے والے برہان الدین زرنوجی نے طریقہء تعلیم پر کتاب لکھی، یہ کتاب دسویں صدی تک مقبول رہی۔ ہم نے تو اس کی قدر نہیں کی لیکن کولمبیا یونیورسٹی میں اس کا انگریزی ترجمہ کیا گیا۔ سندھ میں ضلع دادو سے تعلق رکھنے والے ایک عالم مولانا جعفر بوبکانی تھے، انھوں نے ۱۳۵۰ء میں طریقہء تعلیم پر ایک کتاب لکھی۔ ہم نے اس کتاب کو تلاش کیا اور اس کا انگریزی ترجمہ کیا اور لوگوں کو پڑھایا۔ مولانا جعفر بوبکانی نے اپنی کتاب کے ایک باب میں استاد اور شاگرد کے درمیان رشتے کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ استاد کو یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ شاگرد کو بھی استاد بننا ہے، وہ کہتے ہیں کہ استاد کو اس

بات پر اصرار نہیں کرنا چاہیے کہ اس کی آمد پر شاگرد کھڑے ہو جائیں۔ یہ باتیں یورپ اور امریکہ میں کچھ عرصے پہلے آئی ہیں جبکہ ہمارے یہاں برسوں پہلے ان کو بتا دیا گیا تھا۔''

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ بحیثیت معلّم:

ڈاکٹر بلوچ صاحب ایک کامیاب معلّم تھے۔ان کا لیکچر بڑا بھرپور ہوتا اور طلبہ کو ان کا لیکچر سن کر کسی قسم کی تشنگی کا احساس نہ رہتا ڈاکٹر صاحب کی عادت تھی کہ مقررہ وقت پر کلاس میں آجاتے اور ان کے بعد کلاس کا دروازہ بند کر دیا جاتا ڈاکٹر صاحب جن شاگردوں سے تحقیقی کام لیتے ان سے خوب محنت کراتے اور جو شاگرد ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں محنت سے تحقیق کرتے اور تحقیق کے گُر ڈاکٹر صاحب سے سیکھتے، وہ اپنے شعبوں میں ناموری حاصل کرتے ایسے محنتی شاگردوں میں مقامی شاگردوں کے علاوہ ایران، فلپائن اور دیگر ممالک کے شاگرد شامل ہیں جو اپنے ممالک میں جا کر بھی ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتے اور بذریعہ خط وکتابت رابطہ رکھتے۔ بحیثیت معلم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے ۱۹۵۱ء تا ۱۹۷۳ء خدمات انجام دیں۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنے کردار اور اپنے عمل سے ایک مثالی معلم کی حیثیت سے خود کو منوایا۔ ڈاکٹر صاحب کیسے معلم تھے اس بارے میں ان کے درج ذیل محاسن سے معلوم ہوگا:

وقت کی پابندی: دورانِ معلمی خصوصاً ڈاکٹر صاحب وقت کی بہت پابندی کیا کرتے تھے ان کا اصول تھا کہ خواہ چند ہی طالب علم کیوں نہ ہوں وہ اپنے لیکچر کا آغاز کر دیتے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ بھی معمول تھا کہ طلبہ کو وقت کی پابندی کا عادی بنانے کے لئے وہ کلاس میں جب لیکچر دینے آتے تو دروازہ اندر سے بند کر دیا جاتا تاکہ تاخیر سے آنے والے طلبہ وقت کی پابندی کی عادت ڈالیں۔ ڈاکٹر صاحب کو فروغ تعلیم کی اس قدر لگن تھی کہ وائس چانسلر بننے کے باوجود وہ سندھ یونیورسٹی میں اپنا لیکچر باقاعدگی سے دیتے تھے۔

مضمون پر گرفت: ڈاکٹر صاحب مکمل تیاری کے بعد ہی لیکچر دیتے اور جس مضمون پر لیکچر دیتے اس پر ان کی مکمل گرفت ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا لیکچر سننے کے بعد طلبہ کو کسی طرح کی تشنگی کا احساس نہ ہوتا۔

طلبہ کی رہنمائی: ڈاکٹر صاحب کی یہ بھی عادت تھی کہ ایک شفیق اور مخلص استاد کی طرح ہمیشہ طلبہ کی رہنمائی کا فریضہ

انجام دیتے۔ وہ طلبہ پر انفرادی طور پر توجہ دیتے اور انھیں آئندہ زندگی کے لیے پیشوں اور شعبوں کے انتخاب میں راہنمائی فراہم کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں جو طلبہ تحقیقی کام کرتے، ڈاکٹر صاحب ان کی بھرپور رہنمائی کرتے لیکن ان سے خوب محنت بھی کراتے۔ یہی وجہ ہے کہ سہل انگار طلبہ ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں تحقیقی کام کرنے سے کتراتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ جن طلبہ نے ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں تحقیقی کام کیا ان کی محنت اور برقت رہنمائی کی بنا پر ان کا کام اعلیٰ معیار کا قرار دیا گیا۔

سندھ یونیورسٹی میں تحقیقی منصوبوں کا آغاز

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، ڈاکٹر صاحب نے علامہ آئی آئی قاضی کی خواہش اور پیشکش کی بنا پر ۱۹۵۱ء میں سندھ یونیورسٹی میں شعبۂ تعلیم قائم کیا اور اس میں بحیثیت پروفیسر اور ڈائریکٹر کام کا آغاز کیا تھا۔ اس کے بعد جب تک ڈاکٹر صاحب سندھ یونیورسٹی میں رہے انھوں نے ہر زمانے میں علمی ماحول، تحقیق اور اشاعت علم کے لئے کوششیں کیں اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے جو بھی کوششیں کیں ان کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ **توسیعی لکچروں کا آغاز:** ڈاکٹر صاحب نے شعبے میں ہفتہ وار بنیاد پر توسیعی لکچروں کا آغاز کیا جن میں ہر ہفتے کسی نہ کسی ماہر فن کو مدعو کیا جاتا اور اس سے علمی استفادہ کیا جاتا۔ ان لکچروں کے ذریعے طلبہ اور سامعین کے مبلغِ علم میں بے حد اضافہ ہوتا۔

۲۔ **تعلیمی میوزیم کا قیام:** ڈاکٹر صاحب نے سندھ یونیورسٹی میں پہلا تعلیمی میوزیم قائم کیا۔ اس میوزیم کے قیام کا اصل مقصد تھا کہ طلبہ اور اساتذہ تعلیمی طریقوں اور نصابی ضروریات کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کے طریقوں سے آگاہ ہوں۔ بعد میں اس میوزیم کو سندھ الاجی میوزیم میں ضم کر دیا گیا۔

۳۔ **سندھ یونیورسٹی میں اشاعتی سرگرمیوں کا آغاز:** ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا یہ ایک روشن پہلو ہے کہ آپ جس ادارے میں بھی رہے وہاں فروغِ علم کے مقصد کی خاطر علمی و تحقیقی کتب و رسائل کی اشاعت کا مناسب انتظام کیا اور اس مقصد کے حصول کی خاطر تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ سندھ یونیورسٹی میں بھی ڈاکٹر صاحب نے اوّل روز سے ناکافی وسائل کے باوجود علمی و تحقیقی کتب کی اشاعت کا کام کیا اور ایک تحقیقی جریدہ بنام The

University of Sindh .Journal of Education کا آغاز 1955ء میں کیا۔ یہ جرنل 1975ء تک شائع ہوتا رہا۔اس جرنل میں نہ صرف سندھ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کے تحقیقی مقالات شائع ہوئے بلکہ دیگر ماہرین کے بھی۔ یہ جرنل اعلیٰ معیار کی بنا پر امریکہ،کینیڈا و دیگر ممالک کی یونیورسٹیوں میں جانا جاتا تھا اور وہاں کے ماہرینِ تعلیم اس میں شائع شدہ تحقیقی مقالات پر پسندیدگی کا اظہار کرتے۔اس کے علاوہ 1962ء سے ڈاکٹر صاحب نے Journal of Research:Arts and Social Sciences کا آغاز کیا اور اس کے پہلے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے۔اس جرنل میں ڈاکٹر صاحب اپنے اور دیگر محققین کے بلند پایہ تحقیقی اور علمی مقالات شائع کراتے تھے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے تعلیمی تصورات

جیسا کہ ذکر آیا ڈاکٹر بلوچ صاحب کے تعلیمی تصورات پر عمل کر کے آج بھی ہم اپنے تعلیمی مسائل کا مناسب حل دریافت کر سکتے ہیں۔اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں فرمایا تھا:

''میرے خیال میں تعلیم کی روشنی اور فوائد اتنے عام ہو چکے ہیں کہ تعلیم کی افادیت و اہمیت سے ہر خاص و عام واقف ہو چکا ہے۔ یہ کہنا کہ دیہاتی لوگ تعلیم کے فوائد سے بہرہ نہیں رکھتے، درست نہیں ہے۔ ہاں کسی حد تک یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ان کی اس طرف رغبت نہیں ہے کیونکہ ہمارا تعلیمی سلسلہ صرف کتابوں اور لفظوں تک محدود ہے اس لیے ان کے بچوں کی اکثریت پرائمری یا مڈل سطح سے تعلیمی اداروں کو خیر باد کہنا شروع کر دیتی ہے۔ جب ان بچوں کے والدین دیکھتے ہیں کہ نہ تو استاد پڑھا رہا ہے اور نہ شاگرد پڑھ رہا ہے اور وقت ضایع ہو رہا ہے تو بہتر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بچے کو یا تو کوئی ہنر سکھایا جائے یا اسے کاشتکاری پر لگا دیا جائے تا کہ جوان ہونے تک وہ روزی کمانے کے قابل ہو سکے۔

اس کا علاج یہ ہے کہ ہم ان اسکولوں میں عملی تعلیم کو داخل کریں اور دیہاتی زندگی کے مظاہر کو تعلیمی نصاب میں شامل کریں تا کہ طلبہ کے والدین کو علم ہو کہ ان کے بچے نہ

صرف جدید علوم سے آشنا ہو رہے ہیں بلکہ روایتی ہنر کاری بھی ان کو سکھائی جا رہی ہے۔ ضروری ہے کہ دیہاتی اسکولوں کو دیہاتی زندگی کا ایک اہم حصہ بنا دیا جائے۔ اگر اسکول صرف اس طرح رہیں کہ وہ سرکاری ادارے ہیں اساتذہ تنخواہ لے رہے ہیں، سپروائزر سرسری طور پر معائنہ کیے جا رہے ہیں تو پھر یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہوگا۔

ہمارے ملک میں صرف ایسے ادارے نہیں ہونے چاہییں کہ وہ ڈاکٹر پیدا کریں، انجینئر پیدا کریں، بینکرز اور قانون دان پیدا کریں، بلکہ چھوٹے چھوٹے پیشوں کی ترقی واحیا کے لیے بھی ادارے ہونے چاہییں۔ کیونکہ جس قدر ڈاکٹر یا انجینئر اپنی جگہ اہم ہے وہاں پر ایک ترکھان یا راج کی بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی قومی زندگی کی جدوجہد میں اپنا حصہ ادا کر رہا ہوتا ہے صرف میڈیکل کالج یا انجینئرنگ کالج قائم کرنے پر ہی سارا زور نہیں دینا چاہیے بلکہ تمام پیشوں کے ماہر پیدا کرنے کے لیے پیشہ ورانہ ادارے قائم ہونے چاہییں اور چھوٹے چھوٹے اداروں کا پورے ملک میں جال پھیلا دینا چاہیے تاکہ ہر شخص اپنے پسندیدہ پیشے میں تربیت حاصل کر سکے۔ اگر ایسی صورتحال پیدا کر دی جائے تو بچوں کے والدین خود بخود اپنے بچوں کو تعلیمی اداروں کی طرف بھیجیں گے کیونکہ ان کو علم ہوگا کہ ان کے بچے کسی نہ کسی پیشے میں تربیت حاصل کر کے نکلیں گے اور اپنی عملی زندگی کا بہتر طریقے سے آغاز کر سکیں گے۔ آج کل لاتعداد طلبہ ایسے ہیں جنھوں نے مختلف تعلیمی اداروں یعنی کالجوں اور یونیورسٹیوں سے ڈگریاں تو حاصل کر لی ہیں لیکن ان کو ملازمت نہیں ملتی اور وہ بیروزگار ہیں۔ اس صورتحال نے طلبہ اور طلبہ کے والدین میں مایوسی کو بڑھا دیا ہے اور وہ لوگ اعلیٰ تعلیم کے حصول کو ایک فضول چیز خیال کرنے لگے ہیں جو کہ از حد افسوس ناک امر ہے۔"(۸)

ڈاکٹر بلوچ صاحب کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ اور اس کے اہم مباحث

جیسا کہ اس سے قبل ذکر ہوا ڈاکٹر بلوچ صاحب نے ۱۹۴۹ء میں کولمبیا یونیورسٹی امریکہ سے تعلیم کے ایک مخصوص موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ گراں قدر مقالہ نو آزاد مملکت پاکستان میں اساتذہ کی تربیت و دیگر متعلقہ موضوعات سے متعلق تھا۔

Proposals for the Education of Teachers in Pakistan for the New National System of Education.

''جدید قومی نظامِ تعلیم کی روشنی میں پاکستان کے اساتذہ کے لیے تعلیمی تجاویز''

ساڑھے تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل انگریزی زبان میں لکھا یہ مقالہ علم کا خزینہ ہے اور اس کی پہلی اشاعت لاڑکانہ سے 2003 میں ہو چکی ہے۔ اسی مقالے میں تاریخی تناظر کے حوالے سے تعلیمی تصورات کے ابتدا، ارتقا اور مختلف معاشروں اور ادوار میں ان کی ترویج و اطلاق کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے نیز مختلف شعبوں میں بے شمار تجاویز بھی دی گئی ہیں۔ اس مقالے کا اصل محور استاد ہے جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ لیکن ندرت سے بھرپور جو تعلیمی افکار ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ مقالے میں پیش کیے ہیں، یہاں ہم نے محض ان کے مختصر و اجمالی جائزہ پر ہی اکتفا کیا ہے۔ آگے ہم اس اہم مقالے کے اہم مباحث کے اقتباسات اور متعلقہ عبارات کا سلیس اردو ترجمہ پیش کریں گے۔ ملکوں اور قوموں کی ترقی کے لیے تعلیم کی کیا اہمیت ہے، اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے مقالے میں لکھا:

> ''یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی معاشرہ ناخواندہ ہو اور آزاد اور مستحکم رہ سکے کیونکہ جہالت اور آزادی دو متضاد چیزیں ہیں۔ خواہ کتنی ہی طاقت ہو اور خواہ کتنی ہی دولت اور افرادی قوت ہو تعلیم کے بغیر کوئی قوم ترقی اور آزادی کی حفاظت نہیں کر سکتی۔''

دیکھا جائے تو ڈاکٹر صاحب پہلے پاکستانی ہیں جنھوں نے اساتذہ کی تربیت جیسے اہم موضوع پر تحقیق کر کے ایک گراں قدر اور مفصل مقالہ پیش کیا جو انسانی معاشرے کے نہایت ہی اہم پہلو یعنی تعلیمی نظام کی ٹھوس بنیادوں پر تعمیر کا ایک مدلل اور جامع حل پیش کرتا ہے۔ یہ آج بھی اتنا ہی مؤثر اور قابل عمل ہے جتنا کہ ۱۹۴۸ء

میں تھا۔اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب تعلیم کی بنیادوں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ دوطرح کی ہوسکتی ہیں یعنی:
ا۔تاریخی تعلیمی بنیاد
۲۔انسانی اوراخلاقی بنیاد

تاریخی بنیاد سے ڈاکٹر صاحب کی مراد ماضی سے متعلق وہ معلومات ہیں جو ہمیں اپنی اسلامی اقدار پر پختہ یقین عطا کریں۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب اس مقالے میں علم اور استاد کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ علم کی کسی بھی شاخ پر عبور اور مکمل آ گاہی کی بنیاد وسیع مطالعہ، عمیق سوچ، طویل تجربہ اور مسلسل مشاہدے کے ساتھ ساتھ متعلقہ علم کی شاخ میں متوقع توسیع اور تبدیلی سے آ گاہی پر ہوتا ہے۔ان تمام اوصاف کے ملاپ سے متصف ہونے والا شخص لازماً متعلقہ علوم یا پیشے میں نہ صرف اپنے مخصوص افکار وتصورات رکھتا ہے بلکہ وہ اس قابل بھی ہوتا ہے کہ نہ صرف اپنے معاشرے کے لیے خصوصاً بلکہ بنی نوعِ انسان کے لیے بھلائی اور بہتری کے لیے وقتاً فوقتاً ٹھوس اور قابلِ عمل نظریات پیش کرتا رہے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کے اس مقالے کا محض سرسری مطالعہ ہی ڈاکٹر صاحب کی بحیثیت ماہرِ تعلیم ، بلند پایہ علمی وفکری حیثیت متعین کرنے کے لیے کافی ہے۔ڈاکٹر صاحب مقالے میں ہمیں یاددلاتے ہیں کہ نومبر ۱۹۴۷ء میں ''قومی تعلیمی کانفرنس'' کے لیے اپنے پیغام میں قائداعظم محمد علی جناح نے فرمایا تھا:

"There is no doubt that the future of our state will and must depend upon the type of Education, we give to our Children, and the way in which we bring them up as future citizen of Pakistan."

ترجمہ:اس میں کسی شک کی گنجائش ہرگز نہیں ہے کہ ہمارے ملک کے مستقبل کا براہِ راست دارومدار تعلیم کے ایسے نظام سے وابستہ ہے جس کی مدد سے ہم اپنے بچوں کو تعلیم دیں اور انھیں مستقبل میں پاکستان کا اچھا شہری بناسکیں۔

ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر بلوچ قائداعظم کے مذکورہ پیغام میں Type of Education کے تعین کے حوالے کو اپنے لیے ایک ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ پھر اس کے جواب میں مرتب کیے گئے تفصیلی خاکے کی تمہید کے طور پر لکھتے ہیں:

"At the Present stage this much is certain: the new type of education in Pakistan is to be National in conduct and character and closely related to the needs of the people of each Province and of the Nation as a whole."

ترجمہ: موجودہ دور میں یہ ناگزیر ہو چکا ہے کہ طریقہ تعلیم پاکستان کے اندر قومی سوچ پر اور اخلاق سازی پر مبنی ہو۔ ہر صوبے کے لوگوں کی ضروریات سے باہمی تعلق رکھتا ہو، مجموعی طور پر اسے پاکستانی قوم کے لیے سودمند ہونا چاہیے۔(۹)

نصف صدی سے زیادہ عرصہ قبل بھی ڈاکٹر صاحب کو یہ بصیرت حاصل تھی کہ مختلف صوبوں اور علاقوں کے دیگر شعبوں کے ساتھ تعلیمی تقاضے بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے ایک نوزائیدہ ملک میں صرف ایسی ہی منصوبہ بندی اور پالیسیاں کامیاب ہوں گی جو قومی کے ساتھ صوبائی مقاصد اور مفادات کی عکاسی کرتی ہوں اور وہی قومی وحدت اور اتحاد کو تقویت دے سکتی ہیں۔

اسی طرح کا تصور ہمیں علامہ آئی آئی قاضی کے افکار میں بھی ملتا ہے۔ سندھ یونیورسٹی کی جانب سے اکتوبر 1955ء میں جاری شدہ تعلیمی مجلہ The Sind University Journal of Education کے پہلے شمارے کے لیے دیئے گئے پیغام میں علامہ صاحب فرماتے ہیں:

"Our Education needs a redical change and an entirely new orientation. More ilklinkering will not help. Platitudes borrowed from others and half-way means suggested by expediency, will kill the last hope."

ترجمہ: ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور مکمل نظام کو نئی شکل دینے کی ضرورت ہے۔ صرف باتیں بنانے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ غیروں کی فرسودہ سوچ اور ادھوری سوچی ہوئی آراء جن کا مجبوری میں اظہار کیا جاتا ہے، تعلیم کی آخری امیدوں کو بھی ختم کرسکتی ہیں۔

مذکورہ بالا پیغام میں جس انقلابی تبدیلی (Radical Change) کی جانب علامہ صاحب نے 1955ء میں اشارہ کیا تھا ان کا ڈاکٹر صاحب کو 1949ء میں ہی ادراک حاصل تھا۔ تحریر فرماتے ہیں:

.... Not every or any kind of Education can solve our problems. By consensus the present system of Education cannot"

ترجمہ: ہمارے مسائل متفرق طریقوں کی تعلیم سے حل نہیں ہوسکتے۔ اس بات پر اتفاق ہے کہ موجودہ طریقۂ تعلیم تو انھیں حل کر ہی نہیں سکتا۔

آگے چل کر آپ ہی بتاتے ہیں کہ پاکستان میں مطلوبہ تعلیمی تبدیلی لانے کے لیے جو نئے سرے سے تعمیری کام کرنا ہے اس کا مزاج کیسا ہونا چاہیے، لکھتے ہیں:

A new educational re-organisation in Pakistan must harmonized the best from the past with the present for the future progress of the country.

ترجمہ: پاکستان میں نئے تعلیمی نظام کی تعمیر ماضی کے طریقہ کار سے حال میں بہتری کی طرف ہو۔ اگر اس طریقہ کار کو اپنایا جائے اور زیرِ استعمال لایا جائے تو مستقبل میں بھی علم کی بدولت ملک وقوم کی ترقی ممکن ہے۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی یہ ہے وہ نگاہِ دوربین جو تاریخ کے گہرے مطالعے سے پیدا ہوئی۔ یہ ہے وہ بصیرت اور حال کی ضروریات اور نت نئے پہلوؤں کا مشاہدہ کرنے والی آنکھ جس کے حامل ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے ماضی کی بہترین چیزوں کو حال سے ہم آہنگ کرنے والا نسخہ تجویز کیا۔ فی الحقیقت یہی ہے وہ نسخہء کیمیا

جس میں ملک کی ترقی کا راز سمایا ہوا ہے۔ یہ ایسا نسخہ ہے جو ہر دور میں ہر ملک اور ہر معاشرے کے لیے یکساں مفید ہے اور اس کی آفاقیت اور دائمی اثر پذیری سے کوئی بھی صاحبِ فہم انکار نہیں کرسکتا۔

ڈاکٹر صاحب کے زیرِ بحث افکار آج سے ستر برس قبل قلمبند ہوئے جب کہ ان کی عمر ابھی جوانی کی حدود کے اندر تھی لیکن مطالعے کی وسعت، فکری گہرائی، علمی بصیرت اور مسلسل مشاہدے اور اس کے منطقی ملاپ سے اخذ کردہ نتائج کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب نے آج سے تقریباً ستر سال قبل تحریر فرمایا تھا کہ:

In the absence of educational advancement, our hard earned freedom might succumb to internal upheavels among the ignorant population.

ترجمہ: تعلیمی ترقی کے بغیر ہماری بڑی قربانیوں سے حاصل شدہ آزادی اندرونی انتشار کا شکار ہوسکتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہوگا کہ پاکستانی قوم میں جہالت اور تعلیم سے عدم دلچسپی ایک جاہل قوم کو جنم دے گی۔(۱۰)

تعلیمی طور پر پس ماندہ معاشرے میں داخلی انتشار کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی پیش گوئی پاکستانی معاشرے پر سو فیصد صادق آتی ہے۔ تعلیم کی عظمت و آفاقیت میں ان کا یہی یقین ہے جس کی بنیاد پر وہ تعلیم کو بیک وقت قومی وجود اور بقا کی ضمانت و استحکام کے ذریعہ اور بیرونی پیش قدمیوں کے خلاف نہایت مضبوط و مؤثر دفاعی ہتھیار کہتے ہیں:

"Education and enlightenment opinion are also two only safeguards against any external aggression. In national education is the only sure and permanent guarantee of national defence and national strength. In the present conditions of conflict and confusion, no country can be ignorant and be free and strong at the same time."

ترجمہ:تعلیم میں دُور اندیشی، روشن خیال کی حامل رائے ایسے دو دفاعی ہتھیار ہیں جو بیرونی پیش قدمی کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔قومی تعلیم کے لیے یقینی و مستقل ضمانت،قومی دفاع و قومی استحکام کے حوالے سے دور حاضر میں جو پیچیدگیاں اور مسائل درپیش ہیں کوئی بھی ملک اس سے بے خبر نہ رہ سکے گا اور نہ اپنی آزادی واستحکام برقرار رکھ سکے گا۔

مختصر مگر جامع الفاظ میں ڈاکٹر صاحب نے کس طرح اس آفاقی حقیقت کو سمویا ہے۔مندرجہ بالا حوالے میں آخری جملہ فکری گہرائی،لفظوں کے انتخاب اور زبان کی خوبصورتی کا نہایت نادر نمونہ ہے۔یعنی یہ ناممکن ہے کہ کوئی ملک اور معاشرہ جاہل ہو پھر بھی آزاد اور مستحکم رہ سکے۔جہل اور آزادی دو متضاد اشیاء ہیں۔فرد ہو یا معاشرہ اس کی آزادی اور عزتِ نفس کا زیادہ تر دارومدار اس کی تعلیمی برتری پر ہے جس کے ذریعے معاشرہ اپنی آزادی کی بقاء اور مزید استحکام کے وسائل ڈھونڈ تا ہے:

It would be suicidal for Pakistan if the reconstruction of National Education is stopped, slowed or postponed in favour of any other means of defence-

ترجمہ: پاکستانی قوم کے لیے تعلیمی نظام کو روکنا قومی خودکشی کے مترادف ہوگا۔یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ نہ صرف روکنا بلکہ کسی دوسرے دفاعی طریقے کی خاطر اس میں سستی لانا یا ملتوی کرنا قومی خودکشی کے برابر ہے۔

مندرجہ بالا حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب پاکستان کے دفاع اور بقا کے لیے قومی مزاج سے ہم آہنگ نظامِ تعلیم کی نئے انداز میں تعمیر کے عمل میں التواء یا محض سست رفتاری کو بھی قومی خودکشی کے برابر سمجھتے ہیں اور ہوا بھی ایسا ہی۔آزادی کے حصول کے صرف پچیس برس کے اندر ہی ہم خودکشی کے مرتکب ہو گئے۔آدھا ملک گنوا بیٹھے اور آج بھی نشانِ منزل سے بے خبر اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں۔

قومی تعلیمی نظام کی نئے سرے سے تنظیم سازی سے متعلق سوچتے ہوئے ڈاکٹر بلوچ نے جہاں اپنی فکر کا تعلق تاریخ سے جوڑ کر رکھا ہے، وہاں بیسویں صدی میں نمودار ہونے والے دو نظاموں پر بھی ان کی گہری نگاہ

ہے۔ان دونظاموں میں ایک فرد کی ترقی وفلاح کو ہی سب کچھ سمجھ کرافراد کو مسابقت کے اکھاڑے کے حوالے کرتا ہے اور دوسرا بالکل فرد کی ذات کی نفی کر کے اس کو معاشرتی مشین کا محض ایک پرزہ قرار دیتا ہے۔لیکن ان دونوں نظاموں کے مقابلے میں ڈاکٹر بلوچ کو اپنے ملّی مزاج کی خوب واقفیت ہے۔ان کو اپنی قوم کے اجزائے ترکیبی، معاشرتی تنظیم سازی اور فلسفہ حیات کا شعور حد درجے کا حاصل ہے۔اس لیے وہ مسلم معاشرے میں فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق میں نہ صرف توازن کے قائل ہیں بلکہ فرد اور معاشرے کو ایک دوسرے کا معاون و مددگار قرار دیتے ہوئے اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ قومی تعلیم کے اغراض و مقاصد کی نہ صرف فرد بلکہ معاشرے کی ترقی سے راست نسبت ہونی چاہیے۔فرماتے ہیں:

> According to our social philosophy individual and community (or society) are complementary to each other. Therefore, the aims and objectives of our national education must be directly related to the development of the individual as a member of the society."
>
> ترجمہ: ہمارے موجودہ سماجی فلسفے کے مطابق فرد یا معاشرہ ایک دوسرے کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔تعلیم کے اغراض ومقاصد ایسے ہونے چاہئیں جو براہِ راست فرد کو بحیثیت سماج کے رکن کے ترقی اور انصاف کے پورے موقع فراہم کرے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کے سامنے تعلیم کا فرد کے ہمہ جہت ارتقاء سے قریبی تعلق ہونا واضح ہے لیکن فرد وہ جو خود کو معاشرے کا رکن سمجھتا ہے اور معاشرے کی جانب سے خود کو ذمہ دار سمجھتا ہے۔معاشرے سے باہر یا معاشرے سے بے نیاز فرد اپنے ارتقاء کے لیے جو راہیں متعین کرے، اس کی ذمہ داری ریاست یا حکومت پر نہیں رکھی جاسکتی۔(۱۱)

فرد کے علمی وفکری ارتقا، اس کی بامقصد شخصیت سازی اور معاشرے سے مشروط ترقی کو انتہائی اہمیت دیتے ہوئے ڈاکٹر بلوچ قومی تعلیم کے اغراض و مقاصد میں بھی فرد کو ہی محور بناتے ہیں۔اس بارے میں لکھتے

ہیں:۔

Objectives of national education are broadly two folds:

(i) To help the individual appreciate and then develop those values, attitudes and ideas which are cherished by the society, and

(ii) To equip him with such skill and understanding and knowledge which will be useful to him in solving his problems and meeting his needs in the society."

ترجمہ: قومی تعلیم کے اغراض و مقاصد واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم کیے گئے ہیں:

(۱) فرد کی مدد کی جائے۔ اس کی اقدار، ترقیاتی سوچ، رویوں جن کی مدد سے وہ معاشرے کا ایک ذمہ دار شخص بن سکتا ہو۔

(۲) ایسے فرد کو تیار کیا جائے جو ایسے ہنر، سوچ، سمجھ کی مدد سے علم حاصل کر سکے جو اسے زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں مدد دے اور اس کے ساتھ سماجی ضروریات کو پورا کر سکے۔

وسیع تناظر میں تجویز کردہ مندرجہ بالا تعلیم کے دو مقاصد پر غور کرنے سے ڈاکٹر بلوچ کا پیش کردہ قومی تعلیم کا تصور نہایت واضح ہو جاتا ہے۔ اس تصوّر کے اطلاق اور تجویز سے فرد نہ صرف معاشرے کی مسلمہ قدروں کا حامل ہو جاتا ہے بلکہ ان کو تقویت دلانے میں بھی اپنا مطلوبہ کردار ادا کرتا ہے۔ تعلیم فرد کو ایسے علم، فہم اور مہارت سے آراستہ کرتی ہے جو معاشرے میں رہتے ہوئے ان کی ضروریات کو پورا کرے اور اس کے مسائل کو حل کرے۔

مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کے حامل تعلیمی نظام کے سنگِ بنیاد کون سے ہوں گے؟ یہ ہے وہ اہم سوال جو ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کو خود ساختہ ترقی پسندوں اور نام نہاد Humanism کے مبلغوں سے ممیز و ممتاز کرتا ہے۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر بلوچ صاحب ایک سچے مومن اور قرآن وسنت کا حقیقی فہم رکھنے والے عالم کی حیثیت میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور یہ محض اتفاق نہیں بلکہ منطقی نتیجہ ہے، اس فہم کا، اُس یقین کا اور صالح وآفاقی سوچ کا۔(۱۲)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے تعلیم کے موضوع پر مختلف ادوار میں مفید علمی اور تحقیقی کتابیں بھی شایع کرائیں جن میں سے اہم کتب کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

Education Based on Islamic Values (1)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی دیگر حیثیات کے علاوہ ایک عظیم ماہرِ تعلیم کی حیثیت بھی بڑی اہم ہے۔ آپ نے تعلیم کے محض نظری پہلوؤں پر ہی نہیں بلکہ تعلیم کے عملی پہلوؤں پر نہ صرف ہمیشہ غور کیا ہے بلکہ اپنے طویل عملی تجربے کی روشنی میں ہمارے تعلیمی مسائل کا حل بھی پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی طویل عرصے سے یہ پختہ رائے تھی کہ ہمارا سب سے بڑا ہتھیار صرف اور صرف تعلیم ہے۔ تعلیم کی غیر موجودگی میں کسی قدم کے لیے بڑے بڑے ہتھیاروں کی موجودگی بھی اس کی بقا اور تحفظ کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ جیسا کہ پہلے ذکر آیا ڈاکٹر صاحب نے سندھ یونیورسٹی میں نہ صرف شعبۂ تعلیم کی بنیاد ڈالی بلکہ طویل عرصے تک اس میں پڑھایا بھی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب تعلیمی مسائل کے حل کی خاطر بنائی گئی مختلف کمیٹیوں میں بھی بحیثیت ماہر شریک ہوئے اور اپنے طویل تجربات کی روشنی میں ان مسائل کے قابل عمل حل بھی پیش کیے۔ راقم الحروف سے ایک ملاقات کے دوران ڈاکٹر صاحب نے فرمایا تھا کہ اپنی اس انگریزی کتاب میں ہمارے تعلیمی مسائل اور ان کے حل پر انھوں نے بڑی محنت سے روشنی ڈالی ہے۔ ہمارے تعلیمی مسائل کا گہرائی اور گیرائی میں مطالعہ کر کے موجودہ حالات اور موجودہ صورت حال کے مطابق بہترین حل پیش کیا ہے۔ یہ کتاب اس موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۰ء میں پاکستان اسٹڈی سینٹر سندھ یونیورسٹی سے شائع ہوئی۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے ایک ماہر تعلیم اور عظیم دانشور کی حیثیت سے ایسے تعلیم نظام کی ضرورت

پر زور دیا ہے جو قومی مفاد سے مطابقت رکھتا ہو اور اسلامی اقدار کا حامل ہو۔

National System of Education and Education of Teacher.(2)

جیسا کہ اوپر ذکر آیا، ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں اساتذہ کی تعلیم و تربیت پر بہت زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک اگر بہترین اساتذہ موجود نہیں تو کوئی تعلیمی نظام کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ پیشِ نظر مختصر کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے اسی موضوع کا مفصل احاطہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ قومی نظام تعلیم کیا ہو، اس کے خدوخال کیا ہوں اور کامیابی سے کیسے چلایا جا سکتا ہے، اس پر بھی ماہرانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب لاڑکانہ ایجوکیشن سوسائٹی کی جانب سے ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔

Teacher Education in Muslim Society (3)

یہ کوئی باقاعدہ کتاب نہیں وہ مقالہ ہے جو ڈاکٹر بلوچ صاحب نے ۱۹۷۷ء میں مکہ مکرمہ میں منعقدہ اسلامی تعلیم کے موضوع پر پہلی عالمی کانفرنس میں پڑھا۔ یہ مقالہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔
اسلامی معاشرے میں ایک مثالی استاد کی تعلیم کے لیے کیا کیا جائے اور ایک مثالی مسلمان استاد میں کیا محاسن ہونے چاہئیں جن سے طالب علموں میں اعلیٰ اسلامی اور انسانی خصوصیات پیدا ہوں۔ ان تمام موضوعات پر اس مقالے میں ماہرانہ انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

(4) نهج التعلّم

ایک اسلامی معاشرے میں علم حاصل کرنا فرائض میں داخل ہے۔ قرآن و حدیث میں ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر مسلمان پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔ فروغِ علم کے مسلمان استاد کے کردار سے انکار ممکن نہیں۔ نہجۃ التعلم برصغیر پاک و ہند میں طریقۂ تعلیم سے متعلق پہلی کتاب ہے جسے مخدوم جعفر بوبکانی نے لکھا۔ بوبک ضلع دادو کے ایک گاؤں کا نام ہے، مصنف کا تعلق اسی گاؤں سے تھا۔ مخدوم جعفر نے اس کے علاوہ بھی کئی کتب

تصنیف فرمائیں۔ مخدوم جعفر کی اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ وہ طریقۂ تعلیم کی اصلاح کے ذریعے مسلم معاشرے میں تبدیلی کے خواہش مند تھے۔ ان کے نزدیک انفرادی اصلاح کے لیے لازم ہے کہ تعلیمی نظام کی اصلاح کی جائے۔ یہ کتاب ڈاکٹر بلوچ صاحب کی تدوین وتحشیہ کے بعد ۱۹۹۴ء میں سندھ یونیورسٹی سے شائع ہوئی۔

پرائمری تعلیم کی اہمیت پر ڈاکٹر بلوچ کا ایک اہم مضمون

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ان ماہرین تعلیم میں شامل تھے جن کی نظر میں تعلیمی زندگی کا اہم ترین دور پرائمری یا ابتدائی تعلیم ہوتا ہے۔ وہ اس رائے کے حق میں تھے اور مدلل انداز سے یہ رائے رکھتے تھے کہ پرائمری تعلیم قوم کے تمام بچوں کے لیے بلا معاوضہ ہو اور لازمی ہو۔ اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کا ایک عمدہ مضمون اخبار Pakistan Times میں مورخہ 25-1-1985 کو شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون اس قدر اہم ہے کہ اس کی روشنی میں ہم آج بھی اپنے تعلیمی مسائل حل کر سکتے ہیں۔ موضوع کی اہمیت کی وجہ سے ہم یہ مضمون مکمل شکل میں یہاں نقل کرتے ہیں:

PRIMARY EDUCATION:

The Neglected National Goal

Dr. N.A. Baloch

In its organizational structure as well as in itsadministrative policies, the present system of education in Pakistan is essentially a continuation of the colonial system ofthe pre-independence era. It continues to use imported models and methods.

Teacher in the system is the weakest link: policies governing the

recruitment and training of teachers have no relevance to the role they are expected to play in educating the rising generations in an ideological society. Except for the few vocational objectives that have come to the forefront in post-independence educational planning, the system is not geared to any clear goals of a truly'national' system of education, not to speak of an'Islamic system'.Addition of compulsory courses in 'Islamiyat' or'Pakistan Studies,'though highly commendable, cannot convert the century-old secular system of the colonial period into an Islamic system.

Of all the imbalances in the present system, the one which can be pinpointed as the most serious is the neglect of the elementary stage of education. First, this neglect is one of the worst features of the colonial system that has lingered on thus far and, secondly, it negates the very spirit and ideal of a truly Islamic system of education. These observations, to be properly appreciated, need some elaboration.

The Colonial Legacy

The educational policies followed during the colonial period are too well known to need any detailed comment.Despite all the official arguments on record, it cannot be denied that the colonial administrator was not here to'educate' the subject people. In particular, he was least

interested in educating the masses.

With the 'educational policy minutes' recorded by Macaulay on February 2,1835.and the final educational framework laid down by the Wood's Dispatch of 1854,the historical and socio-cultural foundations of the then existing Indo-Muslim system of education, of which the primary education constituted the main base, were rejected. It was laid down as a matter of policy that while spreading the new Western education, the emphasis would be on imparting "higher education to the upper classes of society who had leisure for study and whose culture could filter down to the masses"(as the Governor General Lord Auckland observed while confirming the new educational policies).

This distinction between the higher or upper classes and the masses which was implicit in the colonial policies continued to operate in favour of "higher forms" of education and against the advancement of elementary education. In their report in1929,the Hartog Committee still treated elementary education distinctly as "mass education" and the system of secondary and higher education as 'education for the directing classes...designed to produce competent and trustworthy representatives and official".(Interim Report: Review of Growth of Educationin British India, published by His majesty's Stationery Office.London, September, 1929,pp. 526-).Even as late as 1944,the most forward- looking colonial

agency, viz,.the CentralAdvisory Board of Education, had observed that while primary education was meant for the masses, the"chief purpose of higher education(inclusive of high schools) is to form an elite".(Report on the Post-War Educational Development in India, fourth edition, Bureau of Education. India, New Delhi, 1944,p. 15)

As a result of this thinking, the colonial system of education was not built upwards on a sound base of'primary education,'but was extended downwards from the top roof of the University and College education. In due course, high school was established as a lower appendage of college education. By the time the colonial rule came to an end, the primary stage remained torn apart from the'upper integrated system'.By 1944 the Central Advisory Board of Education had officially admitted that the system of education did not'provide the foundations which an effective structure could be erected, and in fact much of the present rambling edifice will have to be scraped in under that something better may be substituted.(Report on the Post War Educational Development in India, op. cit. p.2)

But then it was too late for the colonists to make any change. The 'inverted system,'suspended from the top pegs of'University' and 'College' with its truncated bottom of'primary education,'was indeed a marvel of educational structure of the colonial period. But the greater

marvel is that we have continued to use this'inverted model' to this day, being self-complimentary at the same time that we have now a'national system' of education in Pakistan!

Secondly, though the colonial Government had admitted the State's responsibility for promoting primary education, it never assumed full responsibility for educating the entire population. In 1912,when a bill was introduced in the Central Legislature by the non-official member. Mr. G.K. Gokhale,which was also strongly supported by the Quid-i-Azam, Mr. Muhammad Ali Jinnah, providing for a"gradual introduction of the principle of compulsion into the elementary education system of the country,"it was opposed by the majority of official members and was subsequently killed at the Committee stage. It was after a lapse of almost one century ever since the colonial system was first introduced that the Central Advisory Board of Education(1944) for the first time recommended that"a system of universal, compulsory and free education for all boys and girls between the ages of 6and 14 should be introduced as speedily as possible though in view of the practical difficulty of recruiting the requisite supply of trained teachers it may not be possible to complete it in next less than 40years".Thus, had the colonial rule continued on, the introduction of compulsory education upto the age level of 14would have been ostensibly completed

throughout the Subcontinent during the year 1984(twenty-two years ago)!

Subsequently, the first Pakistan Educational Conference summoned speedily at the behest of the Quid-i-Azam at Karachi in 1947(November 27-December 1)had emphasized that illiteracy in Pakistan must be wiped out by means of universal,free and compulsory education as well as through a wide extension of adult education. As regards the minimum period of compulsion, the Conference had unanimously resolved that "free and compulsory primary education be introduced for a period of five years which gradually be raised to eight years.(Proceedings of the Pakistan Educational Conference:Government of Pakistan, Ministry of the Interior Education Division, Karachi, 1948,Resolution No. 160,p. 45.)This important resolution, however, remained on paper and was never seriously taken up for implementation subsequently.

Islamic Features:

The principle of compulsory education for all is writ large in the Quranic injunction, IQRA(Read-96.1)and in the consequent emphasis by the Holy Prophet(may peace be upon him)to the effect that"Acquisition of knowledge is obligatory on every Muslim(i.e. every believer, man or woman, the child,youth, or aged).This was fully understood and

accepted by the early Islamic community, and it did not take long before universal, free primary education became a recognized feature of the Islamic educational system. Though the obligation to learnand teach was recognized as a matter of faith and accepted voluntarily, the great educator Abu al-Hassan Ali al-Qabisi(d.403A.H/ 1012A.C).of Spain, also derived specific juridicalsanction(al-hukm al-fiqhi)for compulsory education: it was a compulsion for the sake of faith since the child was necessarily to be instructed in the Quran and Islam(,al- Qabis, abu al-HasanAli b. Muhammad, al-Risalah al-Mufassilah li Ahwal al Mua'allimin wa Ahkam al-Mua'allimin)(the text of this treatise is appended to Dr. Ahmad Faud al-Ahwani's book al-Tarbiyyah fi-al-Islam au aT'alimft Ra'yi al-Qabisi, Cairo, 1955).

The great teachers who had pioneered the development of Islamic education considered'childhood' as the most important period in life for promoting effective personal development of the younger learner, and therefore they termed this stage of instruction as Ta'lim al-atfal or Ta'lim al-Sibyan(lit'education of children,)'that is'childhood education'instead of'primary' or'elementary'.All attention was therefore centered first on educating the growing child. This led to the development of a common community school, the'children's school'.Thus, a unique institution of primary childhood education emerged for the first time in educational

history of mankind. It became a universal feature of the Islamic system of education in all climes and countries. Called kuttab in the MiddleEast, this community school became widely known as maktab in Iran, Central Asia and the South Asian Subcontinent in the Far East it came to be called by different names in different regions.

This is not the occasion to elaborate upon this development. Suffice it to say that a study of the educational viewpoints of early Muslim scholars and teachers shows that they considered'childhood education to be the foundation of the faith, inculcating Islamic values and guiding the personal growth and development of the child as a committed member of the Islamic community. As such, childhood education became the foundational base for higher Islamic education. Therefore,historically speaking, there can be no system of Islamic education unless it has the strong foundational base of childhood education.

National Tragedy

The foregoing discussion should indicate the two-fold failure of the present system:

i. the failure to recognize the importance of the primary stage of education at the foundational base for the whole system so that it is assigned the necessary priority and the weightage in terms of

organization and financial support

ii. and the failure to recognize and guarantee the Islamic right to education to the Pakistani child in the light of the Quranic injunction to read and the emphasis by the Holy Prophet(may peace be upon him) that acquisition of knowledge is obligatory.

Despite all the lessons from the History, from contemporary compulsions, or from UNESCO's recommendations, the fact remains that more than 50%of the children of school-going age are not in schools in the Islamic Republic of Pakistan. The situation is serious enough to warrant immediate attention.Unless it is seen as a'national tragedy,'and made a'national concern,'the present situation will prolong and the child will continue to be wronged as before.

Perpetuation of Status quo

Educational policies and procedures followed at different levels(local, departmental or ministerial) for the purpose of planning, financing and implementing, though impressive as first pronounced, usually tend to perpetuate status quo: at best the decades old frame is partly stitched but never overhauled or changed.

A serious thinking needs to be done at the national level to save the situation and recognize the present disorganized system. It will be a

great day if a new plan for national education envisages a strong base of universal free compulsory childhood education, which is followed by a preparatory stage for entry into the world of work through a network of vocational schools enabling the growing child to become(ulileidi wa-al-absaar اولي الايدي والابصار) people capable of using their 'hands'and'eyes' effectively(and to learn to seek their livelihood through lawful earning(rizq-i-halal)The subsequent stage may consist of higher institutes which are open to the more gifted ones for intensive study and specialized training in order to buildup professional competence in those specific areas of knowledge and work in which such competence is actually needed.

As far back as 1944,the colonial educator had admitted that so far as the educational system was concerned, much of its"present rambling edifice will have to be scraped in order–due something better may be substituted".Since then, things have gone from bad to worse. It is high time to think whether the nation can afford to build and maintain the most costly ante dated, and now unproductive, superstructure of Colleges and Universities for the few favoured ones when hundreds thousands of the nation's children have no facility even to lean to read and write. The question may be asked what national goals our present 'Higher Education' is serving when Colleges Universities have become

centres of 'muscle-power' rather than of any 'mental growth and development'.

Planned Action

A policy decision needs to be taken without any further delay to recognize the present system and particularly to develop fee primary stage into the foundational base on which must rest any further superstructure, and out of which must grow any further programmes of instruction. But for this change, the action will continue to suffer the present disorganized system with its weak and truncated sector of primary education the annual bulk of out-of-school children will continue to swell the ranks of illiterate adults and literacy figures will always remain low, putting Pakistan in the sphere of illiterate societies.

Firm commitment, wise planning and concerted action are called for to achieve the all-important goal of universal, free,compulsory primary education.

There can be no dearth of excuses and arguments to delay action. The blue books of the colonial period are full of 'convincing' arguments against embarking upon any plan for education. Paucity of funds has always been most effective of such arguments. But the question is: Shall we invest in human development trough education so that every child

who is born in Pakistan is guaranteed the right to minimum necessary education, or shall prefer to invest in steel, textile and cement production In an educationally backward country of the Third World such as Pakistan, where the human problem is more critical, the choice becomes more challenging. No patriotic planner will prefer to divert funds elsewhere at the expense of education, because an illiterate society will always remain vulnerable to internal disruption and external aggression,besides being a formidable obstacle to socio-economicdevelopment.

A thorough reorganization of the present educational system is long overdue and can be delayed only at a great loss. The process of reorganization may well begin with few achievement of the important initial goal as laid down by the First Pakistan International Educational Conference in 1947,that is:Free and compulsory primary education be introduced for aperiod of five years which gradually be raised to eight years."The total period during which this goal is to be achieved has to be fixed and funds committed for its achievement. Even more important are the policies and procedures which are to be followed for the purpose of implementation. Among any other important steps to be taken, the following four considerations will be crucial to the successful achievement of results.

a. The programme of universal free compulsory'childhood education' has to be initiated and carried out through close community cooperation, beginning from'the village as a unit in the vast rural areas and the 'mohalla' as a unit in the urban areas. Mere'official administrative' approach is not likely to succeed.

b. To begin with, the main requirement such as teachers, teaching materials and school buildings will have to be met modestly. Instead of the so called'qualified' teacher.'committed' teacher will have to be sought for from all sections of society including retired personnel only the minimum necessary teaching-learning aids will have to be used, the oral pupil-teacher communication being assigned the greatest importance in the instructional process and the local community shall be required to provide for modest accommodation for the school, which in exceptional cases may even be a hut or an open space under a shady tree. Thus, introduction and extension of the programme shall not be delayed on the pretext of the no availability of'qualified' teachers, 'standard' textbooks, or'proper' school buildings.

c. For some time to come, the foundational stage of'childhood education' will, in effect, remain as the'terminal stage of education' for most of the youth. As this will be the only schooling opportunity readily available to them, special curriculum goals will have to be defined which

shall be self-satisfying rather than subservient to the requirements of any subsequent stage. Obviously, these goals shall not be confined to the 3Rs (Reading, wRiting, aRithmetic ,)viz ,.reading, writing and calculating skills. The whole personal development of the growing child in terms of beliefs, values, attitudes, responsible social behaviour, enlightened citizenship, patriotism and dignity of work and labour shall be the main objective of the national childhood education.

d. The teacher's role shall be all important throughout this period. Therefore, due recognition shall be scored to the teacher. The prospective teachers for this foundational stage shall be recruited early in classrooms, prepared well in advance,and selected and maintained satisfactorily, so that they are able to contribute their best to this important stage of'childhood education'.Personal excellence and an abiding interest to teach the child, rather than mere intellectual attainment, shall be the main criteria for the teacher's final selection. 'Teacher accountability shall be an essential feature of the new educational reorganization.

****

ڈاکٹر بلوچ کی فروغِ تعلیم کے لیے عملی کوششیں

ڈاکٹر صاحب کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ اپنے غریب شاگردوں اور رشتہ داروں کی ہر ممکن مدد کرتے تھے ان کے گھر میں ایک جگہ ایسی تھی جہاں مختلف ادوار میں رشتہ دار رہتے اور غریب شاگرد رہ کر تعلیم حاصل کرتے تھے ان شاگردوں میں صرف مسلمان ہی نہیں ہوتے بلکہ ان میں غریب ہندو آچرداس بھی تھا جس نے ڈاکٹر صاحب کے ہاں رہ کر ہی میٹرک پاس کرلیا اور مختارکار یا اس سے بلند عہدے تک پہنچا۔

ڈاکٹر صاحب کو تعلیم کے فروغ کا اس قدر شوق تھا کہ آج ڈاکٹر صاحب کے گاؤں گوٹھ جعفر خان لغاری اور اس کے قریبی علاقوں میں جو تعلیمی ترقی نظر آتی ہے وہ انھی کی کوششوں کا ثمر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کوششوں سے گاؤں میں لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے جدا جدا پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول قائم کرائے اور اپنے ذاتی صرفے سے کالج کے قیام کے لیے زمین بھی وقف کی۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے اپنی بڑی بیٹی محترمہ حمیدہ بلوچ کی شعبۂ تعلیم میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خاطر ہمیشہ رہنمائی کی اور انھیں یہ ذمہ داری بھی سونپی کہ گاؤں کی بچیوں کی تعلیم کی خاطر وہ گاؤں میں رہ کر ہی یہ ذمہ داری سنبھالیں اور ڈاکٹر صاحب کے فروغ تعلیم کے مشن کو آگے بڑھائیں۔ محترمہ حمیدہ بلوچ نے برس ہا برس تک یہ ذمہ داری احسن طریقے سے نبھائی جس کی وجہ سے گاؤں کی بہت سی بچیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

ڈاکٹر صاحب ہمیشہ تعلیم حاصل کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور انھی کی کوششوں سے اس گاؤں کے رہنے والوں میں ڈاکٹر، انجنیئر، ڈپٹی کمشنر اور سول سروس کے عہدوں پر فائز خواتین و حضرات موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے گاؤں کے علاوہ دیگر کئی مقامات پر اپنے دوست احباب کے ذریعے اسکول قائم کرائے۔ کوٹ میر محمد (تعلقہ کنگری، ضلع خیر پور میرس) میں اپنے دادا کی یاد میں لڑکوں کے لیے پرائمری اور ہائی اسکول اور لڑکیوں کے لیے پرائمری اسکول قائم کرایا۔ کوٹ میر محمد میں ڈاکٹر صاحب کے دادا کے بھائی میانداد فقیر مدفون ہیں۔

حواشی باب نمبر 20

۱۔ملاحظہ فرمائیں پیش نظر کتاب کا باب نمبر ۷

۲۔ایضاً

۳۔ایضاً

۴۔ یہ بات ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے راقم الحروف سے دوران انٹرویو فرمائی تھی۔ یہ انٹرویو مورخہ ۳۰/جون ۲۰۰۶ءکو سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ پر لیا گیا تھا۔

۵۔ یہ بات ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے راقم الحروف سے دوران انٹرویو فرمائی تھی۔ یہ انٹرویو مورخہ ۳۰/جون ۲۰۰۶ءکو سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ پر لیا گیا تھا۔

۶۔ یہ بات ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے راقم الحروف سے دوران انٹرویو فرمائی تھی۔ یہ انٹرویو مورخہ ۳۰/جون ۲۰۰۶ءکو سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ پر لیا گیا تھا۔

۷۔ملاحظہ فرمائیں ''ہمارا نظام تعلیم'' کے موضوع پر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا انٹرویو۔ یہ انٹرویو کتاب ''گلشنِ اردو'' مرتبہ محمد راشد شیخ کے صفحہ ۸۸ تا ۹۵ میں موجود ہے۔

۸۔ایضاً

۹۔ملاحظہ فرمایئے ''ڊاڪٽر نبي بخش خان بلوچ:هڪ عظيم ماهرتعليم'' (ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ۔ایک عظیم ماہر تعلیم) از پروفیسر محمد یوسف شیخ۔ یہ مضمون کتاب '' ڊاڪٽر بلوچ هڪ مثالي عالم'' مرتبہ تاج جویو کے حصّہ اوّل میں شائع ہوا۔ملاحظہ فرمایئے ص:۱۳۰۔

۱۰۔ایضاً

۱۱۔ایضاً

۱۲۔ایضاً

باب نمبر 21

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی مکتوب نگاری

دنیا کی مختلف زبانوں کے ادب میں خطوط نگاری ایک اہم صنفِ سخن ہے۔ خطوط میں خط لکھنے والا اپنے دلی جذبات اور احساسات کو کھل کر بیان کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مکتوب نگار اپنے ذاتی تجربات، مشورے، آراء، پسند ناپسند، علمی معلومات اور ذاتی خیالات سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کرتا ہے۔ ادب کی تمام اصناف میں خطوط کو ایک خاص انفرادیت حاصل ہے اور وہ یہ کہ مکتوب نگار کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتی کہ اس کا خط کبھی شائع بھی ہوگا۔ تحت الشعور میں اس خیال کی وجہ سے ہی مکتوب نگار اپنے دل کی بات خط میں بیان کر دیتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو تحریر میں کسی حد تک تکلفات اور حجابات کا آنا ایک فطری امر ہے۔

سندھی زبان میں مکتوب نگاری

دنیا کی کئی زبانوں میں خطوط کے مجموعے کتابی شکل میں اور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور بہت سے خطوط ہنوز قلمی صورت میں محفوظ ہیں۔ سندھی زبان میں بھی مکتوب نگاری دیگر زبانوں کی طرح ایک اہم صنف ادب ہے اور بہت سے علمی، تحقیقی اور ذاتی نوعیت کے خطوط کتابی شکل میں اور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں جبکہ خطوط کی بڑی تعداد ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ سندھی زبان میں جن شخصیات کے خطوط اہمیت کے حامل ہیں اور کتابی شکل

میں شائع ہو کے محفوظ ہو چکے ہیں ان میں علامہ آئی آئی قاضی، میراں محمد شاہ، جی ایم سید، سید غلام مصطفی شاہ اور شیخ ایاز کے علاوہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی مکتوب نگاری کی خصوصیات

ایک اچھے خط میں اسلوب اور ایجاز و اختصار کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔اس کے علاوہ اگر مکتوب نگار ادبی انداز سے مختصر، عام فہم اور جامع مکتوب نگاری پر قدرت رکھتا ہو تو اس کے خط ادبی شہ پارہ بن جاتے ہیں۔ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ مرحوم اپنے دیگر محاسن کے باوصف ایک کامیاب مکتوب نگار بھی تھے۔ان کی یہ انفرادیت بھی قابل ذکر ہے کہ بیک وقت وہ چھ زبانوں میں مکتوب نگاری پر قدرت رکھتے تھے۔یہ زبانیں سندھی، اردو ،انگریزی، عربی، فارسی اور سرائیکی ہیں۔راقم الحروف کی نظر سے ان کی ان زبانوں میں لکھے خطوط گزرے ہیں ۔البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے سب سے زیادہ مکتوب نگاری سندھی، اردو اور انگریزی زبانوں میں کی۔ڈاکٹر صاحب کے خطوط ان کی دیگر تحریروں کی طرح علم و تحقیق کا قیمتی سرمایہ ہیں۔اب تک ان کے سندھی ،انگریزی اور اردو خطوط کے درج ذیل مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں:

1. **خطوط ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ: مرتبہ: محمد راشد شیخ**

اس مجموعے کے مکتوب الیہان میں علامہ عبد العزیز میمن، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، خواجہ عبد الوحید، ممتاز حسن، سیّد انور حسین نفیس الحسینی (نفیس رقم)، ڈاکٹر عبد الشکور احسن، ڈاکٹر محمد باقر، مشفق خواجہ ،الطاف حسن قریشی، محمد راشد شیخ و دیگر حضرات شامل ہیں۔

یہ مجموعہ مکاتیب محکمہ ثقافت حکومت سندھ کی جانب سے ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔

2. **World of Work : Predicament of a Scholar**

یہ ڈاکٹر صاحب کے نام دنیا بھر کے اہل علم و تحقیق کے خطوط اور ڈاکٹر صاحب کے جوابات کا معلومات افزا مجموعہ ہے۔ان خطوط کا دورانیہ 1946ء سے 2006ء تک کے طویل عرصے پر محیط ہے۔بلوچ صاحب نے

اس عرصے میں نہ صرف پاکستان و ہندوستان بلکہ امریکہ ،کنیڈا، اٹلی ، جرمنی ،فرانس، ترکی، ازبکستان، روس ،ایران، ملائیشیا، انڈونیشیا اور نیوزی لینڈ کے اہل علم و تحقیق کے ساتھ انگریزی میں خط و کتابت کی تھی۔ یہ خط و کتابت جن جن موضوعات پر مشتمل ہے ان میں تاریخ، قانون، ادب، علم بشریات Anthropology، موسیقی اور آلاتِ موسیقی، آثار قدیمہ، فن و ثقافت، تعمیرات، لسانیات ،فلکیات اور دیگر موضوعات شامل ہیں۔ جن جن مشاہیر کے بلوچ صاحب کے نام انگریزی خطوط اس کتاب میں موجود ہیں ان میں: ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ڈاکٹر فواد سیزکین، اینی میری شمل ،ایچ ٹی لیمبرک، سی ای بوسورتھ، سائمن ڈگبی، رشبروک ولیم، ڈاکٹر سیّد محمد یوسف، ڈاکٹر سیّد معین الحق، ڈاکٹر ریاض الاسلام، پروفیسر شیخ عبدالرشید، ظفر حسن ایبک و دیگر مشاہیر شامل ہیں۔

اس معلومات افزا مجموعۂ خطوط کو پروفیسر محمد عمر چنڈ نے بڑے سلیقے سے مرتب کیا اور اسے انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی جام شورو نے ۲۰۰۷ء میں میں شائع کیا۔

3. سڄڻ سارينديي (دوستوں کی یاد)

یہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے سندھی زبان میں لکھے خطوط کا مجموعہ ہے جس میں کل ۴۷ افراد کے نام بلوچ صاحب کے معلومات افزا خطوط جمع کیے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۵ء میں انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی جام شورو نے شائع کیا۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کے نام خطوط کے تین مجموعے سندھی زبان میں شایع ہو چکے ہیں جن میں ڈاکٹر صاحب کے بھی چند خطوط موجود ہیں۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا، بلوچ صاحب ہفت زبان عالم تھے اور ان کی ساری زندگی علم و عمل سے عبارت تھی۔ وہ ان لوگوں میں شامل تھے جن کی زندگی قلم و قرطاس کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ وہ کثیر التصانیف تو تھے ہی کثیر المکاتبت بھی تھے۔ وہ ان بزرگوں میں شامل تھے جن کے نزدیک خط کا جواب دینا ایک اخلاقی فریضے میں شامل ہوتا ہے۔ ان کے خطوط میں بھی دیگر تحریروں کی طرح علمی اور تحقیقی رنگ غالب ہے۔ وہ چھ سال تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طالب علم رہے اور دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان پر بھی انھیں بھرپور قدرت حاصل تھی۔ ان

کے روابط نہ صرف پاکستان کے اردوداں اہل قلم سے بلکہ علی گڑھ میں مقیم ڈاکٹر مختار الدین احمد (سابق صدر شعبہء عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اور ڈاکٹر نذیر احمد (سابق صدر شعبہء فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) سے بھی تھے۔

بلوچ صاحب بڑی وضع دار شخصیت کے مالک تھے، زندگی بھر انہوں نے اپنی وضعداری قائم رکھی، خط لکھنے میں بھی وہ وضعداری نبھاتے رہے۔ ان کا زندگی بھر کا معمول تھا کہ خطوں کا جواب عام طور پر وہ فوراً دیتے۔ نہ صرف خط اپنے ہاتھ سے لکھتے بلکہ لفافے پر مکتوب الیہ کا پتا اور لفافے کی پشت پر اپنا پتا بھی خود ہی لکھتے۔ وہ خطوط نگاری میں پوری کوشش کرتے کہ سائل کی مکمل تشفی ہو اور اسے تشنگی کا احساس نہ رہے۔ اسی طرح اگر انھیں کوئی شخص کتاب یا رسالہ بھیجتا تو اسے شکریے کا خط ضرور لکھتے اور اس علمی کام پر مذکورہ شخص کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ ہمارے معاشرے میں علمی و تحقیقی کام کرنا کس قدر مشکل ہے۔ وہ خود زندگی بھر ان مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے اور علمی و تحقیقی منصوبوں کو بڑی کامیابی سے مکمل کرتے رہے۔ جب کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت کمانا ہی اکثریت کا شعار ہو جائے تو علم و تحقیق بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بلوچ صاحب کے خطوط میں اس صورت حال پر افسوس اور علمی ماحول پیدا کرنے کی خواہش کا اظہار موجود ہے۔ وہ عموماً مختصر خطوط لکھتے تھے لیکن یہ مختصر خطوط بھی جامعیت کا رنگ لیے ہوتے اور بات مکمل اور واضح ہو جاتی۔ ضرورت پڑنے پر سائل کو تفصیل سے بھی لکھتے۔ وہ نثر میں تکلف و تصنع کے قائل نہ تھے اور نہ ہی مسجع و مرصع زبان لکھتے تھے۔ ان کی نثر سادہ و پرکار ہوتی تھی۔ یہی انداز ان کے خطوں میں بھی نمایاں ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقرے لکھتے تھے اور بہت سادہ لیکن واضح انداز میں اپنی بات مکتوب الیہ تک پہنچانے پر بھرپور قدرت رکھتے تھے۔ موضوع کی مناسبت سے عربی و فارسی اشعار، اقوال اور الفاظ بھی تحریر فرماتے۔ ان کے خطوط میں علمی و تحقیقی نکات، انسانی ہمدردی، چھوٹوں کی علمی امداد، حوصلہ افزائی، علمی و ادبی کاموں کا ذکر، خلوص و محبت کی باتیں بھی ہیں، کہیں کہیں ظرافت کے پھول بھی جھڑتے ہیں۔

راقم الحروف نے جب بلوچ صاحب کے استاد محترم علامہ عبدالعزیز میمن کی سوانح اور علمی خدمات پر کتاب کا آغاز کیا تو سب سے پہلے بلوچ صاحب ہی سے رابطہ کیا۔ جواباً انھوں نے تحریر فرمایا:

''آپ کا خط مورخ 98-11-23 موصول ہوا۔ خوشی ہوئی کہ آپ استاذ محترم مرحوم المیمنی

کی سوانح مرتب کرنا چاہتے ہیں اور ماخذ جمع کرنے میں کافی پیش رفت ہوئی ہے۔'' (مکتوب مورخہ ۲۵؍نومبر ۱۹۹۸ء)

اسی طرح جب اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے بلوچ صاحب پر کتاب لکھنے کا کام راقم کو سونپا گیا تو اس کام کی خاطر راقم نے بلوچ صاحب سے مسلسل رابطہ رکھا اور دو مرتبہ حیدرآباد میں ان کے مفصل انٹرویو بھی ریکارڈ کیے۔ یہ بلوچ صاحب کی شفقت تھی کہ اس کام کو بنظر استحسان دیکھا اور جب کتاب بہ عنوان ''ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔ شخصیت اور فن'' شائع ہوئی تو بذریعۂ خط درج ذیل الفاظ میں راقم کی حوصلہ افزائی فرمائی:

''آپ کا احسان کہ آپ نے اتنی اچھی کتاب میرے متعلق مرتب کی ہے۔ کتاب پڑھ کر احباب نے بھی تعریف کی ہے۔ اسلام آباد سے کچھ مطبوعہ کاپیاں مجھے بھجوائی گئی تھیں اور میں نے احباب کو دے دی ہیں۔ سب پڑھ کر آپ کی تعریف کرنے لگے۔'' (مکتوب مورخہ ۱۵؍جنوری ۲۰۰۸ء)

راقم کی تالیف ''علامہ عبدالعزیز میمن سوانح اور علمی خدمات'' پہلی مرتبہ ۲۰۰۹ء میں شایع ہوئی۔ جب اس کے چند نسخے راقم تک پہنچے تو سب سے پہلا نسخہ راقم نے بلوچ صاحب کی خدمت میں روانہ کیا۔ انھوں نے اپنے استاد محترم کی اس اولین سوانح پر انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا اور راقم کے نام خط میں تحریر فرمایا:

''آپ کو یاد کرتے ہوئے یہ عید مبارک ارسال کر رہا تھا کہ ڈاک میں آپ کا گراں بہا تحفہ یعنی قبلہ میمن صاحب کی سوانح پر لکھی گئی یہ کتاب میرے سامنے آئی گویا آپ کی طرف سے 'عید مبارک' احسن طریقے پر ادا ہوئی۔ میں ممنون ہوں کہ کتاب کی پہلی کاپی آپ نے مجھے بھجوادی اور میں بیحد خوش ہوں اور آپ کو داد دیتا ہوں کہ آپ نے قبلہ استاذ کی سوانح کے سلسلے میں جملہ ماخذ سے خوشہ چینی کر کے یہ تفصیلی تصنیف مرتب کی۔ میں نے کتاب کو سرسری طور پر دیکھا ہے اور اب تفصیل سے پڑھوں گا لیکن استاذ مرحوم سے متعلق آپ کی یہ کتاب ایک بڑی مدت تک معتمد علیہ یادگار رہے گی۔'' (مکتوب مورخہ ۱۸؍ستمبر ۲۰۰۹ء)

بلوچ صاحب کا قریبی تعلق جناب ممتاز حسن مرحوم سے بھی تا حین حیات رہا۔ ممتاز حسن مرحوم پاکستان میں اہل علم اور علمی و تحقیقی اداروں کے بہت بڑے سرپرست تھے۔ ایک موقع پر جب ممتاز حسن کراچی سے حیدرآباد آئے اور بلوچ صاحب کو اطلاع ان کے واپس جانے کے بعد ملی تو کس اپنائیت سے ملاقات سے محرومی کا ذکر کیا:

''قبلہ علامہ قاضی صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ یہاں حیدرآباد تشریف لائے اور دیگر ذرائع سے معلوم ہوا کہ یہاں آپ کا شاید ایک رات کے لیے قیام بھی رہا۔ جس دن آپ یہاں تشریف لائے میں حیدرآباد میں ہی تھا البتہ شاید شام کو نواب شاہ چلا گیا تھا۔ آپ سے والہانہ محبت اور عقیدت ستا رہی ہے کہ اس مرتبہ آپ کی آمد کی اطلاع بندہ کو کیوں نہ ملی۔ ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے، والی کیفیت ہے۔ یہ برداشت نہ ہوا اس لیے یہ چند الفاظ بطور حال دل لکھ رہا ہوں۔'' (مکتوب مورخہ ۱۷؍جولائی ۱۹۶۵ء)

جیسا کہ ذکر کیا گیا، بلوچ صاحب کو کوئی شخص کوئی کتاب یا رسالہ بھجواتا تو اس کا شکریہ بھی ادا کرتے اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ مثلاً سیّد عماد الدین قادری صاحب نے بلوچ صاحب کے لیے ترکی سے کتاب منگوا کر ان کی خدمت میں پیش کی تو کس محبت سے جوابی خط میں ان کا شکریہ ادا کیا:

''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔ آپ کا کرم نامہ مورخہ ۱۱؍اپریل ۲۰۰۴ء موصول ہوا۔ نہایت خوشی ہوئی کہ آپ جیسے بلند کردار ذمہ دار احباب ہمارے معاشرے میں باقی ہیں جو ایفائے عہد کو اہمیت دیتے ہیں۔ میں اپنی گزارش بھول چکا تھا لیکن آپ نے اس کو یاد رکھا۔ میں بیحد ممنون ہوں کہ آپ نے میری خاطر اتنی زحمت اٹھائی۔ کتاب کی قیمت، ڈاک کا خرچ اور باقی اخراجات ملا کر مجھے بذریعہ وی پی پی بھجوا دیں۔'' (مکتوب مورخہ ۱۴؍اپریل ۲۰۰۴ء)

اسی طرح جب اردو کے نامور محقق جناب مشفق خواجہ نے کتاب 'معربات رشیدی' کے ترجمے کا نسخہ بلوچ صاحب کو پیش کیا تو نہ صرف خواجہ صاحب کا شکریہ ادا کیا بلکہ مترجم یعنی ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب کی محنت کی ان الفاظ میں تعریف کی:

''میں ممنون ہوں کہ آپ نے رسالہ 'معربات رشیدی' کا تحفہ عنایت فرمایا۔ مبارک ہو کہ ادارۂ یادگار غالب سے اشاعت کے لیے آپ نے اس علمی کتاب کو منتخب فرمایا اور مزید مبارک باد کہ آپ نے جناب ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب کو اس کے اردو ترجمے اور مزید تحقیقات کے لیے تکلیف دی۔ ان کے حواشی اور تعلیقات نے آپ کی اس اشاعت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ تحقیق کی رو سے یہ ایک مثالی ترجمہ ہے اور مشعل راہ ماضی کے متون کے تراجم کے لیے۔'' (مکتوب مورخہ ۲/اگست ۲۰۰۴ء)

بلوچ صاحب کی عادت تھی کہ اگر کسی اہل تعلق یا اس کے متعلقین میں سے کوئی فرد وفات پا جاتا تو تعزیتی خط لکھتے جس میں کوشش کرتے کہ ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جو مکتوب الیہ کے لیے غم والم کی کیفیت میں مرہم کا کام کریں۔ نامور خطاط اور شیخ طریقت سیّد انور حسین نفیس الحسینیؒ کے صاحبزادے حافظ سیّد انیس الحسن کے انتقال انھیں یوں تعزیتی خط لکھا:

''مجھے اس کا علم نہ رہا کہ باری تعالیٰ کی طرف سے آپ کو بڑی آزمائش کے لیے منتخب کیا گیا کہ رفیقۂ حیات کی وفات کے بعد فرزند ارجمند فوت ہوئے۔ یہ خبر حال ہی میں فاضل محترم رشیدی صاحب (کراچی) نے سنائی۔ انسان اپنی خلقت میں ضعیف ہے اس لیے دعا ہے کہ رَبَّنَا لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ۔ تاہم رضائے الٰہی سے اپنے پیاروں کے لیے صبر آزما مراحل مقدر ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ میں کہ گرویدۂ احسان ہوں، دل و جان سے اس صبر آزما دکھ میں آپ سے شریک ہوں۔ دعا ہے کہ خالقِ اکبر مرحومین کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور بخششوں سے مالا مال کرے آمین'' (مکتوب مورخہ ۱۰/ستمبر ۲۰۰۲ء)

ایک اردو خط میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری کو پیر غلام دستگیر نامی کی وفات پر تعزیتی الفاظ یوں لکھتے ہیں:

''جناب پیر غلام دستگیر نامی صاحب کی وفات حسرت آیات کا سن کر دلی صدمہ ہوا۔ آپ نے بندہ کو اس المیہ میں یاد فرمایا۔ جزاک اللہ۔ مرحوم نامی صاحب اخلاقِ حمیدہ کا

مجسمہ تھے۔ مجھے ان سے والہانہ محبت تھی۔ اللہ پاک ان کو جوارِ جنت عطا فرمائے۔ آمین''(مکتوب مورخہ ۲۳ر دسمبر ۱۹۶۱ء)

ایک اور خط میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری کو جناب شریف احمد شرافت نوشاہی کی علمی خدمات پر سفارش کرنے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جناب شرافت نوشاہی صاحب کی علمی و ادبی و تاریخی خدمات کے مدنظر میں نے سفارش کی ہے کہ ان کو صدر پاکستان کی طرف سے اعزاز بخشا جائے۔ لیکن میرے پاس ان کی تصانیف وغیرہ کی تفصیل موجود نہیں۔ اگر ایک ہفتہ کے اندر اندر آپ ان کا (جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں)Biodata بھجوادیں تو اس سفارش کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ ''(مکتوب مورخہ ۱۹ر جون ۱۹۸۲ء)

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی عادت تھی کہ اگر کوئی ان سے علمی معاونت کی درخواست کرتا تو اپنی معلومات اور اپنے کتب خانے سے اس کو ہر ممکن معلومات فراہم کرتے۔ اس حوالے سے آغا نصیر خان کو لکھتے ہیں:

''بشرط فراغت حسبِ ذیل معلومات شہر گنداوہ سے متعلق ارسال فرما دیں۔ اس وقت شہر کی مردم شماری (تقریباً) کتنے سکول (پرائمری ،سکینڈری یا ہائی سکول) ہیں۔ ہسپتال کی نوعیت، خزدار سے جو راستہ گنداوہ آتا ہے اس کی نشان دہی (یعنی کہ کون سی بستیاں راستہ میں پڑتی ہیں)۔ پنجگور سے گنداوہ آنے کے لیے لامحالہ خزدار سے ہی گزرنا پڑے گا یا اور کسی راستے کا بھی احتمال ہو سکتا ہے۔''(مکتوب مورخہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۷۲ء)

حکیم محمد سعید شہید کا زندگی بھر ڈاکٹر بلوچ صاحب سے نہایت قریبی تعلق رہا۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے انھی کے کہنے پر ۱۹۹۳ء میں صوبائی وزیر تعلیم کا عہدہ قبول کیا تھا۔ حکیم صاحب کئی معاملات میں ڈاکٹر صاحب سے مشورے کرتے تھے۔ اس بارے میں نوجوانوں سے متعلق کانفرنس پر بھی مشورہ کیا تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے حکیم صاحب کو لکھا:

''۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں کا عنوان ''نوجوان اور

امن‘‘ غالباً اس لیے ہے کہ ان کانفرنسوں میں مسلم اور غیر مسلم نوجوان حصہ لیں گے۔ ۱۹۸۵ء والی کانفرنس کا عنوان ’’نوجوان امن اور اسلام‘‘ ہے۔ اسی مناسبت سے ضروری ہے کہ تمام دنیا کے اسلامی ممالک سے نوجوان شرکت کریں۔ بصورت دیگر پہلی دو کانفرنسیں ’’نوجوان امن اور اسلام‘‘ کے موضوع پر مرکوز ہوں اور نوجوانان اسلام ان میں شرکت کریں تاکہ امہ اسلامیہ کے مسائل پر سیر حاصل بحث ہو سکے۔ میری ناقص رائے میں اس موضوع پر ایک کانفرنس ۱۹۸۳ء میں منعقد کی جائے۔ دوسری کانفرنس ۱۹۸۵ء میں ’نوجوان اور امن‘ پر ہو جس میں تمام ممالک سے مسلم اور غیر مسلم نوجوان شریک ہوں۔ اقوام متحدہ کے ’’۱۹۸۵ء: سال نوجوانان‘‘ کے اعتبار سے یہ وسعت زیادہ مناسب ہوگی۔ تین کے بجائے دو کانفرنسیں زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوں گی۔‘‘ (مکتوب مورخہ ۲۱/اکتوبر ۱۹۸۲ء)

عالم اسلام کے نامور محقق اور عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم سے ڈاکٹر بلوچ صاحب کا قریبی تعلق تھا۔ بلوچ صاحب نے سو عظیم کتابوں کے منصوبے کے سلسلے میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے کئی مرتبہ مشورے کیے اور پیرس میں ان سے ملاقاتیں بھی کیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ جب ۱۹۸۰ء میں پاکستان آئے تو حیدرآباد میں بلوچ صاحب سے ملنے ان کی رہائش گاہ بھی گئے تھے پھر دونوں حضرات پیر جھنڈا لائبریری (سعید آباد) دیکھنے بھی گئے۔ ایک خط میں ڈاکٹر بلوچ صاحب ڈاکٹر حمید اللہ کو لکھتے ہیں:

’’گزشتہ دسمبر میں جناب بروہی صاحب نے ایک خط آپ کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ اسی سلسلے میں بندہ نے بھی ایک خط لکھا تھا۔ آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ مقصد ہے کہ مختلف علوم میں مسلمان مفکروں، مؤرخوں، طبیبوں، ریاضی دانوں وغیرھم نے جو عالمی سطح کی تحقیقی اور تخلیقی تصنیفیں کی ہیں ان میں سے ایک سو کتابوں کو مؤثر طریقے پر آج کی دنیا سے روشناس کرایا جائے۔

کون سی ایک سو کتابیں منتخب کی جائیں اور ان کو روشناس کرانے کے لیے کون سا

طریقۂ کار اختیار کیا جائے؟ اس سلسلے میں ہم یہاں پر ایک خاص الخاص میٹنگ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ دلی تمنا ہے کہ آپ تشریف لائیں اور ہماری رہنمائی فرمائیں۔
دریں اثناء نمونے کے طور پر چند کتابوں کے نام تجویز کریں تو ہم بھی اسی نہج پر سوچتے رہیں۔'' (مکتوب مورخہ ۲رجون ۱۹۸۴ء)
ایک اور خط میں ڈاکٹر بلوچ صاحب ڈاکٹر حمید اللہ کو سو عظیم کتب منصوبے میں رہنمائی کے حصول کے حوالے سے لکھتے ہیں:
''بڑی کتابوں' کے سلسلے میں آپ کی دعائے خیر میرے لیے باعث تسکین ہے خصوصاً اس حال میں کہ میں حتی الوسع اس منصوبے کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر آپ کسی اجلاس میں نہ آسکیں تو بھی دعا فرمائیں۔ البتہ آپ کی اجازت سے، میں 'ایڈیٹوریل ایڈوائزری بورڈ' میں آپ کا اسم گرامی باعث خیر و برکت سمجھ کر لکھتا رہوں گا، اور کبھی اشد ضرورت کی حالت میں آپ سے رہنمائی طلب کروں گا۔'' (مکتوب مورخہ یکم جون ۱۹۸۸ء)

ایک اور خط میں ڈاکٹر بلوچ صاحب ڈاکٹر حمید اللہ کو لکھتے ہیں:
''معذرت خواہ ہوں کہ ایک طویل مدت کے بعد آپ کے خط مورخہ ۲۸رجب کا جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ نے مولانا مقبول سبحانی کے کشمیری ترجمہ قرآن مجید کے متعلق استفسار فرمایا تھا۔ وزارت مذہبی امور سے جواب باصواب اس طرح موصول ہوا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے کتابت مکمل ہو چکی ہے۔ مفتی ضیاء الحق بخاری صاحب کی نگرانی میں تاج کمپنی کراچی سے چھپنے کا سلسلہ جاری ہے اور عنقریب نسخہ چھپ کر آ جائے گا۔ (مکتوب مورخہ ۲۶راپریل ۱۹۸۸ء)
ڈاکٹر بلوچ صاحب کی مستقل عادت تھی کہ اگر انھیں کوئی کتاب یا رسالہ بھیجتا تو جواباً اسے شکریے کا خط ضرور لکھتے اور اس خط میں کتاب یا رسالے سے متعلق اپنے تاثرات بھی لکھتے تھے۔ اس بارے میں خواجہ رضی

حیدر کو لکھتے ہیں:

''ممنون ہوں کہ آپ نے یاد فرمایا اور شاداب احسانی صاحب کی غزلوں کا 'پس گرداب' غنچہ موسمِ بہار میں بطور تحفہ ارسال فرمایا۔ میں ممنون ہوں۔ شاداب کی غزلوں میں ندرت ہے۔ حقائق کو دلپذیر پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً کہ ہمارے ''علمی'' ماحول کی عکاسی:

زر اندوزی ہو علم و فضل پر غالب تو پھر شادابؔ
پڑھے لکھے کریں بھی کیا اگر جاہل نہ ہو جائیں

امید ہے کہ آئندہ ان کے گردِ آب سے کئی غنچے شاداب ہوں گے۔'' (مکتوب مورخہ ۴/اپریل ۱۹۸۷ء)

جب اظہر سہیل ایڈیٹر تخلیق لاہور نے اپنے رسالے کا ''سندھی ادب و ثقافت نمبر'' شائع کیا تو اس نمبر کی ایک اعزازی کاپی ڈاکٹر بلوچ صاحب کی بھی بھیجی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس نمبر کی اشاعت پر پسندیدگی کا اظہار کیا اور نمبر سے متعلق اظہر جاوید کو لکھا:

''مخزن تخلیق کا 'سندھی ادب و ثقافت نمبر' موصول ہوا۔ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ ماشاءاللہ آپ کا جذبہ اور محنت لائق تحسین ہے اور یہ سندھ سے آپ کی محبت اور اخوت کا بین ثبوت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے دوام بخشے۔ آمین۔

تخلیق کا یہ نمبر یقیناً سندھی ادب و ثقافت کی قدردانی میں اضافے کا سبب بنے گا۔ اس سے سندھی ادب و ثقافت کے بہت عمدہ گوشے سامنے آئے ہیں۔ نیز اس کی وساطت سے آئندہ اس موضوع پر کام کرنے والے اردو دان حضرات کے لیے نئے افق نمودار ہوں گے۔

میں ایسا جاذب نظر، دیدہ زیب، ادب و ثقافت کا انمول مرقع اور حسن ظاہری و باطنی کا حامل نمبر نکالنے پر آپ کو اور آپ کے جملہ احباب (جنھوں نے اس نمبر کی تحریر و

تدوین میں آپ کی معاونت کی ہے) کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ بالخصوص مرحب قاسمی صاحبہ اور مسرت مرزا صاحبہ کو۔'' (مکتوب مورخہ ۳/ مارچ ۱۹۸۸ء)

ڈاکٹر بلوچ صاحب کے لائق پوتے جناب محمد ارشد بلوچ نے اپنی کوشش سے ڈاکٹر صاحب کے سندھی زبان میں لکھے کئی خطوط حاصل کیے ہیں ۔راقم جناب ارشد بلوچ صاحب کا تہہ دل سے مشکور ہے کہ پیش نظر باب کی تکمیل کی خاطر انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے ان خطوط کے مطالعے اور اہم اقتباسات کے اردو تراجم کی شمولیت کی اجازت دی۔قارئین کی سہولت کی خاطر ہم نے پہلے بلوچ صاحب کے سندھی زبان میں لکھے خطوط کے اردو تراجم کا اقتباس دیا ہے اور آخر میں مکتوب الیہ اور تاریخ کتابت قوسین میں دی ہے۔سندھی زبان میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کے خطوط کا یہ مجموعہ مرتبہ محمد ارشد بلوچ ان شاءاللہ سڄڻن کي ساريوم(دوستوں کو یاد کرتے ہوئے) کے عنوان سے دسمبر ۲۰۱۷ء میں شائع ہوگا۔

مجھے اپنی تعریف سننے سے تکلیف ہوتی ہے۔اس کے باوجود اچھے کام کی تعریف کو ضروری سمجھتا ہوں تا کہ اچھے کام کرنے کی خواہش لوگوں میں پیدا ہو۔علمی نوعیت کے کاموں کی اہمیت کو اجاگر کرنا ضروری ہے......میرے دل میں آپ کے کام کی قدر ہے میرے بارے میں جو بھی معلومات درکار ہوں وہ بھیجوں گا۔گوٹھ جعفر جان لغاری نامی کتاب میں میرے بچپن کا ذکر موجود ہے وہ بھی آپ کے لیے حاصل کروں گا۔

آپ نے میرے خط سے ناراضگی کا تاثر لیا جس پر مجھے افسوس ہے۔آپ سے محبت ہے اور یہ محبت قائم رہے گی۔اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور عافیت عطا فرمائے اور آپ اپنے بقیہ علمی منصوبے مکمل کرسکیں گے۔(بنام ڈاکٹر حامد علی خانائی مورخہ 12/2/2001)

آپ کا خط مورخہ 1/3/99 ملا اور اس کے ساتھ کتاب ''تذکرہ کوٹائی سادات روہڑی''۔میں اس تحفے کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔یہ کتاب علمی تحقیقی معیارات کے مطابق تصنیف کی گئی ہے اور آپ نے موضوع کے تمام رخ روشن کیے ہیں۔آپ نے تحریری مآخذات کے علاوہ زمینی آثار کو بھی سامنے رکھا ہے اور لوگوں سے بھی معلومات

حاصل کی ہیں۔صحیح تحقیق کا یہی طور طریقہ ہے۔مبارک باد۔'' (ایضاً)

شاہ عبداللطیف نہ صرف سندھ کے بڑے شاعر اور مفکر تھے بلکہ دنیا کے عظیم شعرا میں سے ایک تھے۔اعلیٰ تخیل اور پاکیزہ جذبات ان کی شاعری کی روح ہیں۔وہ کوئی بھی ایسی سطحی بات نہیں کرتے جو عام لوگ کرتے ہیں۔یہی ان کے کلام کی درست پہچان ہے۔ البتہ جیسا کہ دیگر بڑے شاعروں کے ساتھ ہوا اس طرح بھٹائی کے ساتھ بھی ایسی باتیں اور ایسے اشعار منسوب کیے گئے جو بھٹائی کے شایان شان نہیں، ملا ملا والا بیت جس میں گلہ ہے وہ بعد کے احمقوں کا کہا ہوا ہے۔بھٹائی کے اشعار کی پرکھ یہ ہے کہ ان میں الفاظ و معانی میں کس قدر خوبصورتی ہے۔جن بیتوں میں الفاظ و معانی کا یہ حسن موجود نہ ہو وہ بھٹائی کے نہیں (بنام ڈاکٹر عبدالرسول قادری مورخہ 10/1/81)

لطائف لطیفی کا آپ سندھی ترجمہ کریں۔چھپوانے کی کوشش کی جائے گی۔مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی پر کتاب لکھنا مبارک ہو۔یہ بہت ضروری ہے کہ آپ مخدوم صاحب کی زیادہ سے زیادہ تصانیف کا مطالعہ کر لیں تا کہ مخدوم صاحب کی سوانح کے بارے میں زیادہ سے زیادہ مواد حاصل ہو ایک باب امید ہے مخدوم صاحب کی سوانح کے بارے میں لکھیں گے ۔امید ہے کہ بذل القوة فی حوادث سنی النبوة کا مقدمہ (مخدوم امیر احمد صاحب کا لکھا ہوا) آپ نے پڑھا ہو گا۔(ایضاً 11/9/85)

آپ نے اپنے گزشتہ خط میں اس نیک ارادے کا اظہار کیا تھا کہ مخدوم مبرور محمد ہاشم پر تفصیلی اور تحقیقی کتاب لکھیں گے۔اس کا میں نے جواب لکھا تھا جو آپ تک پہنچا ہو گا۔ غالباً میں نے مخدوم کی کتاب ''اتحاف الاکابر کا ذکر کیا تھا کہ اس کے بارے میں بعض اشارات ایک مختصر مضمون کی صورت میں رسالہ ''مہران کو بھیجے تھے۔ایک قلمی نسخے سے آخری صفحات کے فوٹو میں نے لیے تھے جو آپ کو بھیج رہا ہوں۔ان صفحات میں مخدوم

صاحب نے اپنی ایک سو پانچ تصانیف کے نام لکھے ہیں۔ امید ہے یہ مواد آپ کے لیے کار آمد ثابت ہوگا لیکن آپ کو مخدوم صاحب کی ہر کتاب کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ (ایضاً 3/10/85)

آپ کی جانب سے بھیجی گئی ڈگری کی کاپی اور عبرت اخبار میں شائع شدہ خبر کا تراشہ ملا۔ دیکھ کر خوشی ہوئی آپ کو اس شاندار کامیابی پر مبارک باد۔ اب مزید کام کرنے کے لیے میدان وسیع ہے۔ بہت سے کام کیے جاسکتے ہیں لیکن ترجیح ان کاموں کو دینی چاہیے جن سے علمی معلومات اور تحقیق میں اضافہ ہو۔ (ایضاً 97 / 9 / 6)

آپ کا مفصل خط اور اس کے ساتھ تحقیقی مقالے اور حیاۃ القاری کے صفحات کے عکس ملے۔ آپ نے بڑی زحمت کی بڑی مہربانی۔ مجھے یہ مواد دیکھ کر دلی مسرت ہوئی کہ آپ نے جو تحقیقی مقالہ لکھا اس کا پورا حق ادا کیا۔ حیاۃالقاری کے نہ صرف قلمی نسخوں تک بلکہ مخدوم سرور کے ماخذات پر اہم ماخذ یعنی حافظ مزی کے اطراف تک پہنچے۔ محقق کو چاہیے کہ اس طرح تحقیق کا حق ادا کرے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ میں امام بخاریؒ پر کچھ لکھ رہا ہوں اور اس سلسلے میں حافظ مزی کی کتاب اور حیاۃ القاری کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ ایک دن کے لیے گوٹھ بھر چنڈا بھی گیا تھا جہاں پیر صاحب بہت اکرام سے پیش آئے۔ میں آئندہ اتوار (۱۹ تاریخ) کو وہاں دوبارہ جاؤں گا۔ اگر آپ فارغ ہوں تو وہاں آئیں تاکہ ہم حیاۃ القاری اور حافظ مزی کی تحفۃ الاشراف کا موازنہ کریں۔ یہ موازنہ اس لیے کیا جائے گا تاکہ پتہ چلے کہ:

☆ مخدوم صاحب نے وہی حافظ مزی والی صحیح بخاری کی احادیث حیاۃالقاری میں شامل کی ہیں یا ان میں علمی طور پر کتنا اضافہ کیا ہے؟

☆ صحیح بخاری کی مزید کئی احادیث شامل کی ہیں۔ وہ کون کون سی احادیث ہیں جو حافظ مزی سے رہ گئیں؟

☆ مخدوم صاحب نے ترتیب کے طریقہء کار میں وہی حافظ مزی کے طریقے کی پیروی کی ہے یا اس میں کوئی نیا اضافہ بھی کیا؟ (ایضاً 15/4/98)

معلوم ہوا ہے کہ مخدوم محمد ہاشم سے قبل بڑے عالم اور محقق مخدوم ابوالحسن نورالدین بن عبدالھادی التتوی السندی ثم المدنی نے صحیح بخاری کے اطراف پر کتاب لکھی تھی۔ آپ نے اپنی محققانہ معلومات کے وقت کس نتیجے تک پہنچے تھے کہ مخدوم ابوالحسن مذکور مخدوم محمد ہاشم کے اساتذہ میں سے تھے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ مخدوم صاحب کی کتنی کتب سے متعلق آپ معلوم کر سکے؟ (ایضاً 15/5/98)

میں نے کافی مواد ''سندھ میں فارسی شاعری'' سے متعلق جمع کیا ہے جو تکملۃ التکملۃ (یعنی خلیل کے تکملے کا تکملہ) کے عنوان سے شائع کرنا مناسب ہوگا۔ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ اس تحقیقی کام میں میرے ساتھ شریک ہوں۔ باقی ماندہ کام پورا کریں اور کتاب میرے اور آپ کے نام سے شائع ہو یا سندھ سے متعلق فارسی کتب میں سے کسی کتاب پر کام کریں یا 'سندھ کے کتب خانے' نامی کتاب میں میرے ساتھ شریک ہوں۔ مطلب یہ کہ آپ اپنی صلاحیت کو استعمال کریں اور علم کی خدمت کریں (ایضاً 16/12/98)

آپ کا پیار بھرا خط اور اس کے ساتھ کتاب وتذکرۃ المراد پہنچی۔ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آپ نے محنت اور محبت سے ترجمہ کیا ہے اسے پڑھنا آسان ہے۔ مبارک باد۔ یہ مختصر کتاب ہے بہتر ہوتا کہ اصل متن بھی عکس کی صورت میں چھپ جاتا تو محفوظ ہو جاتا۔ دوسری صورت میں ہر نسخے سے پہلا اور آخری صفحہ کا عکس دیا جاتا۔ آپ نے اچھا کیا کہ نسخے کے پہلے اور آخری صفحہ کا عکس دیا ہے لیکن یہ ذکر نہ کیا کہ یہ عکس کس نسخے کے ہیں۔ ان عکوس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ بالکل بعد کے دور کا ہے یعنی ۱۳۴۷ھ میں نقل ہوا۔ میں نے کسی زمانے میں اس سے کافی اوائلی دور کا نسخہ دیکھا تھا۔ (ایضاً بلا تاریخ)

سندھ میں فارسی شاعری کی تاریخ کا آخری دور پر کچھ عرصے سے کام چل رہا ہے جو اب مکمل ہوا ہے۔عطا محمد حامی نے چند کتب کا ذکر کیا ہے جو درازا کے فاروقی بزرگوں کے پاس دیکھی تھیں مثلاً محمد اشرف فاروقی کے پاس ،دیوان عجائب فارسی' از آخوند محمد ابراہیم عشقباز کی دیکھی تھی۔وقت گزر چکا لیکن معلوم کریں اگر ایسا کوئی آدمی ہوتو یہ کتاب دیکھیں گے(ایضاً 3/2/2007)

آج کتاب' الرحیق المختوم' کے مطالعے کا موقع ملا۔آپ نے اتنی ضخیم کتاب کا آسان سندھی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔آپ کا ذوق اور ہمت پر آفرین ہے۔آپ نے اپنی جانب سے جو بھی الفاظ لکھے ان میں سمجھ اور دانائی ہے۔یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کے دل میں حضرت نبی کریم ﷺ کی سیرت مبارکہ پر لکھنے کا شوق بیدار ہوا ہے ماشاءاللہ اس محبت اور عقیدت پر آپ کو مبارک باد(بنام قاضی مقصود احمد 27/11/2008)

عرب سے نسبت اسلام سے تاریخی وابستگی ،اس لحاظ سے مضمون اگر شائع کیا جائے تو مناسب ہوگا۔گزشتہ ۱۳سو برسوں میں عرب کے کئی محترم قبائل آئے اور یہاں رہ کر سندھی ہوگئے ۔ان کے اصل نام بھی سندھی ہوگئے ۔میھور،تھیم ،مھسیر ،(بنو مھیسرہ) تنیا اور کئی دیگر قبائل کے بارے میں روایات موجود ہیں کہ یہ عرب ہیں ۔(بنام عبدالحی ابڑو 30/7/2000)

مھیسر عرب ہیں۔ان کے بزرگ محمد بن قاسم کے ساتھ آئے تھے۔اصل میں ان کا قیام دادو اور لاڑکانہ والے حصے میں رہا۔دوسری روایت کے مطابق سیوہن کی فتح کے وقت ان کے سردار محمد بن قاسم کی فوج کے داہنے جانب کی صفوں (میسرہ) کے قائد

تھے۔صرف مھیسر قبیلہ ایسا ہے جسے عربی سے محبت،قرآن پاک سے محبت اور دین اسلام سے محبت مسلسل آج تک ہے۔کئی قبائل آئے اور یہاں رہ گئے اور ان کے نام سندھی ہوگئے۔مھیسر ،میٹھور ، پالاری ،ھتیا اور کئی دیگر قبائل یہ سب عرب قبائل ہیں ۔(بنام عبدالرحمن مھیسر مورخہ 5/4/2000)

آپ کی ہمت ہے کہ آپ نے بڑی منزلت والی فقیر محمد سائیں کی مسجد کو آباد کیا ہے ۔اس جگہ میں آنا چاہتا ہوں ،ان شاء اللہ ملاقات ہوگی (بنام حافظ مہران مورخہ 1/1/2006)

بڑی خوش خبری آپ نے سوبھا خان عرف شعر خان لاشاری کی دی ہے۔اگر پر ہوتے تو اڑ کر پہنچ جاتا۔یہ بڑی عمر کا آدمی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ملاقات سے پہلے ہی اڑ جائے لیکن میں جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ان شاء اللہ۔محمد بچل سے بازوں کی خبریں بھی پوچھیں گے اور اس کے ہاتھ کا پکا کھانا بھی کھائیں گے بشرطیکہ زیادہ گھی نہ ڈالے ۔بہر حال یہ سب تکلیفیں آپ کو کرنی پڑیں گی۔(بنام ضیاء الدین شاہ 27/7/90)

اسکول کے بارے میں اعلان کرنا بالکل موزوں ہے۔میں نے جو کچھ لکھا تھا اسے بھی عمدہ طریقے سے آپ شامل کر دیں ۔اسکول کی عمارت پر توجہ دینی چاہیے۔میں نے اس بارے میں غور کیا ہے کہ کلاس روم 20x14 کے بنانے چاہییں ۔دو گارڈز کی ضرورت پڑے گی ۔سائنس ہال کا 25x16 کا ہونا چاہیے۔پکی اینٹوں سے بننا چاہیے۔باہر کے دیواریں پختہ ہوں اور ان میں درزیں بھی ہوں۔اندرونی جانب ضرورت کے مطابق پلستر ہو اور فرش بھی سیمنٹ کا ہو۔کسی بااعتماد مستری سے معلوم کریں کہ 20x14 کے کمرے پر کتنا خرچ آئے گا پھر تمام احباب سے کہا جائے گا اور ایک ایک کمرہ

ہر کوئی بنوائے۔ کمرہ بنوانے والے کا نام اوپر لگایا جائے گا۔(ایضاً22/11/2002)

سندھ کی تاریخ اور تہذیب میں اسلامی اقدار سجائے سمائے ہوئے
ہیں، انہیں ہمیں روشن کرنا ہے۔ بڑے حوصلے سے سارے ملک کی خیر خواہی کرنی ہے
،نفرتیں ختم کر کے محبتیں قائم کرنی ہیں۔(ایضاً 4/10/2003)

سندھ کے بارے میں ابھی بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ایسے خادم درکار ہیں
جو سندھ سے محبت کریں اور سندھ کی عظمت والے مقاصد کو سامنے رکھ کر خدمت کریں اور
بیرونی نظریات کو سندھ پر چسپاں نہ کریں۔سندھ کے ماضی کو اپنا سمجھیں اور اسے داغدار نہ
کریں اور سندھ کے تمام باشندوں میں باہمی محبت پیدا کریں اور انہیں ایک دوسرے کے
خلاف نہ بھڑکائیں(بنام غلام محمد لاکھو19/2/83)
میاں نور محمد خان کلھوڑو کے بارے میں آپ کا انگریزی مقالہ پہنچا۔مجھے خوشی
ہوئی آپ نے اپنی لیاقت میں اضافہ کیا اور انگریزی میں مقالہ لکھا ہے۔یہ آپ کی پہلی
کوشش ہے اور اس لحاظ سے بہترین کوشش۔امید ہے آپ آگے قدم بڑھائیں گے
(ایضاً19/7/87)

میرے یومِ پیدائش (16دسمبر1917ء) کی مبارک باد ملی
۔16دسمبر 2003یوم پیدائش یاد دلاتا ہے کہ کوچ کا وقت آچکا ہے۔ایران کے شاعر حافظ
شیرازی نے کہا تھا

جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

قافلے کی گھنٹی اعلان کر رہی ہے کہ کجاوے کس لو۔(بنام ایاز گل30/12/2003)

آپ نے اپنے پیارے خط مورخہ 16 دسمبر کو لکھ کر مجھے میرے یوم پیدائش کے حوالے سے یاد کیا اور مبارک باد دی جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔16 دسمبر 2003ء نے مجھے یاد دلایا کہ وقت کم بچا ہے اور کام بہت باقی ہے۔اس لیے جس قدر جلد ممکن ہو اسے مکمل کیا جائے (بنام ادل سومرو 25/12/2003)

۲۷ رمضان یوم الجمعہ ۱۴۳۰ھ
۱۸ ستمبر ۲۰۰۹ء

عید الفطر ۱۴۳۰ھ مبارک باد

عزیزم محمد راشد شیخ سلمہ اللہ

السلام علیکم: آپ کو یاد کرتے ہوئے یہ عید مبارک ارسال کر رہا تھا کہ ڈاک میں آپ کا گراں بہا تحفہ یعنی قبلہ میمن صاحب مرحوم کی سوانح پر لکھی ہوئی کتاب میرے سامنے آئی، گویا آپ کی طرف سے 'عید مبارک' احسن طریقے پر ادا ہوئی۔ میں ممنون ہوں کہ کتاب کی پہلی کاپی آپ نے مجھے بھجوا دی اور میں بیحد خوش ہوں اور آپ کو داد دیتا ہوں کہ آپ نے قبلہ استاذ کی سوانح کے سلسلے میں جملہ مآخذ سے خوشہ چینی کرکے یہ تفصیلی تصنیف مرتب کی۔ میں نے کتاب کو سرسری طور پر دیکھا ہے اور اب تفصیل سے پڑھوں گا۔ لیکن استاذ مرحوم سے متعلق آپ کی یہ کتاب ایک بڑی مدت تک معتمد علیہ یادگار رہے گی۔

گلشن اردو کی اشاعت میں تاخیر ہوگئی۔ آپ نے جو محنت کی اس کا شکریہ۔ میں نے آخری مسودہ پر سرسری نظر ڈالی اور پروف بہتر ہے۔ تاہم کارے کسی تمام نکرد!

میری طرف سے سب کو عید مبارک۔

مخلص
نبی بخش بلوچ

Dr. N. A. Baloch
Sindh University
Hyderabad Sindh
(71000)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا اردو زبان میں خط بنام محمد راشد شیخ جو علامہ عبدالعزیز میمن کی اولین سوانح کا نسخہ ملنے کے بعد لکھا

Dr. N. A. Baloch
12, Sindh University (Old Campus)
Hyderabad Sindh - 71000
Pakistan

ڈاکٽر نبي بخش خان بلوچ
12، سنڌ يونيورسٽي (اولڊ ڪئمپس)
حيدرآباد سنڌ - 71000
پاڪستان

Dated ____________

عزیزم محمد راشد شیخ صاحب

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا خط مورخہ 23/11/98 موصول ہوا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ استاذ محترم مرحوم المیمنی کی سوانح مرتب کرنا چاہتے ہیں اور ماخذ جمع کرنے میں کافی پیش رفت ہوئی ہے۔

- مقالات المیمنی مطبوعہ بیروت کا مجھے علم نہیں مل جائے تو میرے لئے بھی نسخہ خرید کر لیں۔
- کتاب کا خاکہ تسلی بخش ہے
- اساتذہ میں مولانا احمد حسن محدث کا ذکر۔ قبلہ استاذ سے میں نے کبھی نہیں سنا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے یاد نہ رہا ہو۔
- ملگرامی سے تلمذ کا انکار۔ میں اس موضوع سے نابلد ہوں
- قبلہ استاذ کی زبانی ہم نے سنا کہ (ندوہ والوں کے اشارے پر) مولانا سورتی نے تنقید لکھی۔ اہل علم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ استاذ کو اس کا بڑی صدمہ ہوا اور وہ خاص طور پر اس پر رنجیدہ تھے کہ مولانا سورتی جیسے عالم کو سامنے لایا گیا اور انہوں نے یہ تنقید لکھ کر اپنے علم کو داغدار کر دیا۔ استاذ نے فرمایا کہ: میں نے بادل ناخواستہ مولانا سورتی کی تنقید کا رد لکھا جس سے ان کی لغزشیں سب کے سامنے آ گئیں۔

قیام پشاور اور مجلہ معارف کے بارے میں میرے پاس معلومات نہیں۔ آپ اگر وہاں جا کر ریکارڈ دیکھیں تو شاید کچھ مل جائے۔

رسالہ تحقیق میں کافی کچھ مواد آ گیا ہے اطمینان ہوا کہ اس سے باخبر ہیں۔

مخلص نبی بخش بلوچ

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا اردو زبان میں خط بنام محمد راشد شیخ جس میں علامہ عبدالعزیز میمن کی اولین سوانح سے متعلق بعض سوالات کے جوابات لکھے

اسلام آباد
١٨-٢-١٩٨٨

أخينا عبد الرسول القادري حفظه الله

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته وبعد، فإني قد عثرت على ورقة فيها ذكر مكتوب من تصانيف المخدوم محمد هاشم السندي رحمه الله - وهي:

١- حياة القاري بأطراف صحيح البخاري
(نسخة خطية محفوظة في مكتبة الشيخ محمد حنيف سجدة)

٢- إتحاف الأكابر بمرويات الشيخ عبد القادر، وذيل عليه

٣- غنية الظريف بجمع المرويات والتصانيف

٤- الرحيق المختوم في وصف أسانيد العلوم

أو

غاية النيل في اختصار الإتحاف والذيل

بخطه فرغ منه في جمادى الآخرة سنة ١١٣٧ھ

مع السلام
نبي بخش عفي عنه

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا عربی زبان میں خط بنام ڈاکٹر عبدالرسول قادری

حکیم فہیم عزیزم عبدالمجید خان سلمہ اللہ

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ وبعد: نامۂ شما مؤرخہ یکم صفر ۶۹
بوساطت محبتہا نقل علی موصول شدہ وباعث مسرت ۔ نیز
ہدیۂ شکار مدارج بہجت آمیز رسید ممنون گردانید ۔ دعوت
شما بعرس حضرت شاہ گودڑ می باعث ملاقات خواہد شد
ولکن حوادث روزگار واشتغال این جانب چندان فرصت
ندہد کہ این آرزو را دریں ولا بتکمیل رسانم ان شاء اللہ
اگر آئندہ سال حالات سازگار شود منہ نیز زمام سفر خود
آن طرف معطوف گردانیدہ باشما وروداستقبال مجیب یاری فراہم کردہ ۔

مخلص
نبی بخش عفی عنہ

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا فارسی زبان میں خط بنام عبدالمجید

My Dear Mr. Umar;
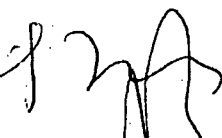
I am grateful for all the work done by you which brought such tributes to me and to you in a function which was held on Sept. 5, 2007. The cuttings from DAWN and KAWISH are enclosed for your personal and record.

All friends remember you. I always talk about you so far as world of work is concerned.

Our friend Abdul Rehman Mehesar died and this has been an extremely sad occasion for me.

I hope you are well and children are doing fine in that real country of great hope and promise.

With my best wishes,

Sincerely,

[illegible signature]

Baloch

6/9/2007

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا انگریزی زبان میں خط بنام پروفیسر محمد عمر چنڑ

باب نمبر22

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی خاکہ نگاری

دنیا کی تمام اہم زبانوں میں خاکہ نگاری ایک اہم ادبی صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔ایک کامیاب خاکہ نگار کی خصوصیات میں عمدہ ادبی اسلوب، اختصار اور جامعیت، دقیق مشاہدہ زیر تحریر شخصیت کے انسانی پہلوؤں پر گہری نظر، فضا بندی، سراپا نگاری اور شگفتگی شامل ہیں۔خاکہ نگاری زیر تحریر شخصیت کی سوانح نہیں ہوتی بلکہ کامیاب خاکہ نگار اس شخصیت کے بارے میں اس طرح لکھتا ہے کہ قاری کی نظر میں وہ شخصیت جیتی جاگتی اور ہنستی بولتی نظر آجاتی ہے اور اس کی انفرادی خصوصیات ظاہر ہوجاتی ہیں۔شخصی خاکہ دراصل زیر تحریر شخصیت کو بے نقاب کرتا ہے اور بہترین خاکہ نگار شخصیت کو بحیثیت انسان پیش کرتا ہے،، بحیثیت فرشتہ نہیں۔خاکہ نگار عموماً اس شخصیت کا خاکہ لکھتا ہے جسے نہ صرف اس نے دیکھا ہو اس سے ملاقاتیں کی ہوں بلکہ اس سے قربت بھی ہو۔(۱)

سندھی زبان میں خاکہ نگاری

خاکہ دراصل کسی شخصیت کے بارے میں ایک مختصر مضمون ہوتا ہے جس میں خاکہ نگار اس شخصیت کے بارے میں کچھ اس طرح لکھتا ہے کہ وہ شخصیت جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ جس شخصیت کے بارے میں لکھا جائے اس کی ذاتی خصوصیات اور محاسن، پسند ناپسند، مزاج، طبیعت اور خیالات کا بھی ذکر

کیا جاتا ہے۔خاکہ تفصیلی سوانح نہیں ہوتا بلکہ اس شخصیت کو جس طرح لکھنے والے نے دیکھا وہ سادہ اور دلچسپ الفاظ میں بیان کر دیا جاتا ہے۔سندھی زبان میں خاکوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو زیادہ تر ادبی شخصیات کے بارے میں لکھے گئے۔سندھی زبان کے معروف خاکہ نگاروں میں جی ایم سید، پیر علی محمد راشدی، پیر حسام الدین راشدی، غلام ربانی آگرو، شیخ عبدالرزاق راز، طارق اشرف، عبدالقادر جونیجو، مہتاب محبوب شامل ہیں ۔ان کے علاوہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے شخصیاتی مضامین میں ہمیں عمدہ خاکہ نگاری کے محاسن ملتے ہیں جن کی تفصیل آگے پیش کی جائے گی۔(۲)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی خاکہ نگاری کی خصوصیات

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے باقاعدہ خاکوں پر مشتمل کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن ان کی بہت سی تحریروں میں خاکہ نگاری کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔یہ تحریریں زیادہ تر سندھی، اردو اور انگریزی میں لکھی گئیں۔سندھی زبان میں جن جن شخصیات پر ڈاکٹر صاحب نے لکھا ان میں علّامہ آئی آئی قاضی، مولوی بہاء الدین بہائی، مرزا قلیچ بیگ ، مولوی عبداللہ لغاری، ثناء اللہ ثنائی، محمد اسماعیل نون، خان بہادر شاہنواز خان جمالی، علی نواز خان انڑ، قاضی عبدالرؤف مدارتی، فولاد علی شر، ممتاز مرزا اور مرزا عباس علی بیگ شامل ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے ان مضامین میں ان شخصیات کی انسانی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔

اردو زبان میں ڈاکٹر بلوچ نے جن جن شخصیات پر لکھا ان میں ان کے استاد محترم علّامہ عبدالعزیز میمن ، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، مولانا آزاد سبحانی، قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، ڈاکٹر غلام مصطفی خاں۔ڈاکٹر مختار الدین احمد، اور ممتاز حسن شامل ہیں۔انگریزی میں ڈاکٹر صاحب نے جن شخصیات پر لکھا ان میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، محمد ایوب کھوڑو اور سیّد شبیر حسین شاہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے لکھے بعض اہم خاکے

جیسا کہ اوپر ذکر آیا ڈاکٹر صاحب جس شخصیت پر بھی لکھتے ،اس کے محاسن اور انسانی خوبیوں کو اجاگر کرتے

تھے۔سندھی زبان میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے نانا لعل خان لغاری مرحوم پر بھی لکھا۔وہ گوکہ عام معنوں میں تعلیم یافتہ نہیں تھےلیکن دانائی اور عقل مندی کے اوصاف سے متصف تھے۔ان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

مرحوم لعل بخش خان لغاری ایک ان پڑھ دانا تھے وہ رشتے میں میرے نانا تھے ۔وہ مجھے اپنے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے تھے اس لیے بچپن میں ہی انہوں نے میری ذہنی تربیت کے لیے ہر طرح کی کوشش کی ۔ہر محفل میں مجھے ساتھ لے جاتے اور محفل کے آداب بھی سکھاتے تھے ہر بات کی فکر رکھتے تھے اور پوچھتے تھے کہ'بات سمجھ میں آئی کہ نہیں'۔ہمیشہ کہتے کہ'معنی اور مطلب کی طرف توجہ کیا کرو کہ معنی سے ہی عقل کی ابتدا ہوتی ہے وہ خوش طبعی سے کہتے تھے کہ بات کو گردن سے پکڑنا چاہیے'یعنی کہ اسے پوری طرح سمجھنا چاہیے۔وہ کہتے تھے کہ دیکھا ہوا واقعہ ہر ایک بیان کرتا ہے اور سنی ہوئی بات ہر کوئی سناتا ہےلیکن دانا وہ ہے جو سُنے دیکھے بغیر بات بتائے۔اگر کوئی بات پسند آجاتی تو کہتے کہ فلاں شخص نے کیا بات کی ہے۔بات کو جڑ سے اکھاڑا ہے انہی لفظوں اور باتوں نے بچپن ہی میں میرے اندر ادبی ذوق پیدا کیا۔نئے اشعار نئی کافیاں،نئی پہیلیاں اور نئی باتیں میرے لیے ایک تحفہ بن گئی تھیں ۔باتیں سننے اور تلاش کرنے کے شوق کا آغاز ہوا جب بھی کبھی نیا شعر یا نئی بات معلوم ہوتی تو یاد کر لیتا تھا یا لکھ لیتا تھا۔

وقت گزرتا رہا اور کچھ سال گزر گئے 1935ء میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے سندھ کو چھوڑ کر جونا گڑھ جانا پڑا۔سندھی شعر و ادب اور معنی اور مطلب سے ذوق ابھی پورا ہی نہیں ہوا تھا کہ نانا مرحوم 1937ء میں فوت ہو گئے۔یہ خبر مجھے خط کے ذریعے جونا گڑھ میں ملی۔ان کی یاد میں یہ ذوق اور بھی بڑھ گیا اور یہ ارادہ کر لیا کہ باتوں کو تلاش کیا جائے گا اور معنی کو کریدا جائے گا۔وطن سے دوری نے میرے جذبے کو اور بڑھا دیا اور سندھ کی محبت میں سندھ کے رہنے والوں کی خوبیاں اور ان کی باتیں یاد آنے لگیں۔سندھ کے میل

ملاکھڑے اور محفلیں یاد آنے لگیں۔ سندھ کے گاؤں اور سندھ کے لوگ یاد آنے لگے۔ سندھ کی کہاوتیں اور شعر یاد آنے لگے۔ مطلب کہ یادوں سے یادیں نکلنے لگیں اور باتوں میں سے باتیں یاد آنے لگیں۔

جونا گڑھ میں بی۔اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد علی گڑھ جانا پڑا۔ 1945ء تک مزید پانچ سال گزارنے پڑے۔ سندھ سے جدائی کا سلسلہ اور پہلے سے بڑھ کر تھا اس لیے سندھ، سندھی زبان سندھی ادب اور سندھی شاعری اور سگھڑ (ہنر مند) بہت یاد آنے لگے اور ان سے محبت بھی انتہا کی ہوگئی۔ ایک رات خواب میں سانون فقیر کو کے بیت پڑھتے ہوئے خود کو دیکھا اور وہ شعر آنکھ جھپکنے تک یاد تھا۔ کاغذ اور قلم اگر بستر پر موجود ہوتے لکھ لیتا لیکن تھوڑی دیر کے بعد شعر بھول گیا۔ اس طرح کی علامات نے میری محبت کو اور بڑھا دیا تھا۔ چھٹیوں میں جب بھی سندھ آنے کا موقع ملتا تو فارغ اوقات کو سندھی ادب کے نکتے تلاش کرنے میں صرف کرنے کی کوشش کرتا رہا اور اسی طالب علمی کے زمانے کی تلاش میں جو مواد مجھے حاصل ہوا اس نے مجھے یقین دلایا کہ سندھی ادب دانائی اور حکمت کی کان ہے جس میں قسم قسم کے ہیرے موتی، چاندی سونا اور جواہر موجود ہیں جن کو تلاش کر کے ڈھونڈنے اور انہیں صرف ایک دھاگے میں پرونے کی ضرورت ہے۔

بی اے اور ایم اے کے امتحان کی خاطر میں نے عربی کا مضمون اختیار کیا جس کی خاطر عربی کی کئی کتب پڑھنا پڑیں۔ ان کتب میں ابو العباس المبرّد کی کتاب 'الکامل فی الادب' (ادب میں کامل) بھی پڑھنا پڑی جس میں عربی ادب، تاریخ، لغت، صرف ونحو بلکہ عربی تمدن اور تہذیب کے بارے میں حکمت آمیز مثالیں اور مباحث، تشریحات اور وضاحتیں پیش کی گئی تھیں۔ اس کتاب میں ادب، تاریخ اور لغت وغیرہ کے موضوعات پر الگ الگ باب تو نہیں تھے لیکن موقع بہ موقع مثالوں اور مکالموں کے ذریعے یہ باتیں شامل تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف جیسے ایک سگھڑ اور دانا ہے جس نے اپنی

ادبی محفل کو تسلسل کے ساتھ قلم بند کیا ہے اور جس میں انہوں نے موقع کے لحاظ سے ہر بات
پر روشنی ڈالی ہے۔ بعض اوقات کتاب پڑھنے سے محسوس ہوتا کہ جیسے مصنف ایک استاد ہیں
اور اپنی باتیں سمجھا رہے ہیں اور اپنے دلائل اور مثالیں دے کر موضوع اور مطلب کو واضح
کررہے ہیں۔ مصنف نے پوری کتاب کو ایک بلند پایہ ادبی محفل کی صورت میں پیش کیا ہے
اور اسی لیے کتاب کے دیباچے میں اپنے انوکھے اسلوب کے بارے میں نکتہ بیان کیا ہے
کہ الشّی بالشیّ یذکر یعنی بات میں سے بات نکلتی ہے۔ اس عالم استاد اور ادیب
کے اسی نکتے اور اس کے پیش کیے گئے مواد نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میں نے سوچا کہ
کاش اسی طرز پر سندھی ادب اور تمدن پہ کوئی کتاب لکھی جائے۔ مبرّد کی کتاب الکامل
کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ اس کی طرز پر کتاب لکھنے کے لیے سندھی علم و
ادب کے وسیع میدانوں کے سفر کرنے پڑیں گے، سندھ کے تمدن اور تہذیب کی گہرائیوں
میں جانا پڑے گا، سندھ کی محفلوں اور مجلسوں میں سے قسم قسم کے انوکھے اقوال جمع کرنا
پڑیں گے، سندھی زبان اور اس کے محاوروں کو سمجھنا پڑے گا، سندھ کے مختلف حصوں میں جا
کر وہاں کے سگھڑوں اور سالکوں سے بہت کچھ سیکھنا پڑے گا۔ مطلب کہ ہر پھول کی خوشبو
لے کر سندھی تمدن کی روح اور اس کے ثمرات کو ایک جگہ پر یکجا کرنا پڑے گا۔ لیکن اس
وقت یہ لیاقت پیدا کرنے کے لیے نہ تو کوئی موقع حاصل تھا اور نہ ہی فراغت تھی۔ البتہ سن
1943ء سے لے کر 1946ء تک سندھی عربی دور کی تاریخ کے سلسلے میں سندھ کا سفر کرنا پڑا
سندھ کو دیکھنے اور سمجھنے کے مواقع ملتے رہے۔ اگست 1946ء میں امریکہ جانے کا اتفاق ہوا
اور تین سال کے لئے دوبارہ سندھ سے جدا ہونا پڑا امریکہ سے واپسی کے بعد جون
1949ء میں سندھی شعر اور لغت جمع کرنے کے سلسلے میں سندھ کے مختلف حصوں کو دیکھنا پڑا
اور اس کے نتیجے میں سگھڑوں اور سالکوں کے ساتھ محافل بھی کیں اور اس قدر مواد جمع
ہوگیا تھا کہ میں نے سوچا کہ مبرّد کی کتاب ''الکامل'' کی طرز پر سندھی میں کوئی کتاب

لکھی جائے۔ یہ خواہش گزشتہ دو سال سے تھی مگر جیسے جیسے دن گزرتے رہے ویسے نئے نئے نکتے معلوم ہوتے گئے اور اپنے ناقص علم کا احساس بڑھتا گیا۔ اسی وجہ سے کئی بار قلم اٹھانے کا سوچا لیکن ہر مرتبہ اپنے ارادے کو ملتوی کرنا پڑا۔ اسی دوران کچھ خاص مواقع پر خاص دوست احباب کے سامنے سندھی ادب اور تمدن کے کچھ انوکھے شواہد محفل کی صورت میں بیان کرتا رہا جسے سن کر تمام دوستوں نے تاکید کی کہ میں ان مختلف ادبی مقالوں اور باتوں کو قلم بند کروں۔ جب انہیں میں نے اپنے اصل ارادے کا بتایا تو سب نے یہ مشورہ دیا کہ کم از کم اس کتاب کی ابتدا مضامین سے کروں جو فی الحال رسالے مہران میں شائع ہوتے رہیں اور بعد میں ضروری ترمیم اور ترتیب کے بعد انہیں کتاب کی شکل میں شائع کیا جائے۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کا جونا گڑھ اور قیام پاکستان کے بعد کراچی اور پھر حیدرآباد میں اردو زبان وادب کے محقق قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی سے قریبی تعلق رہا۔ ان کے بارے میں انھوں نے بڑا معلومات افزا مضمون بہ عنوان ''قاضی احمد میاں اختر اور جونا گڑھ کی یاد میں'' لکھا جس میں قاضی صاحب سے تعلق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''۱۹۵۱ء کے وسط میں پاکستان پبلک سروس کمیشن نے مجھے ''پریس اتاشی'' کے عہدے کے لیے منتخب کیا اور اگست میں دمشق میں میری تقرری کا فیصلہ ہوا۔ اب میں نے جا کر قاضی صاحب کو بتایا وہ خوش تو ہوئے لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ آپ کا باہر چلا جانا ہم پر گراں گزرے گا ان کے یہ الفاظ میرے دل میں بس گئے۔ مجھے تیاری کا الاؤنس مل گیا اور دمشق جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ قبلہ علّامہ آئی آئی قاضی وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سے کراچی تشریف لائے اور پیغام بھیجا کہ میں ان سے ملوں۔ جا کر ملا تو پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہیں؟ میں نے بتایا کہ فیڈرل پبلک سروس کمیشن سے میرا انتخاب ہوا ہے اور دمشق جانے کی تیاری کر رہا ہوں کہ وہاں پر میری تقرری ہوئی ہے۔ سُن کر انہوں نے زوردار ترغیب دی کہ میں رک جاؤں اور سندھ یونیورسٹی میں 'پروفیسر آف ایجوکیشن' کا عہدہ

سنبھال لوں۔قبلہ علّامہ قاضی صاحب سے کالج کے دنوں سے عقیدت تھی میں نے عرض کیا کہ قبلہ میں خدمت تعلیم کو گورنمنٹ سروس پر ترجیح دیتا ہوں مگر سندھ یونیورسٹی تو ایک ممتحن یونیورسٹی ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہاں سے کبھی بھی مجھے رخصت کر دیا جائے۔فرمایا کہ سندھ یونیورسٹی کو ایک مثالی تربیت گاہ بنانا چاہتا ہوں۔اب یہ ''ریزیڈنشل ٹیچنگ یونیورسٹی'' ہوگی اور یہ بسم اللہ آپ ہی کی تقرری سے ہوگی،مزید یہ کہ آپ کی تقرری کے آرڈر میں لکھ دیا جائے گا کہ ریٹائرمنٹ تک آپ کو سیکورٹی آف ٹینوئر دی گئی ہے۔

یہ تو ان کی شفقت تھی البتہ میرے لیے صبر آزما صورت حال سامنے آئی کہ دمشق جانے کو خیر باد کہوں۔دو روز گزرے ہی تھے کہ قبلہ علّامہ صاحب نے یکم ستمبر ۱۹۵۱ء سے سندھ یونیورسٹی میں میری تقرری بطور پروفیسر آف ایجوکیشن کا آرڈر بھیج دیا جس میں ''ٹینوئر'' کا بھی اندراج تھا۔یہ تیس اگست کا دن تھا۔قبلہ علّامہ صاحب کی ترغیب کے مدنظر مجھے اتنی توفیق ہوئی کہ دوسرے دن یعنی ۳۱/اگست کو میں شہاب صاحب اور اکرام صاحب سے ملا اور ان کو اپنے استعفے کے فیصلے سے آگاہ کیا۔دونوں نے سمجھایا کہ میں اتنی اچھی ملازمت نہ چھوڑوں لیکن میں نے ان کو منوایا کہ میرا استعفیٰ قبول کرلیا جائے۔دونوں کرم فرما پھر مجھے سیکریٹری مسٹر جی۔احمد کے پاس لے گئے جنہوں نے بعض مراعات کے حوالے سے مجھے ترغیب دی کہ میں ملازمت نہ چھوڑوں۔میں نے شکریہ ادا کیا اور گزارش کی کہ میں تعلیم کی خدمت کی خاطر یونیورسٹی کی ملازمت کو ترجیح دے رہا ہوں۔لہذا میرا استعفیٰ قبول کرلیا جائے۔اس پر جی۔احمد صاحب نے پوچھا کہ آپ کب جانا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا: آج ہی۔اس پر انہوں نے فائل پر دستخط کر دیے۔اسی دن میں قاضی احمد میاں کے ہاں پہنچا اور کہا کہ قبلہ میں ایک خوش خبری لایا ہوں اور وہ یہ کہ میں دمشق نہیں جاؤں گا۔حیران رہ گئے کیوں کہ چار روز پہلے ہی میں ان کو بتا چکا تھا کہ ملک سے باہر جانے والا ہوں۔جب انہوں نے سنا کہ قبلہ علّامہ قاضی صاحب کی ایماء پر میں سندھ یونیورسٹی جا رہا ہوں

اور آج ہی استعفیٰ دے کر آیا ہوں تو خوش ہو کر فرمایا کہ ہاں بھائی جاؤ اور ہمیں بھی لے جاؤ
میں نے دل ہی دل میں سوچ لیا کہ ان شاء اللہ قاضی صاحب کو سندھ یونیورسٹی میں
بلایا جائے گا۔(۳)

اسی مضمون میں بلوچ صاحب نے اس حقیقت کا اظہار بھی کیا کہ سندھ یونیورسٹی میں انھی کی کوشش سے قاضی صاحب کو شعبۂ تاریخ اسلام کے سربراہ کی پیشکش کی گئی جسے انھوں نے قبول کیا اور کراچی سے حیدرآباد منتقل ہو گئے۔اس بارے میں لکھتے ہیں:

''یکم ستمبر ۱۹۵۱ء کو جا کر میں نے سندھ یونیورسٹی میں پروفیسر آف ایجوکیشن اور صدر شعبہ تعلیم کی ذمہ داری سنبھال لی۔اس طرح پاکستان کی تعلیمی تاریخ میں پہلی بار یونیورسٹی سطح پر شعبہ تعلیم کا اجرا ہوا اور فیکلٹی آف ایجوکیشن قائم ہوئی۔وائس چانسلر علّامہ قاضی صاحب ایک باکمال مفکر ہونے کے علاوہ بڑے تعلیمی مدبر و منتظم تھے اور یونیورسٹی کو صحیح معنوں میں ایک اعلیٰ تربیت گاہ بنانا چاہتے تھے۔اس سلسلے میں انہوں نے مجھے کلی طور پر اپنے اعتماد میں لیا ہوا تھا۔تعلیمی شعبوں کا اجرا، تجدید نصاب وغیرہ تعلیمی امور میرے سپرد تھے۔۱۹۵۱ء۔۱۹۵۲ء کے دوران شعبہ تعلیم کے علاوہ فیکلٹی آف آرٹس کی تکمیل پیش نظر رہی۔میں نے تین شعبوں مسلم ہسٹری، سندھی اور اردو کو اولیت دینے کا مشورہ دیا اور ساتھ ہی شعبہ مسلم ہسٹری کے اجرا کے لیے قاضی احمد میاں صاحب کو بلانے کی تجویز پیش کی۔قاضی صاحب کی ذاتی صفات اور علمی کارناموں کا ذکر کیا اور کتاب طبقات الامم کا اردو ترجمہ علّامہ صاحب کے سامنے رکھا جس کو دیکھ کر خوش ہوئے۔پھر مجھے اجازت دی کہ میں قاضی صاحب کو لکھوں تاکہ وہ ایک دن کے لیے تشریف لائیں۔چنانچہ میں نے قاضی صاحب کو لکھا اور وہ میرے ہاں حیدرآباد تشریف لائے اور ہم دونوں مل کر علّامہ صاحب سے ان کے گھر جا کر ملے۔کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور علّامہ صاحب نے خوش ہو کر قاضی صاحب سے کہا کہ ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ شعبہ مسلم ہسٹری کے صدر

کا عہدہ قبول کرلیں۔اس عہدے کو قاضی صاحب نے منظور کرلیا اور جو نئے کوارٹر بنے تھے ان میں سے ایک قاضی صاحب کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔قاضی صاحب کو ان کی تقرری کا آرڈر ہاتھوں ہاتھ پہنچا دیا گیا اور وہ فوراً حیدرآباد پہنچے اور شعبہ مسلم ہسٹری کے صدر اور پروفیسر کی ذمہ داری سنبھال لی۔

قاضی صاحب کی آمد کے بعد میں نے حتی المقدور کوشش کی کہ ان کو کوئی تکلیف پیش نہ آئے۔ڈپارٹمنٹ کی ضروریات کے سلسلے میں رجسٹرار سے خط و کتابت اور مسائل کو حل کرانے میں قاضی صاحب سے میرا کلی طور پر تعاون رہتا تھا اور وہ ہر طرح مطمئن رہے۔قاضی صاحب حضرت شاہ عبداللطیف کا مزار دیکھنا چاہتے تھے اور ہم ساتھ مل کر وہاں گئے۔اس طرح ہالا ،ٹھٹہ اور مکلی کو گئے۔وہ دوران گفتگو ذکر کیا کرتے تھے کہ ان کے آباواجداد ٹھٹہ سے جونا گڑھ آئے تھے۔قبلہ علّامہ صاحب کے ہاں ہم اکثر ساتھ ہی مل کر جایا کرتے تھے۔علّامہ صاحب قاضی صاحب کو چاہتے تھے اور ان کی قدر کرتے تھے۔(۴)

اسی مضمون میں بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ سندھ یونیورسٹی میں کس طرح قاضی صاحب کی وفات ناگہانی ہوئی اور اس کے بعد بلوچ صاحب کس طرح قاضی صاحب کی میت کو کراچی لے کر گئے:

''سال ۱۹۵۵ء کے شروع ہی میں قاضی صاحب کبھی کبھار علیل ہونے لگے لیکن یہ علالت ایک دن کی ہوتی تھی اور دوسرے دن وہ آفس میں آجاتے تھے۔غالباً مارچ میں وہ ایک دن کے بعد دوسرے دن بھی آفس میں نہ آئے تو میں ان کے گھر جا کر ان سے ملا چارپائی پر بیٹھے تھے اور سرہانے کے دونوں طرف کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔میں نے مزاج پرسی کی اور کہا کہ کسی ڈاکٹر سے رجوع کیا جائے۔فرمایا کہ تشویش کی ضرورت نہیں۔مجھے ایک عرصے سے قلب کا عارضہ انجائنا ہے۔دوا میرے پاس ہے اور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں (یہ کہہ کر چھوٹی سفید گولیاں دکھائیں) آرام کرلیتا ہوں تو طبیعت ٹھیک ہوجاتی ہے۔

چنانچہ دوسرے دن آفس تشریف لائے ۔اس کے بعد کبھی کبھی ایک دن غاغہ کر لیتے تھے تو میں اس کو نارمل ہی سمجھتا تھا۔

۶ راگست علی الصباح قاضی صاحب کے گھر سے بچی دوڑتی ہوئی میرے گھر پہنچی اور مجھے کہا کہ آپ جلدی سے چلیں قاضی صاحب کو کچھ ہوگیا ہے۔ میں فوراً چل پڑا۔ بچی کے ساتھ جب کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ قاضی صاحب اپنی چارپائی پر بالکل سیدھے لیٹے ہوئے ہیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سو رہے ہیں۔ایک ٹانگ بالکل سیدھی تھی اور دوسری زانو سے اندر کے طرف مڑی ہوئی تھی، آنکھیں بند تھیں۔ ہاتھ دونوں مڑے ہوئے سینے پر دھرے تھے۔ میں نے ایک دو آوازیں دیں اور بعد میں ان کی ٹانگ کو اور ہاتھوں کو موڑ کر بازوؤں کو سیدھا کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ قاضی صاحب فوت ہو چکے ہیں لیکن اعضا اتنی آسانی سے مڑ رہے تھے کہ امید ہوئی کہ ایسا شاید نہ ہو۔اس امید پر میں بھاگ کر حکیم شمس الدین صاحب کے داماد ڈاکٹر بھر گڑی کو بلا کے لایا۔انہوں نے معائنہ کر کے بتایا کہ قاضی صاحب تقریباً دو گھنٹے پہلے فوت ہو چکے ہیں۔اس سے اندازہ ہوا کہ وہ ۶ راگست کو صبح ۴ بجے کے قریب فوت ہوئے۔ دونوں ہاتھ جو اُن کے سینے پر رکھے ہوئے تھے اس سے معلوم ہوا کہ عارضہ قلب انجائنا جان لیوا ثابت ہوا۔

میں نے قاضی صاحب کے بچوں کو فوراً کراچی روانہ کر دیا اور پھر غسل و تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ قبلہ علّامہ صاحب کو اطلاع دی۔ انہوں نے پوچھا کہ میّت کو کراچی پہنچانے کا کیا انتظام کیا گیا ہے؟ میں نے بتایا کہ حیدرآباد میمن جماعت سے بس ملنے کی امید ہے اور میں خود میت کے ساتھ کراچی جاؤں گا۔ میں نے مزید کہا کہ مناسب ہے کہ پسماندگان سے ہمدردی کے طور پر یونیورسٹی سے ایک ریزولیشن پاس کیا جائے اور رجسٹرار کے دستخط سے بھیجا جائے۔ فرمایا کہ میں خود تعزیت کا پیغام یونیورسٹی کی طرف سے بھیجوں گا اور وہ آپ اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ جماعت کی گاڑی دس بجے کے قریب ملی اور نماز جنازہ

کے بعد قبلہ علّامہ صاحب سے تعزیتی پیغام لے کر میں اکیلا میت کو سنبھالے ہوئے کراچی روانہ ہوا۔ اتفاقاً اس دن جنوب مغرب سے جو روزانہ ہوا چلتی تھی اس نے بڑی شدت اختیار کر لی۔ کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ قاضی صاحب کی وفات پر فطرت بھی جنبش میں آ گئی ہے۔ ان دنوں کراچی جانا ہوتا تھا تو براستہ ٹھٹہ جایا کرتے تھے۔ ہم نے جب دھابیجی کو کراس کیا تو گاڑی میں پٹرول ختم ہو گیا۔ پیٹرول تو ہم کافی لے کر چلے تھے لیکن سامنے کی ہوا کے غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے پیٹرول ختم ہو گیا۔ میں نیچے اترا اور گزرنے والی گاڑیوں کو ہاتھ دے کر روکنے لگا۔ موٹر کاروں والے حضرات تو رک کر پھر معذرت کے ساتھ چل پڑتے تھے۔ بالآخر ایک ٹرک کا قلندر صفت ڈرائیور نے مجھ سے ہمدردی کی اور دو گیلن کے قریب پیٹرول نلکی پائپ سے نکال کر دیا۔ جب آگے والے پیٹرول پمپ پر پہنچا تو پیٹرول ڈلوایا۔ اس طرح ان کے آخری سفر میں مجھے قاضی احمد میاں اختر کے ساتھ دو گھنٹے مزید رفاقت کا موقع ملا اور یہ صحبت ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہو گئی۔ انّاللہِ و انّا الیہ راجعون۔(۵)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نامور مصنف، محقق، ماہر اقبالیات اور ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے بانی تھے۔ ان کا انتقال مورخہ ۳۰ رجنوری ۱۹۵۹ کو کراچی میں ایک خاص واقعے کے بعد ہوا تھا۔ اس واقعے کی تفصیلات ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اپنے انگریزی مضمون

Dr. Khalifa Abdul Hakim-A true believer and patriot who died defending the cause of Islam

میں بیان کی تھیں (٦)۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ مورخہ ۲۸ جنوری تا ۲ فروری ۱۹۵۹ کراچی میں ایک سیمینار بہ عنوان Islam in the Modern World منعقد کیا گیا جس میں ملکی اور غیر ملکی ماہرین کو مقالے پڑھنے کی خاطر مدعو کیا گیا تھا۔ بقول بلوچ صاحب بیرونی مقالہ نگاروں کے مقالات سے کچھ ایسا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ محققین کے بجائے مشنری ہیں اور ان کے مقالات میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا اور اسلامی اقدار کی

غلط تصویر کشی کی گئی۔انھی مقالہ نگاروں میں Prof. Ann K. S . Lambton کا مقالہ بہ عنوان Islam's Attitude towards Progress:Free thinking and Individual Freedom بھی شامل تھا۔ڈاکٹر بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ خاتون فارسی زبان کی لکچرر کے طور پر اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی میں خدمات انجام دے رہی تھی۔حیرت انگیز بات یہ ہے ایک فارسی زبان کی لکچرر نے ایک ایسے موضوع پر مقالہ لکھا تھا جو اس کے دائرہ کار سے باہر تھا۔اس مقالے میں بھی خاتون نے اسلام کے بارے میں غلط، حقائق کے خلاف اور عیسائیت کے نقطہ نظر سے تنقیدی باتیں بیان کیں۔اس مقالے کو سن کر پاکستانی علما اور محققین سخت ناراض ہوئے اور بڑی بے چینی محسوس کر رہے تھے کیونکہ خاتون نے چالیس منٹ سے زائد اسی طرح کی قابل اعتراض باتیں اپنے مقالے میں بیان کیں۔اس کے بعد ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کھڑے ہوئے اور نہایت مدلل انداز سے خاتون کے اعتراضات کے باری باری جوابات دیے۔ڈاکٹر صاحب نے تقریباً ۴۵ منٹ تک مدلل خطاب کیا جس کے دوران بالکل خاموشی طاری رہی۔ڈاکٹر بلوچ صاحب اس وقت وہاں موجود تھے اور ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے بعد چاہتے تھے کہ انھیں اس مدلل خطاب پر مبارک باد دیں لیکن ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جلد ہی وہاں سے چلے گئے اور ملاقات نہ ہوسکی۔اس کے بعد بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ سیمینار کے اگلے روز علّامہ عبدالعزیز میمن (جو خود بھی شریکِ سیمینار تھے) نے انھیں مطلع کیا کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سیمینار سے سیدھے ممتاز حسن صاحب کے پاس گئے تھے جہاں دورۂ قلب کے نتیجے میں انھوں نے جان جان آفریں کو سپرد کی۔بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا وقت آخر جس وقت آیا اس وقت سیمینار جاری تھا اور انھوں نے زندگی میں آخری خطاب جو کیا وہ اسلام کے دفاع میں اور صحیح حقائق کا اظہار تھا۔

قیام پاکستان کے بعد اس ملک میں علمی اور تحقیقی اداروں کا قیام اور اہل علم کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی جن جن لوگوں نے کی ان میں ممتاز حسن مرحوم کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ڈاکٹر بلوچ صاحب کا ممتاز حسن مرحوم سے قریبی تعلق رہا اور ان کے انتقال کے بعد بلوچ صاحب نے ایک متاثر کن مضمون بہ عنوان ''مرحوم ممتاز حسن۔ایک سچے محب وطن'' (۷) لکھا تھا۔اس مضمون میں ممتاز حسن کے محاسن اور خوبیوں کے بارے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب لکھتے ہیں:

''ممتاز حسن اس خیال کے حامی تھے کہ محنت سے کام کیا جائے اور محبت سے کام لیا جائے۔ ہر اچھی تجویز کا خیر مقدم کیا جائے اور اس کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ ہر وہ تعلیمی تحقیقی یا انتظامی ادارہ جو اچھا کام کررہا ہو اس کی مدد و معاونت کی جائے۔ سب سے اہم اور ضروری یہ کہ ہر وہ صوبہ اور خطہ جس سے پاکستان کی تشکیل ہوئی ہے وہ اس نئی مملکت کے قلب وجگر کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان میں آباد ہر علاقے اور خطے کے لوگ قابل عزت و احترام ہیں۔

ایسے جذبات محض ان کی باتوں تک محدود نہ تھے لیکن وہ ان کے لائحہ عمل اور کردار کی روشن شمعیں تھیں کہ جن سے علم وفضل، ادب وثقافت تحقیق وتعمیر کے گوشوں میں اجالا ہوا۔ ممتاز حسن کے جدا ہو جانے سے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اہل علم یتیم ہو گئے۔ جن تعمیری اداروں کی سرپرستی میں فروغ حاصل ہوا تھا اجڑے ہوئے نظر آنے لگے۔ حیدرآباد سندھ میں آثار قدیمہ کی حفاظت کے لیے سرکل سپرنٹنڈنٹ کی تقرری کا سہرا محکمہ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل احمد خان کے سر پر تھا۔ لیکن پس پردہ اس ترقی اور تعمیر کے روح رواں ممتاز حسن صاحب تھے۔ انہوں نے راقم کو اور دوسرے احباب کو ڈاکٹر خان صاحب سے مل کر کام کرنے کے لیے آمادہ کردیا تھا۔ آرکیالوجیکل ایسوسی ایشن آف پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور اس کے سالانہ اجلاس ہونے لگے۔ ممتاز حسن صاحب اس کے صدر تھے۔ وہ خود آ کر آثار کو دیکھتے تھے، چنانچہ دوبار میرے ساتھ عرب اسلامی شہر منصورہ کے آثار دیکھنے آئے۔ وہاں پر انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہمارے خاندان میں ایک روایت چلی آرہی ہے کہ کسی زمانے میں یہ خاندان منصورہ میں مقیم تھا۔ اس کے بعد بھی انہوں نے ایک دوبار یہ ذکر کیا۔

سندھ کے تاریخی ماخذات کے سندھی اور اردو تراجم اور ان کی اشاعت کا منصوبہ جب بنایا گیا تو اس منصوبے کی تکمیل کی خاطر گرانٹ کی ضرورت تھی۔ اس بارے میں ممتاز حسن کے کردار کے حوالے سے ڈاکٹر بلوچ

صاحب لکھتے ہیں:

''ممتاز حسن صاحب انجمن ترقی اردو کراچی کے فروغ کے لئے کوشاں رہے۔اقبال اکیڈمی کے قیام کا سہرا ان ہی کے سر پر ہے۔پہلے یہ ادارہ کراچی میں قائم ہوا ممتاز حسن صاحب برسوں تک اس کے صدر رہے اور اس کو ایک فعال ادارہ بنا دیا۔سنہ 1951ء میں سندھی ادبی بورڈ قائم ہوا۔ میں اس کا ممبر تھا۔حکومت سندھ سے سالانہ ایک لاکھ روپے گرانٹ منظور ہوئی جس سے سندھی کتابوں کی نشر و اشاعت کا سلسلہ احسن طریقے سے آگے بڑھا۔ سندھ کے اسلامی تاریخی دور پر تحقیق کے دوران علمائے سندھ کی عربی اور فارسی تصانیف میرے سامنے آئی تھیں جو مخطوطات کی صورت میں تھیں اور جن کے ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔ میں نے ممتاز حسن صاحب سے ذکر کیا کہ اگر مرکزی حکومت سے گرانٹ مل جائے تو سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے ان مخطوطات پر تحقیق کی جاسکتی ہے۔ پوچھا کہ کتنی رقم کی ضرورت ہوگی میں نے کہا کہ ایک ڈیڑھ لاکھ روپے۔فوری طور پر کہا کہ نہیں پانچ لاکھ کی اسکیم بناؤ اور رقم مل جائے گی۔اسکیم تیار کرنے اور ان کو باضابطہ پیش کرنے میں کچھ تاخیر ہوئی کیونکہ وزارت تعلیم کی سفارش سے بھجوانی تھی وہاں پر ڈاکٹر امداد حسین صاحب مہربان تھے جنہوں نے سفارش سے یہ اسکیم فائنس کو بھجوا دی۔ بہرحال جیسے ہی یہ اسکیم ممتاز حسن صاحب تک پہنچی تو بغیر تاخیر کے منظور ہوگئی۔اسی گرانٹ سے سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے عربی اور فارسی کی نایاب کتابیں چھپیں۔اس طرح ممتاز حسن صاحب نے دوسرے علمی اور ادبی اداروں کی بھی سرپرستی کی۔''(۸)

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو اردو، عربی اور فارسی زبانوں کے نامور محقق اور سابق صدر شعبہء عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تھے۔وہ علّامہ عبدالعزیز میمن کے نامور تلامذہ میں شامل تھے اور اس طرح بلوچ صاحب کے استاد بھائی تھے۔وہ جب بھی علی گڑھ سے پاکستان آتے، اسلام آباد یا کراچی میں بلوچ صاحب سے ضرور ملتے۔ حسن اتفاق سے ڈاکٹر مختار الدین احمد نے بلوچ صاحب پر ایک معلومات افزا مضمون بہ عنوان ''علّامہ میمن کا ایک

نامور شاگرد۔ڈاکٹر نبی بخش بلوچ'' لکھا تھا جو رسالہ تحقیق شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی میں شایع ہوا۔اس کے بعد بلوچ صاحب نے ان کے بارے میں ایک معلومات افزا مضمون بہ عنوان ''میرے عزیز استاد بھائی۔ڈاکٹر مختار الدین احمد'' لکھا جو پہلے دہلی سے شایع ہونے والی کتاب ''ڈاکٹر مختار الدین احمد۔محقق اور دانشور'' میں شایع ہوا پھر راقم الحروف کی مرتبہ کتاب ''گلشن اردو'' میں شایع ہوا۔اس مضمون میں ڈاکٹر بلوچ صاحب ڈاکٹر مختار الدین احمد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دو آخری سال (نصف ۱۹۴۳ء) جب میں مسلم یونیورسٹی میں تھا آرزو صاحب بھی وہاں تھے لیکن کبھی ان سے ملاقات کا موقع نہ ملا۔مجھے ان سے ملنے کا اتفاق پندرہ سال گذرنے کے بعد ۱۹۶۰ء میں علی گڑھ میں ہوا جب میں پاکستانی وفد میں انڈیا۔ پاکستان کلچر کانفرنس میں شرکت کے لیے دہلی گیا۔ایک دن فارغ ملا جس کو غنیمت جان کر میں وہاں سے مادرِ علمی کی زیارت کے لیے علی گڑھ پہنچا۔استاد المیمنی تو علی گڑھ چھوڑ چکے تھے لیکن میں شعبہ عربی میں گیا اور ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب صدر شعبہ سے ملا۔آرزو صاحب بھی شعبے میں تشریف رکھتے تھے اور ان سے پہلی ملاقات وہیں ہوئی۔یہ جان کر مسرت ہوئی کہ وہ استاد المیمنی کے تلمیذ رشید ہیں اور میرے استاد بھائی ہیں۔تھوڑا سا فراغت کا جو وقت تھا آرزو صاحب کی ہی صحبت میں گزرا اور مجھے ان کی بے شمار کامیابیوں کا علم ہوا۔۱۹۵۲ء میں انہوں نے استاد المیمنی کی رہنمائی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور سر ہملٹن گب کی نگرانی میں ۱۹۵۶ء میں انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈی فل کیا اور ۱۹۵۸ء میں مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں ریڈر ہوئے۔اس مختصر صحبت میں انہوں نے اپنی تواضع و محبت سے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔

مختار الدین احمد صاحب سے بعد میں ملاقاتیں تب ہوئیں جب وہ پاکستان تشریف لائے۔پہلی بار جب وہ کراچی آئے تو وہاں سے چالیس میل دور بھنبھور کے مقام پر سندھ کے تاریخی شہر و بندرگاہ دیبل کے محل وقوع پر سیمینار میں تشریف لائے اور ان سے مل

کر بے حد خوشی ہوئی لیکن اس موقع پر میں ان کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔ دوسری بار ۱۹۸۴ء میں شرق اوسط کا علمی سفر کرتے ہوئے اسلام آباد آئے اور میری دعوت قبول فرما کر میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور ہم نے رات دیر تک بیٹھ کر علی گڑھ اور اپنے استاد میمن صاحب مرحوم کے علم و فضل پر باتیں کیں۔ میرے پاس میمن صاحب کے سلسلے میں کچھ یادداشتیں تھیں جو آرزو صاحب کو پیش کیں۔ اس کے بعد ۱۹۸۹ء میں وہ شرق اردن سے اسلام آباد تشریف لائے اور کرم فرما کر ہجرہ کونسل کے دفتر میں مجھ سے ملنے آئے۔ ہمارے سکریٹری ڈاکٹر محمد معز الدین نے ان کے اعزاز میں ان کی دعوت کی اور میں دیر تک آرزو صاحب کے علم و فضل سے استفادہ کرتا رہا۔ اس دعوت میں ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر قدرت اللہ فاطمی بھی مدعو تھے۔ اچھی علمی صحبت رہی۔ اس کے بعد وہ ۱۹۹۳ء میں کراچی کی ایک علمی کانفرنس میں مہمان خصوصی بن کر تشریف لائے جب کہ میں اسلام آباد چھوڑ چکا تھا اور کراچی میں صوبائی نگران حکومت میں تعلیم کا وزیر تھا۔ حکیم محمد سعید مرحوم ہمارے گورنر تھے۔ ۱۰ راگست کو حضرت شاہ عبداللطیف کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک مجلس منعقد ہوئی اور میری گذارش پر حکیم صاحب نے اس جلسے کی صدارت فرمائی۔ آرزو صاحب بھی اس محفل میں تشریف لائے اور ان سے مل کر ہم لوگوں کو بے حد مسرت ہوئی۔ وہ ادارہ نیپا میں مقیم تھے جہاں پر جا کر میں ان سے ملنے والا تھا لیکن اس دن وزارت میں کسی اہم میٹنگ کی وجہ سے وعدہ پورا نہ کر سکا جس کا مجھے ابھی تک افسوس ہے۔ خیال تھا کہ میں اس کی تلافی اس طرح کروں گا کہ علی گڑھ جا کر آرزو صاحب سے ملوں گا اور ان سے معافی مانگ لوں گا۔

ابھی تک مجھے اس سفر کے اختیار کرنے کی تمنا باقی ہے تا کہ آرزو صاحب اور وہاں کے دوسرے فضلاء خصوصاً ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سے ملوں اور مادر علمی کی بھی زیارت کرلوں۔ و اللہ یجمع بیننا و بینھم ان شاء اللہ۔(۹)

اردو اور فارسی زبان و ادب کے نامور محقق، استاذ الاساتذہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان سابق صدر شعبہء اردو سندھ یونیورسٹی اور سلسلہ نقشبندیہ کے بلند پایہ شیخ طریقت تھے۔ وہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کی طرح مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان کا سندھ یونیورسٹی میں تقرر بحیثیت صدر شعبہ اردو بلوچ صاحب کی ہی کوشش سے ہوا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان اور ڈاکٹر بلوچ صاحب کے درمیان نصف صدی سے زائد عرصے تک بڑے قریبی تعلقات رہے۔ اردو سندھی اور سندھی اردو لغت ان دونوں بزرگوں نے مل کر مرتب کی تھی۔ اس کے علاوہ بلوچ صاحب اپنی اردو کتب کی تکمیل کے دوران ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب سے مشورے بھی کرتے جیسا کہ ''سندھ میں اردو شاعری'' میں بلوچ صاحب نے ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے انتقال کے بعد بلوچ صاحب نے ان کی یاد میں ایک مضمون لکھا تھا جو ماہنامہ بیداری حیدر آباد اور اس کے بعد راقم الحروف کی مرتبہ کتاب ''گلشن اردو'' میں شایع ہوا۔ اس مضمون میں ڈاکٹر بلوچ صاحب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان سے طویل تعلقات اور ان کے اوصاف و محاسن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''مجھے تقریباً پچاس سال تک ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان مرحوم کو مختلف حیثیتوں سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ عالم، محقق، عارف، صوفی، استاد، دوست و ساتھی اور پڑوسی کی حیثیت سے انہیں قریب سے سمجھنے اور پرکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ میں بلا مبالغہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ انسانیت کا ماڈل تھے اور جوہر انسانیت تھے۔ علم اور تحقیق میں بھی وہ بلند مقام پر فائز تھے۔ بزرگوں اور مشائخ کے ہاں بھی کچھ نہ کچھ تکلّف و تصنع ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب ہر قسم کے تکلّفات سے ماورا تھے۔ ہر شخص عام طور پر میں اور ہم کے احساس رکھتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اس اعتبار سے بھی منفرد مقام کی حامل تھی۔ ان کے ہاں اپنی ہستی اور شخصیت کا جداگانہ احساس مفقود تھا۔
>
> پچاس سال تک روزمرہ زندگی میں انہیں جب بھی دیکھا گیا مسکراتے ہوئے اور منکسرانہ حیثیت میں دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب کے علمی کام ویسے تو بہت وقیع ہیں لیکن ہندوستان میں فارسی زبان میں ہونے والے علمی اور ادبی کام، فارسی زبان کی شاعری،

فارسی کی لغات وغیرہ پر وہ یکتائے روزگار تھے۔اس سلسلہ میں ان سے متعدد بار تحقیق کی غرض سے رجوع ہوئے اندازہ ہوا کہ برصغیر ہند کے فارسی علوم پر وہ سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ جو انگریزی زبان میں تھا وہ تاریخ کے موضوع پر تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے نقشبندی سلسلہ کو استقامت کے ساتھ چلایا۔۴۵۔۵۰ سال تک پابندی سے سلسلہ کے مراقبوں کا انتظام اور طالبوں کو بتدریج سلسلہ کے اسباق طے کرانا اور اس کام کو اپنے بہت سارے علمی کاموں کے ساتھ اہتمام سے جاری رکھنا یہ ڈاکٹر صاحب کی بہت بڑی خدمت تھی جو انہوں نے تصوف کے حوالے سے سرانجام دی۔

ڈاکٹر صاحب بہترین پڑوسی تھے ہر پڑوسی کے لیے دل سے دعا کرنے والے اور ان کے دکھ درد اور غم و خوشی میں شرکت کرنے والے۔ان کی شخصیت ہمسایہ کے لیے بلکہ اہل حیدرآباد کے لیے خیر و برکت کا باعث تھی۔وہ سایہ دار درخت کی طرح تھے جہاں دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لیے لوگ کچھ دیر کے لیے آکر آرام کا سانس لیتے ہیں۔

مجھے اس بات کے اظہار میں مسرت ہو رہی ہے بلکہ اس میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ جامعہ سندھ میں ڈاکٹر صاحب جیسی فاضل شخصیت کو لانے کا اصل محرک میں ہی تھا۔میں ڈاکٹر صاحب کی علمی و تحقیقی کتابوں کے مطالعے اور ان کے علمی مقام سے آشنا تھا ۔جامعہ سندھ حیدرآباد کے بانی وائس چانسلر علاّمہ آئی آئی قاضی کی خواہش تھی کہ جامعہ کے ہر شعبے میں ایسے اساتذہ لائے جائیں جو اپنے شعبے کے علم میں ماہر ہوں اور جو طلبہ کی تعلیم و تربیت میں موثر کردار ادا کرسکیں۔اس سلسلہ میں علاّمہ موصوف نے مجھ سے مشاورت فرمائی تو اردو شعبہ کے لیے میں نے ڈاکٹر غلام مصطفی خان کا نام پیش کیا اور انہیں ان کے ممتاز علمی و تحقیقی کام سے واقف کیا چنانچہ علاّمہ صاحب کی طرف سے انہیں سندھ یونیورسٹی میں اردو شعبہ کے سربراہ کی حیثیت سے تقرری کا خط لکھا گیا۔اس طرح ڈاکٹر صاحب کی حیدرآباد تشریف آوری ہوئی۔قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی فوت ہو چکے تھے ان کے نام

پر جو گھر تھا وہ ڈاکٹر غلام مصطفی خان کو دے دیا گیا۔ علّامہ صاحب نے شفقت فرمائی۔''(۱۰)
شمس العلما مرزا قلیچ بیگ نے سندھی زبان کو کئی موضوعات پر علمی اور ادبی کتب سے مالا مال کیا۔ انھوں نے سرکاری ملازمت بھی کی اور اس کے باوجود کئی سو کتابیں بھی لکھیں۔ وہ اپنے وقت کا بہترین مصرف جانتے تھے۔ مرزا قلیچ بیگ کی اسی خوبی کے بارے میں ڈاکٹر صاحب اپنے ایک سندھی زبان میں لکھے مضمون ''مرزا قلیچ بیگ کو مودبانہ سلام''(۱۱) میں لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب نے سب سے پہلے سندھی زبان اور ادب کی بہت خدمت کی اور ان کی کتابیں ادب شعر لغت اور دیگر موضوعات پہ سندھی زبان میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ سندھ کے جغرافیہ تاریخ پر بھی کتابیں لکھیں نیز سندھی زبان کے صرف ونحو پر بنیادی کتاب لکھی۔ اس زمانے میں سندھی کو صوبائی زبان کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا اور ضرورت تھی کہ سندھی زبان میں زیادہ سے زیادہ مواد مہیا کیا جائے۔ اس کام کو مرزا قلیچ بیگ نے اپنے ذمہ لیا اور بڑی خوبی سے انجام دیا۔ وسعت مطالعہ اور تصنیف وتالیف کے بارے میں ان کی کامیاب کوششوں میں ہمارے لیے یہ سبق ہے کہ انسان کی زندگی میں وقت کی کوئی کمی نہیں ہوتی اور کم وقت میں زیادہ کام بھی کیا جاسکتا ہے لیکن اگر زیادہ سے زیادہ کام کیا جائے تو بھی خاصا وقت ہوتا ہے۔ مرزا قلیچ بیگ نے سرکاری ملازمت بھی کی اور اس زمانے میں سرکاری کاموں میں زیادہ سے زیادہ توجہ دینا لازمی تھا۔ اس زمانے میں اونٹوں پر سفر کیا جاتا تھا اور مختیار کار کی حیثیت سے مرزا صاحب نے اونٹوں پر بہت سے سفر کیے۔

انہوں نے سرکاری ملازمت کے ساتھ تاریخی مقامات بھی دیکھے۔ اس زمانے میں بجلی نہیں تھی اس لیے سخت گرمی کے موسم میں پنکھوں کا سوال ان مشکلات کے باوجود مرزا صاحب نے بڑے کارنامے انجام دیے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کم سے کم سہولتوں کے ساتھ بھی بہت سارے کام کرسکتا ہے۔''

سندھ میں تعلیم کے فروغ کے حوالے سے پیر الٰہی بخش مرحوم کی خدمات نا قابل فراموش ہیں

،ان کے بارے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب ایک مضمون (۱۲) میں لکھتے ہیں:

''میں جب کالج میں طالب علم تھا اس زمانے میں پیر صاحب کے عوامی بھلائی کے جذبے سے متاثر ہی نہیں ثنا خوان بھی ہوگیا تھا اور پھر وہ میرے مربی اور مددگار بنے تھے میں 1936ء میں D-J کالج کراچی میں داخلہ لیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کالج میں مسلمان طالب علم صرف انگلیوں پر شمار کرنے کے برابر تھے اور کالج کے مشاغل اور تنظیموں میں ان کا کوئی کردار نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت مسلمان طلبہ کے مسائل کو سننے اور ان سے ہمدردی کرنے والے چار رہنما تھے جن سے میں ملا۔ یہ چار رہنما شیخ عبدالمجید سندھی پیر الٰہی بخش، فتح محمد سیوہانی اور بیرسٹر عبدالرحمان تھے۔ ایک دفعہ ہم وفد کی شکل میں پیر صاحب سے ملے اور ان سے کہا کہ مسلمان طلبہ کے لیے بھی کالج قائم کرنا چاہیے۔ پیر صاحب نے ہمیں بڑا دلاسہ دیا اور کہا کہ وقت آئے گا کہ آپ مسلمان طلبہ کو بھی کالج ملے گا۔ 1937ء کے اواخر میں میری آنکھوں میں اتنی تکلیف ہوگئی کہ میں نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ مجھے کراچی ہی میں رہ کر علاج کرانا تھا میں پیر صاحب کے پاس گیا۔ پیر صاحب نے P.W.P کے وزیر سچل داس وزیرنی سے کہہ کر مجھے کلرک کی ملازمت دلوائی۔

پیر الٰہی بخش صاحب کی سندھ کے لیے سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے تعلیم کے دروازے کھولے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ سندھ کے بچے بھی تعلیم حاصل کریں اور بڑے بھی۔ وہ سندھ کے پہلے وزیر تعلیم تھے جنہوں نے تعلیم بالغاں کا آغاز کیا۔ تعلیم بالغان کے کئی مراکز کا وہ خود معائنہ کرتے تھے انہوں نے اساتذہ کی تعلیم وتربیت کے لیے بندر روڈ کراچی میں شاندار عمارت بنوائی۔ جو اسکول اور کالج 1947ء کے بعد بند ہوگئے تھے ان کو کھلوایا انہوں نے ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے سندھ مسلم کالج قائم کرایا اور کراچی میں سندھ یونیورسٹی بھی قائم کرائی۔

میں جب مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا اور پیر صاحب یہاں آئے اور ان

کے یہاں آنے کا مقصد تھا کہ نئے سندھ مسلم کالج کے لیے پرنسپل اور کالج کے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے۔ علی گڑھ کے حضرات نے ان کو خوش آمدید کہا پیر صاحب نے ڈاکٹر امیر حسن صدیقی کو بطور پرنسپل منتخب کیا جو اس زمانے میں وائس چانسلر کے پاس کام کررہے تھے۔ جب میں پیر صاحب سے ملا تو بڑی مہربانی سے ملے اور مجھے اشارتاً کہا کہ آپ Ph.D کے لیے ضرور کام کریں اس کے بعد سندھ مسلم کالج میں آکر تعلیم کے لیے کام کریں۔ میرے علاوہ وہاں غلام مصطفی شاہ، غلام نبی بھنگر اور ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوتہ کا تقرر کیا گیا۔ یہ سب علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ سندھ مسلم کالج میں تقرر کرانے میں میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی کی زور دار رائے تھی کہ مجھے علی گڑھ سے سندھ مسلم کالج بلایا جائے جس کے لیے انہوں نے سندھ مسلم کالج میں تقرری کا آرڈر فوراً روانہ کردیا۔ میں نے معذرت کی کہ مجھے ایک سال کی مہلت مل جائے کہ اپنا Ph.D کا مقالہ مکمل کرلوں۔ میرے استاد محترم عبدالعزیز میمن صاحب نے پیر صاحب کو ایک خط لکھا لیکن پیر صاحب سندھ مسلم کالج کو آگے بڑھانے کا پختہ فیصلہ کرچکے تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر کو ایک ذاتی خط لکھا کہ مجھے راضی کریں اور کراچی روانہ کریں۔ پیر صاحب مجھ پر مہربان تھے اور ان کے مجھ پر احسانات تھے اس لیے میں نے پیر صاحب کی خواہش کے مطابق Ph.D کا کام روک دیا اور 1945ء کے تعلیمی سال میں سندھ مسلم کالج آکر لیکچرر بن گیا۔ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے اعلیٰ تعلیم کی اسکالرشپ حاصل کی امریکہ جانے سے قبل پیر صاحب کے ساتھ ٹیلی فون پر گفتگو کی اور انہوں نے بڑی حوصلہ افزائی کی۔''

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے سندھ کے نامور عالم اور محقق شمس العلما ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوٹو پر سندھی زبان میں ایک مضمون (۱۳) بہ عنوان شمس العلماءِ ڈاڪٽر عمر بن محمد دائودپوٽي جي ياد ۾ (شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتو کی یاد میں) لکھا تھا۔ اس مضمون میں ڈاکٹر بلوچ نے ڈاکٹر داؤد پوٹو کی علمی خدمات کے علاوہ خود پر ان کے ایک احسان کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہم اس اقتباس کا یہاں

سلیس اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں:

''با صلاحیت استادوں اور طالب علموں کے لیے ان (ڈاکٹر داؤد پوٹو) کے دل میں بڑی عزت تھی اور ان کی بھرپور معاونت کرتے تھے۔ اس سلسلے میں مجھ پر بھی خاص مہربانی کی تھی۔ میں نے میٹرک کے امتحان میں پورے سندھ کے مسلمان طلبہ میں دوسرا نمبر حاصل کیا تھا جس کی بنا پر اس وقت کے دستور کے مطابق بیس روپے ماہانہ ''میٹرک اسکالرشپ'' ملی۔ ڈی جے کالج کے دوسرے سال آنکھوں کے عارضے کی وجہ سے میں امتحان میں نہ بیٹھ سکا اور اسکالرشپ بند ہوگئی۔ پھر بہاء الدین کالج جونا گڑھ چلا گیا جہاں فیس معاف تھی لیکن اس کے باوجود میرا خرچہ پورا نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت سندھ کے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن تھے، میں نے انھیں عربی میں خط لکھا اور اسکالرشپ دوبارہ جاری کرنے کی استدعا کی۔ خط کی عبارت سے متاثر ہوکر انھوں نے میری اسکالرشپ دوبارہ منظور کی جس کے سہارے میں بی اے تک اطمینان سے تعلیم حاصل کرسکا۔''

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے سندھ کے نامور سیاستدان اور سابق وزیر اعلیٰ محمد ایوب کھوڑو مرحوم پر انگریزی میں ایک مضمون (۱۴) بہ عنوان Muhammad Ayub Khuro-His Personality and Character لکھا تھا۔ اس مضمون میں بلوچ صاحب نے محمد ایوب کھوڑو کے اعلیٰ کردار قوت برداشت، تحمل، جرات اور بے خوفی، بحیثیت کامیاب منتظم اور اسی طرح کی اعلیٰ انسانی صفات کا ذکر کیا ہے۔ بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ محمد ایوب کھوڑو نے ہی سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرانے کی جدوجہد کا آغاز کیا اور اس بارے میں ایک کتابچہ لکھ کر شایع بھی کرایا تھا۔ یہ واقعہ ۱۹۳۰ء کا ہے جب محمد ایوب کھوڑو کی عمر محض ۳۰ برس کی تھی۔ محمد ایوب کھوڑو کا قریبی تعلق علاّمہ آئی آئی قاضی سے قائم ہوا اور جس طرح علاّمہ قاضی نے ایک صاف وشفاف اور اعلیٰ کردار والی زندگی گزاری ایوب کھوڑو نے بھی ایسی ہی زندگی گزاری۔ علاّمہ آئی آئی قاضی کی اس نصیحت پر انھوں نے ہمیشہ عمل کیا کہ انسان کو صرف اور صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے اور سچ اور انصاف کا ہمیشہ ساتھ دینا چاہیے۔ محمد ایوب کھوڑو نے اس نصیحت پر ان مشکل حالات میں بھی عمل کیا جب ان پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالا گیا۔ بلوچ صاحب ان کی

زندگی کے دو واقعات بیان کرتے ہیں: پہلا واقعہ اس وقت کا ہے جب کھوڑو صاحب پر قتل کا جھوٹا الزام عائد کیا گیا جس پر کھوڑو صاحب نے بڑے صبر اور ضبط کا مظاہرہ کیا اور بالآخر عدالت نے انھیں اس الزام سے باعزت بری کیا۔ دوسرا واقعہ اس وقت کا ہے جب پیر صاحب پگارا پیر صبغت اللہ راشدی پر انگریزوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران بغاوت کا الزام لگایا اور سات سال تک جیل میں رکھا۔ اس موقع پر انگریزوں نے پیر صاحب کا مقدمہ ایک فوجی عدالت میں چلایا تھا۔ فوجی عدالت کے آگے ایوب کھوڑو صاحب بھی پیش ہوئے تھے اور انھوں نے جو بیان دیا وہ پیر صاحب کے حق میں تھا اور پیر صاحب پر لگائے گئے الزامات کو کھوڑو صاحب نے بھری عدالت میں غلط قرار دیا تھا۔ بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ اس قدر نازک وقت تھا اور انگریزوں کے مظالم اس قدر بڑھ گئے تھے کہ پیر صاحب کی گرفتاری کے بعد حُر مجاہدین کے احتجاج کی بنا پر انگریزوں نے مارشل لا نافذ کر دیا تھا۔ ان مشکل حالات میں بھی کھوڑو صاحب نے حق اور انصاف کا دامن نہیں چھوڑا اور کسی طرح کے دباؤ میں نہیں آئے۔ اسی مضمون میں ڈاکٹر بلوچ صاحب آگے لکھتے ہیں کہ ایوب کھوڑو صاحب کی شخصیت میں تحمل اور برداشت کی صفات اعلیٰ درجے کی تھیں۔ بحیثیت وزیر اعلیٰ انھوں نے نہ صرف اعلیٰ منتظم کا مظاہرہ کیا بلکہ ہمیشہ حق اور انصاف کا ساتھ دیا اور کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی نہیں کی۔ اس کی مثال بلوچ صاحب لکھتے ہیں کہ جب کھوڑو صاحب پر قتل کا جھوٹا الزام عاید کیا گیا تھا تو ایک پولیس افسر اکبر خان نے انھیں گرفتار کیا تھا۔ جب کھوڑو صاحب سندھ کے وزیر اعلیٰ بنے تو اکبر خان ان سے ملا اور ان سے گزشتہ عمل کی معافی مانگی۔ کھوڑو صاحب نے ایک اعلیٰ ظرف انسان کی مثال پیش کرتے ہوئے اکبر خان کو دل سے معاف کر دیا تھا۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے سندھی زبان میں ایک مضمون (۱۵) اپنے قدیمی دوست قاضی فیض محمد پر بھی لکھا تھا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کی طرح ان کا تعلق بھی خاکسار تحریک سے تھا۔ ڈاکٹر صاحب قاضی فیض محمد کے محاسن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''محترم عبدالرحیم میمن کے ایک مثالی رہنما ہونے کی وجہ سے ایس ایم کالج کے سندھی شاگرد خاکسار تحریک میں شامل ہونے لگے۔ علّامہ مشرقی کے لکھے گئے تذکرے ، اشارات اور اصلاح اخبار میں لکھے گئے اداریے اور اس تحریک کی سپاہیانہ زندگی، نظم وضبط

اور خدمت خلق کے جذبے نے نوجوان طلبہ کو بہت متاثر کیا۔ بڑے طالب علموں میں سب سے پہلے قاضی فیض محمد اور محترم عبدالرحیم میمن خاکسار ساتھی بنے، اور چھوٹوں میں راقم الحروف مسلم ہاسٹل میں ہم تینوں سے بعد میں جو طلبہ خاکسار میں شامل ہوئے ان میں قریشی حمزہ خان مرحوم اور بھوپال کے ایک صدیقی تھے جن کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں ہے وہ انجینیرنگ پڑھتے تھے۔ محترم عبدالرحیم میمن اکثر مجھے ہی ساتھ لے کر خاکسار تحریک کی تبلیغ کے لیے کبھی سولجر بازار، کبھی کھارادر اور کبھی لی مارکیٹ اور لیاری جاتے تھے۔ بعض موقعوں پر قاضی فیض محمد بھی ساتھ ہوتے تھے۔ ایک کیمپ جو ہم نے سولجر بازار میں لگایا تھا۔ اس میں غالباً قاضی فیض محمد کیمپ کے سالار تھے اور ایک دوسرا کیمپ جو ہم نے بھیم پورہ میں لگایا تھا وہاں کے سالار عبدالزاق تھے جو کہ مقامی تھے۔ ایک مرتبہ قاضی فیض محمد نے خود ہی اپنی اصلاح پر زور دیتے ہوئے کہا کہ کیوں نہ کوئی ایسا پروگرام ترتیب دیا جائے جس سے ایک تو چستی اور توانائی حاصل ہو دوسرے اس کے ساتھ ساتھ ہم میں خطابت بھی پیدا ہو جائے طے یہ ہوا کہ صبح چار بجے جلدی اٹھ کر اور مسلم ہاسٹل سے نکل کر کچھ فاصلہ دوڑ کر طے کریں تاکہ اچھی طرح ورزش ہو جائے اور پھر وہاں نماز فجر ادا کی جائے اور اس کے بعد پانچ پانچ منٹ کے لیے ہر ایک فوری طور پر دیے گئے موضوع پر تقریر کرے اور یہ عمل سورج طلوع ہونے تک جاری رہے۔ اس کے بعد دوڑ کر مسلم ہاسٹل میں وقت پر پہنچیں تاکہ نہا دھو کر ناشتہ کر کے کالج چلے جائیں۔ محترم عبدالرحیم میمن، قاضی فیض محمد حمزہ خان قریشی اور راقم الحروف اس پروگرام کے مطابق چلتے رہے اور تقریباً دو ہفتے مسلسل ایسا ہی کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ ہم دوڑنے کی رفتار بڑھاتے رہے اور ایک دن ایسا ہوا کہ ہم مسلم ہاسٹل سے کلفٹن تک پہنچ گئے اور وہاں سے وقت پر مسلم ہاسٹل آئے اور تیار ہو کر ناشتہ کر کے ہم مقررہ وقت پر کالج پہنچے۔

شیخ عبدالمجید حکیم فتح محمد سیوہانی اور مولانا دین محمد وفائی سندھی مسلم طلبہ کے قریب

تھے۔شیخ عبدالمجید صاحب نے مسلم ہاسٹل میں کسی جلسے میں خطاب بھی کیا تھا۔بہرحال مسلم ہاسٹل میں شیخ عبدالمجید صاحب کی شخصیت سب سے زیادہ جانی پہچانی تھی ،سندھ اس وقت الگ تھااور سندھ اسمبلی کے الیکشن ہونے والے تھے میں مولانادین محمد وفائی سے ملتارہتا تھا ۔ایک دن مولانا وفائی نے کہا کہ لاڑکانہ میں الیکشن ہورہے ہیں شیخ عبدالمجید صاحب امیدوار ہیں شیخ صاحب کی طرف سے ایجنٹ کے طور پر کچھ پڑھے لکھے لوگ چاہییں اگر طالب علم ہوں تو اچھی بات ہے یہ بات جب میں نے محترم عبدالرحیم اور قاضی فیض محمد سے کی تو ان دونوں حضرات نے مجھے ہمت دلائی اور کہا کہ شیخ صاحب کی کسی بھی طرح مدد کرنی چاہیے ہم تقریباً آٹھ نو طلبہ لاڑکانہ پہنچے جن میں صرف محترم عبدالرحیم ،محترم غلام حسین جلبانی کے نام یاد ہیں۔ مجھے ایک چھوٹے سے گاؤں وارث ڈنہ ماچھی کے لیے مقرر کیا گیا اس سیٹ سے شیخ عبدالمجید صاحب نے الیکشن جیتا اور سر شاہنواز بھٹو ہار گئے۔منتخب نمائندوں نے سندھ میں صوبائی اسمبلی بنائی اور سندھ کا نیا صوبائی نظام 1937ء سے شروع ہوا۔

مئی 1949ء میں جب میں امریکہ سے واپس آیا تو پاکستان قائم ہو چکا تھا اور جناح صاحب کی وفات کے بعد سیاست کا نقشہ بہت تیزی کے ساتھ تبدیل ہورہا تھا۔محترم عبدالرحیم ملازمت میں تھے،قاضی صاحب وکالت کررہے تھے،غلام مصطفی شاہ صاحب سندھ مسلم کالج کراچی میں تھے جن سے علی گڑھ کے سبب گہرا تعلق رہا۔حکومت پاکستان کی جانب سے مجھے ملازمت کے حوالے سے انکار ملا اور سندھ حکومت کو کسی ڈاکٹری ڈگری کی ضرورت نہ تھی ۔میں قاضی فیض محمد صاحب سے ملا جس نے نہایت سنجیدگی سے سیاسی حالات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ پورے پاکستان کی سطح پر سیاسی کام کرنا پڑے گا صرف سندھ کی سطح پر سیاست زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوسکتی۔میں نے امریکا کے حالات بتائے کہ کس طرح یہاں پر جمہوریت چل رہی ہے اور کس طرح وہاں پر مختلف مسائل پر بحث مباحثے

ہوتے ہیں اور وہاں ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔قاضی صاحب نے کہا کہ یہاں پر حالات سازگار نہیں ہیں یہاں پر مسائل کو سمجھنے کے بجائے صرف حصولِ اقتدار کے لیے سیاست کی جاتی ہے۔ میں نے ساری باتیں سنیں اور سوچا کہ سیاست کو سندھ کے سیاستدان ہی جانیں لیکن نئے پاکستانی ماحول میں اگر سندھ کی ثقافت اور تاریخی اہمیت کو اجاگر کیا جائے تو سندھ میں رہنے والوں کا فخر سے سر بلند ہو جائے گا اور باہر کے لوگوں کو بھی ذہنی طور پر متاثر کر سکتے ہیں۔ بے روزگاری میں میرا ایک سال مکمل ہوا تھا جس میں سندھ کے دیہات میں گھومتا رہا سگھڑوں سے محافل کیں اور سندھ کی تاریخ ،لغت اور ادب کا مطالعہ کیا اور سیاسی سوچ رکھنے والوں میں سے میرا خاص تعلق شیخ عبدالمجید میر علی احمد خان ،جی ایم سیّد اور قاضی فیض محمد سے رہا سائیں جی ایم سیّد صاحب نے میرا ذوق اور شوق دیکھ کر سندھی لغت پر کام کرنے کے لیے مالی امداد بھی کی اور غالباً تین ماہ میں بیٹھ کر سندھی لغت پر کام بھی کیا۔سائیں جی ایم سیّد صاحب میری معاونت کرتے رہے اور اس کے علاوہ لسبیلہ کے بارے میں معلومات اکٹھی کر کے ''بیلہ والوں کے اقوال'' نامی کتاب لکھی۔ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی رسالہ نکالا جائے جس میں سندھ کی تاریخ ادب اور ثقافت کے ساتھ ساتھ ضروری مسائل کی طرف توجہ مبذول کروائی جائے لیکن یہ کام پیسے کے علاوہ نہیں ہوسکتا۔

اگست 1950ء کے اواخر میں مرکزی حکومت کے انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کے شعبے میں ملازمت ملی اور چار سو روپے تنخواہ ملنا شروع ہوئی میں نے ستمبر کی دوسری تنخواہ سے پیسے بچا کر ''عام رائے'' کے نام سے ایک ادبی رسالہ نکالنے کا ارادہ کیا۔قاضی فیض محمد کو خط لکھا اور اس کام میں معاونت کرنے کو کہا۔سیّد سردار علی شاہ جو اس زمانے میں اخبار میں کام کرتے تھے انہوں نے رسالے کی طباعت اور اشاعت کی ذمہ داری قبول کی۔قاضی فیض محمد پہلے دوست تھے جنہوں نے اس کام کی حوصلہ افزائی کی اور 100/ روپے بھی

بھیجے۔ 51-1950 کے دوران رسالہ شائع ہوتا رہا اور میری تنخواہ سے بچی رقم سے اور بعض خریداروں کے چندے سے اخراجات پورے ہوتے رہے۔ اس رسالے کے ذریعے پہلی مرتبہ معیاری طریقے سے سندھی ادب اور ثقافت کی اشاعت ہوئی۔

1951ء میں مرکزی پبلک سروس کمیشن کی جانب سے مجھے کلاس ون آفیسر منتخب کیا گیا اور مشرق وسطیٰ میں تعلقات کے فروغ کے لیے میرا تقرر دمشق (شام) میں کیا گیا۔ ستمبر میں مجھے دمشق روانہ ہونا تھا۔ دوسری جانب سندھ میں کام کرنے کے امید افزا حالات پیدا ہو چکے تھے۔ سندھ ادبی بورڈ قائم ہوا اور شاہ عبداللطیف یادگار کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ علّامہ آئی آئی قاضی سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر کئے گئے اور آپ انگلینڈ سے کراچی پہنچ گئے۔ قاضی فیض محمد کو علّامہ قاضی صاحب سے دلی محبت تھی اور وہ ان سے ملنے کی خاطر کراچی آئے۔ ممکن ہے انہوں نے علّامہ صاحب سے کوئی بات کی ہو لیکن جب دوسرے روز میں علّامہ صاحب سے ملا تو انہوں نے مجھے کہا کہ دمشق میں کوئی دوسرا افسر بھی جا سکتا ہے تم باہر سے پڑھ کر آئے ہو اور سندھ یونیورسٹی کو تمہاری ضرورت ہے پھر پوچھا کہ وہاں کتنی تنخواہ ملے گی میں نے کہا کہ الاؤنس وغیرہ ملا کر پندرہ سو کے قریب ہو جائیں گے۔ فرمایا یونیورسٹی میں پروفیسر کی تنخواہ چھ سو روپے ہے لیکن پیسوں سے زیادہ خدمت کا خیال رکھنا ہوگا۔ میں نے ان کی نصیحت کو قبول کیا اور تقریباً ایک ہفتے کے بعد تقرری کا آرڈر روانہ کیا جس پر میں نے دمشق کے خوابوں کو بھول کر مرکزی حکومت کے عہدے سے استعفٰی دے کر ستمبر کی پہلی تاریخ کو سندھ یونیورسٹی کے پہلے پروفیسر کا عہدہ سنبھالا۔

سندھ یونیورسٹی میں آنے کے بعد کالج کے دور کے احباب میں سب سے زیادہ قاضی فیض محمد سے تعلقات استوار رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حیدرآباد میں علّامہ صاحب کے پاس آتے رہتے تھے۔ انہوں نے متعدد مضامین اور ایک کتاب بھی لکھی جس کی

اشاعت سے قبل مجھے ضرور دکھاتے تھے۔علّامہ صاحب کی اہلیہ محترمہ ایلسا قاضی نے اپنی انگریزی نظموں کی طباعت کا کام مجھے سونپا تھا اور اس کے لیے مجھے رقم بھی دی تھی۔کتاب طبع ہوئی لیکن ابھی طباعت اور جلد سازی کے لیے کچھ مزید رقم درکار تھی۔جب قاضی فیض محمد مجھ سے ملنے آئے تو یہ ذکر بھی آیا اور میں نے کہا کہ کتاب کے اخراجات کی بقیہ رقم میں اپنی طرف سے ادا کردوں گا۔انہوں نے کہا کہ فی الحال 300 کتابوں کی جلد بندی کرالو اور میرے اور دیگر دوستوں کے نام دس دس کاپیاں روانہ کرو اس طرح بقیہ اخراجات کی رقم کا انتظام ہو جائے گا۔میں نے ان کا مشورہ قبول کیا اور نسخے انہیں روانہ کیے جس کی قیمت فوراً مجھے بھجوادی۔محترم دوست محمد اسماعیل نون نے 100 نسخوں کی قیمت کا انتظام کر دیا جس سے نہ صرف بقیہ رقم کا انتظام ہو گیا بلکہ مزید 200 نسخوں کی جلد سازی بھی ہو گئی۔

محترمہ ایلسا قاضی کی پہلے اور اس کے بعد علّامہ قاضی کی وفات کے صدمے سندھ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کو برداشت کرنے پڑے۔میں خود ان صدموں سے بے حد متاثر ہوا لیکن جب قاضی فیض محمد اور میں نے آپس میں ایک دوسرے سے تعزیت کی تو مجھے بلاشک وشبہ ایسا محسوس ہوا کہ ان حادثات کا سب سے زیادہ صدمہ قاضی فیض محمد کو اٹھانا پڑا۔قاضی فیض محمد میرے کالج کے زمانے میں میرے محسن اور مربی تھے۔اس لیے جب بھی میں نواب شاہ جاتا تو ان سے ملتا۔اسی طرح جب وہ حیدرآباد آتے تو مجھ سے ملتے البتہ 1968ء کے بعد ان ملاقاتوں میں کچھ کمی آگئی۔1976ء میں جب میں سندھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر تھا مجھے اسلام آباد وزارت تعلیم میں بھجوادیا گیا اس وجہ سے قاضی فیض محمد کا حال واحوال ملنا مشکل ہو گیا۔زندگی کے آخری دور میں انہوں نے ایک بڑے ایثار اور قربانی کا کام کیا۔میری دلی تمنا تھی کہ ان سے مل کر اس کی تفصیلات معلوم کروں گا اور قلم بند بھی کرلوں گا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ دل کھول کر مجھے تمام تفصیلات سے آگاہ کریں گے۔افسوس سندھ سے دوری کے سبب یہ موقع نہ مل سکا اور جس طرح اس سے قبل میرا پیارا

دوست محترم عبدالرحیم انتقال کر چکا تھا اس طرح پیارا اور دلی دوست قاضی فیض محمد بھی اس جہان سے کوچ کر گیا اور ملاقات کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔"

حواشی باب نمبر 22

۱۔ملاحظہ فرمائیں سہ ماہی انشا حیدرآباد کا خاکہ نمبر، جنوری تا جون ۲۰۱۱

۲۔ملاحظہ فرمائیں سنڌي ادب جي تاريخ از ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو

۳۔ملاحظہ فرمائیں "قاضی احمد میاں اختر اور جوناگڑھ کی یاد میں" از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔ یہ مضمون کتاب "گلشنِ اردو" مرتبہ محمد راشد شیخ میں شامل ہے، دیکھیں صفحہ نمبر ۲۲۴

۴۔ایضاً ص ۲۱۸

۵۔ایضاً ص ۲۴۱

۶۔دیکھیں ڈاکٹر بلوچ صاحب کے انگریزی مقالات کا مجموعہ

Sindh Studied : Educational and Archeological

Compiled by G.M.Umrani & Arshad Baloch صفحہ نمبر 227

۷۔ملاحظہ فرمائیں کتاب 'گلشنِ اردو' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر ۲۱۸

۸۔ایضاً ،صفحہ نمبر ۲۱۹

۹۔ایضاً،صفحہ نمبر ۲۴۱

۱۰۔ایضاً ،صفحہ نمبر ۲۴۵

۱۱۔ملاحظہ فرمائیں ڊاڪٽر بلوچ جا مقالا - علم ، ادب ۽ شخصيتون مرتّب : محمد ارشد بلوچ، ص 332

۱۲۔ایضاً ص333

۱۳۔ڊاڪٽر بلوچ جا مقالا - تاريخ،لغت،ٻولي ، ادبۦ شخصيتون

(ڈاکٹر بلوچ کے مقالات۔تاریخ،لغت،زبان،ادب اور شخصیات)مرتبہ : محمد ارشد بلوچ ،صفحہ نمبر250

۱۴۔دیکھیں ڈاکٹر بلوچ صاحب کے انگریزی مقالات کا مجموعہ

Sindh Studied : Educational and Archeological

Compiled by G.M.Umrani & Arshad Baloch

صفحہ نمبر275

۱۵۔ملاحظہ فرمائیں ڊاڪٽر بلوچ جا مقالا - علم ، ادب ۽ شخصيتون مرتّب : محمد ارشد بلوچ، صفحہ نمبر337

باب نمبر 23

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے اسفار اور سفرنامے

سفرنامے آج ادب کا قابل قدر اثاثہ ہیں، ان سے قاری کو نئی سرزمینوں، نئے مقامات اور نئے انسانوں کے بارے میں بیش قیمت معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ہر سفرنامہ لکھنے والے سے اس کی شخصیت، سوچ، فکر اور اندازِ نظر کا اظہار ہوتا ہے۔ سفرناموں کے مطالعے میں قاری کو داستان جیسی حیرت اور افسانے جیسی لذت ملتی ہے۔ عموماً سفرناموں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بیرون ممالک کے سفر بہت کرتے ہیں اور وہاں سفرنامے بھی لکھتے ہیں لیکن اندرون ملک اور ملک کے مختلف حصوں کے سفر نہیں کرتے اور نہ تحریری طور پر محفوظ کرتے ہیں ۔ڈاکٹر صاحب کی مثال اس کے برعکس ہے۔ انہوں نے نہ صرف بیرون ملک اسفار کیے بلکہ اندرون ملک میں بے شمار اسفار کیے اور وہاں معمولی سے معمولی باتوں کو بھی قلمبند کیا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس باب کے عنوان میں 'اسفار' سے مراد مختلف اوقات میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کے کیے گئے سفر ہیں جبکہ 'سفرنامے' سے مراد ان اسفار کی روداد ہے جو ڈاکٹر بلوچ صاحب نے خود بعد از سفر قلم بند کی۔

سندھی زبان میں سفرنامے

سیر و سفر انسانوں کا ہر دور میں شوق رہا ہے۔ سفر کرنے سے نہ صرف تفریح حاصل ہوتی ہے بلکہ معلومات

میں بھی اضافہ ہوتا ہے کیونکہ سفر کرنے والا نئے نئے علاقوں میں جاتا ہے اوران علاقوں کے ان انسانوں سے ملتا ہے جن سے پہلے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ دورِ قدیم میں سفر کرنے کا ایک مقصد تجارت اور تجارت سے حاصل ہونے والے فوائد کا حصول بھی تھا قدیم دور میں سفر کرنے والوں نے نئے نئے علاقے دریافت کیے جیسا کہ کولمبس نے امریکا دریافت کیا تھا۔ انسانی تاریخ میں سفر کرنے والوں میں جن لوگوں نے شہرت حاصل کی ان میں واسکوڈی گاما، کولمبس ابن بطوطہ اور دیگر سیاحوں کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں۔

سندھی زبان میں بھی دیگر زبانوں کی طرح بہت سے سفرنامے لکھے گئے اور بہت سے سفرنامے ایسے بھی ہیں جو رسائل اور مضامین کی شکل میں محفوظ ہیں لیکن کتابی شکل اختیار نہ کر سکے۔ اسی طرح بہت سے سفرنامے ایسے بھی ہیں جو اخبارات رسائل میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو کی تحقیق کے مطابق سندھی زبان کے ابتدائی سفرنامے مذہبی نوعیت کے ہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے سوامی بودھ راج کے سفرنامہ کشمیر کا ذکر کیا ہے جو کشمیر جو سیر (کشمیر کی سیر) کے عنوان سے 1936ء میں شائع ہوا۔ اس سفرنامے میں سری نگر، ڈل جھیل امرناتھ تیرتھ، شالیمار باغ اور دیگر قابل دید مقامات کا ذکر موجود ہے۔ اس کے بعد اندازاً 1950ء میں سندھی زبان کے بعض سفرناموں کی اخبارات میں اشاعت ہوئی۔ ان سفرناموں میں معروف صحافی قاضی عبدالمجید عابد کا یورپ کا سفرنامہ اہمیت کا حامل ہے یہ سفرنامہ پہلے روزنامہ عبرت حیدرآباد میں خطوط کی شکل میں شائع ہوا بعد میں کتابی شکل میں۔ اس سفرنامے میں لندن اور پیرس کے قابل دید مقامات کا ذکر دلچسپ انداز میں کیا گیا۔ اس کے بعد کریم ڈنو راچپر کا امریکا کا سفرنامہ 1961ء میں شائع ہوا اور ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو کا چین کا سفر 1973ء میں شائع ہوا۔ سندھی زبان میں سب سے زیادہ سفرنامے الطاف شیخ نے لکھے جن کے اب تک 20 سے زائد سفرنامے شائع ہو چکے ہیں۔ مہتاب محبوب کا سفرنامہ جو بھارت کے سفر پر مشتمل ہے 1991ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر تنویر عباسی کا یورپ کا سفرنامہ 1984 میں اور عنایت بلوچ کے دو سفرنامے 1984ء اور 1987ء میں چھپے۔ یہ سفرنامے برطانیہ ملیشیا اور سنگاپور کے بارے میں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی سندھی زبان میں کئی سفرنامے لکھے گئے جن کا ذکر کتابوں میں موجود ہے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے اسفار اوران کی خصوصیات

جس طرح چلنا پھرنا زندگی کے معمولات میں داخل ہوتا ہے اس طرح ڈاکٹر صاحب کی تمام زندگی میں مختلف علاقوں کا سفر کرنا ان کے معمولات میں داخل تھا خصوصاً سندھ کے چپے چپے، قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں ڈاکٹر صاحب گئے۔ انہوں نے زندگی میں سفر ہوائی جہازوں میں بھی کیے، پانی کے جہازوں میں بھی کیے، کاروں بسوں اور ٹیکسیوں میں بھی کیے، گھوڑوں اور گدھوں، بیل گاڑیوں، اونٹوں پر بھی سفر کیے اور ان گنت سفر پیدل چل کر بھی کیے۔ ڈاکٹر صاحب نئی نئی سرزمینوں، نئے انسان، نئی باتیں، نئی معلومات، نئی رسم ورواج اور نئے ادبی خزانوں کی تلاش میں عمر بھر سفر کرتے رہے۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کا معمول تھا کہ سفر کے دوران جو بھی معلومات حاصل کرتے اسے اپنی کاپی یا نوٹ بک میں قلمبند کر لیتے اور پھر اس نادر معلومات سے اپنی علمی تحقیقات میں استفادہ کرتے۔ ان کے لیے ہر نیا سفر نئی حیرت اور نئی جستجو کا ذریعہ بنتا۔ اس کے نتیجے میں نئے تجربات اور نئی معلومات حاصل ہوتیں۔ ان کے اسفار کے نتیجے میں وہ علم ودانش کی بیش بہا دولت اپنے دامن میں سمیٹتے تھے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے زندگی میں اندورون ملک اور بیرون ملک جتنے اسفار کیے اب ان کا شمار بھی ممکن نہیں۔ ان کے اسفار پر اگر غور کیا جائے تو ان تمام میں ایک مشترک خصوصیت نظر آتی ہے اور وہ ہے تحصیل وفروغ علم۔ ڈاکٹر صاحب کے اسفار دیگر سیاحوں کے اسفار سے مختلف ہوتے تھے۔ عموماً سفر ناموں میں جو معلومات ملتی ہیں، ان میں مقامات کی سیر، مختلف لوگوں سے ملاقات وغیرہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اگر سفر کرتے تو اس کا مقصد یا تو حصول علم ہوتا یا کسی علمی کانفرنس میں شرکت یا کتب خانوں میں گھنٹوں بیٹھ کر معلومات کا حصول ہوتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے تمام اسفار کی تفصیلات پیشِ نظر باب میں شامل کرنا ممکن نہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اندورن ملک اور بیرون ملک اتنے زیادہ سفر کیے کہ اگر ان تمام اسفار کو جمع کیا جائے تو کئی کتب تیار کی جا سکتی ہیں۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اسفار کا ایک مختصر مجموعہ سندھی زبان میں شائع ہو چکا ہے جس کا نام مون جي ڏٺا ماڳ (میں نے جو مقامات دیکھے) ہے اور اسے احسان علی لغاری نے مرتب کیا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کے کل سات اسفار مرتب کیے ہیں جن کی تفصیلات ڈاکٹر صاحب نے وقتاً فوقتاً قلمبند کیں اور انہیں مختلف رسائل میں شائع کرایا۔ ان سات میں سے پانچ اسفار

بیرون ملک کے ہیں جب کہ دو سفر سندھ سے متعلق ہیں۔ڈاکٹر صاحب کے لکھے ان سفر ناموں میں بہت سی معلومات محفوظ ہیں مثلاً تاریخی مقامات، اہم کتب، محاورے، حکایات، ضرب الامثال اور اسی قسم کی دیگر تفصیلات ڈاکٹر صاحب نے قلمبند کی ہیں۔ان سب کے علاوہ جن مقامات پر ڈاکٹر صاحب گئے وہاں کا ادب، تاریخ، موسیقی اور سندھ کی موسیقی سے اس کا تعلق اور اس طرح کی دیگر معلومات موجود ہیں۔آئندہ صفحات میں ہم بیرون ملک کے ان اسفار کی تفصیلات تحریر کریں گے۔اس کے بعد ہم ڈاکٹر محمد یعقوب مغل صاحب کے ساتھ ڈاکٹر بلوچ صاحب کے ترکی کے اسفار اور عالمی سفر نامے کی تفصیلات بیان کریں گے۔

ا۔ہندوستان سے امریکہ تک کا سفر

ڈاکٹر بلوچ صاحب 1945ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیقی کام کر رہے تھے کہ پیر الٰہی بخش مرحوم کی خواہش اور کوشش کے نتیجے میں انھیں سندھ مسلم کالج کراچی میں آنا پڑا۔یہاں آپ نے 16 ستمبر 1945ء سے بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی تدریس کا آغاز کیا۔دسمبر 1945ء میں مرکزی حکومت کی جانب سے اشتہار شائع ہوا کہ ولایت میں اعلیٰ تعلیم کے خواہاں درخواست دیں۔ڈاکٹر صاحب کی درخواست منظور ہوئی اور پورے ہندوستان سے 25 یا 30 نوجوانوں کو 10 اپریل 1946ء کو انٹرویو کے لیے طلب کیا گیا۔یہ مرحلہ کامیابی سے طے ہوا اور بذریعہ خط مطلع کیا گیا کہ 30 جولائی 1946ء تک تمام معاملات مکمل کر لیں کیونکہ ڈاکٹر صاحب کو امریکہ کی مشہور یونیورسٹی کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں ڈاکٹریٹ کے لیے وظیفہ دیا گیا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے امریکہ تک سفر کی دلچسپ روداد سندھی زبان میں رسالہ مہران کے لیے خطوط کی صورت میں روانہ کی تھی۔اس سفر کا آغاز 16 اگست 1946ء کو اور اختتام 18 ستمبر 1946ء کو ہوا۔اس یادگار سفر کی تلخیص و اردو ترجمہ ہم آگے پیش کریں گے۔

ڈاکٹر صاحب آغاز میں لکھتے ہیں کہ ان کے دل میں وطن میں رہنے اور وطن کی خدمت کا جذبہ موجود تھا لیکن امریکا کا سفر کرنے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ ناممکن کو ممکن بنانا اور ناشدنی کو شدنی بنانے کا جذبہ ان کے مزاج کا حصہ تھا۔16 اگست 1946ء کو ڈاکٹر صاحب کراچی سٹی اسٹیشن سے بذریعہ ٹرین بمبئی کے لیے روانہ ہوئے

اوراحمد آباد کے راستے 18 تاریخ کی صبح بمبئی سینٹرل ریلوے اسٹیشن پر اترے۔ یہ رمضان المبارک کے دن تھے اور یہ بات بڑی اہم ہے کہ سفر میں روزے قضا کرنے کی سہولت کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے عزیمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سفر کے دوران بھی پورے روزے رکھے۔ بمبئی میں طویل بحری سفر کی ضروری کارروائی اور خریداری کے بعد ڈاکٹر صاحب 22 اگست کو بحری جہاز جنرل گارڈن میں امریکہ کے طویل اور دشوار گزار سفر کے لیے سوار ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ اسٹیشن پر ٹرین کی روانگی کے وقت الوداعی مناظر تو انھوں نے کئی مرتبہ دیکھے تھے لیکن بحری جہاز کی روانگی کے وقت الوداعی اور رقت آمیز مناظر دیکھنا ایک نیا تجربہ تھا۔ یہ انسانی جذبات اور احساسات کا بڑا دلکش منظر تھا جس کا مطالعہ ڈاکٹر صاحب نے کیا۔ جیسے ہی جہاز گہرے سمندر میں پہنچا مسافروں کو چکر آنے لگے اور وہ الٹیاں کرنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ چونکہ وہ روزے سے تھے اس لیے روزے کی برکت سے اس کیفیت سے محفوظ رہے۔ اس سفر کے دوران ڈاکٹر صاحب نے اپنی سحری اور افطاری کا انتظام خود ہی کیا۔ وہ خود ہی سحری کے وقت اٹھ کر سحری کھاتے اور نمازوں کے وقت نماز پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب روزانہ جہاز کی بلندی پر پہنچ کر سمندر کا نظارہ بھی کرتے۔ لکھتے ہیں کہ وہ منظر مجھے بالکل ایسا لگتا جیسے سمندر ریگستان ہو اور جہاز ایک سرپٹ اونٹ کی طرح اسے طے کر رہا ہو اور لہریں ریت کے ٹیلوں کی مانند ہوں۔

مورخہ 28 اگست 1946 کو جہاز سنگاپور کی بندرگاہ پہنچا۔ وہاں ڈاکٹر صاحب کو سندھی ہندو ملے جو وہاں تجارت کرتے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب کی ان سے گفتگو ہوئی تو وہ یہی سمجھتے رہے کہ یہ بھی کوئی بھائی بند (ہندوؤں کی ایک ذات) ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ ان سندھی ہندو تاجروں کے کاروبار اور کوٹھیاں نہ صرف سنگاپور اور منیلا میں ہیں بلکہ آگے ہانگ کانگ اور شنگھائی میں بھی۔ 28 اگست 1946 کو ہجری اعتبار سے 30 رمضان المبارک کی تاریخ تھی۔ مسافروں نے مغرب کے بعد عید کا چاند دیکھا اور ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ دوسرے دن صبح ڈاکٹر بلوچ صاحب اور دیگر 25 مسافروں نے جہاز پر عید الفطر کی نماز پڑھی اور ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔

مورخہ 30 اگست 1946 کو جہاز منیلا پہنچا۔ یہاں ڈاکٹر صاحب نے گزشتہ جنگ عظیم دوم کے دوران جاپانیوں کے فلپائن کے باشندوں پر مظالم کا ذکر کیا اور لکھا کہ جب امریکہ نے حملہ کیا تو فلپائن کے باشندوں نے

امریکہ کا ساتھ دیا جس کے نتیجے میں 7 جولائی 1946ء کو امریکہ نے فلپائن کو آزادی دی۔ آگے ڈاکٹر صاحب نے منیلا میں رقص وسرود اور سندھی ہندو تاجروں سے ملاقاتوں کا احوال لکھا ہے۔ فلپائن میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ یہاں اسلام کی دعوت کا آغاز 14 ویں صدی عیسوی سے ہوا جب دو عرب مبلغ مخدوم ابوبکر اور شریف کابنغین یہاں تبلیغ اسلام کی غرض سے 1380ء میں آئے تھے۔ اس کے بعد 16 ویں صدی عیسوی یعنی 1521ء میں اسپین والوں کی حکومت قائم ہوگئی اور اسپین کے بادشاہ فلپ کے نام پر ہی اس ملک کا نام فلپائن پڑا۔ یہاں سندھ کے ہندو تاجروں کی کامیاب تجارت کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کو ایک سندھی ہندو تاجر نے یہ گُر بتایا کہ فلپائن والے جو کچھ کماتے ہیں سب کا سب خرچ کر دیتے ہیں اور جو وہ خرچ کرتے ہیں وہ ہم کماتے ہیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب ہانگ کانگ پہنچے جہاں ان کی پنجابی مسلمانوں اور سندھ کے ہندو تاجروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ہانگ کانگ میں ڈاکٹر صاحب نے دو مسجدیں بھی دیکھیں اور وہاں نمازیں پڑھیں۔ پہلی مسجد 1914ء میں سپاہیوں نے تعمیر کی تھی جو خوبصورت فن تعمیر کی وجہ سے مغل عمارتوں سے مشابہ ہے جب کہ دوسری مسجد 1915ء میں بمبئی کے سیٹھ حاجی محمد اسحاق الیاس نے تعمیر کروائی۔ اس مسجد پر نصب اردو اور انگریزی میں کتبہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے سفرنامے میں نقل کیا ہے۔ ہانگ کانگ میں ڈاکٹر صاحب نے ایک بزرگ کشمیری مسلمان داروغہ رحمت خان سے بھی ملاقات کی۔

ہانگ کانگ سے جہاز 6 ستمبر 1946ء کو روانہ ہوا اور 18 ستمبر کو سان فرانسسکو کی بندرگاہ پہنچا۔ اس دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب مسافروں کو دن میں نیند آنا شروع ہوگئی اور وہ رات کو جاگنے لگے۔ بعض مسافر سمجھے کہ ایسا سر درد یا ہاضمے کی خرابی یا آب وہوا کی وجہ سے ہو رہا ہے یا ایسا کسی سمندری بیماری کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ بالآخر ایک عقلمند شخص نے بتایا کہ دن میں نیند آنا ان تمام وجوہات کی وجہ سے نہیں بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے وقت اور جہاز کے وقت میں 10 گھنٹوں کا فرق آچکا ہے اس لیے جب جہاز میں رات کے گیارہ بجتے ہیں تو اس وقت ہندوستان میں دن کے نو بجے کا وقت ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے جب ہم ہندوستانی وقت کے مطابق رات 11 بجے سوتے ہیں تو دراصل اس وقت جہاز میں دن کے 9 بجے کا عمل ہوتا ہے۔

اس سفرنامے کے آخر میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ بحری سفر کے تکلیف دہ دن اب گزرنے والے ہیں اور سکھ والے دن آرہے ہیں کیونکہ اگلی صبح یعنی 18 ستمبر 1946ء کو ہم امریکہ کی مشہور بندرگاہ سان فرانسسکو پہنچ جائیں گے۔ اس سے آگے نیویارک تک بذریعہ ریل سفر کریں گے۔ اس سفر کے اختتام میں یہ خوش کن اطلاع دیتے ہیں کہ سان فرانسسکو سے نیویارک تک کا سفر اس لحاظ سے بھی بڑا خوشگوار ہوگا کہ سان فرانسسکو امریکہ کے مغربی کنارے پر اور نیویارک مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ اس طرح ٹرین کے خوشگوار سفر میں تقریباً پورا امریکہ دیکھنے کا موقع ملے گا۔

مذکورہ بالا روداد ہم نے ڈاکٹر بلوچ کے سندھی زبان میں لکھے سفرنامے سے اخذ کی ہے جو کئی اقساط میں رسالہ مہران میں شایع ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے ہمیں دوران تحقیق ڈاکٹر صاحب کے اسی سفرنامے کی اردو میں لکھی روداد بھی ملی ہے۔ یہ روداد سفر دراصل ایک خط کی شکل میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے استادِ محترم علامہ عبدالعزیز میمن کو امریکہ سے علی گڑھ لکھی تھی اور یہ خط علی گڑھ کے رسالے 'کانفرنس گزٹ' بابت ۱۹۴۶ء میں اشاعت پذیر ہوا جس میں روداد سفر کے علاوہ کولمبیا یونیورسٹی اور وہاں کے بعض اساتذہ کے بارے میں مفید معلومات ملتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب علامہ میمن کو لکھتے ہیں:

> ''بمبئی سے روانگی کے وقت ایک خط راج کوٹ کے پتہ پر روانہ کیا تھا۔ امید ہے کہ مل چکا ہوگا۔ امریکہ کا سفر 'فن تعلیم' میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اختیار کرنا پڑا۔ فنی نقطہ نظر کے علاوہ ''سیروا فی الارض'' کے اصول کے ماتحت ایک سیر و سفر کا جذبہ یہاں تک کھینچ کر لایا۔ اور پھر ''مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے''۔ اپنی جیب پر چنداں بوجھ نہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے کرایہ سفر اور ٹیوشن فیس کے علاوہ یہاں ۱۵۰ ڈالر ماہانہ وظیفہ ملتا ہے۔
>
> ہمارا سفر بمبئی سے ۲۲؍اگست ۵ بجے شام کو جہاز مسمّٰی بہ ''جنرل گارڈن'' میں شروع ہوا، یہ جہاز ۲۴؍کی شام کو کولمبو (سنگل دیپ) بندر کے نزدیک سے گزرا اور ۲۸؍کو ۱۰ بجے سنگاپور بندر پر پہنچا۔ جہاز ڈاک تک نہیں گیا لہٰذا اس لڑائی کے تاریخی شہر کو دیکھنے کا

موقعہ نہ مل سکا۔ ۲ بجے دوپہر کے بعد یہاں سے جہاز روانہ ہوا اور دوسرے دن ۲۹ر کو بندہ کی کوشش سے جملہ مسلم مسافروں نے جہاز پر نماز عید ادا کی۔ ۳۱ر اگست کو جہاز جزائر تبان وکورجڈور کے درمیانی دروازے سے منیلا بندر کی حدود میں داخل ہوا۔ منیلا بندر میں کئی ڈوبے ہوئے جہاز منکوسۃً علی رو سہا نظر آئے۔ یہ سب اس لڑائی کے کارنامے تھے لیکن منیلا کی تباہی و بربادی کا منظر اور زیادہ تعجب خیز تھا۔ جاپانیوں نے اس شہر کو مورچہ بنایا اور امریکی جہازوں کو تقریباً ہر جگہ پر بم برسانے پڑے۔ بڑے بڑے مکانات، سرکاری عمارتیں، ہوٹلیں، ٹاؤن ہال، یونیورسٹی بلڈنگیں اور کلیسائیں شاہی کھنڈرات بنی ہوئی تھیں اور ان کو دیکھ کر وحشت پیدا ہوتی تھی۔ بازاروں کی جو کڑیاں سلامت رہ گئی تھیں وہاں دکانیں موجود تھیں۔ ہر چیز نہایت گراں تھی۔ فلپائن والوں کو ۴ر جولائی کو امریکہ نے آزادی دی تھی لہٰذا لوگوں میں زندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ فلپائن والوں کو امریکی تہذیب وتمدن نے جذب کرلیا ہے۔ وہ اپنا معاشرتی سرمایہ بالکل کھو چکے ہیں۔ مغربیت میں غرق ہیں لیکن نہایت بیدار اور زندہ دل ہیں۔ ۲ر ستمبر ۷ بجے صبح کو جہاز ساحل چین کی طرف روانہ ہوا۔ اور ۴ر ستمبر کو ۱۱ بجے ہانگ کانگ پہنچا۔ ایک دن کے لیے ہانگ کانگ دیکھنے کا موقعہ ملا۔ یہ شہر خلیج ہانگ کانگ کے دونوں طرف پہاڑیوں پر آباد ہے۔ یہاں ہندوستانی فوج کا پرانا مرکز ہے جہاں ایک عالی شان مسجد بنی ہوئی ہے۔ پیش امام صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ چینی مسلمان تھے اور انگریزی سے اچھی خاصی واقفیت رکھتے تھے۔ ہانگ کانگ شہر میں ایک عمدہ جامع مسجد ہے جو ۱۹۱۵ء میں بمبئی کے حاجی اسحاق سیٹھ کے خرچ پر تیار ہوئی۔ ایک خاص چینی مسلمانوں کی مسجد شہر کے ''ونچائی'' محلہ میں واقع ہے جہاں ایک صاحب محمد تواضع چینی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کل مصر سے جہاز میں آئے ہیں اور وہ کل تیرہ رفقاء ہیں۔ ۹ چین کے باشندے اور ۴ چینی ترکستان کے۔ یہ تیرہ چینی نوجوان ۸ سال جامعہ ازہر میں تعلیم ختم کر کے اب واپس چین جا رہے

تھے۔ محمد تواضع بدر الدین چینی و محمد مکین چینی کو بخوبی جانتے تھے۔ ۶ر ستمبر کو جہاز ہانگ کانگ سے روانہ ہوا اور مشرق شمال کی سمت میں جزائرِ لوچو سے گزر کر جاپان کے جنوب سے یوکوہاما کی سمت میں آ کر سیدھا سان فرانسسکو کو روانہ ہوا۔ اور ۱۸ر ستمبر کو وہاں پہنچا۔ دو دن شہر دیکھنے کا موقع ملا۔ یہاں بھی ''راشن سسٹم'' موجود ہے اور لڑائی کی دیگر صعوبتیں بھی باقی ہیں حالانکہ ہندوستان جیسی سختی نہیں۔ سان فرانسسکو میں انڈیا گورنمنٹ کے افسر کی طرف سے ہمیں تین ماہ کا وظیفہ پیشگی ملا۔ جملہ ۱۲۵ طلبہ اس سفر میں ہمارے ساتھ تھے۔ فن تعلیم کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا نے ہندوستان سے جملہ ۱۳ طلبہ منتخب کئے تھے جن میں سے تین یہاں ہم سفر ہیں۔ ۲۱ر ستمبر کو سان فرانسسکو سے نیویارک کو روانگی ہوئی اور اس ریل کے سفر میں امریکہ کو مشرق سے مغرب تک دیکھنے کا موقع ملا۔ راستہ میں شکاگو میں اترے اور تین گھنٹے بہ ذریعہ موٹر شہر کی سیر کی۔ وہاں سے روانہ ہو کر ۲۵ر ستمبر کو نیویارک کولمبیا یونیورسٹی میں پہنچے اور بفضل خدا اسی دن داخلہ کا طول طویل مرحلہ ختم ہو گیا۔ اور ایک ہوسٹل میں رہنے کو جگہ مل گئی۔ (مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لینے والے اور داخلہ کرنے والے حضرات غور فرمائیں)۔

داخلہ کولمبیا یونیورسٹی کے ''ٹیچرس کالج'' میں ہوا جو درحقیقت بقول امریکیوں کے دنیا میں بڑی سے بڑی ''تعلیمی یونیورسٹی'' ہے۔ اس سال سات ہزار گریجویٹوں نے یہاں داخلہ لیا ہے اور کم و بیش دنیا کے ہر ملک کے طلبا یہاں موجود ہیں۔ چین، ایران، ترکی، عراق و مصر کے چند صاحبان سے ابتدائی ملاقات ہو چکی ہے۔ ہوسٹل کی فیس ستر ڈالر فی ٹرم ہے۔ کھانے کا انتظام حسبِ رواج ہوسٹل میں ہوتا ہے۔ سب لوگ ہوسٹل ہی میں کھانا کھاتے ہیں۔ تقریباً دو سے ڈھائی ڈالر روزانہ خرچ ہے۔ کھانا صاف اور زود ہضم مل جاتا ہے۔ مصالحہ اور چٹنی البتہ موجود نہیں۔ چاول ہوٹلوں میں اکثر نہیں ملتے۔ یہاں ''راجہ ہوٹل''، ''سیلون انڈیا ان'' موجود ہیں جہاں ہندوستانی کھانا بھی مل جاتا ہے۔ میں نے کالج میں

''ڈاکٹر آف ایجوکیشن'' کا کورس لیا ہے۔

کولمبیا یونیورسٹی میں شاندار ''اورینٹل ڈیپارٹمنٹ'' موجود ہے جواب تک میں نے عدم فرصت کی وجہ سے نہیں دیکھا۔ اس کے متعلق آئندہ عرض کروں گا۔ یہاں کے پروفیسر ایک پروفیسر حتی تھے جنھوں نے بلاذری (فتوح البلدان) کا ترجمہ کیا ہے اور ایک تاریخ ادب عرب بھی لکھی ہے۔ اب وہ پرنسٹن یونیورسٹی میں ہیں۔ البتہ سان فرانسسکو میں کیلیفورنیا یونیورسٹی میں جانے کا اتفاق ہوا اور سیدھا اورینٹل ڈیپارٹمنٹ میں پہنچا اور اس کے رئیس ڈاکٹر ولیم پامر سے ملا۔ اس نے بتایا کہ یہاں مشرقیات سے مراد جاپانی، چینی اور مشرق اقصیٰ کی زبانیں ہیں لیکن ایک شعبہ وسط مشرق کا بھی موجود ہے۔ پھر انھوں نے ''ڈاکٹر ولیم پائز'' سے تعارف کرایا۔ ان کے سامنے عربی کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور واقعی لکھنے پڑھنے والے معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے عربی تاریخ خصوصاً مصر کے مملوک خاندان کی تاریخ پر اچھے خاصے معلومات دیے۔ یہ وہی ولیم پائز ہیں جنھوں نے ''النجوم الزاهر'' کو ایڈٹ کیا ہے۔ حال ہی میں النجوم کی ایک جلد لیڈن سے چھپ کر ان کے یہاں پہنچی تھی جو انھوں نے دکھائی۔ ابھی کچھ اور جلدیں باقی ہیں جن کو انھوں نے ایڈٹ کر رکھا ہے مگر چھپنے کی دیر ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے عبدالعزیز المیمنی کا نام سنا ہے۔ خوش قسمتی سے میرے پاس آپ کا عربی میں دیا ہوا سرٹیفکیٹ موجود تھا جو میں نے ان کو دکھایا۔ کافی غور سے پڑھنے اور عربیت پر سَر دھننے لگے۔ انھوں نے پھر ''والٹر فیشر'' سے ملاقات کرائی جو اس سے پیشتر جیروشلم میں رہتے تھے۔ وہ ابن خلدون پر کام کر رہے تھے اور کہا کہ آپ اپنے پروفیسر صاحب سے ابن خلدون کے متعلق خاص معلومات حاصل کر کے مجھے دیں۔ فیشر اتنے فاضل نہیں معلوم ہوتے تھے جتنے ولیم پامر۔''

۲۔ جاوا، سوماٹرا کا سفر (13 تا 27 مارچ 1977ء)

اس سفر کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ جاوا کی صرف باتیں ہی سنتے آئے تھے اب آ کر اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ سرسبز اور خوبصورت ملک ہے جس کے قدرتی حسن کی تعریف ہی نہیں کی جا سکتی۔ اس وقت جاوا سیاسی قوت کا مرکز ہے۔ صدر سوہارتو بھی جاوا کے ہیں۔ جنگ آزادی کی جنگ کے وقت ڈاکٹر اور دوسرے سربراہ سوماٹرا کے تھے۔ سوماٹرا اور جاوا انڈونیشیا کی تاریخ میں سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے اہم جزیرے رہے ہیں۔ اس وقت بھی مردم شماری کا بڑا حصہ انہی دو جزیروں میں آباد ہے۔ جاوا میں 8 کروڑ اور سوماٹرا میں 2 کروڑ باقی دوسرے جزیروں میں تین چار کروڑ اور سارے جزیروں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہے۔

ڈاکٹر بلوچ اس سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ یہ ملک عجائبات میں سے ہے۔ ایک تو ہر جزیرے کا ماحول جدا جدا اور انوکھا ہے اور دوسرے یہ کہ یہ جزیرے ایسے لگتے ہیں کہ جیسے سمندر میں جھاگ پہ نشانات بنے ہوئے ہوں اور اس ملک کا نقشہ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کسی نیلی زمین پر ہرے، لال، سفید اور ہلکے رنگ گرا کر کسی مصور نے ماڈرن آرٹ کی مصوری کی ہو۔ زمین زرخیز ہے اور کثرت سے بارش ہوتی ہے، چاول اور مکئی کے ساتھ ساتھ دیگر فصلیں بھی ہوتی ہیں۔ ایک فصل کاٹتے اور دوسری بوتے ہیں صرف ساڑھے چار ماہ میں چاول کی فصل حاصل کر لیتے ہیں اور دو سال میں چاول کی پانچ فصلیں تیار کرتے ہیں۔

وہاں کے جانوروں کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ جانور بھی کئی قسموں کے ہوتے ہیں۔ جنگلی شیر، ہاتھی، ریچھ اور بندروں کے علاوہ گانے والے عجیب قسم کے پرندے، رنگین طوطے اور رنگین کبوتر وہاں ہوتے ہیں۔ ایک عجیب جانور اورنگتن بھی ہوتا ہے یعنی جنگلی آدمی جو نہ انسان ہوتا ہے نہ بندر، ڈاکٹر بلوچ صاحب نے وہاں کے ایک حیوان خانے میں ایک اورنگتن کو بھی دیکھا جو غالباً کسی قدیمی جانور کی یادگار ہے۔

یہاں کی زبان کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ زبان انڈونیشی ہے جس کی بنیاد اس زبان پر ہے جو ملائیشیا، سنگاپور اور انڈونیشیا میں عام فہم زبان سمجھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے وہاں تحقیق کی تو یہ پتہ چلا کہ مدارس اور خانقاہوں میں ابھی تک عربی رسم الخط رائج ہے اور عربی رسم الخط میں کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ اس علاقے میں اسلام کی آمد کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ عرب مسلم تاجر یہاں تیسری صدی ہجری میں پہنچے

اور صوفیائے کرام اور علماء کرام کی کوششوں سے یہ پورا ملک حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ یہاں جو اہل اللہ اسلام کی تبلیغ کے لئے پہنچے ان میں کئی کا تعلق سندھ اور گجرات سے تھا اور آج تک ہر جزیرے میں ان کے مزارات موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے وہاں کی مقامی زبان میں عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی موجودگی کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس موضوع پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

۳۔روس کا سفر (30 مئی تا 7 جون 1978ء)

ڈاکٹر صاحب نے روس کا یہ سفر پاکستانی اہل قلم کے قائد کی حیثیت سے کیا۔ سب سے پہلے وہ ماسکو پہنچے جس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ ماسکو میں انہوں نے ہر چیز وسیع اور کشادہ دیکھی وہاں کی سڑکیں جو کشادہ تھی، بلڈنگیں بھی وسیع جن کے درمیان درختوں کے وسیع جھنڈ تھے آسمان بھی کشادہ نظر آیا اور زمین بھی کشادہ۔ ڈاکٹر صاحب نے وہاں مشہور روسی ادیب پشکن کی سالگرہ میں بھی شرکت کی اور وہاں اردو میں ایک تحریر بھی پڑھی جس کا روسی مترجم نے ترجمہ کیا۔

ماسکو کے بعد ڈاکٹر صاحب لینن گراڈ بھی گئے جو زار شاہی دور میں اس کا دارالحکومت تھا۔ لینن گراڈ کے محلات، باغات اور میوزیم بھی دیکھے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ دیرینہ خواہش کے باوجود وہ مشرقی علوم کا کتب خانہ نہ دیکھ سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے جب یہ کتب خانہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو منتظمین نے عذر کیا کہ امتحانات کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب وہ کتب خانہ نہیں دیکھ سکتے۔

لینن گراڈ سے ڈاکٹر صاحب اور ان کا وفد تاجیکستان کے دارالحکومت دوشنبہ پہنچا۔ دوشنبہ کی آب و ہوا انہیں کوئٹہ کی آب و ہوا اور وہاں کا موسم کوئٹہ کے موسم جیسا لگا۔ دوشنبہ میں ادیبوں سے ملاقات بھی ہوئی اور مختصر مشاعرہ ہوا جس میں ڈاکٹر صاحب نے وہاں کے لائق شیر علی کے فارسی کلام کو بہت پسند کیا اور سفرنامے میں اس کے اشعار بھی درج کیے۔ یہیں ڈاکٹر صاحب نے نیازی فاتح علی نامی شاعر کی ہمشیرہ کی شادی میں بھی شرکت کی۔ اس شادی میں پاکستانی وفد کا پرتپاک استقبال کیا گیا اور مائیکروفون سے اعلان بھی کیا گیا یہ معزز پاکستانی مہمان بھی تقریب میں آئے ہوئے ہیں اور بڑی محبت اور عزت سے شادی کا کھانا کھلایا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ

اس تقریب میں پاکستانی وفد کے ساتھ اس قدر محبت کا اظہار کیا گیا کہ ابھی ایک طرح کا کھانا کھا ہی رہے تھے کہ دوسری طرح کے کھانے آنے لگے جن میں سیخ کباب، بہترین پکے ہوئے پائے اور آئس کریم اور دیگر چیزیں شامل تھیں۔ اس کے بعد وہاں گوشہء ادیباں کی بھی دعوت میں شرکت کی اور سبزہ زار بھی دیکھا اور عرعر کا چشمہ بھی جہاں جِلدی بیماریوں کے مریض نہانے آتے ہیں۔

۴۔ازبکستان کا سفر

ڈاکٹر صاحب نے ازبکستان کا یہ سفر 21 تا 29 اکتوبر 1998ء کیا تھا اور بڑے مختصر، موثر اور جامع انداز میں ازبکستان کی خصوصیات اپنے مختصر سفر نامے میں بیان کی تھیں۔ یہ معلومات افزا مضمون ڈاکٹر صاحب نے سندھی زبان میں لکھا تھا جو بعد میں ان کے سندھی زبان میں خطوط کے مجموعے میں شامل ہوا۔ یہاں ہم اس سفر نامے کے اہم نکات کا سلیس اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ ازبکستان کا زندگی میں ان کا یہ پہلا سفر تھا جس کا مقصد سمرقند میں حضرت امام بخاریؒ کانفرنس میں شرکت تھا۔ یہ دعوت ازبکستان کی سائنس اکیڈمی کے صدر کی طرف سے دی گئی تھی۔ کانفرنس میں جو وفد پاکستان سے گیا تھا ڈاکٹر صاحب اس کے قائد تھے۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ 1991ء میں روس سے آزادی کے بعد ازبکستان اور اس کی پڑوسی ریاستوں میں ان کی اپنی حکومت قائم ہوئی اور وہ اپنے فیصلے خود کرنے لگے ورنہ اس سے قبل تمام فیصلے ماسکو سے ہوتے تھے۔ ازبکستان کے شہروں اور ان کی وجہ شہرت کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ ازبکستان کا دارالحکومت تاشقند ہے لیکن وہاں کے مشہور تاریخی شہر چھے ہیں یعنی سمرقند، شہرسبز، بخارا، خیوا، فرغانہ، اور ترمذان تمام شہروں کو دیکھے بغیر ازبکستان کے شاندار ماضی سے واقف ہونا ممکن نہیں۔ یہ تمام شہر بڑے بڑے مدارس، مساجد، عالموں، عارفوں، جرنیلوں اور فاتحوں اور علم پرور باشاہوں کی آخری آرام گاہوں کو اپنی سرزمین میں سموئے ہوئے ہیں۔ سمرقند میں عظیم فاتح امیر تیمور کا مقبرہ ہے جو عمارت سازی کا بہت خوبصورت نمونہ ہے۔ امیر تیمور کی خواہش اور وصیت کے مطابق پہلے اس کے استاد کی قبر بنی اور پھر استاد کے قدموں میں امیر تیمور کی قبر بنی، نیز یہ بھی کہ خود اس کی قبر استاد کی

قبر سے چھوٹی بنائی گئی۔ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ موجودہ صورت حال ایسی ہی ہے اور یہ دنیا میں استاد اور علم کے ادب اور تعظیم کی منفرد یادگار ہے۔ڈاکٹر صاحب شہر سبز بھی گئے جو امیر تیمور کی جائے پیدائش ہے جہاں اب تک اس کے شاہی محل کے آثار موجود ہیں۔یہاں امام خزرجیؒ کا مزار بھی ہے جو تابعین میں شامل تھے۔شہر سبز سے کچھ فاصلے پر سطح مرتفع پر کتاب نامی شہر بھی ہے جہاں مرزا الغ بیگ نے رصدگاہ قائم کی تھی اور ستاروں سے متعلق نقشے تیار کیے تھے۔وہ کتابوں والے عالم تھے اس لیے اس مقام کا نام کتاب رکھا۔ڈاکٹر صاحب بخارا بھی گئے جہاں کی ایک مسجد میں شاہ اسماعیل سامانی کا مقبرہ بھی دیکھا۔جب ڈاکٹر صاحب مقبرے کے اندر گئے تو دیکھا کہ ایک خاتون ایک ضعیف شخص کو فارسی رسم الخط میں لکھی ایک کتاب پڑھا رہی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے امام بخاریؒ کے مزار کی زیارت بھی کی جو سمرقند سے کوئی دس بارہ میل کے فاصلے پر ان کے آبائی گاؤں میں موجود ہے۔اس مزار کی جدید تعمیر ازبکستان حکومت نے کچھ ہی عرصہ قبل مکمل کی تھی۔ڈاکٹر صاحب نے نقشبندی سلسلہء طریقت کے بانی حضرت بہاء الدین نقشبندیؒ کے مزار کی زیارت بھی کی جو بخارا شہر سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔اس کے علاوہ عظیم الشان شاہی مسجد اور خانقاہ کی زیارت بھی کی۔

ڈاکٹر صاحب شہر فرغانہ بھی گئے جہاں مشہور ریاضی دان احمد فرغانی کا مجسمہ دیکھا۔احمد فرغانی کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ اس نے جیومیٹری کو اقلیدس کے خول سے نکالا اور ایک نیا رخ دیا تھا۔ڈاکٹر صاحب صوبہ خوارزم کے شہر خیوا بھی گئے جو بڑے بڑے شاہی مدارس، مساجد اور میناروں کا شہر ہے۔یہ شہر نقاشی ،کاشی کاری، عمارتی اینٹوں کی خوبصورت بناوٹ اور عمارت میں تنصیب اور خوبصورت گنبدوں کی بناوٹ کی بنا پر عالمگیر شہرت کا حامل ہے۔ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں کہ خیوا میں انہیں البیرونی کے بارے میں تحقیقات کرنی تھی چنانچہ اسحاق نامی گائڈ سے معاملہ طے کر کے ڈاکٹر صاحب خیوا سے تقریباً 30 میل کے فاصلے پر دریائے آمو کے دوسری جانب پرانا قلعہ دیکھنے گئے۔ڈاکٹر صاحب اس قلعے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ ''کات'' نامی قدیم شہر کے آثار ہیں جو البیرونی کی جائے پیدائش ہے، اسے مقامی زبان میں ''کیث'' بھی کہتے ہیں۔یہاں ایک میوزیم بھی موجود ہے۔''کات'' کا نام 1957ء میں بدل کر بیرونی رکھا گیا۔گائیڈ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب اورنج نامی شہر بھی گئے۔جس گائڈ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب سیر کر رہے تھے اس نے خوارزم یونیورسٹی کے وائس چانسلر عظیم بیگ کو

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بتایا۔عظیم بیگ نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ خوارزم کے علم پرور ''مامون گھرانے'' کے بادشاہوں کی یاد میں یہاں مامون اکیڈمی قائم کی گئی ہے جس کی شاندار عمارت میں اگلے روز ڈاکٹر صاحب کی دعوت کی گئی۔

ڈاکٹر صاحب شہر تاشقند کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ ازبکستان کا سب سے بڑا اور جدید شہر ہے اور اس جیسا صاف ستھرا اور کشادہ شہر پاک و ہند میں کوئی نہیں البتہ منصوبہ بندی کے لحاظ سے اسلام آباد تاشقند سے بہتر شہر ہے۔ازبکستان میں پہاڑوں کا طویل سلسلہ بھی ہے جن سے سونا نکلتا ہے۔ازبکستان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں کہ یہاں شہد کی کئی اقسام پائی جاتی ہیں اور شہد انہی پہاڑوں سے آتا ہے۔امام بخاریؒ کی یادگار میں جو دعوت کی گئی اس میں شہد کے بھرے پیالے بھی موجود تھے۔دیکھنے میں اس شہد کا رنگ سفید تھا۔کھانے سے پتہ چلا کہ یہ دانے دار شہد ہے اور اہم بات یہ کہ اس میں عطر جیسی خوشبو تھی۔ڈاکٹر صاحب آخر میں یہ دلچسپ جملہ لکھتے ہیں کہ ہم اس میٹھے ملک اور یہاں کے میٹھے انسانوں کا یہ مختصر بیان شہد کے ذکر کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے اسفار مع ڈاکٹر محمد یعقوب مغل صاحب

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ایک نامور عالم، محقق، ماہر تعلیم، ماہر لغت و زبان، استاد اور دیگر کئی حیثیتوں کے مالک تھے۔ان تمام کے ساتھ ساتھ انھوں نے زندگی میں بہت سے اسفار بھی کیے اور ان میں سے کئی اسفار کی تفصیلات سپرد قلم بھی کیں۔ڈاکٹر صاحب کے اسفار میں عموماً علمی اور تحقیقی نوعیت کی تفصیلات زیادہ ملتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ کئی عام دلچسپی کی باتیں بھی ملتی ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے زندگی میں جن جن لوگوں کے ساتھ اسفار کیے ان میں ایک اہم اور قابل قدر نام ڈاکٹر محمد یعقوب مغل کا بھی ہے۔ڈاکٹر مغل صاحب طویل عرصہ ترکی میں قیام کر چکے ہیں اور اس وقت پاکستان میں موجود ترکی زبان و تاریخ کے ماہرین میں سرفہرست ہیں۔جب ڈاکٹر مغل صاحب کا قیام ترکی میں تھا اس دوران ڈاکٹر بلوچ نے ترکی کے پانچ سفر کیے۔ان اسفار میں ڈاکٹر مغل ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ رہے۔اس کے علاوہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کے ساتھ ایک عالمی سفر بھی کیا۔ہماری گزارش پر ڈاکٹر مغل صاحب نے ان اسفار کی تفصیلات بیان کیں۔جب یہ تفصیلات کمپوز ہوگئیں تو آپ نے ان کمپوز شدہ

صفحات کا بغور مطالعہ کیا اور ان میں مزید اضافات کیے۔ یوں یہ اہم معلومات زیر نظر کتاب میں شامل ہو سکیں۔ یہاں ہم ڈاکٹر مغل صاحب کی فراہم کردہ تفصیلات بیان کریں گے:

''۱۹۶۰ء میں میں نے بی اے آنرز کا امتحان سندھ یونیورسٹی سے دیا تھا۔ علامہ آئی آئی قاضی اس زمانے میں سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ انھوں نے تعلیم کے فروغ کی خاطر اساتذہ کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کیے تھے اور ان کو پرائیویٹ حیثیت سے امتحان دینے کی سہولت فراہم کی تھی۔ اس زمانے میں میں گورنمنٹ ہائی اسکول میرپورخاص میں استاد تھا اور بی اے آنرز کے لیے روزانہ آٹھ گھنٹے مطالعہ کرتا تھا۔ امتحانات سے قبل روزانہ ۱۸ گھنٹے پڑھتا تھا اور روزانہ صرف دو تا تین گھنٹے سوتا تھا۔ امتحان کے نتیجہ کا اعلان اولڈ کیمپس (سندھ یونیورسٹی) میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ اس وقت یونیورسٹی کے رجسٹرار محمد حسین ترک صاحب تھے جنھوں نے اعلان کیا کہ بی اے آنرز (شعبہ تاریخ اسلامی) میں میں فرسٹ آیا، سیکنڈ پوزیشن عبدالجبار جونیجو (شعبۂ سندھی) اور تیسری پوزیشن گل حسن لغاری (شعبۂ فارسی) کی آئی ہے۔ اتفاق ہے کہ بعد کے ادوار میں ہم تینوں نے باری باری ڈاکٹریٹ کی ڈگری اسی ترتیب سے لی جس ترتیب سے تینوں کی پوزیشن آئی تھی۔

اس زمانے میں ڈاکٹر بلوچ صاحب شعبۂ تعلیم کے سربراہ تھے۔ وہ ایک قابل استاد کے طور پر یونیورسٹی میں معروف تھے اور ان کا طلبہ پر رعب بھی تھا۔ ایک روز میں ہمت کر کے ان کے دفتر میں چلا گیا اور ان کو بتایا کہ بی اے آنرز میں میری فرسٹ پوزیشن آئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور مجھے گلے سے لگا کر مبارکباد دی۔ اس کے بعد انھوں نے یہ نصیحت کی کہ اسی مقام پر رک نہ جانا بلکہ ہمت کرو اور آگے بڑھو۔ ان کے حوصلہ دلانے پر میرے دل میں خیال آیا کہ مجھے اب مزید آگے تعلیم حاصل کرنا چاہیے اور محنت کرنی چاہیے۔

انھی دنوں ترکی حکومت کی جانب سے اسکالرشپ کا اشتہار اخبارات میں شایع ہوا چنانچہ میں نے بھی اسکالرشپ کے لیے درخواست دی۔ جون ۱۹۶۰ء میں میرے پاس اطلاع آئی کہ اسکالرشپ مجھے مل گئی ہے اور میں ترکی جانے کی تیاری کروں۔ ترکی جانے سے قبل میں نے ڈاکٹر صغیر حسین معصومی صاحب (صدر شعبہ تاریخ اسلامی سندھ یونیورسٹی) سے مشورہ کیا کہ میں ترکی جاؤں یا نہیں۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ میں اس وقت ایم اے فائنل میں ہوں اور اگر پی ایچ ڈی نہ کرسکا تو میرا Career تباہ ہوجائے گا اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ ایم اے کی ڈگری لے کر ترکی جاؤں۔ اس مشورے کے نتیجے میں میں کراچی پہنچا جہاں دفتر خارجہ میں متعلقہ ڈائریکٹر ایک بنگالی تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مطلع کیا کہ درخواست دے دوں جس میں یہ مذکور ہو کہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ترکی اعلیٰ تعلیم کے لیے جانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ جواب آنے میں تقریباً دو ماہ کا عرصہ لگے گا اس لیے میں درخواست دے کر ایم اے کے امتحان کی تیاری کروں چنانچہ میں نے درخواست ان کے پاس جمع کرادی۔

۴/ اگست ۱۹۶۰ء کو میں کراچی سے ترکی بذریعہ بحری جہاز روانہ ہوا۔ جانے سے قبل میں ڈاکٹر بلوچ صاحب سے ملاقات کی غرض سے ان کے پاس گیا۔ وہ میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آئے اور فرمایا کہ ترکی پہنچنے کے بعد بھول نہ جانا بلکہ رابطے میں رہنا۔ اس کے بعد ڈاکٹر بلوچ صاحب پانچ مرتبہ ترکی آئے اور ان کے ہر دورے پر میں ہر ہر مقام پر ان کے ساتھ رہتا اور ان کی معاونت کرتا تھا۔ پہلی مرتبہ ڈاکٹر صاحب ۱۹۶۳ء میں ترکی آئے۔ اس زمانے میں میں انقرہ میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب تقریباً ایک ہفتہ استنبول میں رہے۔ وہ سارا وقت استنبول کی شہرۂ آفاق لائبریریوں میں گزارتے اور وہاں علمی اور تحقیقی معلومات جمع کرتے رہے۔ اس کے بعد ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر صاحب نے مجھے بذریعہ خط مطلع کیا کہ وہ ایک اہم کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ایران جارہے ہیں اور وہاں

تحقیقی مقالہ بھی پڑھیں گے۔انھوں نے لکھا کہ اس مقالے کے لیے ضروری معلومات روانہ کروں چنانچہ میں نے ضروری معلومات انھیں بھیج دیں۔میرا یہ خط ڈاکٹر صاحب کے نام خطوط کے مجموعے مرتبہ عنایت بلوچ میں شایع ہو چکا ہے۔اس زمانے میں میں ہر سال ترکی سے پاکستان بذریعہ ایران آتا تھا۔یہ بہت سستا ذریعہ آمدورفت تھا اور امن وامان کی صورت حال بھی بہت اچھی تھی۔جب بھی پاکستان آتا ڈاکٹر صاحب سے ضرور ملتا۔وہ ہمیشہ ترکی کے حالات دریافت کرتے کیونکہ ترکوں سے ڈاکٹر صاحب بہت محبت کرتے تھے اور ان کی خدمات کے معترف تھے۔

ڈاکٹر صاحب میرے ترکی میں قیام کے دوران دوسری مرتبہ دسمبر ۱۹۶۶ء میں ترکی آئے۔اس زمانے میں میں پی ایچ ڈی کے مقالے (Thesis) کی تکمیل میں شب و روز مصروف تھا۔اس شدید مصروفیت کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے پروفیسر خلیل انالجک تھے جنھوں نے مجھے مطلع کیا تھا کہ وہ دو سال کے لیے امریکہ جا رہے ہیں جہاں وہ ترکی تاریخ وثقافت کی تدریس کریں گے اور میں دسمبر تک بہر صورت مقالہ مکمل کرلوں۔بصورت دیگر مجھے دو سال مزید انتظار کرنا پڑے گا۔اتفاق سے ان شدید مصروفیت کے دنوں میں ہی دسمبر کے دوسرے ہفتے میں ڈاکٹر صاحب ترکی آئے۔میں نے ان کی خاطر ایک ہفتہ ان کے ساتھ گزارا کیونکہ وہ ایک ہی ہفتے کے لیے ترکی آئے تھے۔اس زمانے میں ترکی کے 67 صوبے تھے اور ہر صوبے کے گورنر کو 'والی' کہا جاتا ہے۔والی کے پاس بہت سے فنڈز ہوتے ہیں جن سے وہ ترقیاتی کام کراتا ہے۔یہ نظام آج بھی ترکی میں کامیابی سے چل رہا ہے کیونکہ وہاں صوبائی اسمبلیاں نہیں ہوتیں صرف مرکزی حکومت ہوتی ہے۔اسی وجہ سے صوبوں کا نظام والی چلاتا ہے۔میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ صوبہ منیسا بھی گیا اور وہاں کے گورنر سے ہم نے ملاقات کی۔ترکی میں پروفیسر اور اساتذہ کا بے انتہا احترام کیا جاتا ہے ۔جب گورنر کو پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب سندھ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور پاکستان سے

آئے ہیں تو اس نے بہت عزت اور احترام کا سلوک ہمارے ساتھ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے گورنر کو بتایا کہ ان کا منیسا میں محض چند گھنٹے کا قیام ہے۔ گورنر نے کہا کہ آپ ہمارے مہمان ہیں اور آپ کو اپنے قیام کے دوران ٹرانسپورٹ، طعام و دیگر سہولتیں دی جائیں گی۔ ڈاکٹر صاحب اس مہمان نوازی پر بے انتہا خوش ہوئے تاہم زیادہ وقت لائبریری میں تحقیقی کام میں صرف کیا۔

۱۷ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو مولانا جلال الدین رومی کی برسی کے موقع پر قونیہ میں مولانا کے مزار کے نزد محفل سماع کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے وہاں جانے کا عندیہ دیا۔ میں نے اپنے ترک دوست فیضی حالیجی کو فون کیا جس نے مطلع کیا کہ سارا انتظام کر لیا گیا ہے اور ہم قونیہ آ جائیں۔ قونیہ پہنچ کر ہم نے کھانا کھایا اور اس کے بعد رقص درویش دیکھا جس میں کئی افراد زیرِ لب مثنوی پڑھتے ہیں اور وجد کی حالت میں گول گھومتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب یہ دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے۔ اگلے روز ہم انقرہ واپس پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب اس دورے میں استنبول نہ جاسکے اور اس طرح ایک ہفتہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گزر گیا۔ یہ شدید سردی کے دن تھے۔ جب میں ڈاکٹر صاحب کو ایرپورٹ الوداع کہنے گیا تو برف باری کے آثار نظر آنا شروع ہوگئے۔ جب ایر پورٹ سے میں اپنے گھر ضروری سامان کی خریداری کے بعد جا رہا تھا تو برف باری شروع ہو چکی تھی۔ برف پر میرا پاؤں پھسل گیا اور میرے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا اتر گیا جس سے شدید تکلیف شروع ہوگئی۔ اس حالت میں بھی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کیونکہ میں بائیں ہاتھ سے لکھنے والوں میں سے ہوں اور اگر بائیں ہاتھ کا انگوٹھا اتر جاتا تو میں اپنے Thesis کا بقیہ کام کیسے کر پاتا۔ یہ کام دسمبر ہی میں مکمل کرنا ضروری تھا۔ الحمد للہ اس حالت میں بھی میں نے ہمت نہ ہاری اور ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اس نے ضروری علاج کے بعد دوائیاں لکھ دیں۔ میں اس حالت میں دوائیاں بھی کھاتا رہا اور اپنا مقالہ بھی مکمل کرتا رہا۔ الحمد للہ جنوری ۱۹۶۷ میں میرا Viva ہوا

اور مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی ۔

ڈاکٹر بلوچ صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ سنجیدہ علمی اور تحقیقی کاموں کی طرف نہ صرف دوسروں کو راغب کرتے تھے بلکہ ان کی معاونت اور بھرپور حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔وہ فرماتے تھے کہ پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر یہ سمجھنا کہ اب کام مکمل ہوا بالکل غلط ہے بلکہ پی ایچ ڈی کی ڈگری سے تو دراصل ایک اسکالر تحقیق کرنے کا فن سیکھتا ہے،اس کے بعد ہی وہ مرحلہ آتا ہے کہ انسان اپنے تحقیقی کاموں کو مکمل کرے،محنت کرے اور خود کو منوائے۔

۱۹۶۷ء کے وسط میں میں پاکستان پہنچا اور حسب معمول ڈاکٹر صاحب سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔میری خواہش تھی کہ اب جبکہ میں ترکی سے ڈی لٹ (Doctor of Literature) کی ڈگری کامیابی سے حاصل کر چکا ہوں تو کراچی میں ملازمت کروں لیکن یہ نہ ہوسکا۔وہاں ملازمت ملنا ہمارے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔اسی دوران ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ ہم آرسی ڈی پر ایک فنکشن کررہے ہیں اور اس موقع پر آپ ایک مقالہ ضرور پڑھیں۔مقالے کا عنوان بھی ڈاکٹر صاحب ہی نے تجویز کیا جو ’’ہندوستان کے مسلمانوں کے اوائلی ترک حکمرانوں سے سیاسی وثقافتی روابط‘ تھا۔اتفاق سے ایک روز قبل ہی میرے ایک قریبی دوست کی بیٹی کی شادی تھی جس میں مجھے کنڈیارو جا کر شرکت کرنا ضروری تھا۔میں نے ڈاکٹر صاحب سے عذر کیا کہ شادی میں شرکت کرنا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے عذر قبول نہ کیا اور فرمایا کہ شادی میں شرکت بھی کریں اور مقالہ بھی ضرور تیار کریں چنانچہ میں نے مقالہ تیار کیا بھی اور پڑھا بھی۔آرسی ڈی کے حوالے سے یہ فنکشن مہران آرٹس کونسل لطیف آباد حیدرآباد میں ۲۶ رجولائی ۱۹۶۷ء کو ہوا تھا جس کی صدارت عثمان علی عیسانی صاحب نے کی تھی۔عیسانی صاحب آج کل اقراء یونیورسٹی کراچی کے وائس چانسلر ہیں۔بعد ازاں یہ مقالہ ڈاکٹر صاحب نے Sind

University Arts Journal میں شایع بھی کیا۔اس کے بعد ۱۹۷۲ء تک میں سندھ یونیورسٹی کے شعبہءاسلامی تاریخ میں بطور استاد خدمات انجام دیتا رہا۔اسی سال جب میرا Promotion ہونا تھا تو ایک ایسے شخص کا Promotion کیا گیا جو تھرڈ کلاس میں پاس ہوا تھا۔اس بات کا میری طبیعت پر بڑا بوجھ تھا۔اسی دوران ترکی حکومت کی جانب سے Research Fellowship کا اعلان کیا گیا۔میں ڈاکٹر صاحب کے پاس مشورے کے لیے پہنچا۔انھوں نے فرمایا کہ بہتر یہی ہوگا کہ آپ ترکی چلے جائیں کیونکہ آپ یہاں کے ماحول سے پہلے ہی ذہنی طور پر پریشان ہیں اور آپ وہاں جا کر علمی اور تحقیقی کاموں میں مصروف ہو جائیں گے تو یہاں کی پریشانیاں بالکل فراموش کر دیں گے۔چنانچہ اسی سال میں ترکی چلا گیا اور استنبول یونیورسٹی کی ادبیات فیکلٹی میں تحقیقی کام کا آغاز کیا ۔میری تحقیق کا موضوع ترکی زبان کے ان الفاظ سے متعلق تھا جو پاکستانی زبانوں میں بھی رائج ہیں مثلاً انسان،حیوان،جانور،پلاؤ،اوطاق (بیٹھک)وغیرہ وہ الفاظ ہیں جو ترکی زبان میں بھی انھی معنوں میں مستعمل ہیں۔لفظ اوطاق ارغونوں کے عہد حکومت میں ترکی زبان سے سندھی زبان میں داخل ہوا اور سندھی زبان میں اب یہ عام مستعمل لفظ ہے۔اس تحقیق کی تکمیل پر میں نے 3500 الفاظ کی ایسی ہی فہرست تیار کی جو طبع بھی ہوئی۔مجھ پر یہ اللہ کا بڑا کرم ہوا کہ ترکی میں نہ صرف میں تحقیقی کاموں میں مصروف ہو گیا بلکہ استنبول یونیورسٹی کی ادبیات فیکلٹی میں بہت اچھے اخلاق کے ترک احباب سے میرے تعلقات استوار ہوئے۔ان احباب میں ڈاکٹر تحسین یازیجی اور ڈاکٹر عبدالقادر قرہ حان سرفہرست ہیں۔یہ حضرات پاکستان سے بہت محبت کرتے تھے اور ہم نے وہاں ان کے ساتھ مل کر Turk Pakistan Cultural Association میں فعال حصہ لیا جس کے ہفتہ وار اجلاس بھی ہوتے تھے اور میں ان میں بھرپور شرکت کرتا تھا۔۱۹۷۳ء میں میرے قیام ترکی کے دوران ہی ڈاکٹر صاحب کو سندھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنایا گیا۔ڈاکٹر صاحب

کی عادت تھی کہ وہ وائس چانسلر ہونے کے باوجود باقاعدہ کلاس لیتے اور وہ تمام کام کرتے جو اس سے قبل کر رہے تھے۔ یہ بات ڈاکٹر صاحب کے اعلیٰ کردار کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ وائس چانسلر ہو کر بھی بڑی ایمان داری اور دیانت داری سے کام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر کبھی وائس چانسلر کی گاڑی ذاتی کام کے لیے استعمال کرتے تو اپنی جیب سے پٹرول ڈلواتے تھے۔ میں ترکی میں تھا لیکن ڈاکٹر صاحب سے بذریعہ خط و کتابت برابر رابطے میں رہتا تھا۔

دسمبر ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر صاحب کوئی دس بارہ روز کے لیے ترکی آئے۔ ان کی آمد کا مقصد مولانا جلال الدین رومیؒ کی سات سو سالہ برسی کی تقریبات میں شرکت تھا۔ یہ تقریبات مورخہ ۱۵ تا ۱۷ دسمبر ۱۹۷۳ کو منائی گئیں۔ اس میں پاکستان سے ڈاکٹر بلوچ صاحب اور ترکی سے میں نے شرکت کی تھی۔ اس وقت میں استنبول یونیورسٹی میں Department of Urdu and Pakistani Culture کا صدر بن چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ یہ بڑے یادگار دن گزرے۔ مولانا رومیؒ پر سیمینار دو دن قونیہ میں ہوا اور تیسرے دن سیمینار انقرہ میں ہوا۔ اس میں شرکت کے لیے ڈاکٹر این میری شمل بھی آئی تھیں اور ترکی کے نامور محقق ڈاکٹر سہیل انور بھی شریک تھے۔ رات کا کھانا ہم نے ان کے ساتھ ہی کھایا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر سہیل انور کو ترکی میں بابا پروفیسر کہا جاتا تھا کیونکہ ان کے شاگرد بھی پروفیسر بن چکے تھے۔ ڈاکٹر این میری شمل جب ترکی میں پڑھاتی تھیں تو انھوں نے ایک ترک سے شادی کر لی تھی لیکن بعد میں اس سے علیحدگی ہو گئی تھی۔ وہ ترکی زبان اچھی طرح جانتی تھیں۔ اس کے علاوہ فارسی زبان پر بھی انھیں دسترس حاصل تھی۔ ڈاکٹر شمل نے وصیت کی تھی کہ بعد از انتقال ان کی تدفین مکلی کے قبرستان میں ہو لیکن یہ وصیت پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ اس رات کھانے کی میز پر بڑی عالمانہ گفتگو ہوئی کبھی مولانا روم کی مثنوی پر، کبھی شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام پر، کبھی علامہ اقبال کے کلام

پر اور اسی طرح کے دیگر موضوعات پر بڑی عالمانہ گفتگو ہوئی جس میں ڈاکٹر بلوچ صاحب نے بھی بھر پور شرکت کی۔

ڈاکٹر صاحب نے اس دورے کی ابتدا ہی میں مجھے کہہ دیا تھا کہ یہاں کسی سے یہ مت کہنا کہ میں سندھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوں ورنہ لوگ اعزازی تقریبات اور دعوتیں کریں گے اور یوں یہ وقت ان کاموں میں ضایع ہوگا۔ڈاکٹر صاحب چونکہ خود سادگی پسند تھے اور گہرا علمی اور تحقیقی ذوق رکھتے تھے اس لیے خواہش مند تھے کہ ان کے قیام استنبول کا یہ وقت وہاں لائبریریوں میں گزرے اور وہ آزادی سے گھوم پھر سکیں۔ترکی کے اس دورے کے دوران ہم قونیہ،منیسا اور دیگر شہروں کے کتب خانوں میں بھی گئے۔ روزانہ رات نو بجے ڈاکٹر صاحب مجھ سے مشورہ کرتے کہ اگلے دن کہاں کہاں جانا ہے ابھی سے پروگرام بنالو چنانچہ ہم ایسا ہی کرتے۔ہمارا پورا دن لائبریریوں میں گزرتا اور شام کو آزادی سے سیر کرتے۔ڈاکٹر صاحب اپنے ساتھ ان کتب اور مخطوطات کی فہرست لائے تھے جو وہ ترکی کی لائبریریوں میں دیکھنا چاہتے تھے۔یہ کتابیں تقریباً سب ہنداور سندھ سے متعلق تھیں اور ان کے بارے میں وہ مجھ سے بھی مشورہ کرتے تھے۔ان کتب و مخطوطات کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے ایک معلومات افزا مقالہ لکھا تھا جو اب کتاب 'گلشن اردو' مرتبہ محمد راشد شیخ میں موجود ہے۔اس زمانے میں استنبول کی شہرۂ آفاق سلیمانیہ لائبریری کے لائبریرین معمر اولکر صاحب تھے جو ہمارے ساتھ بڑے اکرام سے پیش آئے اور نہ صرف ہر ممکن مدد کرتے بلکہ دوپہر کا کھانا بھی اکثر ہم انھی کے ساتھ کھاتے۔

اس زمانے میں استنبول میں ایک کوفتے والا تھا جس کی دکان 'عثمان کوفتے والا' کے نام سے مشہور تھی۔ڈاکٹر صاحب اور میں اکثر اس کے کوفتے کھانے جاتے۔اس کے علاوہ کشتی میں بیٹھ کر مچھلی بھی کھاتے جو وہیں تل کر پیش کی جاتی تھی اور بڑی لذیذ ہوتی تھی۔ڈاکٹر صاحب کے انتقال سے کچھ عرصہ قبل جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ کافی

دیر تک ترکی میں گزارے ان ایام کو یاد کرتے رہے اور یہ بھی کہا کہ اگر دوبارہ کبھی ترکی جانے کا موقع ملا تو عثمان کوفتے والے کے ہاں جا کر کوفتے کھائیں گے۔ڈاکٹر صاحب کو بلیوں سے بڑی محبت تھی۔جب ہم حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار پر جاتے تو ڈاکٹر صاحب وہاں موجود بلیوں سے پیار کرتے اور ان کو کھانے کو کچھ دیتے۔حضرت ابوایوب انصاریؓ استنبول کی فتح کی خاطر مدینہ منورہ سے جانے والے پہلے لشکر میں شامل ہوئے تھے۔اس مہم میں شہر تو فتح نہ ہوا تھا لیکن حضرت ابوایوب انصاریؓ کا انتقال ہو گیا۔آپ کی وصیت کے مطابق مسلمانوں نے شہر کی فصیل کے نزدیک ہی آپ کی تدفین کی اور عیسائی حکمرانوں کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ اگر ان کی قبر کی توہین کی گئی تو اسلامی حکومت میں موجود عیسائیوں کے گرجوں کو محفوظ نہیں رکھا جائے گا۔طویل عرصہ گزر جانے کی بنا پر حضرت کی قبر کا نشان معدوم ہو چکا تھا۔۱۴۵۲ء میں سلطان محمد فاتح نے استنبول فتح کیا اور اس عظیم شہر میں مسلمانوں کی حکومت کا آغاز ہوا۔سلطان کے وزیر اعظم آق شمس الدین کو مسلسل تین راتیں خواب میں حضرت کی قبر دکھائی گئی۔جب وہاں کھودا گیا تو قبر کے نشان ملے جس پر ایک مزار اور ملحقہ مسجد قائم کی گئی۔اس وقت سے سلطنت عثمانیہ کے اختتام تک تمام ترک سلطانوں کا یہ دستور رہا کہ نئے سلطان کی تاجپوشی کی رسم حضرت کے مزار پر ہوتی اور اس کی کمر سے سلطان عثمان (بانی سلطنت عثمانیہ) کی تلوار باندھی جاتی تھی۔قونیہ میں ڈاکٹر صاحب اور ہم مولانا رومؒ کے مزار پر بھی گئے اور وہاں ڈاکٹر صاحب نے مولانا کی بانسری (نے) اور دیگر چیزوں پر تفصیل سے معلومات حاصل کیں اور قلمبند بھی کیں۔

ڈاکٹر صاحب جب یہ دورہ مکمل کر کے واپس پاکستان جانے لگے تو انھیں خدا حافظ کہنے میں اور ڈاکٹر تحسین یازیجی گئے تھے۔واپسی پر جب میں نے ڈاکٹر تحسین یازیجی کو مطلع کیا کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب پاکستان کے نامور استاد اور سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں تو انھوں نے ناراضگی کا اظہار کیا اور مجھ سے کہا کہ یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی ورنہ

ہم ان کے اعزاز میں تقریبات منعقد کرتے۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ یہ بتانے سے ڈاکٹر صاحب نے منع کیا تھا ورنہ وہ آزادی سے علمی اور تحقیقی کام نہ کر سکتے۔"

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ عالمی دورہ برائے سو عظیم کتب منصوبہ

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے ڈاکٹر محمد یعقوب مغل صاحب کی معیت میں تقریباً ڈیڑھ ماہ تک سو عظیم کتب منصوبے کی خاطر عالمی دورہ کیا تھا۔ اس دورے کے دوران ڈاکٹر صاحب کئی ممالک میں گئے اور وہاں کے کتب خانوں سے اس منصوبے کی خاطر مخطوطات کی نقول حاصل کیں اور وہاں کے اہل علم و تحقیق سے اس منصوبے کے بارے میں مشورے کیے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر بلوچ صاحب ترکی پہنچے کیونکہ پورے عالم اسلام میں مخطوطات کے سب سے زیادہ اور عظیم الشان خزانے ترکی ہی میں محفوظ ہیں۔ ترکی سے فرانس، فرانس سے برطانیہ، وہاں سے مصر، وہاں سے شام اور وہاں سے بالآخر سعودی عرب ہوتے ہوئے پاکستان واپس پہنچے۔ اس عالمی سفر کی خاص خاص باتیں ڈاکٹر محمد یعقوب مغل صاحب نے راقم الحروف کو متعدد نشستوں میں فون پر بتائیں جنھیں راقم نے قلم بند کیا۔ یہ قیمتی معلومات ہم یہاں ڈاکٹر محمد یعقوب مغل صاحب کے خصوصی شکریے سے شامل کر رہے ہیں کہ ان کے مسلسل تعاون کے بغیر ان معلومات کا حصول ممکن نہیں تھا۔

> "۱۴/اگست ۱۹۸۸ء کو سو عظیم کتب منصوبے پر مزید کام کرنے کے لیے ہم پانچ افراد پر مشتمل وفد کراچی سے انقرہ روانہ ہوا تھا۔ ان افراد میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، حکیم محمد سعید، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، میں ڈاکٹر محمد یعقوب مغل اور مسٹر شجاع (ہجرہ کونسل کے ایک افسر) شامل تھے۔ اس وفد کے میر کارواں ڈاکٹر بلوچ صاحب تھے۔ ہم ریاض اور ظہران ہوتے ہوئے ۱۵/اگست کو انقرہ پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس منصوبے کی خاطر بڑی محنت کی تھی اور ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ مسلم تاریخ و ثقافت کی ان سو عظیم کتب کے عربی اور انگریزی تراجم کرا کے دنیا کے آگے مسلمانوں کی علمی اور تحقیقی خدمات کو آشکار کریں۔ اس مقصد کی خاطر ڈاکٹر صاحب نے دنیا کے بڑے بڑے علماء اور محققین سے رابطے کیے تھے

اوران کتب کی ایک فہرست بھی مختصر تعارف کے ساتھ شایع کی تھی۔اس مقصد کی خاطر ڈاکٹر صاحب نے انقرہ میں ترکی کے محققین اور علماء کی دوروزہ کانفرنس منعقد کی تھی جس میں ترک محققین اور تاریخ دانوں نے شرکت کی تھی۔اس دوروزہ کانفرنس کے پہلے سیشن کی صدارت ترک محقق ڈاکٹر آئیدن سائیلی نے کی تھی اور ڈاکٹر بلوچ صاحب نے سوعظیم کتب منصوبے کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی تھی۔پہلے روز سوعظیم کتب کے ٹائیٹلز پر بھی تبادلہ خیال ہوا تھااس کانفرنس میں حکیم محمد سعید مرحوم نے فی البدیہ انگریزی میں تقریر کی تھی جو میرے لیے ایک نئی بات تھی کیونکہ لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ حکیم صاحب انگریزی زبان سے واقف نہیں۔

انقرہ سے ہم سب کا استنبول اور آگے دیگر ممالک جانے کا پروگرام تھا کہ ۱۷راگست کی شام میں نے سی این این پر خبر دیکھی کہ جنرل ضیاء اور دیگر ۳۷ آرمی افسران جہاز کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے ہیں۔اس خبر کے سننے کے بعد شجاع صاحب اور میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کے کمرے میں گئے اور انھیں اس خبر سے مطلع کیا۔ڈاکٹر صاحب نے یہ خبر ٹی وی پر دیکھی اور کہا کہ اس واقعے کے بعد پاکستان ایک اہم موڑ پر آ گیا ہے۔اگلے روز ہم سب پاکستانی سفارت خانہ گئے اور سفیر جناب عزیز خان سے ملے اور تعزیتی رجسٹر پر اپنے اپنے تاثرات لکھے۔وہاں سے ہمارا وفد قونیہ پہنچا جہاں سلجوق یونیورسٹی کے ریکٹر پروفیسر ڈاکٹر خلیل جین نے ہمارا استقبال کیا اور دوپہر کا کھانا بھی ان کی طرف سے تھا۔یہاں سے ہم مولانا رومؒ کے مزار گئے اور وہاں فاتحہ پڑھی۔مولانا روم کے مزار پر ہمارے ساتھ سلجوق یونیورسٹی کے ایک ایسے استاد تھے جو بڑی روانی سے اردو بول رہے تھے۔دریافت کرنے پر انھوں نے مطلع کیا کہ ان کی والدہ کا تعلق پاکستان سے ہے جبکہ والد ترک ہیں۔وہ صاحب اردو اور ترکی کے علاوہ انگریزی اور فارسی زبانوں سے بھی واقف تھے۔قونیہ میں ہم نے میوزیم بھی دیکھا اور علامہ اقبال کی علامتی قبر بھی دیکھی جو اس

بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ علامہ اقبال مولانا رومؒ کے روحانی شاگرد تھے۔ مولانا رومؒ کے مزار سے ہم ڈاکٹر بلوچ صاحب کی خواہش پر یوسف آغا کتب خانہ گئے جہاں ڈاکٹر صاحب نے قانونِ مسعودی کا نہایت نفیس مخطوطہ دیکھا جو سنہ ۴۰۲ ہجری کا مکتوبہ ہے۔ یہاں سے ہم سب اسی روز انقرہ واپس پہنچے۔

پاکستان میں جہاز کے حادثے کے واقعے کی وجہ سے حکیم محمد سعید، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور شجاع صاحب تو ۱۹/دسمبر کی رات انقرہ سے اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گئے جبکہ میرے مشورے پر ڈاکٹر صاحب اس بات پر راضی ہو گئے کہ ہم اپنا یہ کام مکمل کر کے ہی جائیں گے کیونکہ ہمارے پاس ٹکٹ بھی ہیں، ویزے بھی اور ہم ایک اہم مقصد کی تکمیل کے لیے پاکستان سے آئے ہیں۔ ہم دونوں نے پاکستان جانے والے حضرات کو انقرہ ایر پورٹ پر الوداع کہا اور انقرہ میں ایک روز مزید قیام کیا۔ ایر پورٹ پر ہمارے میزبان ڈاکٹر آیدن سائلی بھی خدا حافظ کہنے والوں میں شامل تھے۔

قونیہ میں کئی گھنٹے گزارنے کے بعد ہم انقرہ آئے اور انقرہ سے بذریعہ ہوائی جہاز استنبول گئے۔ سو عظیم کتب منصوبے کی خاطر عالمی دورہ کل چھ ہفتوں کے دورانیہ پر مشتمل تھا جس میں سے نصف وقت یعنی تین ہفتے ڈاکٹر صاحب نے ترکی میں گزارے۔ ڈاکٹر صاحب کی نظر میں استنبول خوابوں کا شہر تھا۔ وہ ہمیشہ وہاں پہنچ کر بڑی خوشی محسوس کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ نہ صرف صبح سے شام استنبول کی عظیم الشان لائبریریوں میں گزارتے بلکہ شام کو شہر میں سیر کرتے اور متوسط طبقے Middle Class کی معاشرت کا مطالعہ بھی کرتے وہاں قیام کے پورے عرصے میں ان کے ساتھ ساتھ رہا۔ ایک دن ہم استنبول سے یالووا بھی گئے جو ایک پرفضا مقام ہے اور جہاں دنیا بھر سے سیاح آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم اماسیا بھی گئے جہاں بایزید مسجد سے ملحق ایک عظیم الشان کتب خانہ ہے۔ یہاں ڈاکٹر صاحب نے کئی قلمی نسخے دیکھے اور اماسیا کے والی مصطفیٰ خطیب اوغلو سے ملاقات بھی کی جو

ہمارے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے اور دوپہر کے کھانے کی دعوت بھی دی۔ یہاں سے ہم ینیچے نامی مقام پر گئے جو اماسیا سے تقریباً تیرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور وہاں ایک آٹھ سو سالہ درخت دیکھا جس کا حجم (Diameter) ۱۳ میٹر (۴۰ فٹ) ہے۔ شام کو واپس استنبول پہنچے۔ ایک روز ہم استنبول سے بورسہ بھی گئے جہاں مشہور عالم اولو جامع مسجد میں نماز عصر پڑھی اور اگلے دن کتب خانہ پہنچے۔ لیکن وہاں پہنچ کر دروازے پر یہ اطلاع پڑھی کہ کتب خانہ دو دن کے لیے بند ہوگا۔ یہ پڑھ کر ڈاکٹر بلوچ صاحب کو افسوس ہوا کیونکہ وہاں سے وہ بیرونی کی كتاب الصيدنه کا قلمی نسخہ دیکھنا اور اس کے عکس لینے کا ارادہ رکھتے تھے۔

ایک روز ڈاکٹر صاحب کے دانت میں درد ہوا چنانچہ میں انھیں ایک ترک Dentist کے پاس لے گیا۔ وہ ہم سے اس قدر محبت سے پیش آیا کہ اس نے نہ صرف دانتوں کی صفائی کی، دوا لگا دی بلکہ ہم سے اصرار کے باوجود کوئی فیس نہ لی۔ ایک روز ڈاکٹر صاحب اور میں نماز پڑھنے مسجد گئے، دوران وضو ڈاکٹر صاحب اپنی مہنگی گھڑی وہیں بھول گئے، جب میں مسجد میں گھڑی کی تلاش میں پہنچا تو امام صاحب نے امانت خانے سے لا کر ہمیں گھڑی واپس کردی۔ اسی طرح ایک دن ڈاکٹر صاحب اپنا پرس جس میں پاسپورٹ، ویزا، کرنسی و دیگر ضروری چیزیں رکھی تھیں ہوٹل میں بھول گئے۔ ڈاکٹر صاحب اس وجہ سے بہت پریشان نظر آرہے تھے کہ اگر یہ پرس نہ ملا تو نہ جانے کتنی مشکلات کا سامنا ہو۔ میں نے انھیں اطمینان دلایا اور ہوٹل جب پہنچا تو ہوٹل کی خادمہ نے مجھے وہ پرس لا کر دیا جس میں سے کوئی چیز غائب نہ تھی۔ جب میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا تو وہ ترکوں کی امانت داری اور دیانت داری پر بڑے حیران ہوئے۔ افسوس کی بات ہے کہ ہم اس رویہ کی اپنے ملک میں توقع نہیں کر سکتے، ہمارے ہاں تو مسجدوں میں نمازیوں کی چپلیں تک چوری کی جاتی ہیں۔

استنبول سے ہم سوعظیم کتب کے منصوبے کی خاطر پیرس پہنچے جہاں ایر پورٹ پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم اور پاکستانی سفارت خانے کے ظفر بیگ صاحب ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھے۔ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کی زندگی سادگی اور دین داری کا عملی نمونہ تھی۔وہ ڈاکٹر بلوچ صاحب سے بہت محبت کرتے تھے اسی وجہ سے وہ ایر پورٹ تشریف لائے تھے۔ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے ہوٹل میں ہمارے لیے بکنگ بھی کرادی تھی۔ہوٹل میں ڈاکٹر بلوچ صاحب نے ڈاکٹر حمید اللہ سے کتاب سرد الصحائف کے حوالے سے گفتگو کی جس کا ترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ کر چکے تھے اور مقدمہ لکھ رہے تھے۔اگلے روز ڈاکٹر بلوچ صاحب نے ڈاکٹر رشدی راشد سے سوعظیم کتب منصوبے کے حوالے سے ملاقات کی ۔رات کا کھانا ڈاکٹر نقوی کے ہاں کھایا۔اس سے اگلے روز ڈاکٹر احمد حسن دانی سے ناشتے پر ملاقات ہوئی جو یونیسکو کی دعوت پر پیرس آئے ہوئے تھے۔اسی روز ڈاکٹر بلوچ صاحب اور میں پاکستانی سفارت خانے پہنچے جہاں سفیر شاہد امین صاحب سے ملاقات کی۔۶ رستمبر کو ہم پیرس کے مشہور عالم کتب خانے Bibliothec Nationale پہنچے جہاں ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم ہمارے منتظر تھے۔ان کی مدد سے ہم نے کتاب المجاھر کی فوٹو کاپی حاصل کی اور میزان الحکمۃ کی مائکروفلم کی خاطر رقم بھی جمع کرائی۔وہاں سے یونیسکو کے دفتر پہنچے اور ڈاکٹر دانی صاحب کے ساتھ لنچ کیا۔

مورخہ ۸ رستمبر کو پیرس سے لندن کی پرواز لی اور اسی شام لندن پہنچے۔اس کے بعد ۱۵ رستمبر تک سارا وقت لندن ہی میں گزرا۔یہاں تقریباً روزانہ ڈاکٹر صاحب برٹش میوزیم کی لائبریری میں جاتے ،کتابوں اور مخطوطات کو دیکھتے اور سوعظیم کتب منصوبے سے متعلق مخطوطات کی فوٹو کاپیاں حاصل کرتے تھے۔ڈاکٹر صاحب نے جن جن کتب کی فوٹو کاپیاں یہاں سے حاصل کیں ان میں عمر خیام کی میزان الحکمت، الجبرا اور دیگر کتب شامل ہیں۔لندن میں ڈاکٹر صاحب کے کئی دوست احباب موجود تھے جو انھیں دعوتیں دیتے مگر

ڈاکٹر صاحب یہی فرماتے کہ لائبریری میں کام کے اوقات میں وہ کوئی دعوت قبول نہیں کریں گے۔شام کو ڈاکٹر صاحب تقریباً روزانہ الہدیٰ بک شاپ جاتے۔احباب کی دعوتوں کے لیے بھی شام ہی کو جاتے۔اسی دوران اتوار کا دن بھی آیا۔یہ پورا دن ڈاکٹر صاحب نے میرے ساتھ ہائیڈ پارک میں گزارا۔وہیں ڈاکٹر صاحب کو اطلاع ملی کہ جناب اے کے بروہی کا لندن میں انتقال ہو گیا۔دراصل اے کے بروہی صاحب جنیوا گئے تھے،وہاں علالت کی بنا پر احباب انھیں لندن لے آئے جہاں ہسپتال میں ہی دل کا دورہ پڑا اور انتقال کر گئے۔ڈاکٹر صاحب اسی شام ان کے چھوٹے بھائی علی حسن بروہی صاحب سے ملنے گئے اور ان سے تعزیت کی اور دعائے مغفرت کی۔لندن میں قیام کے دوران ڈاکٹر صاحب کی اس وقت سفیر پاکستان شہریار محمد خان سے بھی مفصل ملاقاتیں ہوئیں۔

مورخہ ۱۵ رستمبر کو ہم چار گھنٹے کی پرواز کے بعد لندن سے قاہرہ پہنچے۔ایرپورٹ پر سفارت خانے کے افسر منظور صاحب ہمیں لینے آئے تھے۔اس زمانے میں قاہرہ کے پاکستان انٹرنیشنل اسکول کے پرنسپل جناب نور محمد میمن تھے۔ہم ان سے ملنے گئے تو انھوں نے مطلع کیا کہ یہاں ایک صاحب احمد حسن اجمیری ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں اور عربی زبان پر انھیں عمدہ دسترس ہے اور وہ عربی میں گفتگو کے بھی ماہر ہیں،وہ ہماری مختلف جگہ جانے کے دوران معاونت کر سکتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب اور میں ان کی معیت میں شہر گئے اور قاہرہ کے معروف کتب فروشوں اور ناشرین کتب کے ہاں گئے۔یہاں سے ڈاکٹر صاحب نے سوعظیم کتب منصوبے کی خاطر دس کتابیں خریدیں۔دوسرے دن بھی ہم سفارت خانے گئے۔ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر وہ سفارت خانے ہی میں رہے اور میں اجمیری صاحب کے ساتھ قاہرہ یونیورسٹی لائبریری گیا اور کتاب 'میزان الحکمت' کے مخطوطے کی فوٹو کاپی حاصل کی۔اس سے اگلے روز ہم سفارت خانے گئے اور سفیر پاکستان جناب محمد اسماعیل قریشی سے ملاقات کی۔

۲۱ ستمبر کو ہم قاہرہ سے دمشق پہنچے جہاں ایرپورٹ پر جناب غلام رسول بلوچ اور ڈاکٹر احسان حقی ہمارا استقبال کرنے آئے تھے۔غلام رسول بلوچ صاحب ان دنوں پاکستانی سفارت خانے میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے اور ڈاکٹر احسان حقی ڈاکٹر بلوچ صاحب کے قریبی دوست تھے۔خوش قسمتی سے ان دنوں دمشق میں بین الاقوامی کتاب میلہ International Book Fair جاری تھا جس میں ہم نے خاصا وقت گزارا اور ڈاکٹر صاحب نے وہاں سے سوعظیم کتب منصوبے کی خاطر بیس کتابیں خریدیں۔ ۲۳ ستمبر کو جمعہ کا دن تھا، اس روز ہم دمشق کی مشہور مسجد جامع اموی گئے اور وہاں نمازِ جمعہ ادا کی۔ وہاں سے دوپہر کے کھانے کے لیے سفیر پاکستان کے ہاں پہنچے اور شام کو غلام رسول بلوچ صاحب نے دعوت کی جس میں ڈاکٹر احسان حقی و دیگر کئی علما و محققین شریک تھے۔اس کے بعد اگلے روز ڈاکٹر صاحب اور میں دوبارہ بین الاقوامی کتاب میلہ میں گئے اور اگلے روز وادیٔ بردہ گئے جہاں بردہ نہر بھی دیکھی۔ یہ بڑا پرفضا مقام ہے جہاں لوگ دور دور سے تفریح کی خاطر آتے ہیں۔

۲۵ ستمبر کو دمشق سے جدہ کے لیے روانہ ہوئے اور دو گھنٹے کی پرواز کے بعد جدہ پہنچ گئے۔ جدہ ایرپورٹ پر جناب ظفر شیخ صاحب نے استقبال کیا۔ یہاں سے قیام گاہ گئے اور وہاں سے احرام باندھ کر عمرے کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ مکہ مکرمہ تک ہمیں جناب خالد وریامانی اپنے ساتھ لے گئے۔ مکہ میں عمرہ ادا کیا۔ وہاں اسماعیل شاہ بھائی سے ملاقات کی جن کے دادا کاٹھیاواڑ سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ میں آباد ہو گئے تھے۔اسماعیل شاہ بھائی کی مکہ میں نو منزلہ عمارت تھی اور وہ بڑے سخی، فیاض اور مہمان نواز انسان تھے۔ڈاکٹر صاحب کے ان سے اس زمانے سے تعلقات تھے جب ڈاکٹر صاحب بہاء الدین کالج جوناگڑھ میں زیر تعلیم تھے۔مکہ سے ہم جدہ پہنچے جہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز مورخہ ۲۶ ستمبر کو مدینہ منورہ پہنچے۔اگلے روز ڈاکٹر صاحب اور میں نے

پانچوں نمازیں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ادا کیں اور خوب دعائیں کیں۔ اس کے بعد ہم کتب فروشوں کے ہاں گئے اور مکتبۃ الایمان سے ڈاکٹر صاحب نے دو کتابیں خریدیں جن میں ایک 'الاتقان فی علوم القرآن' کا نیا ایڈیشن بھی تھا۔ مدینۂ منورہ میں چار روز قیام رہا جہاں سارا وقت یا تو عبادات میں گزرا یا کتب فروشوں کے ہاں۔ یکم اکتوبر کو مدینہ منورہ سے جدہ پہنچے اور اسی روز رات آٹھ بجے کی فلائٹ سے جدہ سے کراچی کے لیے روانہ ہو کر رات دو بجے بخیر و عافیت کراچی پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب اسی رات چار بجے کی فلائٹ سے اسلام آباد چلے گئے اور میں اگلے روز حیدر آباد پہنچا۔

یوں ڈاکٹر بلوچ صاحب کے ساتھ یہ ڈیڑھ ماہ کا یادگار دورہ برائے سوعظیم کتب منصوبہ اختتام کو پہنچا۔ اس پورے دورے کے دوران ڈاکٹر صاحب کی توجہ کا مرکز سوعظیم کتب منصوبہ رہا اور اسی کی خاطر ڈاکٹر صاحب یا تو علما و محققین سے ملاقاتیں کرتے رہے یا مطبوعہ کتب و مخطوطات کی نقول حاصل کرتے رہے۔''

باب نمبر 24

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے علمی روابط

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ہمارے عہد کے وہ نامور عالم، دانشور، محقق، ماہر تعلیم اور کئی دیگر حیثیتوں کے مالک دانشور اور محقق تھے جن کے علمی روابط نہ صرف برصغیر پاک و ہند کے اہل علم اور محققین سے تھے بلکہ عالمی محققین سے بھی۔ ان روابط کی کچھ تفصیلات ہمیں ڈاکٹر بلوچ کے خطوط، ان کے نام خطوط اور ڈاکٹر بلوچ کی مختلف تحریروں میں ملتی ہیں۔ پیش نظر باب میں ہم ان علمی روابط کی کچھ تفصیلات پیش کریں گے جن سے یہ بات واضح ہوگی ڈاکٹر بلوچ مرحوم ایک وسیع القلب اور وسیع الظرف عالم تھے۔ وہ زندگی بھر کسی محدود دائرے میں مقید نہیں رہے بلکہ ہر اس شخص کی علمی معاونت کرتے تھے جو ان سے رابطہ کرتا۔ ہمیں بلوچ صاحب نے نام مشاہیر کے خطوط میں کئی ایسے خطوط ملتے ہیں جن میں متعدد افراد نے ان سے علمی معاملات میں معاونت کی گزارش کی۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ خود بھی اہل علم و تحقیق سے برابر رابطہ برقرار رکھتے تھے۔ ڈاکٹر بلوچ کے علمی روابط کی تفصیلات تقریباً ۶۵ برس کے طویل عرصے پر محیط ہیں۔ ان سب کا ذکر ان محدود صفحات میں ممکن نہیں۔ اس موضوع پر سب سے اہم کتاب World of work-Predicament of a Scholar ہے جس میں انگریزی زبان میں ڈاکٹر صاحب کی مکاتبت محفوظ کردی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے اردو خطوط کا مجموعہ بنام ''خطوط

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ'' اوران کے نام مشاہیر کے خطوط کے مجموعے یعنی ''خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ'' میں بھی ہمیں ان روابط کی تفصیل ملتی ہے۔ یہ دونوں کتب مرتبہ راقم الحروف ہیں۔

ڈاکٹر بلوچ مرحوم ہفت زبان عالم تھے اوران کی ساری زندگی علم وعمل سے عبارت تھی۔ وہ ان لوگوں میں شامل تھے جن کی زندگی قلم وقرطاس کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ وہ کثیر التصانیف تو تھے ہی کثیر المکاتبت بھی تھے ۔وہ ان بزرگوں میں شامل تھے جن کے نزدیک خط کا جواب دینا ایک اخلاقی فریضے میں شامل ہوتا ہے۔ان کے خطوط میں بھی دیگر تحریروں کی طرح علمی اور تحقیقی رنگ غالب ہے۔وہ چھ سال تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طالب علم رہے اور دیگر زبانوں کی طرح اردوزبان پر بھی انھیں بھرپور قدرت حاصل تھی۔ان کے روابط نہ صرف پاکستان کے اردوداں اہل قلم ومحققین سے تھے بلکہ علی گڑھ میں مقیم ڈاکٹر مختار الدین احمد اور ڈاکٹر نذیر احمد ودیگر اہل علم وتحقیق سے بھی۔ وہ بڑی وضع دار شخصیت کے مالک تھے، زندگی بھر انہوں نے اپنی وضعداری قائم رکھی، خط لکھنے میں بھی وہ وضعداری نبھاتے رہے، ان کا زندگی بھر کا معمول تھا کہ خطوں کا جواب عام طور پر وہ فوراً دیتے۔نہ صرف خط اپنے ہاتھ سے لکھتے بلکہ لفافے پر مکتوب الیہ کا پتہ اور لفافے کی پشت پر اپنا پتہ بھی خود ہی لکھتے۔وہ خطوط نگاری میں پوری کوشش کرتے کہ سائل کی مکمل تشفی ہو اور اسے تشنگی کا احساس نہ رہے۔اسی طرح اگر بلوچ صاحب کو کوئی شخص کتاب یا رسالہ بھیجتا تو اسے شکریے کا خط ضرور لکھتے اور اس علمی کام پر مذکورہ شخص کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے۔ بلوچ صاحب اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ ہمارے معاشرے میں علمی وتحقیقی کام کرنا کس قدر مشکل ہے۔وہ خود زندگی بھر ان مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے اور علمی وتحقیقی منصوبوں کو بڑی کامیابی سے مکمل کرتے رہے جن کی تفصیلات گزشتہ ابواب میں پیش کی جا چکی ہیں۔جب کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت کمانا ہی اکثریت کا شعار ہو جائے تو علم وتحقیق بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور ڈاکٹر بلوچ اور دیگر اہل نظر کی رائے میں ہماری عدم ترقی کی بڑی وجہ بھی یہی افسوس ناک حقیقت ہے کہ ہم نے اب تک علم اور تعلیم کو وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ بجا طور پر حقدار ہیں۔بلوچ صاحب کے خطوط میں اس صورت حال پر افسوس اور علمی ماحول پیدا کرنے کی خواہش ظاہر ہے۔وہ عموماً مختصر خطوط لکھتے لیکن یہ مختصر خطوط بھی جامعیت کا رنگ لیے ہوتے اور بات مکمل اور واضح ہو جاتی۔ضرورت پڑنے پر سائل کو تفصیل سے بھی لکھتے۔وہ نثر میں تکلف وتصنع کے قائل نہ

تھے اور نہ ہی مسجع و مرصع زبان لکھتے تھے۔ ان کی نثر سادہ و پرکار ہوتی تھی۔ یہی انداز ان کے خطوں میں بھی نمایاں ہے وہ چھوٹے چھوٹے فقرے لکھتے تھے اور بہت سادہ لیکن واضح انداز میں اپنی بات مکتوب الیہ تک پہنچانے پر بھر پور قدرت رکھتے تھے۔ موضوع کی مناسبت سے عربی و فارسی اشعار، اقوال اور الفاظ بھی لکھتے۔ ان خطوں میں علمی و ادبی کاموں کا ذکر بھی ہے اور خلوص و محبت کی باتیں بھی ہیں، کہیں کہیں ظرافت کے پھول بھی جھڑتے ہیں۔ ان محاسن کے علاوہ بلوچ صاحب کے خطوط میں ہمیں علمی و تحقیقی نکات، انسانی ہمدردی، چھوٹوں کی علمی امداد، حوصلہ افزائی اور اسی طرح کے بہت سے موضوعات پر مفید معلومات ملتی ہیں۔

پاکستانی اہل علم و تحقیق سے علمی روابط

علامہ عبدالعزیز میمن عربی زبان و ادب کے بین الاقوامی شہرت یافتہ عالم اور بلوچ صاحب کے علی گڑھ میں استاد محترم تھے۔ وہ ۲۳/ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو گونڈل (راجکوٹ) میں پیدا ہوئے اور مورخہ ۲۷/ اکتوبر ۱۹۷۸ء کراچی میں وفات پائی۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کے استاد محترم علامہ عبدالعزیز میمن کے اردو خطوط بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ میں ہمیں درج ذیل عبارات ملتی ہیں:

> ''آپ کبھی یہ خیال نہ کریں کہ میں آپ کو بھولوں گا۔ میرے دل میں آپ کے لیے بڑی جگہ ہے۔'' (خط مورخہ 22-9-1947)(1)
>
> ''آپ امریکہ کے عربی مطبوعات مرآۃ الزمان، اعیان الأعیان حتّٰی وغیرہ کے نسخے ڈھونڈیے سستی مل سکیں تو میرے لیے لے لیں۔ نیز دیگر مطبوعات کا پتہ دیں۔ یہاں (علی گڑھ میں) آپ کے حلقہ کے اکثر آدمی آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔'' (خط مورخہ 20-11-1946)
>
> ''پرسوں آپ کا خط ملا غنیمت ہے کہ آپ نے یاد تو کرلیا۔ اپنے اعزہ کثرت سے فراموش کرتے جارہے ہیں۔ الامن عصمھم اللّٰہ۔ زندگی سراسر غیر دلچسپ اور برباد ہے۔ آپ کی علمی فتوحات کا حال پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی'' (خط مورخہ 24-2-1954)(2)

علامہ میمن اور بلوچ صاحب کے قریبی روابط کے لیے ملاحظہ فرمائیے ''گلشن اردو'' مرتبہ محمد راشد شیخ میں بلوچ صاحب کا مضمون ''افاداتِ میمنی''۔ علامہ میمن کے مفصل حالات اور علمی خدمات کے لیے ملاحظہ فرمائیے ''علامہ عبدالعزیز میمن۔ سوانح اور علمی خدمات'' از محمد راشد شیخ، شایع کردہ 'قرطاس' کراچی ۲۰۱۲

ڈاکٹر محمد حمید اللہ عالم اسلام کے نامور محقق، مصنف اور کئی زبانوں کے ماہر۔ پیدائش: ۱۹ رفروری ۱۹۰۸ء حیدر آباد دکن، وفات: ۱۷ ردسمبر ۲۰۰۳ء فلوریڈا (امریکہ)۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے درمیان طویل عرصے تک علمی روابط رہے۔ جب ڈاکٹر محمد حمید اللہ ابوحنیفہ الدنیوری کی کتاب ''کتاب النبات'' پر تحقیق میں مصروف تھے تو انھیں ایک حوالہ ملا کہ سندھ کے ساحلی علاقوں میں ایک درخت پایا جاتا ہے جس سے رنگ حاصل کیا جاتا تھا۔ انھوں نے اس درخت کی تفصیلات کی خاطر ڈاکٹر بلوچ کو خط لکھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر بلوچ نے ایک کشتی کرائے پر حاصل کی اور فوٹو گرافر کا بھی انتظام کیا اور بڑی تلاش و جستجو کے بعد ساحلی علاقوں میں اس درخت کو دریافت کر لیا اور اس کی تصاویر بھی حاصل کیں۔ پیش نظر خط بنام ڈاکٹر محمد حمید اللہ مورخہ 8-6-1965 میں ڈاکٹر بلوچ نے اسی علمی مہم اور مذکورہ درخت کی تفصیلات بیان کی ہیں

"I am sorry I am writing late because the university was coming to close on May 31for a long vacation, and hence I remained busy with completing the reports and the record. Here is the good news. As expedition in search of al-Kandala was organized from May 10to12.I took the artist and the photographer with me as well as the local boatmen who guided me through the costal channels. The following facts came to light :

1.There are two trees from the bark of which dye is extracted: one is chaunir(چانئر)or chunary(چونری)and the other is Kararri

.(کرڑی)The Kararri contain the dye 75%more than the Chaunir, and therefore, it can be presumed that Kararri was exploited more for commercial purpose in older days.

2.As far as it is known, these trees grow only on the coast-line of Sindh in the belt extending from Son-Miani(20miles west of Karachi)in the west of"Bhuri Darya,"which is a coastal sea channel, some 80miles east of Karachi in the east. They grow only on the interior sea channels on sea water, but cannot grow wherever the sweet water of the Indus reaches .

3.So far as the Kararri tree is concerned, not only the barks but also the stalk and its wood contain dye. The tree, at full length, grows up to 10feet, though the average ones grow from 4to 6feet. Younger or full grown, all contain the dye which some fishermen on the interior of the coastline still use for dying their nets. Skin are also dyed and they are made into bages, air is then pumped into them and then they are used for swimming across the sea channels .

4.The color of the dye is light-red and brown resembling the katha which is used in paan .

5.I took photo of both Chaunnir and Kararri and also brought the small size trees(about 4½feet height) to Hyderabad. I sent

in the parts(the branches, the blossom, etc) to our herbarium in the Botany Department of the University and the Kararri was identified as Ceriops Candolleana Aru belonging to the family of Rhizophora to which also belongs the Chaunir. Now obviously Kararri identified as Ceriops Candolleana Aru is our Al-Kandla. I offer an explanation for this name known to the Arabs. The present pronunciation(کرڑی)is obviously the variation, thought usage in the last many centuries, of the more correct Sindhi name Kandarri. This could be pronounced in the Arabic form as(کندلی)as(ر)or(و)often gets changed into(ل)as a phonetic variation, which the Arabs pronounced as(الکندلی)or(الکندلاء)as it is obtained in the present texts. In some texts if you find it written as(الکندلی)or(الکندلٰی)it should be taken to be more akin to the original indigenous pronunciation.Very soon, I hope to mail to you a sample of the dye and an original photography or colored photograph of the painting of Kararri.

In view of these findings, my earlier note to you in which I thought Chaunir was alkandala, should be treated as incorrect.(3)

ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوتہ کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ 8-10-1973 جس میں ڈاکٹر حمیداللہ کی حیدرآباد آمد اور ان کی خاطر

انتظامات اور پیر جھنڈو لائبریری دکھانے کا ذکر کیا ہے:

"On Thursday, October 11,1973Dr.Hamidullah is reaching at Hyderabad in the evening by Mehran Express. I hope you kindly make necessary arrangement at the Railway Station to receive him and for his stay in the night at Hyderabad. Therefore Doctor Sahib wants to spend two days at both the libraries of Pir Jhando. It is expected that he will be enjoying the hospitality of both the Pir Sahiban. For your information Doctor Sahib only takes food after Iftar but is not in the habit of taking Sehri.(4)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ 1982 میں دورۂ پاکستان کے دوران حیدرآباد بھی گئے تھے لیکن اس وقت ڈاکٹر بلوچ اسلام آباد میں مقیم تھے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنے خط مورخہ 1982-1-20 میں اس حوالے سے لکھا تھا:

"I have had a most pleasant visit to Hyderabad, where the only thing lacking was your presence during my last visit to this place and Pir Jhanda. Everybody was over kind to me. Dr Moghul even came to Karachi to fetch me. I thank you most sincerely for all you have done to honour me".(5)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ مورخہ 1998-10 -8 جس میں پیرس کی عظیم الشان لائبریری Bibliothique National جانے کا ذکر ہے:

"I have just revived communication from Bibliothique National asking for confirmation of payment so that copying

work may be started. It is Saturday today(the library is closed.(So will go Insha Allah on Monday and make the payment. The required payment is less than our initial estimation. Should I send the remaining amount by post May you be in good health with the blessings of God".(6)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے بلوچ صاحب کے نام خطوط میں ہمیں درج ذیل عبارات ملتی ہیں(7):

''آج کی ڈاک میں آپ کی لامتناہی کرم فرمائیوں کا تازہ ثبوت ملا اور پنجابی ترجمہ قرآن مجید کا نسخہ پہنچا۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔''(خط مورخہ 19-8-1967)

''عنایت نامہ اور ہمراہ ملفوفہ ترجمہ دونوں ملے۔ مسرت بے پایاں ہے۔ خدا آپ کو ہزاروں ہزار جزائے خیر دے۔''(خط مورخہ 6-6-1971)

''آپ نے علم کی بڑی خدمت کی ہے۔ خدا آپ کو حسنات دارین عطا فرمائے ان شاء اللہ۔ ۳۰/ جون کے بعد آپ کا علمی کام جاری رہے گا اور اس پر اللہ آپ کو نوازتا رہے گا۔''(خط مورخہ 4-6-1989)

علامہ آئی آئی قاضی کا خط جنوری 1964 بنام ڈاکٹر بلوچ:

"Modern 'Magazine' is only irrational corruption of(مخزن) and Admiral of Amirul-Bahr(امیر البحر).But, alas, our half-educated heads are drunk with the word modern. No possible theory can improve on(tarbiyat, tadeeb, ta'leem(as to that matter, we present one small book to them, that is called the Quran they, the moderns have taken from it already, what all they possess(let them look up in their libraries) if they

have any book before 600to 800AD nay even 1000 AD all else is product of the Quran, directly or indirectly and I swear by Him that wrought me in existence that there is so much yet that were they to know no problem on human earth will remain hidden. Nay it will clear like daylight(Wadh-dhuhaa) والضحیٰ is the proof of it. Muslamans are being kicked, abused, and butchered all over the world".(8)

علامہ آئی آئی قاضی کا خط مورخہ بنام ڈاکٹر بلوچ مورخہ 6-11-1965

"It was so kind of you(husband and wife) to come. But our plight you can not conceive. Poor mother had almost despaired of life. The pain was so severe. While I was almost paralyzed, her nervous condition was so dangerous that I could not even speak of going out of the room. Pray for us that we are soon able to trouble you to come over to us and give us the pleasure of seeing you both. God bless and preserve you".(9)

علامہ آئی آئی قاضی کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ (بلا تاریخ)

"Thanks so much for the(surs).Brohi's letter has just arrived with the introduction. He has written quite a long preface".

"Mother wants you to come this evening and hopes to show you his letter and talk the matter over with you".(10)

شمس العلما ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ مورخہ 1957-8-1

"It was a pleasure to see you yesterday at the Board's meeting. Pity we could not get time to talk to each other. I had so many things to tell you. Let me reassure you that nothing worldly can break the bonds of friendship between us, as it is not based on any ulterior motive Let me also assure you that whenever there is anything concerning you, I always remain quite and never say anything, yet people are apt to misinterpret and to misjudge".(11)

اے کے بروہی کے نام ڈاکٹر بلوچ کا خط بابت1978

"It is an open secret now that the present Vice Chancellor (Mr.Shaikh Ayaz) has failed to develop the University. During his tenure of office since 23January 1976,the very complexion and the concept of University has changed adversely due to the facts of omission and commission. Unqualified, incompetent and influential individuals were appointed to the key posts of Pro-Vice Chancellor, Registrar, and Director of Finance funds were squandered for personal ends".(12)

ڈاکٹر سیّد عبداللہ، اردو، فارسی کے محقق، مصنف اور اورینٹل کالج لاہور کے سابق پرنسپل نیز اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کے مدیر اعلیٰ تھے۔ وہ علامہ عبدالعزیز میمن کے نامور شاگرد اور ڈاکٹر بلوچ کے استاد بھائی بھی تھے۔ ان کی پیدائش: ۵/اپریل ۱۹۰۴ء بمقام منگلور (ضلع مانسہرہ) میں اور وفات: ۱۴/اگست ۱۹۸۶ء لاہور

کو لاہور میں ہوئی۔ وہ ڈاکٹر بلوچ کے نام خط مورخہ 1978-2-5 میں مثنوی مولانا روم کے حوالے سے بلوچ صاحب کو لکھتے ہیں:

''آپ کا ۳۱/جنوری ۱۹۷۸ء کا مودت نامہ ملا۔ بہت سے مآخذ دیکھے۔ رومی رحمتہ اللہ علیہ کے سلسلہ میں ان کے قریب تر زمانے کی برصغیر میں تصنیف ہونے والی کتب اور مختلف فہارس پر از سرِ نو نگاہ ڈالی گئی مگر ۸۰۰ھ سے پہلے کا کوئی حوالہ مل نہیں سکا۔ سعدی کا ذکر ''فوائد الفواد'' میں موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں یہاں کے لوگ ان سے اچھی طرح متعارف ہو چکے تھے۔ شہزادہ محمد نے اسی لئے انہیں ملتان آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے رومی کے اثرات بعد میں پہنچے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مثنوی کے اثرات ھرات سے ہندوستان میں پہنچے۔ جامی نے مثنوی کے دو پہلو کی شرح لکھی جس کا ذکر کتابوں میں آتا ہے۔ لیکن صحیح معنوں میں (میری موجودہ معلومات کے مطابق) دورِ اکبری میں مثنوی کو قبول عام حاصل ہوا چنانچہ ابوالفضل نے اپنی انشا کے دفتر سوم میں دو تین جگہ ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد مغلیہ دور میں آخر تک شرحیں لکھی جاتی رہیں۔ اورنگ زیب نے خاص دلچسپی لی (یہ تفصیلات میری کتاب ''مسائلِ اقبال'' میں (مضمون تحریک مطالعہ اقبال میں رومی کا مقام) موجود ہیں۔ اگر آپ کے پاس یہ کتاب موجود نہ ہو تو میں بھجوادوں۔''(13)

اسی طرح اپنے خط مورخہ 1979-7-18 میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے بلوچ صاحب کو قومی ادارہ برائے تاریخ و ثقافت کی سربراہی کے عہدے پر فائز ہونے پر مبارک باد دی اور بعض قیمتی مشورے بھی دیے۔ اس حوالے سے انھوں نے لکھا تھا:

''مشفقی شفیقی محبی محترمی مکرمی۔ کس کس لقب سے یاد کروں۔ جذباتِ محبت زیادہ ہیں اور الفاظ اور پیرایہ ہائے بیان کم۔ بہرحال سلام مسنون قبول کیجئے۔ کیونکہ یہی سلام اخلاص و مہر و محبت و وداد کا اسلامی انداز بیان ہے۔

گرامی نامہ تازترین ملا ہے۔ یہ معلوم ہوکر بہت خوشی ہوئی کہ آپ ادارہ تحقیق تاریخ وثقافت کے چیئر مین مقرر ہو گئے ہیں اور یکم جولائی ۱۹۷۹ء سے کام بھی شروع کیا ہے

بریں مژدہ گرجاں فشانم رواست

آپ نے ۱۱، جولائی کومرکزی اردو بورڈ کے اجلاس میں مشرف بہ ملاقات فرمایا تھا لیکن اس وقت شاید موقع نہ ملا کہ آپ مجھے یہ خوشخبری سناتے ورنہ میں معانقۂ جوشِ مسرت کرتا اور آپ کی پیشانی پر بوسہ دیتا اور دل کی خوشی کو معرضِ اظہار میں لاتا۔ بہرحال اب مبارکباد ہے آپ ہی کو نہیں خود کو بھی۔

ہم اورینٹل کالج کے فیض یاب لوگ اصلاً مورخ ہی ہیں۔ تاریخ خاص ہو یا لسانیات ہو، یا مخطوطہ شناسی ہو ہم جہاں بھی ہوتے ہیں ذہناً مورخ ہوتے ہیں۔ تاریخ ہمارا قومی مضمون ہے۔ مگر ہم یہ دیکھ کر متاسف ہوتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد ہم نے دین کے بعد اپنے سب سے اہم اور ضروری مضمون تاریخ کی طرف توجہ نہیں کی۔ برطانوی تعلیم نے ہمیں تاریخ کے بارے میں بے حس بنا دیا۔ انگریزوں نے ایلیٹ اور ڈاؤسن پیدا کیے ۔ ہندوؤں نے سرکار، ایشوری پرشاد، قانو ن گو، بینی پرشاد وغیرہ ابھارے ۔ ہمارے یہاں شبلی ایک دبستان کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے لیکن پیچھے پھینک دیے گئے۔ اور کوئی بڑا کام نہ ہوسکا۔

کہنا یہ ہے کہ تاریخ کی تحقیق کی ایسی عمارت تعمیر کیجئے جو مسلم تہذیب وتمدن کے معاشریاتی (Sociological) پس منظر کے ساتھ نتائج تاریخی کا ایک نیا قصر بن جائے۔ یہاں سرسری کام ہوتے ہیں اور ایک ایک کام کئی کئی جگہوں میں ہو رہا ہوتا ہے ۔ برصغیر کے کلچر کے سلسلے میں متعدد مخطوطے میرے علم میں ہیں جن کا ایڈیٹنگ، ترجمہ اور تعلیقہ نگاری ہوسکتی ہے ۔ عالمگیر کے بعد کا دور ہمارے یہاں ''طاؤس ورباب آخر'' کا زمانہ تھا گویا کلچر کے معاصریہ تصور کے مطابق اعلیٰ بلوغ ونبوغ کا زمانہ تھا۔ اس کی

معاشرتی تشریح براہ راست ہماری موجودہ شعوریات سے تعلق رکھتی ہے۔ معلوم نہیں آپ کے پلان کیا ہیں مگر جو کچھ ہو دوررس ہو، ہمہ گیر ہو اور گہرا ہو۔ میں آپ کی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں۔'' (14)

حکیم محمد سعید، پاکستان کے نامور طبیب، دانشور، مصنف اور بانی ہمدرد فاؤنڈیشن تھے۔ ان کی پیدائش: ۹/جنوری ۱۹۲۰ء بمقام دہلی، اور وفات: ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۸ء کراچی میں ہوئی۔ حکیم محمد سعید مرحوم کے بلوچ صاحب سے تاعمر قریبی روابط رہے یہاں تک کہ جب حکیم صاحب کو گورنر سندھ کے عہدے پر فائز کیا گیا انھوں نے وزارت تعلیم کا عہدہ سنبھالنے کے لیے ڈاکٹر بلوچ صاحب ہی سے گزارش کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے حکیم صاحب کی اس پیشکش کو قبول کیا تھا جس کی تفصیلات گزشتہ صفحات میں آچکی ہیں۔ حکیم صاحب نے اپنے خط بابت 1983 میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کو لکھا تھا:

''آپ کی فکرِ بلیغ نے اور آپ کی نگاہ عمیق نے یقیناً پاکستان میں معیارات اخلاق کا جائزہ لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ زوال اخلاق اور انحطاط کردار نے جو وبائی صورت اختیار کی ہے اس پر آپ کو یقیناً تشویش ہے۔'' (15)

حکیم صاحب نے اپنے خط بابت 22-4-1982 میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کو لکھا تھا:

''ہم نے ایک خاکۂ عمل مرتب کیا ہے۔ میں اپنی اس تحریر کے ساتھ منسلک کرتا ہوں۔ یہ حتمی نہیں ہے اس میں آپ کے مشوروں کی شدید ضرورت ہے۔

آپ جان سکتے ہیں کہ میں آپ کے جواب کے لیے کس درجہ بے چین ہوں گا۔ آپ کے جلد از جلد مشورے کے بعد میں ''مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حتمی شکل دے دوں گا اور حسبِ سابق اس کے انتظامات میں آپ کے مشوروں اور اپنے پرخلوص رفقا کے ساتھ مصروف ہو جاؤں گا۔'' (16)

حکیم صاحب نے اپنے ایک خط میں ڈاکٹر بلوچ صاحب کو لکھا تھا:

''میں نے (ہمدرد ایجوکیشن) سوسائٹی کے مقاصد وضع کیے ہیں۔ میں اپنی اس تحریر کے ساتھ

مقاصد اردو/ انگریزی میں آپ کی خدمت میں اس فوری درخواست کے ساتھ پیش کر رہا ہوں کہ ازراہِ کرم بہ حیثیت ماہرِ تعلیم آپ اس میں حذف و اضافہ تجویز فرما دیجئے اور جس قدر ممکن ہو جلد مجھے واپس کر دیجئے تا کہ سوسائٹی کے رجسٹریشن میں ایک روز کی بھی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔"(17)

ڈاکٹر بلوچ کا خط بنام حکیم محمد سعید مورخہ 21-11-1986 جس میں محمد بن قاسم کی فوج کے راستے اور حب ندی کے نزدیک قیام کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیا:

"It may not be correct to place on record that:none of us has ever tried to identified the actual route adopted by Ibn Qasim".It may not be out of place to point that I gave my best thought and attention to it for some years and finally determined the route in its more significant direction-wise details. It is indicated in the map given in my recent edition of 'Fathnama-i-Sindh in 1982.

Manjabri is not Manghopir. Therefore, it will be more correct to refer to Manghopir as such, without quating it with Manjabri".So far as your inquiry is concerned, it may be said that though the minute details of Muhammad bin Qasim;s approach to Debal are not available, it is but certain that advancing from the side of Bela, he must encamped on or near to the Hab river to ensure adequate supply of sweet water. He was still 45miles away from Debal, but Hab is the only

perennial hilly torrent to the west of Debal since Lyari, Malir and Ghaghar remain dry for most part of the year. Even if he had another advance camp near Debal for purpose of assault, it is reasonable to presume that his base camp was near to Hab.So it is quite possible that he might have encamped on the site of"Madinatul Hikmat" or somewhere in its close viscinity".(18)

ڈاکٹر بلوچ کا خط بنام حکیم محمد سعید مورخہ 29-7-1988 جس میں عالمی امن سے متعلق کتاب بھیجنے پر شکریہ ادا کیا:

"On a higher plane, the book demonstrates your commendable initiative at international level to promote man's responsibility at this juncture of world history for peace and creation of consciousness that peace is in peril. Because of your sincere effort, the response has also been commendable. The views expressed by knowledgeable Scholars and men of goodwill from a number of countries will go a long way to underline the fact that during the eighties of the 20th century there were many sincere souls who made their humble contribution in words and views to serve the cause of peace and humanity".(19)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ماہر تعلیم، مصنف، ماہر اقبالیات اور مفکر تھے۔ان کی پیدائش: ۱۹۰۴ء بمقام جموں اور وفات: ۲۹/نومبر ۱۹۶۹ء کراچی میں ہوئی۔وہ مورخہ 8-4-1961 کو تحریر کردہ خط میں ڈاکٹر بلوچ

سے رہنمائی طلب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے تعلیم پر ایک کتاب لکھی ہے جو اب بفضل خدا مکمل ہو کر ٹائپ ہو گئی ہے۔ اس کا عنوان ہے "The First Principles of Educatoin" کتاب کے پانچ ابواب ہیں، جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

Chap. 1 The Confusion of modern Education- Num, Dewey

Chap 2. The urge for educational growth

Chap 3. The misinterpretation of the urge for educational growth-Mc Dongall, Freud, Adler and Marx

Chap 4. The nature of the educational process

Chap 5. The conditions of perfect Educational growth

میں اس کتاب کو Education میں Ph.D کے لئے کسی یونیورسٹی میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

کیا آپ مجھے اس سلسلہ میں کوئی راہنمائی کر سکیں گے۔ اگر سندھ یونیورسٹی میں کتاب پیش کی جا سکے تو مجھے بتایئے اس کے لیے کیا اقدامات کرنے کی ضرورت ہوگی۔

والسلام

امید کہ آپ بواپسی ڈاک جواب سے سرفراز فرمائیں گے۔''(20)

ڈاکٹر وحید قریشی اردو اور فارسی زبانوں کے نامور محقق اور سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور تھے۔ ان کی پیدائش: ۱۴رفروری ۱۹۲۵ء کو اور وفات: ۱۷را کتوبر ۲۰۰۹ء کو لاہور میں ہوئی۔ ان کے خط مورخہ 4-8-1980 میں ہمیں درج ذیل عبارت ملتی ہے:

''علوم وادبیات کی دنیا میں آپ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ یہ مجلس آپ کی ذات سے یہ

توقع بجاطور پر وابستہ رکھتی ہے کہ آپ پروفیسر شیرانی کے حوالے سے کسی نہ کسی موضوع پر ایک علمی مقالہ یا مضمون تحریر فرمائیں گے۔''(21)

نور احمد خان فریدی ادیب، محقق اور مورخ تھے۔ان کی پیدائش :۱۵ر ستمبر ۱۹۰۸ء بمقام ملتان اوروفات:۹ر اکتوبر ۱۹۹۴ء ملتان میں ہوئی۔ان کے بلوچ صاحب کے نام خطوط میں ہمیں یہ عبارات ملتی ہیں:

''آپ سے استدعا ہے کہ مجھے اجازت دیں تاکہ یہ کتابت شدہ مسودہ جناب کو بھیجوں، تاکہ آپ خود بھی ملاحظہ فرمائیں اور تاریخ وثقافت کے ذمہ دار حضرات بھی دیکھ لیں۔اگر پسند آئے تو اس کی طباعت کے لیے گورنمنٹ سے مالی امداد دلائیں ورنہ اسے جلا دیں۔''(خط مورخہ 2-6-1982)(22)

''جناب کی سفارش سے ہی اکادمی ادبیات پاکستان نے احقر کو 700 روپے ماہوار بطور الاؤنس دیے تھے جواب تک مل رہے ہیں لیکن ہر سال جون میں نئے مالی سال کے لیے اس کی تجدید ہوتی ہے اور سوائے آپ کے نہ اس ماحول میں میرا نہ کوئی واقف نہ سفارشی۔''(خط مورخہ 20-6-1983)(23)

''ازراہ کرم جعفر بن محمد علوی کی ملتان پر حکومت کے بارے میں اپنی تحقیق سے مطلع فرمائیں کہ کب سے کب تک رہی۔ابن اثیر کے معاملہ کو بھی صاف کریں۔ابن خلدون کتب ثانی جلد نہم کا دعویٰ ہے کہ جعفر کا چچازاد بھائی عبدالرحمن اپنے اعزا و اقارب سمیت یمن میں آباد ہوگیا تھا۔''(خط بلا تاریخ) (24)

اسی طرح نامور شاعر، ادیب اور سابق ڈائرکٹر مجلس ترقی ادب لاہور، احمد ندیم قاسمی (پیدائش: ۲۰ر نومبر ۱۹۱۶ء بمقام خوشاب، وفات: ۱۰ر جولائی ۲۰۰۶ء لاہور) کے بلوچ صاحب کے نام خط 26-5-1980 میں ہمیں مجلس ترقی ادب کی خاطر معانت کے حوالے سے یہ عبارت ملتی ہے:

''مجلس ترقی ادب کا سا ادارہ جس نے سرکاری گرانٹ سے چلنے والے سبھی اداروں کے مقابے میں قابل رشک کام کیا ہے اور جس نے دنیا بھر میں پاکستان کی

نیک نامی کا سامان کیا ہے، آج کل زیرِ عتاب ہے ۔اس کی جو گرانٹ (دو لاکھ روپے) گذشتہ جون میں منظور ہوئی تھی وہ آج تک release نہیں ہوئی اور میں کتابوں کی فروخت یا بنک سے O/D حاصل کر کے ادارے کے مشاہرے ادا کر رہا ہوں ۔ایک ماہ بعد یہ گرانٹ Lapse ہو جائے گی اور نئے بجٹ میں شاید ہی اس منصوبے کے لیے کچھ رقم مخصوص ہو سکے ۔مجلس پر اس عتاب کا سبب صرف صوبائی سیکرٹری اطلاعات و ثقافت ہیں جو فرماتے ہیں کہ اس ادارے کی کتابیں تو بکتی نہیں ہیں پھر اسے گرانٹ کیوں دی جاتی ہے ،جب کہ یہ ادارہ قائم ہی اس لیے ہوا تھا کہ جو کتابیں عام ناشرین نہیں چھاپتے وہ یہ ادارہ سستی قیمت پر چھاپتا رہے تا کہ علم کا خلا نہ پیدا ہو۔ کیا آپ اس ضمن میں فوری طور پر ہماری امداد فرما سکتے ہیں کہ یہ گرانٹ release ہو اور آئندہ سال کی منظور ہو؟''(25)

احمد ندیم قاسمی کے بلوچ صاحب کے نام خط مورخہ 10-4-1988 میں ''دیوان شوق افزا عرف دیوانِ صابر'' مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ سے متعلق درج ذیل عبارت ملتی ہے:

''آپ کا لکھا ہوا سوانحی مقدمہ بلاشبہ ایک کارنامہ ہے ۔آپ نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے ۔دیوان پر تنقیدی مقدمہ بھی ہونا چاہیے اور جب اس کا موقع آئے گا تو میں اس سلسلے میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا۔اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی درکار ہے ۔''(خط مورخہ 2-6-1982)(26)

سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن، نامور مورخ، محقق سابق ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ اور مدیر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ تھے۔ان کی پیدائش: ۱۹۱۱ء بمقام دیسنہ (بہار) اور وفات: ۱۸؍نومبر ۱۹۸۷ء بمقام لکھنؤ میں ہوئی۔ان کے ڈاکٹر بلوچ صاحب کے نام خط مورخہ 20-3-1982 میں ہمیں درج ذیل عبارت ملتی ہے:

''دارالمصنفین کے بین الاقوامی سیمینار میں آپ تشریف لاتے تو مجھ کو کیسی خوشی ہوتی ۔اس ویرانے میں چاندنی چٹک جاتی ۔آپ تشریف نہیں لائے لیکن اس سیمینار میں آپ کا ذکر بار بار آتا رہا۔سیمینار میں منظور کی گئی تجاویز کی کاپی آپ کی خدمت میں پیش ہے۔امید ہے آپ قبول

فرمائیں گے اور ہمیں ضروری مشوروں سے بھی نوازیں گے۔''(27)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کا قریبی تعلق جناب ممتاز حسن سے بھی تاحین حیات رہا۔ ممتاز حسن مرحوم پاکستان میں اہل علم اور علمی و تحقیقی اداروں کے بہت بڑے سرپرست تھے۔ اس کے علاوہ وہ معروف ماہر اقتصادیات، اسٹیٹ بینک کے سابق گورنر و دیگر اہم عہدوں پر فائز رہے۔ ان کی پیدائش: ۶/ اگست ۱۹۰۷ء کو اور وفات: ۲۸/ اکتوبر ۱۹۷۴ء بمقام کراچی ہوئی۔ ایک موقع پر جب ممتاز حسن کراچی سے حیدرآباد آئے اور بلوچ صاحب کو اطلاع ان کے واپس جانے کے بعد ملی تو کس اپنائیت سے ان سے اپنے خط مورخہ 17-7-1965 میں اس بات کا ذکر کیا:

''قبلہ علامہ قاضی صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ یہاں حیدرآباد تشریف لائے اور دیگر ذرائع سے معلوم ہوا کہ یہاں آپ کا شاید ایک رات کے لیے قیام بھی رہا۔ جس دن آپ یہاں تشریف لائے میں حیدرآباد میں ہی تھا البتہ شاید شام کو نواب شاہ چلا گیا تھا۔ آپ سے والہانہ محبت اور عقیدت ستا رہی ہے کہ اس مرتبہ آپ کی آمد کی اطلاع بندہ کو کیوں نہ ملی۔ ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے، والی کیفیت ہے۔ یہ برداشت نہ ہوا اس لیے یہ چند الفاظ بطور حال دل لکھ رہا ہوں۔''(28)

ممتاز حسن مرحوم کے بارے میں بلوچ صاحب کے معلومات افزا مضمون کے لیے ملاحظہ فرمائیں 'گلشنِ اردو' مرتبہ محمد راشد شیخ

جیسا کہ ذکر کیا گیا، بلوچ صاحب کو کوئی شخص کوئی کتاب یا رسالہ بھجواتا تو اس کا شکریہ بھی ادا کرتے اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ مثلاً سیّد عماد الدین قادری صاحب نے بلوچ صاحب کے لیے ترکی سے کتاب منگوا کر ان کی خدمت میں پیش کی تو کس محبت سے اپنے خط مورخہ 14-4-2004 میں ان کا شکریہ ادا کیا:

''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔ آپ کا کرم نامہ مورخہ ۱۱/ اپریل ۲۰۰۴ء موصول ہوا۔ نہایت خوشی ہوئی کہ آپ جیسے بلند کردار ذمہ دار احباب ہمارے معاشرے

میں باقی ہیں جو ایفائے عہد کو اہمیت دیتے ہیں۔ میں اپنی گزارش بھول چکا تھا لیکن آپ نے اس کو یاد رکھا۔ میں بیحد ممنون ہوں کہ آپ نے میری خاطر اتنی زحمت اٹھائی۔ کتاب کی قیمت، ڈاک کا خرچ اور باقی اخراجات ملا کر مجھے بذریعہ وی پی بھجوادیں۔"(29)

اسی طرح جب اردو کے نامور محقق جناب مشفق خواجہ نے کتاب 'معربات رشیدی' کے ترجمے کا نسخہ بلوچ صاحب کو پیش کیا تو ڈاکٹر بلوچ نے اپنے خط مورخہ 2-8-2004 میں نہ صرف خواجہ صاحب کا شکریہ ادا کیا بلکہ مترجم یعنی ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب کی محنت کی ان الفاظ میں تعریف کی:

"میں ممنون ہوں کہ آپ نے رسالہ 'معربات رشیدی' کا تحفہ عنایت فرمایا۔ مبارک ہو کہ ادارۂ یادگار غالب سے اشاعت کے لیے آپ نے اس علمی کتاب کو منتخب فرمایا اور مزید مبارک باد کہ آپ نے جناب ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب کو اس کے اردو ترجمے اور مزید تحقیقات کے لیے تکلیف دی۔ ان کے حواشی اور تعلیقات نے آپ کی اس اشاعت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ تحقیق کی رو سے یہ ایک مثالی ترجمہ ہے اور مشعل راہ ماضی کے متون کے تراجم کے لیے۔" (30)

سیّد انور حسین نفیسی الحسینی، پاکستان کے نامور خطاط، شیخ طریقت، مصنف، شاعر اور دینی اداروں کے سرپرست تھے۔ ان کی پیدائش: ۱۱ر مارچ ۱۹۳۳ء کو اور وفات: ۵ر فروری ۲۰۰۸ء کو لاہور میں ہوئی۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب نے ان سے خطاطی بھی کرائی تھی خصوصاً اپنے گاؤں قریہ جعفر خان لغاری کی جامع مسجد کے لیے اور سو عظیم کتب کے ٹائٹلوں کے لیے۔ بلوچ صاحب کی عادت تھی کہ اگر کسی اہل تعلق یا اس کے متعلقین میں سے کوئی فرد وفات پا جاتا تو تعزیتی خط لکھتے۔ سیّد نفیس الحسینیؒ کے صاحبزادے حافظ سیّد انیس الحسن کے انتقال پر اپنے خط مورخہ 10-9-2002 میں ان سے درج ذیل الفاظ میں تعزیت کی:

"مجھے اس کا کا علم نہ رہا کہ باری تعالیٰ کی طرف سے آپ کو بڑی آزمائش کے لیے منتخب کیا گیا کہ رفیقۂ حیات کی وفات کے بعد فرزند ارجمند فوت ہوئے۔ یہ خبر حال ہی میں فاضل محترم رشیدی صاحب (کراچی) نے سنائی۔ انسان اپنی خلقت میں ضعیف ہے اس لیے دعا ہے کہ رَبَّنَا لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِہٖ ۔ تاہم رضائے الٰہی

سے اپنے پیاروں کے لیے صبر آزما مراحل مقدر ہوئے۔
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

میں کہ گرویدۂ احسان ہوں، دل وجان سے اس صبر آزما دکھ میں آپ سے شریک ہوں۔ دعا ہے کہ خالقِ اکبر مرحومین کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور بخششوں سے مالامال کرے۔ آمین''(31)

سید نفیس الحسینی کے لیے ملاحظہ فرمائیں ارمغان نفیس اور تذکرۂ خطاطین از محمد راشد شیخ و مقالاتِ خطاطی سیّد نفیس الحسینی مرتبہ محمد راشد شیخ و سیّد انیس الحسینی۔

مولانا اعجاز الحق قدوسی، ادیب، محقق اور صوفیائے کرام کے تذکرہ نگار تھے۔ صوفیائے کرام کے حالات زندگی پر انھوں نے عمر بھر تحقیق کی اور تحقیقات کے نتائج متعدد کتب کی صورت میں شایع کرائے۔ اس کے علاوہ تاریخ سندھ کو تین ضخیم جلدوں میں مرتب کیا جسے اردو سائنس بورڈ (سابقہ مرکزی اردو بورڈ) لاہور نے شایع کیا۔ ان کی پیدائش: جولائی ۱۹۰۵ء بمقام جالندھر ہوئی اور وفات: ۱۹ر فروری ۱۹۸۶ء کراچی میں ہوئی۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی کے ڈاکٹر بلوچ صاحب کے نام خط مورخہ 1981-12-7 میں ہمیں درج ذیل عبارت ملتی ہے:

''گزشتہ خط میں میں نے تحریر کیا تھا کہ آپ کو بالکل اختیار ہے کہ جو حذف و ترمیم کرنا چاہیں تاریخِ سندھ جلد سوم میں وہ کر دیں۔ آپ میرے استادِ معنوی ہیں۔ یہ سب کچھ فیض آپ کا ہے ۔آپ کی کتابوں سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آپ کا ہر حذف و ترمیم میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔''(32)

مولانا اعجاز الحق قدوسی کی آپ بیتی ''میری زندگی کے ۷۵ برس'' کے عنوان سے ۱۹۸۸ء میں کراچی سے شائع ہوئی تھیں۔ اس آپ بیتی میں دیگر شخصیات کے علاوہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی خدمات اور محاسن پر بھی لکھا۔ یہاں ہم اس آپ بیتی سے اہم عبارات نقل کرتے ہیں:

''ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اپنی تعلیمی، علمی، ادبی، تاریخی اور ثقافتی خدمات کی وجہ سے پورے ملک میں غیر معمولی عزت اور احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ ان محققین میں ہیں

جنھوں نے سندھی ادب و تاریخ کی آبیاری کی اور سندھ کے آخری دور کی بعض کتابوں کو ایڈٹ کیا۔ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے سندھ کی ثقافت وتہذیب و معاشرت پر بیسیوں مضامین اور متعدد کتابیں لکھیں۔ان کے ذہن میں بڑی وسعت ہے۔انھوں نے سندھی لوک ادب کو کئی جلدوں میں لکھا،سندھی ادبی بورڈ کی متعدد کتابیں ایڈٹ کی ہیں،سندھی لغت بھی ان کا شاہکار ہے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے تاریخ،ثقافت،موسیقی اور آثار قدیمہ پر انگریزی،فارسی اور عربی میں متعدد مقالے لکھے ہیں اور ایک محقق،عالم اور دانش ور کی حیثیت سے یورپ اور مشرق کے تعلیمی اور ثقافتی اجلاسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی ہے۔ان کی ادبی و علمی خدمات کی بنا پر حکومت پاکستان کی طرف سے انھیں تمغہء پاکستان سونوازا گیا ہے۔

میرا اور ڈاکٹر صاحب کا تعار ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء میں ہوا۔اس وقت ڈاکٹر صاحب سندھی ادبی بورڈ کے ممبر تھے ۔ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ نظام تعلیم معلوم کرنا چاہتا ہوں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد نبوی میں قائم فرمایا تھا۔میں نے کہا کہ اگر چہ اس نظام کی تفصیل مجھے معلوم نہیں،لیکن عہد رسالت کے نظام تعلیم کا مجملاً تذکرہ میں نے اپنی کتاب 'درس گاہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو طالب علم' میں کیا ہے،اگر آپ چاہیں تو وہ کتاب لا دوں۔دوسرے دن میں گھر سے وہ کتاب لے کر آیا۔وہ بہت خوش ہوئے جب میں نے کتاب ان کو دی۔

ڈاکٹر صاحب سے میرے تعلقات مستحکم ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ مرکزی اردو بورڈ نے میری تالیف 'تاریخ سندھ' کے متعلق جب انھیں مبصر بنایا تو انھوں نے بالاستیعاب مسودے کو دیکھ کر بہت اچھی رائے لکھی۔

ڈاکٹر بلوچ پیکرِ شرافت اور مجسمہءحسنِ اخلاق ہیں۔علم کا خاصّہ انکسار ہے اور یہ صفت پوری طرح سے ان میں موجود ہے۔

ڈاکٹر این اے بلوچ بیسیوں علمی تجربوں کی بھٹیوں میں گزر کر سونا ہوئے ہیں۔زندگی کے کتنے موڑ ہیں جن سے گزر کر انھوں نے اس اعلیٰ وارفع منزل کو پایا ہے۔ اب وہ اسلام آباد میں وزارتِ ثقافت حکومتِ پاکستان میں شعبہء تاریخ وثقافت کے چیرمین ہیں۔خدا ان کو سلامت باکرامت رکھے۔''(33)

اسی طرح سیّد انیس شاہ جیلانی کے بلوچ صاحب کے نام خط میں ہمیں درج ذیل عبارت ملتی ہے:

''آپ صاحب علم ہی نہیں ایک بہت اچھے انسان بھی ہیں۔آپ کے بڑے پن کا ثبوت ہم جیسے چھوٹوں پر شفقت فرمانا ہے۔آپ عطیہء کتب میں جس سخاوت سے کام لیتے ہیں وہ آپ کا حصہ ہے اور میں حاضرین اور آنے جانے والوں کو بتا بتا کر اپنی ہوا باندھا کرتا ہوں۔''(34)

ڈاکٹر وقار احمد رضوی کے بلوچ صاحب کے نام خط میں ہمیں درج ذیل عبارت ملتی ہے جس میں قلم کی اس لغزش کا اعتراف کیا ہے جس کی نشان دہی ڈاکٹر بلوچ نے کی تھی:

''مکرمت نامہ باعث عزت افزائی ہوا۔آپ کو میری تصانیف پسند آئیں۔بہت بہت شکریہ۔پروفیسر کرنیکو میرے قلم کی لغزش ہے۔انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں اس جملے کو نکال دوں گا۔چونکہ انہوں نے علامہ میمن صاحب کے ساتھ کام کیا تھا اس لئے میں نے قیاساً لکھ دیا۔اچھا ہوا آپ نے نشاندہی کردی، مجھے اپنی اس خطا پر ندامت اور شرمندگی ہے۔قبلہ میمن صاحب نے مارغولیث کی کتابیں المعرّی کا جواب لکھا تھا۔اس کا اضافہ کردوں گا۔معلومات دہی کے لئے شکر گزار ہوں۔''(35)

سیّد جمیل احمد رضوی محقق، مصنف اور سابق چیف لائبریرین پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ہیں۔ان کے ڈاکٹر بلوچ مرحوم سے بھی روابط رہے جن کی تفصیلات انھوں نے راقم کی گزارش پر تحریری شکل میں روانہ فرمائیں۔سیّد جمیل احمد رضوی صاحب کی یہ تحریری ہم انھی کے الفاظ میں درج کرتے ہیں:

''مجھے یاد پڑتا ہے کہ میری ملاقات ڈاکٹر بلوچ صاحب سے اس وقت ہوئی جب وہ ''چچ نامہ'' پر کام کررہے تھے۔یہ غالباً ۱۹۶۰ء کے عشرے کے اواخر یا ۱۹۷۰ء کے

عشرے کے اوائل کی بات ہے۔ 'چچ نامہ' کا ایک قدیم مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے، ڈاکٹر صاحب اس کا مطالعہ کرنے کے لیے لائبریری میں آیا کرتے تھے۔ ان کو مذکورہ مخطوطہ مطالعہ کے لیے دے دیا جاتا اور ڈاکٹر صاحب کو لائبریری کے کسی حصے میں بٹھا دیا جاتا جہاں مکمل خاموشی ہوتی اور وہ اطمینان کے ساتھ اپنا تحقیقی کام کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب چند بار اس مقصد کے لیے لائبریری میں آئے اور اس طرح انھوں نے اپنا کام مکمل کرلیا۔

ڈاکٹر صاحب کی وضع داری کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بعد میں جب یونیورسٹی میں آتے تو لائبریری میں بھی تشریف لے آتے اور راقم السطور کو ضرور مل کر جاتے۔ اس طرح کی ایک ملاقات کا ذکر میں نے اپنے مقالے بعنوان ''علامہ سید وزیر الحسن عابدی۔ یادداشتوں کے آئینے میں'' مطبوعہ سہ ماہی پیغام آشنا اسلام آباد، شمارہ ۴۷، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء میں کیا ہے۔ اس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

''ابھی لائبریری علامہ اقبال کیمپس (اولڈ کیمپس) والی عمارت میں تھی۔ ایک روز عابدی صاحب لائبریری کے اورینٹل سیکشن میں آئے اور میری سیٹ کے قریب بیٹھ کر ایک کتاب دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (م: ۶/ اپریل ۲۰۱۱ء) تشریف لے آئے۔ عابدی صاحب ان سے اٹھ کر ملے، خیر و عافیت معلوم کرنے کے بعد ڈاکٹر بلوچ صاحب نے کہا: عابدی صاحب، جب ہمیں فارسی کا کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو ہماری نظر آپ کی طرف جاتی ہے۔ گویا یہ عابدی صاحب کے علمی مقام کا اعتراف تھا۔''

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کے معروف اسکالرز سے علمی رابطے تھے اور ان کی علمی قدر دانی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری ۱۹۸۸ء میں قائداعظم کیمپس (نیو کیمپس) میں شفٹ کردی گئی۔ وہاں ہم نے اس کی نئی ترتیب و تنظیم کا کام کیا۔ لائبریری ابھی نئے ماحول

میں مناسبت اختیار کر رہی تھی ، میں اس زمانے میں ڈپٹی چیف لائبریرین (اورینٹل سیکشن) کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔اس منتقلی کے تقریباً سال دو سال بعد میں اورینٹل سیکشن میں بیٹھا کام میں مصروف تھا، میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب میری سیٹ کے قریب آکر کھڑے ہوگئے، میں ان کو دیکھ کر ان کے احترام میں فوراً کھڑا ہوگیا۔ان سے علیک سلیک ہوئی، خیر و عافیت معلوم کرنے کے بعد کہنے لگے کہ مجھے آج لائبریری میں کوئی کام نہیں ہے، صرف آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں، میں نے شکریہ ادا کیا۔اس سے ان کی وضعداری میں استقامت ظاہر ہوتی ہے۔جب ایسے شفیق اور خوش اطوار لوگ دنیا سے چلے جاتے ہیں تو ان کو یاد کر کے طبیعت افسردہ ہوجاتی ہے اور دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے جانے والوں کو اپنے سایہء رحمت میں رکھے اور ان کے مقامات کو بلند کرے ،آمین۔"(36)

غلام حسن شاہ کاظمی محقق، صحافی، تذکرہ نگار اور بانی ہفت روزہ پاکستان ایبٹ آباد تھے۔انھوں نے ہفت روزہ پاکستان کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ایبٹ آباد سے کیا تھا۔ان کی کتب میں نقوش مہر، حیات پیر بابا و دیگر شامل ہیں۔ان کی بیشتر کتب ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ان کی پیدائش: ۲۹ ؍ستمبر ۱۹۰۴ء بمقام طوری شریف (ایبٹ آباد) میں اور وفات: ۱۴؍ستمبر ۱۹۸۴ء بمقام ٹھنگر شریف (مظفر آباد، آزاد کشمیر) میں ہوئی ۔وہ اپنے خط مورخہ 25-6-1980 میں ڈاکٹر بلوچ کو لکھتے ہیں:

"احوال آنکہ جناب گرامی دار الحکومت مظفر آباد تشریف لائے۔میں تقریباً ڈیڑھ ماہ سے اپنے گاؤں میں تھا۔دمہ بھی لطف فرما ہے اور بلڈ پریشر بھی کارفرما۔کسی بھی طبقے کے کسی بھی شخص نے مجھے نہ بتایا کہ آپ حضرات مظفر آباد آئے ہیں۔بعد میں لڑکے سے مجمل طور پر صورت حال معلوم ہوئی۔مجھے اس وقت کوائف معلوم ہوئے جب کہ جناب واپس چلے گئے۔بڑا ہی افسوس ہوا کہ آپ دوبار میرے لڑکے پروفیسر اختر اقبال کے مکان تک قدم رنجہ فرما کر آئے۔مظفر آباد سے میرا گاؤں کوئی تین میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اس کی سطح

ساڑھے چار ہزار فٹ کے لگ بھگ ہے۔ میں اکثر لوگوں سے دور دور رہتا ہوں۔ سرکاری لوگوں کے ساتھ بھی میل ملاپ صفر کے درجے میں ہے۔
اب اگر کہیں آنا ہو جائے تو مجھے اطلاع دی جائے۔ آج میں یونیورسٹی کالج مظفر آباد کے پرنسپل میاں صاحب سے ملا، انہوں نے آپ کی شفقت و محبت سے آگاہ کیا"(37)

پروفیسر جاوید حسین کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ مورخہ 2000-7-12

"You will be pleased to know that the seminar Organizing Committee, University of Karachi is organizing a one-day international seminar in Mumtaz Hasan: Life and Contributions, on August 05,2000 at the Arts Auditorium, University of Karachi to mark his 25th death anniversary. This seminar is expected to be presided over by the Governor of Sindh.

Being close associate and friend of late Mumtaz Hasan, you are kindly requested to contribute an article on any aspect on the life and contributions of Mumtaz Hasan".(38)

ڈاکٹر بلوچ کا خط بنام علی احمد بروہی مورخہ 1978-2-18

"So far as Sindh University is concerned, I have given my heart and soul to it. Perhaps it may be in your knowledge that after being selected in Class-I by the Pakistan Public Service commission and having received the posting order as Public Relations Officer at Damascus, I resigned from that highly

paid and prestigious job and joined the Sindh University as a Professor at Rs.600-/per month. For the next 25years, I worked hard and gave my best to the University. For the period of two years when I was Vice Chancellor, I worked almost single handed and passed sleepless nights to advance the cause of the University on the different fronts".(39)

پروفیسر شیخ عبدالرشید کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ مورخہ 1967-6-13 جس میں تاریخ سندھ سے متعلق کتب کی فہرست روانہ کرنے کی درخواست کی تھی:

"As you are aware Dr. Muhammad-ul-Hassan Siddiqui of the University of Karachi has declined to write two chapters on the History of Sindh and Balochistan from 1707to 1803.I have, therefore, decided to write these chapters myself and this will give me an opportunity to renew my knowledge of this period and this region. I am writing this to request you to send me a list of books on this period and also to lend me any book which I may need and which I may not be able to get in Lahore. I hope you will treat this matter as urgent and help me in this matter".(40)

پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن دانی کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ 1982-11-15 جس میں شمالی علاقوں کے مسلم آثار پر کتاب شائع کرانے کا مشورہ دیا:

"Reference your project of publishing monographs on Islamic

architecture. I find that you have included so far five volumes in this list. But I believe the sixth volume is absolutely essential because so far works on the spread of Islam and its influence in the Northern Areas of Pakistan have been completely neglected. I think it is within the meaning of your programme that a separate monograph on the Islamic Architecture of the Northern Areas of Pakistan should also be included".(41)

پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن دانی کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ مورخہ 1982-11-15 جس میں لاہور کے اسلامی آثار پر کتاب لکھنے پر آمادگی ظاہر کی تھی:

"Reference your very kind letter to me for undertaking a work on Islamic Architecture of Lahore under the program of National Hijra publications, I very much appreciate your trust in me and I fully realize the importance of such a work from the point of view of great cultural heritage of Pakistan. Lahore is a very big city, has a long history and still possesses large number of monuments that are of fundamental importance for the understanding of Islamic architecture.

Such a work could be undertaken only if I have the chance to stay in Lahore between 6to 10months because the study of monuments on the spot is of utmost importance before writing

this book. On the other hand, a lot of research in historical material is also necessary".(42)

ڈاکٹر سید معین الحق (ڈائرکٹر پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی) کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ مورخہ 24-2-1985

"Many thanks for your letter dated 11.2.1985,and the portion of your chapter dealing with the conquest of Sindh by Muhammad bin Qasim. I agree with your suggestion that we should include in the book an account of Arab Rule on Sindh, but keeping in view the scope and format of the book we cannot have a separate chapter on this topic. I would therefore suggest that a brief account(10or 12typed pages) should be added to chapter-1by way of conclusion".(43)

مسرت حسین زبیری (سابق آئی سی ایس افسر و کمشنر) کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ مورخہ 5-11-1984 جس میں اپنی آپ بیتی روانہ کرنے کا ذکر ہے:

"I am sending herewith a set of two volumes of my recently published Autobiography-cum-History, entitled "Voyage through History."The first volume comprises the pre-independence period ending with the departure of Lord Wavell(March, 1947)and the second begins with"Mountbatten arrives" and ends with my return form the R.C.D. in 1971, though in fact the Pakistan period is covered up to the End of the Ayub Era".(44)

ڈاکٹر بلوچ کا خط بنام مسرت حسین زبیری 1984-11-29 جس میں آپ بیتی بھیجنے پر شکریہ اور اپنی رائے ظاہر کی ہے:

"It is painful process to think and write, and to be able to present oneself in black and white before the watching eyes of the world. I am all admiration for your daring determination and plenty of patience and preservation in having produced such a voluminous work. It is full of meat on a variety of subject and events some of which stand better explained in their proper perspective. The expression, in a style you call "racy is pleasingly readable and refreshing, and often powerfully convincing".

There is a dearth of autobiographical writings and memories in Pakistan. Such literature does often 'reveal' history.Only a few works such as of Chaudhry Khaliquzzaman and Chaudhry Muhammad Ali are in the field. The Voyage, in its scope and execution, not only breaks a new ground but also breaks the record."(45)

ڈاکٹر بلوچ کا خط بنام مسرت حسین زبیری 1986-8-26

"I thank you for inviting me to join the Pakistan committee headed by you which is to celebrate the 1000th anniversary of Islamic Civilization in Spain. Frankly speaking, I am

presently overwhelmed with heavily work in connection with the'One Hundred Great books Project' and yet I cannot say 'no' to you. I will be available for advice and consultations that may be needed from time to time though it may not be possible for me to do any serious writing on the subject".(46)

ڈاکٹر بلوچ کا خط بنام کرنل فاضل یوسفزئی مورخہ 22-9-2005 جس میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے حوالے سے رہنمائی کی تھی:

"You have asked for"authentic design or detailed description and dimension of the catapult and the dhowa/ ships employed by Muhammad bin Qasim at Debul. I have no such information available with me. You may consult Encyclopedia of Islam(Old and New editions(and other encyclopedias. For Muhammad Bin al-Qasim and his conquest of al-Sindh, my edition of'Fathanama-i-sind' published by institute of Islamic History, Culture and Civilization, Islamabad, 1983,may be consulted. From Iraq, Muhammad bin al-Qasim had marched overland through Iran and Makran. Another reinforcement, with provisions, had come by boats and joined him in debal. After Debal, local boats were used inland. I have constructed a map and given his itinerary. To cross the Indus, a boat bridge was quickly constructed by his engineers. It was a

great feat of engineering.It is a good news that Muhammad Bin Al-Qasim is being remembered by our army".(47)

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ مورخہ 1-3-1971

"I had the pleasure to meet you in Lahore and I had explained to my desire tom come to Hyderabad Sindh in search of Miniature-Painting from Pakistan area(particularly Sindh)I have been asked by the authorities to collect this information under the programme of R.C.D. and you know that I cannot do this job unless I would see collection in private possessions in these localities. I had also consulted about this matter with Mr. Pir Sayyid Hussamud-Din Rashidi who had also advised me to consult you in this connection.

I am particularly concerned here to see the collection of Talpur Museum or any collection or library with that old family".(48)

سید مظفر علی شاہ کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ مورخہ 26-7-1992

"The architecture that has developed in the last 45year of our independence does not reflect our past history, heritage and culture. It does not make use of abundant indigenous building material and resources. It does not encourage the local craft and craft men and local arts and artisans. It does not make use

of environment and the landscape. It is therefore necessary that a dialogue be initiated between Architects, Engineers and other concerned professionals with a view to closely examine content, form, expression and the base and the source from which our architecture needs to be inspired as we develop, and move into the 21st century".(49)

ڈاکٹر بلوچ کا خط بنام این ہمایوں اختر بابت فروری 1993 جس میں ایک لائبریری اور مرکز نشر و اشاعت کے قیام سے متعلق مفید مشورے دیے ہیں:

"It was a great pleasure for me to have met you at the Islamic Architecture Symposium at Lahore. I talked to you about a library plan, particularly its attractive front elevation. I am sending the sketch of the plot here with. It will be a two story building facing the Madrasah Institution across the road. Book stacks will all be on the upper floor and air conditioned. Main requirements on the ground floor will be under(mostly air conditioned)

1.An audience hall for 250,to serve Reading room as well.

2.Book service section: Card index for the visitor to note particulars of the books needed by him. And also to consult general reference works, encyclopedias etc(visitors come here first, get books and then go to Reading Room)

3.Administrative section: Librarian assistants with bathroom (16x25)

4.Common bathroom for visitors.

5.Printing section: Computer room, printing machine, paper stocking.

6.Binding Section.

7.Book stock, Printed Books to be stored(25x16)

8.Book sale and Book Display section(25x16)

9.Book Dispatch Unit Books to be packed and mailed (16x20.)

10.Living Accommodation(a sort of flat(for librarian with two rooms(10x12)Kitchen and bathroom.

11.Two guest rooms for visiting Research Scholars with bath rooms(10x12)

If your model is used, your name plate will be fixed in grateful memory. Alternately, your assistance will be acknowledged along with others. This request is for free advice, as much as it can be".(50)

ڈاکٹر بلوچ کا خط بنام افتخار عارف مورخہ 24-12-1995 جس میں البیرونی اور الخوارزمی کی ان کتب کے نام تحریر کیے ہیں جن کی اشاعت ہونی چاہیے:

"I suggest that the following works of Beruni and Khwarazmi,

which are of first importance in their respective areas of knowledge, should be included:

1.Al-Qanun–al-Masu'di of Beruni, the greatest of Beruni's works.

2.Kitab-al-Jamhir of Beruni, the first important text in Mineralogy .

3.Alberuni's India, the first pioneering work in Cultural Anthropology.

4.Al-Jabr wa-al-Muqabila of khwrazni which created Algebra. (51)

ڈاکٹر بلوچ کے زندگی بھر ملکی اور غیر ملکی محققین، مصنفین، دانشوروں اور عالموں سے علمی روابط رہے۔ جن جن ممالک کے اہل علم و تحقیق سے ان کے روابط رہے ان میں جرمنی، ترکی، ملائیشیا، انڈونیشیا، ہندوستان، مصر، اردن و دیگر کئی ممالک شامل ہیں۔ ان ممالک کے اہل علم و تحقیق سے تعلقات کے بارے میں ہمیں مفید معلومات پروفیسر محمد عمر چنڈ کی مرتبہ کتاب World of work-Predicament of a Scholar میں ملتی ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر بلوچ کے بین الاقوامی محققین اور مصنفین سے تعلقات اور ان کی خط کتابت عمدگی سے پیش کی گئی ہے۔ اس ضخیم کتاب کے تمام محققین سے خط و کتابت تو یہاں نقل کرنا ممکن نہیں البتہ معروف محققین و مصنفین و دیگر حضرات سے خط کتابت کے ضروری اقتباسات نقل کیے ہیں۔ مکمل خط کتابت کے مطالعے کے لیے مذکورہ بالا کتاب کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا

یورپی محققین، مصنفین اوردانشوروں سے علمی روابط

پروفیسر رشبروک ولیمز برطانیہ سے تعلق رکھنے والے نامور مورخ اور محقق و مصنف تھے۔ وہ ڈاکٹر بلوچ کو اپنے خط مورخہ 1971-10-18 میں لکھتے ہیں:

"How very kind of you to send me your book Popular Folk Stories! I only wish that I had been able to consult you before I wrote about Lakho and Sindhi Knight-at-arms who fought so gallantly in Kutch .If ever a new edition of the Black Hills comes out, be sure that I shall take full advantage of your corrections.(52)

برطانوی محقق اور مصنف پروفیسر ایل ای سی پیکن کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ:

"I am deeply greatful to you for your kindness in sending me copy of your Book:Musical Instruments of the lower Indus valley of Sindh and much appreciate your kind personal dedication. My own book on Turkish folk musical instruments, has gone to press and I hope in due course (Perhaps 18months from now- it is a large and complex book to print)to be able to send you a copy.

What makes your book so useful and interesting is the way in which you have included all types of instruments, even those

like animal bells that are often not thought of as musical instruments".(53)

پروفیسر سائمن ڈگبی کا تعلق لندن یونیورسٹی سے تھا۔ان کی ڈاکٹر بلوچ سے مکاتبت کے موضوعات میں سندھ کے سمہ حکمران اور قدیم سکے شامل تھے۔وہ ڈاکٹر بلوچ کے نام اپنے خط مورخہ 6-6-1973 میں لکھتے ہیں:

"Thank you very much for the type script of your paper "Chronology of the Samma Rules of Sindh" which reached me today.I know that you yourself are interested in numismatics. I should be very interested to hear of other coins of the Jams besides the two issues in my article".(54)

پروفیسر چارلس بکنگھام کا تعلق لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز سے تھا۔وہ ڈاکٹر بلوچ کو اپنے خط مورخہ 6-3-1985 میں لکھتے ہیں:

"Thank you very much indeed for the copy of your monograph on Beruni'sexperiment at Nandana. I am delighted to have this, I read it with great interest and I found your arguments about his relation with Sultan Mahmud wholly convincing".(55)

پروفیسر ڈاکٹر این ماری شمل کا تعلق جرمنی سے تھا۔ان کا نام پاکستان کے علمی حلقوں میں معروف ہے ۔ان کی ڈاکٹر بلوچ سے مکاتبت کے موضوعات میں لوک ادب،تصوف،فلکیات ودیگر موضوعات شامل تھے ۔انھوں نے ڈاکٹر بلوچ کے نام اپنے خط مورخہ 17-9-1959 میں لکھا:

"It was such a wonderful time I spent in Hyderabad,

everything so well arranged, and your and your colleagues' kindness were really touching. I felt completely happy, and only hope that we'll meet again soon.

My lecture on early Sufism went very well I was quite happy. Monday I have to fly away, but let us hope that some kind breeze carries me back one day to Pakistan!

The Sindhi grammar which I got for you is very useful, and there is no day that I do not read and translate some Sindhi passages, Now I have got some publications from the department of advertising etc. in Karachi, and enjoy the Naeem Zindagi(نئین زندگی)and the Mehran Joon Maujoon (مهران جون موجون)

My greatest pleasure is to prepare a private dictionary for all the books I had already, and it is really a great fun to see it growing. I had an invitation of Karachi University for three years but this summer my health was so bad that doctors did not allow me to go.I have read with pleasure your article.

But my wish is to visit Pakistan in spring for a while, in order to talk over with my friends the course of my future studies. I hope Hussamuddin will be completely well by that time".(56)

مورخہ 4-11-1959 کو ڈاکٹر این ماری شمل نے ڈاکٹر بلوچ کو لکھا:

"It is very kind of you to request the Sindhi Adabi Board to send me the'Mehran' also. Every articles, and whatever I can find in Sindhi, is useful for me, and I used to write every single word I find, so that my collection is growing daily".(57)

مورخہ 27-5-1962 کو ڈاکٹر این ماری شمل نے ڈاکٹر بلوچ کو سچل سرمست کی منصور حلاج پر نظم کے حصول کی خاطر درج ذیل خط لکھا:

"I read Sachal's siraiki poetry (which I find simply fascinating.(In the introduction for the edition that was issue by Sindhi Adabi Board, I found a remark that Sachal has written a Persian poem on Masnoor Hallaj.Now, I am collecting all Halajian Literature. Where I can find this poem Has it been printed If yes, where and when, and is it possible, to get itself or a Photostat copy or microfilm very quickly If not, is there a manuscript available, and could it be found and microfilmed You see, I am just busy with an article on Masnoor Hallaj in Sindhi folk-poetry, which shall be finished in the next two months".(58)

مورخہ 10-1-1977 کو ڈاکٹر این ماری شمل نے ڈاکٹر بلوچ کو لوک ادب کے موضوع پر تحقیقی کام میں معانت کے حصول کی خاطر درج ذیل لکھا:

"Between Kabul and Delhi, i.e 24.10to 27.10,I intend to stop for three days in Islamabad, to stay with my Ambassador. I

would be very grateful If we could meet at some point perhaps you could arrange something with Dr.Schheske or Mr.Rosiny. Because I have certain plan connect with Sindhi folklore, I meet your valuable advise in the matter. I am sure you will guide in this respect. But even without this problem I would very much love to see you and chat with you for a while Looking forward to meeting you soon in Islamabad".(59)

مورخہ 15-12-1980 کو ڈاکٹر این ماری شمل نے ڈاکٹر بلوچ کو لوک ادب کے حوالے سے لکھا:

"I felt like being"home" in Sindh, looking at the people, listening to the songs, and remembered our various trips to Bhit Shah and Mitthi with much nostalgia! May we have these experiences once more in the future!

At the moment I have just finished a manuscript for the same publishing house(where also a German book on Rumi appeared two years ago;(it deals with the veneration of the Prophet(PBUH)in Islamic piety and poetry- and you can imagine that I.Drew heavily upon the Madahun and Munaqiba,and translated for instance the gazelle, and that of the reason why honey becomes sweet. I am sure it will be a great surprise for the German readers to see what a marvelous literature has grown around the person of the prophet, and I

felt that I had to open this treasure before my compatriots.(60)

پروفیسر ڈاکٹر سگرڈ ویسٹ پال بش اور پروفیسر ہائنز ویسٹ پال ،یہ دونوں جرمنی کے ماہر بشریات،نسلیات،اور مہتمم عجائب گھر تھے۔ان کے خط (از برودا، گجرات) مورخہ 1969-2-7 بنام ڈاکٹر بلوچ میں ہمیں یہ عبارات ملتی ہیں:

"I still think that London is then best place for books about India, so I have asked there for the Black Hill of Kutch(of Rushbrook Williams)and the Majumdar, Explorations in Sindh.

The books I am sending you today should show you that I have tried, at least, to get something for you. One of them, the book about Kutch by our friend Ramsinhji Rathod is nowadays even a very rare book and we were very fortunate to get a copy for you.Furthermore one modern Gazettteer of Kutch is being written just now and may be available after a year. What about the Gazetteer of Sindh by the way".(61)

پروفیسر ڈاکٹر سگرڈ ویسٹ پال بش اور پروفیسر ہائنز ویسٹ پال کے خط مورخہ 1971-4-2 بنام ڈاکٹر بلوچ میں ہمیں یہ عبارات ملتی ہیں:

"Your parcel with copies of the symposiom about gipsy influence in Spain arrived in yesterday. Thank you very much for it. I am glad to receive it. Remaining so many pleasant hours spent at your home and in you company".(62)

پروفیسر ڈاکٹر سگرڈ ویسٹ پال بش اور پروفیسر ہائنز ویسٹ پال کے خط مورخہ 1981-7-16 بنام ڈاکٹر بلوچ میں ہمیں جرمنی آنے کی دعوت کے حوالے سے یہ عبارات ملتی ہیں:

"In remembrance of your trip to Bockhorn- I still admire your stamina to do it!we send you some fotos of snow, icicles, Church and gravestones. I am always happy when thinking that we won your friendship, which induces me to hope that you will come again. If possible not in the winter, and some time to stay so that we can show you something of Germany. If Mrs.Baloch could be persuaded to accompany you, we would make her very welcome".(63)

پروفیسر ڈاکٹر سگرڈ ویسٹ پال بش اور پروفیسر ہائنز ویسٹ پال کے خط مورخہ 1982 -9 -1 بنام ڈاکٹر بلوچ میں ہمیں یہ عبارات ملتی ہیں:

"We received with pleasure your parcel with two copies of volume IV No. 1of the Journal of Central Asia, one volume of 'American Arab Affairs'the introductory number and a copy of your lecture about the'Irragation Technology' I was naturally, most interested in your own paper".(64)

ڈاکٹر وان لوہنی زی ڈی لیو، ایمسٹرڈیم کے انسٹیٹیوٹ برائے آثار قدیمہ جنوبی ایشیا کے ڈائرکٹر تھے۔ انھوں نے اپنے خط مورخہ 1973-4-6 میں ڈاکٹر بلوچ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا:

"In Pakistan and America I made roughly 1000photographs for the documentation in my Institute as the photographer has

not yet finished with the work, but I hope the picture which I took of your piece has come out well. For this kind gesture I want to thank you also".(65)

ڈاکٹر ایف پی سوموگائی جرمنی سے تعلق رکھنے والے محقق اور ماہر آثار قدیمہ تھے۔ انھوں نے اپنے خط مورخہ 15-9-1982 میں ڈاکٹر بلوچ کو لکھا:

"I would like to say that already before my departure your own studies gave me some new support. Your thesis developing the view that the delta of the Indus River was in course of time,moving from East to West would indicate that the original delta was somewhere in the Gujrat area of India, in the gulf of Kutch, and earlier even into gulf of Khambhat".(66)

ترکی و دیگر ممالک کے محققین، مصنفین اور دانشوروں سے علمی روابط

پروفیسر مصطفیٰ اوسلو استنبول میں مقیم ترک محقق اور دانشور تھے جن سے ڈاکٹر بلوچ کے علمی روابط تھے۔ انھیں ڈاکٹر بلوچ نے اپنے خط مورخہ 18-8-1979 میں لکھا:

"It is after the long time that I am writing to you I have always remembered you as a very kind and generous friend. You showed your kind favours and hospitality to me when I visited Istanbul and Dr. Yaqoob Mughal introduced me to you in Instanbul in Turkey".(67)

ظفر حسن ایبک کا تعلق کرنال سے تھا۔ وہ پہلی جنگ عظیم سے قبل پہلے افغانستان اور پھر وہاں سے ترکی چلے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے ترکی فوج میں ملازمت اور ترک شہریت اختیار کر لی تھی۔ افغانستان میں ان کا قریبی تعلق مولانا عبید اللہ سندھی سے قائم ہوا۔ ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی 'خاطرات' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے جو دلچسپ تاریخی معلومات اور نادر تصاویر پر مشتمل ہے۔ ظفر حسن ایبک کا انتقال مورخہ 5-1-1989 کو استنبول میں ہوا۔ انھوں نے اپنے خط مورخہ 17-10-1982 میں استنبول سے ڈاکٹر بلوچ کو اپنی ترکی۔ اردو لغت کی طباعت کے حوالے سے لکھا:

"I heartily thank you Sir for the interest you have so kindly taken in the printing of my Turkish-Urdu Dictionary at Islamic Research Institute Press. I am sorry to encoarch you in your valuable time".(68)

اسی موضوع پر ظفر حسن ایبک نے اپنے خط مورخ 2-9-1986 میں استنبول سے ڈاکٹر بلوچ کو لکھا:

"I thank you for your kind letter dated 28.8.86which came yesterday. How nice of you to inform me that the printing of my Turkish-Urdu dictionary was proceeding it is the first time that I learnt that the printing was going on. Let us hope that by the grace of a\God and the efforts of Dr. Zaman this dictionary shall be completed and the Urdu-Turkish dictionary and Grammer for Turkish students will also be printed. I do not know how to express my thankfulness to you. Nobody has so far taken such interest in getting my books printed".(69)

پروفیسر آئیدین سائلی اتاترک کلچرل سینٹر انقرہ کے صدر اور انقرہ یونیورسٹی شعبہء تاریخ میں استاد

تھے۔انھوں نے اپنے خط مورخہ 1983-6-21 میں ڈاکٹر بلوچ کو انقرہ میں ابن سینا سیمینار میں شرکت کی دعوت دیتے ہوئے لکھا:

"I am looking forward to seeing you soon in Ankara on the occasion of the Ibn-e-Sina symposium. It will be a great pleasure indeed to see you honor us with presence on that occasion".(70)

پروفیسر آئیدین سائلی نے اپنے خط مورخہ 1985-3-25 میں انقرہ سے ڈاکٹر بلوچ کو لکھا:

"I wish to thank you heartily for your decision to participate in our symposium and for preparing such an interesting and fundamental subject we shall be very glad to welcome you here".(71)

پروفیسر آئیدین سائلی نے اپنے خط مورخہ 1986-9-16 میں انقرہ سے ڈاکٹر بلوچ کو لکھا:

"I hope you will find time to enrich our Journal with other valuable contribution of yours. I remember that you spoke to me of a possible work concerning your Sindhi Language and some similarities it bore to certain Turkish idioms. I remember also talking to you of the possibility of a work on the genealogy of the kings if western Khwarazami state to whose dynasti Beyruni's master, the prince Abu Nasr Mansur ibn Iraq belonged. You seem to be a unique master researcher on such intricate subjects concerning which Beyroni has supplied

us with otherwise non-existent information of vital importance".(72)

پروفیسر آئیدین سائلی نے اپنے خط مورخہ 1989-3-9 میں انقرہ سے ڈاکٹر بلوچ کو لکھا:

"Thank you for your letter of 28February 1989.Your paper entitled'An evaluation of Beruni's references to the Turk Rulers of Kabul and Peshawar' is being printed in the Proceedings of our 1985 Symposium".(73)

پروفیسر ڈاکٹر فواد سیزگین ترکی سے تعلق رکھنے والے عالمی شہرت یافتہ محقق اور مصنف تھے۔انھوں نے عمر کا بڑا حصہ جرمنی کے شہر فرانکفرٹ میں گزارا۔وہاں سے انھوں نے ڈاکٹر بلوچ کے نام اپنے خط مورخہ 1984-8-15 میں لکھا:

"Very many thanks for your letter and the books I got recently. Unfortunately being too busy presently I will be unable to cooperate in establishing the edition program which is planned by the National Hijra Council and which as I hope will be successful. For the time being, I will send you the Arabic translation of the first two volumes of my'Geschichte des Arabischen Schrifttums' the translation of the other volumes is currently under work".(74)

پروفیسر ڈاکٹر ایسین کاہیا انقرہ یونیورسٹی میں شعبہء تاریخ کے صدر تھے۔انھوں نے ڈاکٹر بلوچ کے نام اپنے خط مورخہ 1992-3-7 میں لکھا:

"I also received a packet form National Hijra Council" which

contain 10 copies of my book. Now I am sending one of them for a present. I will never forget your help in this matter".

"I hope that your health is better. Professor Sayili is sending you best wishes and his regard. I hope we will see you in our country sometime. I also send my best wishes for Ramadan".

"Due to unexpected death of Ord. Prof. Dr. Aydin Sayili we decided to dedicate an issue of'ERDEM' to his memory. Your contribution to this issue will be inevitable. If you can send your article until the end of February 1994we will be much obliged".(75)

پروفیسرٹی ڈی جوراؤ ازبک اکیڈمی آف سائنسز کے صدر تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر بلوچ کے نام اپنے خط مورخہ 1998-4-24 میں امام بخاری" سیمینار میں شرکت کی دعوت دیتے ہوئے لکھا:

'It is a real pleasure for me on behalf of the organizing committee to invite you to the celebrations in honour of the 1225th anniversary of the outstanding thinker Imam al Bukhari the author of famous Hadises and 1200th anniversary of the prominent encyclopaedist Ahmed al Farghani who made the great contribution to the development of natural sciences".(76)

ڈاکٹر بلوچ نے اپنے خط مورخہ 1991-4-3 میں ڈاکٹر حمزہ اختصاموو (ازبک ماہر موسیقی وفنون لطیفہ) کو مقالہ بھیجنے اور پاکستان آنے کے حوالے سے لکھا:

"For the publication of the book'Islam, culture Art' I may be able to send you an article on a Music Theme'the Nai'(flute) or'Amir Khusrau's contribution to Music.'It will take some time to prepare the article after I hear from you. I would wish very much that you visit Pakistan. I will have you as my guest at Hyderabad and facilitate your visits in the province of Sindh. I am sure some other friend will help elsewhere".(77)

ڈاکٹر بلوچ کے ایرانی شاگرد محمد علی فرجاد نے تہران سے ڈاکٹر بلوچ کے نام اپنے خط مورخہ 1-9-1977 میں لکھا:

"I have the rare privilege of being your student since November 1975.I have worked assiduously to carry out my research studying under your kind guidance and supervision I have worked day and night and was able to complete my thesis within a short span of two years I had presented to you my thesis a few days back for perusal and you have been kind enough to study it meticulously and suggested a few changes and modifications so as to cover all the aspects of my research study. I have now made extensive changes in the light of your valuable suggestions and incorporated the same in my final thesis I have also added a few more chapters dilating on a number of new ideas concerning primary education in

Iran".(78)

ملائیشیا کے محقق اور دانشور عبدالمجید مکین نے ڈاکٹر بلوچ کے نام اپنے خط بابت نومبر 1982 میں لکھا:

"I am enclosing herewith a Xerox copy of a new item which appeared early this year announcing our Prime Minister's plan for this new Islamic university. I have very often quoted your excellent University as an example worthy of being followed in that respect and I hope that it will be possible for the two countries to cooperate in the exchange objectives".(79)

عبدالمجید مکین نے اسی خط میں ملائیشیا کے وزیر تعلیم انور ابراہیم کی سو عظیم کتب منصوبے کے بارے میں رائے یوں بیان کی:

"Your efforts on the great books project have inspired us to embark on a systematic program of translating into the Malay Language some of many great books from Arabic and English that have a permanent value of our spiritual and civilizational development".(80)

محی الدین سوانڈو نے انڈونیشیا سے تعلق رکھنے والے شاگرد کو ڈاکٹر بلوچ نے مورخہ 23-12-1979 کو خط لکھا جس میں کچھ نصیحتیں بھی موجود ہیں:

"I had gone to Egypt and Morocco. Now you have to study and also see Pakistan, as I tried to learn from you and also visited many good places in your country. Keep yourself warm as our winter is cold. Also take care of your food. It is

better if you cook your own food. You have to keep healthy in order to study and see things".(81)

ڈاکٹر بلوچ کو جے رام داس دولت رام نے دہلی سے مورخہ 25-9-1978 کو لکھا جس میں ڈاکٹر بلوچ کی جانب سے موسیقی پر کتاب بھیجنے پر شکریہ ادا کیا ہے:

"I owe you a thousand apologies for not acknowledging the receipt of your WONDERFUL book on music which will stand aloft above any other on the same subject for a century. What patience, perseverance, depth of study, personal contacts, technical recording work you have all these long years done for a cause which is important from all points of view and more so the cultural contributions of the masses of Sindh in this field of permanent interest and entertainment and also its role in character building".(82)

ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی سابق ڈائرکٹر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا اور نامور تاریخ دان اور کتبہ شناس تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر بلوچ کے نام اپنے خط مورخ 29-11-1996 میں احمد آباد سے اپنے علمی کاموں کے حوالے سے لکھا:

"Apart from a couple of publications 'Taj-Mahal An Illuminated Tomb' published from Washington D.C by Agha Khan foundation and Inayat Khan's 'Shah Jahan Nama' in joint collaboration with an American friend. We are engaged in an ambitious project on history of Shah Jahan. I am also

associated with the preparation of a Descriptive Catalogue of Arabic, Persian and Urdu manuscript in the Dargah of Hazrat Pir Muhammad Shah Library here which has the unique copy of Al-Beruni's'Zich".(83)

ڈاکٹر بلوچ نے اپنے خط 1996-12-14 میں ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی کو شاہجہاں کی بنائی سندھ میں ایک تاریخی مسجد کے حوالے سے لکھا:

"Qazi ahmad Mian Akhtar died and the Allama I.I. Kazi died and Professor left Sindh university I kept reminding him, while he was in Lahore and also visited him frequently during sixties. On the last occasion he told me that he had finished the work and had sent it for review and writing the foreword".

"It was a great good news for me to learn about your scholarly pursuits. I hope the work on Shah Jahan will be a standard one for all times to come as you already know Jami Mosque was constructed at Thatta during his reign. A photo of this grand mosque unique in its work and with an artifice in the edifice to make the Khutbah audible in the distant eastern wing, will be included in the proposed volume. I have also discovered another more modest Mosque in the rural area of Hyderabad District, which has the same type of concealed shutters to let the air into the main prayer chamber as in jami mosque of

thatta. I presume that Shah Jahan had stayed at this place during his wonderings in Sindh. However, I have not studied the subject of his presence in Sindh. If you have the dates of the total period of his stay in Sindh, one could surmise more on the period of construction of this modest mosque".(84)

ڈاکٹر ضیاءالدین دیسائی نے ڈاکٹر بلوچ کے نام اپنے خط مورخ 1997-2-22 میں احمد آباد میں مدفون سندھی شہزادوں کے مقابر کے حوالے سے لکھا:

"Then again I am occupied with giving touches to a volume of a joint project(with an American friend, Dr. W.E.Begley on the History of Shah Jahan".

After my Peshawar and Islamabad visits, I was in Pakistan twice with Dr. Begley but for a very short period of a couple of days, and you were in Hyderabad. Of course after 1981 when we met, I had sent you from Nagpur some information you required from old Arab reports and about the location or existence of the tomb of the Sindh Princes at Ahmadabad. One them Jam Firoz reported to be buried in the Dargah premises of Shah Bhikan son of Hazrat Shah Alam(who was married to a Sindh princess) but there being no inscriptions or original graves at the site. It is on the bank of the river Sabarmati, it is difficult to say anything about Jam Firoze's

grave".

One request! if you could pen down your reminiscences of Bahauddin College Jhunagarh in Urdu, it would be a very useful source of information for the coming generations. This article could be published here in Journal of the Gujarat State Urdu Academy. Please do find some time for it".(85)

پروفیسر آر ناتھ راجستھان یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ وثقافت ہند میں پروفیسر اور مغل فن تعمیر کے ماہر تھے۔ان کی چار ضخیم جلدوں پر مشتمل معروف کتاب History of Mughal Architecture مغل فن تعمیر پر ایک بڑا علمی اور تحقیقی کام ہے۔وہ اپنے خط مورخہ 1988-3-30 میں ڈاکٹر بلوچ کو لکھتے ہیں:

Thank you very much for your letter of 29th January. I am grateful indeed for your kindly writing to the Interior Ministry and facilitating the matter. It is a pleasure to inform you that the Embassy of Pakistan has, thereupon, granted me Visa for 15days visit to Lahore and I am fixing up the program next month. It may not be possible to visit Islamabad and I would miss the pleasure privilege of meeting you. If possible, I will try to ring you up and do a little conversation on telephone.(86)

ڈاکٹر ابراہیم المدکور صدر انسٹیٹیوٹ آف عربک لینگویج قاہرہ کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ 1986

"I was very happy to meet your good self when I benefited from the last conversation between us, concerning your great

project of translating one hundred great books from Arabic to English language. Actually, this is the time that the Muslims themselves should publish their great culture in scientific (modern) languages".(87)

ڈاکٹر سید حسین نصر کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ مورخ 16-5-1988

"I completely agree with you on the proposed list of books, which comprise the collection from the great scholar of Islam".
I am glad that the project for the great Book series is continuing. I am sorry that my very heavy`program does not allow me to write an introduction to the Kitab al-nafs.
As far as the new members of the advisory board are concerned. I think that Dr al-Attas and Osman Bakar from Malaysia and Dr. William Chittick from the State University of New York would be especially suitable. I would very much like to attend the meeting of the advisory board whenever I can but cannot promise anything yet until I know where and when it is".(88)

ڈاکٹر احسان عبداللطیف (عمان) کا خط بنام ڈاکٹر بلوچ مورخہ 2001-11 -5

"Thank you very much for your great letter I received two days ago. I appreciate your concern and attention to my request. The information you sent me was useful to the

research I have been working on. But I want to repeat the questions:

Does(Jaipal mean just(father)(is it)not a name

-And Anandpal–means just(son)not a name

-I am asking this(because Al-Utbi used(these words) as names:

-Anandpal Bin(son of) Jaipal

-Bujhara(بجهرا)

-Bahim Nagar"(بهيم نغر)(89)

ڈاکٹر بلوچ کا خط بنام ڈاکٹر احسان عبداللطیف (عمان)

"Answers to the question you have asked in your letter of 5/11/2001are as follows-:Jaipal is the name of the father.

-Anandpal is the name of the son(بجهرا).

(بجهرا)-Bajehra is a name.

(بهيم نغر)-bhim Nagar is a name.(90)

چند اور شخصیات سے اہم مکاتبت

ڈاکٹر بلوچ کا خط بنام ڈاکٹر محمد یعقوب مغل مورخہ 1978- 1 -2

"Our Ankara Embassy has done a real good work for Allama Iqbal Centenary Celebrations. Credit goes to your Ambassador and his staff, particularly to you.

Congratulations!

The Turkish Delegation to the Allama Iqbal International Congress Lahore, created a very good impression. I tried to give my special attention to them and I hope they returned happy and satisfied: Besides Mehmet 0nder, it was a pleasure to meet all other, particularly the eminent poet and stateman Bahram Oglu. Professor Chagtai was also wonderful. Professor Karahan made a very impressive speech in Persian".(91)

ڈاکٹر بلوچ کے نام ایاز احمد خان (سفیر پاکستان، دمشق) کا خط مورخہ 2- 3 -1986

"Your thoughtful visit to the Arab Scientific Heritage Institute at Aleppo and exchange of ideas with the Director, Dr. Khalid Maghout, have been fruitful so that he has offered two seat for master and two for doctorate to Pakistani students. I will communicate with him directly as you have suggested and will try to promote what has been achieved as a result of your contact there".(92)

ڈاکٹر بلوچ کے نام توحید احمد (کونسلر سفارت خانہء پاکستان، دمشق) کا خط مورخہ 10- 5 -1987

"Dr. Ehsan Haqqi(Sitara-e-Imtaiz,(an Octogenarian Syrain scholar has recently written a full length account of

Quaid-e-Azam, Muahmmad Ali Jinnah's life and Politics in Arabic. This is the first book of its kind to come out in the Arab World.

More than fifty year ago Dr. Haqqi taught at Aligrah University and still speaks chaste and fluent Urdu. He has written over 30books in Arabic, including a comprehensive book on"Pakistan–post and present" and one on the Kashmir Tragedy".(93)

ڈاکٹر بلوچ کے نام افتخار آرائیں (افسر سفارت خانہء پاکستان، ویانا) کا خط
مورخہ 1989 - 6 - 5

"I recall that I congratulate you on your good and effective presentation during the opening ceremony of the Indus Valley Civilization Exhibition in Vienna. After your Presentation, many Austrian and Pakistanis met me and appreciated your comprehensive speech on the occasion".(94)

ڈاکٹر بلوچ کا خط بنام شہر یار رشید (سفیر پاکستان، ازبکستان) مورخہ 1998- 11 -17

"I am back here in Pakistan after attending Conferences in Samarkant and Farghana. Being at home in our dear Pakistan, I avail of the opportunity to convey my very best thanks to you for the hospitality and all the kind courtesies you extended to me when I visited our Embassy there".(95)

ڈاکٹر بلوچ کے نام ڈاکٹر منظور الدین احمد (وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی) کا خط مورخہ 1990 -1 -7 جس میں کراچی یونیورسٹی کی جانب سے انھیں اعزازی ڈی لٹ کی ڈگری پیش کرنے کا ذکر ہے:

"Thank you for sending your detailed curriculum vitae. I have pleasure of informing you that syndicate of the University has unanimously recommended your name for the award of honorary degree of D. Lit for your academic works and services rendered to promoting the cause of literature, education and Islam".(96)

ڈاکٹر بلوچ کا لیفٹننٹ جنرل معین الدین حیدر (گورنر سندھ) کے نام خط مورخہ 1998 -9 -2 جس میں اپنی شخصیت، طریقۂ کار اور علمی کاموں کے بارے میں لکھا:

"I am essentially a man of action, rather a worker with deep interest in doing productive work. I did twenty year of intensive teaching to produce good teachers, set up'University Institute of Education and Research, administered Sindh University as V.C. promoted education/ culture/ sport as OSD/ Secretary in Federal Ministries of Education/ Culture, Developed Islamic University Islamabad as its first V.C, promoted the much needed research and produced a number of useful publications as Director of National Institute of Historical and Cultural Research Islamabad and as advisor to the National Hijra Council, Islamabad. On return from

Islamabad in 1989,I got brief assignment(1991-94)to establish the Sindhi Language Authority, in the light of my experiences as a member of the National Language Authority from its very inception .

But along with enthusiasm for work and fulfillment of responsibilities to the best of my ability, I have always planned to fully utilize my leisure time for research and writing. In our Province here, only the books done by me in Sindhi are known and talked about ".(97)

ڈاکٹر بلوچ کے نام لیفٹننٹ جنرل معین الدین حیدر (گورنر سندھ) کا خط 1998 -9-7 جس میں بلوچ صاحب کی بلند الفاظ میں تحسین کی ہے:

"It is indeed a unique honour for you to have been associated with many prestigious institutions. Your exemplarly discharge of function speaks volume about you sincerity expertise and devotion to the task assigned to you.

I consider you a living legend, in the versatility of literary pursuits and the annals of history and literature development of this province, will commendably record the services you have rendered in this regard".(98)

ڈاکٹر بلوچ کے نام پروفیسر کرار حسین (وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی) کا خط مورخہ 1972 -10 -25 جس میں بلوچستان یونیورسٹی سے متعلق معاونت کی پیشکش کا شکریہ ادا کیا:

"Your offer of cooperation is very e-assuring and I tell you I am very much in need of your cooperation for you know this region, its language and culture and history for better than I do and it shall always be my endeavour to make this University, in a full and real sense, the University of Baluchistan".(99)

حواشی وحوالہ جات

1. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 76
2. ایضاً صفحہ نمبر 86
3. World of work-Predicament of a Scholar p.531
4. World of work-Predicament of a Scholar p.533
5. World of work-Predicament of a Scholar p.534
6. World of work-Predicament of a Scholar p.548
7. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 101
8. World of work-Predicament of a Scholar p.254
9. World of work-Predicament of a Scholar p.255
10. World of work-Predicament of a Scholar p.253
11. World of work-Predicament of a Scholar p. 263
12. World of work-Predicament of a Scholar p. 265
13. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 127
14. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 128
15. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 146

16. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 150
17. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 155
18. World of work-Predicament of a Scholar p. 317
19. World of work-Predicament of a Scholar p.322
20. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 164
21. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 160
22. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 174
23. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 177
24. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 185
25. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 187
26. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 191
27. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 206
28. دیکھیے 'خطوط ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 67
29. دیکھیے 'خطوط ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 190
30. دیکھیے 'خطوط ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 193
31. دیکھیے 'خطوط ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 107
32. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 238
33. دیکھیے میری زندگی کے پچھتر برس از اعجاز الحق قدوسی صفحہ نمبر ۲۳۶
34. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 329
35. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 345

36. غیر مطبوعہ مضمون از سیّد جمیل احمد رضوی بہ عنوان 'ڈاکٹر نبی بخش بلوچ یادوں کے آئینے میں"
37. دیکھیے 'خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' مرتبہ محمد راشد شیخ، صفحہ نمبر 270
38. World of work-Predicament of a Scholar p.273
39. World of work-Predicament of a Scholar p.276
40. World of work-Predicament of a Scholar p.296
41. World of work-Predicament of a Scholar p.328
42. World of work-Predicament of a Scholar p.329
43. World of work-Predicament of a Scholar p.338
44. World of work-Predicament of a Scholar p.354
45. World of work-Predicament of a Scholar p.355
46. World of work-Predicament of a Scholar p.356
47. World of work-Predicament of a Scholar p.371
48. World of work-Predicament of a Scholar p.418
49. World of work-Predicament of a Scholar p.423
50. World of work-Predicament of a Scholar p.425
51. World of work-Predicament of a Scholar p.457
52. World of work-Predicament of a Scholar p.133
53. World of work-Predicament of a Scholar p.136
54. World of work-Predicament of a Scholar p.137
55. World of work-Predicament of a Scholar p.140

World of work-Predicament of a Scholar p.154 .56

World of work-Predicament of a Scholar p.156 .57

World of work-Predicament of a Scholar p.158 .58

World of work-Predicament of a Scholar p.161 .59

World of work-Predicament of a Scholar p.162 .60

World of work-Predicament of a Scholar p.165 .61

World of work-Predicament of a Scholar p.166 .62

World of work-Predicament of a Scholar p.178 .63

World of work-Predicament of a Scholar p.178 .64

World of work-Predicament of a Scholar p.183 .65

World of work-Predicament of a Scholar p.184 .66

World of work-Predicament of a Scholar p.196 .67

World of work-Predicament of a Scholar p.197 .68

World of work-Predicament of a Scholar p.199 .69

World of work-Predicament of a Scholar p.202 .70

World of work-Predicament of a Scholar p.203 .71

World of work-Predicament of a Scholar p.205 .72

World of work-Predicament of a Scholar p.206 .73

World of work-Predicament of a Scholar p.211 .74

World of work-Predicament of a Scholar p.212 .75

World of work-Predicament of a Scholar p.213 .76

World of work-Predicament of a Scholar p.215 .77

World of work-Predicament of a Scholar p.221 .78

World of work-Predicament of a Scholar p.223 .79

World of work-Predicament of a Scholar p.225 .80

World of work-Predicament of a Scholar p.228 .81

World of work-Predicament of a Scholar p.232 .82

World of work-Predicament of a Scholar p.245 .83

World of work-Predicament of a Scholar p.247 .84

World of work-Predicament of a Scholar p.249 .85

World of work-Predicament of a Scholar p.240 .86

World of work-Predicament of a Scholar p.560 .87

World of work-Predicament of a Scholar p.563 .88

World of work-Predicament of a Scholar p.568 .89

World of work-Predicament of a Scholar p.569 .90

World of work-Predicament of a Scholar p.581 .91

World of work-Predicament of a Scholar p.590 .92

World of work-Predicament of a Scholar p.592 .93

World of work-Predicament of a Scholar p.594 .94

World of work-Predicament of a Scholar p.597 .95

World of work-Predicament of a Scholar p.628 .96

World of work-Predicament of a Scholar p.629 .97

World of work-Predicament of a Scholar p.630 .98

World of work-Predicament of a Scholar p.634 .99

باب نمبر 25

افکار ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

اگر ہم دنیا کے معروف اصحاب علم وفضل اور دانشوروں کے حالات زندگی پر غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان میں سے ہر شخصیت منفرد افکار رکھتی تھی اور اسے جن اقدار حیات یقین تھا ان اقدار پر وہ شخصیت عمر بھر عمل پیرا رہی۔ بعینہ یہی صورت حال ہمیں ڈاکٹر بلوچ مرحوم کے حالات زندگی میں نظر آتی ہے۔ وہ ایک اصول پسند انسان تھے جو محض زبانی اصول پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ خود ان اصولوں پر عمل کر کے دکھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پوری زندگی مخصوص اصولوں اور اعلیٰ اسلامی و اخلاقی اقدار پر عمل کرتے ہوئے گزری۔ اس راہ میں انھیں مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن جس بات کو انھوں نے علم وتحقیق کی روشنی میں درست سمجھا اس پر عمر بھر ثابت قدم رہے اور فضول بحثوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے قیمتی وقت کو علمی وتحقیقی کاموں میں صرف کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کی شخصیت میں سندھ کی اعلیٰ اسلامی واخلاقی اقدار اور روایات کے محاسن اور اوصاف موجود تھے۔ ان روایات میں شرافت، مہمان نوازی، ہمدردی، خوش مزاجی، اعلیٰ کردار، چھوٹوں پر شفقت، بڑوں کا احترام اور اسی طرح کی دیگر مثبت روایات شامل ہیں۔ ڈاکٹر بلوچ صاحب کی زندگی میں ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ انھوں نے کبھی پست سطح پر اتر کر دنیا نہیں کمائی اور نہ ہی کبھی عہدوں

کے پیچھے دوڑے بلکہ وہ جس عہدے پر بھی فائز رہے اسے وقار بخشا اور اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے ادا کیں۔ان کی زندگی میں ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ انھوں نے غربت اور طرح طرح کی مشکلات کے باوجود اپنی محنت اور لگن سے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمی مراحل طے کیے لیکن اپنی سرزمین اور اس سرزمین کی اعلیٰ روایات کو کبھی ترک نہیں کیا اور ہمیشہ ان پر عمل پیرا رہے۔ذاتی زندگی میں وہ اپنے استاد علامہ عبدالعزیز میمن کی طرح فضول خرچی اور اسراف کو سخت ناپسند کرتے تھے اور زندگی میں سادگی اور صفائی کے قائل تھے۔

ڈاکٹر بلوچ مرحوم کی شخصیت ایک کثیر الجہتی شخصیت تھی اور ان کے افکار کی بھی کئی جہتیں ہیں۔وہ بیک وقت ایک محقق، ایک استاد، ایک ماہر تعلیم، ایک دانشور، ایک عالم ہفت زبان اور اعلیٰ اخلاق و کردار کے اوصاف سے متصف شخصیت کے مالک تھے۔ان کی مختلف تحریروں میں ہمیں ان کے افکار بھی ان تمام موضوعات سے متعلق ہمیں ملتے ہیں۔ان کی ان گنت تحریروں میں ایسے جملے اور ایسے اقتباسات ملتے ہیں جو بڑے فکر انگیز ہیں اور جنھیں پڑھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر بلوچ محض ایک مصنف اور ایک محقق ہی نہیں بلکہ کئی معاملات میں منفرد فکر رکھتے تھے اور ایک مفکر کی حیثیت سے بھی ان کا مقام بلند ہے۔ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ ان تحریروں سے ان کے افکار کے خوبصورت پھول جمع کر کے ایک خوبصورت گلدستے کی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کریں۔اب یہ فیصلہ قارئین ہی کریں گے کہ ہم اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔

جیسا کہ ذکر آیا ڈاکٹر بلوچ مرحوم کے افکار کی کئی جہتیں ہیں خصوصاً جن موضوعات پر ہمیں ان کے افکار ملتے ہیں ان میں تعلیمی افکار، اخلاقی افکار، افکار برائے طرز زندگی، سندھ کے اسلامی تشخص کے حوالے سے افکار، علم و تحقیق کے حوالے سے افکار اور اعلیٰ اخلاقی معیار و دیگر موضوعات پر افکار ملتے ہیں۔ان افکار کے مطالعے سے ہمیں ڈاکٹر بلوچ مرحوم کے نظریات اور ذہنی رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے مطالعے سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر بلوچ زندگی بھر جن اعلیٰ اسلامی و اخلاقی اقدار پر عمل کرتے رہے وہ کیا تھیں۔نیز ہمیں یہ بھی علم ہوگا کہ ڈاکٹر بلوچ صاحب زندگی بھر کن اصولوں پر عمل پیرا رہے اور اس حوالے سے انھوں نے کبھی مفاہمت یا مداہنت سے کام نہیں لیا۔اس باب کی خاطر ہم نے ڈاکٹر بلوچ کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریروں سے استفادہ کیا خصوصاً سندھی، اردو اور انگریزی زبانوں میں۔اس کے علاوہ ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط کا مطالعہ

بھی کیا جن میں ان کے افکار موجود ہیں۔غیر مطبوعہ خطوط ہمیں بلوچ صاحب کے لائق پوتے جناب محمد ارشد بلوچ سے حاصل ہوئے جن کا شکریہ واجب ہے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے علم و تحقیق سے متعلق افکار

ڈاکٹر بلوچ صاحب نے قدیم علمی وادبی سرمائے کو گمنامی سے نکال کر دنیا کے آگے پیش کیا اور اس طرح اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔وہ زندگی بھر حصول علم اور فروغ علم میں مصروف رہے۔انھوں نے زندگی بھر طرح طرح کی مشکلات کا مقابلہ کیا اور علم و تحقیق کی راہوں پر طرح طرح کے روشن چراغ جلائے تاکہ ان راہوں پر بعد میں آنے والوں کو کسی طرح کی دشواری نہ ہو اور ان راہوں پر وہ بآسانی سفر کر سکیں۔

ڈاکٹر بلوچ کے لکھے مختلف کتب پر لکھے مقدمات کے مطالعے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان کی مقدمہ نگاری کی درج ذیل خصوصیات ہیں،

وہ کتاب کی اہمیت اور اس کے علمی وادبی معیار کو جانچتے ہوئے مقدمہ لکھتے تھے۔

وہ اس موضوع کی دیگر کتب سے اس کا موازنہ کرتے تھے۔

وہ کتاب کے محاسن کا مناسب انداز میں ذکر کرتے ہوئے کتاب کی کمیوں کا بھی ذکر کرتے تھے۔

وہ مقدمے میں کتاب کے موضوع کی تاریخ بیان کرتے تھے۔

زیر تحریر شخصیت کے انتخاب کے حوالے سے افکار

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے جن شخصیات پر لکھا وہ شخصیات تھیں جن کی زندگیوں میں کوئی نہ کوئی قابل تقلید پہلو اور اعلیٰ اخلاقی خوبیاں ضرور تھیں۔وہ ان شخصیات کے محاسن اس انداز سے تحریر کرتے کہ پڑھنے والوں میں عمل کی صلاحیت بیدار ہو اور ان شخصیات کی زندگیوں سے وہ کچھ سیکھ سکیں اور اپنی زندگی میں ان محاسن کو اختیار کر سکیں۔مثال کے طور پر ممتاز حسن، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ایوب کھوڑو، مرزا قلیچ بیگ، مولانا آزاد سبحانی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان و دیگر شخصیات۔اس موضوع پر ممتاز حسن مرحوم کے محاسن پر ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا:

''ممتاز حسن اس خیال کے حامی تھے کہ محنت سے کام کیا جائے اور محبت سے کام لیا جائے۔ ہر اچھی تجویز کا خیر مقدم کیا جائے اور اس کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ ہر وہ تعلیمی، تحقیقی یا انتظامی ادارہ جو اچھا کام کر رہا ہو اس کی مدد و معاونت کی جائے۔ سب سے اہم اور ضروری یہ کہ ہر وہ صوبہ اور خطہ جس سے پاکستان کی تشکیل ہوئی ہے وہ اس نئی مملکت کے قلب و جگر کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان میں آباد ہر علاقے اور خطے کے لوگ قابل عزت و احترام ہیں۔

ایسے جذبات محض ان کی باتوں تک محدود نہ تھے لیکن وہ ان کے لائحہ عمل اور کردار کی روشن شمعیں تھیں کہ جن سے علم و فضل، ادب و ثقافت تحقیق و تعمیر کے گوشوں میں اجالا ہوا۔ ممتاز حسن کے جدا ہو جانے سے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اہل علم یتیم ہو گئے۔ جن تعمیری اداروں کی سرپرستی میں فروغ حاصل ہوا تھا اجڑے ہوئے نظر آنے لگے۔''

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے وقت آخر کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے ان کے اسلام کے دفاع کے طرز عمل کو سراہا اور تحریر فرمایا تھا کہ:

''ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا وقت آخر جس وقت آیا اس وقت سیمینار جاری تھا اور انھوں نے زندگی میں آخری خطاب جو کیا وہ اسلام کے دفاع میں اور صحیح حقائق کا اظہار تھا۔

اسی موضوع پر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے محاسن پر ڈاکٹر بلوچ نے اس طرح روشنی ڈالی تھی:

''مجھے تقریباً پچاس سال تک ڈاکٹر غلام مصطفی خان مرحوم کو مختلف حیثیتوں سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ عالم، محقق، عارف، صوفی، استاد، دوست و ساتھی اور پڑوسی کی حیثیت سے انہیں قریب سے سمجھنے اور پرکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ میں بلا مبالغہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ انسانیت کا ماڈل تھے اور جوہر انسانیت تھے۔ علم اور تحقیق میں بھی وہ بلند مقام پر فائز تھے۔

ایک مضمون میں مرزا قلیچ بیگ کے شخصی محاسن پر ڈاکٹر بلوچ نے یوں روشنی ڈالی تھی:

مرزا قلیچ بیگ نے سرکاری ملازمت بھی کی اور اس زمانے میں سرکاری کاموں میں زیادہ

سے زیادہ توجہ دینا لازمی تھا۔ اس زمانے میں اونٹوں پر سفر کیا جاتا تھا اور مختیار کار کی حیثیت سے مرزا صاحب نے اونٹوں پر بہت سے سفر کیے۔ انہوں نے سرکاری ملازمت کے ساتھ تاریخی مقامات بھی دیکھے۔ اس زمانے میں بجلی نہیں تھی اس لیے سخت گرمی کے موسم میں پنکھوں کا سوال ان مشکلات کے باوجود مرزا صاحب نے بڑے کارنامے انجام دیے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کم سے کم سہولتوں کے ساتھ بھی بہت سارے کام کر سکتا ہے۔''

اسی طرح پیر الٰہی بخش کے شخصی محاسن پر ڈاکٹر بلوچ نے اپنے مضمون میں یوں روشنی ڈالی تھی:

''پیر الٰہی بخش صاحب کی سندھ کے لیے سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے تعلیم کے دروازے کھولے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ سندھ کے بچے بھی تعلیم حاصل کریں اور بڑے بھی۔ وہ سندھ کے پہلے وزیر تعلیم تھے جنہوں نے تعلیم بالغاں کا آغاز کیا۔ تعلیم بالغان کے کئی مراکز کا وہ خود معائنہ کرتے تھے انہوں نے اساتذہ کی تعلیم و تربیت کے لیے بندر روڈ کراچی میں شاندار عمارت بنوائی۔ جو اسکول اور کالج 1947ء کے بعد بند ہو گئے تھے ان کو کھلوایا انہوں نے ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے سندھ مسلم کالج قائم کرایا اور کراچی میں سندھ یونیورسٹی بھی قائم کرائی۔''

اسی طرح محمد ایوب کھوڑو کے شخصی محاسن پر ڈاکٹر بلوچ نے اپنے مضمون میں یوں روشنی ڈالی تھی:

''جب کھوڑو صاحب پر قتل کا جھوٹا الزام عاید کیا گیا تھا تو ایک پولیس افسر اکبر خان نے انھیں گرفتار کیا تھا۔ جب کھوڑو صاحب سندھ کے وزیر اعلیٰ بنے تو اکبر خان ان سے ملا اور ان سے گزشتہ عمل کی معافی مانگی۔ کھوڑو صاحب نے ایک اعلیٰ ظرف انسان کی مثال پیش کرتے ہوئے اکبر خان کو دل سے معاف کر دیا تھا۔''

درج بالا مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ڈاکٹر بلوچ زیر تحریر شخصیت کے اخلاقی محاسن پر نظر رکھتے تھے اور انھی شخصیات پر لکھتے تھے جو ان اوصاف سے متصف ہوتیں۔

مطالعہ کے لیے انتخاب

ڈاکٹر بلوچ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔اس حوالے سے ان کا ذہن بالکل واضح تھا کہ کس چیز کا مطالعہ کیا جائے اور کس چیز کا نہیں۔مطالعے کے حوالے سے ان کے افکار ہمیں ان کے ایک انٹرویو میں ملتے ہیں جس میں انھوں نے فرمایا تھا:

> مطالعہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ایک قسم مطالعے کی یہ ہے کہ جو بھی کتاب ہاتھ آئے اسے پڑھا جائے۔مطالعے کی دوسری قسم وہ ہے جس میں کسی خاص مقصد کی خاطر مطالعہ کیا جائے تا کہ دورانِ تحقیق جو سوالات سامنے آئیں یا جو مسائل ہوں ان کا حل تلاش کیا جائے۔ بلوچ صاحب نے ہمیشہ دوسری قسم کے مطالعے پر عمل کیا ہے۔علی گڑھ میں طالب علمی کے دور میں روزانہ چودہ گھنٹے مطالعہ کرتے تھے۔ دورانِ ملازمت روزانہ آٹھ سے دس گھنٹے مطالعہ کرتے اور زندگی کے آخری دور میں روزانہ پانچ گھنٹے مطالعہ کرتے تھے۔ بلوچ صاحب نے ادبی مطالعے کے ذیل میں مختلف شعراء کا کلام پڑھا۔اسکول کے زمانے میں وہ علامہ اقبال سے بہت متاثر تھے اور ''شکوہ'' اور 'جواب 'شکوہ'' کو بہت لطف لے کر پڑھتے تھے۔انھوں نے سندھ کے تقریباً تمام شعراء کا کلام پڑھا ہے لیکن شاہ عبداللطیف بھٹائی ان کے ذہن میں رچ بس گئے۔

تحریر میں مقصدیت

ڈاکٹر بلوچ مرحوم اپنی تحریر میں مقصدیت کے قائل تھے۔ان کی تحریر اختصار کے ساتھ جامعیت کی حامل ہوتی۔ان کا اسلوب بیان سادہ اور عام فہم ہوتا۔اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کی دلی خواہش ہوتی تھی کہ ان کی تحریر زیادہ سے زیادہ نظروں سے گزرے اور زیادہ سے زیادہ لوگ ان کی تحریر سے مستفید ہوں۔وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ زیادہ سے زیادہ قارئین تک اپنی بات پہنچانے کے لیے ایک واضح، غیر مغلق اور سادہ اسلوب میں تحریر کا ہونا ضروری ہے اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب تحریر آسان زبان میں لکھی جائے

اور عام فہم ہو۔ اگر زبان مشکل اور مغلق ہوگی تو یہ مقصد فوت ہو جائے گا۔ اگر ہم دنیا کے بڑے بڑے محققین اور ادیبوں کی تحریروں کا مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان کی تحریریں سادہ اور عام فہم زبان میں تھیں لیکن اسی سادہ زبان میں انھوں نے بلند افکار پیش کیے۔

ڈاکٹر بلوچ نے اپنے ایک مفصل انٹرویو بہ عنوان ''علم سے عالم تک'' میں اپنے تحقیق اور سندھ سے متعلق تحقیق کے بارے میں افکار کو ان الفاظ میں پیش کیا تھا:

> ''کوئی بھی علمی یا تحقیقی کام بڑی منصوبہ بندی کرنے یا بہت رقم منظور کرانے سے نہیں ہوتا بلکہ یہ تو محبت کے جذبے سے مکمل ہوتا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ اس کام کی خاطر آپ کس حد تک Committed ہیں اور اس کام سے آپ کو کس قدر محبت ہے، یہ سب کام اسی پر دار و مدار کرتے ہیں۔ میرا تعلق سندھ کے دیہی علاقے سے تھا، لوگوں سے میل جول کے نتیجے میں فطری طور پر میرے دل میں ان کے لیے محبت کے جذبات تھے۔
>
> میری زندگی کا مقصد تحقیق یا کوئی اور دوسرا کام شامل نہیں تھا۔ میں نے عمر بھر مختلف ملازمتیں کیں اور جو فارغ وقت ملتا اس میں یہ تحقیقی کام کرتا رہا۔ میں نے یہ سب کام کیوں کیے؟ کیونکہ مجھے ان کاموں سے محبت تھی۔ میں نے ہمیشہ کتاب لکھنے کے عوض روپیہ پیسہ لینا غلط سمجھا ہے۔ آج تک جو بھی علمی کام کیا اس کے عوض کبھی کی ٹکا بھی نہیں لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ علم کی زکوٰۃ ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرا یہ علمی کام آگے زمانے میں سندھ کے لیے کارگر ثابت ہوگا۔''

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے تعلیمی افکار

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی رائے میں قومی تعلیم کے اغراض و مقاصد واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں:

(ا) فرد کی مدد کی جائے۔ اس کی اقدار، ترقیاتی سوچ، رویوں جن کی مدد سے وہ معاشرے کا

ایک ذمہ دار شخص بن سکتا ہو۔
(۲) ایسے فرد کو تیار کیا جائے جو ایسے ہنر، سوچ، سمجھ کی مدد سے علم حاصل کر سکے جو اسے زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں مدد دے اور اس کے ساتھ سماجی ضروریات کو پورا کر سکے۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی رائے میں تعلیم میں دُور اندیشی، روشن خیال کی حامل رائے ایسے دو دفاعی ہتھیار ہیں جو بیرونی پیش قدمی کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ قومی تعلیم کے لیے یقینی و مستقل ضمانت، قومی دفاع و قومی استحکام کے حوالے سے دور حاضر میں جو پیچیدگیاں اور مسائل در پیش ہیں کوئی بھی ملک اس سے بے خبر نہ رہ سکے گا اور نہ اپنی آزادی و استحکام برقرار رکھ سکے گا۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے جدید تعلیم کے حوالے سے اپنے افکار یوں بیان کیے تھے:

''صرف جدید سائنس و ٹکنالوجی کے علوم ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس علم کی بھی ضرورت ہے جو ہمارے کردار، افکار، اخلاق اور معاشرت کو بہتر بنائے اور ہم میں حب الوطنی اور اسلام کی محبت کو اجاگر کرے۔ جب تک ہم میں پاکستانیت کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا ہماری شخصیت کی تعمیر نہیں ہو گی، ہمارے کردار درست نہیں ہوں گے، ہماری روحانی تسکین نہیں ہو گی اس وقت تک نہ تو ہم خوش حال ہو سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی نظام تعلیم ہمارے لیے مفید ہوسکتا ہے۔ یہ تو درست نہیں کہ ہم صرف ذہین لوگ پیدا کر لیں لیکن ان میں وطنیت کا جذبہ نہ ہو، اپنے مذہب سے لگاؤ نہ ہو، اپنی اقدار سے محبت نہ ہو، اپنے ماضی کی روایات کا احساس نہ ہو اور اپنی تہذیب و ثقافت کی وہ پروانہ کریں تو ایسے لوگ قوم و ملک کے لیے کس طرح مفید ہو سکتے ہیں۔''

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا ایک مفصل انٹرویو سندھی زبان میں ''علم سے عالم تک'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس سے ہمیں تعلیم کے حوالے سے منفرد افکار کا سراغ اور ہمارے تعلیمی مسائل کا حل ملتا ہے۔ ایک سوال کے

جواب میں انھوں نے آج کے دور میں تعلیمی انحطاط اور خصوصاً استادوں کے معیار کے بارے میں فرمایا تھا:

''اصل مسئلہ اختیار اور جواب داری کا ہے۔اختیار نہیں ہے تو کوئی جواب دار بھی نہ ہے۔آج کل ہیڈ ماسٹر کی کوئی حیثیت نہیں۔ایک زمانہ تھا کہ یہاں ڈپٹی کمشنر کی بڑی حیثیت ہوتی تھی اب وہ بھی نہیں......اب حالت یہ ہے کہ طالب علم استاد کو مارتے ہیں اور کسی کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ایسی صورت میں لوگ کیوں کام کریں گے اور کیوں محنت کریں گے۔پہلے استاد کی معاشرے میں بڑی قدر تھی،اگر کوئی پرائمری استاد ریٹائر ہوتا تو اسے بڑی عزت سے الوداع کہا جاتا تھا اور اب تو حالت یہ ہے کہ وائس چانسلر کو بھی کوئی نکال دیتا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔''

اسی طرح ایک اور انٹرویو میں انھوں نے نظام تعلیم میں اصلاحات کے بارے میں یوں فرمایا تھا:

''ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور مکمل نظام کو نئی شکل دینے کی ضرورت ہے۔صرف باتیں بنانے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا۔غیروں کی فرسودہ سوچ اور ادھوری سوچی ہوئی آراء جن کا مجبوری میں اظہار کیا جاتا ہے، تعلیم کی آخری امیدوں کو بھی ختم کر سکتی ہیں۔''

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے افکار بابت اخلاقیات

کے ٹی این چینل کے انٹرویو میں ڈاکٹر بلوچ نے اپنا پیغام ان قیمتی الفاظ میں بیان کیا تھا:

''میرا پیغام یہ ہے جن باتوں سے مجھے زندگی میں بہت فائدہ ہوا انھیں بیان کروں۔پہلی بات یہ کہ انسان کو چاہیے کہ ساری دنیا کو نہ دیکھے بلکہ اپنی زندگی گزارنے کے کچھ اصول اور کچھ قواعد بنائے اور ان پر سختی سے عمل کرے، یہ نہ دیکھے کہ دوسرے کس طرح زندگی گزارتے ہیں بلکہ یہ دیکھے کہ مجھے کن اصولوں کے تحت زندگی گزارنی ہے اور اپنی زندگی گزارنے کے فلسفہ پر خود عمل کرے۔دوسری بات یہ کہ آدمی کو زندگی میں محنت کرنی

چاہیے اور محنت سے کام کرنا چاہیے، کاہلی اور سستی سے زندگی نہیں گزارنی چاہیے۔ تیسری بات جس سے مجھے زندگی میں بہت فائدہ ہوا وہ یہ کہ آدمی کو ہر ایک سے الجھنا اور جھگڑا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اگر کوئی الجھنا چاہے بھی تو درگزر سے کام لینا چاہیے اور اپنے کام پر توجہ دینی چاہیے۔ ان تین باتوں سے مجھے زندگی میں بہت فائدہ پہنچا عین ممکن ہے دوسروں کو بھی پہنچے۔

ڈاکٹر بلوچ نے اپنے ایک مفصل انٹرویو بہ عنوان ''علم سے عالم تک'' میں اس موضوع پر اپنے افکار کو ان الفاظ میں پیش کیا تھا:

''میں نے جب لکھنے پڑھنے کا آغاز کیا تھا تب اپنے آپ سے وعدہ لیا تھا کہ میرا قلم کبھی بھی کسی کی مخالفت میں نہیں چلے گا اور میں آج تک اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ اگر کسی سے بلا وجہ الجھا جائے تو نہ صرف عزت گنوانی پڑتی ہے بلکہ آخر میں حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص کو تنقید کرنے کا حق تو حاصل ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ تنقید کرنے والے کی علمی حیثیت کیا ہے؟ یہاں ایسے افراد بھی موجود ہیں جن کے پاس بہت فرصت ہے اور وہ ہر کسی کی تنقید کا جواب دیتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ وہ ایسے افراد بھی پیدا کرتے ہیں جو ان کی جانب سے جواب دیتے ہیں۔

دراصل بات یہ ہے کہ کچھ لوگ محنت سے کام لے کر کچھ نہ کچھ کرتے ہیں جبکہ دوسرے ان کی غلطیاں نکالتے ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ہر شخص اپنے خیالات کے مطابق اپنے وقت کو صرف کرتا ہے۔ میں نے اب تک کوئی سو کتب لکھی ہیں، اگر میں بیٹھ کر صرف تنقیدوں کے جوابات ہی دیتا رہتا تو اتنا علمی و تحقیقی کام کیسے کرتا؟

میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ میں یہ معلوم کروں کہ کون شخص مجھ سے خوش ہے اور کون ناراض۔ میں تو کسی کو بھی اپنا مخالف نہیں سمجھتا۔ باقی رہی بات بائیں بازو والوں کی تو وہ ہر اس شخص کو اپنا مخالف سمجھتے ہیں جو فطری طور پر ان سے جدا ہیں، مثلاً جب

میں مسلمان ہوں تو یہ بات بائیں بازو والوں کو کیوں گوارا ہوگی؟ کئی لوگ مجھ سے اس وجہ سے ناراض ہیں کہ مجھ جیسا قابل آدمی ان کے کیمپ میں کیوں شامل نہیں ہے؟ دوسری بات جوان کو اچھی نہیں لگتی ہوگی وہ میری وطن دوستی ہے۔''

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے افکار بابت سندھ و پاکستان

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مرحوم کے منفرد افکار میں سندھ کے اسلامی تشخص اور محمد بن قاسم کی شخصیت کے حوالے سے افکار بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ڈاکٹریٹ کے مقالے کی خاطر سندھ کے اسلامی دور اور خصوصاً محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے حوالے سے بہت سے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ماخذات کا مطالعہ کیا تھا۔ سندھ کے اسلامی تشخص کے حوالے سے اسی وقت انھوں نے اپنا نقطہ ءنظر طے کر لیا تھا جو مضبوط دلائل کی بنیاد پر تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب کے افکار میں ہمیں ایک تسلسل نظر آتا ہے جو تاوقت آخر قائم رہا۔ سندھ کے اسلامی تشخص اور محمد بن قاسم کی فتح سندھ اور شخصیت کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کے وہ تحقیقی حواشی بڑی اہمیت کے حامل ہیں جو ''فتح نامہ ءسندھ عرف چچ نامہ'' کے سندھی ترجمے کے ساتھ شائع ہوئے تھے۔ فارسی سے سندھی ترجمہ مخدوم امیر احمد نے کیا تھا۔ ان حواشی کا اگر غیر جانب داری سے مطالعہ کیا جائے تو ڈاکٹر صاحب کے دلائل کی قوت واضح ہوتی ہے اور قاری ان کے نقطہ ءنظر کا ہمنوا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ڈاکٹر صاحب کی سندھی، انگریزی اور اردو تحریروں میں اس موضوع پر ہمیں مواد ملتا ہے۔ یہاں ہم ڈاکٹر صاحب کی سندھی تحریروں سے دو اقتباسات کا سلیس اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں جن سے واضح ہوگا کہ سندھ کے اسلامی تشخص اور محمد بن قاسم کی شخصیت کے حوالے سے ان کی کیا فکر تھی:

> ''محمد بن قاسم کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ سندھ (جو موجودہ پاکستان کا ایک صوبہ ہے) کا فاتح تھا۔ عربوں کے زیر حکومت اس وقت کے سندھ میں موجودہ صوبہ سرحد کے کچھ علاقوں کو چھوڑ کر پورا مغربی پاکستان شامل تھا۔ محمد بن قاسم کی فتح سندھ اور اس کے بعد تقریباً تین صدیوں تک سندھ میں عربوں کی حکومت کا زمانہ ایک عظیم الشان دور

ہے۔اس دور کی پوری تاریخ کے دوران محمد بن قاسم کی شخصیت ایک ہیرو کے روپ میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔''

اس موضوع پر ہمیں مفید معلومات ڈاکٹر صاحب کے مختلف افراد کے نام لکھے خطوط میں ملتی ہیں۔ان میں سے چند سندھی زبان میں لکھے خطوط کا ہم سلیس اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں۔یہ خطوط ہمیں ڈاکٹر صاحب کے پوتے جناب محمد ارشد بلوچ کی عنایت سے حاصل ہوئے۔

''سندھ میں گزشتہ تیس چالیس برسوں کے عرصے میں لادینی عناصر نے سندھ کی عرب اسلامی نسبت کے خلاف پروپیگنڈا کیا۔یہاں تک کہ نسب ناموں کو راجپوتوں سے جدا کرنے بلکہ رام لچھمن تک سے ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔اسلام نے عرب قبائل اور غیر عرب قبائل سے ملا کر آپس میں شیر وشکر کر دیا تھا۔سندھ کو اس بات پر فخر ہے کہ تاریخی طور پر عربوں سے ہمارا قریبی تعلق ہے۔''(بنام عبدالحی ابڑو 30/7/2000)

''آج کتاب ''الرحیق المختوم''(مصنفہ صفی الرحمن مبارک پوری) سندھی ترجمہ از قاضی مقصود احمد کے مطالعے کا موقع ملا۔آپ نے اس قدر ضخیم کتاب کا سلیس سندھی عبارت میں ترجمہ کیا ہے۔آپ کے ذوق اور ہمت پر آفرین ہے۔آپ نے اپنی جانب سے جو ابتدا میں تحریر لکھی ہے اس میں یہی سمجھ داری اور دانائی پوشیدہ ہے۔یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کے دل میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ پر لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی ۔ماشاء اللہ اس محبت اور عقیدت پر آپ قابل مبارک باد ہیں۔''(بنام قاضی مقصود احمد (27/11/2008

'انگریز سامراجیوں نے 19 ویں صدی میں سندھی سوسائٹی میں بلوچ اور غیر بلوچ کی تفریق پیدا کی اور اس سے قبل یہ بات نہ تھی۔اس زمانے میں ہمیں ان بے سود بحثوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔سندھ میں جو بھی رہتے ہیں وہ سب سندھی ہیں۔سلطان جام نظام الدین سمہ عہد میں سمہ اور بلوچ سب آپس میں مل جل کر سندھی ہو گئے۔''(ایضاً

(16/5/2003

''سندھ کے اسلامی دور میں بہت سے قبائل عرب سے آئے اور انہوں نے ہمیشہ کے لیے سندھ کو اپنا گھر بنالیا۔ البتہ اس نئے دیس میں افراد کے نام مٹ گئے اور کئی قبیلوں کے نام ان کے بڑوں کے نام یا ان کے پیشوں کے نام سے مشہور ہوئے۔ پنھور، پنھوار نام بکریوں کے ریوڑیوں کی وجہ سے پڑا۔ مخدوم محمد ہاشم پنھور قبیلے سے تھے لیکن اصلیت کے لحاظ سے انہوں نے خود کو اسدی قریشی سے متعارف کرایا۔'' (بنام عبدالوہاب چاچڑ 1/7/2000)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی ایک اہم تحریر روزنامہ جنگ کراچی بابت 24-2-2002 میں بہ عنوان ''بزرگ شہری کیا کہتے ہیں۔ آزادی کے وقت جو خواب دیکھے اس کی تعبیر نہیں ملی'' اشاعت پذیر ہوئی۔ اس تحریر میں انھوں نے قیام پاکستان سے قبل تحریک پاکستان کے دوران صورت حال اور قیام پاکستان کے بعد صورت حال کی ابتری کی وجوہات کے حوالے سے بعض انفرادی افکار تحریر فرمائے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''قیام پاکستان کی جدوجہد میں قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ ساتھ سندھی لیڈر بھی شامل تھے۔ اسلامی معیار کے تحت بنیادی آئین کے لیے مسودہ تیار کیا گیا لیکن مسلم لیگی رہنما عملی طور پر اسے قائم رکھنے اور عمل کرنے میں بالکل ناکام رہے۔ انگریزوں کے آخری ایام میں رشوت عام تھی لیکن بدانتظامی نہیں تھی۔ آزادی کے بعد ہندوستان کو تمام مشینری باصلاحیت و فعال ملی جبکہ پاکستان کو صفر سے آغاز کرنا پڑا۔ صورتحال یہ تھی کہ دفتری استعمال میں آل پن کے بجائے ببول کے درخت کے کانٹے استعمال کرتے تھے۔ اس وقت سیاسی رہنما مخلص تو تھے تاہم اتنے قابل اور باصلاحیت نہیں تھے جس کے باعث بیوروکریسی کرپٹ اور بدعنوان ہوگئی اور جمہوری حکومتوں کا تختہ الٹا گیا اور مارشل لا کی حمایت کی گئی جس کی وجہ سے پاکستان میں غیر سیاسی عمل فروغ پایا۔ بالآخر سیاسی رہنما بھی انتشار اور کرپشن میں مبتلا ہو گئے۔ اس طرح آزادیِ پاکستان کے وقت ہم نے جو خواب دیکھے تھے اس کی تعبیر نہیں مل

سکی۔"

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے ادبی افکار

ڈاکٹر بلوچ صاحب زندگی میں مخالفت کی بجائے محبت کے قائل تھے۔اس حوالے سے غلام محمد لاکھو کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"کتاب لکھنا آسان کام نہیں۔اس لیے آپ کی محنت پر آفرین ہے۔گزشتہ خط میں آپ کو مشورہ دیا تھا کہ سندھ سے متعلق جو بھی لکھیں محبت سے لکھیں۔ ہمارے قلم سے کسی کے خلاف دو لفظ بھی شائع نہ ہوں۔ میرا یہی اصول ہے جو شاید آپ کے لیے بھی مفید ثابت ہو۔"(بنام غلام محمد لاکھو 20/2/1982)

جیسا کہ ذکر ہوا ڈاکٹر بلوچ ہمیشہ اعلیٰ اسلامی اخلاقی اقدار پر عمل پیرا رہے۔اس حوالے سے انھوں نے ایک مضمون میں یہ بیان کیا تھا کہ نظریاتی مملکت میں ادیب کا کردار کیسا ہونا چاہیے۔اس بارے میں انھوں نے لکھا:

"ایک نظریاتی معاشرے یا مملکت کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ وہ اندرونی طور پر اپنے نظریے کی نشوونما پر خصوصی توجہ دے اور بیرونی طور پر اپنی نظریاتی حدود کی حفاظت کرے لیکن اگر معاشرہ یا مملکت اس میں تغافل برتے یا اس سلسلے میں جو اقدام کرے وہ سوچ اور تدبر سے نہ کرے تو پھر اختلافات اور انتشار کی ذمہ داری اس معاشرے و مملکت پر بھی عائد ہوتی ہے۔

ضروری ہے کہ پاکستان میں ہم خود سے یہ سوال پوچھیں اور سوچنے کے بعد دیانت داری سے اس کا جواب دیں کہ صحیح اسلامی معاشرے کے کیا کیا تقاضے ہیں اور وہ کیسے پورے ہو سکتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی فکر کی رو سے اسلامی معاشرے میں ادیب کا مقام نہایت بلند ہے۔ان کا فکر ان کے اعمال اور افعال سب کے سب شائستگی اور سنجیدگی کا مظہر ہوتے ہیں۔ادیب نام ہی اس کردار کا ہے کہ جس میں حسن ادب اور

شائستگی ہو۔اسلامی فکر کے اعتبار سے ادیب کا مفہوم محض تحریر اور تصنیف کی صلاحیت یا شاعری میں مہارت تک محدود نہیں بلکہ اس سے وسیع تر ہے۔شاعر،فلسفی ،مورخ ،نجومی ،طبیب ،ماہرلغت ،ریاضی دان ،اور مختلف علوم میں مہارت رکھنے والے دوسرے علماء جن کو آج کل کی اصطلاح میں سائنسدان کہا جاتا ہے یہ سب کے سب ادیبوں میں شمار ہوسکتے ہیں بشرطیکہ ان کی مخصوص علمی مہارت کے ساتھ ساتھ ان میں حسن عقیدہ اور حسن کردار بھی ہو۔اسلامی روایات کی روشنی میں ان سب کو مشہور مصنف یاقوت نے اپنی بلند پایہ کتاب معجم الادباء یا ارشادالاریب میں بجاطور پر ادیب شمار کیا ہے۔

اسلامی فکر کی روشنی میں ادیبوں کے کردار کو اگر مزید تفصیل سے بیان کیا جائے تو کچھ اس طرح کہنا ہوگا کہ وہ کتاب کے سطحی مفہوم سے زیادہ تر کتاب کی معنوی حکمت اور حقیقت کو سمجھتے ہیں۔اپنے تحریری یا زبانی خطاب کو سامعین کی سوجھ بوجھ کی سطح پر پیش کرتے ہیں ۔احسن طریقے سے استدلال کرتے ہیں ۔طعنہ زنی اور دشنام طرازی سے پرہیز کرتے ہیں تا کہ مخالف ان پر طعنہ زنی اور دشنام طرازی سے کام نہ لے۔وہ تنقید و موازنے میں انصاف برتتے ہیں۔اختلاف کی صورت میں وہ مخالف کو اور خود کو یہ حق دیتے ہیں کہ ''لكُم دِينُكم وَلِيَ دِين'' حسن کردار ہی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ملک وملّت اور انسان کی خدمت کا نیک جذبہ ان کے کردار کا منبع ومشرب ہوتا ہے۔خود پرستی کے بجائے حق پرستی اور غرور اور گھمنڈ کے بجائے تواضع اور انکساری ان کا خصوصی شیوہ ہوتا ہے۔وہ چلتے ہیں تو بھی دھیرے نرم خرام چلتے ہیں ۔وہ لغو اور پست افکار اور افعال سے اپنا دامن بچا کر عزت سے گزر جاتے ہیں۔

اسلامی فکر کی رو سے وہ شخص جو کتابی مطالعے اور تحریر وتصنیف میں دسترس رکھتا ہو مگر اخلاقی پستی کی طرف جھکا ہوا ہو اور جس کا کردار انسانی زندگی کی اعلیٰ قدروں کے خلاف ہو وہ ادیب کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔جو کتابیں پڑھتا ہو، مضامین لکھتا ہو یا شعر کہتا ہو،

مگر اعزاء واقارب کا پاس نہ رکھتا ہو، جو محلہ اور پڑوسی کا بہی خواہ نہ ہو، جو وطن کی حب سے عاری ہو، جو انسانی ہمدردی سے خالی ہو، جس کے قول اور فعل میں تضاد ہو، اور جو اپنی گفتگو تحریر اور تصنیف میں پست موضوعات اور پست خیالات کی طرف مائل ہو تو ایسا لکھا پڑھا، ذہین اور ہوشیار مصنف اور مقالہ نگار کہلا سکتا ہے لیکن ادیب نہیں کہلا سکتا۔ اس نے محض کتابی مطالعہ اور معلومات کا بے نتیجہ بوجھ اٹھا رکھا ہے، مگر نہ وہ خود اس سے صحیح معنوں میں مستفید ہوتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

لغت کے مفہوم میں ادیب کے معنی ایسے عالم کے ہیں کہ جو علم و ادب میں دسترس رکھتا ہو، لیکن علم و ادب کا اصطلاحی مفہوم بھی ادب کے مفہوم پر مبنی ہے۔ قرون اولیٰ والے اسلامی معاشرے کے علمی اور عملی احقائق کی روشنی میں نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ادیب وہ ہے جس کے عقیدے ارادے علم اور کردار میں حسن نمایاں ہو۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے بڑے ادیب تھے اور ان کا کردار اسوۂ حسنہ والا مثالی کردار تھا، آپؐ نے وضاحت فرمائی کہ ادبنی ربّی فاحسن تادیبی۔

اب تک تو یہ ہے کہ اس حقیقت افروز ارشاد کو وعظ کے طور پر یاد رکھا جائے۔ دوسرا یہ کہ اس حدیثِ عالی سے صحیح نتیجہ اخذ کر کے اس کو عملی طور پر اپنایا جائے۔ پیغمبر عالی جناب کا مودب تو خالق اکبر ہی ہو سکتا ہے، اور ان کے تادیب کا مقام سوائے اس کے ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ احسن ترین ہو لیکن انسانی معاشرے کی رہنمائی کے لیے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ادیب خود بخود پیدا نہیں ہوتے بلکہ ان کی نشوونما کے لیے مودب اور تادیب دونوں کی ضرورت ہے۔ اور مزید یہ کہ جو بھی حالات ہوں ان میں مؤدب اعلیٰ پایہ کا ہو اور طریقہ تادیب بھی احسن ہو۔ نتیجے کے طور پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلامی فکر کے اعتبار سے اسلامی معاشرے اور مملکت میں ادیب کا مقام اعلیٰ وارفع ہے کیونکہ اس کا کردار مثبت اور حسین ہے لیکن اسلامی معاشرے میں ادیب خود بخود پیدا نہیں ہوتے وہ

تعلیم وتربیت اورتادیب کے اصولوں پر مبنی نظام تعلیم سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ بنیادی نشوونما کے بعد ادیب کے کردار کو استوار کرنے اور حسین تر بنانے کے لیے مسلسل ترغیب لازمی ہے تا کہ اس کے سماجی وفکری تجزیے تخلیقی اور تعمیری ہوں۔''

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے مذکورہ بالا چند منفرد افکار ہیں جو ہم نے ان کی تحریروں سے اخذ کیے ہیں۔ اگر کوشش کی جائے تو مزید افکار کا سراغ لگایا جا سکتا ہے لیکن محدود ضخامت کی وجہ سے ہم انھی افکار پر اکتفا کرتے ہیں۔

مآخذ و مصادر

سندھی کتب

۱۔اسان جوڳوٺ جعفر خان لغاري از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ لغاری، ضلع سانگھڑ، طبع اوّل، ۱۹۹۸ء۔
۲۔اهي ڏينهن اهي شينهن (جلد دوم) از پیر علی محمد راشدی، سندھی ادبی بورڈ جام شورو/حیدرآباد، ۱۹۸۰ء۔
۳۔جامع سنڌي لغات (جلد نمبر۱ تا ۵) سندھی ادبی بورڈ جام شورو/حیدرآباد
۴۔ نئين جامع سنڌي لغات (جلد نمبر۱ تا ۳) سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد
۵۔ ڊاڪٽر بلوچ هڪ مطالعو مصنف ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو، لاڑ ادبی سوسائٹی بدین، ۱۹۹۸ء۔
۶۔ ڊاڪٽر بلوچ هڪ مثالي عالم (حصہ اوّل) مرتبہ تاج جویو، سندھ مانک موتی تنظیم حیدرآباد، ۲۰۰۲ء۔
۷۔ ڊاڪٽر بلوچ هڪ مثالي عالم (حصہ دوم) مرتبہ محمد عثمان منگي، سندھ مانک موتی تنظیم حیدرآباد، ۲۰۰۲ء۔
۸۔ڊاڪٽر بلوچ هڪ مثالي عالم (حصہ سوم) مرتبہ: محمد عثمان منگي، سندھ مانک موتی

تنظیم حیدرآباد، ۲۰۰۴ء۔
۹۔سنڌي ٻولي جا محقق از ہدایت پریم، سندھ تحقیقی بورڈ حیدرآباد، ۱۹۹۶ء۔
۱۰۔ڊاڪٽر بلوچ جا مقالا ۔ علم ، ادب ۽ شخصيتون ، مرتّب : محمد ارشد بلوچ، ڈاکٹر این اے بلوچ انسٹیٹیوٹ آف ہیریٹیج ریسرچ حیدرآباد، ۲۰۱۲ء
۱۱۔ڊاڪٽر بلوچ جا مقالا:شاھہ عبداللطيف جي حياتي جواحوال۽رسالي جي تاريخ مرتّبہ: ڈاکٹر عبدالغفار سومرو ،ڈاکٹر این اے بلوچ انسٹیٹیوٹ آف ہیریٹیج ریسرچ حیدرآباد، ۲۰۱۲ء
۱۲۔ ڊاڪٽر بلوچ جا مقالا ۔ تاريخ مرتّب : ڈاکٹر محمد یعقوب مغل، ڈاکٹر این اے بلوچ انسٹیٹیوٹ آف ہیریٹیج ریسرچ حیدرآباد، ۲۰۱۲ء
۱۳۔ڊاڪٽر بلوچ جا مقالا ۔ تاريخ،لغت،ٻولي،ادب۽ شخصيتون، مرتبہ: محمد ارشد بلوچ محکمہء ثقافت حکومتِ سندھ، ۲۰۱۴ء
۱۴۔ڊاڪٽر بلوچ جا مقالا(شخصيتون ، تاريخ، ٻولي ۽ ادب)، مرتبہ: محمد ارشد بلوچ ،ڈاکٹر این اے بلوچ انسٹیٹیوٹ آف ہیریٹیج ریسرچ حیدرآباد، ۲۰۱۵ء
۱۵۔ سنڌ جا پاڳارا پير (سندھ کے پگارا پیر)، مرتبہ: ڈاکٹر عبدالرسول قادری، ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ریسرچ فاؤنڈیشن حیدرآباد، ۲۰۱۶ء
۱۶۔ سنڌ جو ذهين ٻار ڊاڪٽرنبي بخش خان بلوچ، مرتبہ: پروفیسر محمد عمر چنڈ، ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ریسرچ فاؤنڈیشن حیدرآباد، ۲۰۱۴ء
۱۷۔شاھه جو رسالو محقق وشارح: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، سندھیکا اکیڈمی کراچی، ۲۰۱۲ء
۱۸۔ڊاڪٽر نبي بخش بلوچ، تعزيتي تاثرات، مرتّب : محمد ارشد بلوچ، سندھ مانک موتی تنظیم، حیدرآباد، ۲۰۱۱ء
۱۹۔ڊاڪٽر نبي بخش خان بلوچ (زندگي ۽ خدمتون) از محمد انس راجپر ،ڈاکٹر

این اے بلوچ انسٹیٹیوٹ آف ہیریٹیج ریسرچ حیدرآباد، ۲۰۱۳ء

۲۰۔سنڌي ادب جي تاريخ (جلد نمبر ۱ تا ۳) از ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو ،سندھی لینگویج اتھارٹی حیدرآباد

۲۱۔فتح نامہ سنڌ عرف چچ نامو ،ترجمہ: مخدوم امیر احمد، تصحیح، تحقیق، تشریح: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد، ۱۹۶۶ء

۲۲۔ مارو جي ملير جا ،از : خادم حسین چانڈیو، گنج بخش کتاب گھر حیدرآباد، ۲۰۰۴ء۔

۲۳۔ڊاڪٽر نبي بخش بلوچ (شخصيت، فڪر ۽ فن) مرتّب : پروفیسر محمد سلیم میمن ،محکمہ ثقافت حکومت سندھ،

۲۴۔ڊاڪٽر بلوچ جا انٽرويو مرتّب :محمد ارشد بلوچ، ڈاکٹر این اے بلوچ انسٹیٹیوٹ آف ہیریٹیج ریسرچ حیدرآباد، ۲۰۱۲ء

۲۵ سانگين سنپارون مرتّب : عنایت بلوچ، ڈاکٹر این اے بلوچ انسٹیٹیوٹ آف ہیریٹیج ریسرچ حیدرآباد، ۲۰۱۲ء

۲۷۔ سنڌي لوڪ ادب جو اڀياس، مرتبہ: محمد ارشد بلوچ، ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ریسرچ فاؤنڈیشن حیدرآباد، ۲۰۱۶ء

۲۷۔ مون جي ڏٺا ماڳ مرتّب :محمد احسان لغاری، ڈاکٹر این اے بلوچ انسٹیٹیوٹ آف ہیریٹیج ریسرچ حیدرآباد، ۲۰۱۲ء

سندھی رسائل

۱۔ماہنامہ بيداري حیدرآباد، اپریل ۱۹۹۷ء

۲۔سہ ماہی مهراڻ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ خاص نمبر، بابت اپریل تا جون 2012

اردو کتب

۱۔اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد نمبر ۱۱، پنجاب یونیورسٹی لاہور

۲۔ایام گزشتہ کے چند اوراق، تعلیقات وحواشی: ڈاکٹر محمد ادریس سومرو، محکمہ ءثقافت حکومتِ سندھ، ۲۰۱۴ء

۳۔تذکرہ پیران پاگارہ از تبسم چوہدری، انڈس پرنٹرز حیدر آباد طبع اوّل ۱۹۷۵ء

۴۔تذکرہ مشاہیر سندھ (۳ حصے) از: مولانا دین محمد وفائی، ترجمہ از: ڈاکٹر عزیز انصاری/عبداللہ وریاہ، سندھی ادبی بورڈ جام شورو، ۲۰۰۵ء

۵۔"پاپ بیتی۔ایک اور طرح کی آپ بیتی" از اشفاق نقوی، نیولائن پبلشرز لاہور، س ن۔

۶۔خفتگان خاک لاہور، از پروفیسر محمد اسلم، ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب لاہور، طبع اوّل، ۱۹۹۳ء

۷۔خفتگانِ کراچی، از پروفیسر محمد اسلم، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہِ پنجاب، لاہور، طبع اوّل ۱۹۹۱ء

۸۔دیوان شوق افزا عرف دیوان صابر، مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، اردو سائنس بورڈ، لاہور، اشاعتِ اوّل ۱۹۸۴ء

۹۔دیوانِ فرید ترجمہ: نور احمد خان فریدی، قصر الادب رائٹرز کالونی، ملتان، ۱۹۷۹ء

۱۰۔دیوانِ ماتم، مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، سندھی ادبی بورڈ جام شورو/حیدر آباد، اشاعتِ اوّل ۱۹۹۰ء

۱۱۔ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیات۔خدمات۔مکتوبات از محمد راشد شیخ، ادارۂ علم وفن کراچی طبع دوم ۲۰۱۴ء

۱۲۔خطوط ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، مرتبہ: محمد راشد شیخ، محکمہ ءثقافت حکومت سندھ کراچی، ۲۰۱۲ء

۱۳۔خطوط مشاہیر بنام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، مرتبہ: محمد راشد شیخ، ۲۰۱۵ء

۱۴۔سندھی اردو لغت، مرتبہ: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ و ڈاکٹر غلا مصطفیٰ خان، انسٹیٹیوٹ آف سندھالوجی، سندھ یونیورسٹی جام شورو، طبع سوم ۱۹۸۵ء

۱۵۔سندھ میں اردو شاعری، مؤلفہ: ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع سوم، ۱۹۷۸ء

۱۶۔طلبہ اور تعلیم (قائداعظم نے کیا سوچا اور کیا کہا) مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، قائداعظم اکیڈمی، کراچی، طبع ششم ۱۹۷۶ء۔

۱۷۔عظمت رفتہ از ضیاء الدین احمد برنی، تعلیمی مرکز کراچی، اشاعتِ اوّل ۱۹۶۱ء

۱۸۔ گلشنِ اردو۔ اردو مقالات نبی بخش خان بلوچ، مرتبہ: محمد راشد شیخ، پاکستا اسٹڈی سینٹر سندھ یونیورسٹی جام شورو، ۲۰۰۹ء
۱۹۔ مضامین ڈار، از پروفیسر محمد ابراہیم ڈار، مرتبہ مطبوعہ بمبئی ۱۹۵۱ء
۲۰۔ مولانا آزاد سبحانی۔ تحریکِ آزادی کے ایک مقتدر رہنما، از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ، پنجاب، لاہور طبع اوّل ۱۹۸۹ء
۲۱۔ میری زندگی کے پچھتر برس از اعجاز الحق قدوسی، مکتبہء اسلوب کراچی، ۱۹۸۸ء
۲۲۔ نذرِ عرشی، مرتبہ مالک رام، مجلسِ نذرِ عرشی، دہلی ۱۹۶۵ء
۲۳۔ وفیاتِ مشاہیر پاکستان از پوفیسر محمد اسلم، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۰ طبع اوّل
۲۴۔ وفیاتِ ناموران پاکستان از ڈاکٹر منیر احمد سلیچ، اردو سائنس بورڈ لاہور، ۲۰۰۶ء

اردو رسائل وجرائد/ اخبارات

۱۔ ماہنامہ العزیز بہاولپور، دسمبر ۱۹۴۳ء
۲۔ ماہنامہ برہان دہلی، دسمبر ۱۹۷۹ء
۳۔ رسالہ بصائر، جامعہء اسلامیہ بہاولپور بابت ۱۹۸۱ء
۴۔ ماہنامہ پیغام کراچی، مارچ اپریل ۲۰۱۱ء
۵۔ مجلہ تحقیق شعبۂ اردو' سندھ یونیورسٹی' شمارہ نمبر ۹۔۸ بابت ۹۴۔۱۹۹۵ء، مرتبہ ڈاکٹر نجم الاسلام
۶۔ مجلہ تحقیق شعبہ اردو، جامعہ سندھ شمارہ خاص نمبر ۱۰۔۱۱ مرتبہ ڈاکٹر نجم الاسلام
۷۔ علی گڑھ میگزین (علی گڑھ آئینۂ ایام میں) مرتبہ محمد رضوان مصطفیٰ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ' ۹۷۔۱۹۹۵ء
۸۔ سہ ماہی فکر و آگہی، دہلی، ''علی گڑھ نمبر'' جلد نمبر ۱۴۔۱۱، ۲۰۰۰ء
۹۔ سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ، ناموران علی گڑھ نمبر، جلد ۲۳۔ بابت ۱۹۸۶ء
۱۰۔ سہ ماہی ''نئی عبارت'' حیدر آباد، ڈاکٹر غلام مصطفی خان نمبر مرتبہ مسرور احمد زئی جولائی دسمبر ۱۹۹۸ء۔

۱۱۔روزنامہ جنگ کراچی،(سنڈے میگزین)۲۲ ستمبر ۲۰۰۲ء۔

انٹرویو

۱۔ڈاکٹر نبی بخش بلوچ سے شخصی انٹرویو،مورخہ ۲۲ جون ۲۰۰۶ء بہ مقام سندھ یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) حیدرآباد

۲۔ڈاکٹر نبی بخش بلوچ سے شخصی انٹرویو۔مورخہ ۳۰ جون ۲۰۰۶ء بہ مقام سندھ یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) حیدرآباد

۳۔ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا انٹرویو،روزنامہ جنگ کراچی (ادبی صفحہ)،مورخہ یکم جون ۱۹۹۷ء

۳۔ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا مفصل انٹرویو،روزنامہ جنگ کراچی (سنڈے میگزین)،مورخہ ۲۲ ستمبر ۲۰۰۲ء

۴۔ڈاکٹر محمد یعقوب مغل صاحب سے فروری و مارچ ۲۰۱۴ء کے دوران مختلف نشستوں میں

۵۔ڈاکٹر محمد شریف بلوچ (فرزند اکبر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ) سے مورخہ ۱۱رنومبر ۲۰۱۲ء کو گوٹھ جعفر خان لغاری میں

۶۔جناب علی محمد بلوچ (فرزند ڈاکٹر نبی بخش بلوچ) سے مورخہ ۱۱رنومبر ۲۰۱۲ء کو حیدرآباد میں

۷۔جناب علی بخش لغاری صاحب سے مورخہ ۲۳رفروری ۲۰۱۴ء کو ان کی رہائش گاہ،کراچی میں

غیر مطبوعہ مضامین

۱۔ڈاکٹر این اے بلوچ لاہور میں از پروفیسر محمد اقبال مجددی

۲۔ڈاکٹر نبی بخش بلوچ از سید جمیل احمد رضوی

شخصی کوائف (انگریزی)

1. BIO-DATA prepared by Dr. N.A. Baloch.
2. Dr. N. A. Baloch - Life Profile by Umaima Baloch

انگریزی کتب

1)Great Books of Islamic Civilization by N.A Baloch, Pakistan Hijra Council, Islamabad, 1989.

2)Sindh: Studies Cultural by Dr. N.A Baloch, Pakistan Study Centre, University of Sindh Jamshoro, 2003.

3)Sindh: Studies Historical by Dr. N.A. Baloch, Pakistan Study Centre, University of Sind, Jamshoro, 2003.

4)Sindh Studies: Educational and Archeological,Compiled & Edited by: G. M. Umrani & M.Arshad Baloch, Dr N.A. Baloch Institute of Heritage Research, Hyderabad, 2012

5)World of work-Predicament of a Scholar, Edited with Introduction by Prof. Muhammad Umar Chand, Institute of Sindhology, University of Sindh, Jamshoro,2007

اخبارات ورسائل (انگریزی)

1.Daily "Dawn" Karachi (Books and Authors) dated 18th September, 2005.

2.Daily "Dawn" Karachi (Books and Authors) dated 27th May, 2007.

3. Daily Pakistan Times Lahore, dated 25th January 1985.
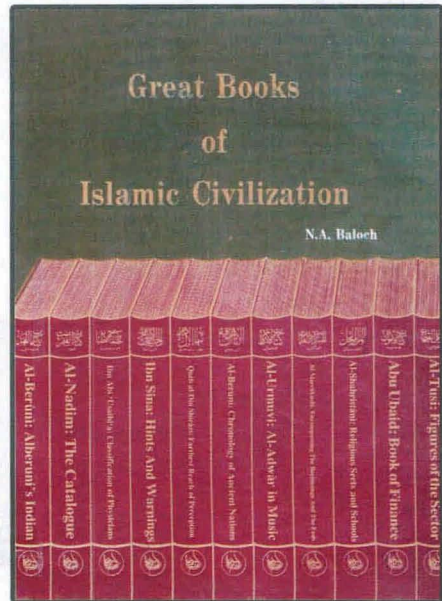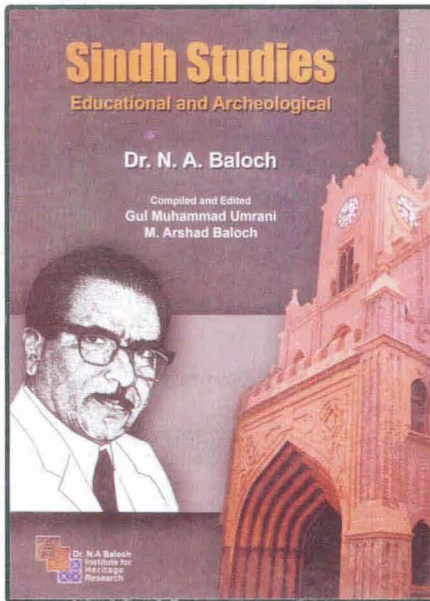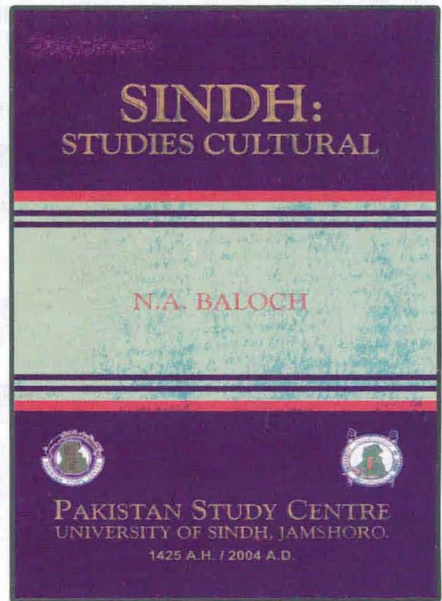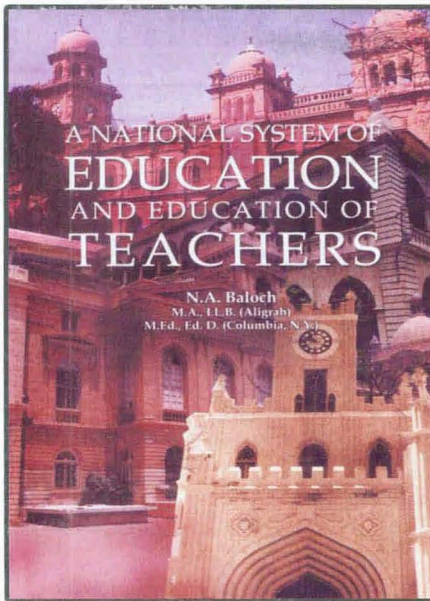
ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی انگریزی زبان میں لکھی چند کتب کے ٹائٹل
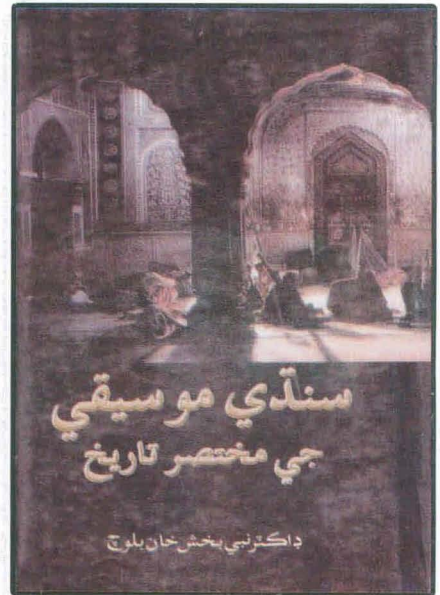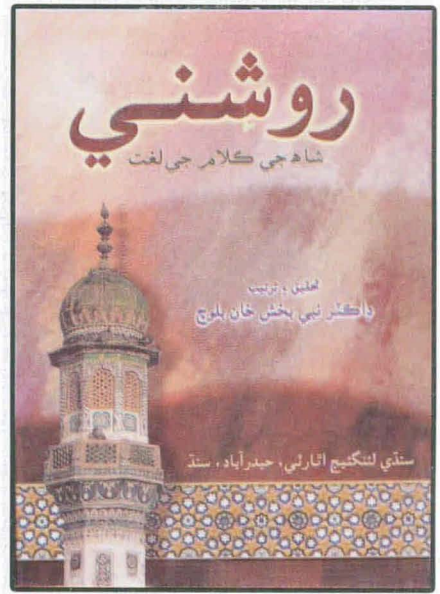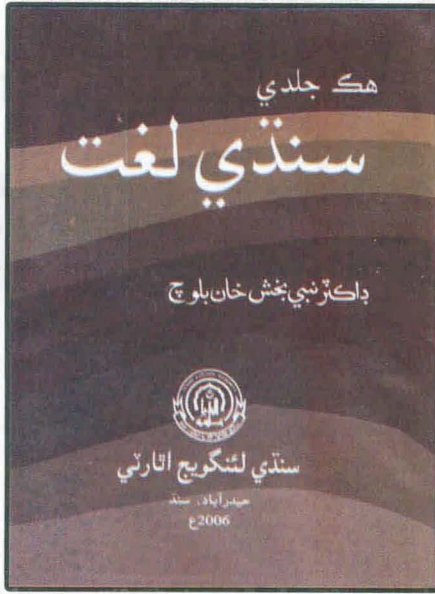
ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی سندھی زبان میں لکھی چند کتب کے ٹائٹل

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی اردو زبان میں لکھی چند کتب کے ٹائٹل

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے بارے میں محمد راشد شیخ کی چار کتابیں